مخزن لاہور

نمبر ۱

ماہوار رسالہ

ماہ جنوری سنہ ۱۹۵۰

سالانہ : سات روپے ،

ششماہی : چار روپے ،

ایک پرچہ ، دس آنے ،

THE "MAKHZAN" LAHORE.

[illegible] زمانے وقت

[illegible] بالکل نہیں ہوتیں۔ فلسفے اور عمرانیات کا مطالعہ اس رسالے کی خصوصیت ہے۔ ادبی تنقیدوں پر بھی [illegible] [illegible] دیا۔ یہ رسالہ ادبی پرچے سے اتنا خشک معلوم ہوتا ہے کہ اسے پڑھنے کی مجھے ترغیب ہوئی نہیں۔

[illegible] اس رسالے سے پچاس ساٹھ سال کی ادبی یادیں وابستہ ہیں۔ آخری انیسویں صدی اور بیسویں صدی [illegible] چنانچہ یہ رسالہ اس بڈھے کی طرح ہے جو ہر وقت جوانی کے دنوں کو یاد کرتا رہتا ہو۔ نئی چیزیں تو خیر [illegible] بہت تنگ رہتا ہے جو مر چکے ہیں۔ یہ رسالہ جرمنوں کے قبضے کے زمانے میں بند ہو گیا تھا۔ جب یہ رسالہ دوبارہ شروع [illegible] اس نے غلامی کے زمانے کو اپنی تاریخ ہی سے خارج کر دیا، اور اس حادثے کے متعلق ایسا رویہ اختیار کیا [illegible] خاص نمبر شروع سے آخر تک پڑھا ہے، مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے، اس میں جنگ اور غلامی [illegible] اس رسالے سے تعلق رہا تھا اُن کے خطوط اور غیر شائع شدہ چیزیں چھاپی تھیں۔ اسی ایک بات سے اندازہ کر لیجئے کہ [illegible] کی کیا اہمیت ہے اور ان کا انداز نظر کیا ہے۔ اس رسالے نے پال والیری کی موت پر جو خاص نمبر شائع کیا تھا وہ [illegible]

LES TEMPS MODERNES (لے تاں مودرن یعنی عصر حاضر) [illegible] آج کل یہ فرانسیسی کا سب سے اہم ادبی رسالہ ہے، کیونکہ اس کے کرتا [illegible] پال سارتر ہیں۔ سارتر کے خیال میں نظم نثر سے بالکل الگ چیز ہے لہذا وہ اپنے رسالے میں نظمیں نہیں چھاپتے [illegible] ہر پرچے میں ہوتے ہیں۔ اطالوی، اسپینی اور امریکن ناولوں کے ترجمے بھی اکثر شائع ہوتے ہیں۔ چونکہ سارتر نے "ذمہ دار ادب" [illegible] ناولوں کے ترجمے خاص طور سے چھاپتے ہیں جن کا تعلق سیاسی، معاشی اور سماجی انصاف سے ہو۔ خصوصیت کے ساتھ [illegible] بڑی دلچسپی ہے۔ یہ رسالہ صرف مابعد الطبیعیات میں نہیں کھویا رہتا، بلکہ سیاسی مسائل پر بھی مفصل اور پُر جوش انداز میں [illegible] سارتر کو رجعت پسند اور عوام کا دشمن بتاتے ہیں، مگر انہوں نے انڈو چائنا کی جنگ آزادی کی کھلم کھلا حمایت کی تھی، اور [illegible] اس رسالے میں کمیونسٹوں سے چھیڑ چھاڑ بھی اچھی رہتی ہے۔ لیکن اس رسالے کی اہم ترین چیز فلسفۂ زیست والوں کے [illegible] آپ کو خود سارتر کا مضمون یاد آتا ہے "ادب کیا ہے؟" — جو چھ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اب تو اس مضمون [illegible] اس رسالے کے مضامین کم سے کم میں نے تو بہت ہی کم پڑھے ہیں۔ خصوصاً جس طرح سارتر نے ادیب کی ذمہ داری [illegible] کرا تہائی اہم چیز ہے۔ اسی طرح ایک بہت لمبا چوڑا مضمون ایک صاحب نے کیسلر کے مضمون "یوگی اور کمیسار" [illegible] اور عمل پر مفصل بحث کی گئی تھی۔ اس رسالے کے خاص لکھنے والوں میں ایک ہیں SIMONE DE BEAUVOIR [illegible] ان کا مقام بہت بلند ہے، مگر ویسے بھی وہ آج کل فرانس کی سربرآوردہ ہستیوں میں سے ہیں۔ تعجب کی بات [illegible] پھر خوبصورت، مگر سچ یہ ہے کہ جب لکھنے پر آتی ہیں تو بڑے بڑوں کے کان کاٹتی ہیں۔ ایک جگہ انہوں [illegible] کا فلسفہ انسانی دماغ کا بہترین کارنامہ معلوم ہوتا ہے، لیکن کتب خانے سے باہر نکلتے ہی آدمی کھو جاتا ہے کہ [illegible] اس کے برخلاف فلسفۂ زیست سڑک پر چلتے ہوئے بھی کام دیتا ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ ٹھوس تجربات بلکہ

خلاف جیت پسند ہے، ڈھونگ کا عوام کا دشمن ہے، اس کا منہ بند کرو، اُس پہ عوام کی عدالت میں مقدمہ چلاؤ۔ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد تو الفاظ دیکھتے ہی جانپ لینا آسان ہو گیا تھا، اس لئے اس رسالے کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ آراگوں صاحب اس پرچے کے نگران ہیں ان کی بیوی کا کلام خاص اہتمام سے شائع ہوتا ہے، اور ہر تنقیدی مضمون میں کم سے کم ایک دفعہ یہ اشارہ ضرور کر دیا جاتا ہے کہ آج کل فرانس میں آراگو سے بڑا ادیب کوئی نہیں ہے ۔۔ حالانکہ سنجیدہ رسالوں میں اُن کا ذکر شاذونادر ہی ہوتا ہے۔

اتنے ادبی رسالوں کا ذکر کیا ہے تو ایک اور رسالے کا نام بھی لے دوں جو پوری طرح ادبی تو نہیں ہے۔ مگر ہمارے لئے دلچسپی رکھتا ہے میں ایک رسالہ نکلا ہے۔ BALKANS ET PROCHE ORIENT (بال کن اے پروش اوریاں) اس میں ترکی، مصر، عراق، ایران، عرب اسلامی ممالک کے تمدن، ادب اور سیاست وغیرہ کے متعلق مضامین ہوتے ہیں، اور نظم و نثر کا ترجمہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ پرچہ دیکھا تو نہ مگر تجربے سے پتا چلتا ہے کہ اس کا رنگ معلوماتی قسم کا ہے، کھلے کھلے پروپیگنڈے سے گریز کیا جاتا ہے۔

ادبی رسالوں کے ضمن میں تھوڑا سا ذکر ادبی ہفتہ وار اخباروں کا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فرانس کی ادبی زندگی میں ان اخباروں کی بڑی اہمیت اور اثر ہے۔ یہ اخبار ہونے تو ہیں چھوٹے چھوٹے، مگر بکتے بہت ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی ادیبوں کی آمدنی کا ایک خاص ذریعہ یہی اخبار ہیں۔ نہ کہ یہ اخبار ادیبوں کو اتنا زیادہ معاوضہ دے دیتے ہیں کہ وہ لوگ اس آمدنی پر بھروسا کر کے اپنا مستقل کام سکون اور اطمینان کے ساتھ جاری رکھ سکتے ان اخباروں میں آپ کو بڑے بڑے ادیبوں کے مضامین مل جائیں گے جن میں کسی ادبی موضوع پر ہلکے پھلکے انداز میں بحث کی ہو گی۔ یہاں تک کہ ایک پرچے میں ایک دفعہ آندرے ژید کا مضمون دیکھا، اور انہوں نے لکھا بھی تھا کس بات پر؟ محاورے کی غلطیوں پر، پھر بہت سی دلچسپ ادبی بحث کا اکھاڑا یہی اخبار بنتے ہیں، اور عام پڑھنے والوں کی رائے پر ان اخباروں کا بہت اثر پڑتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں نے اِن اخباروں کو کبھی توجہ نہیں پڑھا، یُوں ہی سرسری طور سے دیکھا۔ اس لئے مجھے صرف ایک نام یاد آ رہا ہے ۔۔۔ LE LITTERAIRE (ل لتیریر) یہ اخبار صرف صفحے کا ہوتا ہے، مگر پھر بھی تنوع کافی ملتا ہے۔ ان اخباروں کے مقابلے پر کمیونسٹوں نے بھی اپنا ایک ہفتہ وار اخبار نکال رکھا ہے جس کا نام ہے LETTRES FRANÇAISES (لیترز فرانسیز)

آخر میں یہ اور سُن لیجئے کہ فرانس کے ادبی رسالوں میں آج کل سب سے زیادہ کن مصنفوں کا ذکر ہوتا ہے۔ کافکا، کیرکے گارڈ، لوتریامو سارتر، ہائی ڈیگر، یہ پانچ نام ایسے ہیں جو ہر سنجیدہ رسالے میں ہر مہینے آپ کو بلاناغہ ملیں گے۔ اس کے بعد نمبر آتا ہے مال رو اور ہنری ملر کا، ان کے بعد والیری، راں بو، بودیلیئر اور ملارمے۔

★

★

★

شاد اختر غیاب

پیشین گوئی

اٹھ خواب سے اے روحِ عمل ہو بیدار   صبحِ تازہ کے جھلکتے ہیں افق پر آثار!
دیکھ وہ جلوۂ خورشید سے بھاگی شبِ تار   دستِ فطرت نے سجاتے ہیں نئے نقش و نگار
دیکھئے جس طرف اک جذبۂ بیداری ہے
بزمِ ہستی میں نئے عہد کی تیاری ہے

جب کسی عہد کا آغاز ہوا کرتا ہے   انقلابات کا دروازہ ہوا کرتا ہے،
غم ہر اک عیش کا ہمراز ہوا کرتا ہے   سوز وابستۂ ہر ساز ہوا کرتا ہے۔
غوطہ زن ہوتی ہے ہر موج ابھرنے کیلئے،
زلفِ تعمیر بگڑتی ہے سنورنے کیلئے

خلشِ خار کا کیوں لوگ گلہ کرتے ہیں؟   پھول آغوش میں کانٹوں کی کھلا کرتے ہیں
غم ہی آئینۂ ہستی پہ جلا کرتے ہیں،   نوکِ نشتر سے یہاں زخم سلا کرتے ہیں،
ہوں نہ گر اشک تو ہنسنے کی کوئی بات نہ ہو
کیسے ممکن ہے کہ دن آئے مگر رات نہ ہو

کیا ہوا آج اگر نظمِ جہاں ہے ابتر   کیا ہوا آج زمانہ ہے اگر زیر و زبر
کیا ہوا آج اگر عام ہے ہنگامہ و شر   کل تو آنے دو کہ بن جائیگی یہ شب ہی سحر
زحمتِ درد سے تکمیلِ مسرت ہوگی،
بطنِ گیتی سے کوئی تازہ ولادت ہوگی

خون اور آگ کے طوفان گزر جائیں گے   قتل و غارت کے یہ سیلاب اتر جائیں گے
زندہ فتنے جو نظر آتے ہیں مر جائیں گے   کام بگڑی ہوئی دنیا کے سنور جائیں گے
باغ میں جاکے خزاں خود یہ پکار آئی ہے
دل گرفتہ نہ ہو بلبل کہ بہار آئی ہے

جناب مسعود اشعر

وُرُود

فضاؤں میں دلکشی، ہواؤں میں گدگدی سما گئی،
وُرُود کی خبر کلی کلی کو گُل بنا گئی،
وہ گُل کہ جس کو دیکھ کر بہار مات کھا گئی۔

سرودِ برشگال پہ ہوائیں گنگنا اٹھیں
گھٹاؤں میں بھی ہری بھری فضائیں گنگنا اٹھیں،
نکلتے چھپتے چاند کی شعاعیں گنگنا اٹھیں

یہ لالہ اور یہ نسترن، یہ گُل یہ سوسن و سمن
جبیں جبیں دمن دمن، روش روش چمن چمن
ہر اک خوشی میں ہے مگن بنی ہوئی نئی دلہن

ہوائیں مرغزار میں بجا رہی ہیں سیٹیاں
ہے راگنی کی رو ہر ایک چیز میں رواں دواں
کہ پیپلوں کے پتّے بھی بجا رہے ہیں تالیاں

لچک رہی ہے شاخِ گُل چھلک رہا ہے جامِ مُل
جمیل صورتیں بھی جیسے آج دے رہی ہیں جُل
نشے میں آج ڈوبتا ہی جا رہا ہے جزو و کل

یہ پھول اور یہ پنکھڑیاں، کنول کی مست انکھڑیاں
روش پہ فرشِ مخملیں بچھا ہوا جہاں تہاں
زبانِ حال سے خبر یہ دے رہی ہے کہکشاں!
"وہ آ رہی ہیں، یہ تمام خوبیاں لئے ہوئے"

جی برنارڈ شا
ترجمہ سعیدہ [illegible]

وہ اُسکے شوہر سے جھوٹ کیسے بولا

(ڈراما)

تمام رات آٹھ بجے کا عمل ہے، کرامویل روڈ کے مین فلیٹ میں نشست [illegible] رہنے کا کمرہ [illegible] ہے کمرے آراستہ ہیں اور روشن ہیں۔ اس کا جانشین [illegible] جو اٹھارہ سال کا ایک خوبرو نوجوان شام کے لباس میں [illegible] ایک سیاہ اوور کوٹ کمرے میں اکیلا داخل ہوتا اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گچھا اور اونچی ہیٹ ہے۔ دروازہ کے پاس [illegible] ہے، اور جب وہ کمرے میں نمودار ہوتا ہے تو قریب ترین انگیٹھی اس کے دائیں کو، اور سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا [illegible] بائیں کو ہے، آتشدان کے قریب ایک چھوٹی سنگھار میز رکھی ہے جس پر ایک دستی آئینہ، ایک پنکھیا، ایک بوتل سفید دستانے اور سر پر باندھنے کا ایک چھوٹا سا سپید اونی پارچہ دھرا ہے۔ بیچ میں [illegible] پیانو کے نزدیک ایک چوڑی مربع بچھی ہوئی تپائی رکھی ہے۔ کمرے کی تزئین [illegible] کنسنگٹن فیشن کی ہے یعنی [illegible] کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کا مقصد اہل خانہ کی [illegible] حیثیت اور قوت خرید کو نمایاں کرنا ہے۔ نہ کہ ان جسم کا آرام پہنچانا۔

ہم پھر دہراتے ہیں کہ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت نوجوان ہے [illegible] نظر آتا ہے گویا حالت خواب میں ہو، اور چل ایسے رہا ہے جیسے [illegible] میں تیر رہا ہو۔ وہ بڑی احتیاط سے پھولوں کو تپائی کے برابر میز پر رکھ دیتا ہے اور پھر اس کے اوپر ہیٹ رکھ کر آتشدان کی طرف بڑھتا گھڑی دیکھتا ہے، اور [illegible] جیب میں رکھ لیتا ہے میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو غور سے دیکھتا ہے اور یوں کھل اٹھتا ہے گویا اس کے سامنے جنت کے دروازے کھل رہے ہوں۔ میز کے پاس جاتا ہے اور اونی پارچہ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی ناک اس کی اون پر رکھ دیتا ہے اور اس کا بوسہ لیتا ہے پھر کچھ بعد دونوں دستانوں کو چومتا ہے پنکھیا کا بوسہ لیتا ہے اور ایک کیف و سرور میں ڈوبی طویل کپکپاتی ہوئی آہ بھر کے تپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیتا ہے تاکہ حقیقت کو پل بھر کیلئے بھول کر سپنوں میں کھو جائے۔ پھر ہاتھ ہٹا لیتا ہے اور اپنی بیوقوفی پر آپ ہی آپ مسکرا کر ملامت سے سر ہلاتا ہے، اپنے بوٹ پر مٹی کا ایک چھپکا دیکھ پاتا ہے اور پھرتی سے بہ احتیاط اسے اپنے رومال سے پونچھ ڈالتا ہے۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دستی آئینہ اٹھا کر اپنی ٹائی کو پوری پوری احتیاط سے درست کرتا ہے۔ اور دوبارہ گھڑی دیکھ رہا ہوتا ہے کہ عورت بڑی گھبراہٹ میں داخل ہوتی ہے۔ وہ تھیٹر کے لئے بنی ٹھنی نظر آتی ہے قرینے سے بے سلیقہ اور پھوہڑ معلوم ہوتی ہے۔ بے شمار ہیرے پہنے ہوئے ہے۔ اور جوان اور خوبصورت نظر آنے میں کوشاں نظر آتی ہے، مگر سچ پوچھئے تو لباس اور تصنع کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ساؤتھ کنسنگٹن کی ایک بالکل معمولی سینتیس سالہ عورت ہے۔ جو جسمانی اور روحانی اعتبار سے نوجوان سے کہیں کم رتبہ ہے۔ جب وہ داخل ہوتی ہے تو نوجوان جلدی سے آئینہ وہیں رکھ دیتا ہے

نوجوان: (اس کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہوئے) آہ! آخر کار!

عورت۔ میں ذرا [illegible] ہو گئی!

نوجوان۔ کیوں؟ آخر کیا ہوا؟
عورت۔ میں نے تمہاری نظمیں پھاڑ ڈالیں۔
نوجوان۔ وہ تمہارے قابل ہی نہ تھیں، میں تمہارے لئے اور نظمیں
لکھوں گا،
عورت۔ نہیں شکریہ، بس میرے لئے اور نظموں وظموں کی ضرورت
نہیں، اُف میں بھی کتنی پگلی، جلد باز اور نادان تھی رہی!
نوجوان۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تمہاری اسی جلد بازی اور بچپنے
پن پر،
عورت۔ (بے صبری سے) اُف، پاگل نہ بنو، بے صبری! تم یہ نہیں دیکھتے
مجھ پر کیا بپتا آن پڑی ہے، اگر کسی نے یہ نظمیں دیکھ پائیں پڑھیں،
تو کہیں کی نہ رہوں گی، اُف لوگ کیا سوچیں گے:
نوجوان۔ یہی کہ ایک مرد ایک مرتبہ ایک عورت سے اس شدت سے
محبت کرتا تھا کہ پہلے کبھی کسی مرد نے نہیں کی تھی، لیکن وہ یہ نہیں
جان سکیں گے کہ وہ مرد تھا کون،
عورت۔ لیکن مجھے اس سے کیا؟ وہ یہ تو جان جائیں گے کہ وہ عورت کون تھی!
نوجوان۔ لیکن وہ آخر جائیں گے کیونکر؟
عورت۔ اے واہ، جائیں گے کیوں نہیں؟ میرے کمبخت، اللہ مارے
نام سے وہ سب پٹی نہیں پڑیں کیا؟ ہائے کیا ہی اچھا ہوتا اگر میرا
نام میری جین یا گلیڈیز میونیل، یا بی ایٹرس، یا فرانسسکا، یا گنی ویر
ہوتا، یا کوئی اور معمولی سا نام، لیکن آرورا! آرورا! میں لندن بھر
میں واحد آرورا ہوں، اور ہر کس و ناکس کو یہ علوم ہے، اور پھر اس
کے ساتھ قافیہ ملانا بھی تو بے حد آسان ہے! اُف، ہنری، کاش
کہ تم نے میری ہی خاطر جذبات کو ذرا قابو میں رکھا ہوتا، یا کچھ رازداری
ہی سے کام لیا ہوتا!
نوجوان۔ تمہارے نام نظمیں لکھوں اور قلم روک کر! یہ کہہ رہی ہو تم مجھ سے!

عورت۔ (دل رکھنے کو) بے شک، پیارے۔ یہ تمہاری بڑی نوازش تھی
پھر میں جانتی ہوں، میرا بھی اس میں اتنا ہی قصور تھا جتنا تمہارا۔
مجھے یہ تو سوچنا چاہیئے تھا کہ تمہارے گیت ایک بیاہتا عورت
نام لکھے ہی نہ جانے چاہیئے تھے۔
نوجوان۔ آہ! کاش وہ کسی بن بیاہی عورت کے نام ہوتے۔ ہائے کاش
عورت۔ اصل میں تمہیں ایسی خواہش کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا وہ کسی
بیاہی عورت کے علاوہ اور کسی کے قابل ہیں ہی نہیں۔ یہی تو مصیبت
ہے، او ری اللہ، میری نندیں کیا کہیں گی؟
نوجوان۔ (ذرا گھبراہٹ سے) تمہارے نندیں بھی ہیں؟
عورت۔ ہیں کیوں نہیں؟ تم سمجھتے ہو میں فرشتہ ہوں؟
نوجوان۔ (ہونٹ چباتے ہوئے) سمجھتا تو ہوں، مگر نہیں اف خدایا
معلوم نہیں اب ایسا سمجھتا ہوں یا پہلے ایسا سمجھتا تھا، اور یا
(جیسے سسکی روکتے ہوئے)
عورت۔ (پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے، ملائمت سے)
سنو تو، دیکھو نا تمہارے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ اور یہی کیا کم
کہ خوابوں کی سرزمین میں ہم تم ایک ساتھ رہے ہیں! پھر تم مجھے
چاہتے بھی رہے ہو، لیکن آخر اس میں بھلا میرا کیا قصور کہ میرے
شوہر کے رشتہ دار، دار کو تم ایک آنکھ نہیں بھاتے ہیں کہ نہیں
نوجوان۔ (خوش ہو کر) ارے ہاں ٹھیک ہے، وہ تو تمہارے شوہر کے
رشتہ دار ہیں، میں بھول ہی گیا، معافی چاہتا ہوں، آرورا (اپنے
تشکر سے اس کا ہاتھ اٹھا کر چومتا ہے۔ وہ تپائی پر بیٹھ جاتا
ہے۔ وہ میز کی طرف پشت کئے میز کے پاس ہی کھڑا ہے اور اس
کے چہرے پر پھیکی، کھسیانی سی مسکراہٹ کے آثار ہیں)
عورت۔ بات دراصل یوں ہے کہ ٹیڈی کے یہاں تو رشتہ داروں کے ع
کچھ اور ہیں ہی نہیں۔ اس کے آٹھ تو سگی ہی بہنیں ہیں، اور چھ رشتے

میزی، کتنے پیارے لڑکے ہو تم، لیکن [غم سے اُس کا ہاتھ پیچے دھکیلتے ہوئے] تمہارا فائدہ کیا، مجھے تو اس وقت ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو مجھے اس مخمصے سے نکال سکے۔

نوجوان۔ [پورے تیقن سے] عین وقت پر تمہارا دل تمہاری رہنمائی کریگا میں اس مسئلے پر گہرا غور کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ ہمیں زود یا بدیر کیا کرنا ہوگا۔

عورت۔ نہیں میزی، میں کوئی نامناسب بات نہ کرونگی، کوئی اونیٰ حرکت مجھ سے نہ ہوگی۔ [وہ تپائی پر بعد سے بیٹھ جاتی ہے، اور نہ ترغیب کے اثر سے بالاتر نظر آتی ہے]

نوجوان۔ اگر تم کوئی ایسی حرکت کرتیں، تو آسودہ ہی نہ ہوتیں، ہمارا رویہ انتہائی آسان، انتہائی دلیرانہ، اور انتہائی باہمیت اور صدق پسندانہ ہوگا ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور مجھے اس بات پر قطعاً شرم محسوس نہیں ہوتی۔ میں اس امر پر آمادہ ہوں کہ جاکر لندن بھر کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کر دوں اور اسی بیباکی سے جس سے میں عنقریب تمہارے شوہر کے سامنے اس بات کا اظہار کرنے کو ہوں، بشرطیکہ تم یہ مان جاؤ کہ تمہارے لئے اس سے باوقار آبرومندانہ رستہ اور کوئی نہیں، اور مجھے یقین ہے کہ تم عنقریب اس بات کو مان لوگی۔ آؤ ہم آج شام اکٹھے اپنے گھر چلے چلیں۔ بلا کسی رازداری اور شرمساری کے۔ یاد رکھو، تمہارا شوہر ہم پر کچھ نہ کچھ حق ضرور رکھتا ہے۔ ہم یہاں اُس کے مہمان ہیں۔ وہ ایک باعزت انسان ہے۔ وہ ہم پر مہربان رہا ہے۔ اور جہاں تک اُس کی خشک طبیعت اور اس کے پست تجارتی ماحول نے اسے اجازت دی ہے وہ شاید تم سے محبت بھی کرتا رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس حقیقت کی خبر اُسے کسی افترا پرداز کی زبانی نہ پہنچنے دیں۔ آؤ ہم اسی وقت، چپ چاپ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس کے پاس چلے چلیں اور اسے خیرباد کہہ آئیں۔ اور اس کے اس مکان میں سے بغیر کسی رازداری اور پوشیدگی کے نکل کھڑے ہوں۔ آزادی اور دیانت داری کے ساتھ، پوری عزت و آبرو

عورت۔ [اس کی طرف نظریں جماتے ہوئے] اور ہم جائیں گے کہاں؟

نوجوان۔ ہم اپنی عام، روزمرہ کی روش زندگی سے بال برابر بھی نہ ہٹیں گے جس وقت نظروں کے کھو جانے نے ہمیں فوری عمل پر آمادہ کیا اس سے پہلے ہم تھیٹر جا رہے تھے۔ ہم اب بھی تھیٹر ہی جائیں گے لیکن ہم تمہارے ہیرے جواہرات یہیں چھوڑ جائیں گے کیونکہ نہ تو انکی ضرورت ہے اور نہ ہمیں ہیروں کی کچھ حاجت ہی ہے

عورت۔ [مغموم ہو کر] میں تمہیں بتا چکی ہوں مجھے ہیروں سے نفرت ہے۔ یہ ہوس تو پیدا ہی کرتے ہیں کہ میں ان سے لدی پھندی رہوں مجھے سادگی کی تبلیغ کی ضرورت نہیں۔

نوجوان۔ جانِ من، میں کبھی ایسی بات ذہن میں بھی نہیں لایا! میں جانتا تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا بھی نہیں کرتیں۔ مگر میں کہہ رہا تھا ... ہاں یاد آیا۔ بس تو تھیٹر سے یہاں واپس آنے کی بجائے تم میرے ساتھ میرے گھر لوٹ آنا۔ جو اب سے ہمیشہ کے لئے ہم دونوں کا گھر ہوگا۔ اور مناسب وقت آنے پر، جب تمہیں طلاق مل چکے گی، تو جو بے مصرف قانونی کارروائی تم ضروری سمجھو گی وہ بھی ہم برداشت کر لیں گے، میں تو قانون کو کچھ وقعت نہیں دیتا۔ میری محبت قانون نے مجھ میں پیدا نہیں کی تھی۔ نہ یہ اس کی بدولت بڑھ یا گھٹ ہی سکتی ہے۔ یہ بڑی سادہ سی اور بڑی پیاری سی بات ہے۔ ہے نا [میز پر سے پھول اٹھاتا ہے] یہ رہے تمہارے پھول، ٹکٹ میرے پاس ہیں۔ گاڑی ہم تمہارے خاوند سے مانگ لیں گے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ہمارے درمیان کوئی رنجش اور کبیدگی نہیں۔ آؤ۔

عورت۔ [مری ہوئی آواز میں پھولوں کو بغیر نظر ڈالے پکڑتے ہوئے۔ اور
وقت گذارنے کی خاطر] ٹیڈی ابھی تک نہیں لوٹا،

نوجوان۔ خیر اس بات کو اطمینان سے طے کر لیں گے، آدمی الحال تھیٹر چلے
چلیں، اور جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور پس ہم اس کو سارا بات
... بیا ... یا اب سے تین گھنٹے بعد آج، بالکل۔ فرق ہی
کیا ... سب کچھ شرافت مندانہ طور پر شرم اور خوف کے
بغیر نہ جاسکے۔

عورت۔ تم نے ... کھیل کے ... ہیں، لوسینگزن نے،

نوجوان۔ لوسینگزن ... نے ... لیکن لوسینگزن کے سب ٹکٹ بک چکے
تھے [وہ تورت تھیٹر کے دو ٹکٹ نکالتا ہے]

عورت۔ پھر تم نے کس کھیل کے لئے ٹکٹ لئے؟

نوجوان۔ معاف یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟ لوسینگزن کے علاوہ آخر اور کھیل
نہ کہاں جسے ہم دونوں برداشت کر سکتے، سوائے کینڈڈا کے[1]

عورت۔ [یک دم گھبراتے ہوئے] کینڈڈا! نہیں، نہیں، ہنری
یہ تو نہیں وہاں جانے کی [پھولوں کو پانو پر پھینکتے ہوئے]
یہ سب اس کھیل کا کیا دھرا تو ہے۔ مجھے تو افسوس ہے میں نے
اسے دیکھا ہی کیوں۔ اس کی تو نمائش ہی بند کر دینی چاہئے۔

نوجوان۔ [تیزی سے] آرڈرا!

عورت۔ ہاں ہاں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

نوجوان۔ وہ ملکوتی نظم عشق و محبت! وہ نظم جس نے ہم دونوں کو ہمکلام
ہونے کی جرأت عطا کی! وہ جس نے ہم پر ان جذبات کو آشکارا
کیا جو ہم ایک دوسرے کی نسبت محسوس کرتے تھے! وہ —

عورت۔ ہاں، بالکل وہی! اس نے میری کھوپری میں وہ وہ لغویات
بھر دیں جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھیں۔ میں خود کو بالکل کینڈڈا
سمجھنے لگی تھی۔

نوجوان۔ [اس کے ہاتھ پکڑ کر گہری نظریں ڈالتے ہوئے] تم ٹھیک
سمجھتی تھیں، تم بالکل کینڈڈا ہی لگتی ہو۔

عورت۔ [اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے] ہنہہ! بالکل لغو! اور پھر میں
یوں محسوس کرنے لگی تھی کہ تم یوجین ہو۔ [ناقدانہ نظروں سے
جانچتے ہوئے] اب جو میں نے تم کو غور سے دیکھا ہے تو تم
واقعی یوجین ہی معلوم ہوتے ہو۔ [وہ اپنے آپ کو سب سے
نزدیک ترین کرسی پر گرا دیتی ہے۔ جو اتفاقاً پیانو کی نشست
ہوتی ہے، وہ اس کے پاس جاتا ہے]

نوجوان۔ [بڑے جوش سے] آرڈرا! اگر کینڈڈا کو یوجین سے محبت
ہوتی، تو وہ رات کے وقت بلا تامل اس کے ساتھ باہر چل
کھڑی ہوتی۔

عورت۔ [اتنے ہی جوش کے ساتھ] ہنری، جانتے ہو اس کھیل میں
کمی کس چیز کی ہے؟

نوجوان۔ اس میں کوئی بھی کمی نہیں ہے۔

عورت۔ ہے کیوں نہیں۔ اس میں ایک چارچینا کی کمی ہے۔ اگر اس
میں چارچینا ہوتی جو نت نئے فتنے کھڑے کر سکتی، تو وہ کھیل
ایک بالکل جیتی جاگتی دکھ بھری کہانی ہوتا۔ اب میں تمہیں
ایک ایسی بات بتاتی ہوں جو پہلے کبھی نہیں بتائی۔

نوجوان۔ وہ کیا؟

عورت۔ میں ٹیڈی کو اس کھیل میں لے گئی تھی۔ میرا خیال تھا، اس سے
اس کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر میں اسے سونے سے کسی طرح
باز رکھ سکتی تو ضرور ویسا ہی ہوتا۔ مگر چارچینا بھی ہمراہ تھی، اور
اس نے وہاں جو جو قبل مچائے ہیں۔ وہ سننے کے قابل تھے۔

[1] برنرڈ شا کا ایک کھیل

وہ کہہ رہی تھی: یہ قطعاً سراسر اخلاق سوز کھیل ہے۔ اور میں جانتی ہوں کس قسم کی عورتیں نوجوانوں کو آتشدانوں کے قریب بیٹھ کر محبت جتانے کی دعوت دیتی ہیں۔ وہ ٹیڈی کو اس بات کے لئے تیار کر رہی تھی کہ میری نسبت اس کے کان بھرے۔

جوان۔ جانم ہمیں جارجینا سے انصاف پسندانہ سلوک کرنا چاہیئے۔

رت۔ پہلے اُسے اس کا مستحق تو ہو لینے دو۔ جارجینا سے اور انصاف! واقعی؟

جوان۔ دراصل وہ دنیا کو دیکھتی ہی اس نظر سے ہے۔ اور یہی اس کی سزا ہے۔

رت۔ اے واہ! یہ اس کی سزا کیسے ہوئی جبکہ وہ اسے پسند کرتی ہے سزا تو مجھے ملے گی اور اس وقت جب وہ ٹیڈی کے سامنے نظلوں کا وہ پلندا لے آئے گی۔ کاش تم میں کچھ بھی عقل ہوتی۔ اور تم اس مصیبت میں مجھ سے ہمدردی کر سکتے۔

جوان۔ [پیانو سے ہٹتے ہوئے اور کسی قدر بے تابی سے ٹہلتے ہوئے] پیاری، میں جارجینا اور ٹیڈی کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ یہ سب رگڑے جھگڑے ایک ایسی سطح پہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں جہاں میں بقول تمہارے بالکل نکما ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اب نتائج سے بے پروا ہوں۔ آخر اس میں ڈرنے کی بات ہی کیا ہے؟ مشکل کونسی درپیش ہے جارجینا کر ہی کیا سکتی ہے؟ تمہارا شوہر کیا کر سکتا ہے؟ آخر کون ہے جو ہمارا کچھ بگاڑ لے گا؟

عورت۔ کیا تمہارا مطلب ہے کہ ہم بس ٹیڈی کے روبرو جا دھمکیں۔ اور صاف کہہ دیں کہ لو صاحب ہم تو یہ چلے؟

نوجوان۔ ہاں، اس سے آسان اور کونسا طریقہ ہو سکتا ہے؟

عورت۔ اور تم سمجھتے ہو کہ وہ پل بھر کے لئے بھی اسے برداشت کرے گا جیسے اس ڈرامے میں وہ بدھو سا پادری کرتا ہے؟ اُف، وہ تو تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔

نوجوان۔ [اچانک رکتے ہوئے۔ اور بہت اعتماد کے ساتھ] میری جان تم ان باتوں کو کیا سمجھو؟ اور سمجھو بھی تو کیونکر۔ ایک لحاظ سے میں اس کھیل کے شاعر کے بالکل برعکس ہوں۔ میں نے یونانی مثال کی پیروی کی ہے۔ اور اپنے جسم کی پرداخت سے کبھی بے پروائی نہ کی۔ اگر تمہارا شوہر دس سال چھوٹا ہوتا اور باقاعدہ مشق کر رہا ہوتا تو جب کہیں جا کر ایک معمولی دوسرے درجے کا ہیوی ویٹ مکہ باز ہو سکتا مگر موجودہ صورت حالات میں اگر کسی شدید ہیجان کی وجہ سے وہ بہت برانگیختہ ہو بھی جائے تو شاید پندرہ ایک سیکنڈ تک۔ تو کسی قدر مقابلہ کرے گا مگر زیادہ نہیں۔ لیکن میں بھی اس قدر پھرتیلا تو ہوں کہ پندرہ سیکنڈ تک اس کی پہنچ سے باہر رہ سکوں۔ اور بس اس کے بعد تو یوں سمجھو میں اس پر بالکل ہی غلبہ پا لوں گا۔

عورت۔ [اٹھ کے اس کے قریب جاتے ہوئے، سہم کر] غلبہ پا لینے سے کیا مراد؟

نوجوان۔ [نرمی سے] جان من! کیا کرو گی پوچھ کر؟ بہرحال تسلی رکھو تمہیں میرے متعلق قطعاً کسی تشویش کی ضرورت نہیں۔

عورت۔ اور ٹیڈی کے متعلق؟ کیا تمہارا مطلب ہے کہ تم میرے بیچارے ٹیڈی کو ایک وحشی کی طرح پیٹ ڈالو گے؟

نوجوان۔ پیاری، یہ سب تشویش غیر ضروری ہے۔ یقین رکھو کچھ بھی نہیں تمہارا شوہر جانتا ہے کہ میں خود کو بچا سکنے کے قابل ہوں۔ ایسے حالات میں کبھی کچھ واقع نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ میں خود تو کچھ کروں گا نہیں۔ جو آدمی کبھی تم سے محبت کرتا تھا، وہ میرے نزدیک مقدس ہے۔

عورت۔ [تیزی سے] تو کیا وہ اب بھی مجھ سے محبت نہیں کرتا؟ کیا اُس نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟

ہیں ہیں ایک شریف آدمی کی طرح پیش آنے کو تیار رہوں۔ مگر اتنا تو بتایئے کہ آخر کیونکر؟

عورت۔ (کچھ سہم کر) شکریہ ہینری، میں جانتی تھی تم ضرور مان جاؤ گے، تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟ نہیں ہونا؟

نوجوان۔ ہاں، ہاں مجھے جاؤ، مجھے کچھ بتاؤ تو سہی جس پر میں غور کر سکوں، ورنہ میں، ورنہ میں — (وہ یکایک اس کی پنکھیا جھپٹ لیتا ہے اور مٹھیاں بھینچ کر اسے توڑ ڈالنا چاہتا ہے)

عورت۔ (دوڑ کر پنکھیا کو اچک لینے کی کوشش کرتے ہوئے، اور نعرہ سے چلاتے ہوئے) مت توڑنا میری پنکھیا، نہیں نہیں، ایسا نہ کرو۔ (وہ جیسے جیسے پنکھیا اس کی مٹھی سے نکالتی جاتی ہے۔ وہ اپنی گرفت ڈھیلی کئے جاتا ہے) یہ بڑی بیہودہ بات ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتی، تمہیں اس کا حق ہی کیا ہے (وہ پنکھیا کھول کر کیا دیکھتی ہے کہ چند ایک تیلیاں ٹوٹ چکی ہیں) اُف! ذرا تو سوچا سمجھا ہوتا۔

نوجوان۔ معاف کرنا، میں تمہیں نیا پنکھا خرید دوں گا۔

عورت۔ (چڑ کر) تم کبھی ایسی پنکھیا حاصل نہیں کر سکو گے، اور یہ پنکھیا تو میری خاص دل پسند تھی۔

نوجوان۔ (دکھاوے سے) بس تو پھر تمہیں اس کے بغیر ہی گذارہ کرنا پڑیگا۔

عورت۔ میری منظورِ نظر پنکھیا کو مروڑ کر ایسی باتیں تمہیں بڑی زیب دے رہی ہیں، ہے نا؟

نوجوان۔ اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ میں ٹیڈی کی منظورِ نظر بیوی کو مروڑ ڈالنے کے کس قدر قریب تھا تو تم شکر گذار ہوتیں کہ تم اس وقت زندہ ہو، بجائے اس کے کہ — کہ کوڑی بھر ہاتھی دانت کے لئے یوں بک جھک رہی ہوتیں، جہنم میں جائے تمہارا پنکھا!

عورت۔ اوئی! میرے سامنے اس قسم کی تو تکار اور لام کاف! گویا تم میرے شوہر ہی تو لگتے ہو،

نوجوان۔ (پھر سے تپائی پر گرتے ہوئے) آہ! یہ تو کوئی بھیانک سپنا ہے۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تم میری آرورا نہیں ہو،

عورت۔ ہوں، اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں بتاؤ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ اگر میں جانتی کہ تم ایسے آفت کے پرکالے ہو تو کیا میں تمہیں چل نکلنے کی شہ دے دیتی؟

نوجوان۔ نہیں نہیں، مجھے پستیوں کی جانب مت کھینچو، مجھے پھر سے بلندیوں پر چڑھنے میں مدد دو۔

عورت۔ (اس کے پاس گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے، ملتجیانہ) ہینری! تو سوچو، اس بات ہی کو مدِ نظر رکھو کہ میں تباہی کے گڑھے کے عین کنارے پہ کھڑی ہوں، اب تو یہ کہنا بند کرو کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔

نوجوان۔ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

عورت۔ (اکتاہٹ سے یکدم کھڑے ہوتے ہوئے) اگر تم نے پھر یہ بات کہی تو میں کوئی ایسا کام کر گذروں گی جس پر میں بعد میں پچھتاؤں۔ ہم اس وقت ایک ڈراؤنے کھڈ کے بالکل کنارے پر کھڑے ہیں۔ مانا کہ یہ بڑا آسان ہے کہ ہم دوسری طرف چھلانگ جائیں اور قصہ ہی تمام کر ڈالیں لیکن کیا اس سے بہتر کوئی حل نہیں ہے؟

نوجوان۔ میں اب کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ ایک سرد اور سیاہ سایہ چھا چکا ہے اور میں اپنے خوابوں کی بستی کے کھنڈروں کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ (ایک گہری آہ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

عورت۔ کچھ بھی نہیں؟ مگر میں تو دیکھ سکتی ہوں، میں دیکھ سکتی ہوں کہ وہ لفظیں ٹیڈی کی آنکھوں کے آگے ٹھونس رہی ہے۔ (پورے عزم کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے) ہینری! ایپ جا میں تمہیں بتا دوں کہ یہ سب تمہارے ہی کرتوت ہیں، اور اب اس الجھن سے مجھے نکالنا تمہارا ہی کام ہے۔

نوجوان۔ (خوش خلقی اور نا امیدی سے) میں تو یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ

تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا؟

عورت۔ کیا آرورا نام کی کسی اور عورت سے تمہاری جان پہچان ہے؟

نوجوان۔ نہیں۔

عورت۔ اس۔ بلی جیسی احمقانہ نہیں سے کام نہیں چلے گا۔ تمہیں کسی نہ کسی آرورا کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی نکالنا ہوگا۔

نوجوان۔ تم پھر بھی نہیں کہ ساری دنیا میں تمہیں واحد آرورا ہو۔ اور [ہیجان جذبات سے یکایک حود کر آنے پر بھینچی ہوئی مٹھیاں بلند کرتے ہوئے] بخدا! میرے لئے تو ساری دنیا میں تم ہی ایک آرورا ہو۔ [اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اور چہرہ ڈھانپ لیتا ہے۔

عورت۔ [اُسے تھپکتے ہوئے] ہاں ہاں، پیارے ٹھیک ہے۔ یہ تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ یقین مانو میں اس بات کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔ اب ذرا غور سے میری بات سنو۔ میرا خیال ہے تمہیں ساری نظمیں زبانی یاد ہونگی۔

نوجوان۔ ہاں سب یاد ہیں [سر اٹھا کر ایک فوری شبہے کے ماتحت اس کی طرف تکتے ہوئے] تو کیا تمہیں یاد نہیں؟

عورت۔ بھئی اللہ! وہ کمبخت تو سدا ہی میرے حافظے سے اتر جاتے ہیں اور پھر میں کام کاج میں بھی کچھ ایسی لگی رہی کہ ان سب کو پڑھنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ ویسے میرا پکا ارادہ ہے کہ جونہی نظمیں واپس ملیں، میں انہیں پڑھ ڈالوں، تمہارے ہی سر کی قسم ہیری، لیکن اب کوشش کر کے بڑی احتیاط سے انہیں دھیان میں لاؤ۔ سوچو تو بھلا ان میں کسی جگہ ٹیپس کا نام بھی آتا ہے۔

نوجوان۔ [جھنجلا کر] نہیں تو،

عورت۔ پورا یقین ہے۔؟

نوجوان۔ ہاں ہاں۔ اچھی طرح سے۔ میں بھلا نظم میں ایسا نام استعمال ہی کیسے کر سکتا تھا۔

عورت۔ خیر مجھے تو اس کی ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ٹیپس بے بہر کا ہوتا ہوا قافیہ ہے۔ جو اس وقت مجھ پر بہت اچھی طرح سے واضح ہو رہا ہے۔ مگر تم شاعر ہو اور بہتر جانتے ہوگے۔

نوجوان۔ خیر اس سے کیا۔ اچھا پھر؟

عورت۔ اے واہ! اس سے کیا کیوں؟ اس سے تو بہت کچھ ہوگا۔ مگر اگر ان نظموں میں ٹیپس وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں آتا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی اور آرورا کے نام لکھی گئی تھیں۔ اور تم کہنا تم نے مجھے اس لئے دکھائی تھیں کہ میرا نام بھی آرورا ہی ہے۔ بہرحال تمہیں اس موقع کے لئے کوئی اور آرورا گھڑنا ہی پڑے گی۔

نوجوان۔ [بہت سرد مہری سے] ہاں اگر تم مجھ سے جھوٹ ہی کہلوانا چاہتی ہو۔

عورت۔ بالکل! ایک عزت والے شریف آدمی ہوتے ہوئے تم ایسے موقع پر سچ بول ہی کیسے سکتے ہو! ٹھیک ہے نا؟

نوجوان۔ اچھا یوں ہی سہی، مگر تم نے میری روح کو کچل ڈالا ہے اور میرے پاکیزہ خوابوں کو ملوث کر دیا ہے۔ ہاں میں جھوٹ بولوں گا۔ اپنی بات پر اڑ جاؤں گا اور اسے اپنی عزت کا سوال بنا دوں گا، ڈرو مت، میں اپنی شرافت کا بھرم قائم رکھوں گا۔

عورت۔ ہاں، اب تو یہ سارا الزام تم میرے ہی سر تھوپو گے نا۔ بھی بھی اتنا بھی کوئی کیا کرے گا!

نوجوان۔ [بڑی کوششوں سے اٹھتے ہوئے] آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں، مسز ٹیپس، میں معافی چاہتا ہوں مجھے یوں معلوم ہوتا ہے گویا میرے عضو عضو میں کھنچاؤ سا پیدا ہو رہا ہے۔

عورت۔ کھنچاؤ؟ کیسا کھنچاؤ؟

نوجوان۔ رومانی لڑکپن سے شک خوردہ پن تک پہنچنے میں عموماً بیس سال لگتے ہیں۔ مگر جب یہ عرصہ پندرہ منٹ کے وقفے میں سمٹ

آستہ تو رفتار ترقی ضرورت سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور نتیجۃً اعضا میں کھنچاؤ اور دردِ نمو پیدا ہو جاتا ہے۔

عورت ۔ اے فوج! اس وقت بھی انہیں چوچلے سوجھ رہے ہیں۔ تم ابھی ابھی کہہ نہیں چکے کہ اب تم پوری مفلسی دکھاؤگے اور ایکا منہ بنا کر نیڈی سے کہہ دوگے کہ تم دراصل کسی اور آرورا کو چاہتے ہو۔

نوجوان ۔ ہاں، اب میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ میں سچ بھی بولتا تو ایسے ہی تک سب کچھ کہہ دیتا۔ اور اب جھوٹ بھی بولوں گا تو وہ سرتا سر جھوٹ ہوگا۔ میں چٹخارے بھر بھر کے اپنی عزت اور آبرو کا بھرم باندھوں گا۔

عورت ۔ پیارے میں جانتی تھی تم ایسا ہی کروگے۔ میں ۔ شی: [دوڑکر دروازے کے قریب پہنچتی ہے۔ اور کواڑ کھول کے دم بخود ہو کر سنتی ہے]

نوجوان ۔ کون ہے؟

عورت ۔ [خوف سے سفید پڑتے ہوئے] نیڈی، میں سنتی ہوں۔ وہ ننھے ہیرو ٹیبر کو جھٹک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا ذہن دھول سے خالی ہے ورنہ وہ کبھی ایسا نہ کرتا، شاید جارجینا نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ [پیچھے سے واپس انگیٹھی کی طرف آجاتی ہے] دیکھو تم یوں نظر آؤ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اور ہاں مجھے میرے دستانے تو پکڑا نا، جلدی کرو۔ [وہ دستانے اسے دے دیتا ہے۔ عورت ایک دستانہ تیزی سے چڑھا لیتی ہے اور دکھاوے کی بے پروائی سے اس کے بٹن بند کرنے لگتی ہے] تم مجھ سے دور کھڑے ہو جاؤ۔ ذرا ایک سے۔ [وہ کان دبائے چپ چاپ ہٹتا چلا جاتا ہے۔ جتنی کہ پیانو اس کے رستے میں حائل ہوتا ہے] اتنے میں اپنے دستانے کے بٹن لگاؤں، تم گنگناتے رہو۔ اس طرح تمہارے خیال میں کیا یہ۔۔

نوجوان ۔ یہ ڈراما اپنی پوری قیطنت کا مظاہرہ کر رہا ہوگا۔ خدا کے لئے یہ دستانہ دستانہ اٹھا رکھو، مسز بیلیس تم اس میں بالکل گھڑی ہوئی ہو۔

اس کا شوہر اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک صحت مند، قریۂ نوک پلک سے درست قسم کا آدمی ہے۔ اس کی ٹھوڑی مضبوط۔ آنکھوں سے کچھ حماقت، اور منہ سے زود یقینی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہنسا سا نظر آتا ہے۔ مگر ناراض نظر نہیں ہوتا بلکہ معاملہ کسی قدر۔

اُس کا شوہر ۔ ارے! آپ لوگ یہیں ہیں، میں سمجھا آپ تو چلے ہونگے۔۔

عورت ۔ ٹیڈی، میں تمہارے متعلق پریشان ہو رہی تھی، تم شام کے لئے گھر کیوں نہ آسکے؟

اُس کا شوہر ۔ مجھے جارجینا نے بلا بھیجا تھا۔

عورت ۔ بیچاری جارجینا پیاری! مجھے افسوس ہے میں پچھلے ہفتے کے ہاں نہ جا سکی۔ خیریت سے تو تھی؟

اس کا شوہر ۔ ہاں ہاں، بس میری ۔۔ اور تمہاری ۔ خیریت پوچھنے کے لئے ملنا چاہتی تھی۔ [وہ سہم کر دزدیدہ نظروں سے پینز کو تکتی ہے] ہاں، یاد آیا، ایچان بھئی مجھے تم سے آج ایک باتیں کہنی ہیں، لیکن اگر آرورا تمہیں کچھ دیر کے لئے سکے تو،

نوجوان ۔ [تکلفانہ] بندہ حاضر ہے،

اس کا شوہر ۔ نہیں، جلدی کاہے کی ہے۔ تھیٹر کے بعد سہی۔

نوجوان ۔ ہم نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اس کا شوہر ۔ اوہ! اچھا تو پھر ذرا میری گرم گرم کنیا میں نہیں؟

عورت ۔ اے ہے، تم کیوں جاؤ، میں ہی جا کر جواہرات کو سا بند کرنے آتی ہوں، تھیٹر تو اب جا نہیں رہے۔ وہ ذرا میری چیزیں تو پکڑا نا۔

ا شوہر۔[اس کو سرکا پارچہ اور آئینہ دیتے ہوئے] ہاں! یہاں ہم زیادہ آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔

ن۔[ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے، اور شانے جھٹک کر پھیلاتے ہوئے] ہاں، جگہ ذرا کشادہ ہی ہو تو بہتر رہے گا۔

کا شوہر۔ اچھا تو بھئی اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو ذرا ــــ

نت۔ نہیں تو۔ [چلی جاتی ہے]

جب دونوں مرد تنہا رہ جاتے ہیں تو لپس اعتبا طسے نظموں کو جیب سے نکالتا ہے، اور غور سے انہیں دیکھنے لگتا ہے پھر ہنیری کی جانب اٹھاتا ہے اور اس طرح اس کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ ہنیری یوں ظاہر کرتا ہے گویا کچھ نہ سمجھا ہو، اور پوری کوشش ہے کہ ان چیزوں سے لاتعلق نظر آئے۔

کا شوہر۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں آیا آپ ان مخطوطات سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔؟

ان۔ مخطوطات؟

کا شوہر۔ ہاں، کیا آپ ذرا غور سے انہیں ملاحظہ کریں گے؟

[وہ انہیں ہنیری کی ناک تلے لے جاتا ہے]

ان۔[گویا ناگہانی انکشاف کے مسرور کن تحیّر کے ساتھ] اخاہ! یہ تو میری ہی نظمیں ہیں۔

کا شوہر۔ خیال تو میرا بھی یہی ہے۔

ان۔ کیسی شرم کی بات ہے کہ مسز لپس نے یہ نظمیں آپ کو دکھا ڈالی ہیں۔ آپ مجھے بالکل گدھا سمجھ رہے ہونگے۔ یہ نظمیں میں نے کئی برس ہوئے لکھی تھیں، جب میں نے شوتن برن کے "پو پھٹے کے گیت" پڑھے تھے، معلوم نہیں اس وقت میرے دل میں کیا سمائی کہ میں نے طلوع سحر کے متعلق کتنے ہی گیت گھسیٹ ڈالے، آرورا، آپ جانتے ہیں نا وہی گلابی انگلیوں والی آرورا، وہ صبح کی دیوی یہ سب نظمیں اسی آرورا ہی کے متعلق ہیں۔ جب مسز لپس نے بتایا کہ ان کا نام بھی آرورا ہے تو میں یہ نظمیں انہیں پڑھنے کو دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن میں نے یہ ہرگز نہ کہا تھا کہ وہ آپ کی بے مہر نظروں کے سامنے بھی لائی جائیں۔

اس کا شوہر۔[کھسیانا ہو کر] ایپ جان، بڑے چلتے پرزے ہو، تم بنتے تو شعر و ادب کے رسیا ہو، اور ایک دن آئے گا کہ ادبی اور شاعر ہمیں اپنے درمیان پاکر فخر کیا کریں گے۔ میں تم سے کہیں زیادہ سن رسیدہ آدمیوں سے اس سے کہیں پھسپھسی کہانیاں سن چکا ہوں

نوجوان۔[بڑی ہی حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے] کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں؟

اس کا شوہر۔ کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ میں آپ پر اعتبار کر لوں؟

نوجوان۔ تو اور کیا! میں سمجھا نہیں،

اس کا شوہر۔ ابی ہٹاؤ، یونہی اپنی کارگزاری پہ پانی پھیر رہے ہو۔ ایپ جان میرا خیال ہے تم معاملے سے اچھی طرح واقف ہو۔

نوجوان۔ یقین جانئے۔ میں خاک بھی نہیں سمجھ سکا۔ آپ ذرا وضاحت سے بیان نہیں کر سکتے؟

اس کا شوہر۔ بھئی زیادہ مروت، خیر کہتے ہو تو اتنی وضاحت کئے دیتا ہوں کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ نظمیں یوں بھی ظاہر ہو سکتی ہیں گویا ان میں ایک جیتی جاگتی عورت کو نہیں بلکہ ایک ٹھنڈے ٹھٹھرتے وقت کو مخاطب کیا گیا ہو۔ اور وہ وقت بھی ایسا جب تم اپنی زندگی بھر میں شاید ہی کبھی اپنے بستر ہی سے نکلے ہو، تو اتنا سمجھ لو کہ تم اپنی شعری صلاحیتوں کے ساتھ کوئی انصاف نہیں کر رہے۔ اور یاد رکھو کہ میں ان صلاحیتوں کا اتنا ہی معترف اور مداح ہوں جتنا کوئی اور شخص۔ چلو اب مان بھی لو نا کہ یہ نظمیں تم نے میری بیوی ہی کے نام لکھی ہیں۔ ہاں، [ایک اندرونی نزاع ہنیری کو جواب دینے سے روکتی ہے]

تباؤ، اسی کے نام لکھی تھیں نا؟ [وہ نظموں کو میز پر پھینک دیتا ہے، انگیٹھی کے پاس جا کر ڈٹ کے بیٹھ جاتا ہے، اور پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے نتیجے کا انتظار کرتا ہے]

نوجوان۔ [جذباتی انداز میں اور محتاط ہو کر] مسٹر بپس، میری بات کا یقین کیجئے، آپ غلطی پر ہیں۔ میرے لئے یہ کہنا لاحاصل ہے کہ مسز بپس ایک پاکباز خاتون ہیں، جو کبھی میری نسبت کوئی خیال بد ذہن میں نہیں لائیں، رہا یہ واقعہ کہ انہوں نے میری نظمیں آپ کو دکھائی ہیں۔ . . . .

اس کا شوہر۔ یہ امر واقع نہیں ہے۔ مجھے یہ نظمیں اس کے علم کے بغیر ملی ہیں۔ اس نے مجھے نہیں دکھائیں۔

نوجوان۔ کیا یہی بات ان نظموں کی تعلی معصومیت کو ثابت نہیں کرتی؟ جونہی ان کو آپ کے اس باطل خیال کا علم ہوتا وہ فوراً آپ کو یہ نظمیں دکھا دیتیں۔

اس کا شوہر۔ [متنزلزل ہوتے ہوئے] اے میاں! کچھ تو انصاف کرو، اپنی ذہنی صلاحیتوں سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔ کیا تمہارا مطلب ہے کہ میں واقعی چغد بن رہا ہوں؟

نوجوان۔ [گرمجوشی سے] یقین مانئے آپ واقعی اس فعل کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ میں آپ کو دل پر ہاتھ رکھ کر، اپنی شرافت کے نام سے یقین دلاتا ہوں کہ عام رفعت و احترام کے علاوہ میرے دل میں مسز بپس کے متعلق کوئی جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔

اس کا شوہر۔ [رکھائی سے، اور پہلی مرتبہ کبیدہ خاطر ہو کر] ہوں! واقعی! [وہ آتشدان سے اٹھ کر میز کی طرف آنا شروع کرتا ہے اور بڑھتی ہوئی خفگی سے، سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتا ہے]

نوجوان۔ [اپنی غلط بیانی کے اس اثر میں اضافہ کرنے کی خاطر جلدی سے] مجھے کبھی خواب میں بھی اُن کے متعلق نظمیں لکھنے کی نہ سوجھی تھی۔ یہ بات ہی لغو ہے،

اس کا شوہر۔ [لال پیلا ہوتے ہوئے] کیا بات لغو ہے!

نوجوان۔ [ٹالنے جھجکتے ہوئے] خیر کچھ معاملہ ہی ایسا ہے کہ بس، بپس کا مداح نہیں ہوں۔۔۔ ان معنی میں

اس کا شوہر۔ [میز پر جھڑ ہ سا دوستہ ہوتے] میں تجھے بتا دیتا ہوں کہ مسز بپس کی تعریف تجھ سے کہیں بہتر انسان کر چکے، الٹی کھوپری کے گدھے کہیں کے، تجھ سے کئی درجہ بہتر انسان۔

نوجوان۔ [بھونچکا سا ہو کر] میری اس طرح بے عزتی کرنے کی ضرورت نہیں اپنی شرافت کی قسم ۔۔۔

اس کا شوہر [جواب سننے کی تاب نہ لاتے ہوئے، اور میز کو پرے کی طرف دھکیلتے ہوئے] تم مسز بپس کے مداح نہیں ہو! تمہیں خواب میں بھی اس کے نام نظمیں لکھنے کی نہیں سوجھی! میری تمہارے لئے قابلِ اعتنا ہی نہیں؟ ہیں؟ [تندی سے] تم ہو، تپا تو چلے۔ آخر تم میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے۔

نوجوان۔ مسٹر بپس، میں آپ کے فخر و حسد کا لحاظ کرتے ہوئے

اس کا شوہر۔ فخر و حسد! تمہارا خیال ہے میں تم سے حسد کرتا ہوں؟ تم جیسے دس آدمیوں کی بھی پروا نہیں، لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہاں کھڑا تمہارے منہ سے اپنی بیوی کی توہین ہوتے سنتا رہا اور وہ بھی اُسی کے مکان میں، تو تم سخت غلطی پر ہو۔

نوجوان۔ [اس حالت سے کہ وہ خود تو پیانو سے پیٹھ لگائے ہوئے اور بڈھی سر ہی پر چڑھا آ رہا ہے، غیر مطمئن ہوتے ہوئے] ا- میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ ذرا ہوش کے ناخن لو، یقین مانو، بپس سے میرے تعلقات بالکل غیر جذباتی قسم کے ہیں۔

اس کا شوہر۔ [حقارت سے] پھر سے کہنا، پھر سے تو کہنا، فخر و حسد۔ فخر و حسد! تف! دُموں ایک لات؟

ہینری اچانک اس داؤں سے کام لیتا ہے جسے پہلوان غچہ دینا
اور وہ ٹیڈی کے ساتھ رُخ بدل لیتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ٹیڈی،
ہینری کے درمیان آ جاتا ہے۔

ٹیڈی: میں اب یہ بے ہودگی ہرگز برداشت نہیں کروں گا

شوہر: ہُنہ! تو تمہاری رگوں میں بھی کچھ خون دوڑ رہا ہے۔ بہت
خوب۔

ہینری: عجب تماشا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مسز ہیپ بالکل۔

شوہر: بھلا یہ تو معلوم ہو تم مسز ہیپس کو سمجھتے کیا ہو؟ سنو میں خود
نہیں بتاتا ہوں مسز ہیپس کون ہے۔ مسز ہیپس ساؤتھ کنسنگٹن کے
سب سے سلجھے ہوئے حلقے کی سب سے سلجھی ہوئی عورت ہے
اور وہ حسین ترین، عقیل ترین، اور ان تجربہ کار لوگوں کی نظر میں جو
اچھی چیز کو دیکھ کر پہچان سکتے ہیں، جذبات انگیز ترین عورت ہے
خواہ تم جیسے احمق، بدخو و غلط، بھاڑے کے ٹکٹ بند گدھے جن کی
نظر میں کوئی چیز جچتی ہی نہیں، اس کو کچھ بھی سمجھتے ہوں۔ اس کی
خوبیاں سب مشہور آدمی تسلیم کر چکے ہیں۔ اور اگر تم ان خوبیوں کو
نہیں سمجھ سکے تو یہ تمہاری گنامی کی دلیل ہے۔ صف اول کے تین ایکٹر
مینجر اس کو سو پونڈ فی ہفتہ کی تنخواہ کی پیشکش کر چکے ہیں بشرطیکہ
وہ ان کے معلوماتی تھیٹر کی سٹیج پر آنا منظور کر لے، اور مجھے یقین ہے
وہ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں تم سے زیادہ دیکھ بھال کے کرتے ہیں
موجودہ کابینہ کا وہ واحد ممبر جسے ہم خوش شکل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے
ساتھ ناچنے کی خاطر کاروبارِ سلطنت تک سے بے پرواہی برت چکا
ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کا اٹھنے بیٹھنے والا بھی نہیں ہے۔ اور پھر بیڈفورڈ
پارک کے اولین پیشہ ور شعراء میں سے ایک اس کے نام گیت لکھ
چکا ہے جو تمہاری تمام تک بندیوں سے بہتر ہے۔ ایسے ہی پارسال
ایسکاٹ میں ایک ڈیوک کے بیٹے نے محض اس وجہ سے میرے
ہاں آنا مناسب نہ سمجھا کہ مسز ہیپس کے متعلق اس کے جذبات اس
کے اس فرض کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے تھے جو بحیثیت میزبان
ہونے کے میرے متعلق اس پر عائد ہوتا تھا۔ اور اس بات سے
اس کی اور میری دونوں کی عزت افزائی ہوئی۔ لیکن [بڑھتے ہوئے
جوش و غضب کے ساتھ] معلوم ہوتا ہے مسز ہیپس تمہارے لائق ہی
نہیں ہے۔ تم اسے سرد مہری اور لاتعلقی کی نظر سے دیکھتے ہو۔ اور
پھر یہ سب کچھ تم بے شرمی سے میرے ہی منہ پر کہہ رہے ہو بدتمیز
کہیں کے۔ گھونسا مار کے تیری ناک نہ چپٹی کر دوں تو سہی۔ ارے ایک
سلجھی ہوئی عورت کا تجھ سے تعارف کرانا تو بھینسے کے آگے بین
بجانا ہے [چنگھاڑتے ہوئے] سن رہا ہے ابے او بھینسے؟

نوجوان: [بڑی ہی کج بد خلقی سے] ایک دفعہ پھر تو کہنا مجھے بھینسا۔ وہ
ٹکر دوں گا جبڑے پر کہ بتیسی باہر آ جائے گی۔

اس کا شوہر: [تڑپ کر] کیا کہا۔۔؟

وہ ہینری پر ارنے بھینسے کی سی تندی کے ساتھ جھپٹ کر ٹوٹ پڑتا
ہے۔ ہینری ایک مشاق کمہ باز کی طرح چوکس ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور
پھرتی سے پیچھے ہٹ آتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس تپائی کو بھول جاتا ہے
جو اس کے پیچھے ہی رکھی ہے۔ وہ پیٹھ کے بل اس پہ گر پڑتا ہے اور اس
حالت میں غیر ارادی طور پر تپائی کو ٹیڈی کی ٹانگوں کے بیچ میں دھکیل
دیتا ہے۔ ٹیڈی آگے کی طرف لڑکھڑا کر زمین پر آ رہتا ہے۔ مسز ہیپس ایک
چیخ کے ساتھ کمرے میں در آتی ہے اور بچھڑے ہوئے پہلوانوں کے
درمیان آ کر فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ تاکہ اپنا دایاں بازو اپنے شوہر کی گردن
میں حائل کر سکے۔

عورت: مت لڑنا ٹیڈی، اس سے ہرگز مت لڑنا۔ تمہیں وہ جان سے
مار ڈالے گا۔ وہ دنگل کا لڑنے والا ہے۔

اس کا شوہر: [منتقمانہ] میں اسے بھرے دنگل میں پچھاڑ ڈالوں گا۔

[اپنی بیوی کی گرفت سے نکلنے کی بے سود کوشش کرتا ہے]

عورت۔ ہنیری، اسے اپنے ساتھ مت لڑنے دو۔ قسم کھا کر کہو کہ تم اسے لڑنے سے باز رکھو گے۔

نوجوان۔ [افسوس سے] میری چاند پر ایک بڑا گومڑا ابھر آیا ہے۔ [اٹھنے کی کوشش کرتا ہے]

عورت۔ [بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے کوٹ کا پچھلا سرا پکڑ کر اُسے پھر پیچھے کھینچتے ہوئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے ہاتھ سے ٹیڈی کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے] نہیں پہلے قسم کھاؤ، تم دونوں ہی قسم کھاؤ [ٹیڈی اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ اُسے پھر واپس کھینچ لیتی ہے] ٹیڈی، وعدہ کرتے ہو نا؟ ہاں، ہاں شاباش کھا بھی لو قسم!

اس کا شوہر۔ ہرگز نہیں، جب تک وہ سب الفاظ واپس نہ لے۔

عورت۔ وہ لے لے گا۔ ضرور لے لے گا، ہنیری تم اپنے الفاظ واپس لیتے ہو نا ― ہاں، ہاں کہہ دو نا،

نوجوان۔ [وحشیانہ] ہاں، میں واپس لیتا ہوں [وہ اس کا کوٹ چھوڑ دیتی ہے۔ نوجوان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی ٹیڈی بھی] میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، سب کے سب اور پوری طرح سے

عورت۔ [قالین پر سے] اور مجھے نہیں اٹھاتے گا کوئی؟ [دونوں ایک ایک ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھاتے ہیں۔] لو، اب تم دونوں ہاتھ بھی ملا کے اپنی بے غلطی کا ثبوت نہ دو گے؟

نوجوان۔ [بے پروائی سے] میں ایسا کوئی فعل کرنے پر تیار نہیں۔ میں نے فقط تمہاری خاطر سے جھوٹ کا یہ طومار کھڑا کیا تھا۔ اور تم دیکھ ہی رہی ہو اس کا صلہ مجھے کیا ملا ہے۔ چندیا پر شلغم کے برابر ایک بڑا گومڑا! اور اب میں بالکل لگی لپٹی رکھے بغیر سب کچھ سچ سچ کہہ دوں گا۔

عورت۔ ہنیری، خدا کے لئے . . . .

نوجوان۔ سب بیکار، تمہارا شوہر ایک گدھا اور وحشی ہے۔

اس کا شوہر۔ کیا کہا؟

نوجوان۔ میں کہتا ہوں تم ایک گدھے اور درندے ہو۔ اور اگر تم میرے ساتھ ذرا باہر چلو تو میں یہی الفاظ پھر کہنے کو تیار ہوں [ٹیڈی مقابلے کے لئے کوٹ اتارنا شروع کرتا ہے] میں کہے دیتا ہوں کہ وہ نظمیں تمہاری بیوی ہی کے نام لکھی گئی تھیں، ان کا ایک ایک لفظ تمہاری بیوی اور صرف تمہاری بیوی کے نام تھا [بمپس کے چہرے سے تندی کے آثار دور ہو جاتے ہیں، اور وہ شاداں کوٹ پھر سے پہننے لگتا ہے] میں نے یہ نظمیں اس لئے لکھی تھیں کہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ میں اسے دنیا کی حسین ترین عورت سمجھتا تھا اور میں یہ بات اس سے بیسیوں مرتبہ کہہ چکا ہوں میں اس کی پرستش کرتا تھا۔ سنتے ہو؟ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ تم ایک بیہودہ بنئے ہو۔ اور اس کے بالکل قابل نہیں ہو۔ اور تم ہو بھی ایسے ہی۔

اس کا شوہر۔ [اس قدر ممنون ہوتا ہے کہ اپنے کانوں پر اعتبار نہیں کر سکتا] تمہارا فی الواقع یہی مطلب ہے؟

نوجوان۔ ہاں ہاں، واقعی میرا یہی مطلب ہے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ میں نے مسز بمپس سے کہا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کے میرے ساتھ چلی چلے۔ اور تم سے بالکل الگ ہو جائے۔ تم سے طلاق لے لے اور مجھ سے شادی کر لے۔ میں نے اس کی منتیں کیں، التجائیں کیں، کہ وہ اسی رات چلی چلے، اور صرف اس کا انکار ہی ہمارے سب تعلقات کے خاتمے کا باعث ہوا۔ [اس پر بڑی ہی تحقیر آمیز نظریں ڈالتے ہوئے] خدا ہی جانتا ہے۔ اُسے تم میں کونسی خوبی نظر آتی ہے؟

اشوہر۔[ندامت کی تصویر بن کر] اُف عزیز من! تم نے پہلے ہی انہیں یہ بتا دیا میں معافی کا خواستگار ہوں۔ چلو غصہ تھوک دو، آؤ ہاتھ ملائیں۔ ڈارلنگ، ان سے کہو مجھ سے ہاتھ ملائیں۔

نے ہینری میرا جی دل رکھ لو، آخر وہ میرا شوہر ہے۔ اسے معاف کر دو۔ ہوا سب ہاتھ ملا! [ہینری شش و پنج رکھڑا رہتا ہے اور وہ اس ہاتھ پکڑ کر ہینری کے ہاتھ میں دے دیتی ہے]۔

کا شوہر۔[گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے] تمہیں ماننا ہی پڑیگا کہ تمہاری شعری حسیناؤں میں سے کوئی بھی میری ربیری کی گرد کو نہیں پہنچ سکی۔ [بیوی کی طرف مڑ کر اس کا شانہ فخر سے تھپکتے ہوئے] ہے نا ڈیری؟ کوئی شخص تمہیں دیکھ کر حواس قائم بھی رکھ سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ میں نے کوئی بھی تو ایسا آدمی نہیں دیکھا جس کی تین ہی دن میں حالت غیر نہ ہو گئی ہو۔

ت۔ ڈیڈی بیوقوف نہ بنو۔ ہینری مجھے امید ہے تمہیں کچھ زیادہ چوٹ نہ آئی ہوگی [وہ اس کے سر کے پیچھے ہاتھ پھیرتی ہے۔ وہ درد سے کراہتا ہے] جیسے جیسے شوبن ہو رہی ہے۔ او ہو میں ابھی مرکرا اور جلدی منگواتی ہوں [جا کر گھنٹی بجاتی ہے]

کا شوہر۔ ایپ جان، ایک بہت بڑی نوازش کرو گے؟ میں تم سے کس منہ سے درخواست کروں، لیکن واقعی یہ ہم دونوں پر بڑی نوازش ہوگی

نوجوان۔ فرمایئے!

اس کا شوہر۔[نظمیں اٹھاتے ہوئے] آم . . . کیا میں یہ نظمیں چھپوا سکتا ہوں؟ میں یہ کام نہایت ہی زیب و زینت سے کرواؤں گا بہترین کاغذ، مزیّن جلد، ہر چیز اول درجے کی۔ یہ ٹیڑی ہی پیاری نظمیں ہیں۔ میں ذرا ان کو شہرت دینا چاہتا ہوں۔

عورت۔[اس تجویز پر مسرور ہوتے ہوئے گھنٹی بجا کر لوٹتی ہے اور دونوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے] بھئی ہینری، دیکھو بُرا نہ ماننا

نوجوان۔ اوہ۔ مجھ کو تو کوئی اعتراض نہیں، میں ان چیزوں سے اب بالکل لاتعلق ہوں۔ اس شام میں بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا ہوں۔

عورت۔ تمہاری عمر کیا ہے ہینری؟

نوجوان۔ آج صبح میں اٹھارہ برس کا تھا اور اس وقت میں۔ لعنت ہو اس پر، میں پھر اسی ذلیل ڈرامے کا فقرہ دہرانے لگا۔ [وہ کینڈا کے ٹکٹ اپنی جیب سے نکالتا ہے اور نفرت سے پھاڑ ڈالتا ہے]

اُس کا شوہر۔ اس کتاب کا نام کیا ہونا چاہیے؟ آرزو کے نام، یا کچھ ایسا ہی نام نہ ہو؟ کیوں؟

نوجوان۔ میں تو اس کا نام رکھتا ہوں "وہ اُسکے شوہر سے جھوٹ کیسے بولا"

(سعید اختر درانی۔ سوندھی بزم ترجمہ گورنمنٹ کالج لاہور)

عالمِ بےعمل

آبادی سے دور ایک گلی سڑی لاش کو جھنجھوڑتا ہوا گِدھ مجھے دیکھتے ہی چلایا

"ہم تم بھائی بھائی ہیں"

مَیں نے خشم آلود مستفسرانہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا

وہ چلّائے جا رہا تھا

"ہم دونوں آفاقی بلندیوں سے شناسا ہونے کے باوجود ارضی غلاظتوں کی رغبت کو ٹھکرا نہیں سکے"		(داؤد شبنم ملک)

حضرتِ اثر صہبائی

تجلّیات

پھینکے ہیں گُل بھی برق گرانے کے ساتھ ساتھ
تسکیں بھی دے رہے ہیں جلانے کے ساتھ ساتھ

صبحِ وطن ہے شامِ غریباں سے ہمکنار
نوحہ بھی ہے خوشی کے ترانے کے ساتھ ساتھ

شبنم کے آنسوؤں سے ہیں پھولوں کے گال تر
فطرت رُلا رہی ہے ہنسانے کے ساتھ ساتھ

ہر لحظہ نقشِ نو کی طلب میں ہے زندگی ---!
تعمیر کر رہی ہے مٹانے کے ساتھ ساتھ

آفاتِ روزگار سے برہم نہیں ہوں مَیں،
جرأت بڑھا رہی ہیں ستانے کے ساتھ ساتھ

ہم برق رَو ہیں اور زمانہ ہے سُست گام
اب کون گام زن ہو زمانے کے ساتھ ساتھ

ہر سجدے میں ہو عظمتِ کونینِ آثرؔ، اگر!
دل بھی جھکائیں سر کو جھکانے کے ساتھ ساتھ

جلیل حسین جلیل

غزل

تنہا تجھکو پاؤں کیسے ؟
میٹھے گیت سناؤں کیسے

دل کا راز بتاؤں کیسے
میں غم کو بہلاؤں کیسے

میں اب تک یہ سوچ رہا ہوں
اُن سے ربط بڑھاؤں کیسے

کھویا جس کو آپ ہی میں نے
آپ ہی اس کو پاؤں کیسے

راہیں سب مسدود ہوتی ہیں
اُس مہ وش تک جاؤں کیسے

اَن ہونی کو ہونی کر کے
بگڑی بات بناؤں کیسے

کوئی طریقہ تم ہی بتا دو
روٹھو تم تو مناؤں کیسے

صبر کروں تو دل نہیں مانے
گذرا وقت بھلاؤں کیسے

نام نہیں لے سکتا تیرا
سیدھی بات بتاؤں کیسے

آنکھوں میں آنسو آ جائیں
لب تک دل کو لاؤں کیسے

عقل نے سب کچھ مانا لیکن
دل کو میں سمجھاؤں کیسے

پروفیسر حمید احمد خاں

ہیر رانجھا

دریائے چناب اپنی چھ سو میل کی روانی میں جن گلزاروں اور بیابانوں کے دامن پر لہراتا ہے اُن کی فضائیں صدیوں سے شعر و سرود میں ڈوبی ہیں۔ دریا کی دلکش وادیاں ایک الگ نفسیاتی آب و ہوا رکھتی ہیں۔ عشق و محبت کی کسک، تلاشِ حق کی لگن، چناب کی لہروں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی ہے۔ ملتان ہے۔ ان میں سے کونسا نام ہے جو ہمیں حقیقی یا مجازی عشق کا کوئی دل نشیں رومان نہیں سناتا! وادیٔ چناب کی یہ روحانی اور رومانی کیفیت مدت سے عارفانہ اور عشقیہ شاعری کا موضوع بنتی رہی ہے۔ اس کیفیت کے جس خاص پہلو سے ہمیں اس وقت سروکار ہے اس کی سب سے مشہور یادگار جھنگ قدیم شہر میں ملتی ہے

اس شہر سے دو کوس باہر اینٹ کا بنا ہوا ایک مقبرہ ہے۔ یہ سولھویں صدی کے مغلیہ مقبروں کے انداز میں بنا ہے۔ اس کی دیواروں میں چاروں طرف ہیں مگر ایک دریچہ بند ہے اور ہمیشہ بند رہتا ہے۔ مقبرے کے اندر کھڑے ہو کر نظر اوپر اٹھائیے تو آسمان دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سے چناب کبھی اس قدر قریب دریا کے کنارے گویا اس مقبرے کے پاؤں سے لپٹتے تھے۔ یہ وہ پرانا چناب تھا جس سے انگریزی عہد کی نہروں کا پانی ابھی نہیں کاٹا گیا تھا اور جس کی نے ملازم کی طرح بھرنا ابھی فراموش نہیں کیا تھا لیکن اب وقت کے بہاؤ کے ساتھ دریا کا بہاؤ بھی اپنا رُخ بدل چکا ہے۔ اب اس حسرت بھرے مزار تک سنسناتے چناب کی ہوا دور سے آتی ہے اور اُس وقت کو یاد کرتی ہے جب چار سو برس، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتے کہ اس وادی کی سب سے حسین اور ...ت لڑکی ہیر سیال نے اپنے وطن کی طرف کوچ کر کے دریا کو آخری مرتبہ عبور کیا۔ صرف اس لئے کہ اس مقبرے کی خاک اُس کے جسدِ عنصری کو ہمیشہ اپنے دامن میں چھپا لے۔

عشق و محبوبی کی یہ داستان جھنگ میں نہیں بلکہ ضلع سرگودھا میں شروع ہوتی ہے۔ سولھویں صدی کے اوائل کا ذکر ہے کہ یہاں کے ایک قصبے تخت ہزارہ میں ایک خوشحال اور معزز زمیندار رہتا تھا جس کا نام موجو چودھری تھا۔ یہ ذات کا رانجھا جاٹ تھا۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے جن میں سب سے چھوٹا دھیدو تھا۔ یہی دھیدو بعد میں اپنی ذات کے نام سے مشہور ہوا اور رانجھا کہلایا۔ رانجھا کچھ تو چھوٹا بیٹا ہونے کے باعث اور کچھ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے لاڈلا تھا۔ باپ کے لاڈ پیار سے وہ قدرۃً کچھ نازک مزاج اور کچھ آرام پسند ہو گیا تھا اسے کھیتوں میں کام کرنے سے اتنی رغبت نہ تھی جتنی بانسری بجانے سے۔ بانسری بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس شغل میں اس کی فطرت کے شاعرانہ جذبے کو تسکین ملتی تھی لیکن اس تسکین سے قطع نظر، بانسری سے زندگی بسر نہیں ہوتی۔ جب باپ کا انتقال ہوا تو رانجھا کھیتی باڑی کی زندگی کے درشت حقائق کی تاب نہ لا سکا۔ اُس کے نازک ہاتھوں میں ہل چلانے سے چھالے پڑ پڑ جاتے لیکن بھائیوں اور بھاوجوں سے اس معاملے میں ہمدردی کی کوئی توقع نہ تھی۔ وہ سب اس معاملے کو یوں دیکھتے تھے کہ آخر اس چھیلے بانسری بجانے والے کی زندگی کا کوئی مصرف بھی ہے یا نہیں۔ اب کئی بار اسے بھائیوں کی گھرکیاں اور بھاوجوں کے طعنے برداشت کرنے پڑے لیکن کب تک برداشت کرتا۔ ایک دن صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ گھڑی آگئی جب اس نے اپنے اہلِ خاندان کو الوداع کہنے کی ٹھان لی

اسے وہ اس شان کے ساتھ نکلا کہ کندھے پر ایک کمبل تھا اور ہاتھ میں بانسری۔

رانجھا اب ایک بانکا سجیلا گبرو تھا۔ اس کے گھی سے چپڑے چمکتے ہوئے لمبے بال اس کے شانوں پر گرتے تھے۔ گاؤں سے نکل کر اس نے رُخ کیا۔ آخر وہ چناب کے کنارے ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں دریا کے پار جھنگ کی بستیاں اور اُن کے بیرونی کھیت سامنے نظر آتے تھے سیال راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ یہ لوگ نام و نسب پر نازاں تھے اور اپنے آپ کو بالاتر قوم سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے علاقے کے جاٹ زمینداروں کو بیٹی دینے سے عار تھا۔ ان میں بڑے بڑے متمول اور بارسوخ لوگ تھے انہی میں ایک اونچے گھرانے کا دولتمند زمیندار چوچک تھا۔ چوچک کی لوخیزا لڑ کا نام ہیر تھا۔ اسے اتفاق کہئے یا کرشمۂ قدرت کہ رانجھا چناب کو عبور کر کے جب جھنگ کی طرف اترا تو اس علاقے میں سب سے پہلے سامنا ہیر ہی سے ہوا۔ دونوں پر حسن و شباب کا عالم، رانجھا اپنے من کا لاڈلا، ہیر گھر بھر کی چہیتی، دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور پھر جھک کر رہ گئیں۔ اس تعارف نشست میں شاید منظر کی دلفریبی اور ہوا کی خوبی کو بھی دخل تھا۔ روایت کہتی ہے کہ موسم میں ایک سرور تھا۔ جھنگ سیال میں آڑو پکے ہوئے تھے اور باغوں میں پیٹھی دانگور کے خوشے لٹک رہے تھے۔ جو کچھ پیش آیا اس کی توجیہہ کچھ بھی ہو، دریا کنارے کی اس ملاقات کا نتیجہ اتنا ضرور نکلا کہ چوچک نے ہیر کی سفارش پر رانجھا کو اپنی بھینسیں چرانے کے لئے کہا اور رانجھا نے یہ نوکری بخوشی منظور کی۔

اس طرح ہیر اور رانجھا دونوں کی زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوا۔ رانجھا اپنی بھینسوں کو لے کر دریا کے بیلے میں جاتا اور ہیر بھی کسی نہ کسی بہانے کی طرف جا نکلتی۔ بیلے کے جھاڑ دن جھنکاڑوں کے درمیان رانجھا کی بانسری کی لے عجیب اثر رکھتی تھی۔ ہیر مسحور ہو کر سنتی رہتی۔ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے گئے۔ دریا کے کنارے ہر روز ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اور آخر دونوں میں محبت کے قول و قرار ہو گئے۔

لیکن محبت کا سرور حقیقی زندگی کی تلخیوں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ ایسے موقع بھی آتے کہ رانجھا کی طبعِ نازک پر اپنی نوکری کی ذلت گراں ہو جاتی۔ یہ بات کوئی اسے کوئی نا ملائم لفظ کہہ دیتا تو اس کا جی چاہتا کہ جھنگ سیال سے بھی اسی طرح رخصت ہو جائے جس طرح اس نے کبھی تخت ہزارہ چھوڑا تھا لیکن ہیر کی منتیں اور تسلیاں اسے کچھ نہ کرنے دیتیں کبھی ہیر یہ بھی کہہ دیتی کہ اگر تو جاتا ہے تو میں بھی جاتی ہوں۔ اس پر رانجھا بے بس ہو کر رہ جاتا۔

اسی طرح برسوں گزر گئے۔ رانجھا مشقت کا عادی نہ تھا۔ اس کے لئے چرواہے کا کام خوب تھا۔ دوسری طرف چوچک کے لئے بھی ایسے کام کا وجود غنیمت تھا جو برسوں تک تنخواہ کا نام نہ لیتا تھا۔ اگر ان حالات میں کوئی انقلاب نہ آتا تو رانجھا شاید اسی روش پر زندگی کے دن ختم کر دیتا ان واقعات اب ایک نیا پلٹا کھانے والے تھے۔ ہیر اور رانجھا کی جنگل کی ملاقاتیں اب کئی لوگوں کی نظروں میں آ چکی تھیں۔ انہی میں ہیر کا چچا کیدو تھا۔ یہ شخص اپنے شبہے کی تصدیق کے لئے بیلے میں پہنچا اور چھپ کر ہیر اور رانجھا کو دیکھتا رہا۔ اس کا حال خدا کو معلوم ہے کہ خاندانی غیرت نے تقاضا یا خبثِ باطن نے جوش مارا۔ بہرحال اس شخص نے ہیر کے والدین کو خبر دی اور زور لگایا کہ کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ کر ہیر کی شادی جلد از جلد کر دی جائے

ضلع مظفر گڑھ میں کھیڑے راجپوتوں کا ایک سربرآوردہ خاندان رنگ پور کے قصبے میں آباد تھا۔ رنگ پور کے کھیڑے جھنگ کے سیال راجپوتوں کی برادری سے تھے۔ ہیر کے لئے بر کی تلاش ہوئی تو کھیڑوں میں سیدا نامی ایک شخص مل گیا۔ ہیر نے اس شادی کو روکنے کے لئے جو کچھ کیا ہو گا وہ ظاہر ہے لیکن آخر کار سیدا برات لے کر پہنچا اور ہیر ایک نا رضا مند دلہن کی حیثیت سے رنگ پور کو روانہ ہو گئی۔

رانجھا غم سے نڈھال پھر بھٹکتا ہوا الٹے قدم چلا لیکن اب وطن میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ آگے بڑھا اور جہلم کے قریب جا نکلا۔ یہاں

وہ کان چھدوا کر بالناتھ جوگی کے چیلوں میں شامل ہو گیا۔ اس زمانے کے مذہبی عقیدوں میں یہ عجیب لچک تھی کہ مسلمان ہندو گروؤں اور ہندو مسلمان پیر کی خدمت میں بلا تکلف پہنچ جاتے تھے۔ رانجھا خاصے عرصے تک گرو بالناتھ کی حضوری میں رہا۔ لیکن پھر ہیر کی کشش غالب آئی۔ اور اسی طرح جوگی بنا ہوا رنگ پور کی گلیوں میں پہنچا۔ آخر ہیر سے ملاقات ہوئی۔ اور ایک عجیب اتفاق سے خود ہیر کی نند سہتی نے ہیر اور رانجھا کو رنگ پور سے فرار ہونے میں مدد دی۔ کھیڑوں نے تعاقب کیا اور اس سرگرمی سے دوڑے کہ ہیر اور رانجھا کو جا ہی لیا۔ لیکن وہ دونوں پھر ان کے ہاتھ سے نکل گئے

اب ان کے سامنے دو ہی راستے کھلے تھے۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں یا ہیر کے والدین کے پاس پہنچکر ان کی اجازت اور رضامندی سے اپنی نئی زندگی بسائیں۔ ہیر کے اصرار پر یہی دوسری صورت اختیار کی گئی۔ ہیر اور رانجھا پھر جھنگ سیال پہنچے۔ نیکدل اور صاف باطن چوچک اپنی بیٹی کی خاطر اس انتظام پر رضامند ہو گیا کہ ہیر کی شادی رانجھا سے ہو جاتے۔ لیکن اب کیدو پھر نمودار ہوا۔ شاید وہ زہریلی فطرت کے ان لوگوں میں سے تھا جو دوسروں کی خوشی کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس نے اپنی شرارت کا جال پھیلایا اور بھولے بھالے چوچک کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ہیر کو زہر دے کر یہ قضیہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ رانجھا سے کہا گیا کہ باقاعدہ برات لانے کے لئے اپنے وطن کو جائے اور جب وہ رخصت ہو گیا تو ہیر کی زندگی ختم کر دی گئی

جب رانجھا کو یہ خبر پہنچی تو اس کی حالت مردوں سے بدتر ہو گئی۔ اس کے ہاتھ بار بار دعا کے لئے اٹھتے تھے کہ اے خدا اگر ہیر زندہ نہیں ہو سکتی تو مجھے بھی اٹھا لے۔ اس حالت میں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کی دعا قبول ہوئی اور وہ خود ہیر کے پاس جا پہنچا۔

اس طرح عشق کی محرومی اور زندگی کی نامرادی کی یہ داستان ختم ہوتی ہے۔ رحم اور خوف یہ دو جذبے اس کہانی کی ساخت میں اس طرح بُنے گئے ہیں کہ اسے خود بخود دنیا کی بڑی بڑی المیہ کہانیوں میں جگہ ملتی ہے۔ اس کہانی کی واقعیت کے ساتھ ساتھ اس کی سادگی اور برجستگی فوراً سننے والے کے دل میں جگہ بناتی ہے۔ اپنی خصوصیتوں سے قطع نظر، کچھ مجرد یا اخلاقی تصورات جو اس کہانی کے اہم واقعات کی بنیاد ہیں۔ ان اخلاقی تصورات میں سب سے نمایاں خلوص، وفا، استقلال اور ہمت ہیں۔ ان سب پہلوؤں نے مل جل کر پنجاب کے عوام، بالخصوص قصباتی حلقوں کے عوام کی شعری حس کو بیدار کیا اور ان کے تخیل میں ایک آگ سی لگا دی۔ سولہویں صدی میں پنجاب کی تہذیبی اور درباری زبان فارسی تھی لیکن ہیر اور رانجھا کے عشق کو کسی دربار سے تعلق نہ تھا۔ یہ تمدن کے زراعتی دور کی کہانی ہے جس کا محور درباروں کے بجائے گاؤں اور کھیت، دریا اور وادیاں ہیں۔ جو لوگ یہ زراعتی زندگی بسر کر رہے تھے ان کے لئے ہیر رانجھا کی کہانی ایک پیغام بن کر آئی۔ انہوں نے اپنی پنجابی بولی میں دل سے نکلے ہوئے گیت ہیر اور رانجھا کے متعلق لکھے لیکن یہ گیت محض لوک گیت تھے۔ ان کی حیثیت ادبی نظموں کی نہ تھی۔ کسان ہل چلاتے ہوئے اور ان کی بیویاں چکی پیستے ہوئے یہ گیت گاتیں۔ اس طرح دو سو برس گزر گئے اور ہیر رانجھا کی کہانی نے پنجاب کے مغربی اضلاع میں ایک قومی روایت کی سی مقبولیت حاصل کر لی۔ اٹھارہویں صدی میں مغلوں کے زوال کے ساتھ فارسی زبان کو بھی زوال آیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیوں نے سر نکالا۔ جس طرح دہلی کی مقامی بولی نے اردو بن کر فارسی کی جگہ لی اسی طرح مغربی پنجاب میں بھی خود اس علاقے کی بولی ادبی کاوش کا موضوع بنی۔ میر اور سودا کا پنجابی ہم عصر وارث شاہ ہے جس نے فارسی کے زوال کے بعد اپنے دہلوی معاصرین کی طرح زبان و ادب میں ایک ترقی پسندانہ قدم اٹھایا۔ اس نے اپنی عظیم الشان پنجابی نظم کے لئے ہیر و رانجھا کا مقبول عام قصہ انتخاب کیا اور اسے دیہاتی پنجاب کی زندگی کے رس میں اس طرح سمویا کہ زندۂ جاوید کر دیا۔

ہیر اور رانجھا کے کردار رفتہ رفتہ ایک تمثیلی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پنجاب کے صوفی شعراء نے دو سو برس پہلے ہیر اور رانجھا کے عشق کی تعبیر عارفانہ رنگ میں کی۔ ہیر بارہا معشوق حقیقی کی علامت بنتی ہے اور رانجھا عارفِ کامل کی۔ خود وارث شاہ نے اپنی نظم کے خاتمے پر پوری داستان کو ایک تمثیل

از سید فیاض محمود

”دُکھیا جیارا“

(افسانہ)

وہ صبح سات بجے اٹھا۔ رضائی چھوڑ کر باہر جانے کو جی نہ چاہتا تھا کیونکہ جنوری کے دن تھے مگر بستر میں لیٹے لیٹے بھی اس کی طبیعت گھبرانے لگی ... جلد ہی ... بیزار ہو گیا تو اٹھ بیٹھا ... دو گھنٹے اسی تلملاہٹ میں گذر گئے تھے کسی چیز کا انتظار نہ تھا، کوئی اس کا منتظر نہ تھا۔ خیالات کی یورش ... مل گئے ... تھی ... کا یہی حال ہوتا ہے جن کی کوئی معہ ... نہ تھی وہ روز سوچتا میں اُس سے یہ کہونگا، یہ کہوں گا، میں کہونگا "آج تم بہت بشاش ... دکھتی ہو، تم نے کیسے ... دیا"۔

"آج تمہارے گال پر تازگی بہت ہے، تمہاری آنکھوں میں چمک ہے"۔

"تم تو مذاق کرتے ہو"۔

"واللہ ٹھیک کہتا ہوں۔ آج تو تم بہت ہی اچھی لگتی ہو"۔

"تھوڑی ہی"۔

"تو کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں"۔

"اور نہیں تو کیا"۔

"واللہ تمہارے سر کی قسم"

"میرے سر کی قسم، عجب مسخرے ہو، اپنے سر کی قسم کھاؤ جس میں گوبر بھرا ہوا ہے"۔

"... مسخرہ پن، ہنسی، عشق، جنون، ہائے اللہ مجھے ان باتوں کا خیال کیوں آتا ہے" وہ تو مجھے مسخرہ سمجھتی ہے۔ وہ کہتی ہے یہ سوچ ... نہیں سکتے تن پر ... نا کوٹ اور جس کے گلے میں بدرنگ ٹائی ہے۔ یہ مجھ سے باتیں بناتا ہے۔ ارے اس کی یہ جرأت، کہ یہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کہے ... اپنی پوزیشن کا ... س نہیں۔ یہ سمجھتا ہی کیا ہے۔ بدتمیز اپنی شکل بھی آئینے میں نہیں دیکھتا ... تو میری شکل میں کیا نقص ہے، فقط ناک چپٹی ہے مگر ایسی ... ناک تو نہیں اور کیا نقص ہے ... سو دفعہ کہا ہے کوئی تمہارا کام ہو تو بتاؤ، گھی کی فرمائش کر دیتی ہے۔ گاؤں سے منگوا دیتا ہوں تو دو دن مسکرا کر سلام کا جو ... دیتی ہے ... ٹائپسٹ ہے مگر دماغ عرش پر ہے، معلوم نہیں اس کا باپ کون تھا کہ کسی کو اپنے برابر جانتی ہی نہیں، ہائے اس کی کمر جس کا قد ... خوش قطع جس کا شباب اس قدر جوش پر ہو اسے ایک سو روپے کے کلرک کی کیا پروا، مگر کیا میں انسان نہیں۔ مجھ میں کیا نقص ہے، کیا نقص ہے ... س ہے ... میں انسان ہوں۔ انسان ہوں۔ انسان ہوں، میرے سینے میں دل ہے۔ میرے بھی سینے میں دل ہے۔ میرے سینے میں بھی تو دل ہے۔ ... کیا کروں۔

سید فیاض محمود

میں اس سے کہوں گا تم میری روح ہو، تم میری جان ہو، تم مجھے ایمان سے پیاری ہو۔ یہ میرے تنخواہ کے سو روپے ہیں۔ ان میں چالیس اپنی ... رکھتا ہوں۔ ساٹھ اپنے خرچ کے لئے رکھتا ہوں۔ یہ بھی تم لے لو۔ میں کھانا کہیں نہ کہیں سے کھا لیا کروں گا۔ مجھے بھوک ہی نہیں لگتی۔ ان روپوں سے ... اپنے لئے تحفہ لے لینا۔ میں نے تمہیں سکارف لا کر دی تھی۔ تم نے قبول کر لی تھی، ان روپوں سے ایک ہینڈ بیگ لے لو۔ ساڑھی لے لو۔ یہ میرے ... جا، انہیں تم خرچ لو۔ مجھے اس طرح دھتکارا نہ کرو۔ میں کمینہ نہیں، میں ذلیل نہیں۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ میں رذیل ہوں، نہیں ہوں۔ رذیل نہیں۔ میری ... بہی ذلت ہے کہ تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تو ایک مغرور شخص کہلاتا تھا۔ میں آج تک کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ تم نے ہی مجھے ذلیل کیا۔ تم یہ نہیں قبول کرتیں تو تم مجھے اس طرح دھتکارا تو نہ کرو۔ میں کون ہوں، تم اپنے کتے سے بھی ایسا سلوک نہیں کرتیں۔ مجھے کیوں ایسا حقیر جانتی ہو۔ ... طرف دیکھو۔ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ تمہاری کتنی عزت کرتا ہوں۔ تمہارا ایک اشارہ میرے لئے حکم سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ مگر تم قدر نہیں کرتیں۔ سچی محبت کی قدر نہیں، تم روپے کی قدر کرتی ہو، تم اعلیٰ پوزیشن کی قدر کرتی ہو، تم ذات نہیں پہچانتیں، تم پہچانو بھی کیسے۔ تم خود کون ہو۔ تمہاری ذات کیا ہے، تم کس کی بیٹی ہو، تمہاری ماں کیا کرتی ہے۔ تم عزت کرنا کیا جانو، شرافت کو تم کس طرح پہچانو۔ میں کون ہوں، تم کس طرح سمجھو ... کون ہو، تمہاری ذات کیا ہے، تمہارا خون کیا ہے۔ تمہاری قدر و منزلت کیا ہے، تمہاری شکل تمہارا جسم، تمہاری رعنائیاں ہی تمہاری ذات ہیں، حسب و نسب ہیں، تمہاری ساری کائنات ہیں۔ تم انہیں سے اپنی قدر بنانا چاہتی ہو، انہیں اونچے سے اونچے بیوپاری کے پاس بیچنا چاہتی ہو۔ بیوپاری بھی تمہیں مل ہی جائے گا۔ تم بک جاؤ گی، تم ضرور بک جاؤ گی۔ تم جیسیاں ... کتنی ہیں۔ گلی کوچے ان سے بھرے پڑے ہیں۔ تمہارے گاہک ... میں کون ہوں، میں غریب ہوں، میری شکل اچھی نہیں، میرا لباس اچھا نہیں، میرے پاس روپے نہیں۔ مگر میں آن رکھتا ہوں۔ تمہارے ... سکتا ہوں۔ مگر تم ذلیل ہو، تم کمینی ہو، تم بازاری ہو، تم ضرور اپنے آپ کو بیچنا چاہتی ہو، تم اپنے لئے گاہک تلاش کرتی رہتی ہو۔ تمہیں کوئی نہ کوئی ضرور مل جائے گا۔ تم خوش ہو جاؤ گی، تم واقعی خوش ہو جاؤ گی۔ تمہارے جسم کی تمہیں پوری قیمت مل جائے گی۔ کتنی قیمت ہو گی، ایک ہزار، دو ہزار، پانچ تمہارے بدن کی دس ہزار قیمت کیا زیادہ ہے۔ تمہارا لچک دار جسم، تمہارے جسم کے خم اور ابھار، دس ہزار کیا ان سے ... ہیں۔ زیادہ ہیں؟ زیادہ نہیں؟ ہرگز زیادہ نہیں۔ میرے پاس دس ہزار، دس ہزار چھوڑ بیس ہزار ہوں تو اسی وقت تمہارے قدموں میں انہیں ڈال دو ... ہزار روپے۔ دس ہزار بھی کوئی چیز ہوتی ہے . . . . . .

" مسٹر آصف۔ مسٹر آصف . . . . . "

" کون ہے؟ "

" بھئی آج دفتر نہیں جاؤ گے "

" نہیں تو۔ تیار ہو رہا ہوں "

" بھئی غضب کرتے ہو، روز دیر کر دیتے ہو، کیوں صبح نہیں اٹھا کرتے۔ صبح اٹھنے کی عادت ڈالو "

" بھائی افضل! کیا کروں، نیند بہت آتی ہے۔ آنکھ کھلتی ہی نہیں "

" تو جلدی سو جایا کرو نا "

"واقعی ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کیا کروں گا، مگر مجھے دیر تک پڑھنے کی عادت ہے کیا کروں نیند جلد آتی نہیں"

"اور جب آتی ہے تو آنکھ کھلتی نہیں۔" آصف ہنستا ہے۔

"جی ہاں ٹھیک فرمایا آپ نے، چلنے میں تیار ہو گیا، فقط ایک منٹ اور لگے گا۔ سائیکل نکالتا ہوں"

"بھئی آصف یہ مصلا ابھی اٹھایا تک نہیں، کیا دیر تک قرآن مجید پڑھتے رہے"

"نہیں تو، ذرا دیر سے اٹھا تو جلدی جلدی نماز گھسیٹ دی تھی، مصلا اٹھانا یاد نہیں رہا"

"بھئی تم بھی نماز کے پیچھے عجیب لٹھ لئے پڑے ہو"

"کیا کروں بھئی بہت دیر سے عادت ہے۔ اور پھر اس میں کچھ سکون بھی مل جاتا ہے"

"آپ کو کس سکون کی تلاش ہے، سکون تو ہم جیسے آوارہ مزاجوں کو چاہیئے آپ کو خدا نے ایسی بلاؤں سے محفوظ رکھا ہے"

"کن بلاؤں کا آپ ذکر کر رہے ہیں؟"

"بھئی یہی حادثے جو ہم جیسے نالائقوں کو ہر روز ہوتے رہتے ہیں"

"خدانخواستہ آپ کو کوئی حادثہ تو نہیں"

"بھئی نہیں کیا بتاؤں تم ان باتوں کو کیا جانو!"

"پھر بھی؟"

"بھئی ہمارے دفتر میں جو ٹائپسٹ ہے۔ دیکھئے سائیکل یہاں احتیاط سے چلائیے آپ تو گر ہی پڑے تھے۔ یہی ڈر تھی"

"ہوں!"

"ارے بھئی کیا بتاؤں میرے خیال میں اس کے دو سو روپے لگ گئے ہوں گے۔ دس دفعہ تو اسے سینما دیکھنے لے گیا ہوں کئی دفعہ کھانا کھلایا ہے، سال میں چار دفعہ سالگرہ ہوتی ہے میں اس کے ساتھ ڈیڑھ سال سے کام کر رہا ہوں، آپ کو تو ابھی ڈیڑھ مہینہ یہاں آتے ہوا ہے، آپ کو کیا پتا یہ میرے ساتھ چھ مہینے سے ہے۔ مگر لڑکی بہت پیاری ہے۔ ایک میرے ساتھ ہی تو کیا، اجمل کے ساتھ بھی جاتی ہے، آپ جانتے ہیں اجمل کو؟ ریکارڈ سیکشن میں کام کرتا ہے بڑا آدمی ہے۔ آپ نے بھی تو دیکھا ہے اسے۔ ایک کائیاں ہے۔ اڑتی چڑیا کو پہچانتا ہے، اس کے ساتھ تو اس کا تعلق دیر سے ہے۔ اتنا روپیہ کھلا کے رام کی ہے۔ مگر میرا خیال ہے ابھی اس کے ساتھ بھی جاتی ہے۔ کمینی ہے کتیا۔ مگر کیا کریں، مر رہے ہیں یار مر رہے ہیں"

آصف برابر سنتا رہا، لوگوں کی باتیں سننا اس کا معمول تھا۔ دفتر کے سب لوگ اپنی اپنی باتیں اس سے کہتے۔ وہ سب کی سنتا۔ افضل کی کہانی بھی

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دفتر ابھی دو میل آگے تھا۔ افضل اپنے خیالات میں غرق پھر بول اٹھا۔

"کاش میرا دل بھی تم سا ہوتا مطمئن۔ بے ہراس، پر سکون، عشق کی الجھنوں سے پاک، محبت کے عذاب سے محفوظ، حسد سے خالی، آرام کی نیند سوتے ہسے پڑھتے ہو"

"جی!" آصف گھٹی ہوئی آواز سے بولا۔

افضل نے چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے"۔ یوں معلوم ہوا جیسے آصف کے لہجے نے اس کے ذہن کو کچوکا دیا ہو۔

آصف نے اپنی متین آواز میں کہا "کچھ نہیں مجھے تو کھانسی آئی تھی۔

افضل نے سمجھدارانہ طور پر کہا "اچھا! کچھ علاج کرو۔ آج کل خشک سردی پڑ رہی ہے۔ کھانسی بگڑ جایا کرتی ہے۔ ابھی میں نے پرسوں ڈوروتھی کو ... کی ایک شیشی لا کر دی تھی۔ چیزیں مانگنے میں تو اس اللہ کی بندی کو وہ کمال حاصل ہے کہ کیا بتاؤں، یوں فرمائش کر دیتی ہے جیسے کسی پر احسان کر ... ہے مگر کیا کریں، دل ہی تو ہے . . . .

سارا دن آصف دفتر میں توجہ اور انہماک کے ساتھ کام کرتا رہا۔ کئی دفعہ ڈوروتھی اس کے پاس سے کاغذ لینے آئی۔ کئی دفعہ وہ ڈوروتھی کی میز پر ... دینے گیا۔ اس کے ہاتھ میں جنبش تھی نہ اس کی آواز میں ارتعاش۔ ڈوروتھی کے سامنے آصف کا دل منجمد، اس کے حواس برقرار، اس کا تنفس ہموار ... اعضا قابو میں، اس کا دماغ حاضر رہا۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ وہ اس سے کچھ کہے۔

ڈوروتھی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ اپنے کولہے مٹکاتی۔ تن تن کر کھڑی ہوتی۔ اپنی کرسی سے سرک کر اٹھتی، لچکتی لچکاتی کمرے میں ... ہر کام کے لئے پھرتی۔ آصف کی میز کے پاس اس قدر قریب آ کھڑی ہوتی کہ اس کے عطر کی خوشبو آصف کے دماغ تک میں سرایت کر جاتی ... آصف کا دل اسی ہموار حرکت کے ساتھ کام کرتا رہتا۔ نہ اسے افضل کی گفتگو یاد آتی اور نہ اجمل کی طرف اس کا خیال لوٹتا۔ اسے یہ احساس بھی نہ ہوتا ... اس کے اعضا پر، اس کے جذبات پر یہ جمود کیوں طاری ہو جاتا ہے۔ ہر روز یہی واقعہ پیش آتا۔

ہر شام کو وہ دفتر سے اسی پرسکون انداز سے روانہ ہو جاتا۔ جوں جوں اس کا گھر قریب آتا جاتا۔ اس کے خیالات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ... اس کے دماغ کی پریشانی بڑھ جاتی۔ وہ جلدی جلدی سائیکل چلاتا اپنے کمرے میں پہنچ جاتا۔ آتے ہی اس کے خیالات اسے گھیر لیتے۔ ہر طرف ڈوروتھی ... تصویر، ہر سمت ہر دیوار پر اس کا شباب مجسم نظر آتا۔ دیواریں اپنی جگہ سے ہٹ کر اسے پیسنے کو دوڑتیں۔ اس کی چارپائی اٹھ کر چھت سے ٹکراتی ... معلوم ہوتی، کمرے کی ہر چیز، میز کا ہر کونا، کتابوں کا ہر صفحہ اس کے سامنے ناچتا، ہر لفظ میں کسی کے کولہے، کسی کی مسکراہٹ، ہر سانس میں ... سے تکرار، ہر لحظہ کسی سے گفتگو۔ ساری رات اور صبح کے کئی لمبے گھنٹے اسی طرح صرف ہو جاتے۔ پونے دس بجے افضل ہر روز "دکھیا جیارا" ... گاتا اس کے دروازے پر دستک دے دیتا اور راستے میں ڈوروتھی سے اپنی دوستی اور محبت کے قصے آصف جیسے ہمدرد دوست کو سناتا رہتا۔

(سید فیاض محمود)

یکرنگ

جب ستی گل رخاں سے یار ہوا خلق کی یہں نظر میں خوار ہوا

نجم الدین آبرو

جب یہ ہے مسکراتا تو کس طرح جیتیں گے تم کو تو یہ ہنسی ہے پہ ہے مرن ہمارا

میر سجاد

دونوں طرف جو منہ پہ ہیں موجیں کناریاں لہریں ہیں میرے شوق کی زلفیں تمہاریاں

جناب عبدالحمید صاحب علیم

غزل

وہ فرشِ سبزہ پہ یُوں نرم گام چلتا ہے
کہ جیسے چرخ پہ ماہِ تمام چلتا ہے

اِدھر تو گردشِ ایام کیسے آنکلی؟
یہ میکدہ ہے یہاں دورِ جام چلتا ہے

ترے فراق کے لمحے بسر نہیں ہوتے
اگرچہ وقت بہت تیز گام چلتا ہے

نہ آنسوؤں کی کمی ہے نہ قحط آہوں کا
ترے کرم سے فقیروں کا کام چلتا ہے

بڑے خلوص سے دل ٹوٹتے ہیں راہوں میں
کچھ اس ادا سے وہ محشر خرام چلتا ہے

پگھل ہی جائیں گے دل اے علیم حسینوں کے
کہ پتھروں پہ بھی سحرِ کلام چلتا ہے

شبیر محمد اختر

ہنرمندی اور حُسن کاری

(ایک مکالمہ)

[حال ہی میں ایک کتاب IMAGINARY CONVE SATIONS (تخیلی مکالمے) میسرز میکڈ اینڈ وار برگ لندن کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب آٹھ ایسے فیچروں کا مجموعہ ہے جو بی بی سی لندن کے تیسرے پروگرام میں نشر کئے گئے ہیں۔ ذیل کا ترجمہ ہربرٹ ریڈ کے فیچر ARISTOTLE'S MOTHER کا ہے] ش۔م۔ا

راوی:۔

[۳۴۰ قبل مسیح کا زمانہ ہے، یونان کے دارالسلطنت ایتھنز کے شمال مشرق میں کھیل کا ایک وسیع میدان ہے جس کے قریب پانچ برس سے ارسطو نامی فلسفی نے اپنا مدرسہ قائم کر رکھا ہے۔ اکادمی نے جسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے چونکہ اُسے اپنا صدر منتخب نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس نے یہ مدرسہ قائم کر لیا ہے۔ موسم گرما کے ایک دن کا پچھلا پہر ہے ارسطو میدان کے گرداگرد ایک راستہ پر آہستہ آہستہ گھوم رہا ہے اسے اپنے شاگردوں کا انتظار ہے جن سے وہ سورج ڈھلنے تک باتیں کرتا رہے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ بدن پر مالش کرنے چلے جائیں گے، ہر شام وہ اس کے پاس آتے ہیں۔ میدان کے قریب ہی اپالو لے سی ایس کا معبد گھنے درختوں کے سایہ میں ہے، جب کھیلنے والے شور مچاتے ہیں اور باتیں کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو فلسفی اور شاگرد درختوں کے نیچے جا بیٹھتے ہیں۔

ارسطو خاصا وجیہ ہے اُس کی عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ آنکھیں ذکاوت سے بھری ہوئی، پژمردہ چہرے پر چمک رہی ہیں۔ ڈیل ڈول جاذبِ نظر ہے، خوش بیانی سے باتیں کرنا اس کا معمول ہے۔ وہ مقدونیہ کے شاہ کا معلم اور دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کا معتمد بنے۔ مگر یہ جاہ و حشمت اُسے بہکا نہیں سکی۔ اُس کے اوراک نے اُسے بتایا ہے کہ مسرتوں سے مالا مال لوگ معمولی گھرانوں میں رہتے ہیں۔ اس کے دم سے دارالسلطنت کے مضافات میں فلسفے کا چرچا رہتا ہے اور نوجوانوں کے اذہان جلا پاتے رہتے ہیں۔

ارسطو کی جانب ایک شخص چلا آ رہا ہے، یہ کوئی نوجوان نہیں، بلکہ جزیرۂ روڈز کا مصور، پروتوجینیس ہے، جس نے زندگی کے اچھے دن گمنامی میں گذارے ہیں۔ چند برس ہوئے وہ مشہور اور نامور مصور اپیلیس کے ایما پر ایتھنز چلا آیا اور یہاں اُس کے فن کی قدر ہونے لگی ہے۔ پروتوجینیس کے پیچھے ایک غلام کپڑے میں لپٹی ہوئی تصویر اٹھائے ہوئے ہے]۔

ارسطو۔ پروتوجینیس اخوش آمدید، تصویر مکمل ہو گئی کیا؟

پروتوجینیس۔ جی ہاں! رنگ ابھی ذرا گیلے ہیں۔

ارسطو۔ تو تم خود ہی کپڑا ہٹا کر اسے بنچ پر رکھوا دو، وہاں روشنی بھی خاصی ہے

پروتوجینیس۔ بجا ارشاد!— دیکھوں آپ کو پسند بھی آتی ہے یا نہیں۔

ارسطو۔ (تصویر دیکھ کر) بہت خوب! تمہاری ہنرمندی قابلِ داد ہے۔

تم نے فی سی ایس کو زندہ کر دیا ہے۔

پروتوجینیس۔ فی سی ایس زندہ ہو گئی۔ لیکن تصویر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ پسند آئی؟

ارسطو۔ تصویر میں وہ ساری خوبیاں ہیں جن کی ایک مصور سے توقع ہو

سکتی ہے۔

پروتوجینیس۔ معاف کیجئے آپ کے الفاظ واضح نہیں ہیں، یہ تصویر آپ کی ملاقات کی ہے اور بیٹے کی حیثیت سے آپ اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں مگر میں معتقد ہوں میں نے اس میں کچھ اور پیش کیا ہے۔

ارسطو۔ اس کچھ اور کو کیا کہو گے؟

پروتوجینیس۔ میں اسے حسن کہوں گا، آپ فلسفی ہیں، آپ اسے جو چاہیں نام دیں۔

ارسطو۔ نام دینے سے قبل میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کچھ اور کی نوعیت کیا ہے، تم نے حسن کا لفظ استعمال کیا ہے اور میں اسے ہنرمندی کہتا ہوں کیا یہ الفاظ مختلف خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں؟

پروتوجینیس۔ میرے خیال میں مصور حسن کی تخلیق کے لئے ہنرمندی استعمال کرتا ہے یہی ہنرمندی کسی اور کام کے لئے بھی صرف کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کرسی کی تصویر کو لیجئے۔ اس میں حسن اور ہنرمندی دونوں موجود ہیں۔

ارسطو۔ بیٹھ جاؤ، یوں کب تک کھڑے رہو گے۔

پروتوجینیس۔ شکریہ!

ارسطو۔ یہاں، اس بنچ پر میرے قریب!

پروتوجینیس۔ شکریہ! تو میں کہہ رہا تھا کہ اس کرسی کی تصویر کو لیجئے، محض ہنرمندی سے مصور بھی نجار ہو جائے گا۔

ارسطو۔ تمہارے نزدیک اچھی تصویر اور اچھی کرسی میں کوئی فرق تو ضرور ہو گا؟

پروتوجینیس۔ نجار اپنی ہنرمندی سے شاید ایسی کرسی بھی بنا لے جیسے حسین بننے میں کوئی باک نہ ہو لیکن کیا آپ اس نجار کی ویسی ہی تعریف کریں گے جیسی میری کی ہے۔

ارسطو۔ ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے خواہ وہ ہاتھ سے کیا جائے یا دماغ سے۔ ہر ہنرمندی کی اہمیت اس مقصد پر منحصر ہوتی ہے جو وہ پورا کرتی ہے

پروتوجینیس۔ کرسی اگر آرام دہ نہیں تو خواہ کتنی ہنرمندی سے [illegible] اور وہ خوبصورت بھی ہو بیکار ہے۔

ارسطو۔ بالکل درست! گویا کرسی کا مقصد فوت ہو گیا۔ نجار کرسی [illegible] اتنا کھو گیا کہ کرسی کرسی نہ رہی۔ اب اگر وہ کہتا ہے کہ [illegible] خوبصورت کرسی بنائی ہے تو وہ اناڑی ہے۔ اگر وہ [illegible] کہ اس نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جس کی ہیئت [illegible] دیدہ زیب ہے تو اس کا مقابلہ بت تراش یا مصور سے [illegible]

پروتوجینیس۔ تو وہ نجار نہیں ایک چوب کار ہے اور فی [illegible] بت تراش۔

ارسطو۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں، ہو سکتا ہے کہ فی [illegible] جس خوبی سے ہاتھی دانت تراش کر ایتھینا دیوی کا [illegible] ایک نجار اسی خوبی سے لکڑی کی کوئی چیز تراشے، لیکن [illegible] کاموں میں کسی نہ کسی طور فرق ضرور کرنا پڑے گا۔ محض [illegible] رنگوں کے استعمال کا "ہنرمند" کہہ دینے سے تسلی نہیں ہوتی [illegible] اتنی تعریف فن کے اظہار کے لئے کافی نہیں۔

پروتوجینیس۔ جی ہاں! مصور اپیلیس کی حسن کاری کا مقابلہ ایک [illegible] ان نقوش سے جو وہ مٹی کے پیالے پر بناتا ہے نہیں کیا جا سکتا اور نہ ایک نجار کا کام فی آئی ڈیاس کی نقاشی کی رفعت [illegible] سکتا ہے۔

ارسطو۔ رفعت! یہ ایک نئی صفت ہے جس کا تم نے پہلی بار ذکر کیا ہے

پروتوجینیس۔ آپ نے مجبور کیا اور میں نے یہ نام اس صفت کو دیا ہے جو ایک اعلیٰ مصور یا سنگ تراش کے لئے ضروری ہے [illegible] چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں مجھ سے متفق ہوں۔

ارسطو۔ کیا جب میں کوئی تصویر یا سنگتراشی کا نمونہ دیکھوں تو اس میں [illegible] صفت کو تسلیم کر لوں؟

پروتوجینیس۔ جی نہیں! آپ کو مقابلہ کرنا ہوگا۔ مصوّر قدرت کی نقالی کرتا ہے۔ اسی میں اس کی عظمت ہے۔ فن کار کا فن اس وقت معراج پر ہوتا ہے جب اس پر اصل کا دھوکا ہو۔ نقل کا شبہ تک نہ رہے۔ لیکن کرسی بنانے والا ایسا نہیں کر سکتا۔

ارسطو۔ کرسی کی ہیئت کا ایک ہمہ گیر معیار توقیقی ہے۔ اور یہ آدام پہنچانا ہے جس کے حصول کی کرسی بنانے والے کوشش کرتے ہیں۔ اگر فطرت کا کوئی نمونہ ہی موجود نہ ہو تو پھر کوئی یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہے کہ فلاں کام مکمل ہے یا نہیں؟ بات یہ ہے کہ تمام چیزیں جس ہیئت کی طرف راجع ہوتی ہیں وہ مرئی فطرت میں نہیں ہے۔ وائے اور پھر فطرت کے کارنامے ہیں لیکن زندگی اُن کی نقل اتارتی ہے۔ کیا اس طرح کرسی بنانے والا ہمہ گیر ہیئت کی نقالی نہیں کر سکتا۔

پروتوجینیس۔ بجا ارشاد! ہر شے آخرکار اسی ہیئت کے مقابل آجاتی ہے جو غیر متغیر ہے اور ہمہ گیر ہے اور جو چیزیں اس کی صفات کو اپنے اندر سمو لیں وہ مکمل اور عظیم کہلا سکتی ہیں۔

ارسطو۔ گویا اصولی طور پر ہم ایک دوسرے سے متفق ہیں، اب اختلاف صرف غیر متغیر اور ہمہ گیر کے بارے میں رہ جاتا ہے۔ اور تم یہ صفات مرئی دنیا میں دیکھنا چاہتے ہو۔

پروتوجینیس۔ (پُر ندرانہ انداز سے) جی ہاں —

ارسطو۔ جس طرح گھٹک کے بال و پر، سرو کی نازک شاخ یا آدمی کا جسم؟

پروتوجینیس۔ یوں ہی سمجھ لیجئے۔

ارسطو۔ لیکن کیا یہ چیزیں بھی مادّے ہی سے ایک ہم آہنگ ہیئت میں تبدیل نہیں ہو گئیں۔ اور پھر یہ پتھر، یہ آدمی، ایک مدت اس ہیئت میں رہ کر پھر انحطاط یا تخریب کے ذریعہ سے مادّے ہی تے نہیں جاملتے۔

پروتوجینیس۔ ہم مصوّر لوگ فلسفی نہیں ہوتے۔ نہ ہم اس مرئی دنیا سے پرے کی بات جانتے ہیں۔ ہم فطرت کے صرف انہی قوا سمجھتے ہیں جو ہمارے اردگرد کی ہیئت میں ظاہر ہیں۔ ہم نقالی تو کر سکتے ہیں، اسے بدل نہیں سکتے۔

ارسطو۔ اگر سوداسیلیس چکو رکی ایک ایسی تصویر بناتا ہے جو نظر آتا ہے تو کیا اُس نے اپنے فن کی حدود کے امکانات کر دیئے؟

پروتوجینیس۔ جی ہاں:

ارسطو۔ اگر وہ ایک آدمی کی ایسی ہی تصویر بنا دے جیسا وہ اُس نے فن کی معراج کو پا لیا؟

پروتوجینیس۔ جی ہاں۔

ارسطو۔ لیکن آدمی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اور جدا جدا ہوتی ہیں۔ کوئی بدشکل اور بُرا ہے اور کوئی خوبصورت نیک، تو کیا مصوّر ان بُرے اور اچھے آدمیوں کی یکساں بنائے گا؟

پروتوجینیس۔ وہ اچھے کو خوش شکل اور بُرے کو بدشکل کر کے کی ہیئت کے مطابق ہو سکے گا۔

ارسطو۔ دو مصوّر جب اچھے اور بُرے انسان کی تصاویر بنا تم اُن میں کیسے فرق کرو گے؟ دونوں نے اصل نمونوں کی

پروتوجینیس۔ اگر دونوں کا پیش کرنا ایک ایسا ہے تو میں د ایک ایسا عظیم المرتبت کہوں گا۔

ارسطو۔ گویا جو مصوّر مستقلاً بُرے لوگوں کی تصویر بناتا ہے، عظیم ہے جیسا وہ جو مستقلاً اچھے لوگوں کی تصویر بناتا۔

پروتوجینیس۔ جی ہاں!

ارسطو۔ یا اتنا ہی عظیم جتنا وہ مصوّر جو دائماً اچھے اور بُرے کے آدمیوں کی تصویریں بناتا رہتا ہے؟

بنیس: جی ہاں! بشرطیکہ تمام حالتوں میں تصویر کشی ایک ایسی ہو۔
دیمیوسے: خیال ہے تمہارا یہ کہنا درست نہیں تم جو اس بات پر زور دے رہے ہو۔ وہ مصور جو اچھے آدمی کی تصویر بناتا ہے۔ اور وہ جو بُرے آدمیوں کی تصویر ہے یا جو دونوں کو پہلو بہ پہلو پیش کرتا ہے سب برابر ہیں۔ گویا تمہارے نزدیک مصور کا فرض ایک چیز کو جیسی وہ ہے پیش کرنا ہے۔ اس کی جانچ نہیں؟
بنیس: میں اس نتیجے کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کی صداقت پر مصر ہوں۔ اگر میں مواخذہ کرنے لگوں تو پیشہ فلسفیوں سے الجھ بیٹھوں گا
بہرحال یہ تو مانو گے کہ مصور، فلاسفر اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کا کام کرنے والے کو ایک قوم میں مل جل کر ہم آہنگی سے زندگی بسر کرنی چاہئے؟
بنیس: ضرور
اور مل کر قوم کی ہمہ گیر بھلائی کی کوشش!
بنیس: جی ہاں۔
اور ہمہ گیر نیکی ہی مسرت ہے۔
بنیس: جی ہاں!
تو پھر قوم کے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ ساری قوم کی مسرت کے لئے کوشش کرے۔
بنیس: یہ خیال ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔
اس لئے ہم کہیں گے کہ ہر کوئی اپنے جسم کے کسی عضو کو حرکت دینے یا منہ سے کوئی لفظ نکالنے سے قبل یہ سوچ لے کہ آیا یہ حرکت یا کلام قوم کی مسرت میں مدد ہو سکتا ہے؟
بنیس: یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے۔
تو پس مصور کو بھی تصویر بنانے سے پہلے یہ سوال اپنے آپ سے کرنا ہوگا کہ آیا وہ اُس مشترک مقصد کو پورا کر رہا ہے؟

پروتوجنیس: اب سمجھا! آپ نے مجھے اپنی منطق میں پھنسا لیا ہے لیکن فلسفی جو ہمیشہ لفظی بحثوں میں کامیاب ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ عملی زندگی میں بھی ہمارے مد و گار ہو سکیں۔ خدارا یہ تو کہئے کہ مصور وہ کون سے مناظر اور اشخاص پینٹ کرے جن سے وہ بلند مقصد پورا ہو جو آپ اُس کے ذمہ لگا رہے ہیں۔
ارسطو: مصور اپنی قوم یا دوسری قوموں کی زندگی کا جائزہ لے سکتا ہے۔ وہ چیزوں کے اندر جھانک کر اُن کی حقیقت کو جان سکتا اور پھر اسی دنیا کو اپنے استدلالی ذہن کے ذریعے سے اپنے نصب العین کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ حسن تو اس مثالی دنیا میں ہے جسے وہ اپنے ذہن کے اندر اپنی تخیلی صلاحیتوں سے تخلیق کرتا ہے۔ تمہارا یہ کہنا بجا ہے کہ مصور کا کام فیصلہ دینا نہیں، لیکن مصور کے کام کو تو پرکھا جاتا ہے۔ اس کے فن میں زندگی کی اچھی صفات کی کمی سب سے لازمی جزو کا فقدان ہے۔ شاہ مقدونیہ کی سرگرمیوں، عالی ہمتی اور فاتحانہ کارناموں کا نقارہ چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔ ذرا شاہ اعظم کی شخصیت اور اس کی سلطنت کا خیال کرو جو اس کی ناموری کے باعث آج مشہور و معروف ہے۔ تم کئی ایسے مفید مقاصد پورے کر سکتے ہو جن سے تمہاری قوم کو علم اور راہ نمائی میسر آسکے گی اور مصوری کو عظمت ملے گی۔ آنے والی نسلیں تمہارے فن پارہ پر ناز کر سکیں گی۔
پروتوجنیس: یہ آپ کی والدہ کی تصویر تو میں نے آپ کے کہنے پر بنائی ہے
ارسطو: ٹھیک ہے! لیکن کیا دنیا میری ماں کو جانتی ہے؟ اس کی شہرت کی خواہاں ہے؟ اس کا جواب استدلال دے سکتا ہے۔ لیکن محبت روکتی ہے۔ یقین مانو میری چھوٹی سی دنیا پر اس کی حکومت ہے، اب وہ اگرچہ مجھ سے پہلے چلی گئی مگر جب تک میں زندہ ہوں وہ

میرے پاس رہے گی اور یہ تمہارا معجزہ ہے اور میں تمہارا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

پروتوجینیس۔ آپ کا اطمینان میرے لئے خوشی کا موجب ہے۔ تو غلام آپ کے ہاں تصویر پہنچا آئے؟

ارسطو۔ ابھی یہیں رہے تو اچھا ہے۔ میں اسے تمہارے ہم وطن ایوڈی مس اور اپنے اُن شاگردوں کو دکھانا چاہتا ہوں جو میری ماں کو جانتے ہیں۔

پروتوجینیس۔ بہتر، الوداع۔

ارسطو۔ الوداع پروتوجینیس۔ دیوتا تمہارے محافظ ہوں۔

[راوی]:۔

پروتوجینیس مڑتا ہے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے سایہ دار کنج کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ اپالو ولیکیا کے معبد کے سامنے سے گزرتا ہے۔ وہ ایتھنز کی گلیوں میں چلا جا رہا ہے۔ راستے میں بڑے بڑے مکان ہیں۔ باہر بچے کھیل رہے ہیں۔ کہیں بکریاں ممیا رہی ہیں اور کہیں مرغیاں زمین کرید رہی ہیں، بازار میں خوانچے والے شور مچا رہے ہیں اور وہ ان سب سے بے نیاز چلا جا رہا ہے۔ بالآخر وہ شہر کے وسط میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں مشہور و معروف مصور ایپلیس کا اسٹوڈیو (نگارخانہ) ہے۔ مصور نے ابھی ابھی اپنا کام ختم کر کے برش رکھے ہیں۔ اور اب وہ تصویر کو کپڑے سے ڈھانپ رہا ہے۔ نگارخانہ ایک طویل کمرہ ہے جس میں تناسب بہت کم ہے۔ کمرے میں سامان تھوڑا ہے لیکن قیمتی ہے۔ نگارخانے کے تینوں جانب کھڑکیاں ہیں۔ مشرق اور مغرب کی جانب جو کھڑکیاں ہیں۔ اُن میں سے طلوع اور غروب ہوتے ہوتے سورج کی کرنیں اندر آتی ہیں۔ جنوبی کھڑکی کے سامنے پردہ گرا دیا گیا ہے تاکہ دھوپ کمرے کو گرم نہ کر سکے۔ دروازوں پر سنہری کام چوبی کا کام کیا گیا ہے۔ شمالی دیوار پر آبی رنگوں سے تصاویر بنی ہیں جو ایپلیس کے موقلم کا نمونہ ہے۔

ایپلیس اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے ناکام ہمعصر اسے متکبر خیال کرتے ہیں۔ لیکن وہ سنکی ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ اپنے امیر و کبیر زبونوں کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی زندگی کا معیار کافی بلند رکھنا چاہئے۔ وہ ہم مصوروں کی عزت کرتا اُن سے نہایت کھلے طور پر ملتا اور باتیں کرتا ہے۔ اسی نے پانچ برس پروتوجینیس کو ایتھنز آنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اس کے وطن میں ترقی کے بہت کم تھے۔ اسی کے کہنے پر پروتوجینیس نے اپنا کام ایتھنز میں شروع

پروتوجینیس نگارخانے میں داخل ہوتا ہے۔ مصور ایپلیس کوچ رہا ہے۔ پروتوجینیس کو دیکھ کر وہ استقبال کے لئے اٹھتا، اور اسے مقابل کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ یوں دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے۔

ایپلیس۔ تشریف آوری کا شکریہ۔ کام کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اچھا تم آگئے۔ اب کچھ پینے میں لطف آئے گا

پروتوجینیس۔ آپ مجھے ہمیشہ نوازتے ہیں۔ لیکن آج دسترخوان سے آپ کی عقل و حکمت سے لذت اندوز ہونے آیا ہوں۔

ایپلیس۔ دونوں حاضر ہیں۔ دسترخوان پر تم جو چاہو۔ آسکتا ہے۔ مگر علم و حکمت میں جو کچھ جانتا ہوں عرض کر دوں گا۔ دسترخوان پر ہم باتیں کر سکتے ہیں۔

پروتوجینیس۔ مہمان نوازی کا شکریہ۔ سیدھا لیسیم سے چلا آ رہا ہوں۔ تصویر مکمل کر کے دے آیا ہوں۔ گرمی آج خاصی ہے پسینے میں شرابور ہو گیا ہوں۔ آپ کے یہاں تو کافی ٹھنڈک ہے۔

ایپلیس۔ اور ستاگیروی[1] نے اسے پسند کیا؟

پروتوجینیس۔ تصویر کو اس نے معجزہ بتایا ہے لیکن شاید یہ معجزہ اس کی میزان پر پورا نہیں اترا۔

ایپلیس۔ یہ مکتب کا استاد اپنے متعلق عجیب دھوکے میں مبتلا ہے۔ اس نے تمہیں مصوری کے بارے میں ہدایات دینی تو شروع نہ

---

[1] حکیم ارسطو ستاجرہ کے رہنے والے تھے۔

ایپلیس - میری ہنرمندی پر تو اس نے کوئی حرف گیری نہیں کی۔
[illegible] - اپنی والدہ ماجدہ کی تصویر پر حرف گیری؟
ایپلیس - جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس کا خیال ہے کہ مجھے شاہ مقدونیہ
کی شبیہ بنانی چاہئے تھی اور اس کا یہ مطلب ہے [illegible] کے خلاف میں نے احتجاج
کیا تھا۔
[illegible] کہ سکندر مطلق العنان ہے۔ وہ اپنا مصور خود منتخب
کرتا ہے۔ اپنے منتخب کئے ہوئے مصور کا مقابلہ برداشت نہیں کر سکتا۔
ایپلیس - [illegible] دریافت کر سکتا ہوں کہ جب آپ نے شاہی تصویر
بنائی تو آپ کی ہنرمندی کی قیمت بڑھ گئی؟
[illegible] اس سوال کا تعلق؟
ایپلیس - یہ نکتہ ارسطو نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موضوع کی عظمت
[illegible] فن کو بڑھا دیتی ہے۔
[illegible] ضرور تمام بادشاہوں کی بیجا تعریف و توصیف کرتا ہے۔
ایپلیس - لیکن ارسطو مدح خواں ہے خوشامدی نہیں۔ اس نے یہ بات
[illegible] سے کہی تھی۔
[illegible] میں نے سکندر کی تصویر بنائی ہے اس
[illegible] پر لوگوں کا رشک دے مارتا۔
ایپلیس - لیکن اس سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ آپ نے سکندر اعظم
کی تصویر بنا کر مجھ سے زیادہ بلند مقصد پورا کیا ہے۔ مجھ سے جس نے
ایک فلسفی کی ماں کی تصویر بنائی ہے۔
[illegible] - یہ بے معنی بات ہے۔ سکندر دوسرے لوگوں ہی کی طرح ایک
انسان ہے۔ اس کے دراز قد و قامت سے زرہ بکتر اتار دو پھر
دیکھو ہر کوئی اسے ایک معمولی سا لالا خیال کرے گا۔ میں نے سکندر
ایک انسان کی تصویر نہیں بنائی تھی۔ بلکہ میں نے تو تصویر بنائی
تھی چمکدار چار آئینہ، کلاہ آہنی، کلغی اور ساق آہنی کی جو اس کی [illegible]

والی پنڈلیوں کو ڈھانپتی ہے اور جو اسے فوق الانسانی عظمت بخشتی
ہے۔ میں نے بجلی کی گرج پر اس کا قبضہ دکھایا۔ شاید مانتی ہو یہ
یہ فعل دیوتاؤں کی توہین ہوتا اور میں اپنی آزادی کھو بیٹھتا۔
پروتوجینیس - اب میں سمجھا میں تو اس کے دلائل کا قائل ہو گیا تھا
ایپلیس - فلسفی الفاظ کے چکر چلاتے ہیں یہ لوگ محض خطیب ہیں اور
چرب زبانی سے ہمیں اندھا کر دیتے ہیں۔ ہم سیدھے سادے [illegible]
ہیں۔ ہماری دلیلیں ہمارے اوزار ہیں۔ ہم الفاظ کا جواب کام سے
دیتے ہیں۔
پروتوجینیس - گویا آپ کو یہ تسلیم نہیں کہ موضوع کی عظمت سے فن کی [illegible]
قیمت بڑھ جاتی ہے۔
ایپلیس - میں اس سے بالکل انکار تو نہیں کرتا لیکن بحیثیت ایک مصور کے
میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ کوئی فلسفی ہو یا کوئی بادشاہ، بلکہ [illegible]
فن کو ہمیں لوگ سمجھ سکتے ہیں۔
پروتوجینیس - آپ اپنی مرضی سے کونسا موضوع پسند کریں گے؟
ایپلیس - میرے دل میں ابھی ایک خیال آیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان
اور دنیا کے سارے نظاروں کو یہیں چھوڑ کر فلک کی فضاؤں میں
پہنچوں، میری آنکھیں بادلوں کو چیر کر اولمپس کی تلاش کر رہی ہیں۔
میں سب سے عظیم اور دیوتاؤں کی محبوب "حسن کی دیوی" کو تصویر
کا قالب دینا چاہتا ہوں۔
پروتوجینیس - افروڈائٹ سے بہتر موضوع ممکن نہیں۔ لیکن آپ اس کی
تصویر کیسے بنائیں گے۔ یوں ہی کہ وہ رتھ پر سوار ہے۔ اس کے
پیامی بلبل، فاختہ، راج ہنس ساتھ اڑے جا رہے ہیں۔ اس کا آشیانہ
پھولوں سے لدا ہے۔
ایپلیس - ہرگز نہیں۔ یہ جانور اور پھول، میں انہیں بیکار سمجھتا ہوں۔ میں
دیوی کے جنم کا منظر پیش کروں گا۔ وہ سمندر کے جھاگ میں سے

برہنہ ابھر رہی ہے۔ اس کا حسن اتنا انسانی نہیں کہ اس میں شہوانیت نمایاں ہو جائے۔ میں اس کے سر کو جھکا دوں گا، اُس کے گیلے بال ...کھلے ہونگے۔ بالوں سے پانی کے قطرات یوں گراؤں گا کہ وہ ...۔ وہ پہلی نقاب پہن کر اس کے اعضا کو ڈھانپ لیں۔

پرو تر جینس۔ محترم دوست بس کیجئے۔ کہیں الفاظ آپ کے تخیل کو کمزور نہ کر دیں۔

اپیلیس۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یہ تصویر بنا رہا ہوں۔ معاف کرنا میں تمہیں دکھا نہیں سکوں گا، ابھی پہلا خاکا ہے۔ تخیل کے بچے اگر وقت سے پہلے باہر آجائیں تو اکثر بیمار ہو جاتے ہیں۔ یہ فلسفی ان باتوں کو کیا جانیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی تخیلی اڑان میں جب ہوا کے دوش پر ہوں۔ تو راہ میں رک جائیں۔ اور یہ ہمارے پروں کو گن سکیں۔

پرو تو جینس بھائی! آؤ اب کچھ کھا پی لیں موسیقی سے جی بہلائیں۔ ارے کوئی ہے۔ دستر خوان بچھاؤ — ہاں وہ شراب —

اثر محمد اختر

★

...ے اچھے پیارے مصوّر!

مجھے یوں نہ ترسا

مجھے ایک ہی بار تصویرِ محبوب جلد اب دکھا دے۔

...یہی بس مری آخری التجا ہے

مجھے یوں نہ ترسا

...تصویر میں اب بتاتا ہوں پہچان جس کی

...ے اچھے پیارے مصوّر!

...ڑھتا ہے سنبل سے پُرپیچ گیسو

...ر وار ہوتے ہیں چہرے پر اُس کے پسینے کے قطرے

...ظر آتے ہیں جو کہ شبنم کے قطروں کی مانند تازہ

...ہ ہے مہ جبیں، اے مصوّر!

...ظر آتی ہیں ابروئیں اس کی ایسی

...ہو جیسے جگر دار شمشیر کوئی

...پُر کیف کاجل بھری اُس کی آنکھیں کہ ہوں جیسے نرگس کی آنکھیں کہ آہو کی آنکھیں

...ڑکتا ہے تیروں کی مانند پلکیں

...کھتا ہے رخسار مانندِ لالہ

...ہن، غنچہ ہائے سمن سے لطیف و نیک تر

شفیق اُس کے لب ہیں

وہ جب مسکراتا ہے مانندِ مرجاں نظر آتے ہیں دانت اُس کے کہ بکھرے ہوں موتی

وہ سیمیں ذقن ہے۔

دراز اُس کی گردن

گداز اُس کی باہیں، سفیدی میں یوں تو کہے مرمریں ہیں

وہ ہے سرو قد، اے مصوّر،

وہ سب اپنے چہرے پہ کرتا ہے گیسو پریشاں تو معلوم ہوتا یوں ہے جیسے وہ چشمۂ آبِ ظلمات میں چھپ گیا

مرے اچھے پیارے مصوّر! مجھے یوں نہ ترسا

تو ہے سب سے اعلیٰ تو ہے سب سے برتر، ہم انسانوں کی طرح بالکل نہیں ہے۔

مجھے ایک ہی بار تصویرِ محبوب جلد اب دکھا دے

جو ممکن نہیں یہ تو پھر اے مصوّر!

جو سارے حسینوں سے بڑھ کر حسیں ہے

جو ہے سب سے اعلیٰ

جو ہے سب سے برتر

یہی بس مری آخری التجا ہے

مجھے اپنا جلوہ دکھا دے

مجھے آپ میں جلد ہی جذب کرلے

(خورشید آفریدی)

حامد علی خاں

اِملا کی غلطیاں

املا کی بعض غلطیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں یعنی لوگ کسی زبان کے بعض الفاظ کے املا میں کوئی ایسا حرف داخل کر دیتے ہیں جو اُس زبان میں جس کا وہ لفظ ہے موجود ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ازدحام ایک عربی لفظ ہے اور اس کا صحیح املا ہے۔ ا۔ز۔د۔حائے حطّی۔ا۔م۔ لیکن عام لوگوں نے اسے زائے فارسی یعنی ژ۔ اور ہائے ہوّز سے لکھنا شروع کر دیا۔ اور اژدہام ہی تلفظ کرنے لگے۔ غالباً یہ غلطی اس وجہ سے شروع ہوئی ہوگی کہ فارسی لفظ "اژدہا" اس طرح لکھا جاتا ہے۔ لکھنے والوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان دونوں لفظوں میں کوئی معنوی تعلق نہیں ہے اور یہ بھی نہیں سوچا کہ زائے فارسی یعنی ژ خالص فارسی حرف ہے اور عربی میں قطعاً مستعمل نہیں بلکہ اہلِ عرب کے لئے اس حرف کا صحیح مخرج سے ادا کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر "ژ" ایک عربی لفظ یعنی "ازدحام" کے املا میں کیونکر شامل ہو سکتی ہے۔

ایک اور عربی لفظ ہے "نکہت" بمعنی خوشبوئے دہنِ محبوب۔ اب محض خوشبو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کو عام لوگ "گ" سے لکھ کر نکہت کے بجائے "نگہت" اور "نگھت" بولنے لگے ہیں حالانکہ گ عربی حروفِ تہجی میں شامل ہی نہیں۔

ایک ہندی لفظ ہے "ہامی" جس سے مراد ہے "ہاں کہنا" یا "اقرار کرنا"۔ "ہامی بھرنا" مشہور محاورہ ہے۔ "ہامی" کا صحیح املا "ہاں" کی طرح ہائے ہوّز سے ہے لیکن لوگوں نے اس میں بھی تصرف کیا ہے اور اسے حائے حطّی سے لکھ کر عربی کا "حامی" بنا دیا ہے۔ محاورہ استعمال کرتے ہیں تو حائے حطّی ہی سے حامی بھرنا لکھتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ ایک بے معنی بات ہے۔ عربی لفظ "حامی" سے مراد ہے "حمایت کرنے والا" اس کا ہندی لفظ "ہاں" سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے عربی لفظ "حامی" اور ہندی لفظ "ہامی" کے کم از کم املا میں ضرور فرق قائم رکھنا چاہیئے۔ "ہامی بھرنا" کے محاورے میں "ہامی" کو ہائے ہوّز ہی سے لکھنا صحیح ہے۔

املا کی ایک عام غلطی یہ ہے کہ بعض الفاظ کے آخر میں بلا وجہ ایک "ہ" بڑھا دی جاتی ہے۔ مثلاً "پروا" کو لوگ "پرواہ" لکھتے ہیں۔ اسی طرح "بے پرواہ" اور "بے پرواہی" لکھا جاتا ہے حالانکہ نہ یہ املا درست ہے نہ تلفظ۔ پروا، بے پروا، اور بے پروائی کو "ہ" کے بغیر لکھنا چاہیئے۔

لفظ "قہقہہ" پر اکثر ظلم ہوتا ہے یعنی لکھنے میں اس کی آخری یعنی تیسری "ہ" ساقط کر دی جاتی ہے اور "قہقہہ" کے بجائے "قہقہ" لکھا جاتا ہے۔ حالانکہ نہ یہ املا درست اور نہ یہ تلفظ۔ صحیح املا ہے۔ ق۔ہ۔ق۔ہ۔ہ۔

بہت سے لوگ بعض عربی حروف کے آخر میں بلا وجہ ایک ہائے مختفی کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً موقع۔ مرقع، مزرع، مع، مصرع، برقع وغیرہ۔ ان سب الفاظ کا آخری حرف "ع" ہے۔ لیکن "ع" کے بعد معلوم نہیں کیوں ایک "ہ" بڑھا دی جاتی ہے اور انہیں موقعہ، مرقعہ، مزرعہ، معہ، مصرعہ اور برقعہ لکھتے ہیں۔ یہ املا صحیح نہیں۔ ان الفاظ کے آخر میں "ع" کے بعد کوئی "ہ" نہیں۔ اس غلطی سے املا کی ایک اور غلطی پیدا ہوتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ اردو بول چال میں جب ایسے الفاظ کا امالہ ہو جن کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو الف کی طرح "ہ" بھی عموماً یائے مجہول سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً "مکتبہ" "مکتبے" ہو جاتا ہے اور "درجہ" "درجے"۔ امالے کے بعد ان الفاظ کو تلفظ کے مطابق یائے مجہول ہی سے لکھنا بھی چاہیئے۔ لیکن جن الفاظ کے آخر میں "ع" ہو اُن کا امالہ یائے مجہول سے نہیں ہوتا۔ نہ انہیں یوں لکھنا ہی چاہیئے

ورنہ اِن کا لفظ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔ مثلاً لوگ مُوقع کا امالہ کرکے مُوقِعے لکھتے ہیں۔ مُرقّع کا امالہ کرکے مُرقّعے لکھتے ہیں۔ اسی طرح بُرقع، برقعے ... مصرعے لکھا جاتا ہے۔ یہ امالہ نہ صرف خلافِ قاعدہ ہے بلکہ اس سے املا کی بھی ایک ایسی غلطی واقع ہوتی ہے جو متعلقہ الفاظ کا حلیہ بدل کر اُن کے تلفظ بھی عجیب وغریب بنا دیتی ہے۔ اس کے متعلق صحیح قاعدہ یہ ہے کہ جو الفاظ حرفِ ع پر ختم ہوں، اُن کو امالے کی صورت میں لکھنے کے وقت ع سے ما قبل کو مفتوح کر دیا جائے۔ امالے سے مُوقَعے۔ املا میں اپنی اصل صورت کے قریب رہتے ہوئے مُوقَع ہو جائے گا خلافِ قاعدہ مُوقِعے ... نہیں ہوگا۔ مُرقّع، ق کے کسور ہو جانے سے مُرقِّع ہو جائے گا۔ نہ کہ مُرقّعے (مُرقَّعے ...)۔ اسی طرح مصرع، ر کے مکسور ہونے سے مصرِع ... کے اضافے سے مصرعے (مصرَعے) وقس علیٰ ہذا۔ (شکریہ ...)

شیلے
(ترجمہ: عزیز خالد)

نوحہ

زندگی! دُنیا! طلسمِ روز و شب!
آخری زینوں پہ جن کے چڑھ رہا ہُوں مَیں، مگر
ہے بگہ حیراں کہ مَیں پہلے کہاں استادہ تھا!
پھر بھی آئے گا شکوہ و شعر و نکہت کا وہ دَور؟
اب نہیں آئے گا آہ!
ان سمن زاروں میں وُہ حُسنِ بہاراں اب بھی ہے
نُورِ تابستاں وُہی ہے اور بادِ زمہریر
اب بھی آتی ہے فسردہ سایوں کو تھامے ہُوئے
مَیں مگر گرمِ سفر ہُوں دِل کی ظلمت گاہ میں،
بُجھ گئی ہے آہ شمعِ زندگی میرے لئے
یہ کبھی روشن نہیں ہو گی؟ ——— نہیں!

عبدالحمید

(امریکی ظرافت سے مستفاد)

"مُردہ بدستِ زندہ"

غریب نواز کو انتقال کئے دس سال بیت چکے تھے جب وہ دوبارہ اس دنیائے آب وگل میں آیا تو نئی دریافت سے فائدہ اٹھانے والا وہ سب سے پہلا آدمی تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کے بعد کون کون اور کتنے لوگ واپس آئے، پر اتنا ہم وثوق سے جانتے ہیں کہ وہ ضرور واپس آیا اور جو کچھ اس پر بیتی حسب ذیل ہے

قبر سے باہر نکل کر اس نے اطمینان کا سانس لیا، اس کے جسم کے گرد وہی چادر لپٹی ہوئی تھی جو تجہیز و تکفین کے وقت اس کا کفن بنی تھی، اس نے پھاڑ کر اس چادر کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، نصف تو اس نے دھوتی کی صورت میں اپنی کمر کے گرد باندھ لی اور بقیہ نصف اپنے جسم پر لپیٹ لی۔ دس سال پیشتر جب اسے قبر میں اتارا گیا تھا تو اس چادر کا رنگ بہت اجلا اور سفید تھا، لیکن اب ذرا مٹیالی ہو گئی تھی۔ امتداد زمانہ سے وہ پہلے جتنی پائدار اور مضبوط بھی نہیں رہی تھی۔ تاہم وہ اسی چادر کو اوڑھے ہوئے ناز گلی چوک میں آ کھڑا ہوا۔ اس کا جنازہ اسی جگہ سے گزرا تھا۔

رواج کے مطابق اس کا ماتمی جلوس بھی نہایت اہتمام کے ساتھ نکالا گیا تھا، لیکن اس میں بناوٹ کے بجائے خلوص اور حقیقی غم واندوہ کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ چونکہ غریب نواز اپنی زندگی میں بہت ہر دلعزیز تھا اس لئے سبھی کو اس کی موت سے دکھ پہنچا۔ وہ بہت محنتی اور دیانتدار آدمی تھا۔ اور اس کے خاندان کی تمام ترقی اور کامیابی اسی کی محنت کی رہین منت تھی۔ مرتے وقت اس نے اپنے اعزہ کے لئے خاصی بڑی جائداد اور کامیاب چلتا کاروبار چھوڑا تھا۔ ابھی اس نے عالم شباب سے گذر کر عالم پیری میں قدم رکھا ہی تھا کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے دنیا والوں سے چھین لیا۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مشورے، دوستی، ہمدردی اور مہربانی کے محتاج تھے۔ اس وقت اس کی موت کو بہت بری طرح محسوس کر رہے تھے۔

اب آپ قدرتی طور پر سوال کریں گے کہ غریب نواز واپس کیسے آیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ "ادارۂ تحقیقات ارواح" کے شہرۂ آفاق صدر نے ایک دریافت سے دنیا بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اس دریافت کی مدد سے مرے ہوئے لوگ دنیائے نیستی سے دوبارہ دنیائے ہست و بود میں آ سکتے تھے۔ غریب نواز نے بھی اس نئی دریافت سے فائدہ اٹھایا اور وہ دوبارہ آب وگل کی دنیا میں آ گیا۔ اس واپسی میں اس کی کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی۔ بلکہ زیادہ تر دوسروں کی خدمت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ہمارے پاس فرض کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ دوسری دنیا میں غریب نواز کا وقت اطمینان سے نہیں گزر رہا تھا۔ وہ ایک مثالی انسان تھا — اس کے اعزہ کے لئے اس خلا کا پر کرنا مشکل ہو گیا تھا جو اس کی وفات سے پیدا ہو گیا تھا۔ انہیں اس کی موت کے بعد یہ پوری طرح معلوم ہوا تھا کہ وہ کس حد تک اس کے دست نگر تھے۔ ان باتوں کو غریب نواز نے بھی محسوس کیا، اس کا ضمیر اسے فرض کی یاد دہانی کرا رہا تھا چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے واپس آنے کا پکا ارادہ کر لیا اور بالآخر واپس آ ہی گیا۔

اب وہ چوک سے نکل کر لوہاری دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگا، لوگ اس کی موجودہ ہیئت کو دیکھ کر ہنس رہے تھے لیکن وہ پروا کئے بغیر آگے بڑھتا گیا۔ لوہاری دروازے کے اندر اس کی دکان تھی۔ اب اس کا سائن بورڈ تبدیل ہو چکا تھا اور وہاں اس کے بجائے اس کے بیٹے کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا

تھا۔ وہ بغلی دروازے سے مکان کے اندر داخل ہوگیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہاں اس کا چھوٹا سا دفتر تھا۔ اس کی ترتیب میں اب تبدیلیاں آچکی تھیں۔ "پرائیویٹ" اب تک اسی شان دلربائی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ کسی شخص کا بلا اجازت اندر جانا ممکن نہ تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ اسے روکا جا سکتا وہ دفتر میں داخل ہوگیا، جہاں اس کا سامنا اپنے بڑے بیٹے سے ہوا۔

"افضل!"

"ابا جان آپ!"

پھر دیر تک کمرے پر اضطراب اور سراسیمگی کی کیفیت چھائی رہی لیکن یہ اضطراب وہ نہیں تھا جو کسی عورت کی یکا یک آمد سے خواہ مخواہ دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ اضطراب اس کیفیت کا آئینہ دار تھا جو ایسے مردوں کے مقابل ہونے سے پیدا ہوتی ہے جن کی کسی چیز متوقع ملاقات ہوگئی ہو۔ کتنا فرق ہے ان دو حالتوں میں! وہ خاموشی سے میز کے گرد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔

غریب نواز نے کہا۔ "میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں جہاں سے میں آرہا ہوں وہاں ہمیں پیسے کی مطلق ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔"

افضل کی شادی ہو چکی تھی لیکن کاروبار کی حالت اتنی اچھی نہیں رہی تھی۔ اس کے چند بچے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ تاہم اس کے طرزِ عمل سے اب تک ... نہ دی تھی ... رہی تھی۔

اس نے دراز کھولتے ہوئے کہا "ابا جان! میرے پاس اس وقت صرف سو روپے موجود ہیں۔ یہ آپ کی ——"

غریب نواز نے جلدی سے نوٹ پکڑتے، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور افضل کے کپڑے پہننے لگا۔ خوش قسمتی سے افضل کے کچھ فالتو کپڑے دفتر ہی میں کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ پھر کرسی پر آبیٹھا بعض چیزوں سے خود بخود پردہ اٹھ رہا تھا۔

"افضل! مرتے وقت میں نے کافی روپیہ چھوڑا تھا۔"

اور جب اسے حقیقت حال سمجھ آگئی تو وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"بیٹا میں تمہارے کام میں حارج نہیں ہونگا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اپنے پرانے دوستوں سے پھر سے تعلقات ... تمہاری امی کیسی ہیں؟"

افضل کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

وہ قدرے جھجک کر بولا "جی، بالکل ٹھیک ہیں۔ شاید یہ مناسب ہوگا کہ آپ ان سے اس وقت تک نہ ملیں جب تک کہ —— اچھا میں ... کے ساتھ چلوں گا، ہم ملاقات کے لئے وقت مقرر کریں گے۔ خیر مجھے سوچ لینے دیجئے۔"

غریب نواز نے بیٹے کی حرکات و سکنات کو تعجب سے دیکھا۔ بہرحال دکان سے نکل کر اس نے اپنے دوستوں کا رخ کیا۔ پہلے وہ بخشی کے پاس گیا۔ بخشی اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اپنی زندگی کے آخری پانچ سال وہ ہر ہفتہ بلا ناغہ اس سے تاش کھیلتا رہا تھا، چنانچہ روزمرہ کے معمول کے مطابق ... ان کی باتوں کا موضوع تاش ہی تھا

بخشی نے کہا "آج دوپہر کے بعد تمہارے ساتھ کھیلنے میں مجھے بہت خوشی ہوتی۔ پر کیا کروں، آج میں اسی وقت اپنی بیوی کے ساتھ سینما جا رہا ہوں ...

...ابھی تو مجھے فرصت نہیں ہو گی، ڈپٹی کمشنر صاحب نے ملاقات کے لئے یہی وقت دیا ہے، تم جانتے ہو کہ ان سے ملنا کتنا ضروری ہے۔ اگر نہ ملوں تو میرا کاروبار ...ٹھپ ہو جائے گا؛ اچھا بھئی۔ اگلے ہفتے کسی روز دیکھا جائے گا"

...ہی سے واپس ہو کر غریب نواز نورالدین، قمرالدین کے ہاں گیا، اپنے پرانے بنک کے سن رسیدہ چیئرمین کے پاس پہنچا، وہ ابھی زندہ تھا کہ اسے پتا لگ سکے کہ ...ہو رہا ہے۔ گیا جہاں اس کے کچھ اور دوست تھے لیکن سب کا طرزِ عمل ویسا ہی بے رخی کا تھا جیسا بخشی کا۔ کسی کو اس سے بات کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔

...ب وہ واپس اپنے بیٹے کی دکان پر پہنچا، شام کے پانچ بج چکے تھے۔ افضل اس کا انتظار کر رہا تھا ——اس کے چہرے پر صبح کی نسبت پریشانی کے آثار زیادہ ...ہو رہے تھے۔ وہ خاموشی سے جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

...آخر غریب نواز نے مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا: "افضل بیٹے آج ایک عجیب و غریب تجربہ حاصل ہوا، میرے واپس آنے پر کوئی بھی خوش نہیں۔ دراصل ...میری کسی کو ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ میرے تمام پرانے دوست مجھے بھول چکے ہیں۔ انہوں نے سنا تو مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن اس میں پہلا سا ...خلوص نہ تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں پرانے تعلقات کو دوبارہ قائم نہ کر سکا۔ میں نے تمہارے لئے جائداد چھوڑی تھی۔ اور اب اگر دوبارہ حصول ممکن بھی ہو پھر بھی ...مناسب اور نا موزوں معلوم ہو گا۔ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ تھا وہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اب ہم دونوں کی زندگیاں مختلف راستے اختیار کر چکی ہیں۔ افضل ...میں واپس جا رہا ہوں۔ تم غم نہ کھاؤ، تمہارا احتجاج غیر ضروری ہے۔ دیانتداری مجھ سے یہی تقاضا کرتی ہے اور پھر یہ بالکل قدرتی بات ہو گی کہ میری بیوی بھلا دی جائے ...بیٹا میں واپس جا رہا ہوں، پر جانے سے پیشتر میں چاہتا ہوں —— ایک بات، صرف ایک بات۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری امی نے اور شادی کر لی ہے، تمہارا ...اور تمہاری باتیں اس حقیقت کی غمازی کر چکی ہیں۔ پھر بھی میں ان سے ملنا چاہتا ہوں —— ان سے مصافحہ کرنا اور آخری بار الوداع کہنا —— میں پرانی یادوں کا واسطہ ...دیتا ہوں —— بیٹا، کیا تم کوئی انتظام کر سکتے ہو؟ —— اچھا زبانی نہ ہی، فون ہی پر سہی"

غریب نواز کی آواز کانپ رہی تھی، اس کا بیٹا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس نے کہا: "ابا جان! آپ بجا فرماتے ہیں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ میرا دل سخت نہیں ہے، یہ دنیا خیالی نہیں بلکہ عملی دنیا ہے۔ ابا جان! اس لئے میں ...متفق ہوں۔ آپ کا واپس تشریف لے جانا ہی بہتر ثابت ہو گا۔ لیکن خدا کے لئے آپ امی سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ اس کی شادی کامیاب نہیں رہی؟"

"جی ... جی ... انہوں نے ایک اور مرد سے شادی کر لی ... وہ بہت اچھا آدمی ہے پر ابھی اسے آداب سکھانے کی ضرورت ہے اور آداب سکھانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ امی آپ کو ...ایک مثالی انسان کی حیثیت سے پیش کرتی رہیں۔ انہوں نے آپ کی تصویر دیوار پر لٹکا رکھی ہے تاکہ ایک مستقل مثال ہر وقت سامنے رہے۔ ہم بھی تھوڑی بہت ان کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی ...مثال کی یاد اسے کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہونے میں مدد دے رہی ہے۔ ابا جان اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اگر آپ نے ملاقات کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ ——؟"

غریب نواز یہ سن کر یک بیک اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے افضل کے کپڑے اتار ڈالے اور دوبارہ اپنی چادر کے دونوں ٹکڑوں کو اوڑھ لیا۔ نوٹ ابھی تک اس کے ہاتھ ہی میں تھے۔ ...وہ بولا "ٹھیک ہے بیٹا! میں سمجھ گیا، مجھے چلنا ہی چاہئے قبرستان تک جا، نیولا کہتی ہے، اگر تم گوارا کرو تو اچھا بھئی، السلام علیکم —— مجھے بہت خوشی ہے کہ کم از کم تم سے تو ملاقات ہو گئی، اچھا اب اجازت دو، میں ...اجنبی ہوں" اور وہ باہر نکل گیا —— دروازہ بند ہو گیا، اور چند لمحوں تک کمرے میں سکون رہا —— پھر افضل کو کچھ یاد آیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

اُس نے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا: "ابا جان!" —— بوڑھے آدمی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

افضل نے نہایت معصومیت کے ساتھ کہا: "معاف فرمائیے ابا جان! صبح آپ مجھ سے روپے لے گئے تھے نا، اگر آپ برا نہ مانیں تو ان میں سے جو باقی بچے ہوں وہ مجھے عنایت کر دیجئے"

مخزن المخازن

"اردو"

فنون لطیفہ کی اسلامی قدریں اقبال کی نظر میں

(عزیز احمد)

تمام اسلامی فنون لطیفہ میں اقبال کو صرف دو ہی متضاد رجحان نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلا رجحان سامی ہے۔ اس میں بڑا سوز، جوش اور حرکت ہے۔ دوسرا رجحان ایرانیت۔ یہ ہے تو ایرانی لیکن اس کی تعمیر بڑی حد تک یونانی کلاسیکی اثرات کے تحت ہوئی ہے۔ ان میں سے پہلا رجحان عربیت کا ہے کہ اس میں صحرائی زندگی کی ورقوت ہے۔ یہ رجحان جھوٹی آرائش و زیبائش سے مبرا ہے۔ یہ زندگی کی سختیوں سے پیدا ہوا ہے اور اس میں زندگی کی سختیوں کے مقابلے کی صلاحیت ہے۔ سامی ... لیے زندگیوں کے زوال کے قدر کے ادب تک ہر جگہ اپنی ... سے متاثر رہا ہے، فکر سالم پر مبنی ہے۔ اس میں ... بڑی قدرتی سادگی ہے۔ اسلامی فن کاروں کو اقبال کا یہ مشورہ ہے کہ جیسے اس سامی اور عربی رجحان سے سبق حاصل کرو۔

> نکر سالم ز ادب می باید نت
> رجعتے سوئے عرب می باید نت
>
> از چمن زار عجم گل چیدۂ
> نو بہار ہند و ایراں دیدۂ
>
> اندکے از گرمی صحرا بخور
> بادۂ دیرینہ از خرما بخور
>
> سر یکے اندر بر گرمش بدہ
> تن دمے با صرصر گرمش بدہ

اسلامی نظریۂ شعر | یونانی سخن پرست نظریۂ شعر کے مقابلے میں اقبال نے رسول کریم صلعم کے ارشادات سے ایک اسلامی نظریۂ شعر و فن مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ ان کا ایک بڑا دلچسپ مضمون "جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ"[1] ہے۔ دو مقولوں پر رسول اللہ صلعم نے جو تنقیدات ارشاد فرمائیں ان سے اقبال نے اہم تنقیدی نتائج اخذ کئے ہیں۔

(۱) ان میں سے پہلا موضوع وہ تعاجب رسول اللہ صلعم نے امراؤ القیس کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی: اشعر الشعراء وقائدھم الی النار (یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان کا سپہ سالار بھی ہے)۔

اقبال نے اس قول نبوی صلعم کا تجزیہ یوں بھی کیا ہے ... ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنھوں نے ... کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر ... ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوش ربا داستانیں ... جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں ... مرثیوں، سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہی عرب کے دور جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے ... قوت ارادی کو جنبش میں لانے کے بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بیخودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے"[2]

پھر اقبال نے ارشاد نبوی صلعم سے یہ تنقیدی نظریہ اخذ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ ضروری ...

---

[1] مطبوعہ مضامین اقبال (حیدرآباد دکن) صفحات ۵۷ تا ۸۰

[2] مضامین اقبال صفحہ ۷۹

نہیں کہ دونوں ایک ہی ہوں ۱؎

(۲) دوسرا واقعہ جو اقبال نے نقل کیا ہے اور اس سے تنقیدی نظریہ اخذ کیا ہے یہ ہے:-

"ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا۔

ولقد بیت علی الطوی واظلہ
حتی انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ: میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کی شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔ ۲؎"

اقبالؒ نے اس سے جو تنقیدی نظریہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیات انسانی کے تابع ہے۔ اس پر فوقیت نہیں رکھتی ۳؎"

سوزِ یقین: ان دو اہم تنقیدی تجربوں (۱) صنائع و بدائع کے محاسن کا زندگی کے محاسن ہونا ضروری نہیں اور (۲) صنعت حیات انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی، کے علاوہ اقبالؒ نے فنونِ لطیفہ اور خصوصاً شاعری کی ایک بڑی قدر جاوید نامہ میں رومی کی زبانی بیان کی ہے۔ یہ حرارت یا سوزِ یقین ہے۔

گفت آں شعرے کہ آتش اندروست — اصل او از گرمی اللہ ہوست
آن نوا گلشن کند خاشاک را — آں نوا برہم زند افلاک را
آں نوا بر حق گواہی می دہد — با فقیراں پادشاہی می دہد
خوں از و اندر بدن سیارتر — قلب از روح الامیں بیدارتر
اے بسا شاعر کہ از سحرِ ہنر — رہزنِ قلب است و ابلیسِ نظر

لیکن یہ تیسری تنقیدی قدر خالص مذہبی ہے اور اسے نظریۂ فن طرح حل نہیں کیا گیا ہے۔ (اقتباس)

۱؎ مضامین اقبال صفحہ ۷۶
۲؎ مضامین اقبال صفحہ ۷۶، ۷۷
۳؎ مضامین اقبال صفحہ ۷۷

"آجکل"

ایلورا

(سکندر علی وجد)

(اورنگ آباد دکن سے ۱۴ میل کے فاصلے پر دولت آباد کی پہاڑیوں میں تقریباً سو سال کی مدت میں (سنہ ۵۰۰ تا سنہ ۶۰۰) ۳۴ غار تراشے گئے تھے۔ مذہب و تمدن کی اس پرعظمت سنگین داستان میں پیکر تراشی کے بیسیوں بے مثل نمونے آج بھی محفوظ ہیں)

مرے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نورِ ازل بت ہیں آستینوں میں
حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں

یہاں جو سیر کو فکرِ رسا نکلتی ہے
وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

عیاں ہیں عرصۂ ہستی کے سب نشیب و فراز

رشتے حقیقت سے دور گرد مجاز
عمل کو خیال کی پرواز
نئے آدمی حیات کا ... دراز

کمند گردشِ ایام کے اسیر نہیں
نقوشِ دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں

تیرے جانب نقش کاروں کے
...ارمان تھے بہاروں کے
خواب تھے بیدار کہساروں کے
... کی بیشے تھے برق پاروں کے

تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

...وردل نئے خیال کی دنیا
... عروج و زوال کی دنیا
... جلال و جمال کی دنیا
... شے حال کی دنیا

بجوم ڈوب گئے جلوۂ سحر کے لئے
ہوا ہے خونِ دل اس جنتِ نظر کے لئے

عالم کا عکس یہ وادی!
شہر یاراں خموشی آبادی!
... کو بھی عرضِ ہنر کی آزادی
... ہے کوئی نقشِ فریادی

غلامِ مرضیٔ حالات حسن کار نہیں!
کمالِ فکر کے شہکار اشتہار نہیں

... اس آغوش کوہسار میں ہے
... خواب کسی چشمِ انتظار میں ہے

زمام شام و سحر دل کے اختیار میں ہے
زمانہ محو یہاں جستجوئے یار میں ہے

نگاہ ڈھونڈ رہی ہے نشاں نہیں ملتا
غبار سامنے ہے کارواں نہیں ملتا

"نگار"

نظیر اکبر آبادی اور نقاد

(نسیم اللہ بیگم)

نظیر اکبر آبادی اردو کے ان چند شعرا میں سے ہیں جن کے ساتھ بہت کم انصاف کیا گیا ہے شیفتہ نے گلشنِ بیخار میں نظیر اکبر آبادی کے متعلق یہ جملہ لکھا ہے: "اشعار بسیار دارد کہ بر زبان شوقین جاری است و نظر بر ابیات درصف شعرا نشایدش شمرد" شیفتہ خود نواب تھے اور دہلی کے جاگیردارانہ نظام کے ایک رکن۔ اس لئے انہیں قدرتاً نظیر سے نفرت ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک نظیر کی شاعری عوام کی شاعری تھی اور ایک نواب کی شان کے منافی تھا کہ وہ ایسی شاعری کو پسند کرے۔

دوسرے صاحب کریم الدین (مصنف طبقات الشعرائے ہند) نظیر کی امرد پرستی کے شاکی ہیں اور کہتے ہیں کہ "نظیر نے شعر بھی اسی لئے کہنے شروع کئے تھے۔ اس کے شعر بازاری لوگوں کو بہت یاد ہیں" ان کے جملہ کا پہلا حصہ ایک رکیک ذاتی حملہ ہے۔ وہ رند مشرب تھے اور بقول شیفتہ زبان کے چھوہڑ ہوں تو ہوں لیکن عمل کے پھوہڑ نہیں تھے۔ لیکن جملہ کا دوسرا حصہ شیفتہ کی رائے کا اردو ترجمہ ہے۔ کریم الدین صاحب خود بھی اقتصادی حیثیت سے طبقۂ عوام ہی کے فرد تھے۔ لیکن چونکہ ان کی توقعات طبقۂ خواص ہی سے متعلق تھیں اور وہ اپنے آپ کو عوام سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی نظیر کے متعلق وہی کہہ دیا جو شیفتہ نے کہا تھا۔

کریم الدین کے بعد نظیر پر گرد و ڈالنے والوں میں علامہ شبلی اور حالی

ہیں۔ علامہ شبلی کہتے ہیں کہ "ابتذال کی صاف اور بیّن مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے" اور حالی فرماتے ہیں کہ "اس کی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں" شبلی چونکہ خلفائے عباسیہ اور سلاطین کے مورخ ہیں اس لئے درباروں کی ٹھاٹ باٹ ان کے دل کو آتنا مسحور کر لیتی ہے۔ کہ عوام کی زندگی کا مطالعہ انہیں خشک اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے شبلی نظیر کی عام پسند زبان پر ان سے خفا ہیں۔

حالی نے گو نظیر کی زبان کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں لگایا اور مقام بوجہ اہلِ زبان پر ڈال دیا ہے پھر بھی انہوں نے نظیر کو گرایا ہے اور اس کا سبب بھی یہی تھا۔ کہ وہ خواص کی اصلاح کی طرف متوجہ تھے اور عوام کی طرف انہیں اعتنا نہ تھا۔ ڈاکٹر فیلن صاحب اپنی ڈکشنری کے دیباچے میں نظیر کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نظیر ایشیا کا شکسپیر ہے اور اس میں شک کرنے کی مجال نہیں" سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ کی تعریف کا بھی قریب قریب یہی انداز ہے۔ تاریخ ادب اُردو کی رائے یہ ہے کہ "تنوع مضامین، ناصحانہ روش، وسیع النظری، ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، خالص ہندوستانیت اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اس کو شعرائے اُردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے" ان تذکروں کے علاوہ سب سے پہلے شخص عبدالغفور صاحب شہباز ہیں جنہوں نے نظیر کو اپنی تحقیقی کاوشوں کا مرکز بنا کر "زندگانی بے نظیر" ترتیب دی۔ انہوں نے نظیر کو اردو کا شیکسپیر قرار دیا ہے۔ نظیر کی زبان کے متعلق سب حضرات کے یہاں اعتذار کا پہلو زیادہ ہے لیکن اکابر ادب میں وحیدالدین سلیم نے اس مسئلہ پر اپنی قطعی رائے پیش کر دی۔ وہ فرماتے ہیں "نظیر اکبر آبادی نے عام لوگوں کے میلے ٹھیلوں اور ان کے حالات و خیالات اور مشاغلِ زندگی کی ایسی صحیح اور سچی تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر ان کا مقابلہ اس باب میں نہیں کر سکتا۔ عام شعرا نے اس کی زبان کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے"

(اقتباس)

"ادبِ لطیف"

سحر سے پہلے

(فارغ بخاری)

یہ سُرمئی سے ہیولے افق کے دامن پر
ہر ایک لحظہ نئی ہیئتیں بدلتے ہوئے
کبھی دلوں کی حسیں دھڑکنوں کا رُوپ لئے
کبھی خیال کی پرچھائیوں میں ڈھلتے ہوئے
کبھی نگاہ کو حسنِ فریب دیتے ہوتے
کبھی جنوں کی اڑانوں کے ساتھ چلتے ہوئے
کبھی حکایتِ عہدِ طرب سنا
غمِ حیات کا لا، کبھی اُگلتے
یہ سُرمئی سے ہیولے اُفق کے دامن پر
تصوّرات کا عنوان بنتے جاتے ہیں
جو داستاں کہ ابھی وقف بننے والا ہے
زبانِ حال سے وہ داستاں سناتے ہیں
جو دب چکی ہیں حوادث کی شاہراہوں میں
ان اونگھتی ہوئی یادوں کو گدگداتے ہیں
میں سوچتا ہوں مگر سوچتا ہی رہتا
ہر ایک موڑ پہ یہ آئینہ دکھا
خزاں کا گرچہ تسلط ہے صحنِ گلشن پر
مری نگاہوں میں رعنائی بہار بھی ہے
خمارِ گریۂ شب ہی نہیں مآلِ حیات
اسے سحر کے تبسم کا انتظار بھی ہے
مدام بے کس و مجبور ہی نہیں انساں

ی اسے قسمت پہ اختیار بھی ہے
میں سوچتا ہوں کہ یہ تلخ زندگی میری
ہو تیرا ساتھ میسر تو خوشگوار بھی ہے

۔۔۔ نئی زنجیر میں نہ پہنوں گا
مجھ کو پرانا قفس جلانا ہے
توڑنا ہے مجھ کو یہ فرسودہ نظام
مجھ کو نئی بستیاں بسانا ہے
نوع بشر کے عروج کی خاطر
فضاؤں کی وسعت کا بھید پانا ہے

ابھی تو کرنا ہے خود مجھ کو اس کا استقبال
نئی حیات کا جو قافلہ روانہ ہے

"قومی زبان"

سندھ میں اردو

(محمد امین زبیری)

اردو کبھی سندھ میں اجنبی نہیں رہی جیسا کہ اہل سندھ کی اردو تصانیف ظاہر ہے۔ سندھ کے شہروں اور قریوں سے صدہا طالبان علم نے اردو بول کے علمی مراکز میں جو شہر و قصبات میں واقع ہیں تعلیم حاصل کی اور ذریعۂ تعلیم رہی۔ علی گڑھ کے کالج اور یونیورسٹی ہی میں نہیں بلکہ اس کے اسکول میں یہ کم عمر سندھی طلبہ داخل ہوتے رہے اور ان کو کوئی دقت جو زبان سے ہو سکتی ہے پیش نہیں آئی چند ہی سال ہوئے کہ پیر پگاڑو کے دو کم سن بچے حکومت انگریزی نے وانس چانسلر کی نگرانی میں داخل کرائے تھے یہ نفیس اردو بولتے سنتے سمجھتے تھے۔

آج سے بیالیس سال پہلے اسی شہر کراچی میں جو سندھ کا دارالحکومت تھا ایک عظیم الشان تعلیمی و سیاسی اجتماع ہوا تھا یعنی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے منعقد ہوتے تھے جن میں تقریبا تمام صوبوں کے نمائندے شریک تھے تعلیمی کانفرنس کے صدر مولانا حالی اور مسلم لیگ کے صدر مسٹر آدم جی پیر بھائی تھے۔ اور دونوں اداروں کے سیکرٹری مولوی مشتاق حسین نواب وقار الملک تھے، کانفرنس کا خطبۂ صدارت اردو میں تھا۔ اور لیگ کا خطبۂ صدارت انگریزی میں، مگر اور سب کارروائی اردو میں ہوئی تھی مسلم لیگ کا اولین دستور بھی اسی اجلاس اسی زبان میں مرتب ہوا تھا۔

اہل سندھ نے ان اجلاسوں کو کامیاب بنانے میں انتہائی دلچسپی لی تھی۔ اس کے بعد پھر ایک تعلیمی اجتماع خیرپور میں ہوا تھا ستمبر ۱۹۴۰ء کل ہی کی بات ہے کہ جب اردو صوبائی کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جن میں مشاہیر سندھ نے نہایت اہم حصہ لیا اور بیش بہا امداد کی۔ یہ تمام واقعات اس امر کا صاف ثبوت ہیں کہ سندھ کے ممتاز اہل الرائے کو اردو کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ اور وہ اس کا فروغ چاہتے ہیں۔ (اقتباس)

"عالمگیر"

غزل

(نجم آفندی)

ارادہ جب اٹل ہے انقلاب آنے سے کیا ہوگا
نہ بدلے گا یہ دل دنیا بدل جانے سے کیا ہوگا
کہیں جھوٹی تسلی سے کسی کی پیاس بجھتی ہے
مجھے سمجھاؤ، میرے دل کو سمجھانے سے کیا ہوگا
ملے گی کچھ نہ کچھ دیوانگی ہر مرد میداں میں
یہی کہتی رہے دنیا کہ دیوانے سے کیا ہوگا
کوئی تدبیر کیجے میں نہیں تقدیر کا قائل!
مری حالت پہ نظر ہائے ترس کھانے سے کیا ہوگا

نگاہ شمگیں دعوت نہ بن جائے تبسم کی
ہم ایسے منچلوں پر آگ برسانے سے کیا ہوگا

بحمداللہ محفل کی فضائیں نے بدل ڈالی!
اُٹھا دیجیے مجھے اب میرے اُٹھ جانے سے کیا ہوگا

"معارف"

غزل و قصیدہ اور زوال سلطنت

(شاہ معین احمد ندوی)

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ولی اور اُن کے متبعین کے پیام بوالہوسی سے محمد شاہ اور پوری قوم عیش پرستی میں مبتلا ہو گئی اور تغزل او قصیدہ نگاری نے ارکان حکومت کو فکر سلطنت سے آزاد کر دیا، اور مسلمانوں کی تباہی کا سبب غزل سرائی ہے:

درحقیقت تغزل یعنی عاشقانہ جذبات سے دُنیا کی کسی قوم اور کسی زبان کی شاعری خالی نہیں بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اسی جذبہ نے شاعری کو پیدا کیا، یا کم از کم اس کو ترقی دی، یہ اور بات ہے کہ مختلف زبانوں کی شاعری میں اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوں، ولی اور ان کے متبعین کے پیام بوالہوسی اور قصیدہ و غزل کے اثر سے محمد شاہ اور مسلمان قوم عیش پرستی میں مبتلا نہیں ہوئی، بلکہ اس سے بہت پہلے مبتلا ہو چکی تھی، تغزل اور قصیدہ نگاری سے نہ ارکان حکومت فکر سلطنت سے آزاد ہوتے ہیں، اور نہ کوئی قوم عیش پرستی میں مبتلا ہوتی ہے، اس کا سبب غفلت و جمود بے عملی اور دوسرے طبعی اسباب ہوتے ہیں۔ اردو غزل فارسی غزل کی نقل ہے۔ اس لئے یہی اثرات فارسی شاعری اور غزل کے بھی ہونے چاہئیں، حالانکہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری کی اصلی ترقی کا زمانہ جو زیادہ تر قصیدہ و غزل و نسیب پر مشتمل ہے، وہی ہے، جو اسلامی حکومتوں کے عروج کا ہے، بلکہ مسلمان حکمرانوں ہی کی قدردانی سے شاعری کو فروغ حاصل ہوا، بنی امیہ کے عہد سے لے کر تیموریوں کے خاتمہ تک تمام مسلمان حکمران خاندان اور ان کے بیشتر فرمانروا خود بھی شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ اور شاعروں کے قدردان اور سرپرست تھے، عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے تمام شعراء اخطل، جریر، فرزدق سے لے کر ابن الرومی، بحتری، صابی، ابن العلاف تک اور رودکی اور دقیقی سے لے کر عرفی کاشمیری اور ناصر سرہندی تک اپنے اپنے زمانہ کے سلاطین کے درباروں سے وابستہ یا کم از کم اُن کی فیاضیوں سے بہرہ یاب تھے حتیٰ کہ حکیم سنائی، نظامی اور شیخ سعدی جیسے شعراء کا بھی کچھ نہ کچھ سلاطین سے تعلق رہا تھا عربی و فارسی کے تمام بڑے بڑے شعراء غزل گو بھی تھے اور قصیدہ گو بھی، ان میں سے بہتوں کے تغزل کی رنگینی اردو غزل سے بھی بڑھ کر ہے لیکن اُن کی غزل سرائی اور قصیدہ نگاری نے نہ ان سلاطین کو فکر سلطنت سے آزاد کیا اور نہ مسلمانوں کو عیش پرست بنایا۔ بلکہ یہی زمانہ مسلمانوں کے اوج شباب کا تھا۔ اور غزل اور قصیدہ کے قدردان سلاطین فوجوں کے سپہ سالار، ملکوں کے فاتح، اور جہانگیر و جہاندار تھے۔ شاعری اور شعراء کا سب سے زیادہ قدردان اور سرپرست محمود غزنوی تھا، جس نے سب سے پہلے اپنی حکومت میں شاعری کا مستقل محکمہ قائم کیا، اور اس کے جو مقرر کئے، کئی سو شعراء اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے، حال ہر دور میں رہا، خود تیموریوں کے عہد میں فارسی شاعری کی ترقی کا زمانہ وہی ہے جو تیموریوں کے عروج کا ہے۔ فیضی، عرفی، نظیری، طالب، قدسی، ابوطالب کلیم، صائب، ناصر علی سرہندی اور غنی کاشمیری وغیرہ بڑے شاعر اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک کے زمانہ میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی شاعری کا بہترین ذخیرہ مسلمانوں کے عہد عروج اور نامور سلاطین کی قدردانی کی یادگار ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ قصیدہ نگاری اور تغزل نے مسلمان سلاطین کو فکر سلطنت سے آزاد اور مسلمانوں کو عیش پرستی میں مبتلا کیا صحیح نہیں ہے۔ قصائد تو ان سلاطین کی یادگار ہیں جن کی تلوار

پر اس نے اپنے سینہ پر پتھر رکھا۔ اور اسے وطن جانے کی اجازت دے دی۔ شہزادہ اپنے جہاز پر روانہ ہوگیا اور ملکہ اس کے جہاز کو پہاڑ کی چوٹی پر سے دیکھتی رہی۔ جہاز آہستہ آہستہ چھوٹا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ افق میں غائب ہوگیا۔ جہاز غائب ہوتے ہی ملکہ غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ چند گھنٹوں بعد جب اس کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرہ میں تھی۔ کچھ دنوں تک وہ صاحبِ فراش رہی جب ذرا سنبھلی تو سست نڈھال رہنے لگی اور وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگی۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن شہزادہ نہ آیا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ وہ اپنی ملازمہ سے پیازی رنگ کا لباس سلوائے گی جو وہ شہزادہ کی واپسی کے دن پہنے گی۔ ایک مہینہ اور گزر گیا اور لباس بھی تیار ہوگیا لیکن شہزادہ واپس نہ آیا۔ ملکہ ہر روز اپنا لباس نکالتی اور پیازی رنگ کے بادبان دیکھنے پہاڑی پر جاتی۔ وہ سمندر کے کنارے کشتی چڑھتی، روتی اور چلاتی لیکن جہاز نہ آنا تھا نہ آیا۔

پانچ مہینہ بعد ملکہ نے اپنا لباس ایک صندوق میں بند کرکے رکھ دیا اور کہنے لگی "وہ مجھے بھول گئے۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے" یہ کہہ کر وہ پہاڑی کی چوٹی پر چڑھی، اس افق کو جہاں شہزادہ کا جہاز غائب ہوا تھا بڑی حسرت و یاس کی نظر سے دیکھا لیکن بے سود و بیکار، جہاز کا نشان تک نہ پا سکی۔ آخر سمندر میں کود کر موجوں کی نذر ہوگئی

ملکہ کی اچانک اور بے وقت موت سے سارا تھریس ماتم کدہ بن گیا۔ دوسرے دن ملکہ کو اس کے پیازی لباس میں کفنا دفنا کر اس کی قبر پر بادام کا ایک درخت بو دیا گیا۔ موسم بہار کی آمد پر درخت میں نئی پتیاں پھوٹ آئیں جو ہمیشہ نم رہا کرتیں۔ نم پتیوں کو دیکھ کر لوگ کہتے "ہماری ملکہ مرنے کے بعد بھی دیمرفون کی جدائی میں آنسو بہا رہی ہے۔"

ایک سال گزر گیا۔ آغاز بہار تھا، بادام کے درخت کی بے برگ و بار شاخیں ملکہ کی قبر پر پھیلی ہوئی تھیں کہ شہزادہ اپنے وطن سے تھریس واپس آیا۔ وہ ملکہ کو بھولا نہیں تھا۔ لیکن مجبوریوں نے اس کو جلد واپس آنے کا موقع نہ دیا۔ تھریس واپس آتے ہی اس نے محل کے داروغہ سے پوچھا "ملکہ کہاں ہے؟" سن کر خاموش ہو گیا اور شہزادہ کو ملکہ کی قبر پر لا کھڑا کر دیا۔ شہزادہ نے ملکہ کی دیکھ کر بادام کے بے برگ و گل درخت کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ درخت سینہ سے لگانے ہی اس میں پیازی رنگ کے پھول نکل آئے۔ اس وقت سے بادام کے پھول پتوں سے پہلے نکلنے لگے۔ ملکہ فلس اب بھی موسم کو خوش آمدید کہنے اپنا پیازی جوڑا پہنتی ہے۔

صورت سنگھ کی اردو شاعری

(بشیر مخفی)

اپنے کتب خانہ علمیہ میں حیدرآباد سندھ سے آیا ہوا ایک سندھی شاعر کے اردو فارسی کلام کا نسخہ میرے مطالعہ میں آیا۔ جو کتابت، طباعت لحاظ سے خاصا بوسیدہ اور پرانا ہے۔ اسے پڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہندو شاعر اپنی مذہبی روایات قلمبند کرتے ہوئے اردو زبان کو کس طرح سے استعمال کر چکا ہے اور اردو غزل گوئی اور اردو شاعری سے بھی کس قدر دلچسپی رکھتا ہے۔ مصنف و شاعر کے حالات کا کچھ زیادہ پتا نہیں چلتا۔ کتاب کا نام ہے "پریم تت" معروف بہ دیوان صورت بہار۔ جس کا تخلص صورت ہے۔ یہ کتاب مطبع "دنیا دنو دکراچی" میں سنہ ۱۸۹۰ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بعض مذہبی بزرگوں کے متعلق شاعر کا عقیدتی کلام ہے۔ اور زیادہ تر غزلیں پرانے رنگ اور پرانی طرز کی ہیں۔ صورت سندھی اردو فارسی میں اچھے انداز میں اپنے جذبات و خیالات کی عکاسی کرتا ہے اور مسلمان صوفیائے سندھ کے مشہور بزرگوں کے متعلق بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

دیوان پر ایک منظوم اردو تقریظ منشی کھیم سنگھ صاحب نے لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ گلزار بے خار صورت بہار
کھلیں جس میں معنی کے غنچے ہزار

شگفتہ ہیں گل اس میں رنگیں نگار
کئی بلبلیں اُن پہ ہوتیں نثار
کئی قسم کے رنگ اور اس میں ڈھنگ
ہندوستان پنجاب دکن کے دیار
محبت کے گلبن ہرن جس میں کھلے
صفت صدق کے نہر جاری ہزار
جو اس باغ کی سیر کرتا رہے
مو کب وہ اب میں تم کا دیکھے بہار

مصنف نے اپنے کلام غزلیات وقصائد و مثنوی کو ہندی موسیقی کے
لکھنے کی کوشش کی ہے اور جگہ جگہ علم موسیقی ہندی کے راگوں کے اشارات
ہیں۔

بندش سے ساتھ ساتھ اردو فارسی کے کلام موجود ہیں۔ صرف ردکافیاں
بان میں کہی ہیں۔ اس مجموعہ میں بہت سی کافیاں اور غزلیں ملتی ہیں۔
نی نمبرے دیکھئے:

واہ واہ عشقا تیرا ایمان
ہیر سیم ہوئی رانجھ جان
عاشق جیوا ہو یا لیلے
سسّی پنوں پڑے پہچان
سوہنی ڈوب میں ہار کے ہوئی
گھر میں تھی دو دن مہمان
صورت بد کو بہار کیا تم!
واہ واہ عشقا ترا احسان

دو غزل ملاحظہ ہو۔

نام تو محبوب کا پھر کام بھی محبوب ہو
خوبرو خوشخو تے ہو خوشنام ہو مرغوب ہو

خوب ہونے میں خوشی محبوب ہونے میں مزا
کیوں نہ ہو محبوب جس کے دل کا حق مطلوب ہے
منہ کے آگے سے مرنا کام درویشوں کا ہے
بندہ بے پروا کسی کے آگے کب مغلوب ہو
(اقتباس)

تبرکاتِ مخزن

جامع مسجد دہلی کے گردا گرد کے حالات

جو غدر سے پہلے تھے اور جو اب ہیں

(منقول از مخزن بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء)

شاہجہان نے اکبرآباد کے قلعہ کا یہ حال دیکھ کر کہ اس کے پاس جامع مسجد
بنانے سے اس کے باہر بادشاہ کی سواری اور اُمرا کی سواریوں کے جلوس کے
کھڑے رہنے کے لئے جگہ بہت تھوڑی باقی رہی تھی جس کے سبب سے بڑی
چپقلش ہوتی تھی۔ اس لئے اُس نے دہلی میں قلعہ کے ہزار گز کے فاصلے پر
جامع مسجد بنوائی۔ اور قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان بڑے بڑے میدان رکھے
جن میں قلعہ سے باہر بادشاہ اور امراء کی سواریوں کے جلوس بافراغت ٹھہرتے
رہیں۔ مسجد کے گرد بہت چوڑے رستے چھوڑ کر مشرقی دو کونوں میں بہت
بڑے بڑے دو حوض بنوائے تھے مگر وہ بند ہو گئے اور ان پر مکانات
بن گئے اور سنہ $\frac{1060}{1650}$ میں مسجد کے عقب میں شمال مغربی کونے میں ایک
دارالشفا اور مغربی جنوبی کونے میں دارالبقا بنا۔ دارالشفا میں طبیب مفت
علاج کرتے اور دوا خانہ سے بیماروں کو دوا بے قیمت دیتے۔ مگر غدر
سے پہلے دارالشفا کا یہ حال نہیں رہا تھا۔ شہزادوں نے اس پر قبضہ کر کے
اپنے مکانات بنالئے تھے۔ ان میں سے شیش محل اب تک موجود ہے
دارالبقا میں پہلے شاہی مدرسہ تھا۔ اس میں معقول و منقول کا درس جاری تھا
مگر وہ بھی بالکل ویران ہو گیا تھا۔ اس کی عمارت بھی جا بجا سے شکستہ ہو گئی
تھی کہ سنہ ۱۸۲۰ء میں مولوی محمد صدرالدین خاں صدرالصدور شاہجہان آباد

اتفاقاً اور بادشاہ سے لیکر اس کی مدت میں بہت روپیہ خرچ کیا اور معلم
اس سے تنخواہ دے کر نوکر رکھے اور بہت طلبہ مستعد مستعد جمع کئے
کہ وہ اپنے پاس سے دیتے تھے۔ نانبائی کی دکان دارالبقا کے
زہ پر تھی۔ دارالبقا کے صحن کے بیچوں بیچ میں ایک کنواں پہاڑی کو کاٹ
جان میر منشی وزیر ماچیتانہ نے بنوایا تھا۔ اس میں بہت
پ تھا کہ مسجد کے گرد شاہجہانی چوڑے راستے اور میدان باقی
ہے تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں جامع مسجد کے عقب کی دیوار سے
دال والوں کی دکانیں پیوستہ تھیں جو مسجد کے ساتھ ایسی معلوم
تا ہے کہ زربفت میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے اور مسجد کے شمالی مغربی گوشہ
چبوترہ قبرستان بنا اور چبوترہ کے سرے پر ایک چھوٹی سی مسجد بن جانے
سے رخ زیبا پر چیچک کے داغ معلوم ہوتے تھے۔ مسجد کے گرد
لوگوں نے اپنے مکانات بنائے تھے جنہوں نے جامع مسجد کو گھیر لیا
وہ ان کے اندر ایسی معلوم ہونے لگی تھی جیسے کوئی حسین عروس
ے لگا کے بالوں کی کوٹھڑی میں بند ہو۔ عالی شان عمارتوں کی حسانت
لک جب ہی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ چاروں طرف سے کھلے میدانوں
اور کر پھیلے نیچے اونچے مکانات ان کے گردو پیش ہوں۔
جاتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی وہ حس جو حسانت کا ادراک کرتی ہے
ہے۔ اس لئے مسلمان سمجھتے ہی نہ تھے کہ ان مکانات کا مسجد کی گردن
کرنا اس کے حسن کی نمائش کو خاک میں ملانا ہے۔ مگر غدر کے بعد
انگریزوں کو یہ خیال آیا کہ اس مسجد کے چاروں طرف میدان کرکے اس کی
شان نمایاں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے گرد ان محلوں اور
ان عمارتوں کو صاف کیا۔ دارالشفاء دارالبقا۔ چاوڑی کے بازار کا بیٹھ
سے کے محلہ کا گلیوں کے بازار کا۔ امام کی گلی کا کچھ کچھ حصہ مسمار کیا۔
بازار بالکل اڑا دیا۔ اور اور محلے بھی بالکل بے نام ونشان کئے اور یہ تجویز
اس کے گرد چمن اور باغ لگاتے جائیں جس سے اور بھی مسجد کے حسن پر
بہار آجاتے۔ چمنوں کے لئے عقب میں دو سنگھاڑے بنائے اور ان میں
درخت لگائے۔ مگر زمین ایسی سنگلاخ تھی کہ اس نے پودوں کی جڑوں کو
جگہ نہ دی۔ ناچار سنگھاڑے توڑ دیئے گئے۔ اور چمنوں کے لگانے کی تجویز
کو ملتوی کر دیا۔

اس مسجد کا پیچھا دال والوں کی دکانوں کے الحاق سے نہیں چھوٹتا تھا۔
کہ مسجد کی کمیٹی منتظم نے جنوبی جانب میں چوبی دکانوں کی قطاریں بنوائیں۔
جس سے مسجد کے مغربی جانب میں ذات الجنب کا مرض اور بڑھا۔ جو کہ
عمارت کے حسن پرست ہیں وہ ان دونوں طرف کی دکانوں کو مسجد کے
حسن پر ایسا داغ لگا ہوا جانتے ہیں کہ ان کا بس چلے تو وہ اس کو اٹھا
دیں۔ مگر یہ داغ مسجد کو ورم دیتے ہیں اس لئے وہ مٹنے کے نہیں۔
دکانوں کا نام غدر سے پہلے دال والی دکانیں تھا۔ اور ان میں پہلے
نری دالیں ہی بکا کرتی تھیں مگر اب وہ اناج کی بڑی منڈی ہو گئی ہیں جس
کے آگے اناج کے انبار لگے رہتے ہیں۔ اور چھکڑوں کی قطاریں کھڑی
رہتی ہیں

زمزمۂ نشاط

(منقول از مخزن۔ بابت ماہ نومبر ۱۹۰۸ء)

زندگی مزے کی ہے لطف جاں اٹھائے جا　　لطف جاں اٹھائے جا یہ مزے اڑائے جا
حملہ ہائے فکر و غم ہوں اگرچہ دمبدم　　وار سب بچائے جا فکر و غم ٹلائے جا
ظلم دشمناں سہی جور دوستاں سہی　　رنج اندوہاں سہی بھول جا بھلائے جا
داغ رفتگاں سہی سوزش نہاں سہی　　داغ یہ چھپائے جا آگ یہ بجھائے جا
ماجرائے حسن و عشق خار دل اگر بنے　　دل سے تو نکال پھینک یہ خلش مٹائے جا
زندگی کہیں جسے وہ تو سیل آب ہے　　بہہ چل اور بہائے جا بہہ چل اور بہائے جا
شب زیادہ شمع کم ہے اگر تو کیا ہے غم　　جب تلک کہ جل سکے بے دھڑک جلائے جا
منتظم ہے ساقیا فرصت انبساط کی　　پی بھی اور پلائے جا پی بھی اور پلائے جا
ماضی پہ خاک ڈال کل پہ پر کاہ حال　　جام و شیشۂ شراب سنبھال دور یہ چلائے جا

ایڈیٹر کے نام

پاکستانی ادب

"مخزن" کا اجرا ہمارے لئے وجہ مسرت ہی نہیں بلکہ وجہ افتخار بھی ہے یہ جریدہ اردو کی لسانی اور ادبی ترقی کے سلسلے میں ایک "پرانے مجاہد" کی حیثیت رکھتا ہے اور اب تنے ادبی شعور کا ترجمان نظر آتا ہے میں اس کا مطالعہ اپنا ملی فرض تصور کرکے کرتا ہوں لیکن ایک شمارے کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس شمارے میں "پاکستانی ادب" کے عنوان سے ایک قابل قدر مقالہ شائع ہوا ہے لیکن ایک خاص بات صاحب مقالہ نے کسی وجہ سے نظر انداز کر دی ہے "پاکستانی ادب" اردو مجلس کراچی کی "ادبی تحریک" ہے جس کی ہفت روزہ نشستوں میں گزشتہ سال تقریباً تمام مسالک خیال کے نمایندوں نے مستقل بحث کی۔ اس بحث و تمحیص کے بعد "پاکستانی ادب" پر پہلا مضمون راقم الحروف نے اردو مجلس کراچی میں پڑھا جو ماہنامہ "محفل" کراچی کے پہلے شمارے میں چھپ چکا ہے۔ دوسرا مضمون بعنوان "پاکستانی ادب کی فکری اساسیں" غلام محمد بٹ صاحب نے تحریر کیا۔ جو ہفت روزہ "غالب" کراچی میں شائع ہوا تیسرا مضمون اسی عنوان سے جناب صفدر مخدوم نے پڑھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ترقی پسندوں نے "سویرا" میں "پاکستانی ادب" تحریک کو جناب صمد شاہین ایڈیٹر "نیا دور" کے نام کے ساتھ "چپکا کر" تحقیر آمیز تبصرہ کیا۔ اس بحث سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ناقدین "پاکستانی ادب" پر تبصرہ کرتے ہوئے اگر اس تحریک کی بانی جماعت یعنی اردو مجلس اور اراکین اردو مجلس کا جنہوں نے اس عنوان سے سب سے پہلے مضامین لکھے۔ ذکر بھی کر دیا کریں تو مناسب ہوگا۔ نئے لکھنے والے یا گمنام ادیب و شاعر آج نہیں تو کل اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعہ ترقی تو ضرور کریں گے، لیکن اس سلسلہ میں اگر اہل نظر بھی ادبی تعاون کا ثبوت دیں تو بہتر نتائج ہو سکتے ہیں شہرت یافتہ ادبا و شعرا کے نام اچھالنے کا زمانہ گزر گیا اور اس قسم کی بت پرستی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ر ظفر احسن آصف جائنٹ سیکریری اردو مجلس کراچی

حسن ظن

کراچی کے انتہائی ذمہ دار ادیبوں کے اس خیال پر کہ اردو کا بہترین رسالہ "مخزن" ہے آپ کو مبارک باد دینا اپنا فرض خیال کرتا ہوں تقریب وہ کی بات ہے، ہمارے بھائی نے وقار عظیم صاحب سے دریافت کیا تھا کہ اس وقت پاکستان و ہندوستان میں اردو کا بہترین رسالہ کونسا ہے ان کی زبان سے بے ساختہ "مخزن" نکلا۔ اس میں آپ کا خلوص، وہ خلوص جو آپ اردو زبان سے رکھتے ہیں، کارفرما نہیں تو اور کیا ہے۔ حالانکہ مخزن کا لباس زرق برق نہیں لیکن حقیقت بیں نگاہیں اس کے حسن خیر فانی کو خوب پہچان لیتی ہیں۔ اور یہی آپ کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے رضا نعیم

تجاویز

مخزن کا سہ بارہ اجرا اور اس کی روز افزوں ترقی اس حقیقت کی ثبوت ہیں کہ ابھی صالح اور متین ادب کے پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد خاصی ہے میں ذیل میں چند گذارشات کر رہا ہوں امید ہے آپ غور فرمائیں گے اول یہ کہ آپ "تبرکات مخزن" زیادہ صفحات پر شائع کیجئے، کیونکہ مخزن کے پہلے اور دوسرے دور کی مقدس جلدیں ہر ایک کی دسترس سے باہر ہیں۔ دوسرے یہ کہ "مخزن المخازن" میں پورے مضمون لکھنے کی بجائے آپ اختصار سے کام لیں، اگر آپ اس عنوان کے تحت مشہور عالم رسالہ READERS DIGEST

کی نقل کریں تو خوب ہے مثلاً آپ پلیے اور غیر ضروری عنصر کو نکال کر صرف
ضروری پہلوؤں کو پیش کریں۔ (محمد اختر وکیل)

مخزن: مشورہ کا شکریہ! مخزن المخازن میں اقتباسات اور خلاصے ہی
شائع ہوتے ہیں۔

اہلِ قلم کے نام

مخزن کے چار پرچے دیکھے۔ بخدا اس غلط "ترقی پسندی" کے دور میں
مخزن کا دم لبا غنیمت ہے۔ آخر میں جو دلچسپ انتخاب ہوتا ہے اس نے تو
مجھے مجبور کر دیا ہے کہ مخزن ہر ماہ باقاعدہ طور پر خرید کر پڑھوں۔ میرے خیال میں
اگر آپ مخزن میں قدیم و جدید شعراء کا تذکرہ اور اُن کے کلام کا سنجیدہ انتخاب
بھی ہر ماہ دیا کیجئے۔ باذوق صاحب اور دوسرے اہلِ قلم سے سیر و سیاحت،
سوانح عمری اور شعر و شاعری سے متعلق زیادہ سے زیادہ مضامین حاصل کرکے
شائع فرمایئے۔ مشاہیرِ شعر و ادب کی تصویریں بھی ہر ماہ شاملِ اشاعت ہونی
ضروری ہیں۔ اچھی اچھی علمی اور ادبی کتابوں کا ذکر بھی نہایت مفید ہے۔ نوادر
کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ مکتوبات میں لکھنے والے کی شخصیت کی جھلک
نظر آتی ہے۔ اختر شیرانی مرحوم کے متعلق کوئی دلچسپ مضمون حاصل کرکے
شائع کیجئے۔ آپ کی کوئی تازہ نظم یا غزل نظر سے نہیں گزری۔ آپ اپنے
کلام کا ایک جامع انتخاب مخزن میں فوراً شاملِ اشاعت فرمایئے۔ کیا
ملک صاحب صرف ہمایوں کے لئے وقف ہیں۔ حمید احمد خاں صاحب
غالب کو چھوڑ کر کسی دوسرے شاعر پر بھی لکھا کریں (ناظر رومانی۔ کنڈیاں)

مخزن: مخزن کی تعریف دراصل مخزن میں لکھنے والوں کو خراجِ عقیدت ہے۔
مخزن کو زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کی تجاویز کے صحیح مخاطب بھی فی الواقع
مخزن میں لکھنے والے اہلِ قلم ہیں۔ ہمیں آپ سے پورا اتفاق ہے۔ اور
ہم مخزن کے ذریعہ سے آپ کی تحریر متعلقہ اصحاب تک پہنچا رہے
ہیں۔ ان کو جامۂ عمل پہنانا معاونین کا کام ہے۔

★

"مقتول شکاری"

رسالہ مخزن بڑے شوق سے پڑھا گیا۔ منجملہ اور مضامین کے "مقتول
شکاری" خاص دلچسپی کا باعث ہوا۔ جو میں نے اور کئی دیگر احباب نے بہت
پسند کیا۔ اردو زبان میں ایسے مضامین کی بہت ضرورت ہے
(سردار محمد مسیب انسپکٹر پولیس پنجاب)

تلفظ

نومبر کا مخزن ملا۔ "تلفظ کی غلطیاں" سب سے پہلے توجہ کا مرکز بنا۔
آپ نے تلفظ کی اغلاط اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیتے ہوئے مکالمہ
میں تحریر کیں۔ مجھے یہ طریق بہت پسند آیا۔ اسے مستقل باب رکھئے تاکہ
پڑھنے والے اپنا تلفظ درست کر سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت تک کسی نے
اس طرف توجہ نہیں دے رہا ہے۔ ادب اور زبان کی خدمت کرنے کے لئے
یہ بھی ضروری ہے کہ زبان کو تلفظ کی اغلاط سے پاک کیا جائے۔ یہ قدم بھی
ادب پر ایک احسان کے مترادف ہے۔ آپ کی اور مخزن کی خدمات کو
نہ تو آج تک فراموش کیا جا سکا ہے اور نہ آئندہ مورخین ادب اور اہلِ قلم
ادب فراموش کر سکیں گے۔ (تصدق حسین)

واقعیت

مخزن خدا کرے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ وضع داری آپ کا
جوہر ہے۔ آپ ادب میں بھی اسے نبھا لیتے ہیں۔ میں عریاں نگاری کو خوب
نہیں کرتا مگر بعض دفعہ اظہار میں بے تکلفی کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ اگر ادب
اگر پائنچے اور آستین کی تنگی اور فراخی کا خیال رکھا جائے تو "واقعیت" کی
"آب" جاتی رہتی ہے۔ بیان میں کمی نہیں آتی مگر بیان کی روح مجبوس ہو جاتی
ہے اس لئے میں دانستہ طور پر کوئی قید نہیں لگاتا۔ مگر مجھے ۔ ۔ ۔ کی قسم کے
عریاں افسانے نہ لکھنا آتے ہیں نہ اُن کی طرف میری طبیعت راغب ہی ہوتی ہے
گزشتہ مہینوں میں تخیل کو عشق کے نفسیاتی امکانات کی آزمائش رہی ہے اور اسی سلسلہ
ملک باہوں جنوں میں کیا کیا کچھ والی بات ہو گئی۔ انشاءاللہ اب کوئی دُھلی دھلائی
چیز پیش کر سکوں گا۔ (سید فیاض محمود)

اصولوں کا آئینہ ضابطہ عالم میں اگر کسی کے پاس ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام فلسفے انسان کی فطرت کے نظریات لیکن اسلام خود فطرتِ انسانی کے متعلق اپنا ایک فلسفہ اور نظریہ رکھتا ہے۔ اور مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہی نظریہ سچا اور بے خطا ہے۔ یہ تمام فلسفے کو دعوتِ مقابلہ دیتے رہتے ہیں۔ ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ہم یہ دعوت قبول کرتے اور فطرتِ انسانی کے متعلق اسلامی نظریہ کی صحت کو خالص علمی نقطہ سے ثابت کر دکھاتے مگر اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے ہم نادانستہ طور پر غیر اسلامی فلسفوں سے متاثر ہوتے چلے گئے اور آج ہم میں اکثر تعلیم یافتہ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ان میں سے کسی نہ کسی فلسفہ کے بنیادی نظریے کے قائل ہیں اور نہیں جانتے کہ ان عقائد سے ہمارا تعلق رکھنا اسلام سے کنارہ کشی کے مترادف ہے۔ بقول مصنف اقبال کے اس حکیمانہ شعر میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی — یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

مصنف کے نزدیک مسلمانوں کے مرض کی تشخیص مصنف کا خیال ہے کہ مغرب کے غلط تصورات کے خلاف اسلام کا قدرتی ردِ عمل اقبال کے فلسفۂ خودی کی صورت میں نمودار ہوا ہے اور یہی مسلمانوں کے احساسِ کمتری کا علاج بھی ہے چونکہ باطل نے فلسفے کی صورت اختیار کی ہے اس لئے حق بھی اس کے مقابلے کے لئے ایک فلسفے کی صورت میں متشکل ہوا ہے۔ چونکہ باطل تازہ علوم اور جدید فلسفے کے ہتھیاروں سے مسلح تھا اس لئے حق بھی اس کے مقابلے میں تازہ علمی حقائق اور علمی طرزِ استدلال سے مسلح ہو کر آیا ہے تاکہ باطل کو اسی کے اسلحہ سے شکست دے۔

مصنف نے اقبال کے فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا اور آخری فلسفہ اسلامی فلسفہ ہے۔ جس کا شارح اقبال ہے اور اس کا مقصد شاعری نہیں تبلیغِ حق ہے۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست — سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

مصنف کی رائے یہ ہے کہ دنیا کے تمام درد و مصیبت کا علاج اسلام کے پاس ہے۔ جو دینِ فطرت ہے اور جس کی لچک نے اسے زمانے کی ضروریات کا کفیل بنا دیا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ کھول کر اسلام نے اپنے اندر اتنی وسعت پیدا کر لی ہے کہ توحید کی بنیادوں پر اس کے قصرِ رفعت اعلیٰ کسی زمانے میں مسدود نہیں ہو سکتا۔ فلسفۂ خودی عہدِ حاضر کے ملحدانہ فلسفوں کے خلاف اسلام کا کامیاب حربہ ہے۔ جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی صداقت آشکار کرتا ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ نظریۂ خودی جب تک ہماری ریاست کا نظریہ نہ بن جائے یہ ہمارے مرض کے علاج کی حیثیت سے اپنے کمال کو نہ پہنچ سکتا۔ لیکن مصنف کا ایمان ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اسلام ہی نے ایک طرف فلسفۂ خودی کو پیدا کیا ہے۔ اور دوسری طرف پاکستان اقبال کے تصور اور ایک دوسرے مردِ مومن کے ذوقِ یقین سے عالمِ وجود میں آیا۔ مصنف کی پیشینگوئی ہے کہ دنیا کا آئندہ مقبول ترین فلسفہ یہی اسلامی فلسفہ ہو گا اور اسلام کا پیغام دنیا میں اتنی یگانگی، اتنی ہم آہنگی اور اتنی ہم خیالی پیدا کر دے گا کہ قوموں کے تمام باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اور اقوام بنی نوع آدم کی ایک عالمگیر ریاست میں متحد ہو جائیں گی۔ پاکستان اور اہلِ پاکستان کو اپنے منصب کی عظمت کا احساس ہونا چاہیئے۔ اگر یہ احساس پیدا ہو گیا جو انشاء اللہ ضرور پیدا ہو گا تو اسلام کے پیغام کے مبلغ کی حیثیت سے پاکستان کا مستقبل بے حد درخشاں ہے۔

مرح

منشورات

حادثاتِ جانکاہ

دسمبر میں چند ایسے روح فرسا حادثات ناگہانی طور پر پیش آگئے جن سے پاکستان اور دنیائے اسلام کے بہت سے دوسرے حلقے شدید غم و الم میں مبتلا ہو گئے۔ ۱۳ دسمبر کی شب کو ریاست بہاولپور میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے رحلت فرما گئے۔ مولانا علمِ دین کے فاضلِ اجل ہونے کے ساتھ بالغ نظر سیاسی مبصر بھی تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے بہت پہلے اُن مولویوں کی گمراہی کا اندازہ کر لیا تھا جو برّ اعظم ہند کے مسلمانوں کو حقِ خود اختیاری سے محروم کر کے ابدی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے اُسی وقت آوازِ حق بلند کر کے اُن لوگوں کو راہِ راست پر آنے کی تلقین کی۔ اسی حقیقت شناس بصیرت کی وجہ سے مولانا کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ حصولِ پاکستان میں وہ مدت تک حضرت قائد اعظمؒ کے دوش بدوش رہے۔ اور قیام پاکستان کے بعد اُن کو یہ عزت نصیب ہوئی کہ وہ دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے مذہبی رہنما بنے۔ حضرت قائد اعظم کی نماز جنازہ کے امام بھی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ہی تھے۔ مولانا نے کچھ زیادہ بڑی عمر نہیں پائی۔ اُن کی موت اس وجہ سے اور بھی بے وقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کی مجلسِ دستور ساز کے مذہبی مشیر تھے اور یہ اہم کام ابھی تکمیل کو نہ پہنچا تھا کہ قوم اس سرچشمۂ فیض سے محروم ہو گئی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے نامکمل ترجمۂ کلام مجید کی تکمیل کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ دوست دشمن یکساں ان کے تبحرِ علمی کے قائل تھے۔ چنانچہ اُن کی موت کے بعد بھی پاکستان و ہند کے تمام مختلف الخیال حلقوں نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے

دوسرا المناک حادثہ کراچی سے ۴۵ میل کے فاصلے پر جنگشاہی کے قریب پیش آیا۔ جہاں ”پاک ایر“ کا ایک ہوائی جہاز ایک ہزار فٹ اونچی ایک پہاڑی سے ٹکرا کر گرا اور جل گیا۔ افسوس کہ اس حادثے سے جہاز کا کوئی مسافر جانبر نہ ہو سکا بلکہ اکثر مسافروں کی لاشیں بھی جل کر ناپید ہو گئیں۔ مسافروں کی کل تعداد ستائیس بتائی گئی ہے۔ اس جہاز میں پاکستان کے قابل ترین جرنیلوں میں سے دو یعنی جنرل افتخار خاں اور جنرل شیر خاں کے علاوہ اسلامی ملکوں کی اقتصادی کانفرنس میں شامل ہونے والے مشرق وسطیٰ کے پانچ نمائندے بھی سوار تھے۔ ہمیں اپنے قابل ترین جرنیلوں کی موت سے جو نقصان پہنچا ہے اس سے بھی زیادہ رنج اور دکھ کے ساتھ شرم کا باعث ہمارے لئے اسلامی ممالک کے اُن نمائندوں کی غریب الوطنی کی موت ہوئی ہے جو ہمارے مہمان تھے اور جن کے دورانِ قیام پاکستان میں ہم اُن کے جان و مال کے امین اور محافظ تھے۔ اپریل میں بھی ”پاک ایر“ کا یہ دوسرا اس قسم کا حادثہ ہے جس کی وجہ سے اہل پاکستان بجا طور پر اس کمپنی سے سخت بدظن ہو گئے ہیں۔ اس حادثے کے متعلق کمیشن کے ذریعے سے تحقیق ہو رہی ہے لیکن تحقیق کا کچھ بھی نتیجہ کیوں نہ نکلے۔ ہمارا سرِ ندامت ممالک مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے سامنے اُٹھنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومتِ پاکستان اس واقعے سے سبق سیکھے گی اور آئندہ غیر ملکی مہمانوں اور ملکی اور فوجی افسروں کو اس قسم کی مشتبہ حیثیت کی پرائیویٹ کمپنیوں کے طیاروں میں سوار نہ ہونے دے گی۔ عام مسافروں کی جانیں بھی اُن کے اعزہ و اقربا کے لئے یکساں بیش قیمت ہوتی ہیں۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ریلوے

طرح ہوائی سفر کا کاروبار بھی حکومت اپنی ہی تحویل میں لے لے۔

دسمبر کی آخری تاریخوں میں لندن سے یہ افسوسناک اطلاع بھی آئی کہ لندن کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر عبدالغنی قریشی انتقال فرما گئے۔ مرحوم ... دہلی میں لیگ کے ایک نہایت مخلص کارکن تھے۔ فسادات کے دوران میں جب دہلی کے ایک ہندو ڈاکٹر جوشی صاحب اس جرم میں ... عوام کی گولی کا نشانہ بن گئے کہ انہوں نے کچھ مسلمانوں کو ان لوگوں کی خواہش کے خلاف اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی تو دہلی کی پولیس نے اصل مجرموں کے بجائے ڈاکٹر ... ڈاکٹر جوشی کا قاتل قرار دے کر ایک جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ اس مقدمے کا نامنصفانہ فیصلہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے لئے پھانسی کی سزا تجویز ہو گئی ... حکومت پاکستان نے انتہائی کوشش کے ساتھ ہندو اور سکھ ملزمین سے ڈاکٹر قریشی کا مبادلہ کر کے اُن کی گلو خلاصی کرائی۔ لیکن قید میں ... ڈاکٹر قریشی جن تکلیفوں میں مبتلا رہے تھے اُن سے ڈاکٹر صاحب کی صحت ایسی بگڑ گئی تھی کہ وہ پھر نہ سنبھل سکے۔

ڈاکٹر صاحب کا شمار بھی اُن لوگوں میں ہوگا جنہوں نے جہادِ پاکستان میں شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ خدا اُن کو اور دوسرے تمام مرحومین کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

پاکستان میں ممالکِ اسلامیہ کی اقتصادی کانفرنس

گذشتہ نومبر کی چھٹیوں کو اس لحاظ سے تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ اُس دن پہلی مرتبہ تمام ممالکِ اسلامیہ کے نمائندے اپنی اقتصادی فلاح و بہبود کے مسائل پر غور کرنے کے لئے دولتِ خداداد پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں جمع ہوئے۔ یہ تاریخی اجتماع ایک لحاظ سے اُس خوشگوار خواب کی تعبیر ہے جو حضرت قائداعظم اور شاعرِ اسلام علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے عالمِ اسلام کے اتحاد کے متعلق دیکھا تھا۔ اس کانفرنس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں شامل ہونے والے اکابر خود اسلامی حکومتوں کے ذمہ دار نمائندے تھے اور کانفرنس میں ممالکِ اسلامیہ کے اقتصادی تعاون کے متعلق جو تجاویز پیش ہوئیں انہیں سب نمائندوں کی متفقہ منظوری حاصل ہوئی۔

اب بہت سے اسلامی ممالک اغیار کے مستبدانہ تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں انڈونیشیا کے عظیم الشان اسلامی خطے کو بھی غیر ملکیوں کے استبداد سے نجات ملی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تمام اسلامی ممالک اقتصادی لحاظ سے بہت پسماندہ ہیں۔ کیونکہ غیر ملکی حکومتوں نے ہماری تجارتی و صنعتی صلاحیتوں کو خود غرضانہ مقاصد کے لئے مدتوں دبائے رکھا۔ اسلامی ممالک میں لوگوں کا پیشہ عموماً زراعت ہے مگر دوسروں کے بنے ہوئے تمام اشیاء پر انحصار کرنے سے کوئی ملک اپنے عوام کا معیارِ زندگی زیادہ بلند نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے حالات میں سیاسی آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود اکثر ممالکِ اسلامیہ اغیار کی اقتصادی غلامی پر مجبور ہیں اور یہ غلامی کی ایک نہایت مکروہ شکل ہے۔ اسلامی ممالک کی اقتصادی یکجہتی کے لئے جہاں مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی اسباب ممد و معاون ہیں وہیں ہم سب کی تقریباً ایک سی اقتصادی زبوں حالی بھی ہمارے اتحاد کے لئے ایک چھپی ہوئی برکت ثابت ہو سکتی ہے۔

ہم سب کو اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے نہ صرف زراعتی منصوبہ بندیوں کی ضرورت ہے بلکہ ہمیں اپنے ہاں صنعتی سرگرمیوں کا بھی ... ہم۔ ہر اسلامی ملک اگر اپنی اقتصادی ممکنات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے اور یہ کوشش تمام ممالکِ اسلامیہ کی متحدہ فلاح کے مقصد کی طرف ...

بھی مل جل جائیں تو نہ صرف ہماری متحدہ اقتصادی بہتری کی راہیں کھل جائیں گی بلکہ ہر ملک فرداً فرداً بھی اس تعاون سے بیش از بیش فائدہ حاصل کر سکے گا۔

اس وقت ایک طرف اینگلو امریکن بلاک اور دوسری طرف کمیونسٹ بلاک پسماندہ ملکوں کو ہضم کرنے کی فکر میں ہے۔ اگر اس وقت اسلام کا اقتصادی بلاک مضبوط ہو جائے تو اسلامی نظام اقتصاد اپنی معتدل نوعیت کے لحاظ سے ان دونوں متقاصم فریقوں کے درمیان ثالث بالخیر بن سکتا ہے۔

نادان دوست

پچھلے "مخزن" میں ہم نے اس جلسے کا ذکر کیا تھا جو بیمار ذہنیت کے چند ایسے شاعروں اور قصہ نویسوں نے باغ جناح میں منعقد کیا تھا جو کسی ان بوجھے خبط کے باعث پاکستان بھر میں صرف اپنے آپ کو ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ اس دلچسپ جلسے کی غالباً آخری نشست کے وقت کچھ روسی ادیب بھی لاہور پہنچے جن کے خیالات اچھے خاصے معقول تھے اور جو پاکستان کی آزادی اور اپنے ملک سے پاکستان کی دوستی پر بہت خوش تھے۔ ہمارے مقامی ترقی پسند بھی اپنے آپ کو روس کا دوست سمجھتے ہیں لیکن روسی ادیبوں کے صحت مندانہ خیالات معلوم ہونے پر یہ راز کھلا کہ روس کے یہ نادان دوست جو دوستی پر غالباً غلامی کو ترجیح دیتے ہیں اپنی پاکستان دشمنی سے پاکستانیوں کو روس سے نالاں اور بدظن کر کے دوستی کے پردے میں روس سے بھی دشمنی کر رہے ہیں۔ کاش روس اور پاکستان کی دوستی کے آب مصفا میں یہ لوگ اپنا گندہ پانی نہ ملائیں۔

ترقی پسندوں کے جلسے کے متعلق جو دلچسپ واقعات سننے گئے ان میں سے ایک پر لطف واقعہ یہ ہے کہ جلسہ گاہ میں روسی جھنڈا تو موجود مگر پاکستانی علم غائب تھا۔ سنا ہے کہ جب روسی ادیبوں نے حیران ہو کر ایک ترقی پسند سے دریافت کیا کہ آزاد پاکستان کا جھنڈا کہاں ہے تو روس کا یہ نادان دوست لگا بغلیں جھانکنے چونکہ نیک نیت روسی ادیبوں کے لئے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ کسی ملک میں کوئی ایسی "ترقی پسند" جماعت بھی ہو سکتی ہے جو اپنے وطن کی بدخواہ ہو اس لئے ایک ترقی پسند نے آگے بڑھ کر یہ عذر لنگ پیش کر دیا کہ جناب ہم جلدی میں پاکستان کا جھنڈا لگانا بھول گئے تھے۔ کاش یہ لوگ اب بھی اپنی ان گمراہ کن سرگرمیوں سے باز آ جائیں جن سے عوام میں روس کے متعلق بدگمانی پیدا ہونے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ "ترقی پسندوں" کی خانہ بر انداز سرگرمیاں ختم ہو جائیں تو روس اور پاکستان کی حکومتوں اور عوام کے مابین بہت جلد بہتر دوستانہ تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔

مذکورۂ بالا جلسے کا ایک اور پر لطف منظر وہ تھا جس میں "پاکستان مردہ باد" کے سوا تین نعرے لگانے کے بعد ترقی والوں نے یہ اعلان کیا کہ اب سندھ کے ایک ہشتاد سالہ شاعر ملتانی زبان میں اپنا کلام معجز نظام سنائیں گے۔ اس واقعے کی تصویر کشی معاصر "قندیل" نے یوں کی ہے:

"یہ اعلان سننا تھا کہ مندوبین کی صفوں میں جنبش ہوئی اور دو حضرات دوڑ کر ایک صاحب کو کندھوں سے پکڑ کر اسٹیج پر لے آئے۔ ان صاحب نے نہ صرف کرسی پر بیٹھ کر اور کاغذ کو آنکھوں سے چسپاں کر کے نظم پڑھی بلکہ مائیکروفون کو بھی غیر ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آواز اسٹیج کے اردگرد ہی ٹہلتی رہ گئی۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا جو ہم کو پہنچ سکا وہ بند غالباً پنجابی میں تھے جن میں شاعر نے "سبحان اللہ پاکستان" کے عنوان سے یہ انکشاف فرمایا تھا کہ پاکستان میں نہ تیل ملتا ہے اور نہ بجلی سنڈیل ہے نہ چھکڑا سہ روٹی ہے نہ کپڑا خوشکہ پاکستان سبحان اللہ ہی سبحان اللہ ہے۔ یہ سن کر ایک اخبار نویس نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

کیوں صاحب ہمارے ملک کا کیا نام ہے؟

ان کے ساتھی نے گھبرا کر کہا۔

پاکستان، کیوں کیا بات ہے؟

اخبار نویس نے کہا۔

تو پھر یہ شاعر اعظم پاکستان کا ذکر خیر فرما رہے ہیں؟ تعجب ہے کہ یہ صاحب ریل کے ذریعے سندھ سے یہاں پہنچے ہیں، ایک [illegible]

ہوئے ہیں [illegible] سال کی عمر میں بیٹھے کٹے ہیں بجلی کی روشنی میں مائیکروفون پر اپنا کلام بلاغت نظام سنا رہے ہیں اور کہتے ہیں پاکستان [illegible]

[illegible] ہی نہیں۔

ان کے ساتھی نے سرگوشی میں جواب دیا۔

بھئی ان کی نظر کمزور ہے۔ کیا عجب جو انہیں کوئی چیز نظر نہ آتی ہو۔ مگر تم خاموشی سے بیٹھے سنتے رہو۔

منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت! پھر بھی اس زندہ دل بزرگ کا وجود لبا غنیمت ہے جسے اسی سال کی عمر میں [illegible] کے معنی معلوم نہیں [illegible]

لکھا ہے۔ اس بڑھے جھکڑ کی وطن دشمنی اور غلامانہ ذہنیت سے خیال ہوتا ہے کہ آزادیٔ پاکستان سے قبل اس نے اپنی ترقی پسند زندگی کی [illegible]

انگریزی حضور ہی کی صحبت خاص میں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزاری ہوگی۔ وطن کی آزادی ان لوگوں کو اتنی ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ [illegible] پاکستان کے

ساتھ ہی انہوں نے اپنی رجعت پسندانہ سرگرمیاں شروع کر کے اور انہیں "ترقی" کا نام دے کر ترقی کے لفظ ہی کو ذلیل کر دیا ہے۔

ایک نیا اسلامی اخبار

پنجاب کا مسلمہ طور پر بہترین انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ جو بعض اہل الرائے کے نزدیک پاکستان بھر کا بہترین روزانہ انگریزی اخبار ہے، قلب

بکمہ غیر پاکستانی نامسلمانوں کی ملکیت میں تھا۔ اس وجہ سے بعض لوگ اس سے کچھ بدظن بھی تھے، لیکن حال ہی میں اس اخبار کی کمپنی کے تقریباً تمام حصص

بعض پاکستانی مسلمانوں نے خرید لئے ہیں اور اس کے بعد سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنے آئندہ مطمح نظر کی توضیح کے لئے جو مقالۂ افتتاحیہ لکھا ہے وہ مکمل

اسلامی اور پاکستانی ہے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ سول کے اس قلب ماہیت سے پاکستان کے اخبارات کی برادری میں ایک معتبر اسلامی اخبار کا

اضافہ ہوگیا ہے جو مسلمان انگریزی اخبارات پڑھتے ہیں اُن پر سول کا اب پہلے سے بہت زیادہ حق ہے۔ سول لاہور اور کراچی دونوں جگہ سے بیک وقت

شائع ہوتا ہے۔ اس طرح پاکستان کے دو سب سے بڑے شہروں کو ایک کے بجائے فی الحقیقت دو جلیل القدر انگریزی اخبارات مل گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے

کہ سول اپنا بلند معیارِ صحافت برابر برقرار رکھے گا۔

مخزن

فروری ۱۹۵

سالانہ — سات روپے

ششماہی — چار روپے

ایک پرچہ — دس آنے

The "MAKHZAN" Lahore

[illegible] ہدی افادی کے مزاج طبعی میں کچھ خصوصیات ایسی ملتی ہیں کہ انہیں اردو کا آسکر وائلڈ کہا جا سکتا ہے [illegible]
[illegible] مکاتیب (ص ۳۳) سے کرنے کی خواہش تھی کہ لکھنے لکھانے کے مشغلے کو بھی وہ [illegible] ان کی تحریریں [illegible]
[illegible] ہے جو دوسروں کے یہاں مشکل سے ملتا ہے۔ وہ نثر میں شاعری کرتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن [illegible]
[illegible] اب آتے ہیں۔ پاکستان کی آزادی کے بعد اردو اُن علاقوں میں پھیل رہی ہے جہاں کی مقامی زبان [illegible]
[illegible] ادیب اور مصنف [illegible] پاکستانی ادب کی تخلیق کے لئے پیدا ہوں گے تو وہ زبان و بیان اور انداز ادا پر [illegible]
شاید [illegible] کی طرف توجہ کریں گے۔ اس زمانے میں مہدی افادی کا فن سب سے زیادہ [illegible] گا۔

•

محمد خلیل الرحمن

غزل

شدتِ درد و تعب یاد نہیں — تابِ احساس تھی کب یاد نہیں

میری بڑھتی ہوئی بربادی کا — وہ ہیں یا دل ہے سبب یاد نہیں

زندگی میں وہ مقام آ پہنچا — اُن کے جور اپنی طلب یاد نہیں

تیرہ روزی سے ہوا ہے یہ حال — تجھ سے روشن تھی جو شب یاد نہیں

گھٹتے جاتے ہیں الم روز بروز — پہلے جو یاد تھے اب یاد نہیں

تلخیاں ہم بھی سناتے اپنی — پر یہ مشکل ہے کہ سب یاد نہیں

ہوں ز خود رفتہ مگر پھر بھی خلیل
کیا وہ سانس اور وہ لب یاد نہیں

جذبۂ عشق

(ایک [illegible] کے جواب میں)

عشق میں وسعت نہ سمجھنے والے
جذبۂ عشق تو ہر پھول میں ہر خار میں ہے

جذبۂ عشق ہے دریاؤں کی موجوں میں رواں
وسعتِ دشت میں ہے رفعتِ کہسار میں ہے

نگہِ شوق سے دیکھے تو نظر آتا ہے کہ عشق
محفلِ دہر کے ہر ثابت و سیّار میں ہے

برق میں اس کی چمک ابر میں ہے اسکی گرج
نور اسی کا ہے جو خورشیدِ ضیا بار میں ہے

جذبۂ عشق ہے گاندھی کی خموشی میں نہاں
جذبۂ عشق ہی ٹیگور کی گفتار میں ہے

گفتۂ اکبر کو افکارِ پریشاں نہ سمجھ
جذبۂ عشق ہی خوابیدہ اِن افکار میں ہے

شعر سے تجھ کو جو مس ہو تو بتاؤں تجھ کو
کہ یہی شے ہے جو اقبالؒ کے اشعار میں ہے

تجھ کو جو روح کا احساس ہو تو میں تجھ سے کہوں
کہ یہی نغمہ تری رُوح کے ہر تار میں ہے

کیا خبر کیا ترے انکار میں پنہاں ہے مگر
جذبۂ عشق ہی آزاد کے اقرار میں ہے

آزاد

سید عابد علی

غزل

کیا مقامِ بلند رکھتا ہوں، میں دلِ دردمند رکھتا ہوں،

چاندنی چاندنی ہے بزمِ خیال مہوشوں کو پسند رکھتا ہوں،

نغمۂ رنگ شعلۂ آہنگ شعر سے میں بھی چند رکھتا ہوں

دل میں ایسا ہے اک مقام جہاں سینت کر زہر خند رکھتا ہوں،

کوئی صیّاد خوش نہیں آتا ہوسِ قید و بند رکھتا ہوں

خدا اسے ساکنانِ بامِ بلند آستیں میں کمند رکھتا ہوں

مجھ پہ آساں ہے راہِ غم عابدؔ
طبعِ مشکل پسند رکھتا ہوں

سید علی عباس جلالپوری

ایک تکون کے دو زاویے . . . . "

آفتاب نے تنگ آ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔ ڈھول بے تحاشا پیٹے جا رہے تھے۔ ان کے ہنگامے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ گاؤں کے کھلاڑی کبڈی جیت کر آ رہے تھے۔ نوجوان جاٹ جوشِ مسرت سے نعرے لگا رہے تھے اور انگلیوں سے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ جلوس گلی کے نکڑ پر آ گیا تھا۔ آفتاب اُٹھ کھڑا ہوا اور بیٹھک کے دروازے کی طرف گیا۔ گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں مکانوں کی منڈیروں پر بیٹھی فتح مند نوجوانوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ جوش و خروش سے بھرے ہوئے کھلاڑی ڈھول کے آگے ناچتے ہوئے آگے بڑھے۔ لنگوٹ کسے ہوئے۔ خوب گٹھے ہوئے جسم، بازوؤں پہ مچھلیاں تھرکتی ہوئیں، چوڑے چکلے سینے، شیر دل دلائیاں، دلیر قامت، تنومند صحت اور شباب کے یونانی مجسمے۔ اُنہیں دیکھ کر آفتاب نے اپنے بائیں بازو کو دائیں ہاتھ سے ٹٹولا۔ درخت کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح پتلی جلد سے منڈھی ہوئی ہڈیاں۔ اُس کی آنکھوں میں حسرت اور افسوس کے آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ لپک کر بیٹھک میں چلا گیا۔ اور پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ اس کے دل میں کسی مرض کے دھونے کی شدت کے ساتھ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا خاتمہ کر دے۔ آخر یہ بے مصرف زندگی کس کام کی۔ وہ کبھی جوان ہوا ہی نہیں تھا بیس برس کا بچہ، ہڈیوں کا ڈھانچہ، زرد رخسار، اندر دھنسی ہوئی آنکھیں جن کے گرد سیاہ حلقے۔ ہونٹ پژمردہ، سوکھی ہوئی گردن جس کو چھپانے کے لئے وہ قمیص کے کالر کو چڑھائے رکھتا تھا۔ اُس کے ماں باپ حیران تھے کہ آفتاب کیوں دبلا پتلا ہے۔ اُس کے بھائی لحیم شحیم تھے۔ وہ اپنے خاندان میں بیٹھا ہوا اجنبی معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھوت زندوں کی بستی میں آ گیا ہو۔ والدہ کا خیال تھا کہ کسی دشمن نے اس پر جادو ڈال دیا ہے۔ باپ کو خدشہ تھا کہ اُسے تپ دق نہ ہو جائے۔ اُس نے کئی دفعہ آفتاب کو کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح نہ مانا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا۔ مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ میں اچھا بھلا ہوں۔ مگر جی ہی جی میں حکیم کے پاس جانے سے گھبراتا تھا کہ کہیں وہ اس کا مرض پہچان نہ جائے۔ اور اُسے خفت نہ اٹھانی پڑے۔ یاس و حرماں کے احساسات نے اُس کے ذہن و قلب کو ماؤف کر دیا تھا۔ وہ بے حد حساس اور تنک مزاج ہو گیا تھا۔ اس کو تمام صحت مند لوگوں سے نفرت تھی۔ وہ دنیا بھر سے بیزار تھا سوائے . . . . . بیگم نور کے۔

"آفتاب جی!" ایک لڑکی نے زنانے کا دروازہ کھول کر بیٹھک کی طرف جھانکا۔ کشیدہ قامت، پُر شباب جسم، گول چہرہ، چمپئی رنگ۔ آفتاب نے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ سی محسوس کی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی دھندلی آنکھیں چمک اٹھیں۔

بیگم نور نے چڑیا کی طرح چہکتے ہوئے کہا: "آپ گھر آئیں گے یا دودھ یہیں لے آؤں؟"

آفتاب نے اُس سے آنکھ ملانے کی کوشش کی مگر اس کی نگاہیں خوشی سے اُوپر نہ اُٹھ سکیں۔ اُس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا: "یہیں لے آؤ"

پھر اس نے اپنے آپ سے کہا: "آخر میں کیوں بیگم نور سے ڈرتا ہوں۔ جب اُس سے بات کرنے کی کوشش کروں گلے میں پھندا سا اٹک جاتا ہے۔ آنکھیں اُوپر نہیں اٹھتیں۔ آخر کب تک میں اس آتش خاموش میں جلتا رہوں گا۔ کیوں نہ آج اس کے سامنے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کر دوں۔ مگر حرفِ آغاز ہی ہو کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ والدہ سے شکایت نہ کر دے۔ بڑی بدنامی ہوگی۔ ہر طرف سے طعنوں کی بوچھاڑ پڑے گی۔ شاید وہ کسی کو نہ بتائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوتی ہے۔ مگر وہ تو سب سے مسکرا کر باتیں کرتی ہے۔ معمولی باتوں پر ہنسنے لگتی ہے۔

کر اٹھلا اور بیگم نور احتیاط سے دودھ کا گلاس تھامے اندر داخل ہوئی۔ قریب آکر اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا "لیجئے"۔
آفتاب کا ذہن سپاٹ تھا۔ وہ حیران تھا کہ اُسے بیگم نور کے سامنے کیوں آزادی سے گفتگو کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور ہونٹوں پہ مہر سی لگ رہی ہے۔ اُس نے جلدی سے دودھ کا گلاس لیا جیسے چھین کر لے رہا ہو اور پھر غٹا غٹ پی گیا۔

"آپ کبڈی دیکھنے گئے تھے؟" بیگم نور نے کچھ لگاوٹ کے انداز سے یہ سوال کیا۔ خدا معلوم کیوں آفتاب کا مزاج برہم ہو گیا۔ اُس نے درشت لہجہ میں کہا "جاؤ اپنا کام کرو۔"

بیگم نور کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ خالی گلاس لے کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی واپس چلی گئی۔

شام کے کھانے سے فارغ ہو کر آفتاب حسب معمول مردانے کی چھت پر چلا گیا۔ وہاں اس کا نوکر بخشو بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ آفتاب بستر پر لیٹ گیا اور بخشو اس کے پاؤں دبانے لگا۔ کچھ سوچ کر بخشو نے حقے کی نے منہ سے نکالتے ہوئے کہا "آپ کبڈی دیکھنے کیوں نہ گئے۔ بڑا سخت مقابلہ تھا۔ انہوں نے بڑے بڑے جوان منگائے تھے مگر ہمارے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ میں بگری والے پیر کی منت مان کر گیا تھا۔ مار مار کر کچومر نکال دیا۔ افسوس کہ آپ موجود نہ تھے ورنہ مجھے ضرور انعام دیتے۔ جب میں نے کامو قصاب کو پکڑا تو لوگوں نے دوڑ دوڑ کر مجھے نوٹ دیئے۔ کل چوبیس روپے ہوتے ہیں۔"

بخشو کی باتیں سن کر آفتاب کے سینے پر جیسے سانپ لوٹ گیا۔ آخر ادب اور فلسفے کا مطالعہ اس کے کس کام کا۔ کاش وہ بخشو جیسا ہوتا کہ گاؤں کے میلوں میں مردانگی کے جوہر دکھاتا۔ بخشو گاؤں کا ہیرو تھا جس طرف جاتا مردوں اور عورتوں کی انگلیاں اس طرف اُٹھ جاتیں۔ "وہ دیکھو بخشو جا رہا ہے۔" شام کو جب وہ کمرے میں آیا تھا تو بیگم نور چپاتی نائن سے سرگوشی کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "آج ہمارے بخشو نے خوب پالا مارا۔" "ہمارا بخشو"! آفتاب غصے سے کانپ اٹھا اور درشت لہجے میں بولا "جیسے رہ گئے ہے۔ کیا ڈینگیں مار رہا ہے۔ تم لوگ بھی کوئی انسان ہو۔ لنگوٹ کسا اور بیلوں کی طرح ڈکارنا شروع کر دیا۔ اجڈ کم بخت۔"

بخشو ہنس پڑا۔ اس نے بے تکلفی کے انداز سے کہا "آپ جوانی کی قدر کیا جانیں۔ آپ تو کتابیں پڑھ پڑھ کے گل گئے ہیں۔ کیا یہ جوان کا کام ہے کہ سامنے کتابیں رکھے سارا دن کونے میں اکیلا بیٹھا رہے۔"

آفتاب نے موضوع سخن بدلنے کے لئے کہا "ارے صرف پاؤں دباؤ۔ ٹانگیں چھوڑ دو۔" اس کو یہ بھی ڈر تھا کہ بخشو حسب معمول اس کی پتلی پتلی ٹانگوں پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے بخشو کے مذاق کی پیش بندی کرتے ہوئے کہا "کہو راجی تیلن نے بھی تمہیں انعام دیا کہ نہیں۔"

بخشو اعتماد نفس کے انداز سے متبسم ہو کر کہنے لگا "ایک راجی تیلن۔ خدا کی قسم آپ نہ مانیں گے۔ گاؤں کی کون لڑکی ہے جو آج مجھ سے بات کرنا باعث فخر نہ سمجھتی ہو گی۔ مگر مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے۔ جوانی سنبھال کر نہ رکھوں تو پالے کیسے ماروں۔"

آفتاب نے سرد آہ بھری اور جی میں کہا کاش میں بھی اپنی جوانی سنبھال کر رکھتا۔ بخشو رازداری کے لہجے میں کہہ رہا تھا "سنا جاتا ہے کہ آپ راجی تیلن کی بات ناحق نکالتے ہیں۔ میں تو بیگم نور کے لئے دیوانہ ہو رہا ہوں۔ ایسی خوبصورت لڑکی میں نے عمر بھر نہیں دیکھی۔ عورت ہے کہ کیلے کی پھلی۔"

یہ سن کر آفتاب کو غصہ آ گیا۔ مگر بخشو اپنی دھن میں کہتا گیا "ہم غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ ہاں صاحب آپ کا اور جو کیا مقابلہ [illegible] اور وہ آپ پر لٹو ہو رہی ہے۔ ہر وقت آفتاب جی۔ آفتاب جی کی رٹ لگی رہتی ہے۔"

آفتاب نے ٹال دیا "کیا فضول بک رہے ہو۔ مجھے اس کم بخت سے کیا غرض۔"

بخشو نے کاکش لگا کر بولا: ہو لا بے پروا ہے۔ اگر وہ مجھ سے ایک دفعہ مسکرا کر بات کرے تو جان قربان کر دوں۔ مگر کنگالوں کو کون منہ لگاتا ہے۔ آج ڈیوڑھی پر دوپٹی پہنے گیا۔ دو دفعہ زنجیر کھٹکھٹائی کسی نے پروا نہ کی۔ آخر دیر کے بعد بیگم نور دونی سے کر آنکھیں نکالتی ہوئی آئی اور مجھ پر برس پڑی: "ہم بہرے ہیں کیا۔ دروازہ حطرا و شرپیٹ رہے ہو۔ جا نہیں سکتے۔" راجہ صاحب مجھ سے بڑے بڑے کڑیل جوان آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے۔ مگر میں بیگم نور کی خفگی چپ چاپ برداشت کر لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر بخشو والہانہ انداز سے ماہیے کا ایک بول گنگنانے لگا۔

پتریاں مندریاں — تیں کی جاناں مرجاں کھا کھیاں اندریاں

آفتاب اس کی حماقت پر جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ کمبخت یہ عشق جتانے چلا ہے بیگم نور سے۔ مگر اس کے خیال کے مطابق واقعی بیگم نور کو مجھ سے محبت ہے۔ کچھ شبہہ تو مجھے بھی ہے۔ افسوس آج بے چاری کو بلا وجہ جھڑک دیا۔ کیسی دل شکستہ ہو گئی تھی۔ میں نے کیوں اس کے بھولے بھالے دل کو دکھی کیا۔ کسی دن میں اس کو محبت بھرے الفاظ میں بتاؤں گا۔ میں تجھ پر جان چھڑکتا ہوں بیگم نور۔ میں ابھی تک تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میری تمنا ہے کہ ہم کسی نامعلوم سرزمین کو نکل جائیں۔ کسی ویرانے میں محبت کی بستی بسائیں۔ میں ساری عمر تیری پرستش کے لئے وقف کر دوں گا۔ میری طولِ طویل میں اپنے افسانوں میں تجھے غیر فانی شہرت کا تاج پہناؤں گا۔

آفتاب اسی قسم کے خیالات میں کھویا رہا۔ حتیٰ کہ نیند اُسے خوابوں کی دنیا میں لے گئی۔ اُس نے دیکھا کہ کبڈی کے میدان میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ وہ لنگر لئے ناچتا کودتا ہوا میدان میں نکلتا ہے۔ جو کھلاڑی اس کے سامنے آتا ہے اُسے مار گراتا ہے۔ بخشو تو اُس کا ایک گھونسا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یکبارگی ڈھول بجتے ہیں۔ لوگ اُسے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں اور جلوس گاؤں کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ گلی کے موڑ پر بیگم نور آگے بڑھتی ہے اور اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتی ہے۔

اس دن جس وقت بیگم نور کام سے ذرا فارغ ہوتی وہ دوڑتی ہوئی صحن کی دیوار کے پاس آتی اور گردن بڑھا بڑھا کر پہاڑ کی طرف دیکھتی۔ کبھی برساتی نالے کی بل کھاتی ہوئی گزرگاہ میں اونٹوں کا قافلہ دکھائی دیتا اور کبھی بھیڑوں کا گلہ۔ اس کی نگاہیں ننگی چٹانوں سے ٹکرا کر واپس پلٹ آتیں۔ آخر شکاریوں نے کیا بگاڑ دیا تھی۔ سب گھر والے پریشان تھے مگر بیگم نور کا تو مارے تشویش کے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے اندرونی اضطراب کو چھپانے کی لاکھ کوشش کی مگر بیگم صاحبہ کئی دفعہ ٹوک چکی تھیں۔ بیگم نور آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ادھر ادھر بھاگی بھاگی پھر رہی ہو۔ نچلی نہیں بیٹھ سکتیں۔ جس کام کو ہاتھ لگاتی ہو ادھورا چھوڑ دیتی ہو۔ جب انہوں نے کہا بیگم نور ذرا دیکھنا تو آفتاب آتا دکھائی دے رہا ہے کہ نہیں۔ تو وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور لپک کر چھت پر چڑھ گئی۔ تمام راستے سنسان پڑے تھے۔ سورج منگلا وتی کی چوٹی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ مشرقی افق پر سیاہی کی لکیر پھیل رہی تھی۔ خدا خیر کرے۔ بیگم نور نے زیر لب کہا اور پھر منت مانی کہ اگر آفتاب جی شکار سے صحیح سلامت لوٹ آئے تو پچاس نفل نماز پڑھوں گی۔ اسے لوگاٹے کے موڑ پر چند آدمی آتے دکھائی دیئے جن کا رخ گاؤں کی طرف تھا۔ اچھا ہاں وہ "ٹوپ" والے آفتاب جی ہی تو تھے۔ بیگم نور نے منڈیر پر سے جھانکا اور جوشِ مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "آ گئے آ گئے" اور بیگم صاحبہ بخشو کندھے پر ہڑیال اٹھائے ہوئے ہے۔

بیگم صاحبہ نے جھلاہٹ کے لہجہ میں کہا: "اری پگلی شرم نہیں آتی۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں کوٹھے پر شور نہیں مچایا کرتیں۔"

بیگم نور مجرم سی ہو کر نیچے اتر آئی اور دروازے میں کھڑی شکاریوں کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب گلی میں آ کر نکلا۔ ہوا، وہ بہت تھکا ماندہ دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں اکھڑی ہوئیں، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی۔ بیگم نور کی آنکھیں ناچ رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار مسکرا کر کہا "آفتاب جی شکر ہے آپ آ گئے۔ [illegible] آفتاب کے پھیکے ہونٹوں پر بے معنی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ مگر وہ چپ چاپ اندر چلا گیا۔ گھبراہٹ سے اس کی [illegible] بیگم نور نے مڑ کر حسرت بھری نگاہ سے آفتاب کی طرف دیکھا۔ کیا دن بھر کے اضطراب اور انتظار کا صلہ یہی ایک بے معنی [illegible] تھی۔ وہ بعض اوقات نامحسوس طور پر متعجب سی ہو جاتی کہ اس دبلے پتلے بے ڈھنگے مزاج لڑکے سے مجھے کیوں انس ہو گیا ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ مجھ سے [illegible] کرتا ہے؟ میں آفتاب جی کے دوسرے جاتیوں سے دور بھاگتی ہوں کیونکہ میں ان کی حریص بھٹی بھٹی آنکھوں سے ڈرتی ہوں اور ان کی لگاوٹ کی گفتگو سے گھبراتی ہوں۔ کاش آفتاب جی ایک ہی دفعہ مسکرا کر لگاوٹ کے انداز سے مجھ سے بات کرتے۔ کبھی کبھی وہ آفتاب کی بے پروائی پر جھلا کر دل میں عہد کرتی کہ اب میں ضبط سے کام لوں گی۔ مگر جب وہ اس کے سامنے آ جاتا تو بے اختیار اس کے پہلو میں جذبۂ محبت جوش مارنے لگتا اور وہ سوچنے لگتی آفتاب جی کس قدر مکزور ہیں۔ میری خدمت اور ہمدردی کے کس قدر محتاج۔ گھر میں جب کبھی اس کے بڑے بھائی آفتاب پر پھبتیاں کستے تو اس کو سخت غصہ آتا۔ کتنے بے رحم ہیں یہ لوگ اپنے بے وقوف بھائی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کا دل دکھاتے ہیں۔ مجھ کو آفتاب جی سے کیسی ہمدردی ہے۔ مگر آفتاب جی کو میرے جذبات کا بالکل پاس نہیں۔ [illegible] پھر مجھے ٹرخا دیتے ہیں۔ جھڑک دیتے ہیں۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ اور میں آنسو پی کر چپ ہو رہتی ہوں۔

[illegible] انہی خیالات میں محو برتن صاف کر رہی تھی کہ ڈیوڑھی سے بختو کی آواز سنائی دی "بیگم نور جی"

بیگم نور نے کچھ الٹا ادھر ادھر دیکھا۔ شکر ہے کسی نے سن نہیں لیا۔ آخر یہ کیوں مجھے بیگم نور جی کہہ کر بلاتا ہے۔ منع کرنے کے باوجود۔ وہ غصہ سے لال پیلی آنکھیں نکالتی ہوئی باہر گئی۔ بختو ٹوکرے میں شہزادے کے گوشت نے تھلے۔ لئے بیٹھا تھا۔ بیگم نور جاتے ہی اس پر برس پڑی "حرامی تو کیوں اپنی عادتوں سے باز نہیں آتا۔ بیگم نور جی بیگم نور جی کیا ہوا۔ کمینے میں جانتی ہوں تجھے اچھی طرح۔ آج رات بتاتی ہوں بیگم صاحبہ کو۔ کتیا کے بچے۔"

بختو احمقوں کی طرح کھڑا آنکھیں جھپکتا رہا۔ بیگم نور کی حقارت آمیز خاموشی سے شاید اس کی گالیاں اسے بہتر معلوم ہو رہی تھیں۔ مگر وہ شکایت کے خیال سے ڈر گیا۔ بیگم صاحبہ کہیں مجھے گھر سے نہ نکال دیں۔ پھر میں بیگم نور سے دور ہو جاؤں گا۔ اس نے منت کے انداز سے کہا "بیگم نور خدا کے لئے گھر نہ بتانا۔ اتنی گالیاں دیں اور [illegible] بہت بھی کر دی۔ اچھا اب کبھی نہیں اس طرح نہیں بلاؤں گا۔"

بختو کے مردانہ چہرے پر انکسار اور التجا کی علامات دیکھ کر بیگم نور کا دل پسیج گیا۔ اس نے لاڈ کے انداز سے کہا "اچھا آج نہیں کہوں گی۔ مگر پھر کبھی نہ کہنا اور ہاں یہ ٹوکرا اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو۔"

بختو نے حکم کی تعمیل کی۔ پتا نہیں کیوں دروازے سے نکلتے وقت اسے بختو کی تالیفِ قلب کا خیال آ گیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور کہا "کتنا بھاری ہے۔ اتنی دور سے کیسے اٹھا کر لاتے۔"

اس خلافِ توقع اظہارِ ہمدردی سے بختو کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس نے فخریہ انداز سے کہا "یہ کونسا بوجھ ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے مرغی اٹھائے جا رہا ہوں۔"

"یہ ہڑیال آفتاب جی نے شکار کیا ہوگا؟" آفتاب کا نام لیتے ہی وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔

"آفتاب جی نے شکار کیا؟" یہ کہہ کر بخشو طنزیہ انداز سے ہنسا۔ پھر بولا "وہ بیچارے کیا شکار ماریں گے۔ راجو لی شکاری نے مارا تھا بیگم نور ایک بات سن۔ ناراض تو نہ ہوگی؟"

بیگم نور نے کڑے کڑے پوچھا "کیا ہے؟"

بخشو کی آنکھوں میں شرارت کی چمک لہرا گئی "تم چھوٹے راجہ کو آفتاب جی کہتی ہو میں نہیں بیگم نور جی کہوں تو کیا حرج ہے؟"

یہ سن کر بیگم نور کچھ ایسی گھبرائی کہ بغیر جواب دیئے اندر چلی گئی۔

صحن میں پلنگ پر بیٹھا ہوا آفتاب شکار کے واقعات بیان کر رہا تھا۔ میں اس پہاڑ پر چڑھا۔ اُس جنگل سے نکلا۔ یہاں ہڑیال دیکھا۔ وہاں تک اس کا پیچھا کیا۔ پھر بھاگتے ہوئے پر فائر کیا اور مار گرایا۔ اس کی ماں اور چھوٹی بہن تعجب آمیز فخر کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ بیگم نور نہ رہ سکی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا "بخشو تو کہتا ہے کہ ہڑیال راجو لی شکاری نے مارا ہے"

آفتاب غصے سے تھر تھر کانپنے لگا "حرامزادی بے حیا! میں جھوٹ بولتا ہوں اور وہ سؤر کا بچہ سچ کہتا ہے"

بیگم نور چپ ہو کر رہ گئی۔ آفتاب کے منہ سے گالیاں سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو پھوٹ آئے۔ وہ گالیاں سننے کی عادی ہو چکی تھی مگر آفتاب جی سے اُمید نہ تھی کہ وہ بھی اُسے گالیاں دیں گے۔ انہوں نے تو کبھی کسی کو گالی نہیں دی تھی۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ اب بغیر ضرورت کے کبھی آفتاب جی سے بات نہیں کروں گی۔ وہ مجھے گالیاں دیں میں انہیں پیار کروں میں کوئی کمینہ عورت ہوں انہیں کیا حق ہے کہ بغیر قصور کے مجھ پر برس پڑے۔ آج میری کیسی بے عزتی ہوئی۔ اگر میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو میں کیوں چاکری کی مصیبت میں پڑتی۔ اس خیال سے پھر اس کی آنکھوں میں غم و الم کے آنسو پھوٹ آئے اور وہ دیر تک چولھے کے سامنے بیٹھی روتی رہی۔ آخر اس نے آنسو پونچھتے ہوئے زیرلب کہا۔ دنیا میں مجھ سے محبت کرنے والا کوئی نہیں، کوئی نہیں! اس وقت دھوئیں میں بخشو کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے اُبھرا وہ آرزو اور شوق عجز اور ملاطفت کے انداز سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر نہیں وہ اُجڈ گنوار تھا۔ راجاؤں کا حقہ بھرنے والا کنگال۔ میں چار جماعتیں پڑھی ہوں۔ اگر وہ لکھا پڑھا ہوتا . . آفتاب جی کی طرح پھر اور بات تھی۔ مگر . . . .

"بیگم نور!"

"ہیں! یہ آواز تو آفتاب جی کی ہے" وہ لپک کر صحن میں گئی۔ آفتاب اکیلا مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ بیگم نور روتی رہی ہے اُس نے سوچا یہ مجھے کیا ہو گیا تھا کہ بے اختیار گالیاں بکنے لگا۔ وہ سچ تو کہتی تھی۔ اس کے دل میں خیال گذرا کہ اپنی غلطی تسلیم کرے اور اس کی دلجوئی کرے، دونوں دیرینہ پیاسی وہی ناگفتی ول کی۔ اس نے بمشکل اتنا کہا "بیگم نور میرا چپل لے آؤ" اس کا لب و لہجہ اس قدر نرم اور لجاجت آمیز تھا کہ بیگم نور نے تعجب سے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے چپل لا کر اس کے آگے رکھ دیا اور کہا "آپ مجھ سے ناراض کیوں ہو گئے تھے؟"

"میں! ہیں؟" آفتاب کی آنکھیں نیچے جھک گئیں اور گلے میں پھندا سا اٹک گیا۔ پھر اس نے جیسے ایک وار کو بچاتے ہوئے کہا "بالا خانے میں نہیں اماں بلا رہی تھیں؟"

بیگم نور کا دل بجھ گیا اور وہ سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔

دوسرے دن آفتاب پھر شکار کھیلنے پہاڑ پر گیا۔ شام کو واپس آیا تو تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر زنانے ہی میں سو رہا۔ ویسے بھی اس کے ماموں اور بھائی باہر سوئے ہوئے تھے اور گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ وہ تکیے پر سر رکھتے ہی سو گیا۔ اس کی والدہ اور بہن دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ بیگم نور بے حس و حرکت اپنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں نیند سے ناآشنا تھیں۔ اس کے دل کی بےچینی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی کل چین نہیں آتا تھا۔ دل عجیب و غریب متضاد کیفیات کا گہوارہ بن گیا تھا۔ امید و بیم، حسرت و آرزو، سرمستی اور یاس زدگی، سکون و ضبط کا زمانہ بیت چکا تھا۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی ساحل پر سے گذر رہی ہے اور ریت اس کے پاؤں کے نیچے سے پھسلی جا رہی ہے۔ اب گری کہ اب گری۔ کبھی اپنے حال پر غور کرتی اور کبھی مستقبل کے اندیشہ سے ہاتھ ملتی رہ جاتی۔ آخر میں کب تک آفتاب جی کی سرد مہری اور حقارت کو برداشت کرتی رہوں گی۔ وہ دیر تک انہی خیالات میں گم رہی اور ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکوں نے تھپک تھپک کر اسے سلا دیا۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی جب آفتاب کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے بیخودی کے عالم میں بخشو کو آواز دی مگر معاً اس کو دھیان آیا کہ وہ مردانے میں سوتا ہے۔ ہوں پہلے تو اس نے خیال کیا کہ بیگم نور کو جگائے مگر پھر سوچا کہ سب کی نیند خراب ہوگی۔ پانی کی گھڑونچی شمالی کونے میں رکھی تھی۔ وہ ہمت کر کے اٹھا۔ پانی پی کر واپس آنے کو تھا کہ اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ قریب ہی بیگم نور سو رہی تھی اور عجیب شان سے سو رہی تھی۔ ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں، مہکتے بال چہرے پر بکھرے ہوئے۔ چاندنی اس کے صبیح چہرے پر نور بکھیر رہی تھی۔ دائیں پنڈلی ننگی ہو رہی تھی۔ بھری بھری، گول گول، سپید سپید۔ آفتاب کے دل میں بے پناہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس مرمریں پنڈلی کو ہاتھ سے چھوئے۔ اس نے جھک کر پنڈلی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں میں گویا بجلی کی رو دوڑ گئی۔ اس نے جھٹکا سا محسوس کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ گھر والوں پر ڈالی۔ سب سو رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں اپنے پلنگ کی طرف چلا گیا۔ مگر اب نیند کہاں۔ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔

سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ مغربی افق پر زعفرانی اور شفقی رنگ کی بدلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ آفتاب گرجاک کی ایک چٹان پر بیٹھا تھا۔ وہ دور سے اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک دفعہ اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بیگم نور اس کی چشم تصور کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہی پرشباب تبسم، وہی ترشے ہوئے نقوش، وہی شعلے کی طرح دہکتے ہوئے رخسار جن پر سیاہ کاکلیں دھوئیں کے مرغولوں کی طرح لہراتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ غائب ہو گئی۔ اپنی بے چارگی کے احساس سے اس کے سینے میں درد سا اٹھا اور اس نے حسرت و ارمان کے درد سے میں اپنے آپ سے کہا۔ اے کاش میں اس مجسمۂ حسن و شباب کی رعنائیوں اور لطافتوں کو اپنا سکتا۔ لوگ حسن کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کے ارمان حسن مغرور کی چوکھٹ پر سر پٹک پٹک کر دم توڑ دیتے ہیں لیکن حسن خود میرے قدموں میں پڑا لوٹ رہا ہے۔ ناز سراپا نیاز بن کر میرے اشارۂ ابرو کا منتظر ہے۔ اور خود میرا جنون شوق متقاضی ہے کہ وہ اٹھے اور اس شکست خوردہ حسن سے خراج محبت وصول کرے۔ مگر فطرت کی ہمت نہیں کہ اٹھے، آنکھوں میں جرأت نہیں کہ تجلیوں کو سمیٹیں اور زبان کو یارا نہیں کہ اظہار مدعا کرے۔ مجھ سے زیادہ حرماں نصیب شخص کون ہوگا۔ میری جوانی

باپ سے بدتر، میرا وجود عالم کے برابر کیوں نہ اس ستم ظریفی کا خاتمہ کر دوں جس کا نام آفتاب ہے۔ یہ سوچ کر اس نے دریا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ وہ چٹان سے نیچے اترا اور دریا کی طرف چل دیا۔ شفق کی سرخی دور دور تک کھنڈ گئی تھی۔ اس سرخی کی بھڑک فضا میں آتشیں دھندلکا بکھیر رہی تھی۔ چاروں طرف زندگی کے نمود، حرارت کے آثار نمایاں تھے۔ گھونسلوں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کی چیخ پکار، گاؤں کی طرف سے آنے والے گڈریوں کے گیت، دریا کی موجوں کی گھن گرج، مینڈکوں اور جھینگروں کا شور، مگر اس کے دل ویران میں قبرستان کی خاموشی طاری تھی، بھیانک خاموشی! اس کے سرد ہونٹ سختی کے ساتھ باہم پیوست تھے۔ آنکھیں افق پر گڑی ہوئی تھیں۔ قدم دریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دریا موجیں مار رہا تھا جیسے کوئی پاگل زنجیریں توڑ کر بھاگ نکلا ہو۔ جابجا جھنور پڑ رہے تھے۔ پانی کے بلونے جانے سے جھاگ اٹھ رہا تھا۔ آفتاب کنارے پر کھڑا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ رہی تھیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں میں موت جھلملا رہی تھی۔ یک لخت قریب کی جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی اور ایک خوفناک سانپ عین اس کے سامنے سے بل کھاتا ہوا گزر گیا۔ پھر اس کو یوں محسوس ہوا جیسے دریا کی کف آلود لہریں بے شمار سانپ ہیں جو اس کو ڈسنے کے لئے پھن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔ وہشت سے اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ واپس مڑا اور گاؤں کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کے پاؤں دھوتی اور آک کی جھاڑیوں میں الجھتے رہے مگر وہ بھاگتا گیا۔

بخشو ڈیوڑھی کے دروازے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ زنانے کا دروازہ کھلا۔ بیگم نور نے ڈیوڑھی میں جھانکا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی شاید دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ اس نے بمشکل آتا کہا "بخشو۔ رات کا اندھیرا چھا رہا ہے اور آفتاب جی ابھی تک گھر نہیں آئے۔ بیگم صاحبہ سخت گھبرائی ہوئی ہیں۔ ذرا دیکھنا تو انہیں"

بخشو نے مسکرا کر جواب دیا "اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔ وہ کسی چٹان پر بیٹھے شعر لکھ رہے ہونگے۔ ابھی آجاتے ہیں" یہ کہتا ہوا وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا۔

بیگم نور نے ایک مغرور ملکہ کے چڑچڑے لہجہ میں کہا "میں کہتی ہوں جاؤ اور دیکھو" بخشو سے باتیں کرتے وقت اس کے لب و لہجہ میں یہ تبدیلی اکثر پایا کرتی تھی۔

بخشو نے تمسخر کے انداز سے کہا "میرا خیال ہے کہ بیگم صاحبہ سے تم زیادہ گھبرائی ہوئی ہو"

بیگم نور غصے سے کانپنے لگی "حرامی! تم کب بھونکنا بند کرو گے؟"

بخشو نے آہستہ سے جواب دیا "جب میرے منہ میں روٹی کا ٹکڑا ڈالا جائے گا"

"تو لو پھر" بیگم نور نے پاؤں سے جوتا اتارا اور اسے مارنے کے لئے آگے بڑھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ کیا اس کی آنکھیں اسے دھوکا دے رہی تھیں۔ بخشو نے پگڑی اتار کر اپنا سر آگے بڑھا دیا تھا۔ بیگم نور کا ہاتھ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بخشو نے سر اٹھا کر بیگم نور کی طرف دیکھا جو بت کی طرح بے حس اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر وہی ہاتھ جو اسے مارنے کے لئے اٹھا تھا، کلائی سے پکڑ لیا۔ بیگم نور نے تڑپ کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر بخشو کی گرفت آہنی تھی۔ اپنی جگہ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ بخشو کے ہاتھ کے لمس سے اس کا سراپا جھنجھنا اٹھا۔ اور اس کا تنا ہوا مرمریں جسم پگھل کر موم کی طرح گداز ہو گیا۔ بخشو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "چھڑاؤ اب"

بیگم نور کی رگ رگ میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کی پیشانی پر حیا کا پسینہ آگیا اور آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ اُس نے منت آمیز لہجے سے کہا "مجھے رو دو بخشو۔"

بخشو نے آخر بڑی کوشش سے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور آہستہ سے بیگم نور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ لپک کر اندر چلی گئی۔ کواڑ بند کر کے اس نے اپنی [illegible] دیکھی۔ اس کی [illegible] کی کرخت انگلیوں کے نشان اُبھر آئے تھے۔ یہ سُرخ لکیریں چنگاریوں کی طرح دھک رہی تھیں اور ان کی تپش سے اس کی آنکھوں [illegible] سے گہرے سُرخ ہو گئے تھے۔

~~~~~~~~

کئی دن سے آفتاب کے ہمراہ جانے کو اُسے اپنے یہاں مدعو کر رہے تھے مگر وہ ٹالتا چلا آتا تھا۔ آخر ایک صبح وہ خود گھوڑے لے کر آگئے اور اُسے نئے ہی بنی۔ ننھیال میں اس کی ہر طرح خاطر مدارات کی گئی مگر اس کا دل پژمردہ نہ جیون غنچہ تصویر کھلا۔ اُٹھتے بیٹھتے بیگم نور کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی محبت بے مصرف ہے غم انجام ہے۔ اس کے باوجود امید پیچھا نہیں چھوڑتی تھی تکمیلِ محبت کی امید۔ اس جنسل تک پہنچنے کی اُمید جس کی طرف پہلا قدم اٹھانا اُس کے لئے محال ثابت ہو۔ انتہا خود فریبی عجیب و غریب رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اب وہ اس سوچ میں تھا کہ ایک دفعہ جرأت کر کے اظہارِ محبت کر دیتا تو دوسرے مراحل از خود طے ہو جاتے۔ اس خیال کے ماتحت اُس نے ننھیال سے لوٹتے وقت قصبے کے بازار سے ایک ریشمی موباف خریدلیا، اور جی میں ارادہ کیا کہ موقع پا کر یہ موباف بیگم نور کو تحفتہً دوں گا۔ اس وقت اس کو یہ خیال نہ رہا تھا۔ کہ موباف پیش کرنے کی ہمت کیسے ہوگی۔

جب وہ گھر پہنچا شام ہو چکی تھی۔ اس نے بخشو کو گھوڑے کی باگ پکڑنے کے لئے آواز دی۔ مگر وہ بیٹھک میں نہ تھا۔ ناچار گھوڑا ایک آدمی کے سپرد اور گھر میں گیا۔ اُس کی والدہ نے اٹھ کر پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا اس کی والدہ نے کہا۔

"سن چکے ہو؟"

"نہیں تو کیا ہوا؟"

اس کی والدہ نے تھوڑی دیر کے بعد آہستہ سے کہا "کل صبح سے بیگم نور اور بخشو دونوں غائب ہیں۔ وہ نامراد اُسے بھگا کر لے گیا ہے۔"

یہ سن کر غم و غصہ سے اس کا سراپا تھرا اُٹھا۔ مگر اُسی وقت اس کے دل کی تہ میں اطمینان کی ایک ہلکی سی لہر اُٹھی۔ وہ بیگم نور کو موباف دینے کی مصیبت سے تو بچ گیا تھا۔

سید علی عباس

●

سید آلِ رضا لکھنوی

کہتے ہیں لوگ آپ کو مجھ سے ہے کچھ لگاؤ
یہ واقعہ بھی خوب ہے، تہمت بھی خوب ہے
جلتا ہے آندھیوں کے تھپیڑوں میں اک چراغ
ان سے رضا امیدِ محبت بھی خوب ہے
~~~~~~~~

غزل

مجھ میں ظاہر نہ کیوں ہو ذات اُس کی
نقطہ لفظ اُس کا بات بات اُس کی

لُطف پر اُس کے بھولنے والے
اور ہے چشم التفات اُس کی،

تیرے غم کا ہے کون میرے سوا
میری ہستی ہے کائنات اُس کی

کیا کہوں دل پہ کیا گذرتی ہے
گفتنی کب ہے واردات اُس کی،

کیوں مرے ہم نوا ستارے ہیں
راہ کیوں دیکھتی ہے رات اُس کی،

اُس کی باتوں نے کر دیا بے خود
بے خودی نے بنائی بات اُس کی

اب نظر کو نہ آ کے دو تسکیں!
ہو چکی درد سے نجات اُس کی

سجاد رضوی

مشینیں اور جذبات

(برٹرینڈ رسل)

کیا مشینوں کے ہاتھوں جذبات کا خون ہو گا یا جذبات مشینوں کے کل پرزے بکھیر دیں گے!؟

آج سے تیس سال قبل برٹرینڈ رسل نے یہ سوال اٹھایا تھا۔ مگر آج جبکہ مشینوں کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس سوال کی اہمیت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک چیز یہ بھی کھٹکتی ہے کہ آخر مشینوں میں اور جذبات میں یہ مخاصمت کیوں؟ ہمارا روزمرہ کا تجربہ تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان مشینوں سے بڑی حد تک مانوس ہے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا بچہ بھی کسی مشین کو دیکھ کر خاصی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ جس قدر مشین بڑی ہو گی اسی قدر اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ دور جدید کی ایسی فن کاری کی عظیم الشان روایات موجود ہیں۔ جب مغرب کے میکانکی طریقوں کو دیکھتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ ان مشینوں کی فوقیت اور برتری انہیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں پڑتی۔ ایک تعلیم یافتہ اور جہاندیدہ ایشیائی کے لئے اس سے بڑھ کر کوفت کی بات نہیں ہو سکتی کہ اس کے سامنے اہل مشرق کی ذہنی صلاحیتوں اور ایشیا کی پرانی تہذیبی روایات کا ذکر چھیڑا جائے۔ اس وقت اس کی حالت اس بچے کی ایسی ہو گی جسے کھلونے کی گاڑیوں کی بجائے کھلونوں سے کھیلنے کی ترغیب دی جائے۔ وہ ان کھلونوں سے دل بہلانے کی بجائے، سچ مچ کی گاڑیوں سے کام لینے کو ترجیح دے گا۔ ہاں بات یہ کہ اسے اس بات کا احساس نہ ہو کہ وہ ان گاڑیوں تلے آ کر کچلا بھی جا سکتا ہے۔

جب مغرب میں مشینوں کا نیا نیا رواج ہوا تو وہاں بھی یہی کیفیت دیکھنے میں آتی تھی۔ چند اہل ذوق و نظر کو چھوڑ کر، وہاں کے لوگ بھی ان میں اسی طرح مست ہو گئے تھے جس قدر آج مشرق کے رہنے والے محسوس کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے لوگ محض اپنی میکانکی ترقی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اپنے باپ دادا سے افضل گردانتے تھے۔ اگر پی کاک (PEACOCK) نے اپنے اوائل عمر میں ایسے لوگوں کو "بھاپ کے ذہنوں والے" کہہ کر ان کا مذاق اڑایا تو اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب ذوق تھا، اور اس کے نزدیک ادب و فن، تہذیب و تمدن کی صحت مند اقدار صرف یونانی اور لاطینی ادیب ہی پیش کر سکتے تھے، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کا بھی شعور رہے کہ وہ اپنے دور کے رجحانات کی ترجمانی نہیں کر رہا۔ روسو (ROUSSEAU) کے مداح اور ان کا پرستار ہی فطرت کا نعرہ۔ ولیم مارس (WILLIAM MORRIS) اور اس کی "کہیں نہیں کی خبریں"۔ مناظر قدرت کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان شاعر اور ان کی تمام "وسطائیت" (MEDIAEVALISM) مشینوں کے خلاف سراسر جذباتی اور رجعت پسندانہ رد عمل کا مظاہرہ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ بٹلر ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے ٹھنڈے دل، ٹھنڈے دماغ سے بالکل عقلی اور منطقی انداز میں مشینوں کے خلاف کچھ سوچنے کی ٹھانی۔ مگر وہ بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یوں کہئے کہ یہ بھی سوڈا واٹر کا ایسا ابال تھا جو ختم ہو گیا۔ وہ دن اور آج، مشین زدہ اقوام میں سے اکثر لوگوں نے سیموئیل بٹلر کی تقلید میں موجودہ صنعتی طور طریقوں کے خلاف مبہم یا واضح لفظوں میں آواز بلند کی ہے

مشینوں کی تعریف کی جاتی ہے اُن کی ساخت کی نفاست کی بناپر، اور قدر کی جاتی ہے تو اس لئے کہ وہ ہمیں طاقت کا بے بہا خزانہ عطا کرتی ہیں۔ بالکل برخلاف مشینوں کو سننے والے حضرات کا یہ قول ہے کہ صاحب وہ نفیس تو ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی ہیبتناکی پر بھی تو غور فرمایئے اور اس پر کہ ان کی بدولت ہماری گردنوں پر غلامی کا جوا ڈال دیا جاتا ہے اب یہ نہ کہئے کہ ان دونوں گروہوں میں سے ایک سچا ہے اور دوسرا جھوٹا۔ ورنہ پھر یہ تو بات ہوگی کہ جگیہ رکھو دیکھو کوئی پٹ کے چند باشندے کہنے لگے کہ آدمیوں کے سر ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ نہیں پاؤں ہوتے ہیں دراصل اپنے اپنے مقام پر دونوں گروہ سچے ہیں۔ آپ تو بس مشین کو الف لیلہ کا جن سمجھئے جو اپنے مالک کو تو فائدہ پہنچاتا ہے لیکن غیروں کو صرف ڈراتا ہے۔ مشین کا مالک تو اس کے پاس پھٹکتا تک بھی نہیں اس لئے وہ نہ تو اس کی گڑگڑاہٹ سن سکتا ہے نہ اس سے خارج ہونے والے میل پر اس کی نظر پڑتی ہے اور نہ اس کا دھواں اس کی ناک تک پہنچتا ہے۔ اگر کبھی کبھار وہ اسے دیکھتا بھی ہے تو اس وقت جب اس کو اڈے پر نصب کیا جا رہا ہو ... وہ شخص اس مشین سے پیدا ہونے والی حرارت اور گرد و غبار کا مزا چکھے بغیر اس کی طاقت اور ساخت کی تعریف کر سکے۔ لیکن اگر اُن حضرت کو یہ کہا جائے کہ حضور ذرا اس مشین کو ذرا اُن لوگوں کے زاویۂ نگاہ سے بھی تو دیکھئے جنہیں اس سے کام لینا ہے اور اپنی زندگی کی شام و سحر اسی کے پاس گزارنی ہے، تو اس کے پاس ایک ترشا ترشایا جواب موجود ہوگا کہ بھئی وہ لوگ اس کے وسیلے سے اپنی روزی بھی تو کماتے ہیں۔ اور صرف اسی کی وجہ سے اُن کی قوت خرید میں بھی کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔ اور بہرحال وہ اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں۔ اگر ہم اس جواب کو صحیح تسلیم کر لیں تو مطلب یہ نکلا کہ یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ آسودہ حال ہیں۔

یہاں مفروضہ یہ گھڑا گیا ہے کہ مادی اشیا کی ملکیت انسان کو آسودہ حال بناتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک زیادہ کھاتا پیتا آدمی اپنے سے کم کھاتے پیتے شخص سے زیادہ آسودہ حال اور مطمئن ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ آسودگی کا انحصار دولت پر ہے۔ لہٰذا آسودہ حال بننے کے لئے دولت کا ہونا لازم ہے۔ چند حضرات اس کی مخالفت تو ضرور کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی مخالفت میں خلوص کارفرما نہیں ہوتا۔ البتہ مذہب اور اخلاق کا نام لے لیکر نعرہ بازی ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہی مخالفتِ زر اُن کے لئے ذریعۂ آمدنی بن سکے تو بس اُن کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں سمجھتے ہیں۔ اس نظریہ کی مخالفت تو ضرور کروں گا مگر مذہب یا اخلاقیات کی آڑ لے کر نہیں، بلکہ محض مشاہدہ اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے۔

اب اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ آسودگی اور آمدنی میں کچھ تعلق ہے اور اول الذکر کا مؤخر الذکر پر انحصار ہے تو پھر معاملہ صاف ہے۔ اور بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن اگر ہم یہ تسلیم نہ کریں تو سارا قصہ ایک بار نئے سرے سے غور و فکر کا محتاج ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ آدمی کی کچھ تو ہوتی ہیں ضروریات زندگی اور کچھ ہوتے ہیں ذاتی جذبات۔ اگر ضروریاتِ زندگی مہیا نہ ہوں تو انسان اپنی تمام توجہات ان کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ اور جذبات دب کر ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جب عام ضروریات پوری ہو جائیں تو پھر انسانی آسودگی کا انحصار صرف جذبات ہی پر ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتی معاشرہ میں ایسے انسان بھی ہیں جن کی معمولی ضروریاتِ زندگی بھی پوری نہیں ہونے پاتیں۔ جہاں تک ایسے لوگوں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان کو خوشی اور آسودگی بخشنے والی سب سے پہلی چیز آمدنی کا اضافہ ہے جس کی وجہ سے اُن کی عام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ مگر یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ بشرطیکہ ہم نیک نیتی سے ان کو ضروریاتِ زندگی مہیا کر دینا چاہیں۔ مگر خیر یہ تو دوسرا سوال ہے۔ مجھے تو اس وقت اُن لوگوں کا ذکر کرنا ہے جن کے پاس ضروریاتِ زندگی سے کچھ زیادہ چیزیں ہیں

ذرا غور تو کیجئے ہم میں سے ہر شخص اپنی آمدنی کیوں بڑھانا چاہتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ ہم مادی اشیا کو خریدنے کے لئے اپنی آمدنی میں اضافہ چاہتے
ہیں تاکہ ہم آسودہ حال ہو سکیں۔ حالانکہ مادی چیزوں کا ہماری آسودگی سے بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں۔ ہم یہ چیزیں صرف اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے
ہمسایوں اور [illegible] پر فوقیت حاصل کر سکیں۔ جب کوئی شخص کسی فیشن ایبل علاقے میں کوئی اچھا سا مکان تلاش کرتا ہے تو اس سے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے
[illegible] اپنے خاندان کے تعلقات بڑھائیں اور اس طرح ابتدائی زمانے کی دوستیوں کی تلخ یادیں دماغ سے محو ہو سکیں۔ جب وہ اپنے
بچے [illegible] اپنے سکول میں داخل کرواتا ہے اور فیسوں پر کافی پیسے خرچ ہو جاتے ہیں تو محض یہ خیال تسکین کے لئے کافی ہوتا ہے کہ اس طرح لوگوں کی نظروں
میں عزت [illegible] محلے میں وقار حاصل ہو سکے گا۔ یورپ اور امریکہ کے ہر بڑے شہر میں بعض حصوں کے مکانات اسی لئے زیادہ مہنگے ہوتے
ہیں کہ [illegible] زیادہ سے زیادہ [illegible] خواہشوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ انسان کی بڑی خواہشوں میں ایک خواہش یہ بھی ہے کہ لوگ اس کی تعریف و توصیف کریں۔ اور
جیسا کہ ظاہر ہے معاشرے میں [illegible] وہی سمجھا جاتا ہے جو باعزت ہو اور عزت دار وہی ہو سکتا ہے جو دولتمند ہو۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ ہم
میں سے [illegible] زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا چاہتا ہے۔ اگر یہ خواہش پس پردہ کارفرما نہ ہو تو کوئی شخص بھی دولت جمع کرنے میں منہمک نہ ہو۔ جو عزت
[illegible] حاصل کرنے [illegible] ہے اور یہ آرائش و زیبائش کی چیزیں تو محض دکھاوا ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسے لکھ پتی کو لیجئے جسے فن تصویر
کشی سے کوئی [illegible] ماہرین کی مدد اور مشورے سے وہ مختلف فنکاروں کے شاہکار جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے
وہ ان تصاویر [illegible] یہ خیال کہ لوگ ان تصاویر سے اس دولت کا اندازہ کر سکیں گے جو اس کے پاس ہے۔ اس کے ذوق
[illegible] کافی ہوتا ہے۔ ورنہ [illegible] سے زیادہ تو کرسمس نمبروں کی فحش اور عریاں تصویریں اس کے لئے کشش کا سامان
رکھتی ہیں۔ [illegible] ان تصویروں کو حاصل کر کے وہ لوگوں کے دلوں پر اپنی امارت و دولت کا سکہ نہیں بٹھا سکتا۔

جہاں تک معیار عزت کا تعلق ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مختلف معاشروں میں عزت کا حصول مختلف ذریعوں سے ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ
کوئی شخص دولت مند ہی ہو۔ مثلاً آپ بعض علاقوں میں ایسی سوسائٹی پائیں گے جس میں ابھی تک زمانۂ وسطیٰ کی طرح نسل اور خاندان معیار عزت ہیں۔ یورپ
کے بعض حلقوں میں ذہنی اور ادبی برتری باعزت ہونے کے لئے کافی ہوگی۔ یونیورسٹیوں میں وہی شخص عزت و حرمت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا جو اہل
علم و دانش میں شمار ہو۔ ہندوستان میں پیروں اور رشیوں کے آگے سر تسلیم خم ہوتے ہیں۔ اور چین میں عقلاء و فضلاء عزت اور بزرگی کے اجارہ دار سمجھے جاتے ہیں۔
اب ان مختلف سوسائٹیوں کا مشاہدہ اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا کہ حصول دولت محض حصول عزت کا ذریعہ ہے اور وہ لوگ جنہوں نے
عزت حاصل کرنے کے اور ذریعے تلاش کر لئے ہیں، دولت اور زر و سیم کے انباروں سے بے نیاز نظر آئیں گے بشرطیکہ انہیں قوت لایموت سے بے فکری ہو
لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنے اس جوہر کو جلا دیتے رہیں جس کی وجہ سے انہیں عزت و شہرت و مرتبہ حاصل
ہوا ہے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ حصول زر کی خواہش فطرت انسانی میں داخل نہیں محض ذیلی حیثیت رکھتی ہے۔ اور بعض مجلسی تقاضوں
کی بنا پر آدمی اس خواہش سے دست بردار بھی ہو جاتا ہے۔ اگر قانونی طور پر دولت کی تقسیم صحیح طریق کار پر مساوی کی جاتے اور ہر شخص کے پاس برابر کا
مال موجود ہو تو پھر ہم کوشش کریں گے کہ کوئی ایسا ذریعہ تلاش کیا جائے جو ہم کو اپنے ہمسایوں پر فوقیت دلا سکے۔ اور ہم سوسائٹی میں عزت حاصل کر سکیں

کے علاوہ دولت حاصل کرنے کی خواہشوں کا اکثر و بیشتر حصہ مقابلے کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اور مقابلے میں خوشی اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم
اپنے حریف کو پچھاڑ دیں چونکہ دولت میں اضافہ مقابلتہً زیادہ نفع بخش نہیں۔ اس لئے ہم اس اضافے سے کوئی زیادہ آسودگی حاصل نہیں کرتے۔ گو ہم
زیادہ دولت سے زیادہ چیزیں خرید سکتے ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ قوتِ خرید آسودگی نہیں بخشتی۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ قوتِ خرید
میں اضافہ ہماری حصولِ زر کی خواہش کے محرکات میں شامل نہیں ہے۔ اور انسان کو آسودگی صحیح معنوں میں قوتِ خرید میں اضافہ ہونے سے نہیں حاصل
ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مشینیں آسودگی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں تو میرے خیال میں یہ بات درست نہ ہوگی۔ کیونکہ مشینیں صرف قوتِ خرید میں کسی قدر اضافے
کا باعث بن سکتی ہیں۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ ان مشینوں کو عام احتیاج دور کرنے کے کام میں لایا جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیا ہی کیوں
جائے۔ ایسے علاقوں میں جہاں آبادی بڑھتی نظر نہیں آتی ہم بغیر مشینوں کے اس لعنت کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ فرانس ہی کی مثال لیجئے۔ وہاں امریکہ، برطانیہ
اور قبل از جنگ جرمنی کی بہ نسبت کم مشینیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ احتیاج بھی کم ہے۔ اس کے برعکس زیادہ مشینوں والے علاقوں میں احتیاج بھی بد
حالی نظر آئے گی۔ احتیاج کا خاتمہ صرف مشینوں ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ آبادی کا اضافہ اور ملک کے سیاسی حالات بھی اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

اب آیئے تصویر کا ایک اور رُخ ملاحظہ فرمایئے۔ مشینوں نے ہم سے بہت سی چیزیں چھین بھی لی ہیں۔ جو یقینی طور پر آسودگی حاصل کرنے میں بڑی
حد تک مددگار ہوتی ہیں۔ میری مراد خود اختیاری اور تنوع سے ہے۔ مشینوں کے اپنے رنگ ہیں اور اپنے تقاضے۔ جس شخص نے مشین لگائی ہو اُسے تو بہرحال
اسے چلانا ہی ہے۔ جذبات کے نقطۂ نگاہ سے مشین کے بارے میں سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شاید
ہم جذبات کے بارے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان میں یکسانیت کا فقدان ہے۔ چونکہ ہمارے نام نہاد سنجیدہ لوگوں کے ذہنوں پر مشینیں سوار ہو چکی ہیں
اس لئے ان کے نزدیک ایک آدمی کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ مشین کی طرح کام کرتا ہو یعنی اس پر اعتماد کیا جا سکے۔ وہ مستعد ہو۔ پابندِ وقت
ہو۔ اُس کی زندگی میں یکسانیت ہو یعنی اس کی زیست کی گھڑیاں ایک مقررہ اور طے شدہ پروگرام کے مطابق گزرتی رہیں۔ وہ اپنے مالک کا فرمانبردار ہو
اس میں خود اختیاریت کا جذبہ بالکل مٹ چکا ہو۔ برگساں کا فلسفہ اس کے خلاف ایک احتجاج ہے جس میں یہ خوف ظاہر کیا گیا ہے کہ لوگ زیادہ
زیادہ تعداد میں آدمیوں کی بجائے مشینیں بن رہے ہیں۔ مشینوں کی غلامی کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے ہماری جبلت نے بدقسمتی سے ایک عجیب
اختیار کر لیا ہے۔ جب سے انسان نے مل جل کے رہنا سیکھا۔ اُس کے دل میں جنگ کی آگ بھڑکتی رہی ہے۔ مگر ماضی میں اُس کی حدت اور شدت
درجے پر نہ تھی جس پر آج پہنچ چکی ہے۔ اٹھارھویں صدی میں انگلستان اور فرانس میں متعدد لڑائیاں ہوئیں جو حصولِ اقتدار کی خاطر لڑی گئیں۔ مگر ان
باوجود اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کی عزت تھی۔ دونوں ملکوں کے قیدی افسر دشمن ملک میں بھی مختلف اجتماعات اور محفلوں میں معزز مہمانوں کی
حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔ ۱۸۹۹ء میں جب انگلینڈ کی ہالینڈ سے جنگ چھڑی تو افریقہ سے ایک شخص ولندیزیوں کے خلاف عجیب و غریب
من گھڑت افسانے لے کر آیا لیکن برطانیہ کے لوگوں نے اُس کی ایک نہ مانی، وہ سزا کا مستحق گردانا گیا۔ اور اس کے ساتھ ولندیزی حکومت کا ترجمانی
بیان بھی چھاپ دیا گیا۔ لیکن اگر پچھلی جنگِ عظیم میں کوئی شخص ایسی حرکت کرتا تو قوم اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیتی اور اُس شخص کو جھٹلانے والے کو
غدّار اور بزدل قرار دیئے جاتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مختلف قوموں کے درمیان جذبۂ منافرت پھیلانے اور جنگ کی آگ کو بھڑکانے کی پوری ذمہ داری
مشینوں کے سر عائد ہوتی ہے جو تین ذریعوں سے اس آگ کو ہوا دیتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ان کی وجہ سے بڑی بڑی فوجیں تیار کرنے میں مدد مل جاتی ہے

[illegible]یہ ہے کہ ہم ان کی مدد سے ایک سستا سا پریس حاصل کر سکتے ہیں۔ گھٹیا قسم کے اخبارات انہیں کی بدولت معرضِ وجود میں آجاتے ہیں۔ مخالف قسم کی
[illegible]ڑا اچھالنا اور اپنی قوم کے لوگوں کے جذبات برانگیختہ کرنا ان کا کام ہوتا ہے۔ تیس[illegible] یہ کہ ان کی وجہ سے انسان کے جذبۂ خود اختیاری کی تسکین نہیں
[illegible]نی اور وہ لاشعور میں دب کر انسان کے ذہن میں الجھنیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ انسان فطرۃً تنوع پسند ہے۔ وہ ہمیشہ انقلاب چاہتا ہے۔ ایک ہی
[illegible]ر پر چلتے رہنا اُسے [illegible] برداشت نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک ڈگر پر چلتے چلتے اکتا جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمیشہ غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرتا
[illegible]ہے۔ لیکن مشینوں کے رواج سے انسان کی زندگی میں ایک جمود سا پیدا ہو چکا ہے۔ یہ انسان کو یکسانیت اور ہمواری کا سبق پڑھاتی ہیں۔ جمود کی وجہ
[illegible] صبر۔ ہے۔ بظاہر تو انسان حالات پر شاکر و قانع ہو جاتا ہے لیکن اس کا لاشعور ہمیشہ اسے بغاوت پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ان حالات میں یہ ضرورت
[illegible]نسان جنگ سے اپنے جذبۂ بغاوت کو تسکین دے سکے۔ ہنگامہ ہائے جنگ کا خیال اس کی ذہنی گتھیوں کو سلجھا دیتا ہے۔ اور اس وجہ سے لاشعور
[illegible]نے جنگ کا زمانہ سکون کا زمانہ ہوتا ہے اور اس کا تصور سکون بخش و دلپذیر۔ ہم جنگ کا الزام سارے کا سارا سیاست والوں کے سر نہیں تھوپ
[illegible]تے۔ اس میں ہماری اندرونی خواہش کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں روس کی مثال لیجئے۔ وہاں کے لوگ پہلی جنگ عظیم میں لڑنا نہیں چاہتے تھے
[illegible]ر انہیں لڑوایا گیا۔ لہٰذا ان کی لڑائی بددلی کی آئینہ دار تھی۔ انہوں نے دورانِ جنگ ہی میں ایک انقلاب برپا کر دیا جس نے ان کو جنگ کی لعنت
[illegible]ے چھڑا دیا۔ لیکن اس کے برعکس جرمنی، برطانیہ اور امریکہ کی کوئی حکومت اپنے عوام کی عام خواہشِ جنگ کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہاں کے عوام
[illegible] ذہنوں میں مشینوں کی وجہ سے ایک عجیب قسم کا خلفشار رونما ہو چکا تھا جس کا علاج ان کے نزدیک جنگ کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان حالات کا مقابلہ مشینوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسا کرنا ایک تو غیر ممکن ہے۔ اور دوسرے انتہائی
[illegible]ت پسندی۔ اس وقت تو اس مصیبت کا یوں ہی خاتمہ کیا جا سکتا ہے کہ مشینوں سے پیدا شدہ نقائص کو دور کیا جائے یعنی اس یکسانیت اور
[illegible]موار زندگی میں لذتیں پیدا کی جائیں تاکہ لوگ ذہنی تسکین حاصل کر سکیں۔ مشینوں کی وجہ سے لوگ آرام طلبی کی روزی کماتے ہیں۔ محنت اور
[illegible]قت کا سامنا کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر انہیں ایسے کاموں میں مشغول کیا جائے جن میں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو عوام کے دلوں سے
[illegible] کی خواہش دور ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ انتظام کریں کہ کارخانوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدور اور کلرک سال میں ایک ماہ چھٹی لے سکیں۔
ان ایام رخصت میں وہ حسبِ خواہش سیر و تفریح کریں۔ اور ان کی زندگی میں پیدا شدہ جمود ٹوٹے۔ یا ان کے لئے ایسے مواقع مہیا کئے جائیں کہ وہ ہوائی جہاز
[illegible]ا سکیں یا چوٹیوں پر چڑھنے کی ہمتیں سر کی جائیں تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عوام کے دل جنگ کے جذبے سے پاک ہو جائیں گے۔ ان عوام
[illegible]ابالغوں کے دلوں سے یہ خواہش دور کرنے کا طریقہ ڈھونڈنا میرے بس کا روگ نہیں۔ لیکن میں مایوس نہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ماہرینِ نفسیات کوئی نہ
[illegible] طریقہ دریافت کر ہی لیں گے۔

مشینوں نے ہمارے حال پہ ایک کرم یہ بھی کیا ہے کہ انہوں نے ہمارے طرزِ زندگی کو تو بدل دیا۔ مگر جبلت کے تقاضوں کو چھوا تک نہیں۔ یہی وجہ ہے
[illegible]رے سارے نظام میں گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ انسانی جذبات اور جبلی تقاضوں کو سمجھنے کے علوم ابھی تک تشنہ ہیں۔ گو سائنسدانوں نے نفسیاتی تحلیل کے
[illegible]یے سے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ تحلیل ہمیں بتاتی ہے کہ آدمی لاشعوری طور پر ایک کام کئے جاتا ہے جس کی اُسے مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ ایک نامعلوم منزل
[illegible]رف گامزن رہتا ہے گویا کہ وہ سحر زدہ ہے۔ ہماری لاشعوری الجھنوں کو بھی چند انتہا پسند ماہرینِ نفسیات نے یکساں قرار دیا۔ حالانکہ ہر آدمی کی ذہنی الجھنیں

...رے سے کہیں مختلف ہوتی ہیں۔ بہر حال امید کی جاتی ہے کہ عنقریب ہمارے معاشی اور سیاسی معاملات نفسیاتی نقطۂ نظر سے جانچے جائیں گے اور اس طرح ...ت انسانی فطرت پر کافی روشنی پڑ سکے گی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ انسان کا جذبۂ بغاوت کسی صورت مٹایا نہیں جا سکتا، اور اگر دبا یا جائے تو پھر وہ لاشعور میں دبکا ہوا مصیبتیں نازل ...تا رہتا ہے جو پرانی کہانیوں کے بھوتوں کی شرارتوں سے کم بھیانک نہیں ہوتیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انسانی تقاضوں کو نفسیات کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے اور ان کو سمجھ کر کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جو کم خطرناک بھی ہو اور ان تقاضوں کو پورا بھی کر سکے۔ مشینوں سے پیدا شدہ یکسانیت اور مجبوری ہمارے کام میں سب سے زیادہ مخل ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر فرد کی زندگی میں ایسے لمحات ہونے چاہئیں جن میں یہ جمود ٹوٹ سکے اور فرد کی خواہش خود اختیاری تسکین پا سکے۔ یہ سچ ہے کہ ایسا کرنے سے مصارف میں بہت کچھ اضافہ ہوگا لیکن بہر حال وہ کسی صورت بھی جنگ کے خرچ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

انسانیت کی ترقی کے لئے بھی یہ بات ضروری ہے کہ انسانی ذہن کو سمجھا جائے۔ سائنس نے دنیائے طبیعیات میں تو ایک انقلاب برپا کر دیا ہے مگر خود ہمارا ذہن ابھی تک اس کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے۔ اور اس کے بارے میں تو ہم اتنا کچھ بھی نہیں جانتے جتنا منفی اور مثبت برقیوں ...ستاروں کے بارے میں۔ جب سائنس انسانی فطرت کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اسی وقت ہم صحیح طور پر اس آسودگی اور ذہنی تسکین سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ جس کو حاصل کرنے میں مشینیں اور طبیعیات ناکام ہو چکی ہیں۔

مستجاد رضوی

●

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کی تفسیر

از محمد انور طور

سائنس کی دنیا نے دکھائی یہ ترقی — اک منظرِ پامال ہیں ایوان و عمارات
ناپاک ارادوں کی ہے خلقت کا مرقع — انسان پہ انسان جھپٹتا ہوا ہیہات
لاٹھی کی حکومت کی یہ تصویر ہے گویا — مرغانِ حق آگہ کی دبا دیتے ہیں اصوات
ہر سمت دھواں دھار گھٹاؤں کا سماں ہے — آتش کے بھرے ہیں تو شعلوں کی ہے برسات
اڑتے ہوئے بمبار ہیں خونخوار فضا میں — انساں کے لبادے میں کوئی دیو خرابات

گر اس سے بڑھی اور مشینوں کی حکومت
پھر عہدِ جہالت کے نظر آئیں گے حالات

جلال الدین اکبر

صہبائے شوق

خوفِ حق ہے دلیلِ راہِ صواب　　فَاتَّقُوا اللّٰہَ یَا اُولِی الْاَلْبَاب،
عقل ہے اور جنونِ سُود و زیاں　　عشق ہے اور غارتِ اسباب
توڑ دے پاستے حرص کو ناداں　　کہ یہ دنیا ہے ایک موجِ سراب
ترک کر دے ہوائے نفس کو بس　　رُوئے مقصود کا یہی ہے حجاب
دربِ پیرِ مغاں کی خاک ہوئے　　جب ملا ہم کو جرعۂ مئے ناب،
یا رِ یابِ جنابِ حسن ہوئے　　جب کیا غم نے پائمال و خراب
ہم ہیں اور سجدہ ہائے عجز و نیاز　　کہ محبت ہے سر بسر آداب
دل کی نازک مزاجیاں توبہ　　غمِ دنیا کی اب نہیں اِسے تاب
کثرتِ شوق ہے کہ شدّتِ غم　　خواہشِ لُطف ہے نہ خوفِ عتاب
میرا محبُوب ہے مرا معبود　　اور محبّت ہے میرا بادۂ ناب
میرا پیمانہ ذِکر و سوز و گداز　　میرا میخانہ مسجد و محراب
میرا کاشانہ مہبطِ انوار　　میرا پروانہ جمعِ احباب
میرا ویرانہ منزلِ عشاق　　میرا دیوانہ ہر دلِ بےتاب

مستِ صہبائے شوق ہیں اکبر
ہم نہیں جانتے شراب و کباب

محمد شمس الدین صدیقی ایم۔اے (عثمانیہ)

رقیب

(ایک ایکٹ کی تمثیل)

افراد ــــــــ

میاں

بیوی

نوزائیدہ بچہ

مقام:۔ متوسط گھرانے کا ایک مکان　　　　　زمانہ:۔ موجودہ

(پردہ اٹھنے پر ایک بڑے کمرے میں ماں بچے کو گود میں لیے لوری دے کر بہلانے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے۔ رات کا وقت ہے اگر چہ ایک کونے میں قندیل رکھی ہے اور اس کی مدھم روشنی میں کلاک کا وقت صاف نظر نہیں آرہا ہے، کانٹوں کے انداز سے آٹھ بجنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک کونے میں دو کرسیاں اور ایک سادہ میز جس پر ہر قسم کی گھریلو چیزیں رکھی ہوئی، دوسری طرف فرش بچھا ہوا اور اس پر بیوی بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے)

بیوی:۔ (دبی ہوئی مدھم آواز میں) سو جا رے ننھے سو جا تو۔ سو جا رے ننھے سو جا۔

(باہر سے بادلوں کی کڑک اور پانی برسنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بجلی بھی وقتاً فوقتاً چمک کر سارے کمرے کو لمحہ بھر کے لئے اچانک روشن کر دیتی ہے)

بیوی:۔ ننھے! آج تیرے ابا کو بہت دیر ہو گئی اور چھتری بھی نہیں لے گئے۔ خدا معلوم کب یہ بارش تھمے!!

(بچہ کچھ کلبلانے لگتا ہے اور ماں پھر لوری دینے لگتی ہے)

سو جا رے ننھے! سو جا تو ......

(کچھ دیر بعد میاں تیزی سے داخل ہوتے ہیں پانی میں تر بتر بھیگے ہوئے اور سخت وحشت زدہ عالم میں سانس پھولی ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوڑتے ہوئے آئے ہیں، آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

میاں:۔ اوفوہ! کیا سردی ہے اور پھر اس پر یہ اچانک بارش! خدا کی پناہ!! اگر اور کچھ دیر ہو جاتی تو میں پانی میں بالکل ہی بہہ جاتا (سردی سے دانت کٹکٹانے لگتے ہیں)

بیوی:۔ ذرا دروازہ ٹھیک سے بند کر دو، ٹھنڈی ہوا آرہی ہے کہیں بچہ کو لگ نہ جائے۔

میاں:۔ (دروازہ زور سے بند کر کے چٹخنی لگا دیتا ہے) یہ لو۔ اب تو ٹھیک ہے نا؟

(بیوی بدستور بچّے کی طرف متوجہ ہے، ننھا لوری اب رک گئی ہے صرف تو رہا رہتی ہے)

میاں:- ذرا کپڑے نکال دو، بدل لوں۔

بیوی:- ننھا اب سونے ہی والا ہے، میں اٹھ جاؤں تو جاگ پڑے گا، تم خود نکال لو۔

میاں:- میں یہاں سردی کے مارے کانپ رہا ہوں اور تم باتیں بنا رہی ہو۔

بیوی:- باتیں کیا بنا رہی ہوں، دیکھتے نہیں ننھے کو لئے بیٹھی ہوں

میاں:- تو ننھا کو لئے بیٹھی ہو تو مجھ پر کیا احسان کر رہی ہو؟

بیوی:- ننھے میں [illegible] کی امانت ہے؟

میاں:- اس ننھے نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے، گویا اب میری کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔

بیوی:- ناحق ایسی کیوں الجھتے ہو، اگر خود ہی صندوق سے کپڑے نکال لیتے تو تمہارا ایسا کونسا نقصان ہو جائے گا؟

میاں:- ہاں ایسا نقصان ہو جائیگا، دن بھر دفتر میں دماغ سوزی کروں، رات میں ننھا رلا دے، ہانپتا کانپتا بھیگا ہوا گھر واپس آؤں تو بیوی کی باتیں سنوں، لعنت ہے ایسی زندگی پر!

بیوی:- تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے، تم تو اب بات بات پہ جھگڑنے لگے ہو۔

میاں:- اب چھوڑو اس ننھے کے چونچلے، چلو سیدھی طرح میرے کپڑے نکالو اور کھانا چن دو۔

بیوی:- چلاتے کیوں ہو، ذرا آہستہ بولو، ننھا اٹھ جائیگا تو پھر دیر تک سوئیگا نہیں۔

میاں:- پھر وہی ننھا! کیا صرف ننھے ہی کو سونے کا حق ہے، مجھے نہیں ہے؟ کیا ننھا دن بھر کام کرتا اور پیسے کماتا ہے؟ ننھا گھر چلا رہا ہے یا میں؟

بیوی:- چھوڑو بھی اس فضول بحث کو، تمہاری اور ننھے کی کیا برابری، اس سے کیوں جلتے ہو؟

میاں:- کیوں نہ جلوں، جب سے وہ پیدا ہوا ہے تم تو بس اسی کی ہو گئی ہو، میرا تو کوئی خیال نہیں اور ننھے کی ہر بات کا خیال، کیا اسی کے لئے شادی کی تھی؟

بیوی:- پھر اور کس لیے؟ اگر اولاد نہ ہوتی تو پھر شادی کا مقصد ہی کیا رہا؟

میاں:- ہاں شادی کا یہی تو مقصد ہے کہ دن بھر پسینہ بہاؤ، کولھو کے بیل کی طرح کام کرو اور جو کچھ اس کا معاوضہ ملے وہ سب بچوں پر لٹا دو، باپ چاہے جائے جہنم میں!

بیوی:- اب چپ بھی رہو، تم تو چلا چلا کر ننھے کو اٹھا ہی دو گے، میں ابھی کپڑے نکالے دیتی ہوں، بھوک کی حالت میں آدمی ایسی ہی الٹی پلٹی باتیں کرتا ہے۔

(بچے کو آہستگی سے فرش پر لٹا کر اٹھتی ہے اور صندوق سے کپڑے نکالتی ہے اور پھر کھانے کا انتظام کرنے اندر چلی جاتی ہے)

میاں:- (بچے سے مخاطب ہو کر) سو جا بیٹا مزے سے، میں اب تمہارے ہی لئے رہ گیا ہوں۔

(بیوی کھانا لے آتی ہے اور میز پر چن دیتی ہے)

بیوی:- لو پہلے کھانا کھاؤ، پھر مجھ سے بات کرنا۔

میاں:- (غصے میں آکر) تو تمہارا مطلب ہے میں ہوش میں نہیں ہوں؟

بیوی:- کیا ہوا ہے تمہیں، کیا کہیں کچھ پی کر آ گئے ہو؟

میاں:- (زور سے) خاموش! دیکھو جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے کہ تم پہلے میری بات سنو گی یا اپنے ننھے کی میں کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

بیوی:۔ اس غریب بے زبان کے پیچھے کیوں پڑے ہو، تمہارا ہی تو بچہ ہے!

میاں:۔ نہیں! تمہارا ہے، میں نے کب کہا تھا کہ . . . . .

بیوی:۔ کیوں خدا کی نعمت کو ٹھکراتے ہو . . .

میاں:۔ یہ نعمت ہے! شادی ہوئے دس مہینے بھی پورے نہیں ہوئے اور یہ بچہ میری زندگی وبال کرنے کے لیے آموجود ہوا، کیا یہ نعمت ہے؟ راتوں کی نیند خراب ہوئی سو الگ اور پھر . . . .

بیوی:۔ گویا تم کبھی بچے نہیں تھے!

میاں:۔ چپ رہو! اب دو دو دو جواب بھی دینے لگیں! یہ سب اسی ننھے کی وجہ سے۔ وہ دن یاد ہیں جب میری بات بات پر جان چھڑکتی تھیں! اب مقابلہ کرنے لگی ہو!

بیوی:۔ اس میں مقابلہ کی کیا بات ہے۔ یہ بیچارہ بے زبان بے بس بچہ اگر اس کے آرام کا خیال نہ رکھوں تو کیا روتا ہوا چھوڑ دیا کروں؟

میاں:۔ ہاں، اس کے آرام کا ضرور خیال رکھو! اور گویا میں اب یہاں صرف جھک مارنے آتا ہوں!

بیوی:۔ پھر وہی! اچھا لو کھانا کھالو، تم بہت بھوکے معلوم ہوتے ہو۔

میاں:۔ ہاں، ایسا بڑا ہی تو میرا خیال ہے تمہیں۔ دیکھو جی، آج یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ تم میری بیوی ہو یا ننھے کی ماں؟

بیوی:۔ اس فضول بحث سے کیا حاصل ہے؟

میاں:۔ بولو، تمہارا کیا جواب ہے؟

بیوی:۔ میں تمہاری بیوی بھی ہوں، تمہارے بچے کی ماں بھی ہوں۔

میاں:۔ جھوٹ مت بکو۔ اگر بیوی ہوتیں تو میں ابھی تک بھیگے کپڑوں میں کپکپاتا یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔

بیوی:۔ یہ کیا کپڑے نکلے رکھے ہیں۔ اگر نہ بدلو تو اس میں میرا کیا قصور؟

میاں:۔ وہ دن کہاں گئے جب تم شام ہی سے میرا انتظار کیا کرتی تھیں

بیوی:۔ تو کیا اب نہیں کرتی؟

میاں:۔ شاید اس انتظار کو لوریوں میں بہلاتی ہو۔

بیوی:۔ خدا جانے تم ننھے کے کیوں دشمن ہو گئے ہو، تم تو ابھی نہ

میاں:۔ اس سے کس نے کہا تھا کہ اتنا جلد پیدا ہو جائے اور ہمارے لطف کو خاک میں ملا دے!

بیوی:۔ ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو، سوچو تو تم کیا کہہ رہے ہو

میاں:۔ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کے پیدا ہونے سے پہلے منتظر رہتی تھیں، ساتھ بیٹھی رہتی تھیں، میرے آتے ہی تپیدے استقبال کرتی تھیں، میرے کپڑے اتارتی تھیں، جوتے نکالتی تھیں، منہ ہاتھ دھلاتی تھیں . . . اور اب؟ اب تو لو! اور مدام برابر ہے!

بیوی:۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کیا اس معصوم مسکراہٹ کا بدل ہیں جو بچے کے چہرہ پر نظر آتی ہے؟

میاں:۔ پھر وہی بچہ! یہی تو میں کہتا ہوں، اسی نے میری اچھی خا[صی زندگی] تباہ کر کے رکھ دی ہے۔

بیوی:۔ تو آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

میاں:۔ میرا مطلب وطلب کچھ نہیں۔ سب کچھ سمجھ کر بھی انجان ہو تو اس کا کیا علاج ہے۔

بیوی:۔ کیا ننھے کا گلا گھونٹ دوں، جب تمہیں چین آ جائے گا

میاں:۔ میں یہ تو نہیں کہتا مگر یہ اس قدر جلد پیدا کیوں ہوا؟

بیوی:۔ اب اس کا جواب میں کیا دوں، یہ تو تم اپنے آپ سے یا پھر خدا سے۔

میاں:۔ میں کسی سے پوچھنا نہیں چاہتا، میں خود اپنا منہ کالا کئے لا[تا ہوں] لاؤ میری چھتری۔

بیوی:۔ کیا مطلب؟

میاں:۔ مطلب یہ کہ میرا اب اس گھر میں رہنا دشوار ہے۔

(بچہ مسلسل رو رہا ہے)

میاں:۔ (چھتری ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں سے بچے کو سنبھالتا ہے اور لے کر ٹہلتا ہے) ارے کیوں رُوتا ہے بھئی کیا تکلیف ہے تجھے؟

بیوی:۔ تمہاری ورزشی کچھ کم تکلیف ہے؟

(بچہ روتے روتے چھلکتا ہے)

میاں:۔ ارے ارے لٹا دو بھئی میرے کپڑے بھیگے ہیں، سے سردی نہ لگ جائے۔

بیوی:۔ خود ہی لٹا دو۔

میاں:۔ (بچے کی بے ادبی سے متاثر ہو کر اس کا منہ چوم لیتا ہے اور فرش پر لٹا دیتا ہے) مت رو، مت رو، اچھا ہم نہیں جائیں گے، اب تو خوش ہو جا۔

(بچہ برابر رو رہا ہے)

میاں:۔ (گالوں کو تھپتھپا کر) او ہو ہو! مت رو، ننھے مت رو، ہم تجھے شربت لا دینگے جھنجھنا لا دیں گے، پنل لا دیں گے، سو جا، سو (بیوی آکر بچے کو پھر گود میں لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ میاں کپڑے بدلنے اندر چلے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد بدل کر واپس آتے ہیں)

بیوی:۔ شکر ہے تمہارے سر سے بھوت اترا تو سہی۔

میاں:۔ چڑھا ہی کب تھا؟

بیوی:۔ ابھی ابھی جو ولایتی بن رہے تھے۔ وہ سب کیا تھا؟

میاں:۔ یہ تو سب مذاق تھا۔

بیوی:۔ ہاں، اب اپنی بیوقوفی کو مذاق سے پردہ میں چھپا رہے ہو۔ کیا کر رہے ہو خیر کھانا تو کھا لو۔

میاں:۔ وہ تو کھاؤں گا ہی، پھر وہ ننھے کو شربت جھنجھنا اور پنل لا کر دے گا؟

(پردہ فوراً گرتا ہے)

(حجیاب [illegible])

ولی دکنی

(۱۰۷۹ تا ۱۱۵۵ ہجری)

مت غصے کے شعلوں سوں جلتے کوں جلاتی جا — ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر جوگی کی لیا صورت — یک بار اری موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف — اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں — ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی پجن ہاری اس بت کوں پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر اس دل کوں کیا کاجل — یو روشنی افزا ہے انکھیں کوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم

مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

حسین جلیل

پاکستان کا سپاہی

(دوران جنگ میں اپنے ساتھیوں سے)

[illegible] اُس دن یہ شعر موزوں ہو گئے ۔ بظاہر ایک مختلف چیز تھی [illegible] شاعر خواہ وطن سے محبت کرے یا وطن کے سپاہی سے ۔ اپنی ذات کو کلام [illegible] سے وطن کا سپاہی ہے ۔ (جلیل)

اگر [illegible] دہر آجاؤں — وطن کی راہ میں لڑتا ہوا گر موت پا جاؤں

بچا لینا وطن کو جان کی بازی لگا دینا — کڑی جنگوں میں پاکستان کی عزت بچا لینا

[illegible] لوٹ کر جانا — مرے احباب کو میرا یہ اک پیغام پہنچانا

[illegible] کو — خدائے برتر و عالی نے دی ہے آبرو مجھ کو

مری ناکامیوں کو میرا [illegible] کہنا! — وطن کی راہ میں مَیں نے لٹا دی زندگی کہنا

[illegible] کہ اب مجھ کو ارم جلوے دکھاتا ہے — مجھے تم سے زیادہ چاہنے والا بلاتا ہے

یہ آخر میں بہادر ساتھیو تم سے گزارش ہے — اگر تم سے بنے تو اور اک خدمت کی خواہش ہے

کراچی میں مری چھوٹی سی اک تربت بنا دینا — مجھے تم قائدِ اعظمؒ کے پہلو میں سُلا دینا

ہوا تھا یہ سپاہی دیس پر قربان لکھ دینا

مرے مرقد پہ تم اک نقطۂ پاکستان لکھ دینا

ڈاکٹر جلیل شاہ پوری
(از حیدرآباد دکن)

ولی کی غزل

غزل فارسی شاعری کی ایجاد ہے اس میں عموماً سے ۱۲ تک اشعار ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعوں اور بعد کے اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ یا قافیہ و ردیف
ضروری ہے۔ اردو و فارسی کے تمام اصنافِ سخن میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ سے شاعر عموماً اپنے ذاتی احساسات کا بیان کرتا ہے اس میں ہر قسم
جذباتی اور اخلاقی مضامین باندھے جا سکتے ہیں۔ غزل میں بلندی خیال، سلاست بیان، شیرینی زبان، تشبیہ، استعارہ، معاملات، ترنم، بحروں کا انتخاب اور روزمرہ کے
استعمال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ولی کی غزل اردو کے ابتدائی دور کی یادگار ہونے کے باوجود ان تمام زیورات سے مرصع و مزین ہے۔ غزل میں عام طور پر معاملات حسن و عشق یا دراصل حسن کے متعلق
بیان کئے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بغیر محبت یا کم از کم خیال و ذکرِ محبت کے زندگی میں قطعاً کسی قسم کا لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔

ولی کی شاعری میں معشوق کا تصور اصلی اور حقیقی ہے ان کا معشوق بعد کے شعراء کے معشوق کی طرح نہیں جس کی اگر تصویر کھینچ دی جاسکے تو ایک اچھے خاصے کارٹون
بن جائے گی۔ اس لئے کہ متاخرین نے اپنے معشوق کی خصوصیات شکل، صورت، وضع قطع کا اس مبالغہ سے ذکر کیا ہے کہ اگر تمام خصوصیات کسی ایک معشوق
میں بالحقیقت جمع ہو جائیں تو کم از کم وہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہوگی۔ مثلاً منہ کو غنچہ سے تشبیہ دیتے ہوتے بالکل معدوم ہی بنا دیا، زلفوں کا یہ حال ہے کہ ان کو کسی اونچی
سے اونچی فصیل پر چڑھنے کے لئے آسانی سے پھندا بنایا جا سکتا ہے، کمر پتلی ہوتے ہوتے بالکل بال کی طرح ہو گئی اور آخر کار تو یہ کہہ دیا گیا کہ

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے   کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

لیکن ولی اپنے معشوق کو انسانی شکل ہی میں دیکھتے ہیں اور اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ سننے والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کی محبوبہ کوئی بہت ہی حسین اور متناسب الاعضا
عورت ہے جس کو مخاطب کر کے وہ بے اختیار کہتے ہیں کہ

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا   ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا
تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت   یک بار اری موہن اچھاتی سوں لگاتی جا

ولی نے جو اردو غزل گوئی کا باوا آدم ہے فطرت کے تقاضے کے مطابق غزل میں عورت کو معشوق سمجھنے کی ہدایت کی لیکن افسوس کہ ہمارے شعرا فارسی
کا رنگ دیکھتے دیکھتے خود بھی ایرانی مذاق کے ہو گئے، ولی ہندوستانی ہیں ان کی معشوقہ بھی یہیں کی ہے جو گھونگھٹ والی ہے

مجھ گھٹ میں ہے نگھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا   دیکھن سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا

تشبیہ و استعارہ کلام میں لطافت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اصل سے زیادہ نقل کو پسند کرتا ہے اس لئے اچھی صورت
کو صرف اچھی صورت کہہ دینے سے سامعین پر کوئی خاص اثر نہیں ہو سکتا اگر اس کی بجائے پھول کہہ دیں تو یقیناً وہ متاثر ہوں گے اور سمجھیں گے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے
بہت ہی حسین ہے۔ اردو بھاشا اور فارسی سے مل کر بنی ہے اس لئے اس میں ان دونوں زبانوں کی خصوصیات کا ہونا ضروری تھا پہلے پہل تو ان دونوں زبانوں کی

چند غزلیں

آنسہ نکہت رعنا بٹ

مطربا! آغازِ الفت کا فسانہ چھیڑ ذرا
میٹھا میٹھا، مدھم مدھم ترانہ چھیڑ ذرا

لوٹ آئیں گی بہاریں پھوٹ نکلے گا شباب
دیکھ کر میری طرف ہاں مسکرانا پھر ذرا

دھل کے رہ جائینگے سب عہد خلافی کے گلے
مسکرا کر بھول جانے کا بہانہ چھیڑ ذرا

ساز ہے خاموش میری زیست کا مدت ہوئی
کاش ہو جاؤں حوادث کا نشانہ پھر ذرا

بھولا بھٹکا آ ہی نکلے گا کوئی سیلِ بلا
خیر مقدم کو کہ دل تعمیرِ خانہ چھیڑ ذرا

نکہت بے چارہ تجھ کو بجلیاں بھولیں نہیں
آزمالے تو بنا کر آشیانہ پھر ذرا

ظفر اقبال حشر

تقدیسِ فکر ذوقِ تماشا نے لوٹ لی
عقبیٰ کی چیز جنتِ دنیا نے لوٹ لی

ہم اُن سے عرضِ شوق کی جرأت نہ کر سکے
یہ آرزو ہجومِ تمنا نے لوٹ لی

رُودادِ زندگی کا خلاصہ یہی تو ہے
امروز کی خوشی غمِ فردا نے لوٹ لی

کیا چیز تھی نہ جانے مری عصمتِ نظر
کعبے سے بچ رہی تو کلیسا نے لوٹ لی

جینے کی اب امید نہیں چارہ گر مجھے
جو زندگی تھی فکرِ مداوا نے لوٹ لی

جوشِ جنوں میں بات ہی پہلی سی اب کہاں
لذت جو تھی وہ وسعتِ صحرا نے لوٹ لی

دل کی وہ ایک بوند جو نقدِ حیات تھی
اے حشر میرے ذوقِ تماشا نے لوٹ لی

جیمنی سرشار

بزمِ محفل کی جانب یوں ترا دیوانہ آتا ہے
کہ جیسے شمعِ روشن کی طرف پروانہ آتا ہے

زبانِ شیخ پر جب خلد کا افسانہ آتا ہے
مرے دل میں خیالِ کوچۂ جانانہ آتا ہے

اسیرِ کفر و ایماں ہے ابھی انساں قیامت ہے
ابھی محفل میں ذکرِ کعبہ و بت خانہ آتا ہے

الٰہی! لاج رکھنا میرے زہد و پارسائی کی
کہ یاد اب بھی وہ لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے

کبھی توبہ کی جانب منتقل ہوتا ہے ذہن اپنا
کبھی دل میں خیالِ شیشہ و پیمانہ آتا ہے

فقط سرشار ہی پر دوست! یہ پابندیاں کیوں ہیں؟
تری محفل میں جب ہر شخص بیباکانہ آتا ہے

عبدالمجید حیرت

سینہ کس کا ہے داغ داغ کس کا ہے
گھر میں روشن چراغ کس کا ہے

سامنے ہے مگر نہیں ملتا
اس قدر گم سراغ کس کا ہے

دیکھتے ہی میں گے، دیکھنے والے
آسماں پہ دماغ کس کا ہے

مے سے لبریز جام ہے کس کا
اور خالی ایاغ کس کا ہے

ایک دھوکا ہے یہ بھی اے حیرت
ورنہ یہ باغ و راغ کس کا ہے

بچہ ڈھونڈتا تھا کبھی کبھی کنایتہً اس سے کہہ دیتا کہ "...... پہلوان۔ تم میرے پیچھے لڑکے کو تنگ نہ کیا کرو۔" اس دوران میں سلیم نے دیکھا کہ جب اس کی دکان سے
سے چھری، چاقو یا سگریٹ کے پیکٹ وغیرہ کوئی نہ کوئی معمولی شے غائب ہو جاتی۔ سلیم نے ایک دن ہمت کر کے کہہ دیا کہ "پہلوان جی! تم میرے پیچھے د
دکان پہ آیا کرو اور سودا بھی میرے ابا ہی سے لیا کرو ...!" اس کے نتیجے میں لطیف نے دکان پر آنا بند کر دیا لیکن اس کے بعد ایک عجیب حادثہ پیش آ
دن غفور خاں کا لڑکا چار آنے کے بسکٹ لینے آیا اور جو چونی سلیم کو دے گیا وہ بعد ازاں غور سے دیکھنے پر کچھ خراب پائی گئی۔ شام کو جب ملا دکان پر آیا تو
وہ چونی باپ کو دکھائی کہ کھوٹی تو نہیں، اور کہا کہ "یہ غفور خاں کا لڑکا دے گیا ہے۔" ملا نے کہا "بالکل خراب ہے جا اس کے گھر سے دوسری چونی بدل کر لے آ۔"
غفور خاں کا مکان تھوڑی ہی دور گلی کے دوسرے نکڑ پر تھا۔ زیادہ بہتر ہوتا جو ملا ذرا صبر سے کام لیتا اور پھر جب غفور خاں یا اس کا لڑکا کسی ضرورت سے دکان پر
آتے تو ان سے کہہ دیتا یا یہ بھی نہ کرتا تو سلیم کو بھیجنے کے بجائے ذرا خود ہی بڑھ کر اس کے گھر سے چونی بدل لاتا۔ مگر اس کی قدرتی بزدلی اور کمزوری نے ا
اپنے لڑکے کو دوسرے دن کہ جو کچھ روداد پیش آنے اس طفل ہی کو پیش آئے۔ اس واقعے میں ان بے پروا والدین کے لئے ہزار ہا سبق ہیں جو اکثر اسی قسم ا
سے کام لیتے اور اپنے بچوں کو معمولی کاموں کے لئے اندھیرے اجالے کہیں بھیج دیتے ہیں اور بظاہر معمولی باتوں کے سنگین پس منظر پر ان کی نگاہ نہیں ہوتی۔
جھٹپٹا ہو چکا تھا جب سلیم باپ کے حسب الحکم غفور خاں کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ تاریکی غالب آ رہی تھی تاہم لوگ ابھی چل پھر رہے تھے۔ سلیم غفور خاں کے
گھر پھر واپس نہ آیا۔ نہ کسی سے اس کی کوئی خبر مل سکی۔ دو دن بعد اس کی لاش بہت مسخ حالت میں غفور خاں کے مکان سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر
اختتام پر ایک کوڑی میں چھپی ہوئی ملی جہاں لاش کی موجودگی کا سراغ اس کے غیر معمولی تعفن سے ملا۔

رات کے آٹھ بجے کے قریب جب سلیم کو غفور خاں کے ہاں گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زائد ہو گیا تو اس کے باپ کو تشویش ہوئی۔ اس اثناء میں
کا بڑا لڑکا اور اس کا بوڑھا نوکر بھی اپنی دکان بند کر کے واپس آ گئے تھے چنانچہ عزیز اپنے نوکر کے ساتھ ایک لالٹین ہاتھ میں لئے غفور خاں کے مکان کی
چلا۔ ایک دو دوست ہمسائے بھی ان کے پیچھے ہو لئے۔ اگرچہ رات زیادہ نہیں گئی تھی مگر غفور خاں کے مکان کا دروازہ بند پایا گیا۔ عزیز نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑے
توقف کے بعد دروازہ کھلے بغیر اندر سے زنانہ آواز میں کسی نے جواب دیا "... کون ہے؟ وہ (غفور خاں) گھر میں نہیں ہیں ..." عزیز نے باہر سے کہا "
ملا کا لڑکا ہوں کافی دیر ہوئی سلیم آپ کے یہاں کھوٹی چونی واپس کرنے آیا تھا جو آپ کا لڑکا آج بسکٹ لیتے وقت دے آیا تھا۔ وہ چونی خراب تھی۔ مگر پھر اب
سلیم دکان کو نہیں لوٹا ....؟" کچھ توقف کے بعد اسی آواز میں پھر جواب ملا "یہاں تو سلیم نہیں آیا ... نہ کوئی چونی کا ذکر سنا۔" عزیز یہ غیر متوقع جو
اور دروازہ نہ کھلنے پر سخت مضطرب ہوا۔ طرح طرح کے خیال اس کے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ اگر اس کے اندر جرأت ہوتی تو وہ دروازہ کھلوانے پر اصرا
وہ اس کے بغیر ہی وہاں سے پلٹنے لگا۔ اتنے میں اس کے ساتھی بھی پیچھے سے آ پہنچے۔ انہوں نے گلی کے وسط میں پڑے ہوئے ایک جوڑی جوتے پائے
نے ذرا پہچان لئے کہ سلیم کے تھے۔ اس قدر قوی شہادت و سراغ کے باوجود عزیز اور اس کے ساتھیوں نے فوراً بھی عقل و ہمت سے کام نہیں لیا۔ اگر یہ لوگ ا
معمولی اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے صرف دروازہ کھلوائے جانے ہی پر اصرار کرتے تو کم از کم یہ دو سوال اسی وقت حل ہو جاتے کہ آیا غفور خاں ا
فی الواقع گھر میں موجود تھا یا نہیں؟ دوم یہ کہ سلیم اس وقت تک زندہ تھا یا مردہ، یا گھر میں اس کی موجودگی کا کوئی امکانی ثبوت تھا ... کچھ بھی نہ کرتے ہوئے
ہر تو نوں میں سے ایک دو افراد غفور خاں کے مکان سے متصل کہیں ٹھہر جاتے اور چھپ کر شب کے بقیہ حصے میں مکان میں آنے جانے والوں کی حرکات و سکنات
دیکھتے کہ کون کون اس کے بعد کسی وقت گھر سے باہر نکلا۔ کون داخل ہوا۔ یا اس کے بعد پھر دروازہ کھلا یا نہ کھلا، تو معاملے کے متعلق بہت کچھ عقدہ کشائی ہ

عبدالعزیز خالد

خلش

(ترکی سے ترجمہ)

کتنا آزاد ہے میرا سودا ——
فارغ و کم طلب و بے پروا
اس کو مرغوب نہیں ——
عیشِ جہاں
دولتِ خسروی و شانِ شہاں
ہمہ نغمہ ہمہ مستی ہمہ رنگ
اس کو مطلوب نہیں ——
مال و منال
صولت و دبدبہ و جاہ و جلال
سیم و زر لعل و گہر نیلم و سنگ
اے خدا اے کہ تو ہے صاحبِ الطافِ عمیم!
ایک الجھن سی ہے سینے میں مرے اک کاہش
اک تحیر کی تجسس کی خلش
مانگتا ہوں میں فقط تجھ سے حیاتِ جاوید
تاکہ میں دیکھ سکوں
تیرے اس کھیل کا انجام ہے کیا!

معمّا: (مُعَمَّہ ذ ہ سے) صحیح نہیں۔ اس کا مادہ "عَمی" (اندھا ہونا) ہے چونکہ اس کے معنی سطحی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے "مُعَمّا" (الف سے) کہتے ہیں۔ عربی میں "مُعَمّٰی" (ی پر کھڑی زبر) بھی لکھتے ہیں لیکن اردو میں مستند فصحا "مُعَمّا" (الف سے) ہی تحریر کرتے ہیں۔ یہ باب تفعیل سے اسم مفعول بنایا گیا ہے۔ جیسے مُرَبّا، مُصَفّا وغیرہ۔ اس میں "ہ" نہیں آ سکتی۔

ہَرج مَرج:۔ اس ترکیب میں "حَرج" (حائے حطی سے) لکھنا غلط ہے لیکن ترکیب کے بغیر تنہا "حرج" (حائے حطی سے) صحیح اور "ہرج" (ہائے ہوز سے) نادرست ہے۔ "حَرَج" (حائے حطی سے) کے معنی ہیں سختی، تنگی، نقصان، تضیع اوقات، کمی وغیرہ۔ "ہَرج" (ہائے ہوز سے) فتنہ اور آشوب کو کہتے ہیں "مَرج" کام کا بگڑنا اس لئے "مَرج" کے ساتھ بگاڑ، اضطراب، فساد اور خلط ملط کے معنی میں "ہَرج" (ہائے ہوز سے) ہی درست ہے۔ "حَرَج" (حائے حطی سے) کے معنی میں "ہرج" (ہائے ہوز سے) لکھنا جائز نہیں۔ نشتر جالندھری

(ریڈیو پاکستان لاہور کے شکریے کے ساتھ)

•

تلفظ کی غلطیاں (مکالمہ)

حامد علی خاں

علوی:۔ عباسی صاحب یہ جو ہمارے دوست ہیں مُسمّی (مُسَمّی) باقر علی ولد محمد ہاشم ان کے خلاف ایک نہ ایک دن مجھے ہتک عزت کا دعویٰ کرنا پڑے گا۔

عباسی:۔ بھائی علوی ضرور کیجئے مگر ذرا خود بھی ہوشیار رہیئے۔ ایسا نہ ہو کہیں عربی زبان آپ پر بھی ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دے۔

علوی:۔ یہ کیا مذاق آپ کو سوجھا ہے؟ جو بات کی جائے آپ ہنسی میں ٹال دیتے ہیں کیسی عربی اور کیسا دعوے؟ اور پھر میرا عربی فارسی سے سروکار کیا ہے؟ میں تو یہ زبانیں جانتا بھی نہیں میری زبان تو ہے اردو۔

عباسی:۔ علوی صاحب آپ کا عربی اور فارسی سے کوئی تعلق نہیں تو نہ سہی مگر آپ کی اردو کا تو ان دونوں زبانوں سے کچھ نہ کچھ واسطہ ہے!

علوی:۔ ہو کا صاحب! اللہ! اس وقت یہ غیر متعلق بحث ہے کیا؟ آخر میری آپ کی عربی کا کیا بگاڑا ہے جس عربی و ربی قطعاً نہیں جانتا۔

عباسی:۔ خیر یہ تو نہ کہیے آج تو اپنی گفتگو میں آپ اب تک بہت سے عربی الفاظ استعمال کر چکے ہیں۔

علوی:۔ کہتے ہوں گے مگر آخر آپ کچھ کہیں گے بھی یا آج پہیلیوں ہی میں باتیں ہوتی رہیں گی۔

عباسی:۔ اجازت ہو تو عرض کروں!

علوی:۔ اجازت کیسی، میری بات کو تو آپ نے بے لطف کر ہی دیا۔ اپنی زبان دانی کے جوہر کیا میں آپ کو جانتا نہیں؟

عباسی:۔ قطع کلام کا جرم تو مجھ سے ضرور سرزد ہوا ہے اس کے لئے معافی اور "تابعدار صاحب" کا تصدیق بھی ضرور سنوں گا مگر آپ نے گفتگو شروع کرتے ہی قانونی زبان استعمال کرنی شروع کی اسے سن کر میں کچھ گھبرا سا گیا کہ آپ نے شروع کرتے ہی پانچ لفظوں کا خون کر دیا۔

علوی:۔ عباسی صاحب! اب آپ کہاں تک میرے صبر کا امتحان لیں گے، میری فرد جرم بھی تو پیش کیجئے۔

عباسی:۔ جی ہاں، تو پہلی گزارش یہ ہے کہ آپ نے "مُسَمّٰی" (مُسَمّا) کو "مُسمی" کہا۔

علوی:۔ اچھا! یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔ تو کیا "مُسمی" کوئی لفظ نہیں؟

عباسی:۔ لفظ تو ہے، مگر اس کا مفہوم برعکس ہے۔ "مُسمّی" کہتے ہیں نام رکھنے والے کو۔ مگر یہ لفظ اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ اور شاید آپ بھی نام رکھنے والے کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اس کا ذکر کر رہے تھے جو ایک خاص نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کے لئے جو لفظ ہے اس کا تلفظ ہے "مُسَمّا" اس مفہوم میں مُسمی کہنا قطعاً غلط ہے۔

علوی:۔ اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔

عباسی:۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ آپ نے باقر علی کو ناحق باقر علی کہہ

ب: باقر؟ مگر لوگ تو باقر کہتے ہیں!

ی: یہ عوام کی نوازش ہے۔ باقر تو کوئی لفظ ہی نہیں۔ باقر اسم فاعل ہے اور اس سے مراد ہے علم و فضل یا دولت و حشمت کے وسیع ذرائع رکھنے والا شخص۔

ب: شکریہ یہ بات بھی بالکل واضح ہو گئی۔

ی: تیسری گزارش یہ ہے کہ وَلَد قطعاً غلط ہے۔ صحیح لفظ ہے وَلَد بمعنی فرزند۔ اس کا ایک لفظ وَلَد فرور ہے۔ مگر وہ اردو میں استعمال نہیں ہوتا ولد کہیے۔

ب: یہ بھی تو آپ نے خوب تر بتائی۔ وَلَد کے تلفظ سے تو میں بھی ناواقف نہ تھا مگر معلوم نہیں بولنے میں بے اختیار کیوں وَلد کہہ جاتا ہوں

ی: اتنی بے اختیاری بھی کیا۔ تھوڑا اسا رکھ رکھاؤ تو ہونا ہی چاہیے۔ خیر تو میری چوتھی گزارش یہ ہے کہ رسول اکرم کے جدِ امجد کا لقب تھا ہاشِم جو اُن کی غریب پروری کی صفت پر دلالت کرتا ہے۔ آپ نے ہاشِم کا تلفظ بھی ہاشَم کیا تھا جو درست نہیں ہے۔ ہاشم میں یائے نسبتی کے اضافے سے جو لفظ بنتا ہے اس کا تلفظ بھی لوگ غلط کرتے ہیں یعنی ہاشَمی (بش می)، یہ عوام کی اختراع ہے۔ ورنہ صحیح تلفظ ہے ہاشِمی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ باقر علی وَلَد محمد ہاشم کہنا بھی مہمل سی بات ہے۔

علوی:- میں سمجھ گیا۔ باقر علی وَلدِ محمد ہاشم کہنا چاہیے۔

عباسی:- میرا یہی مطلب ہے۔ اضافت کے بغیر یہ الفاظ بالکل بے ربط رہ جاتے ہیں فارسی اضافت ان میں ایک ربط اور مفہوم پیدا کر دیتی ہے

علوی:- میں حیران ہوں، یہ بات مجھے خود کیوں نہ سوجھ گئی۔ در اصل عوام سے غلط سن سن کر ذہن کچھ کند سا ہو جاتا ہے اور آدمی بے سمجھے بوجھے جلدی بے

عباسی:- آپ کا خیال درست ہے لیکن اگر انسان اپنے آپ کو تعصبوں سے مبرا سمجھ کر اپنے عیب کو صواب کہنے پر مصر نہ ہو تو اصلاح کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے میں بہت خوش ہوں کہ آپ کبھی کسی غلطی پر قائم رہنے کے لئے اصرار نہیں کرتے۔ ان ساری باتوں میں ذرا جلدی ہو گئی مفصل باتیں پھر کسی وقت ہوں گی

علوی:- مگر وہ پانچویں غلطی تو آپ نے مجھے بتائی نہیں!

عباسی:- میں بھولا نہیں ہوں۔ وہ غلطی ہے ہتک عزت۔ یہ جو آپ نے ہتک کہا۔ یہ ایک نئی بات ہے۔ صحیح عربی تلفظ تو ہے ہَتْک۔ ت ساکن ہے۔ ت مفتوح نہیں اردو میں بعض لوگ ہَتَک یعنی مفتوح ت کے ساتھ بھی بولتے ہیں مگر یہ ہتک تو آج آپ ہی سے سنا۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ شام کو پھر حاضر ہوں گا۔

حامد علی خاں

اپنے پیارے بچے کی روح سے

(جو ۲۲ اپریل ۱۹۴۲ء کو ڈیرہ دون میں ہم سے جدا ہوا)

تم اس ملک عدم[1] سے ابھی تک واپس نہیں آئے جہاں ہم نے تمہارا اعلیٰ بہت ہی دلخراش آہوں، فلک شگاف نالوں اور خونچکاں آنسوؤں کے ساتھ دیا تھا۔ اس آٹھ سال کی مدت میں رہا تمہاری والی بہت سے لاسلکی پیغامات ہم نے تم کو بھیجے۔ تمہاری چھوٹی بہنیں تمہیں یاد کرتی کرتی تھک گئیں اور اب وہ بڑی ہو گئیں۔ تم ہوتے تو ان سے بھی بڑے ہوتے تمہاری امی نے تمہارے غم میں اپنی صحت بھی کھو لی۔

تمہاری جدائی کے چھ سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں دنیا نے اتنا بڑا انقلاب دیکھا جس کی دہشت ناک یادداشت نے تمہاری معصوم یاد کو بھی دبا دیا اور ہمیں اس شہر سے بادلِ ناخواستہ کوچ کرنا پڑا جہاں تمہیں مصروف مطالعہ چھوڑ آئے ہیں۔ انسانوں نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ ظالموں نے مظلوموں پر ہاتھ اٹھایا۔ زبردستوں نے زیردستوں کو تباہ کیا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو تہ تیغ کیا۔ صنف نازک تک کی بے حرمتی و بے آبروئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جس کی کوکھ سے تمام ابنائے آدم پیدا ہوتے ہیں حد ہے کہ بعض درندہ صفت انسانوں نے تم جیسے نونہالوں کے شکم خون سے بھی ہاتھ رنگے۔ خنجر لال کئے توبہ! آگ اور خون کا یہ تماشا تم دیکھتے تو کیا کہتے۔ اچھا ہوا جو اس نامراد دنیا سے تم پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے!

ولادیدی کہ آں فرزانہ فرزند | چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں
بجائے شوخ چشمیں در کنارش | فلک بر سر نہادہ لوح سنگیں

ابن حسن زیدی

[1] سید سبط حسن زیدی ابن سید ابن حسن زیدی۔ [2] ڈیرہ دون کا ایک خوبصورت قبرستان جہاں صرف بچے سپرد خاک کئے جاتے تھے۔

آنسہ رضیہ جہاں آرا
بی۔ اے (عثمانیہ)

جامعہ عثمانیہ

ضمون ملک کے تمام ارباب تعلیم کے لئے علی العموم اور پنجاب یونیورسٹی کے ذمہ دار ارکان کے لئے علی الخصوص قابل توجہ ہے چونکہ توقع یہ تھی کہ پنجاب پاکستان کی قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے باب میں سارے پاکستان کی رہنمائی کرے گا۔ اس لئے پنجاب کے ارباب اقتدار کا اس سلسلے میں جو تجاہل اور دو گو مگو کی حالت ہے جس کی طرف آنسہ رضیہ جہاں آرا نے اشارہ کیا ہے اور بھی قابل افسوس بلکہ شرمناک معلوم ہوتی ہے۔ مدیر

شہر سے دور، آبادی سے دور، دنیا کی ہلچل سے دور، بیرونی اور ہندوستانی جامعات میں، اعداد و کمیت جامعہ نے اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر دور دور شہرت حاصل کر لی تھی۔ اپنے پورے حسن اور رعنائیوں کے ساتھ ایک پر فضا اور پہاڑی مقام پر واقع ہے۔ آج سے تیس سال قبل اس کا سنگ بنیاد بڑے ہی جوش و خروش سے رکھا گیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام نے دکن کے چپے چپے پر علم کی شمع جلا دی۔ جامعہ کے ماحول اور جدید قومی ... نے برعظیم کی جامعات کو بیدار کیا ہے اور یہاں کا طرز تعلیم و تدریس کیلئے باعث ... اس خوبصورت جامعہ کے ... وقت ارباب اقتدار نے اپنے ذوق جمالیات کا پورا پورا اظہار کیا تھا۔ حسین ترین قدرتی مناظر سے گھری ہوئی دلکش باغات میں ایستادہ یہ ایک پرعظمت و پرجلال نظارہ پیش کرتی ہے۔ بقول سر تیج بہادر سپرو جامعہ کا گرد و پیش اور اس کی فضائیں اسے علوم و فنون کا حقیقی مقام بنا رہی ہیں۔ اس حسین ماحول میں جامعہ عثمانیہ کی بہت سی عمارتیں ہیں جو آرٹ اور تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ جامعہ پر ایک نظر ڈالتے ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ بھی کوئی چیز ہے ... حضرات نے اس کی شاندار اور نظر فریب عمارات کو ہمیشہ تعجب و تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ طبیعات کالج، کیمیا کالج، انجنیئرنگ کالج اور آرٹس کالج کی تعمیری خوبصورتی آرائش اور تزئین سے مزید بڑھ جاتی ہے۔ سر سی پی راموسوامی ایر نے جامعہ کو دیکھنے کے بعد کہا تھا میں بھی دوسروں کی طرح جامعہ کی عمارتوں اور ان کے اندر غیر معمولی عمدہ آسائش کی تکمیل دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ جامعہ میں داخل ہوتے ہی پہلا احساس عظمت سے معمور ہو جاتا ہے بڑے بڑے خوشنما ہال، کشادہ گیلریاں اور طرز تعمیر کی ... دیکھنے والے کو فوراً متاثر کرتی ہیں۔ رشید احمد صاحب صدیقی فرماتے ہیں جامعہ عثمانیہ کی اس عمارت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد وغیرہ کی تعمیر ان پیکر ذہنوں اور شخصیتوں نے کی ہوگی۔ میں اس امر کا قائل ہو گیا کہ جتنے بڑے پیمانہ پر سوچنا، بنانا اور ساتھ ہی نزاکت و رعنائی کے ساتھ اس کو مکمل کرنا مسلمانوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دیکھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کسی زبردست عمارت کے نہیں شخصیت کے سامنے ہیں جس کی موجودگی میں کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے جو ادنیٰ درجہ کی ہو۔ ہر شخص جو ہندوستان کی اس شاندار جامعہ کو دیکھنے کے لئے آتا ہے اسے پہلے ماڈل روم میں لے جایا جاتا ہے۔ جہاں ایک نظر میں تمام جامعہ کا منظر دیکھ لیتا ہے۔ جامعہ کی مکمل تصویر ۔۔۔ ان عمارات کی جو اب موجود ہیں اور جو آئندہ بننے والی تھیں ۔۔۔ یہ تمام چھوٹے پیمانہ پر بنی ہوئی یہاں ... وہ خواب ادھورا ہی رہ گیا وہ امیدیں پوری نہ ہوئیں ۔۔۔ مذکورہ بالا کالجوں کے علاوہ بقیہ کالج شہر اور اضلاع میں ہیں۔ شہر حیدرآباد میں سٹی کالج موسیٰ ندی کے کنارے ہے۔ اس کا قدرتی نظارہ بھی بڑا کیف آور اور رومانی ہے۔ سٹی کالج کے علاوہ دار العلوم کالج، چادر گھاٹ کالج، نظام کالج، محبوب کالج، میڈیکل کالج، مختلف مقامات اور محلوں میں واقع ہیں۔ کلیہ اناث یعنی ویمنز کالج ان سب سے علیحدہ ہے یہاں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اورنگ آباد کالج، گلبرگہ کالج اور ورنگل کالج اضلاع میں ہیں۔ یہ تمام کالج جامعہ عثمانیہ سے ملحق ہیں۔ کلیہ فنون یعنی آرٹس کالج سے کچھ ہی فاصلہ پر وہ جو لال لال چھتیں درختوں میں چھپی نظر آ رہی ہیں۔ وہ زرعی کالج، کلیہ بیطاری و دار الترجمہ کی عمارات ہیں۔ دار الترجمہ کے سامنے ذرا بلندی پر جو سفید عالیشان کوٹھی ہے وہاں وائس چانسلر یعنی معین امیر جامعہ رہتے ہیں۔ آرٹس کالج کے پیچھے ہاسٹل (ر) (ب)

...ہے اور بس اور سائنس اور دیگر اعلےٰ علوم کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ خیال باطل ثابت ہوگا۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں شعبہ ...
...یات، شعبہ علم دینیات، شعبہ اردو، شعبہ فارسی، شعبہ عربی، شعبہ سنسکرت، شعبہ کامرس، شعبہ طبیعات، شعبہ کیمیا، شعبہ حیاتیات، شعبہ ارضیات، شعبہ ریاضی، شعبہ سیاسیات
...، شعبہ انجینیری، شعبہ معاشیات، شعبہ جغرافیہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ میڈیکل تعلیم بھی اردو ہی میں دی جاتی ہے۔ یہ شعبہ جات اس بات کا صاف ثبوت ہیں کہ اردو میں سائنس
...کی تعلیم بلا کسی دشواری کے دی جاسکتی ہے لیکن پاکستان کے ارباب اقتدار یہ سمجھتے ہیں کہ انجینیری، میڈیکل تعلیم اور سائنس کی تعلیم اردو میں قطعاً نہیں دی جاسکتی یا کم از کم
...دس سال تک نہیں دی جاسکتی۔ وہ صرف فنون کی حد تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر رضامند ہیں۔ حالانکہ عثمانیہ کے اردو میں تعلیم یافتہ گریجویٹ یعنی طیلسانئین انجینیر اور
...ڈاکٹر جن کو دنیا کی تمام اعلیٰ اور معیاری جامعات تسلیم کرتی ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی جامعات میں انہیں داخلے ملتے ہیں اور بیرونی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں انہیں کوئی دقت
...نہیں ہوتی اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کیا بیجا نہیں کہ اردو کو فی الفور ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جاسکتا، جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ حضرات اس کی عملی مثال ہیں کہ اردو
...ایک ذریعہ تعلیم بہت کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کی بنا پر پاکستان کو ایک بڑا علمی ذخیرہ مل سکتا ہے جسے وہ اردو کو قومی زبان بنانے کے سلسلے
...بڑی آسانی سے استعمال کر سکتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اردو میں اصطلاحات اور علمیت نہ ہونے کی بناء پر اسے اعلیٰ علوم اور ٹکنیکل علوم کی تعلیم دینے کے لئے ذریعہ تعلیم بنانا تقریباً
...ہے۔ حالانکہ اسی ناممکن کو جامعہ عثمانیہ میں بڑی محنت سے ممکن بنایا گیا تھا ہمارے سامنے جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات موجود ہیں جن سے ہم پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان
اصطلاحات ہی سے جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور ہندوستان کی کسی جامعہ سے بھی قابلیت میں کم نہیں بلکہ عثمانیہ کا نصاب دوسری جامعات سے کہیں زیادہ ہے

جامعہ پنجاب

مضمون	پرچے	نشانات
انگریزی	تین پرچے	نشانات ۱۵۰
معاشیات	دو پرچے	نشانات ۱۵۰
۱۔ اصول معاشیات، زر، بنکنگ وغیرہ		
۲۔ معاشیاتِ ہند		
تاریخ	دو پرچے	نشانات ۱۵۰
۱۔ تاریخ ہند یا تاریخ اسلام		
۲۔ تاریخ انگلستان یا تاریخ یورپ		
اردو یا کوئی اور زبان	ایک پرچہ	نشانات ۵۰

کل پرچے = ۸

جامعہ عثمانیہ

مضمون	پرچے	نشانات
انگریزی	دو پرچے	نشانات ۲۰۰
معاشیات	تین پرچے	نشانات ۳۰۰
۱۔ اصول معاشیات		
۲۔ بنکنگ زر بین قومی تجارت		
۳۔ معاشیات ہند		
تاریخ	تین پرچے	نشانات ۳۰۰
۱۔ تاریخ ہند		
۲۔ تاریخ اسلام یا تاریخ یورپ		
۳۔ تاریخ تمدن ہند		
اردو یا کوئی اور زبان	تین پرچے	نشانات ۳۰۰
۱۔ شاعری		
۲۔ نثر		
۳۔ مضمون نویسی۔ سرسری مطالعہ کی کتابیں NON-DETAILED TEXTS		

کل پرچے = ۱۱

طبیعات

اردو اصطلاحات	انگریزی اصطلاحات	اردو اصطلاحات	انگریزی اصطلاحات
خواص مادہ	Properties of matter	اضافیت	Relativity
حرارت	Heat	لچک	Elasticity
نور	Light	حرارہ	Calory
صوت یا آواز	Sound	طول موج	Wavelength
مقناطیس	Magnet	قطب	Pole
برق	Electricity	رَو	Current

ریاضی

اردو اصطلاحات	انگریزی اصطلاحات	اردو اصطلاحات	انگریزی اصطلاحات
علم مثلث	Trigonometry	سلسلہ حسابیہ	Arithmatical Progression
علم ہندسہ	Geomatry	نسبت	Ratio
ہندسی مخروطات	Geometrical conics	مسئلہ ثنائی	Binomial theorem
سکونیات	Statics	محدد	Co-ordinates
قطر	Diamater	محور	Axis
متماثلات	Identities	سمتیہ	Vector
میلان	Inclination		

اسی طرح طب Medicine قانون اور انجنیئری کی خالص ٹیکنیکل اصطلاحات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور ان علوم پر کافی کتابیں انگریزی اور عربی اور فارسی سے ترجمہ اور تالیف کی گئی ہیں۔ پاکستان میں اس طرح ان تمام علوم کی تعلیم اردو میں دی جاسکتی ہے۔ جو کچھ بھی کمی ہے اسے ترجمہ و تالیف کے ذریعے بہت جلد پورا کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال جامعہ عثمانیہ کی مثال پاکستان کے سامنے ہے جبکہ جامعہ عثمانیہ کے سامنے اس کے قیام کے وقت کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس طرح پاکستان کو جامعہ عثمانیہ کی نسبت بہت سی سہولتیں حاصل ہیں اور وہ عثمانیہ کے تجربہ سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر نہ اٹھائے تو بڑی بدقسمتی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانا بھی شاید غیر ضروری نہیں کہ جامعہ عثمانیہ ایک سرکاری ادارہ ہے۔ حیدرآباد میں تعلیم پر حکومت اپنے موازنہ کا ساڑھے بارہ فیصد حصہ خرچ کرتی ہے۔ صرف جامعہ عثمانیہ پر ۹۰ لاکھ سالانہ کا خرچ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن میں تعلیم عام اور بہت ارزاں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی ممتاز خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے اساتذہ پروفیسروں کی تنخواہیں ان کے حیثیت اور رتبہ کے شایان شان ہیں۔ خالص علمی زندگی کے لئے دنیا کی معاشی و مالی الجھنوں سے آزاد رہنا انتہائی ضروری ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ اساتذہ جامعہ کو اقتصادی پریشانیاں لاحق نہ ہوں اور وہ اطمینان اور فراغت سے اپنے اہم کام کو انجام دیتے رہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ

مخزن المخازن

ماہِ نو

غزل

(از صدق جنائی)

تیرا ستم ناز سہا بھی نہیں جاتا
تا وقت ستم آراستہ ہوا بھی نہیں جاتا

لکھنے میں [illegible] ہے کہ افسانہ [illegible]
سننے کے بھی قابل ہے سنا بھی نہیں جاتا

[illegible] کوئی عشق میں چارہ بھی نہیں اور
عاشق سے [illegible] کیا بھی نہیں جاتا

[illegible] شوق کا عالم ہے کہ [illegible]
ملنے کی بھی حسرت ہے ملا بھی نہیں جاتا

[illegible] سے مرا نامۂ اعمال
یہ کون سا خط ہے کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

تاثیر نہ ہو دی آہ جگر سوز سے کچھ بھی
منہ لے دل ناکام سیا بھی نہیں جاتا

پتھر تھا دل جس کا کہ پسیجا نہیں اے صدق
تم سے تو ترا حال سنا بھی نہیں جاتا

فیضی رحمین

(ایس۔ این قطب)

نئی دہلی کے امپیریل سکریٹریٹ کے گنبد شاہد ہیں کہ ایک پاکستانی مصور نے کس طرح اپنے وطن کی عظمت اور شان کو دوبالا کیا ہے۔ جب سکریٹریٹ کے گنبد تعمیر ہوئے تو برطانوی حکمرانوں کی تجویز یہ تھی کہ ان گنبدوں کے اندرونی حصوں کی تزئین کے لئے یورپ سے مصوروں کو بلایا جائے اس لئے کہ ان کے نزدیک ہندوستان میں کوئی مصور یہ کام انجام دینے کا اہل نہیں تھا۔ ایک مسلمان مصور نے انگریزوں کا چیلنج قبول کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اگر اس کے بنائے ہوئے نقوش پسند نہ آئیں تو انہیں کھرچ ڈالا جائے لیکن جب یہ مصوری مکمل ہو چکی تو انگلستان کے مشہور اخبار گارڈین نے اس پر شاندار تبصرہ کیا اور آج بھی جب کبھی کانفرنس کے دوران فاضل مقرروں کی نظر فیضی رحمین کی تصویروں کی رنگینیوں میں کھو جاتی ہے تو تقریر کے سلسلے منتشر ہو جاتے ہیں۔

دبلے پتلے، نرم گفتار فیضی رحمین کراچی کے ایک پرانی وضع کے بنگلے میں اوپر کے حصے میں رہتے ہیں فیضی رحمین پاکستان میں ایک قومی تصویر خانہ بنانے کا خاکہ مرتب کرنے میں اس قدر منہمک ہیں کہ انہیں اب تک اس کا بھی موقع نہیں مل سکا کہ وہ اپنی ساری بندھی ہوئی تصویریں کہ جن سے انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے، کھول کر بھی رکھ سکیں۔ فیضی رحمین ایشیا کے واحد مصور ہیں جن کی بنائی ہوئی تصویریں لندن، پیرس اور سان فرانسسکو کے تصویر خانوں کے مستقل ذخیرہ میں شامل کی گئی ہیں۔ مانچسٹر کی سٹی آرٹ گیلری نے جب فیضی رحمین کی ایک تصویر [illegible] تو اپنی قدیم روایت کے بالکل خلاف ان کی تصویروں کی واحد نمائش کی۔ [illegible] کیا جاتا ہے۔ کہ نیویارک کی نمائش میں ان کی بنائی ہوئی کشمیری پہاڑوں کی تصویروں نے دیکھنے والوں کو اتنا متاثر کیا کہ کناڈا کی حکومت نے فیضی رحمین سے راکی پہاڑ کی تصویریں بنانے کو کہا اس لئے کہ ان پہاڑوں کی عظمت اور کرشمہ کی مصوری [illegible] کا کوئی مصور بھی اس سادگی اور قوت کے ساتھ نہیں کر سکا تھا جتنی رحمین نے

یں کی خصوصیت ہے ۔

فیضی رحیمن نے مصوری کا فن اختیار کیا — یہ محض اتفاقی بات تھی۔ ان کے
الے ان کے بچپن کی شرارتوں سے عاجز آکر انہیں کسی مدرسے میں داخل کرنا چاہتے
تھے پڑوس میں مصوری کا ایک مدرسہ تھا اور اس کی فیس بھی صرف ایک روپیہ مہینہ
تھی گھر والوں نے اس فرصت سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اس مدرسہ میں داخل کر دیا
گھر والے تو اس طرح ان سے نجات حاصل کرنے پر مسرور و شاداں تھے لیکن خود
انہیں یہ قید بامشقت زیادہ پسند نہیں آئی اور اس لئے انہوں نے اس قید خانے
میں بھی اپنے دو ہم مشرب و ہم نوا پیدا کر لئے۔ پہلے مہینہ امتحان ہوا تو نتیجہ دیکھ کر فیضی
رحیمن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اور ان کے دونوں ساتھی امتحان میں فیل تھے۔
اگلے مہینے کے امتحان میں ایک ساتھی پاس ہو گیا اور اس سے اگلے مہینہ دوسرا بھی پاس
ہو گیا فیضی کو اپنے دونوں باغی دوستوں پر بڑا غصہ آیا اور اب انہوں نے بھی پڑھنے
میں جی لگایا۔ آخر تیسرے مہینہ پاس ہو کر وہ اپنے دونوں بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے
جا ملے۔ دوسری جماعت میں وہ اب دوسروں سے دو مہینے پیچھے تھے اور امتحان
میں صرف ایک مہینہ باقی تھا پھر بھی انہوں نے امتحان دیا۔

۳۴ لڑکے امتحان میں بیٹھے اور ان میں سے صرف ایک کامیاب ہوا فیضی
رحیمن یہاں سے اس شریر اور چنچل بچے کی زندگی کا رخ بدل گیا تین سال کا کورس
انہوں نے ایک سال میں پورا کر لیا اور اسکول کے پرنسپل نے یہ سفارش کی کہ اس بچے
کو مصوری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجا جائے۔

یورپ؟ یورپ جانے کا خیال بظاہر مضحکہ خیز سا تھا لیکن اس جگہ بھی اتفاق
نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ مصوری کی ایک مقامی نمائش میں مصوری کے ایک ادارے کو
فیضی رحیمن کی ایک تصویر پسند آگئی۔ اور انہوں نے انہیں تین گھنٹہ روزانہ کام کرنے
کے لئے ۱۲۵ روپیہ ہفتہ کی پیش کش کی۔ انہوں نے کام شروع کر دیا۔ کام بہت کیا،
معاوضہ بہت کم اور اس طرح اتنا روپیہ جمع کر لیا کہ اب وہ انگلستان جا سکتے تھے۔
لیکن ایک مشکل اور تھی۔ ان کی انگریزی کی لیاقت بالکل واجبی سی تھی۔ لیکن انہوں
نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک ڈکشنری خرید لی اور جہاز پر جب کوئی نیا لفظ سنا۔ اس
کے معنی اس میں دیکھ کر یاد کر لئے۔

وہ لندن پہنچ گئے لیکن انہوں نے لندن کی زندگی کے جتنے سہانے
دیکھے تھے۔ وہ وہاں جا کر ختم ہو گئے — اس لئے کہ نہ تو یہاں کی تعلیم اتنی آ
تھی جتنی بمبئی کی اور نہ روپئے کی سہولتیں تھیں۔

مایوسی نے انہیں ایک بات سجھائی۔ انہوں نے مشرقی دولت ا
وشرکت کے متعلق ایک من گھڑت کہانی لکھی۔ وہ بک گئی۔ فیضی رحیمن کو اس
بھی ہوئی اور حد درجہ کی حیرت بھی لیکن آگے چل کر انہیں معلوم ہوا کہ ان
پھوٹی انگریزی میں ایک مقامی رنگ تھا جو وہاں کے اخباروں اور رسا
بھا گیا۔ ان نیم ادبی کہانیوں سے فیضی رحیمن کو کوئی پچاس روپے ہفتہ کی آمد
لگی لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں اپنے فن کو چھوڑنے کا خیال کبھی پیدا
ہوا۔ انہوں نے رائل اکیڈمی کے آرٹ اسکول میں داخلہ کی درخواست
کا امتحان ہوا تو ان کا چالیس پاؤنڈ سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اس زمانہ میں
۱۴ گھنٹے روزانہ کام کرتے تھے۔ سال بھر کی محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی
اکیڈمی کی نمائش میں رکھی گئی۔ اس زمانہ میں انگلستان کے مشہور مصور جان سا
نے انہیں اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ اور فیضی رحیمن نے اس
اور فخر کے ساتھ قبول کر لیا۔

اس کے بعد کے چار برس میں فیضی رحیمن نے اپنی تعلیم مکمل کی اور
حلقہ میں شہرت بھی حاصل کر لی لیکن اس زمانہ میں جب زیادہ شہرت اور زیاد
کار آہستہ انہیں اپنی طرف بلا رہا تھا، ان کی فطرت نے پھر بغاوت کی ا
بوریا بستر باندھ کر ہندوستان کو واپس آگئے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ اس وقت انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا
"صرف اس لئے کہ ایسا کرنے کو جی چاہا"، لیکن ان کا خیال ہے کہ اس وق
کا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ اس لئے کہ مشرق کے مصور مغرب کی اجنبی فضا میں
پھول نہیں سکتے۔

یہ بات اس وقت کی ہے جب ہندوستان کی ذہنی فضا میں

یہ سوال ہر غیور سرحدی کے ذہن میں ابھرے گا۔

موسیٰ خان اور گل مکئی

موسیٰ خان گل مکئی کا چچا زاد بھائی تھا اور اس کا محبوب تھا۔ بچپن ہی سے ان کے ماں
اولین سے گل مکئی کو موسیٰ خان سے چھین لینا چاہتا ہے۔ مگر [illegible] جان اور میر ولی
بعد [illegible] سے موسیٰ خان کے دوست تھے انہیں اپنی اس کوشش میں ناکام رہنا پڑتا ہے
دوران میں جان بیرون ملک کے [illegible] سے [illegible] موسیٰ خان تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان سے
واپس آتا ہے۔ وہ [illegible] میدان خالی دیکھ کر گل مکئی کو اغوا کر لیتا ہے۔ موسیٰ خان جب
ہندوستان سے واپس آتا ہے تو [illegible] کی حالت کے صدمے سے اپنی بیچارگی
پر کڑھتا ہے [illegible] اور بات [illegible] کے گاؤں پر تن تنہا حملہ کر دیتا ہے
لیکن انجام کار وہ [illegible] کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ گل مکئی جب یہ خبر سنتی ہے تو [illegible]
سے کہتی ہے کہ میں تجھ سے شادی کر لوں گی لیکن مجھے آخری بار موسیٰ خان کی قبر دیکھنے
کی اجازت دو۔ [illegible] اجازت دے دیتا ہے۔ گل مکئی قبر پر جا کر فرطِ غم سے بے ہوش
ہو کر گر پڑتی ہے لیکن جلد ہی یہ بے ہوشی موت کی دائمی سکوت میں تبدیل ہو جاتی ہے

جلالت اور محبوبہ

محبوبہ ایک حسین شہزادی تھی جس کے حصول کی خاطر جلالت کے چھ بھائی
ہمیشہ کے لئے [illegible] چکے تھے جلالت ان کا ساتواں اور آخری بھائی تھا اس نے بھی کمر ہمت
باندھ لی۔ مشکل یہ تھی کہ محبوبہ کو حاصل کرنے کی شرط بڑی کڑی تھی۔ محبوبہ ایک مخصوص تہ خانے
میں جا چھپ جاتی تھی اور امیدوار اسے ڈھونڈتا۔ تہ خانے کی بھول بھلیوں میں وہ
خود کو بھول جاتا تھا۔ اور محبوبہ کو ڈھونڈ نکالنا تو ایک طرف نتیجہ یہ ہوتا کہ بے چارہ خود بھی
جان سے مارا جاتا۔ جلالت مہم سر کرنے سے پہلے پنج پیر گیا جہاں ایک بزرگ کی
دعائیں حاصل کرنے کے بعد وہ محبوبہ کے شہر کی طرف چل پڑا۔ اتفاقاً وہ شہر میں ایک
مالن کے ہاں اترا جو روز محبوبہ کے لئے ہار پرویا کرتی تھی۔ جلالت نے ایک دن اپنے
ہاتھ سے ہار پرو کر مالن کے ہاتھ بھجوا دیا۔ جو محبوبہ کو بہت پسند آیا۔ اور محبوبہ نے اسے
حکم دیا کہ ہار پرونے والی لڑکی کو خود حاضر کیا جائے۔ مالن بڑی سٹپٹائی۔ مگر جلالت
نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ اور اس طرح جلالت لڑکی کے بھیس میں محبوبہ کے پاس
پہنچا۔ پہلی ملاقات میں دونوں کے دل دھڑکنے لگے اور جلالت نے محبوبہ سے کہا
کہ ہم آج رات مل کر دعا مانگیں کہ خدا مجھے لڑکی سے لڑکا بنا دے اور اس طرح
نے تہ خانے کا راز بھی اس پر افشا کر دیا۔ دوسرے دن جلالت [illegible] اعلان
تہ خانے میں محبوبہ کو ڈھونڈنے اتر پڑا۔ محبوبہ نے اسے جگہ بتا دی تھی کہ میں گل
کے جھنڈ میں انتظار کروں گی۔ چنانچہ اس طرح یہ دونوں دھڑکتے ہوئے دل [illegible]

ادبی دنیا

مکاتیبِ غالب کی اشاعت

حمید احمد خاں

۱۸۵۳ء اور پھر ۱۸۶۳ء میں غالب کے مکاتیبِ فارسی شائع [illegible]
۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" کے نام سے اردو خطوط کا وہ پہلا مجموعہ [illegible]
جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔
۱۸۶۹ء میں اردو خطوط کا ایک اور مجموعہ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے شائع [illegible]
۱۸۶۹ء غالب کا سال وفات ہے۔ ان کا یہ مجموعۂ خطوط ان کی وفات کے تقریباً
تین ہفتے بعد شائع ہوا۔ اس مجموعے میں عودِ ہندی کے کئی خطوط شامل ہیں۔
۱۸۹۹ء میں "اردوئے معلیٰ" کا حصہ دوم شائع ہوا۔ یہ رقعات سب کے
سب نئے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے۔
۱۹۳۷ء میں "مکاتیبِ غالب" کے نام سے غیر مطبوعہ رقعات شائع ہوئے [illegible]
ریاست رام پور کے ریکارڈ آفس سے حاصل کئے گئے تھے۔
۱۹۴۱ء میں "خطوطِ غالب" کے نام سے ایک ضخیم مجموعہ الٰہ آباد سے شائع
ہوا۔ اس مجموعے میں بعض غیر مطبوعہ خط پہلی مرتبہ چھپے ہیں لیکن ایک بڑی خوبی
ہے کہ اس میں عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ کے خطوں کی تصحیح اور تاریخی ترتیب
بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔
۱۹۴۹ء میں "نادراتِ غالب" کے نام سے ایک نیا مجموعہ خطوط کراچی سے
شائع ہوا۔ اس مجموعے میں منشی نبی بخش حقیر کے نام کے غیر مطبوعہ خطوط ہیں

مثنوی ہیر رانجھا کا ایک ورق

(بھابیوں سے جھگڑ کر رانجھا کا ترکِ وطن پر آمادہ ہونا)

فضل حسین تبسم

بڑی دیر تک کام کرتا رہا
پڑی تھی جو سر پر وہ بھرتا رہا
کہ اتنے میں کھانا لئے آگئیں
وہاں بھابیاں اس کو دیکھا ہنسیں
وہ نٹ کھٹ شریر اور غرور کی پوٹ
زبانوں پہ ٹھٹھا دلوں میں تھا کھوٹ
یہ بیٹھی زمیں پر پھسکڑا سا مار
وہ بیٹھی بصد ناز ٹانگیں پسار
کہا اک نے "دھیدو ادھر آؤ بھی
تجو کام، کھانا ذری کھاؤ بھی"
گیا جھینپتا بھابیوں کے حضور
پسینے میں ڈوبا بدن چور چور
زراہِ تاسف کہا اک نے "چاند
ہوئی جوت کیوں تیرے جوبن کی ماند"
کہا دوسری نے "میں واری گئی
کہاں چین کی وہ سواری گئی
یہ گرمی یہ تپتی زمیں، الاماں
جلے آگ میں اک سجیلا جواں"
کہا تیسری نے مرا جی جلا
"لگے آگ ہل کو یہ ہے بد بلا"
تو بولی وہ آنکھیں بچا کر "بُوا
نہ غم کھاؤ یہ تو ہے اچھا ہوا
کہ یہ چھیل گبرو لگا کام سے
چھٹے آئے دن کے ہم الزام سے
ڈبونے پہ نام اپنے ماں باپ کا
کمر بستہ رہتا تھا چاند آپ کا
پڑا شور تھا گھاٹ بازار میں
سدا یہ چرچے لگتے تھے سرکار میں
ہوا آپ سے نام خدا یہ جواں
نہیں سر اٹھا سکتا یہ خاندان"
تڑپ کر یہ بولا کہ "روکو زباں
چلاؤ نہ طعنوں سے تیر و سناں
نہیں آپ کا کارنامہ یہ کم
جدا کر دیا بھائیوں کو بہم
کبھی میر اگر تا پسینہ جہاں
بہاتے تھے خوں اپنا بھائی وہاں
مرا بھائیوں کے دلوں میں تھا گھر
تمہیں پر نہ بھاتا تھا یہ اک نظر
نہ اپنی سعی کرنے میں کی کچھ کمی
لگائی بجھائی شب و روز کی
چھڑکتے تھے جاں مجھ پہ بھائی جو کل
گئے طوطے کی طرح آنکھیں بدل
یہ کب کا مگر تم نے بدلہ لیا
مرے خون کا ان کو پیاسا کیا
بڑی آئی ہیں یہ مری خیر خواہ
تم اور میری ہمدرد لے واہ واہ
نہ چلتی ہوا سے لڑو بھابیو نہ چھیڑو ہمیں راہ لو بھابیو"

مطبوعات

(نوٹ۔ تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

سلسلہ اسباق تعلیم القرآن قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنا اور اس کے معنی و مطالب سے آگاہ ہونا ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ [illegible] یں نے محکمہ تعلیم اس مضمون کو لازمی کر رہا ہے تاکہ پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کے طلباء قرآن مجید [illegible] سمجھ سے واقف ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں مولوی عبد اللطیف صاحب شاہد منشی فاضل، ادیب فاضل کی کوشش نہایت قابل قدر ہے جنہوں نے بڑی [illegible] کاوش اور محنت سے قرآن کریم باترجمہ سکھانے کے لئے اسباق کا ایک سلسلہ مرتب کیا ہے جس کے ایک سو زیادہ اسباق شائع ہو چکے ہیں اور [illegible] ہو رہے ہیں۔ اسباق کی ترتیب فاضل مرتب نے اتنی آسان اور سہل رکھی ہے کہ ہر معمولی اردو پڑھا لکھا شخص نہایت آسانی سے ان کو سمجھ سکتا اور یاد کر سکتا [illegible] اور باقاعدہ محنت کرے تو بہت قلیل عرصہ میں قرآن مجید کے معانی اور مطالب سے باخبر ہو سکتا ہے۔ ایک آیت لے کر پہلے اس کے ہر لفظ کے الگ الگ [illegible] معنے ہیں۔ پھر پوری آیت عربی میں لکھ کر اس کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ جو لفظ مکرر آتے ہیں انہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس طرح آخر تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے جو لوگ [illegible] اسلامی مدرسے قرآن کریم کا ترجمہ سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ سلسلہ اسباق نہایت مفید ہے۔ روزانہ تھوڑا وقت لگا کر بھی ہر شخص ان اسباق پر حاوی ہو [illegible] ہے ہمارے خیال میں کوئی مسلم گھرانا اس کتاب سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ اشد ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی بچہ بھی قرآن کریم کے ترجمہ سے ناواقف نہ رہے۔ شاہد صاحب [illegible] مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے وقت کی اس اہم ضرورت کو سمجھا اور اسے بہترین شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔

اس سلسلہ اسباق کے ساتھ ہی شاہد صاحب نے ایک اور نہایت مفید کام بھی کیا ہے اور وہ ایک کتاب العربیہ کی تدوین ہے۔ قرآن کریم میں جتنے الفاظ آئے ہیں یا [illegible] میں عربی الفاظ بولے، لکھے یا پڑھے جاتے ہیں۔ اس لغت میں وہ سب جمع کر دیئے گئے ہیں اور ان کے معنی اردو میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ لغت نویسی کے فن میں یہ کوشش نہایت مستحسن ہے۔ امید ہے طلباء اور عربی خواں اصحاب اس کتاب کو نہایت مفید پائیں گے۔ یہ لغت عربی کے ۱۳ ہزار الفاظ کے معانی پر مشتمل ہے اور اس کے شائع ہونے سے عربی زبان کی ڈکشنریوں میں ایک نہایت مفید اضافہ ہوا ہے۔ اسباق القرآن اور لغت العربیہ کی مجموعی قیمت چھ روپے ہے اور حجم بڑے سائز کے تیرہ سو صفحات۔ پتہ حکیم عبد اللطیف شاہد مہتمم ادارہ تعلیم القرآن۔ گوال منڈی بین بازار ۱۳ لاہور (محمد اسمٰعیل پانی پتی)

پیام نو مولفہ جناب وفا راشدی۔ حجم ۱۱۲ صفحات۔ قیمت مجلد ۲ روپے۔ مکتبہ اشاعت اردو کلکتہ یا ڈھاکہ سے طلب فرمائیے۔

اس مجموعے میں بر اعظم پاکستان و ہند کے چھتیس بلند پایہ شعراء کے حالات درج ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر اُن کی ایک ایک نظم بھی دی گئی ہے۔ [illegible] حالات شعراء نے مختصراً خود لکھے ہیں جن میں سے بعض سرسری ہیں اور بعض کچھ مفصل جو زیادہ دلچسپ ہیں۔ نظموں کے انتخاب میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ [illegible] ان کا تعلق اپنے زمانے کی تحریکات سے ہو۔ یہ مجموعہ اردو ادب اور شاعری کے شائقین کے لئے بہت بیش قیمت ہے اس کے لئے انہیں وفا راشدی صاحب کے صحیح ذوق اور کاوش و محنت کا ممنون ہونا چاہئے۔ مکتبہ اشاعت اردو جو اس کا ناشر ہے مشرقی پاکستان ہی میں نہیں، ہندوستان میں بھی اردو کے لئے کام کر رہا ہے۔ اس لئے یہ مکتبہ بلا امتیاز مذہب و ملت تمام اہل اردو کی سرپرستی کا مستحق ہے۔

[illegible] نے [illegible] الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر مخزن "شاہدین بلڈنگ" مال روڈ لاہور سے شائع کیا۔

جلد ۳ نمبر ۳

مخزن لاہور

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

مارچ سنہ ۱۹۵۰ء

مدیر

ادارۂ مطبوعات نوائے وقت لمیٹڈ • اس پرچے کی قیمت ۸ آنے ہے

مخزن کی عظمت رفتہ

ہو سکے وہ شعر جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتے سنسنی پیدا کرنے کی اسی خواہش کا ایک خاص اظہار ہیں ؎

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

نوجوان غالب کو اس قسم کے مولے موٹے الفاظ استعمال کرنے کا شوق کیوں تھا اس کی کوئی سیدھی اور آسان سی تشریح کر دینا نامناسب ہے لیکن یقینی ہے کہ اس اندازِ بیان کو ایک حد تک نوجوانی کی ہیجان پسندی سے ضرور تعلق تھا۔

ہیجان پسندی اندازِ بیان میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے اور شعر کے مضمون میں بھی۔ داغ کا اندازِ بیان عام طور پر سلجھا ہوا اور صاف ستھرا ہوتا ہے لیکن ذرا اس شعر کے مضمون پر غور کیجئے ؎

انکارِ مے کشی نے مجھے کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اس نے خم مے پلا دیا

کسی کے سینے پر ناکہاں شراب کا مٹکا لے کر چڑھ جانا اس دنیا کی دنیا میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ داغ کا ایک شعر ہے جس کی عام طور پر بہت داد دی جاتی ہے اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ سنسنی پیدا کرنے کی خواہش اس شعر کے مضمون میں ناواجب حد تک جھلک رہی ہے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یہ شعر تصویر نہیں کارٹون ہے اور کارٹون بھی ایسا جس میں واقعات کو مسخ کرنے میں بے اعتدالی سے کام لیا گیا ہے۔ ایک حسین عورت شمع کے پاس بیٹھ جاتی ہے چہرے سے نقاب کو دور کر دیتی ہے۔ پروانہ حیران و ششدر ہوا میں معلق ہے سوچتا ہے کدھر کا رخ کروں شعلۂ رخ کا یا شعلۂ شمع کا؟ اب آپ دنیائے حقیقت کی دنیا میں کوئی اس قدر ہنگامہ خیز چہرہ موجود ہے؟ یقیناً آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حسن کی مبالغہ آمیز تعریف کو شاعر نے ہیجان انگیزی کا لباس پہنا دیا۔

شاعری میں ہیجان انگیزی کا مسئلہ اتنا نازک ہے کہ اس میں اختلافِ رائے کی وسیع گنجائش ہے جس مضمون یا طرزِ بیان کو عہدِ لکھنؤ کے انگریز ڈرامانگار یا عہدِ فارسی غزل گو ذوقِ سلیم کے بالکل مطابق پاتے تھے اسی میں آج ہم کو ہیجان انگیزی کی انتہا نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کی رائے درست تھی یا ہماری؟ اگر ہم ان کی رائے میں عیب نکالتے ہیں تو کس بنا پر؟ اس سوال کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے لیکن سب سے واضح بات یہ ہے کہ ان گزشتہ نسلوں کا مزاج ایسا تھا کہ خونریز ہنگاموں کو برداشت کر لینے کی قدرت ان میں اعتدال سے زیادہ موجود تھی۔ عام حالات میں ان کو بھی اپنے ادیبوں کی ہیجان انگیزی لغویت کی حد کو پہنچی ہوئی نظر آتی۔ اس سے قطعِ نظر جو ادبی روایات آج ہمارے پیچھے موجود ہیں وہ ان کے پیچھے موجود نہ تھیں اور ذوقِ سلیم وہ ملکہ ہے جو بہت سی محنت، ذہنی تربیت اور ریاض اور خداداد صلاحیت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ شعر فہمی کے متعلق دنیا کی عام روش (اور بالکل غلط روش) یہ ہے کہ جو شخص شعر پڑھ سکتا ہے اسے دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ شعر سمجھ بھی سکتا ہوں۔ حالانکہ شعر فہمی کی صلاحیت اتنی ہی نایاب ہے جتنا موسیقی کا صحیح ذوق۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مشاعرے میں بیٹھنے والے شاعر ادبی مذاق سے بری ہو گئے۔ جو بڑی سے بڑی شاعرانہ سنسنی کو اسی چٹخارے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں جس سے مثلاً میر کی کسی شستہ اور شیریں غزل کو۔ آپ کو وہ قصہ تو یاد ہوگا کہ حضرات میں سے کسی صاحب کو میر امانی اسد کے ایک شعر پر غالب کے شعر کا گمان گزرا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ میر امانی کا تخلص اسد تھا اور خود غالب کا دورِ اوّل کا تخلص

سید عابد علی عابد

غزل

نشتر کی نوک دل میں اتارے چلے گئے — ہم یوں عروسِ غم کو سنگارے چلے گئے

آیا ترا خیال مٹے نقشِ ماسوا — اُبھرے افق سے چاند ستارے چلے گئے

چلنا رہِ حیات پہ دشوار تھا مگر — تیرے متاعِ غم کے سہارے چلے گئے

دل کو تمہیں نے ہاتھ میں لے کر مسل دیا — ہم سادہ دل تمہیں کو پکارے چلے گئے

قائم رہیں یہ عہدِ کرم بھی حدودِ ناز — دریا کے ساتھ ساتھ کنارے چلے گئے

محفل کو ناگوار تھی عرضِ شکستِ دل — محفل سے اُٹھ کے درد کے مارے چلے گئے

ہاں اے زمینِ گورِ غریباں جواب دے — کیوں مجھ سے روٹھ کر مرے پیارے چلے گئے

آیا نہ ہات گوشۂ دامانِ التفات — لیکن فقیر ہاتھ پسارے چلے گئے

عابد زمانہ ہم کو مٹاتا چلا گیا
ہم نقشِ زندگی کو اُبھارے چلے گئے

★

سرشار عقیلی
منظوم ترجمہ: ظفر اقبال خشتر

وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

سرشار سندھ کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔ سندھی کے علاوہ آپ اردو اور فارسی میں بھی کافی مہارت رکھتے ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں۔ جب آپ اردو میں شعر کہتے ہیں تو اس پر اہلِ زبان کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ ادارہ

وہ شاعرِ دل نوازِ ہستی
وہ پیکرِ سوز و سازِ ہستی
وہ پردہ کشائے رازِ ہستی
وہ نازِ وجود و نازِ ہستی
جو فکر و نظر پہ حکمراں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ فاتحِ ممکناتِ فطرت
وہ حاصلِ کائناتِ فطرت
وہ آلِ وجود و ذاتِ قدرت
وہ پردہ درِ حیاتِ فطرت
جو محرمِ رازِ دو جہاں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کا پیامِ زندگانی
وہ جس کا مقامِ جاودانی
مغلوب ہے جس سے کامرانی
مسحور ہے جس سے نوجوانی
جو عالمِ پیری میں جواں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کا قدم ہے فاتحانہ
وہ جس کا علم ہے خسروانہ
ہے جس کا وجود جاودانہ
آفاق کا شاعرِ یگانہ
جو آپ ہی اپنا ترجماں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کی نظر پیمبرانہ
وہ جس کی گزر قلندرانہ
وہ جس کا مزاج شاعرانہ
وہ جس کا مذاق والہانہ
جو روحِ حیاتِ جاوداں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ شاعرِ عہدِ نو کہ پیہم
صورت گرِ انقلابِ عالم
فطرت کا وہ نغمۂ مجسم
وہ محرمِ زندگی کہ ہر دم
تابندہ و زندہ و جواں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

دو غزلیں

آتش لودھیانوی

[illegible] رفعتِ اثر تلاش کریں
حدودِ شوق و انعامِ نظر تلاش کریں

اے ندیم جہانِ دگر تلاش کریں
نئی فضائیں نئے بحر و بر تلاش کریں

[illegible] منزلِ مقصد تو جستجو نہ رُکے
اگر تلاش کریں عمر بھر تلاش کریں

[illegible] بھی عار ہے ہمیں تقلید
جدھر کوئی بھی نہ ہو ہم اُدھر تلاش کریں

مقابلہ عشق و حسن کا عجب ہے
ہم ان کی اور وہ ہماری نظر تلاش کریں

[illegible] کے تصور کی روشنی ہو مدام
وہ شب تلاش کریں وہ سحر تلاش کریں

[illegible] میں ڈھونڈیں چراغ امید دل کے
خزاں کی آڑ میں گلہائے تر تلاش کریں

[illegible] بلندی کعبہ نظر میں پھر جائے
صنم کدے کے وہی بام و در تلاش کریں

[illegible] بھر کا تبسم وہ اک کرم کی جھلک
چلو وہی نگہِ مختصر تلاش کریں

وہ دیر و کعبہ کی حد سے نکل چکے آتش
کہاں تلاش کریں ہم اگر تلاش کریں

ہادی مصطفےٰ آبادی

کوئی تو حد بھی ہوتی ہے دعا بیکار جانے کی
ترے عہدے نے کوشش کی مجھے کافر بنانے کی

یہ رقصِ ماہ و انجم چھیڑ کلیوں کو ہنسانے کی
ضرورت کیا پڑی تھی آپ کو محفل سجانے کی؟

پڑی ہمت نہ دستِ شوق کو آنچل تک بڑھانے کی
کچھ اس انداز سے چاہی اجازت اس نے جانے کی

یہ نکھری چاندنی راتیں یہ نکھری رونقِ گلشن
قسم کھائی ہے ہر جلوے نے ان کو ڈھونڈ لانے کی

سکونِ آشیاں [illegible] دل تو بھر جائے
کرم اے برق آ دنیا اُڑا دے آشیانے کی

وہاں چھپ چھپ کے بہتے آنسوؤں میں کیا اثر ہوگا
جہاں عادت سی ہو چھپ چھپ کے آنسو بہانے کی

کہیں چھپتے بھی ہیں جب آنکھ میں آنسو بھر آئے ہوں
بھرم کھل جائے گا کوشش نہ کیجے مسکرانے کی

وہ ہادی مجھ سے شرما کر کسی کا مسکرا دینا
سمٹ کر آ گئیں رنگینیاں سارے زمانے کی

عبدالحمید عدم

غزل

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

زندگی کے حسین ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

پھول دامن میں چند رکھ لیجے
راستے میں فقیر ہوتے ہیں

تیری محفل میں بیٹھنے والے
کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

اے عدم احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

محمد خلیل الرحمٰن

اظہار

تم اب سراپا شباب ہو، حسن و فسوں ہو!
تمہارے نازک بدن کا بانکپن ہے باک طالب نگاہ کو دامِ آرزو ہے!
تمہاری آواز ایک ایسی لطیف لے ہے
کہ جس کے سنتے ہی دل لرز اٹھا ہے، تمنا سے کانپتا ہے!
تمہاری رفتار میں بہاروں کی مستیاں ہیں
تمہاری آنکھوں میں عکس ہے زندگی کی اُس رمزِ آتشیں کا
کہ جس کے اشاروں پہ ڈھل کے بنتی ہے عشق کی بیکراں کہانی!
جو ایک احساسِ نور بن کر
تمہاری ہر اک ادائے رنگیں میں ایک جادو جگا رہی ہے!
تمہاری شرمیلی خواہشوں کے حجاب میں جھلملا رہی ہے!

تمہارے پرتو سے میری ہستی کا لمحہ لمحہ
عجیب اندازِ دلکشی سے چمک اٹھا ہے!
مرے جہاں کے ہر ایک ذرے میں زندگی کا طلسمِ نو جگمگا اٹھا ہے!

اس کی وجہ یہ تھی کہ سر سید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی۔ اور مولانا مرحوم بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔

سر سید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیئے تھے۔

بہر حال اس کتاب میں جہاں جہاں انشا پردازی دکھائی ہے اس کا یہ نمونہ ہے۔

"ان حضرت کی طبع رسا مشکل الید سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب فہم و ذکا۔ اور ناخن فکر عقدہ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ جزب کو انگشت موج دریا کی بھی اس مرتبہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کو کہ معلوم ہو لیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا اور ان کی نالے روشن جوہر نا موش خط موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزی کو دو نیم"۔

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا اور سر سید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام سید الاخبار تھا۔ اور دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کی اقتضا سے سادہ اور صاف ہوتی تھی تاہم اس وقت تک یہ علمی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سر سید نے بھی اسی وجہ سے آثار الصنادید میں انشا پردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا۔

آثار الصنادید جس زمانہ میں نکلی اس کے چند برس کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات یہ اردو میں لکھنے شروع کئے۔ مرزا چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے اس لئے انہوں نے تمام ہمعصروں کے برخلاف مکاتبات و مراسلات میں بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم مسرت و خوشی حیرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بلحاظ اس کے یہ کہنا بیجا نہیں کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سر سید مرحوم تھے اس کا سنگ بنیاد در اصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سر سید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سر سید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

اسی زمانہ میں ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہو گئے اور اردو انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو چونکہ اخلاقی۔ تمدنی۔ ملکی۔ مذہبی۔ تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا اس لئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص سٹائل متعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔

۱۸۷۰ء میں جس کو آج کم و بیش ۳۷ برس ہوئے۔ سر سید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اردو انشا پردازی کو اس حد تک پہنچا دیا جس سے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔ سر سید نے اردو میں جو باتیں پیدا کیں اس کو وہ مختصراً تہذیب الاخلاق میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں ان کی خاص عبارت یہ ہے: "جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور

دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے دل میں بیٹھے:

اس آرٹیکل میں سرسید نے انشاپردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں جن کو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سرسید کی انشاپردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے۔ اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا کہ اس سے بڑھکر ناممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعراء اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکے۔ فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے سعدی رزم کے مرد میدان نہیں۔ نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے سرسید نے اخلاق معاشرت۔ پالٹکس۔ مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے مثال کے طور پر ہم بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ امید کی خوشی پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں امید کو مخاطب کیا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:

”دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے شوہر کے غم میں لگی ہوتی ہے۔ اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل غم میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ۔ اے میرے دل کی کونپل تو بڑھ اور پھل پھول۔ تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ ہو۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ پر نہ آئے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے جگر کے ٹکڑے میرے بچے سو رہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری جوانی تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت تیری لیاقت۔ تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا ہمارے دل کو تسلی دیں گی۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔ سو رہ میرے بالے سو رہ“

”یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچہ غوں غوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اماں اماں کہنا سیکھا اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اسی ماں کی آتش محبت کے بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو واسطہ پڑا۔ رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق عمدہ دل سے سنانے لگا اور جبکہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل۔ بے گناہ زبان سے۔ بڑے پیار خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ تمہاری پیاری ذات ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے“

”وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے۔ لڑائی کے میدان میں جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے۔ اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور بادل کی سی کڑکنے والی آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے۔ تو اے بہادروں کی قوت بازو! اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے نیکنامی کا خیال اس کے دل کو تقویت دیتا ہے۔ اس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے“

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے۔ اور اس میں کس قدر درد۔ اور اثر پیدا کیا ہے۔

پالٹیکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔

پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی جس میں اورینٹل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا۔ سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالیٹکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اس وقت سرسید نے پے در پے تین آرٹیکل لکھے۔ ان آرٹیکلوں نے یونیورسٹی کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص ان آرٹیکلوں کے جواب میں سیکڑوں مضمون لکھے گئے اور ان کا مجموعہ چھپا کر کے ایک مستقل کتاب تیار کی۔ افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم ان آرٹیکلوں کا کوئی حصہ نقل نہیں کر سکتے۔

سرسید نے انشاپردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کئے ان میں ایک یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا لیکن ترجمہ کر کے نہیں کیونکہ یہ طریقہ بیکار ثابت ہوا ہے بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اردو میں، اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کئے۔ امید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کئے وہ اصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گزرے ہیں۔ سرسید نے ان کے مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا۔

سرسید کی انشاپردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں آئی اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تعبیرات بہت کم ہیں۔ اس لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے لیکن سرسید نے کمال سے مشکل مسائل کو اس فصاحت، صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گزرا ہے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے۔ زبان میں مسائل ادا کرنے کے لئے عربی زبان کو ناقابل سمجھتا ہے تو یہ اس کا خیال محض غلط ہے۔ سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیئے ہیں۔ سرسید نے فلسفۂ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں۔

زمانہ حال کے علماء کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقاید و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا۔ تاہم اس سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔

سرسید کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور مذاق بھی ہوتی ہے لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ۔ مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم جو سرسید کے مخالفوں میں رسالے لکھا کرتے تھے حرمین شریفین گئے اور وہاں سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ اس پر سرسید ایک موقع پر تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں۔

مولوی صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا۔ ان کے لائے ہوئے فتووں کے دیکھنے کو ہم بھی مشتاق ہیں۔

بہ بیں کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

سبحان اللہ کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا ہے تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:۔

سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پیدا ہو گیا۔ اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، ادھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے بینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوتی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آ گئی

اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیئے۔ بچّے اٹھاتے وقت کہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ اٹھے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت لبور کرماں سے کہتا ہے کہ بی دیمت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے۔ تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں۔ حالی تو اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو انشاپردازی پر جو اثر ڈالا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا کا ہے۔ وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا[1]۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جبکہ تمام ملک سرسید کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہے۔ اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا مشتاق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھا جانا چاہیئے۔ میں نے اسی کی تعمیل کی۔ ورنہ میں مولانا کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا۔

بھلا تردد بیجا سے اُس میں کیا حاصل　　　اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

(شبلی)

---

[1] سرسید کی مبسوط اور بے نظیر سوانح عمری "حیاتِ جاوید" مولانا حالی نے سرسید کی زندگی ہی میں لکھنی شروع کر دی تھی جس میں سرسید کے تمام کارناموں پر تفصیلی تنقید کی گئی ہے۔ سرسید کو اس بات کی خواہش رہی کہ دیکھوں میرے متعلق مولانا نے کیا لکھا ہے؟ مگر حالی نے کبھی کتاب کا مسودہ سرسید کو نہیں دکھایا اور ان کے انتقال کے ۲ برس بعد ۱۹۰۱ء میں اسے شائع کیا۔ یہاں مولانا شبلی کا اشارہ اسی کتاب کی طرف ہے۔　　(محمد اسماعیل پانی پتی)

★

"حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک"

یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ جب "حیاتِ جاوید" شائع ہوئی اور حالی نے شبلی کو (جو اُن دنوں حیدرآباد میں تھے) مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو کے ہاتھ ہدیۃً بھیجی، تو شبلی نے طنزیہ تبسم کے ساتھ کہا:۔

"اس میں مدلل مداحی کے سوا اور ہے کیا؟"

۲ - بنام مسٹر جان میولسن آرنلڈ

جان میولسن آرنلڈ نے اپنی کتاب "قرآن اینڈ بائبل" مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں سر سید کی مندرجہ ذیل چٹھی چھاپی ہے۔ یہ انہوں نے اپنی تفسیر بائبل کی پہلی جلد کے متعلق مصنف موصوف کی چٹھی کے جواب میں ان کے پاس بھیجی تھی۔ اس چٹھی سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا اور اس کی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں کے خیالات جو اس وقت تھے اور خود سید کا اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا بخوبی واضح ہوتا ہے۔ (اسماعیل)

بیشک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی ہے۔ کچھ بھی وجوہ ہوں جنکی وجہ سے ہمارے آباو اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ بوجہ زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے تھے اور اس کے ساتھ اس خیال کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے ذریعے سے بہت قوت اور مدد ملی ہے۔ ان دلائل سے بجز اس کے کہ باہم ہندو جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہوا اور دونوں کے دل برے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

جبکہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد بائبل مقدس کی تفسیر لکھنا، اس کی تائید کرنا اور اس کو الہامی کتاب ماننا ہو تو اس کی الفت اور منزلت اس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہو گی؟ بلا شبہ اس سے سب لوگ متنفر ہونگے اور اس کو برا کہیں گے۔ یہی حالت میری ہوئی۔ اس کے شروع میں میرے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوا مگر میں نے ان کی بیجا تضحیک، بے بنیاد دھمکیوں اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اس بات کے کہنے میں جس کو حق سمجھتا تھا کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا جو انعام کہ مجھ کو میری تحریر سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا پہلا حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا۔ بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس پر اعتماد رکھنے اور اس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے اور بہت سے توہمات اور خیالات غلط جو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہو گئے جیسا کہ آپ ذیل کے فقرات سے معلوم ہو گا جن کو میں ایک بڑے مولوی کے خط سے جو میرے پاس آیا نقل کرتا ہوں۔

میں نے آپ کی تفسیر کو پڑھا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلا شک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانہ میں آپ ایسے شخص ہیں جو راہ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تصنیف سر سے تفسیر کو پڑھی جاتی ہے۔ اور اس کے قابل تعریف فقروں کے پڑھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے۔

بائبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اس سے بہت بد اعتقاد ہو گئے ہیں مثلاً ابراہیم علیہ السلام کی طرف صریح جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی۔ لیکن میں برخلاف ان کے کہتا ہوں کہ خود بائبل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں۔ اس بنا پر مجھ کو امید ہے کہ تفسیر کا دوسرا حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کا تعصب بائبل کے ساتھ بہت کم ہو جائیگا۔

بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری تفسیر سے عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملے گی علاوہ اس کے عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لئے کہ میں انجیل میں کہیں اس مسئلہ کی تائید اور وجود نہیں پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں اس لئے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو ایک دن سب کو جانا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہتی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش ان چند رسالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اس باب میں لکھے ہیں اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہوگا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائیگا آپ کی خدمت میں ارسال ہوگا۔

انگریزی میں بھی بائبل کا اتنا ہی طرفدار اور موید ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنزو کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصوں میں جب ان کا موقع آئے

مراجعہ دوالمنۃ

سید احمد خاں

مارچ ۱۸۶۵ء

پروفیسر محمد شمس الدین صدیقی
ایم اے (عثمانیہ)

ہمہ خاندان آفتاب

(ایک ایکٹ کا FARCE یعنی مضحک نقل)

افراد :-

حلیم :- ناول نویس باپ ، عمر ۵۲ سال
سعادت :- افسانہ نویس بیٹا ، عمر ۲۷ سال
اختر :- اخبار نویس بیٹا ، عمر ۲۵ سال
عباس :- ڈراما نویس بیٹا ، عمر ۲۵ سال
صفیہ :- شاعر بیٹی ، عمر ۲۴ سال

مقام :- متوسط درجے کا ایک مکان زمانہ :- بیسویں صدی

★

(حلیم ایک آرام کرسی پر دراز سگار پی رہا ہے ، سعادت دوسری آرام کرسی پر، عباس تیسری پر، ہر ایک کے سامنے ایک تپائی رکھی ہے جس پر بہت سے سادہ کاغذات پڑے ہوئے ہیں)

عباس :- (ڈرامائی انداز میں) اباجان کیا میں آپ سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آیا آپ نے وہ مقدمہ پڑھ لیا ہے جو میں نے آپ کے تازہ ناول پر لکھا ہے ؟

حلیم :- عباس تم نے اس میں بہت بخل سے کام لیا ہے ، مجھے زیادہ پسند نہیں آیا ۔

عباس :- لیکن میں نے تو ناول کی ہر بات کی تعریف کی ہے ، کردار نگاری ، مکالمے ، منظر نویسی ، پلاٹ غرض ہر چیز کو سراہا ہے ، پھر بھی آپ کو یہ مقدمہ پسند نہیں آیا ؟

حلیم :- خیر اس حد تک تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں چاہئے تھا کہ اس ناول کا دنیا کے مشہور و معروف ناولوں سے مقابلہ کر کے اس کی خوبیاں گنواتے ۔

عباس :- اباجان آپ جانتے ہیں کہ ناول میرا میدان نہیں میں تو ڈرامے کی دنیا کا بادشاہ ہوں ، میں نے اپنی ساری زندگی میں آپ کے لکھے ہوئے ناولوں کے سوا اور کوئی ناول نہیں پڑھا ، ہاں ڈرامے بہت پڑھے ہیں ۔ اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ناول کا مقابلہ دوسرے ناولوں سے کیا جائے تو یہ آپ خود ہی لکھ کر اس میں اضافہ کر لیجئے ۔

حلیم :- یہ تو آخری صورت ہو گی ، سعادت کیا تم یہ کام نہیں کر سکتے ؟

سعادت :- نہیں اباجان ، میں تو صرف افسانے کے میدان کا مرد ہوں ، سوائے افسانوں کے میں نے اب تک کچھ نہیں پڑھا ، میں بھی آپ کے ناول کی تعریف کا صحیح حق ادا نہیں کر سکوں گا ، یہ آپ ہی کر لیں تو مناسب ہے ۔

عباس :۔ اباجان میرا ایک اور ناچیز مشورہ یہ ہے کہ ناول کا نام بدل دیا جائے۔

سعادت :۔ میں بھی اس تجویز کی پُر زور تائید کرتا ہوں، موجودہ عنوان میں بہت قدامت کی بو آتی ہے، کوئی نیا نام ہونا چاہئے۔

حلیم :۔ تو بتاؤ کیا نام رکھا جائے؟

عباس :۔ میری رائے میں "اندھیرا سورج" بہت ترقی پسندانہ نام ہے، یہ رکھ لیجئے۔

سعادت :۔ بہت اچھا نام ہے، اباجان یہی رکھ لیجئے۔

حلیم :۔ میں تم دونوں کی ترمیم کو منظور کرتا ہوں۔ اور اس مشورہ پر شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن مقدمے میں افسانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟

عباس :۔ شاید صفیہ لکھ سکے، اس سے بھی دریافت کیجئے۔

حلیم :۔ (بلند آواز سے پکارتا ہے) صفیہ! صفیہ!!

صفیہ :۔ (مکان کے اندر سے) آئی اباجان! (کمرے میں آکر) فرمایئے، کیا ارشاد ہے؟

سعادت :۔ دیکھو صفیہ، اباجان نے کل جو ناول مکمل کیا ہے نا وہ تم نے پڑھ تو لیا ہوگا اب تک۔

صفیہ :۔ ہاں پڑھ لیا ہے، بہت اچھا ناول ہے۔

عباس :۔ تو اب اس کا نام بدل کر "اندھیرا سورج" کر دیا گیا ہے، کیا تمہیں پسند ہے؟

صفیہ :۔ اچھا تو ہے لیکن زیادہ شاعرانہ نہیں، اسی کو "خورشید سیاہ" یا "مہر تاریک" کہہ دیں تو مطلب بھی وہی رہے گا اور نام میں شعریت بھی آجائے گی۔

حلیم :۔ بہت مناسب تجویز ہے، بیٹی میں تمہارے مشورہ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے منظور کرتا ہوں، لیکن خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اصل معاملہ تو زیر بحث یہ ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔

عباس :۔ میں نے اس پر جو مقدمہ لکھا ہے اباجان اس میں کچھ کمی محسوس کر رہے ہیں، کیا تم یہ کمی دور کر سکتی ہو؟

سعادت :۔ اباجان کا خیال ہے کہ اس ناول کا دنیا کے مشہور و معروف ناولوں سے مقابلہ کر کے اس کی خوبیاں بتانا چاہئے۔

عباس :۔ میں نے چونکہ دوسرے ناول پڑھے نہیں ہیں اس لئے میں نہیں لکھ سکتا۔

سعادت :۔ میں بھی انھیں الفاظ کو دہرانا کافی سمجھتا ہوں۔

صفیہ :۔ تو پھر آپ مجھ سے یہ توقع کیونکر رکھتے ہیں؟ مجھے تو صرف شعر و شاعری سے دلچسپی ہے اور سوائے شعر کہنے کے میں اور کچھ نہیں کر سکتی، کہئے تو ایک منظوم تقریظ لکھ دوں۔

حلیم :۔ اچھا یہی سہی۔ آج ایک منظوم تقریظ لکھ دو۔

صفیہ :۔ ضرور، ضرور۔ اب میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔

حلیم :۔ خیر خیر اس کسر نفسی کی ضرورت نہیں، ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم کتنی بڑی شاعرہ ہو۔

صفیہ :۔ یہ محض آپ لوگوں کا حسن ظن ہے، ذرہ نوازی ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

عباس :۔ صفیہ، میں نے بھی اپنے ڈراموں کا مجموعہ مرتب کر لیا ہے، اگر اس کے لئے بھی ایک تقریظ لکھ دو تو ٹھیک ہے۔

صفیہ :۔ بہت خوب، میں بڑی خوشی سے یہ کام کر دوں گی۔

عباس :۔ اس کا مقدمہ سعادت بھائی لکھ رہے ہیں، کیوں سعادت بھائی! میں آپ کا شکریہ پیشگی ادا کرتا ہوں۔

سعادت :۔ ہاں اطمینان رکھو۔ آج ہی لکھ دوں گا۔ میں شکریہ قبول کرتا ہوں۔

عباس :۔ آپ اپنے افسانوں کے مجموعہ کے لئے اختر بھائی سے مقدمہ لکھوا لیجئے۔ یہ ناٹھیک؟ یا پھر اباجان سے لکھوا لیجئے۔

صفیہ :۔ اور تقریظ میں لکھ دوں گی۔

سعادت :۔ شکریہ، شکریہ، صفیہ تم پر مجھے رشک آتا ہے کہ تم شاعرہ ہو۔

سعادت:- تو اس کا حقیقت پسندانہ جواب یہ ہے کہ جو ہمیں سب سے زیادہ معاوضہ دے۔

عباس:- یعنی دینے کا وعدہ کرے،

سعادت:- ہاں یعنی دینے کا وعدہ کرے بلکہ باقاعدہ معاہدہ کرے،

حلیم:- اس سے کیا ہوتا ہے، وہ وعدے کے مطابق دینے سے رہا اور ہم لینے سے رہے، عدالتی جھگڑے ہمارے بس کا روگ تو ہیں نہیں پھر؟

عباس:- پھر یہ کہ چونکہ ہر ناشر دوسرے کسی ناشر کے جتنا ہی خراب ہے اس لئے کسی بھی ناشر کو دیں ایک ہی بات ہے۔

صفیہ:- یعنی ع پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم!

سعادت:- تو اس صورت میں اپنے اپنے قدیم کرمفرماؤں ہی کو پھر ایک بار کرم فرمانے کا موقع دینا پڑے گا۔

عباس:- بظاہر تو ہم کافی غور و خوض اور باہمی مشورے کے بعد اسی نتیجے پر پہونچے ہیں۔

حلیم:- بس یہی ٹھیک ہے، کوئی ناشر دوسرے سے مختلف نہیں ہے، اس لئے ہر ایک اپنے اپنے قدیم ناشر ہی سے اپنی کتاب چھپوائے۔

صفیہ:- اور میری کتاب؟ مجھے تو ناشروں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

حلیم:- خیر خیر میں اپنے پبلشر کے ہاں چھپوا دونگا لیکن اس کا مقدمہ بھی کسی سے لکھوایا ہے؟

صفیہ:- اب اور کس سے لکھواؤں ابا جان، آپ ہی لکھ دیجئے۔

حلیم:- اچھی بات ہے، لکھ دونگا لیکن ایک شرط ہے۔

صفیہ:- وہ کیا؟

حلیم:- انتساب بھی میرے ہی نام ہو۔

عباس:- پھر تو آپ کے ناول کا انتساب میرے نام ہونا چاہئے اور سعادت بھائی کے مجموعہ کا اختر بھائی کے نام۔

سعادت:- اور تمہارے مجموعہ کا میرے نام۔

حلیم:- منظور بے چون و چرا منظور!

صفیہ:- منظور!

عباس:- منظور!

سعادت:- تو پھر مجھے بھی منظور!

حلیم:- چلو، سب فیصلے ہو گئے، اب صرف چھپوا دینا ہے اور بس۔

سعادت:- یعنی ایک نعل مل گیا ہے۔ اور اب صرف تین نعلوں اور ایک گھوڑے کی کسر ہے۔

عباس:- خیر یہ بھی غنیمت ہے، اگر یہ ایک نعل بھی نہ ملتا تو ہم کیا کر لیتے؟

حلیم:- خیر اس بحث کو چھوڑو، اب سوال یہ ہے کہ ناول کب چھپوایا جائے۔

سعادت:- نیک کام میں دیر کاہیکی، ابھی سہی۔

حلیم:- لیکن مقدمے میں کچھ ترمیم و اضافہ ہونا باقی ہے نا۔

عباس:- تو پھر کل سہی۔

صفیہ:- ابا جان، اب گھر میں مشکل سے تین چار دن کا خرچ اور باقی رہ گیا ہے اس کی بھی فکر کیجئے۔

سعادت:- کوئی مضائقہ نہیں، مجھے ایک دو دن میں ماہنامہ "معدن" سے ایک چیک کی توقع ہے۔

صفیہ:- کتنے روپے کا؟

سعادت:- دو افسانوں کا معاوضہ آئے گا۔ پچاس روپے کی امید ہے۔

صفیہ:- بس تو پھر ٹھیک ہے۔

(اختر داخل ہوتا ہے اور آکر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عباس:- ہیلو، سعادت بھائی، اختر بھائی آ گئے،

اختر:- کیا کام ہے مجھ سے؟

سعادت:- یہی کہ میرے افسانوں کے مجموعے پر مقدمہ لکھنا ہے۔

اختر:- اچھی بات ہے، فرصت ملی تو لکھ دوں گا۔ لیکن کیا بات ہے کہ

آپ لوگ آج کی سب سے اہم خبر پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔
سب مل کر:۔ وہ کیا؟
اختر:۔ ارے گویا آپ نے آج اخبار نہیں پڑھا؟
صفیہ:۔ آج آپ کا اخبار نہیں آیا، خدا معلوم کیا بات ہے۔
اختر:۔ حیرت ہے، میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ لوگوں نے وہ اعلان پڑھ لیا ہوگا۔
حلیم:۔ کونسا اعلان؟ کچھ بتاؤ تو۔
اختر:۔ سنئے۔ ادارۂ ادبیات عالیہ کی طرف سے ایک ادبی انعام کا اعلان ہوا ہے۔
حلیم:۔ کیا ناول کے لئے؟
سعادت:۔ یا افسانے کے لئے؟
عباس:۔ یا ڈرامے کے لئے؟
صفیہ:۔ یا نظم کے لئے؟
اختر:۔ سنئے تو سہی کسی قسم کی قید نہیں ہے، خواہ تصنیف غیر مطبوعہ ہو یا مطبوعہ ہو، نظم ہو یا نثر، ڈراما ہو یا افسانہ، ناول ہو یا کچھ اور کوئی کتاب ہو!
حلیم:۔ لیکن انعام کس قدر ہے؟
سعادت:۔ ہاں اصل سوال تو یہ ہے۔
عباس:۔ جس پر ہمارے اس مقابلے میں شریک ہونے کا انحصار ہے۔
اختر:۔ انعام بہت بڑا ہے۔
صفیہ:۔ یعنی؟ ہزار دو ہزار روپیہ؟
اختر:۔ اس سے بھی زیادہ۔
سعادت:۔ پانچ ہزار؟
اختر:۔ اس سے بھی زیادہ۔
عباس:۔ دس ہزار؟
اختر:۔ اس سے بھی زیادہ۔
حلیم:۔ بیس ہزار؟
اختر:۔ جی ہاں، بیس ہزار روپیہ۔
حلیم:۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے [illegible] نہیں رہی۔
عباس:۔ اور نہ مجھے۔
سعادت:۔ اور نہ مجھے۔
حلیم:۔ لیکن اختر اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ انعام کسے دیا جائے؟
اختر:۔ ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں پانچ ممبر [illegible] یا شاعر یا نقاد ہیں۔
حلیم:۔ کیا کوئی تاریخ بھی مقرر کی گئی ہے؟
اختر:۔ ہاں، اس ماہ کے ختم تک سب کتابیں ادارۂ ادبیات عالیہ کے دفتر تک پہنچ جانی چاہئیں، ایک اور بات کہنا میں بھول گیا، وہ یہ کہ ہر تصنیف صرف اسی سال کی چھپی ہوئی [illegible]
عباس:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری [illegible]
سعادت:۔ یقیناً۔
صفیہ:۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ انعام ابا جان کے سوا [illegible] تھا۔
حلیم:۔ ممکن ہے، بہت ممکن ہے لیکن میرے خیال [illegible] کیا عمدہ نظمیں لکھی ہیں تم نے!
عباس:۔ اگر ابا جان اور صفیہ کو نہ ملا تو پھر سعادت [illegible]
سعادت:۔ اور اگر مجھے بھی ملا تو پھر تمہیں ندامت [illegible]
اختر:۔ مختصر یہ کہ انعام آپ سے گھر ہی میں رہے گا۔
صفیہ:۔ اس میں تو شبہ کی کوئی گنجائش [illegible]
حلیم:۔ خیر چھوڑو اس بحث کو، اب سوال [illegible] کس طرح سے کیا جائے۔

سعادت :- یہ بات اصل مسئلہ تو غور طلب ہی ہے۔

اختر :- میری رائے میں تو ہمیں اپنا ایک اخبار نکال لینا چاہیئے۔

عباس :- تمہیں ایک پبلشنگ ہاؤس کھول لینا چاہیئے۔

سعادت :- ہاں ہاں ٹھیک۔

صفیہ :- میرے خیال میں تو پہلے ایک نفیس بنگلہ کسی شاعرانہ مقام پر خرید لینا
چاہیئے، بعد میں اگر رقم بچ جائے تو اور کچھ کیا جا سکتا ہے۔

حلیم :- رقم بچ جائے تو ایک موٹر بھی ضرور لینا چاہیئے۔

اختر :- میں تو سمجھتا ہوں کہ بیس ہزار میں موٹر، بنگلہ اور پبلشنگ ہاؤس کے بعد
بھی اخبار جاری کیا جا سکتا ہے۔

سعادت :- اس صورت میں ہمیں اخبار نکالنے پر کوئی اعتراض نہیں۔

حلیم :- گویا رقم کا مصرف بھی طے ہو گیا۔ اب صرف رقم آنے کی دیر ہے۔ اختر!
انعام کب تقسیم کیا جائے گا؟

اختر :- انعام مثلاً ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد، مجھے ٹھیک یاد نہیں۔

حلیم :- نہیں یہ بالکل ٹھیک نہیں، سب کچھ معلوم رہنا چاہیئے۔ عباس جاؤ
ذرا ایک [illegible] خرید لاؤ۔

عباس :- ابھی خرید لاتا ہوں بھائی جان، دو منٹ میں آتا ہوں۔

(عباس چلا جاتا ہے)

حلیم :- اس خوشی میں ایک دور چائے کا تو ہو جائے۔

صفیہ :- بہت خوب۔ پانی تو چولہے ہی پر رکھا ہے، ابھی بنا لاتی ہوں۔

(صفیہ گھر کے اندر چلی جاتی ہے)

سعادت :- تم نے اپنے اخبار کا نام کیا سوچا ہے اختر؟

حلیم :- ہاں یہ بھی طے ہو جانا چاہیئے تاکہ ڈکلریشن بھی داخل کرایا
جا سکے۔

سعادت :- [illegible] بنانے میں کچھ دیر تو لگتی ہی ہے، اس لئے ہر چیز
[illegible] طے کر لینی چاہیئے۔

اختر :- میں نے نیا سنسار سوچا ہے۔

سعادت :- "نیا زمانہ" اس سے اچھا رہے گا۔

حلیم :- "نئی دنیا" ان دونوں سے بھی بہتر رہے گا۔

اختر :- ہاں یہ دونوں نام بھی ٹھیک ہی ہیں، فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

سعادت :- قرعہ ڈال لو۔

اختر :- اچھی بات ہے۔

(صفیہ چائے لے آتی ہے)

حلیم :- صفیہ سے بھی تو پوچھ لو۔

(سب اپنی اپنی پیالی لے لیتے ہیں)

صفیہ :- کس بارے میں؟

حلیم :- اصل سوال اس وقت غور طلب یہ ہے کہ اختر جو اخبار نکالیگا
اس کا نام کیا ہونا چاہیئے، نیا زمانہ، نیا سنسار، یا نئی دنیا؟

صفیہ :- ویسے یہ تینوں بھی برے نہیں لیکن شعریت کسی میں بھی نہیں۔ ہاں اگر
"دنیائے نو" نام رکھا جائے تو یہ البتہ شاعرانہ ہے۔

اختر :- منظور۔

سعادت :- منظور۔

حلیم :- تو پھر مجھے بھی منظور۔ اب سوال یہ ہے کہ بنگلہ کا کیا نام ہو؟

اختر :- "نشان راہ" کیسا رہے گا؟

سعادت :- ٹھیک نہیں، اس سے تو "نشیمن" بہتر ہے۔

حلیم :- "نشیمن" سے تو "آشیانہ" اچھا ہے۔

صفیہ :- میرے خیال میں "کہکشاں" زیادہ موزوں اور زیادہ شاعرانہ
ہے۔

حلیم :- منظور۔

اختر :- منظور۔

سعادت :- منظور۔

علیم :- چلو مکان کا قصہ بھی طے ہو گیا لیکن یہ عباس ابھی تک نہیں لوٹا۔

سعادت :- آتا ہی ہو گا۔

(عباس ہاتھ میں اخبار لئے داخل ہوتا ہے)

علیم :- عباس آ گئے؟ تقسیم انعام کی کیا تاریخ ہے؟

عباس :- تاریخ کو چھوڑیئے اباجان، یہاں تو ایک اور ہی پرابلم ہے

علیم :- وہ کیا؟

عباس :- اس انعامی مقابلہ میں شرکت کے لئے ہر تصنیف کے ساتھ پچاس روپے بھی بھیجنا ضروری ہے!

علیم :- پچاس روپے!

اختر :- جی ہاں اباجان یہ کہنا تو میں آپ سے بھول ہی گیا تھا۔

علیم :- یعنی دو سو روپوں کی ضرورت پڑے گی؟

صفیہ :- اور گھر میں اس وقت صرف پندرہ روپے رہ گئے ہیں۔

اختر :- یہ ادبی مقابلہ کاہے کو ہے انعامی معمّا ہے۔ لعنت ہے اس پر۔

سعادت :- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادارۂ ادبیات عالیہ والے سب سے فیس جمع کر لینے کے بعد اپنے کسی عزیز کو انعام دیں گے۔ لعنت ہے ایسے ادبی مقابلے پر۔

عباس :- ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس میں شریک ہونا محض فضول ہے

علیم :- لہٰذا طے پایا کہ اپنے اپنے ناشروں کے پاس ضرور جانا چاہیئے۔

اختر :- کیونکہ انگور کھٹے ہیں۔

علیم :- بیٹی اس دام میں پھنستے پھنستے بچ جانے کی خوشی میں چائے کا ایک دور اور ہونا چاہیئے۔

عباس :- یعنی ایک دور ہو چکا ہے؟

سعادت :- ہاں، دیکھتے نہیں، پیالیاں خالی رکھی ہیں۔

عباس :- تو پھر میں دو پیالیاں پینے کا حقدار ہوں

صفیہ :- اچھی بات ہے، آپ کے لئے دو ہی بنا دوں گی۔

(صفیہ پھر گھر میں چلی جاتی ہے)

علیم :- اب ہمیں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔

سعادت :- جی ہاں، بہت وقت ضائع گیا۔

عباس :- ذرا چائے پی لیں تو پھر کام شروع کر دیں گے

(باہر سے "خط لے جاؤ" کی آواز آتی ہے)

علیم :- دیکھو تو سعادت کس کا خط ہے۔

(سعادت باہر جا کر ایک لفافہ ہاتھ میں لئے آتا ہے)

علیم :- کس کا ہے؟

سعادت :- میرا ہی ہے، "ہمعصر" کے دفتر سے آیا ہے۔

(لفافہ چاک کر کے اس میں سے خط نکالتا ہے)

سعادت :- پچاس روپیہ کا چیک آیا ہے

علیم :- آ گیا؟ بہت اچھا ہوا۔

سعادت :- اور ساتھ ہی شکریہ کا خط اور ایک افسانہ کا مطالبہ بھی ہے۔

عباس :- ضرور بھیجئے۔

علیم :- اختر تم نے میرا نیا ناول پڑھ لیا ہے نا؟

اختر :- ہاں اباجان۔

علیم :- کیسا ہے؟

اختر :- میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں آج تک ایسا اچھا ناول نہیں لکھا گیا۔

سعادت :- میرا بھی یہی خیال ہے۔

عباس :- اور میرا بھی۔

علیم :- تو پھر کیوں نہ اسے انعامی مقابلے میں بھیج کر تین ہزار روپیہ حاصل کیا جائے؟ پچاس روپے کا چیک تو آ ہی چکا ہے۔

سعادت :- لیکن اباجان......

علیم :- لیکن ویکن کیا۔ پچاس روپے کے بدلے تین ہزار، اس سے بہتر اور کونسا سودا ہو سکتا ہے؟

سعادت :- مگر اباجان ابھی تو اس پر آپ نے [illegible] نہیں کی۔

حلیم :- ماکر نسا مشکل کام ہے، آج کرلونگا۔

سعادت :- میرا مطلب تھا ذرا تفصیل سے نظرِ ثانی کرنا ضروری ہے کیونکہ
قصے میں بعض جگہ کچھ جھول رہ گئے ہیں۔

عباس :- جی ہاں ابا جان، اس کے علاوہ دو ایک کردار جو غیر ضروری ہیں
حذف ہونے چاہئیں۔

سعادت :- مناظر میں بھی کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے

عباس :- بعض جگہ مکالمہ بھی غیر فطری ہو گیا ہے۔

سعادت :- غرض یہ کہ ابھی بہت کچھ بدلنا ہے اور وقت بہت کم رہ گیا ہے

عباس :- اس لئے میرے خیال میں آپکے ناول کی بجائے میرے ڈراموں کا
مجموعہ بھیجا جائے تو انعام ملنے کا زیادہ یقین ہوگا

سعادت :- تمہارے ڈراموں میں بھی بہت اصلاح کی ضرورت ہے۔

حلیم :- اسٹیج کی ہدایات بہت ناقص ہیں۔

سعادت :- کرداروں کے لباس کے بارے میں بھی تفصیل نہیں دی گئی ہے

حلیم :- اور پھر اکثر ڈرامے تو انگریزی سے ماخوذ ہیں، طبعزاد نہیں ہیں۔

سعادت :- جب تک تصنیف طبعزاد نہ ہو اسے بھیجنے سے فائدہ ہی کیا ہے

حلیم :- تمہارے ڈرامے بھیجنا تو پچاس روپے ضائع کرنا ہے۔

سعادت :- البتہ میں افسانوں کا مجموعہ بھیج دوں تو یقین ہے کہ انعام مل جائیگا۔

حلیم :- ناممکن! تمہارے افسانوں میں پلاٹ ہی نہیں ہے،

عباس :- سوائے شعوری تجزیے کے آپ کے افسانوں میں دھرا ہی کیا ہے
سعادت بھائی!

سعادت :- یہی تو جدید افسانے کی تکنیک ہے۔

حلیم :- نہ کردار، نہ پلاٹ، نہ مکالمہ، نہ منظر، واہ بھئی واہ، خوب تکنیک
ہے۔

عباس :- سعادت بھائی میں تو آپ کو ہرگز پچاس روپے ضائع کرنے کا
مشورہ نہیں دونگا۔

(صفیہ چائے لے آتی ہے)

صفیہ :- کون سے پچاس روپے؟

اختر :- سعادت بھائی کے نام "معدن" سے چیک آیا ہے۔

صفیہ :- شکر ہے، میں تو گھر کے خرچ کی فکر میں گھلی جا رہی تھی۔

اختر :- لیکن ابا جان، عباس اور سعادت بھائی تو اس امر پر مصر ہیں کہ
اس ادبی مقابلے میں شریک ہونا چاہئے۔

حلیم :- صفیہ تم کہو میرا ناول کیسا ہے؟

صفیہ :- بہترین۔

سعادت :- اور میرے افسانے؟

صفیہ :- لاجواب۔

عباس :- اور میرے ڈرامے؟

صفیہ :- بہت اچھے۔

حلیم :- تو پھر اب سوال یہ ہے کہ انعامی مقابلے میں کس کی تصنیف بھیجی جائے

اختر :- صفیہ، تمہارا کیا خیال ہے؟

صفیہ :- میرے خیال میں تو یہ پچاس روپے گھر کے خرچ کے لئے زیادہ ضروری ہیں

حلیم :- بیس ہزار روپے آجائیں تو ایسے ایسے ہزار گھر چلائے جا سکتے ہیں۔

صفیہ :- میں سمجھتی ہوں ابا جان کہ اگر بھیجنا ہی طے ہو تو پھر میری نظموں کا مجموعہ
بھیجئے جس کی آپ اتنی تعریف کرتے ہیں۔

حلیم :- خیر خیر، تم لکھتی تو اچھا ہو لیکن......

سعادت :- ابھی بہت مشق کی ضرورت ہے، اس لئے تمہارے مجموعۂ کلام
کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اختر :- آخر یہ آپ لوگوں کو آج کیا ہو گیا ہے۔ جو ایک دوسرے کے ہاتھ
دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں!

حلیم :- میں سمجھتا ہوں کہ میرا ناول ہی اس انعام کا مستحق ہے اور وہی
بھیجنا چاہئے۔

سعادت:۔ میرے خیال میں میرے افسانوں کے سوا اور کسی کو انعام نہیں مل سکتا۔

عباس:۔ مجھے تو یقین ہے کہ میرے ڈرامے آپ کے افسانوں اور ناولوں سے کتنے ہی اچھے ہیں۔

حلیم:۔ گستاخ، بدتمیز! جھوٹ بکتا ہے، تو پھر یہ مقدمہ کیوں لکھا؟

سعادت:۔ ذرا جو ایک آدھ ڈرامے کی تعریف دل رکھنے کو کر دی تو ہاتھ پیر نکال رہا ہے۔

(تینوں ایک دوسرے کو غصے کی نظروں سے دیکھتے ہیں)

اختر:۔ میرے ذہن میں اس مسئلہ کا ایک حل آیا ہے۔

صفیہ:۔ وہ کیا؟ کہہ دیجئے تاکہ کشیدگی دور ہو جائے۔

اختر:۔ سعادت بھائی، ذرا یہ چیک مجھے تو دیجئے۔

(سعادت کے ہاتھ سے جھپٹ کر چاک کر دیتا ہے)

اختر:۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!!

سب مل کر:۔ ارے ارے!! یہ کیا؟؟؟ چیک پھاڑ دیا؟

(سب کے چہرے اتر جاتے ہیں)

(پردہ گر پڑتا ہے)

★

لاشعور!

عظیم قریشی

خمار سی رواں رواں
نگار سی جواں جواں
شرار سی تپاں تپاں

کرن مہک کے سو گئی!
بہشت تھی جو کھو گئی!!

ٍ یہ ڈراما طنزیہ ہے اور نام سب فرضی ہیں۔

سید آغا حسین ابو طوجاہی (میگ)

بہار کا ایک منظر

سرخ پھولوں کے باغات میں جو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں

پاکستانی نسیم کے محبوب جھونکوں کے نام!

سرخ گلاب کے پھول گلابی اور سفید حاشیوں کے ساتھ ان باغات میں کس قدر دلفریب معلوم ہوتے ہیں جن کے ساتھ بڑی دور تک چلے گئے ہیں۔ شفاف ندیاں ان کے ساتھ ساتھ بہہ رہی ہیں۔ حضرت غالب قصیدہ کی ایک بہاریہ تشبیب میں فرماتے ہیں ؎

گر رنگ بشنوِ گل نگری شاد شو کہ گل

از جرِ جگر خراشی پیکان خار یافت

گر حسن ماہ یک شبہ بینی بداں کہ ماہ

پاداشِ جہاں گدازی شب ہائے تار یافت

جام از شراب روشنیِ آفتاب داد

بزم از بساط تازگیِ نو بہار یافت

بوئے سخن صفائے بنا گوش گل گزید

بانگِ قلم نشاطِ نوائے ہزار یافت

چھوٹے بچے ان ساحلوں کے آس پاس باغ کی روشوں پر کھیل رہے ہیں۔ سفید اور نیلی چنریاں اوڑھے ہوئے چھوٹی بچیاں جھاڑیوں کے گرد اگرد گھوم رہی ہیں۔ وہ سب سیاہ تتلیوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ تتلیاں جب ان کی زد سے نکل جاتی ہیں۔ تو وہ ہنسنے لگتے ہیں۔

بعض وقت ان کے قہقہے ذرا معمول سے بلند ہو کر سبزی مائل مرتعش پانی میں جا ملتے ہیں۔ وہاں سے رنگین مچھلیاں برآمد ہو کر لہروں کے بہاؤ کے ساتھ دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔

ان بچوں کی سیاہ آنکھوں سے تتلیاں ڈرتی ہیں۔ ان کی آنکھیں کچھ ایسی سیاہی مائل ہیں۔ کہ ایک مشہور عرب شاعر نے شاید انہی کی تعریف میں کہا تھا۔

(مترجمہ) "اس کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی کچھ ایسے معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے باغ کی ہر شئی کو اونگھ آجائے"

باریک و نیشنیں شیشہ آلات کے ٹوٹنے سے کیسی سُریلی اور پُر کیف آوازیں نکلتی ہیں۔ جب سرخ سفید اور نیلے پھول آپس میں ٹکراتے ہیں۔ تو سوائے خواب آلود

خاموشی کے ادراک یا ذہن میں آتا ہے ۔ یاں کبھی حافظ اور غالب کے دلنشین شیشوں سے بھی باریک اور نازک اشعار کسی بھولے ہوئے خواب کی طرح یاد آنے لگتے ہیں
یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اردو شاعر کے جذبات دریائے چناب کی رنگین لہروں کے ساتھ ساتھ بہے جا رہے ہیں۔ جہاں وہ کہتا ہے ؎

آنکھوں کے سامنے ہیں ان کے حسین فسانے
بیتی ہوئی بہاریں، گزرے ہوئے زمانے
وہ آئیں یا نہ آئیں، کون ان کی بات مانے

شام میں خنکی اور نمی آچلی ہے اور وادی پاکستانی فضائیں موسمِ بہار کی طرف جا رہی ہیں۔ دریا کی ذرا تیز ہوائیں ہلکے ہلکے خوشبو دار درختوں سے گزر کر حیران کر رہی ہیں۔ آسمان پر بکھرے ہوئے تارے شاید موتی بن جانا چاہتے ہیں۔ نیلی نیلی لہروں کے پرسکون پیچ و تاب میں دریا کی ہلکی سبز گہرائیوں میں انسانی اذہان کے ابر آلود افق پر چمکنے کے لئے۔

بادلوں کے گلابی منظر شفق کی رنگینیوں سے چھن چھن کر ان لہروں میں سمائے جا رہے ہیں۔ جو ہزاروں سال سے بہہ رہی ہیں۔

موسمِ بہار گہری اُودی پاکستانی سرسبز نکہتوں پر چھایا جا رہا ہے۔ انار اور سیب کے درختوں پر نیلے شکرخورے چہچہا رہے ہیں۔ وہ کبھی اپنے جوڑے کا تعاقب کرنے لگتے ہیں کبھی دور تک اڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور واپس آکر سرسبز و شاداب درختوں کا منہ چومنے لگتے ہیں۔ یہ پھول بھی ننھے خوبصورت پرندوں سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ اور اپنے اباً و رحصے پروں میں لپیٹ کر بقول نفیس خوبان باغ کو تحفۃً بھیج دیتے ہیں۔

چھوٹے پرندے یہ پیغام بہار کے خوش رنگ درختوں کے پاس اس طرح جاتے ہیں جس طرح بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ریشمی لہریں نوا ہائے راز لے کر کسی طرف جا رہی ہوں۔

میں ان اودے پرندوں اور سیاہ تتلیوں کو دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ بچے بھی دریا کے جھاگ کو پکڑنے سے عاجز آکر تھک گئے ہیں۔ ماہی گیر جو دریا سے کنارے کے قریب پہنچے ہیں۔ جلدی جلدی کنارے پر آنے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

ننھے پرندے اپنے بسیروں میں جا چکے ہیں۔ باغوں پر ایک پُر کیف سکون طاری ہے۔ بقولِ شاعر ؎

تاریک ہو چلی ہیں، تاروں کی جلوہ گاہیں
کچھ تھک گئی ہیں، دیکھو مہتاب کی نگاہیں
سونے کو جا رہی ہیں، وہ کہکشاں کی راہیں

تاروں پہ ارغوانی بدلی سی چھا رہی ہے
بادِ نسیم آکر پنکھے ہلا رہی ہے
اے دل محوِ کشش ہو جا اب نیند آ رہی ہے

★

★

تاثراتِ فصلِ بہار

۱۹۴۳ء

۱

پھر آج وہی خوشبوئے بادِ بہار آئی
غنچوں کے تبسم سے
پھولوں کے تکلم سے
پھر یادِ نگار آئی، پھر نکہتِ یار آئی
پھر آج وہی خوشبوئے بادِ بہار آئی

۲

پھر نکہتِ یار آئی، پھر یادِ نگار آئی
ہر کنجِ خیاباں سے
ہر گلبنِ شاداں سے
پھر آج وہی خوشبوئے بادِ بہار آئی
پھر یادِ نگار آئی، پھر نکہتِ یار آئی
پھر آج وہی خوشبو———

۱۹۳۳ء

خوشی کے زمزمے گاتی ہوئی فصلِ بہار آئی — گلستاں سے صدائے خندۂ گل بار بار آئی
چمن کے پتے پتے پر ہوئی انوار کی بارش — گھٹا بن کر نویدِ رحمتِ پروردگار آئی
صدا بلبل کی گونجی دمبدم صحنِ گلستاں سے — بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

لڑھکتی، ڈگمگاتی، کھڑکھڑاتی، پتیاں بھاگیں
سپاہِ گل قطار اندر قطار آئی

خزاں رخصت ہوئی روتی بلکتی سر پٹکتی
چمن سہرا اٹھاتی، ناچتی، گاتی بہار آئی

خدا جانے رات بھر گلشن نے لوٹا حسنِ فطرت کا
گہر دم ورنہ کیوں پھر شبنمِ گوہر شمار آئی

ہوئی اس خاکداں پر حسنِ فطرت کی وہ ارزانی
کہ جنت کی نگاہ رشک ہو کر شرمسار آئی

افق تک سبزہ سو لہرا رہے ہیں زمردیں افعی
زمیں خوش ہے کہ میلی کچیلی اپنی اتار آئی

گلستاں گرمیِ انفاسِ گل سے تمتما اٹھا
کہ روحِ عشق لے کر زندگانی کا شرار آئی

گھر آیا جھومتا، دھوم میں مچاتا ابرِ آزاری
اور اُس کی پیشوائی کو یہ چشمِ اشکبار آئی

صبا کے مست سحر انگیز جھونکے پے بہ پے آئے
بھلانے پر بھی یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی

سمجھ کر گل کو ہم رنگ اُس کے عارض کا سحر بلبل
گئی اک گل کی پتی لے کے لیکن شرمسار آئی

صبا مستی سے اٹھلاتی ہوئی پھرتی تھی گلشن میں
ہنسی پھولوں کو اُس پر آئی اور بے اختیار آئی

نگہ نرگس کی حیراں زلفِ سنبل کی پریشاں ہے
بہار اُس انجمن سے آئی لیکن بے قرار آئی

وہ حسنِ جاوداں فارغ ہے قیدِ [illegible] سے
خزاں ہے سادگی اُس کی بہار اُس کی خود آرائی

بحمد اللہ وہی اب سرمۂ چشمِ جہاں بیں ہے
کبھی رکھی تھی، کام آج اُس کی خاکِ رہگزار آئی

مزارِ عشق میں چھپے ہیں اپنی بے نوائی کے
جہانِ حسن میں جیسے مسلّم اُس کی دارائی

انا الحسن اپنی خاکستر کے ہر ذرے سے پیدا ہے
دعائے عشق دیکھا کس طرح بر لانے کار آئی

آفتابِ انجمن شیخ عبدالقادر

۱۹۵۰

انجمن جس کے دم سے روشن تھی　　بجھ گئی آج اُس کی شمعِ حیات

زندگی اُس کی انجمن کا چراغ　　انجمن کا چراغ سالِ وفات

اُسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں

وہ تھا قلب و دماغِ شہرِ لاہور

ہوا بے تاج فرقِ انجمن جب

کہا میں نے چراغِ شہرِ لاہور

۱۹۵۰ - ۱ - ۱۹۵۱

حفیظ ہوشیارپوری
(بشکریہ امروز)

متعلقین کو صبر کی تلقین بھی روز ہی کی جاتی ہے۔ روزِ ازل سے یہی ہوتا رہا ہے۔ اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ زندگی بدستور آگے بڑھتی رہے گی [illegible] پہنچتی رہیں گے کہ یہی تقدیر ہے۔ اور اس کا کوئی چارہ انسان کے بس کا کام نہیں لیکن ایسے درخشندہ ستارے بار بار نہیں طلوع ہوتے جس کا کاش [illegible] کبھی پوری ہو جاتی۔

مجھے اپنے اس غم میں برابر کا شریک سمجھئے کہ یہ صرف آپ ہی کا غم نہیں بلکہ پوری صحافتی دنیا کا غم ہے۔ اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے۔

اردو دنیا کا غمِ عظیم

سلام مچھلی شہری (از لکھنؤ)

اخباروں کے ذریعہ اس عظیم غم کی خبر مجھے پہلے ہی ہو گئی تھی جس سے پوری اردو دنیا میں کہرام مچا ہوا ہے۔ ابھی خصوصاً ادارہ مخزن اور [illegible] کا تو نہ جانے کیا حال ہو گا۔ کیا کیا جائے۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔ اب ہم مرحوم کی روح کو اس طرح خوش کر سکتے ہیں کہ مخزن کو نہ صرف زندہ رکھیں بلکہ اسے [illegible] زبان و ادب کے لئے شمعِ سرمنزل بھی بنا دیں۔

پاکستان و ہند کے لاکھوں انسانوں کی محرومی

جیمنی سرشار ایڈیٹر "ماہنامہ جیون نیوز بمبئی"

اخبارات میں قبلہ شیخ صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر دل کو سخت صدمہ ہوا۔ چند ہی روز پہلے ان کی شدید علالت کی اطلاع ملی تھی میں نے [illegible] شیخ صاحب کی خدمت میں خط لکھا مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور اخبارات میں یہ منحوس خبر چھپ گئی کہ قبلہ شیخ صاحب کی [illegible] سے ہم لوگ اب محروم ہو گئے ہیں۔

قبلہ شیخ صاحب کی لاتعداد خوبیوں کے پیشِ نظر ان کی رحلت پر ان کے سن وصال اور عمر کے اندازہ کے ماتحت غور کرتا ہوں تو [illegible] حقیقت میں ان کی وفات پاکستان اور ہند کے لاکھوں انسانوں کیلئے جو ان کی ذات سے دلی عقیدت رکھتے تھے ایک انتہائی رنجدہ سانحہ ہے لیکن مشیتِ ایزدی سے کیا چارہ ہے۔ آپ کو بھی اس سے سخت صدمہ پہنچا ہو گا لیکن بہرحال ہمیں ان کے متعلق اپنے فرائض کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

میری خواہش ہے کہ اگلے ماہ یا جس قدر جلد ممکن ہو ان کی یاد میں مخزن کا ایک خاص ماتمی نمبر شائع کیا جائے جس کی ضخامت دو سو صفحات سے کم نہ ہو اور اس میں ان کی سیرت کے مختلف پہلو اجاگر کئے جائیں۔ اگر اور کوئی صورت نہ نکل سکے تو دو ماہ کا مشترکہ نمبر بھی اس غرض سے مرتب اور شائع کیا جا سکتا ہے۔ زرِ چندہ [illegible] عنقریب ارسالِ خدمت ہو گا۔ یقیناً میری طرح میں نہیں بلکہ سینکڑوں اصحاب انہیں آخری خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔

★

خادمِ اردو کی رحلت

ظفر اقبال حشمی (کراچی)

سر عبد القادر کی رحلت کی خبر سنی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتہائی رنج ہوا۔ ابھی پریس پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل مولوی محمد وسیم کا انتقال ہوا تھا مقدم ملک ابھی ان کی موت کی اطلاع سے مغموم تھی کہ سر عبد القادر کا انتقال ہوگیا۔

سر عبد القادر کی وہ خدمات جو انہوں نے ایک خادمِ اردو کی حیثیت سے انجام دی ہیں۔ تاریخِ اردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان کا رسالہ مخزن اردو ادب میں ایک سنگِ میل ہے۔ جس کی امتیازی حیثیت ہمیشہ کے لئے اردو زبان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سر عبد القادر نے پنجاب میں اردو کو پھیلانے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کو تمام تعلیم یافتہ طبقہ جانتا ہے اس لئے ان کی وفات ایک ادبی و صحافتی نقصان ہے۔ جس کا نعم البدل ملنا مشکل ہے۔ مرحوم کی ان عظیم الشان خدمات کے پیشِ نظر میں خادمانِ ادب سے پُر زور الفاظ میں اپیل کروں گا کہ وہ ان کی یادگار قائم کریں۔ تاکہ اردو کے اس مشہور مبلغ کی یاد ہمیشہ باقی رہے اور خاص طور پر پنجاب کے اردو نوازوں کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں پیش قدمی کریں اس لئے کہ ان پر مرحوم کا بڑا حق ہے۔ دعا ہے کہ رب العزت مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔

★

آہ مشعلِ راہ!

جناب جبریل (صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد سندھ)

مخزن کے سرپرست اور بانی حضرت شیخ عبد القادر صاحب کی رحلت اردو ادب کے لئے ایک شدید صدمہ ہے۔

آئندہ مخزن میں مرحوم سے متعلق کافی مواد شائع کیجئے۔ شیخ صاحب کی موجودگی ہی ہم لوگوں کے لئے مشعلِ راہ تھی۔ آہ شمعِ اردو کا شیدائی بھی چل بسا۔ افسوس۔

فروغِ شمع تو باقی رہے گا روزِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

★

ہند و سندھ کا بڑا آدمی

جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو (ایڈیٹر علی گڑھ میگزین علی گڑھ)

سر عبد القادر کی موت سے ہم لوگوں پر جیسے ایک بجلی سی گری۔ ہند و سندھ کا ایک بڑا آدمی چل بسا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

★

شیخ عبدالقادر

راجہ حمید کوثر جالندھری

یہ نظم جناب شیخ عبدالقادر کی نذر کرتا ہوں - (کوثر)

۱

اُٹھ گیا قدردانِ اہلِ کمال — محسنِ شاعرانِ اہلِ کمال
شعر پڑھنے سے دل لرزتا ہے — جھینپتی ہے زبانِ اہلِ کمال
کیا خبر کوئی داد دے کہ نہ دے — اب کہاں قدردانِ اہلِ کمال
اپنی بے قدریوں پہ روئیں گے — عمر بھر بیکسانِ اہلِ کمال
خاک چھانیں گے دشت و صحرا کی — کون سمجھے گا شانِ اہلِ کمال

۲

چوڑیاں ریختہ کی ٹوٹ گئیں — رہ گئیں گھٹ کے سب تمنائیں
یہ رنڈاپا بھری جوانی میں — ہائے کس طرح دل کو سمجھائیں
شیخ والا صفت کی میت پہ — اپنے ہاتھوں سے پھول برسائیں
اس سے اچھا تو یہ ہے اے کوثر! — موت آجائے ہم کو مر جائیں
اے عروسِ مہاجرہ افسوس — مل گئیں خاک میں تمنائیں

۳

آدمی کی بساط ہی کیا ہے — دن ہے چڑھتا ہے ڈھلتا ہے
دوست آہ و بکا سے کیا حاصل — موت پر کس کا زور چلتا ہے
کس کو آخر فنا نہیں ہونا — کس کا دائم چراغ جلتا ہے
ڈوبتے دل کو اب بچائے کون — آنکھ سے سیلِ اشک اُبلتا ہے

زندگی موت کا فسانا ہے
جو بھی آیا ہے اُس کو جانا ہے

مشترکہ تمدن کا نمائندہ

جگن ناتھ آزاد (نائب مدیر آجکل دہلی)

کل آپ کا ... شیخ صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی۔ دل سے ایک آہ نکلی۔ نہ جانے کتنے واقعات نظر کے سامنے پھر گئے۔ اردو کا ایک بہت بڑا محسن ... صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ تمدن کا ایک نمائندہ۔ یہ مشترکہ تمدن فقط پنجاب اور یوپی کی خصوصیت ہے۔ تمام ... کی ... شیخ صاحب کے خطوط جمع کر رہا ہوں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے لکھے۔ شاید کوئی کام کی چیز تیار کر سکوں۔

... صاحب نے کل ایک ... مجھے یاد نہیں رہا وہ براہ راست آپ کو بھیج دیں گے۔

"ہمارے بزرگ"

سید تمکین کاظمی (از حیدرآباد دکن)

کیا عرض کروں کہ ... کے انتقال سے کتنا صدمہ ہوا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ لاہور میں میرے ایک بزرگ موجود ہیں۔ افسوس وہ بھی نہ رہے۔ کیا آئندہ پرچہ جلد ... نمبر ہوگا۔

قومی زبان کا پرانا خادم

آغا حسین ارسطو جاہی

رسالت کے ایڈیٹر میں خبر وحشت اثر آغا شیخ عبدالقادر کے انتقال کی معلوم کر کے نہایت درجہ حزن و ملال ہوا۔ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ انہوں نے ہماری قومی زبان کی خدمات عظیم انجام دیں۔ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور انکے احسان کو بھی کبھی ہم فراموش نہ کر سکیں گے۔ مولانا آزاد کے بعد اس پایہ کا اردو ادیب پیدا نہیں ہوا۔ میں حیران ہوں کہ آج جو یہ اقتصادی عظیم کی تلافی کس طرح ہو سکے گی۔

- مخزن کا دوبارہ اجرا اور دلچسپی جو اس رسالہ کے بارے میں باوجود اس ضعف و ناتوانی کے انہوں نے لی۔ ہم پر ایک احسان عظیم ہے۔

"ادبی ملنگ"

وقار خلیل شاہپوری (مدیر مینا حیدرآباد دکن)

آج اخبارات میں شیخ عبدالقادر بالقابہ کے رحلت کرنے کی دل خراش و اندوہناک خبر دیکھی۔ جی دہل گیا۔

مخزن المخازن

امروز نمبر

"شیخ اُردو"

(صادق قریشی)

جناب مدیر مخزن ۔ سر عبدالقادر کے متعلق امروز کا جو مضمون کل آپ کو بھیجا گیا تھا ۔ اس میں ابتدائی تاریخیں غلط چھپ گئی ہیں ۔ صحیح تاریخیں ارسال ہیں ۔ اس مضمون میں شامل کر لیجئے ۔ مخلص ۔ صادق قریشی

سر عبدالقادر ماضی کو حال سے ملانے والی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے تھے آپ مسلمانوں کی اس ذہنی نشاۃ الثانیہ کی پیداوار تھے جس کے تقریباً تمام علمبردار ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو چکے ہیں ۔ سر عبدالقادر کو جن زندگان قوم کے ساتھ مل بیٹھنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ملتا رہا ، ان میں سر سید احمد خاں شمس العلماء آزاد، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی، خواجہ الطاف حسین حالی، سید اکبر الٰہ آبادی، حکیم اجمل خاں، سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک بلگرامی جیسی یکتائے روزگار ہستیاں شامل تھیں آپ کا حلقۂ احباب دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا تھا جب کبھی وہ اپنے دوستوں کی باتیں سنانے لگتے ان کے چہرے پر ایک بشاشت سی کھیلنے لگتی اپنی عمر رفتہ کے واقعات وہ بہت مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے ۔

یہ مختصر تذکرہ سیر و سفر مختلف عہدوں پر ملازمت اور علمی ادبی سرگرمیوں کی ایک طویل داستان پر مشتمل ہے ذیل میں آپ کی عمر کے اہم اوقات مندرجہ ہیں جو ایک ملاقات کے دوران میں خود شیخ صاحب نے لکھوائے تھے ۔

۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ فتح الدین بسلسلہ ملازمت یہاں مقیم تھے ۔

۱۸۷۹ء ۔ شیخ فتح الدین کا تبادلہ قصور ۔ قصور میں آپ تین سال تک مقیم رہے ۔

۱۸۸۲ء ۔ یہ کنبہ لاہور پہنچا ۔ شیخ عبدالقادر سنٹرل ماڈل سکول میں تعلیم پانے لگے ۔

۱۸۹۰ء ۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا

۱۸۹۴ء ۔ فورمن کرسچین کالج سے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔

۱۸۹۵ء ۔ پنجاب آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور تین سال کے بعد انگریز چیف ایڈیٹر کی جگہ لی ۔

۱۹۰۱ء ۔ رسالہ مخزن کا اجراء

۱۹۰۴ء ۔ بیرسٹری کے لئے انگلستان کو روانگی ۔ مخزن اس دوران میں جاری رہا ۔

۱۹۰۷ء ۔ لندن سے واپسی ۔ دہلی میں پریکٹس شروع کی ۔ رسالہ مخزن بھی دہلی سے نکلنے لگا ۔

۱۹۰۹ء ۔ لاہور واپس آ کر یہاں پریکٹس شروع کی ۔

۱۹۱۱ء ۔ لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے ۔ اور آٹھ سال تک یہ کام کرتے رہے ۔

۱۹۲۱ء ۔ لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے ۔

۱۹۲۳ء ۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ۔

۱۹۲۴ء ۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر مقرر ہوئے ۔

۱۹۲۵ء ۔ قائم مقام وزیر تعلیم ۔

ابتدائیات کا نیا سکول — The new school of Urdu Literature.

اردو زبان و ادب — Urdu Language and Literature.

اردو کے مشہور شعراء و مصنف — Famous Urdu poets and writers

لندن میں آپ نے اپنے قیام کے دوران میں ..... (۱۹۴۲ء - ۱۹۳۹ء)
میں بھی وہاں ایک ہندوستانی پبلک سوسائٹی قائم کی جس کے اجلاس میں
شرکت کے لئے کی شرط یہ تھی کہ بات چیت اردو میں کی جائے۔ اس کا حلقہ
اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ وہاں لندن کے علاوہ آکسفورڈ، کیمبرج، گلاسگو
اور برسٹل سے لوگ آنے لگے اس طرح اردو کی خدمت کا سلسلہ آپ نے
سات سمندر پار بھی جاری رکھا۔

شیخ عبدالقادر کی سب سے بڑی صفت غالباً یہ تھی کہ آپ ایک مرنجاں
مرنج انسان تھے آپ نے کبھی کسی کا دل نہ دکھایا، اگر کسی نے رنج کا اظہار کیا تو
مسکرا دیئے۔ اتنا معتدل مزاج شخص اس زمانے کے اکابرین میں شاید ہی اور کوئی ہو
آپ تمام مفید قومی تحریکوں کو اچھا سمجھتے تھے اور ہر قسم کے لیڈروں کے مفید
کاموں کے مداح تھے۔ سیاسیات میں بھی آپ اعتدال پسندی کے قائل تھے۔

نوائے وقت

فردوس مکاں شیخ عبدالقادر مرحوم و مغفور

(امین حزیں سیالکوٹی)

اقبال کی نگاہ میں تھے شیخ — اقبال کے یار غار تھے شیخ
اک بزم جہاں میں جو چمکا — اردو کے شہسوار تھے شیخ
ملت کا چمن تھا شگفتہ جن سے — اقبال تھے گل بہار تھے شیخ
اردو کا بھی گویا اقبال! — اردو کے مگر ستار تھے شیخ

پیرانہ سری میں بھی وہی عشق — اردو پہ دل نثار تھے شیخ
اس عصر کی محفل ادب میں — شخصیت باوقار تھے شیخ
ہم دوست سے جا ملے ہیں آخر — جن کے لئے سوگوار تھے شیخ

اے راہ رو دیار رحمت!
منزل گہہ تو جوار رحمت!

چٹان

اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

(شورش کاشمیری)

بلاشبہ شیخ عبدالقادر ہمارے اسلاف کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اور
اس زمانے کی درخشانی کے تصورات وابستہ تھے جنہیں اب تاریخ نے اپنے اوراق
میں محفوظ کر لیا ہے۔ ان کا وجود ایک تمدن کی علامت، ایک ثقافت کا نمونہ اور
ایک تہذیب کا مرقع تھا۔

آج سے کوئی ایک برس پہلے ہم کچھ دوست ان کی خدمت میں حاضر
ہوئے۔ میں نے عرض کیا "چٹان کا اقبال نمبر نکل رہا ہے، آپ سے علامہ اقبال
کی بابت کچھ پوچھنا ہے"۔ وہ یوں معلوم ہو رہے تھے۔ گویا خستہ حال بوسیدہ
گوشت کسی قدر مرجھا کر لٹک گیا ہے۔ جب تعارف ہو گیا تو کسی قدر مسکرائے ان
کی مسکراہٹ میں ایک وقار تھا۔

"ہاں تو آپ شورش کاشمیری ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اخاہ! آپ کے متعلق ریاض نے ذکر کیا تھا؟"

"میں نے ان سے اسی مطلب کے لئے وقت مانگا تھا۔ انہی کی بدولت
آج ہم کو پہلی دفعہ آپ سے ملاقات کی عزت حاصل ہو رہی ہے اور ہم زندگی میں
پاس بیٹھ کر گویا ان لوگوں کو دیکھ رہے ہیں جن سے ہمارے اسلاف کی ایک
باعظمت تاریخ وابستہ ہے۔"

[illegible] گھروں میں ہوتے تھے اور اس میں کثرت سے ہندوستانی اور انگریز علم و ادب کے شائق انگریز بھی شامل ہوتے تھے گویا لندن میں اردو کا مجلسی [illegible] سر عبد القادر کی وجہ سے اس مجلس کے انعقاد کا اہتمام قائم رہتا تھا جب حفیظ [illegible] پہنچے تو اس مجلس کی مقبولیت اور بھی بڑھنے لگی اور ہر جلسے میں لندن کے [illegible] آکسفورڈ، کیمبرج، گلاسگو، اور برسٹل سے لوگ آنے لگے۔ نہ جانے سر [عبد] القادر کے لندن سے چلے آنے کے بعد اس مجلس کا کیا حشر ہوا؟

جن آدمیوں کو سر عبد القادر سے مجلس میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ [اس] بات کی تصدیق کریں گے کہ مجلسی حیثیت سے آپ کا رتبہ بہت بلند ہے [بلکہ] یہ کہنا چاہیئے کہ آپ ایک ایسے مجلسی فن کار ہیں جن کا ہمسر شاید ہی کوئی [ہو]۔ آپ گھنٹوں ان کی باتیں سنتے رہیں تو سیری نہ ہوگی۔ بلکہ یہی جی چاہے گا کہ زندگی فرصت دے تو کچھ لمحے اور آپ کے پاس بیٹھے رہیں۔ آپ نے بہت سیاحت کی ہے۔ اور دنیا کے مختلف ممالک کی اہم شخصیتوں سے [مل] چکے ہیں۔ لہٰذا آپ ان سے کسی موضوع پر کسی ملک کا ذکر کریں تو وہ اپنے [ذاتی] تجربوں کی رو سے ایسی لذیذ باتیں سنائیں گے کہ آپ سنتے سنتے کبھی نہیں [اکتا]ئیں گے۔ طرز بیان میں اس قسم کا خلوص اور سادگی ہے کہ آپ فوراً ان سے [مانو]س ہو جائیں گے اور سننے والے کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیں گے کہ رتبے [ع]زت یا وجاہت میں وہ سامعین سے کس قدر بلند اور ارفع ہیں۔

۱۹۳۳ء کا ذکر ہے کہ آپ نے اردو سے متعلق میرے ایک لیکچر کی [صد]ارت قبول فرمائی۔ لیکچر لندن کی گوور سٹریٹ انڈین سٹوڈنٹس یونین کے [ہ]ال میں ہوا۔ لیکچر سے فراغت ہوئی تو کہنے لگے: بھائی یہاں کی کافی بہت مشہور ہے آپ کو کافی پلوائیں۔ ہم نے بہتیرا کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ لیکن آپ مصر ہو کر میزبان بن ہی گئے۔ اس وقت ہم چار پانچ آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں سے ایک دارا بھی تھے۔ جو بیرسٹر ہو جانے کے باوجود [ہندوستان] میں صرف ماضی عیاشی کرتے تھے اور ان کی جسمانی نقاہت اور مالی انحطاط میں کوئی زیادہ تفاوت نہیں تھا۔ دارا صاحب نے بیٹھتے ہی آپ سے پوچھا

کہ شیخ صاحب غالب کا وہ شعر سنائیے جو [illegible] آپ نے مجھے سنایا تھا سر عبد القادر نے کہا: پہلے یہ [illegible] آپ کو جس شعر کا استعمال سنانا [illegible] اور پھر شعر تو ہم سب [illegible] سے [illegible] غرض یہ کہ سننے لگے۔ آپ کہنے لگے [illegible] میں جب [illegible] زیر [illegible] [illegible] میں نے اپنی زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر دیا۔ [illegible] کے وقت جب احباب [illegible] تو ہمارے ایک بہت [illegible] والے مبارک باد اور سلامتی کی دعا دینے کے بجائے [illegible] کہنے لگے شیخ صاحب ایک عرصے سے پچھتا رہے ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ آپ اپنی زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر کے جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا آپ نے غالب کا وہ شعر نہیں سنا —

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت

پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست

لندن میں ایک عید کے موقع پر ایک دعوتی رقعے پر یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ناچ کا انتظام مفت ہوگا۔ جس وقت آپ کو دعوت ملی [illegible] میں پاس بیٹھا ہوا تھا آپ نے دعوت دینے والوں سے کہا کہ آپ ناچتے گاتے رہتے لیکن عید کے موقع پر اس کا تذکرہ کیا ضرور تھا۔ یہ گفتگو کرتے کرتے جدید تہذیب و تمدن پر تبصرہ کرنے لگا اور میں نے شکایت کی کہ مسلمان رفتہ رفتہ [illegible] سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی زبان سے بھی نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں کہنے لگے۔ ایک بات بتاتا ہوں۔ آپ ...... صاحب سے [illegible] تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہندوستان کے ایک نہایت معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ان کے والد کتنے بلند مرتبہ عالم تھے۔ میرے ان کے والد سے بھی تعلقات تھے۔ میں نے ان سے ان کی [illegible] کی خیریت پوچھی تو کہنے لگے: چشم بد دور۔ خیریت [illegible] جب [illegible] شاید یہ لفظ کہیں سے سن لیا تھا [illegible]

آپ [illegible] مرنجان مرنج انسان تھے چند سال ہوئے کہ [illegible]

انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے تو بھی ادب کی خدمت میں ویسے ہی مصروف رہا کرتے تھے۔ مشاعروں کی صدارت، علمی جلسوں کی سرپرستی۔ ادیبوں کی امداد اور رہنمائی۔ اس موقع پر پنجاب کے سی۔ آئی۔ ڈی کے بڑے افسر نے ان سے کہا۔ آپ تو مشاعروں کی صدارت کو چلے جاتے ہیں مگر ہمیں بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ باوردی پولیس اور بے وردی سی۔ آئی۔ ڈی کے اتنے آدمی آپ کی حفاظت کے لئے بھجوانے پڑتے ہیں تو آپ یہ کام چھوڑ دیں۔ حکومت کا منشا بھی یہی ہے۔ مگر مرحوم کا دل جانتا تھا کہ یہ حکومت کی کرسیاں اور خان بہادری کے اعزاز ڈھلتے ہوئے سائے کی طرح ہیں۔ مگر ادب کی خدمت اور قوم کی تعمیر مستقل حیثیت رکھتی ہے چنانچہ برابر خدمت ادب میں مصروف رہے۔

آج شیخ صاحب کے سینکڑوں ادبی اور اخلاقی شاگرد دنیا میں موجود ہیں۔ شمع سے شمع جلتی ہے۔ نور سے نور پیدا ہوتا ہے۔ اور شیخ صاحب مرحوم کی ذات گرامی کی پیدا کردہ محفلیں تا ابد قائم رہیں گی:

قومی زبان

شیخ عبدالقادر مرحوم

سر شیخ عبدالقادر ہماری قوم کے ایک ایسے فاضل اور مقبول فرد تھے جن کی اہل ملک بوجہ ان کے علم و فضل کے عزت اور بوجہ ان کے اخلاق حمیدہ کے ان سے محبت کرتے تھے۔ وہ محض اپنی قابلیت اور اعلےٰ سیرت کی وجہ سے اعلیٰ مدارج تک پہنچے اور ہر اعتبار سے وہ وقار اور عزت حاصل کی جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ "مخزن" جاری کر کے انہوں نے اردو زبان اور ادب کو بڑا فروغ دیا اور پرانے اور نئے ادیبوں کو اس میں لکھنے کی دعوت دی۔ اور اپنا شریک کار بنایا۔ انگریزی کا اخبار "آبزرور" انہوں نے اس وقت نکالا جب کہ انگریزی حلقہ اخبار نویسی میں مسلمانوں کی کوئی قابل قدر آواز گورنمنٹ کے اعلیٰ احکام تک نہیں پہنچتی تھی۔ شیخ صاحب نے یہ پرچہ نکال کر مسلمانوں کے حقوق کی حمایت کی اور اسلامی مسائل و تہذیب پر بہت اچھے مضامین شائع کئے۔

انہیں اردو زبان سے بڑا شغف تھا۔ اس کی اشاعت و ترقی میں انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن جہاں کہیں رہے اردو زبان کا ذوق اور اس سے ان کی ہمدردی اور دلچسپی ساتھ رہی۔ چنانچہ جب وہ لندن میں سیکرٹری آف اسٹیٹ کے مشیر کی حیثیت سے تھے تو وہاں انہوں نے اردو مجلس قائم کی اور اپنی صدارت و شرکت اور تقریروں سے اس میں عجیب چہل پہل اور لطف پیدا کر دیا۔ ان کی اردو کی محبت اس سے ظاہر ہے کہ آخر عمر میں جبکہ وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی اردو پروفیسری کی خدمت اعزازی طور پر انجام دی۔ پنجاب یونیورسٹی کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ایسا فاضل ادیب اور نقاد اردو کی پروفیسری کے لئے مل گیا۔ ان سے بڑھ کر کوئی شخص اس برعظیم میں اس خدمت کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تھے اور اس معاملے میں ان کی رائے قطعی تھی۔

وہ بڑے زندہ دل، خوش مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ ان کے معلومات بہت وسیع تھے اور ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے تھے۔ ان کی تقریریں بڑی دلچسپ اور پر از معلومات ہوتی تھیں۔ ملک کی ادبی اور علمی انجمنوں کو بڑی تمنا رہتی تھی کہ وہ ان اجلاسوں کی صدارت فرمائیں۔ وہ علمی و ادبی کاموں اور اداروں کو بڑی فراخ دلی سے مدد دیتے اور اپنے مشورے سے مستفید فرماتے۔ وہ نہایت مرنج و مرنجاں، بے حد خوش اخلاق، منکسر اور بڑی محبت اور شفقت سے ملتے اور لوگوں کی بھلائی کے کام کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے۔

انجمن ترقی اردو سے جب دلی سے تباہ و برباد ہو کر [illegible]

مطبوعات

حامد علی خاں

نوٹ: تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے

پاکستان کے لوک ناچ

جب تک ہمارا ادب اور فن درباروں کی سرپرستی کا محتاج رہا، ہمارے ادیب اور فن کار صرف بادشاہوں اور امیروں وزیروں کے درباروں اور ان درباروں کے متعلقات کی عکاسی میں مصروف رہے۔ یہ بات بالکل قدرتی تھی کیونکہ انسان اپنے ماحول سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے افسانے بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے افسانے تھے، ہماری شاعری درباروں کی ایک علامت بن کر رہ گئی تھی، اور ہمارے مصوروں کے قلم محض شاہی خاندان اور دربار کی پرستاری کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ اب وہ دن باقی نہیں رہے، ادیبوں اور فن کاروں کا ماحول بدل گیا، اس لئے قدرتاً ہماری ادبی و فنی تخلیقات کے انداز میں بھی تبدیلی آگئی۔ موجودہ زمانہ سلطانیِ جمہور کا زمانہ ہے۔ چنانچہ ہمارے ادب و فن میں بھی شاہ پرستی کی جگہ جمہور پرستی لے رہی ہے۔ ہر بات کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے وقت سے پہلے اپنی شاعری میں جمہور پرستانہ میلانات کا اظہار کیا تو درباری عہد کے نقادوں نے اس پر ناک بھوں چڑھائی اور نظیر کا کلام پایۂ ثقاہت سے گرا ہوا سمجھا گیا۔ اس زمانے میں وہی نظیر ہے کہ جمہور پرست نقادوں کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے۔

پرانے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے طرزِ عمل کے برعکس اس زمانے کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں نے عوام کی زندگی کی عکاسی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم عوامی ادب، عوامی رسم و رواج اور عوامی تفریحات بھی ہماری توجہ کا مرکز بنی ہیں۔

چند سال پہلے دیویندر ستیارتھی صاحب نے لوک گیت کے نام سے براعظم ہندوستان کی مختلف قوموں کے گیت جمع کئے تھے۔ اس وقت ایک اور ایسی ہی کتاب ہمارے پیش نظر ہے — یعنی پاکستان کے لوک ناچ۔ اس کتاب کے مؤلف عبد السلام صاحب خورشید ہیں اور ناشر ادارۂ ادبیات نو، لاہور۔ — لوک ناچ سے مراد رقص کے وہ تمام قدیم طریقے ہیں جو عوام میں صدیوں سے رائج چلے آتے ہیں۔ رقص کیا ہے؟ جذبات و احساسات کی شدت کا جسمانی اظہار، یا روح کی موسیقی سے جسمانی اعضا کی ہم آہنگی۔ رقص اور نغمے کا پرانا ساتھ ہے اور اسی طرح نغمے اور شعر کا تعلق بھی قدیم ہے۔ چنانچہ خورشید صاحب نے جہاں ہمارے مختلف لوک ناچوں کی اقسام گنوائی ہیں اور ان کی کیفیت درج کی ہے، وہیں ایسے گیت بھی جمع کر دیئے ہیں جو علی الترتیب مختلف لوک ناچوں کا لازمہ ہیں۔

لوک ناچوں اور لوک گیتوں کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان سے عوام کی روح کو پہچاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ ناچ اور یہ گیت عوام کے رنج و راحت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی مدد سے ہم عوام کی معاشرت اور ان کے رسم و رواج کی خوبیوں اور برائیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی روشنی میں اصلاحِ معاشرت کا کام بھی بہت آسان ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس لحاظ سے بھی مفید ہے کہ اس کے مطالعے سے نہ صرف پاکستان کے مختلف صوبوں کے لوگ اپنے عوام کے قریب آ سکتے ہیں بلکہ مختلف صوبوں کے عوام بھی ایک دوسرے کی روح سے زیادہ قرب حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر مؤلف نے تمام وہ حکایات بھی درج کر دی ہیں جو کسی ناچ یا گیت کا پس منظر یا اس کی اساس ہیں۔ بہتر ہوتا کہ خورشید صاحب ان گیتوں کے اردو

مصنف بھی اپنی کتاب میں شامل کر دیتے کیونکہ گیتوں میں جو مقامی بولیاں استعمال کی گئی ہیں، انہیں پاکستان کے ہر صوبے کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ دیہاتی شاعروں کی مقامی بولیوں کا سمجھنا تو خیر بڑی بات ہے ہمارے ہاں تو ایک ہی صوبے کی باقی اور شہری زبان میں بھی اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ شہری آبادی دیہاتی گیتوں کی بولی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتی۔

ایک اور کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ جہاں پنجاب کے لوک ناچوں اور لوک گیتوں کے متعلق اس میں کافی تفصیلات ملتی ہیں، وہاں پاکستان کے دوسرے صوبوں کے متعلق اس قسم کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ ان میں سے اکثر کے لوک گیت ہی درج کئے گئے ہیں۔ اس کا اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ پنجاب کے حصے کتاب کے کچھتر صفحے دیئے گئے ہیں لیکن پاکستان کے باقی چاروں صوبوں کو مجموعی طور پر صرف چوبیس صفحات دیئے گئے ہیں۔ گویا پنجاب کے حصے کے صفحوں کے مقابلے دوسرے صوبوں کے حصے میں اوسطاً صرف چھ چھ صفحے آئے۔ یہ قدرتی بات ہے کیونکہ خورشید صاحب خود صوبۂ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دوسرے صوبوں کے متعلق بھی ویسی ہی گہری واقفیت رکھیں جیسی انہیں پنجاب کے متعلق حاصل ہے۔ اس لحاظ سے بہتر یہ ہوتا کہ وہ اس کتاب کی تالیف میں پاکستان کے باقی صوبوں کے بھی کم از کم ایک ایک واقف کار ادیب کو شریک کر لیتے۔ پنجاب کے جن لوک ناچوں کا ذکر مؤلف نے کیا ہے وہ ہیں بھنگڑا، سمی، جھمر، لڈی، گدا اور کیکلی۔ ان ناچوں کے متعلق گیت بھی تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔ جیسا اوپر لکھا گیا ہے دوسرے صوبوں کے ناچوں اور گیتوں کا ذکر سرسری ہے یا صرف نام گنوا دیئے گئے ہیں۔ بہر حال موجودہ کتاب ایک بڑے کام کی ابتدا ہے ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ خورشید صاحب اسے آئندہ بہتر اور مکمل بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

بیکراں ایک اور نئی کتاب جو اس وقت میرے سامنے ہے جناب جگن ناتھ صاحب آزاد کا مجموعۂ کلام ہے، جسے بیکراں کے نام سے مکتبۂ شعر و ادب ... نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ اردو کے مشہور شاعر جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری نے لکھا ہے۔ بیکراں میں نظمیں بھی درج ہیں اور غزلیں بھی۔ آزاد کا قلم دونوں اصنافِ سخن میں یکساں روانی سے چلتا ہے۔ ذوقِ سخن اور اردو زبان کی محبت انہیں اپنے والد جناب تلوک چند صاحب محروم سے ملی ہے۔ وہ ان محبانِ اردو میں سے ہیں جن کی کوششیں اب ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا سہارا ہیں۔

آزاد کو حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے خاص عقیدت ہے چنانچہ ان کے کلام کا صفحۂ اول اقبال ہی کے اس قطعے سے مزین ہے:

سحر در شاخسارِ بوستانے — چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری — سرودے نالۂ آہے فغانے

بیکراں میں نالہ و رود کی کمی ہے، نہ نالہ و آہ و فغاں کی۔ آزاد ایک حساس نوجوان ہیں اور سچے شاعر۔ ان پر دنیا حسن و مسرت کا گہوارہ بھی ہے اور رنج و مصیبت کا گھر بھی۔ سچا شاعر زندگی کے دونوں پہلوؤں کا احساس ہوتا ہے۔ آزاد خود کہتے ہیں

دنیا ہے اک محفلِ عشرت، دنیا ہے اک غم خانہ — یوں بھی دل کا افسانہ ہے، یوں بھی دل کا افسانہ

آزاد کی شاعرانہ وسیع المشربی ملاحظہ ہو۔

کیونکر ہو مفقود رقابت شیخ و برہمن میں آخر — یہ بھی تیرا دیوانہ ہے وہ بھی تیرا دیوانہ

پھر کہتے ہیں۔

تو بھی اے آزاد جب انساں ہے فانی دنیا میں — بزم کی بزم ہے شمع کی شمع ہے پروانے کا پروانہ

جیسا پہلے بھی لکھا گیا ہے آزاد کو حضرت علامہ اقبال سے خاص عقیدت ہے۔ اس مجموعے میں ان کی نظم "آزاد و اقبال" اس بات کی گواہ ہے کہ وہ اقبال کو اپنا روحانی رہنما سمجھتے ہیں۔ اقبال کی رحلت پر انہوں نے "ماتم اقبال" کے عنوان سے جو پُر درد نوحہ لکھا اس کا آخری شعر بھی اسی عقیدت و ارادت کا آئینہ ہے شعر ہے ؎

ہے خاک میں وہ عرشِ معانی ہزار حیف
اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف

اسی نظم میں لکھتے ہیں ؎

گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا
تو شمع ہی کے عالمِ جاں میں سما گیا

"بیکراں" کی نظموں اور غزلوں کے ذکر میں اگر آزاد کی اس طویل پر اثر اور درد ناک نظم کو خراجِ عقیدت ادا نہ کیا جائے جو انہوں نے "شکنتلا" کے عنوان سے اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات کی یاد میں لکھی ہے، تو ایک بڑی ناانصافی ہو گی۔ ہماری شاعری میں شدتِ احساس کی اس سے بہتر تصویریں بہت کم ملیں گی۔ پوری نظم شدید درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ہے، مگر میں اس سے اقتباسات نقل کر کے شاعر سے ناانصافی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ خود "بیکراں" میں پوری نظم ملاحظہ فرمائیے۔

تاریخِ مثنویاتِ اردو

تیسری نئی کتاب ہے "تاریخ مثنویاتِ اردو" جو شرکتِ مصنفین لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کے مؤلف ہیں سید جمال الدین احمد جعفری۔

مثنوی ہیئت اور موضوع دونوں لحاظ سے اردو کی اصنافِ سخن میں ایک الگ چیز ہے۔ اس کے لئے چند بحریں بھی مخصوص کر دی گئی ہیں، اور یہ ابتدا سے قصے یا کہانی ہی کے بیان کیلئے وقف رہی ہے، اگرچہ متاخرین میں سے ایک آدھ بزرگ نے اسے نعتیہ مضامین کیلئے بھی استعمال کیا ہے۔

جیسا نام سے ظاہر ہے "تاریخ مثنویاتِ اردو" اس صنفِ سخن کی ایک ارتقائی تاریخ ہے۔ ضمناً مثنوی نگاروں کے حالات بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مؤلف نے جس مثنوی کا ذکر کیا ہے نہ صرف اس کی داستان کا خلاصہ چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے بلکہ اس میں سے کافی اشعار کے اقتباسات بھی درج کر دیئے ہیں۔ اس سے مثنوی کے موضوع اور اس کے عیب و ہنر کے متعلق پڑھنے والے کو اچھی خاصی واقفیت ہو جاتی ہے۔ مؤلف نے کتاب کی تالیف میں جو تحقیق اور محنت کی ہے اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اکثر مشہور مثنویوں کے متعلق اربابِ فن میں جو بحثیں ہوتی رہی ہیں ضمناً ان کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ گویا ساڑھے دو سو صفحے کی اس مختصر کتاب کو پڑھ کر ہم مشہور اردو مثنویوں اور مثنوی نگاروں کے متعلق اچھی خاصی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اصنافِ سخن کے انتخاب و تدوین کا یہ طریقہ طالب علموں کے لئے بہت مفید ہے۔ اگر اسی طرح مشہور قصیدوں اور مرثیوں وغیرہ کی تدوین بھی ہو جائے تو ایک بڑی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں صرف چند زیادہ مشہور مثنویوں کا ذکر ہے۔ مثنوی نگاروں کے نام شاید آپ بھی سننا چاہیں۔ ان میں ولی دکنی کے ہمعصر سراج اورنگ آبادی بھی ہیں اور ان کے علاوہ میر حسن، میر، جرأت، انشا، مصحفی، دیا شنکر نسیم، مومن، شوق، محسن کاکوروی، شوق قدوائی، تسلیم لکھنوی، امیر مینائی، داغ دہلوی اور دیگر حضرات بھی ہیں۔ [illegible] ان شاعروں کے علاوہ اور بھی بیسیوں شاعروں نے بڑی تعداد میں اچھی خاصی مثنویاں کہی ہیں، جن کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہوا۔ لیکن جہاں تک اس کتاب کے مقصد کا تعلق ہے اسے اس سے زیادہ تفصیل سے گراں بار بھی نہ ہونا چاہیئے تھا۔ پھر بھی میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کتاب کے آخر میں اگر چند صفحے کچھ مزید مثنویوں اور مثنوی نگاروں کی تاریخ وار فہرست کے اندراج کے لئے وقف کر دیئے جاتے، تو جہاں اس سے موجودہ کتاب کے قارئین کی طبیعتوں پر کوئی نا مناسب بوجھ نہ پڑتا، وہیں اولوالعزم محققین کو ایک ایسی کلید مل جاتی جس سے ان کا شوقِ فراواں بہت سے نئے باب کھول سکتا۔

حامد علی خاں

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمۃ
نے پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا

جلد [illegible] نمبر [illegible]

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور : اپریل ۱۹۵۰ء

سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
ایک پرچہ آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات نوائے وقت لمیٹڈ

The "Makhzan" Lahore

قندیل لاہور ، شاعر مشرق سے آخری ملاقات ، حضرت شیخ عبدالقادر علیہ الرحمہ
آہنگ کراچی ، آزاد کا سفر ایران ، آغا محمد باقر
ادبی دنیا لاہور ، غزل ، ندیم جعفری
نظام المشائخ کراچی ، شیخ عبدالقادر ، ملا واحدی
آجکل دہلی ، محرم بہار (نظم) ، جوش ملیح آبادی
ماہ نو کراچی ، غالب کا کلکتہ ، حمید احمد خاں ،
" " غزل ، آرزو لکھنوی
حجاب بھوپال ، فانی پر ایک نظر ، اسلام حسین
ایشیا بمبئی ، اکبر الہ آبادی کی تبلیغ حقائق ، ظ۔ انصاری

صفحۂ اوّل

چھ/اکیس اپریل کی [illegible] ملک بھر میں "یوم اقبال" منایا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کا تخیل پیدا کرنے والے عظیم انسان [illegible] کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ [illegible] کے احترام میں "مخزن" کی موجودہ اشاعت کے متعدد مضامین نظم و نثر علامہ اقبالؒ سے متعلق ہیں اس کے علاوہ "مخزن" کی [illegible] سرورق [illegible] بیعلامہ اقبالؒ کی [illegible] تصویر ہے جو موجودہ اشاعت کی زینت ہے۔ اس تصویر کے لئے ہم اپنے معزز دوست جناب [illegible] اقبالؒ کی یہ تصویر [illegible] ہی میں اب سے تقریباً چھیالیس سال قبل شائع ہوئی تھی۔

کچھ عرصہ گزرا ڈھاکہ سے علامہ اقبالؒ کے ایک امروہوی عقیدت مند نے حضرت شیخ عبدالقادر سے [illegible] "مخزن" یہ دریافت کیا تھا کہ علامہ اقبالؒ کے منظوم پیغام "عبدالقادر کے نام" کو شیخ صاحب نے کس طرح جامۂ عمل پہنایا۔ چونکہ شیخ صاحب قبلہ اس وقت [illegible] میں مبتلا تھے ہم شیخ صاحب [illegible] پیغام اُن تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ قومی زبان کی اہمیت سے واقف ہیں اور شیخ صاحب کی ان خدمات کا بھی علم رکھتے ہیں جو انھوں نے اردو زبان و ادب کا شوق پیدا کرنے کے لئے انجام دیں، وہ اس سوال کے جواب سے بھی بے خبر نہیں۔ تاہم یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمیں اپنے کرم فرما پروفیسر آغا صادق کے ذریعے سے اس سوال کا جواب خود شیخ عبدالقادر قبلہ کی زبانی بھی مل گیا۔ شیخ صاحب کے جواب کے الفاظ علامہ اقبالؒ کی تصویر کے نیچے شیخ صاحب کی تصویر کے ساتھ ہی درج ہیں۔ پروفیسر صاحب کا اصل مضمون جس سے یہ جواب نقل کیا گیا ہے مئی کے "مخزن" میں آپ ملاحظہ فرما سکیں گے۔

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمہ کی یاد میں بھارتیوں اور پاکستانیوں کی طرف سے مضامین نظمیں اور تعزیت کے پیغامات برابر وصول ہو رہے ہیں۔ ان میں سے چند اپریل کے "مخزن" میں درج ہیں۔ باقی آئندہ نکلتے رہیں گے۔

کچھ مدت قبل ہم نے اپنے فاضل مترجمین سے درخواست کی تھی کہ وہ مغربی زبانوں کے علاوہ مشرقی زبانوں کے ادب پر بھی توجہ مبذول کریں۔ اس وقت تک ہمیں عربی، فارسی اور ترکی مضامین نظم و نثر کے چند تراجم وصول ہو چکے ہیں جو "مخزن" میں اپنے اپنے وقت پر چھپتے رہیں گے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی، ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا مترجمہ ایرانی افسانہ ہے جو "ملاّ کی آپ بیتی" کے عنوان سے اشاعتِ زیرِ نظر میں طبع ہوا ہے۔ اپنے ہمسایہ ملکوں سے قرب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اُن کے موجودہ ادب سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہیئے۔

"مخزنِ جدید" میں اب سے پہلے ہم نے برِّ عظیم بھارت و پاکستان کے کسی شاعر کا فارسی کلام بوجوہ شائع نہیں کیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ بھارت کے نامور شاعر حضرت پنڈت جوش ملسیانی نے اس بارے میں اوّلیت کا امتیاز حاصل کیا ہے۔ اس اتفاق کو دلچسپ [illegible] بھارت کی اکثریت اور حکومت فارسی تو کیا، اُردو سے بھی محض اس لئے دست بردار ہو چکی ہے کہ اس میں فارسی عربی کی آمیزش ہے۔ ایک وہ [illegible] ہیں جو فارسی عربی کے تلفّظ تک سے اتنے بیزار ہیں کہ وہ اپنی سودیشی اُردو میں بھی اس کی بو پا کر اس سے تائب ہو رہے ہیں اور ایک یہ پنڈت جی ہیں کہ اب تک "سرورِ رفتہ" سے سرشار ہیں۔ شاید ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر کہا گیا تھا کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

★

شیخ عبدالقادر کی ذاتِ گرامی سے میرا قرب اس امر کا متقاضی تھا کہ انکی وفات کی خبر سے مجھے شدید صدمہ ہوتا لیکن آج صبح جب اخبار میں میں نے یہ خبر پڑھی تو میرے دل کی وہ کیفیت نہیں ہوئی جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوا کرتی ہے۔

میں ایک دوست کے ساتھ ایک ریستوران میں چائے پی رہا تھا کہ اچانک ایک خبر پر نگاہ پڑی ــــــ سر عبدالقادر انتقال فرما گئے ــــــ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "ایک شاندار، باوقار اور کامیاب زندگی آج اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی" اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دوست نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے اسے بتایا کہ ہمارا ایک سفینہ راں تمام زندگی اپنے فرض میں منہمک رہنے کے بعد آج ابدی نیند جا سویا ہے۔ اس زندگی پر جس قدر رشک کیا جائے کم ہے۔

شیخ عبدالقادر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں ہوئی جب آپ انجمنِ اسلام کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے راولپنڈی تشریف لائے۔ انجمن اسلام کے اس جلسہ میں والد کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ اجلاس میں شریک ہو گیا جب ہم پہنچے [illegible] نظم پڑھ رہے تھے۔ مجمع پر وجد کا عالم طاری تھا گویا کسی نے طلسم کر دیا ہو۔ والد جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو

حفیظ صاحب نے پڑھنا بند کر دیا، اور آواز دے کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ شیخ عبد القادر اٹھ کھڑے ہوئے، ایک قدم آگے بڑھے اور والد جب آگے بڑھے تو شیخ صاحب ان سے بغل گیر ہو کر ملے اور اپنے ساتھ ہی انھیں جگہ دی۔ یہ عبد القادر کی پہلی تصویر تھی جو میں نے دیکھی آج بھی جب شیخ صاحب کا خیال آتا ہے تو وہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

دوسری ملاقات ۱۹۳۰ء میں ہوئی جب کہ انجمن ادب راولپنڈی کے زیرِ اہتمام ہم لوگوں نے یوم اقبال منایا۔ شیخ عبد القادر سے ہم نے صدارت کی درخواست کی۔ آپ تشریف لائے اور دو دن گورڈن کالج اور ڈی۔ اے۔ وی کالج میں اجلاس کی صدارت فرما رہے۔

اس اجلاس کے کئی پروگرام تھے، ایک نشست میں بہت سے اصحاب نے اقبال کے سات سات پسندیدہ اشعار سنائے۔ یہ اقبال کی کتابوں میں سے شعر منتخب کیے تھے لیکن شیخ عبد القادر نے سات میں غالباً تین یا چار اشعار ایسے سنائے جو اقبال کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ ان میں سے ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے ؎

شب فرقت تصور تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا　　تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے[1]

اسی تقریر میں آپ نے "ہلال عید" کا ذکر کیا اور کہا کہ اقبال کا اصل مصرع یہ تھا

دردامن تو ماہ تمامے نہادہ اند

لیکن میرے مشورہ پر اسے انھوں نے "در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند" کر دیا تھا۔

اس کے دو سال بعد پھر والد کی معیت ہی میں لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت غالباً آپ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ اس ملاقات میں اقبال کی شاعری کے متعلق ہی زیادہ تر بات چیت ہوتی رہی۔

اس گفتگو میں شیخ صاحب نے اپنے متعلق ایک بات کہی جس سے ان کی اقدارِ زندگی پر بہت اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے کہا کہ دنیوی اعتبار سے خدا نے مجھے بہت عزتیں دی ہیں۔ میں وزیر ہند کی ایڈوائزری کونسل تک پہنچا ہوں۔ لیکن جب بھی دو چار احباب جمع ہو جاتے ہیں اور میرا ذکر ہوتا ہے تو اس کا تعلق نہ ایگزیکٹو کونسل کی ممبری سے ہوتا ہے نہ ہائی کورٹ کی ججی سے بلکہ میری زندگی کے اس دور سے جب کہ میں مخزن کو مرتب کرتا تھا۔ میں خود بھی اس دور کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی دور سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد لاہور میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات میں میں نے کہا بعض لوگ کہتے ہیں حفیظ جالندھری کی کامیابی کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ ایک ان کا ترنم اور دوسری آپ کی مربیانہ روش۔ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ بولے تمھارا کیا خیال ہے تم پہلے اپنی رائے ظاہر کرو۔ میں نے کہا میں تو اس خیال کو غلط سمجھتا ہوں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حفیظ ایک بڑا شاعر ہے اور اس کی شاعری میں اتنی جان ہے کہ وہ اپنے پروں سے اڑ سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا سکے۔ کہنے لگے تمھاری رائے

---

[1] یہ شعر اقبال کی ایک قدیم غزل کا ہے جو چھپی بھی تھی مگر بانگ درا میں شامل نہیں۔ اس کا ایک شعر یہ بھی تھا ؎ جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے۔ یہ غالباً اس عہد کی غزل ہے جب علامہ اقبال حضرت داغ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ "مخزن"

یہ جو تم نے لوگوں کی رائے کا ذکر کیا ہے یہ حفیظ کے حاسدوں اور مخالفوں کی رائے ہے۔ میں نے حفیظ کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ صر
یہ ہے کہ شاہنامۂ اسلام کا دیباچہ لکھا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ حفیظ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دے۔ دیباچے تو میں نے
بھی کئی شاعروں کے لئے لکھے ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو میرے دیباچے کی بدولت حفیظ کے مقام تک پہنچے ہیں۔

کچھ دن بعد راقم نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ "اقبال"[1] مرتب کیا اور دیباچے کے لئے شیخ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ان دنو
بہاولپور کے چیف جسٹس تھے۔ آپ نے بڑی محبت سے اس کتاب کا دیباچہ لکھا اور بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں میری کوشش کو سراہا۔

۱۹۴۶ء میں میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر پنجاب کے ایک روزنامہ اخبار کے عملہ میں شریک ہو گیا تھا۔ میرے ذمے اخبار کی نما
کے فرائض تھے اور میں مختلف موضوعات پر مختلف اشخاص سے خاص انٹرویو لیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک دن میں شیخ صاحب کی
میں حاضر ہوا۔ اور ان سے اخباری انداز کی بات چیت چھیڑی۔ یہ انٹرویو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اور چونکہ اس انٹرویو میں
صاحب کا کردار ایک نئے انداز سے ہمارے سامنے آتا ہے لہٰذا اسے میں ہو بہو یہاں درج کرتا ہوں:-

سیاسی موضوعات پر ملاقاتوں سے "فراو" کے طور پر نمائندۂ "جے ہند" شیخ سر عبدالقادر کے پاس پہنچا اور ان سے درخواست
کی کہ علم و ادب کے کسی ایسے پہلو پر روشنی ڈالیں جو آج تک منظرِ عام پر نہ آیا ہو۔ شیخ صاحب یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے
چپ ہو گئے۔ پھر بولے اس سوال کے جواب میں مختصر طور پر کیا کہا جا سکتا ہے۔ ادب کے کئی ایسے مسائل ہیں جن پر ابھی
تک کسی نے غور نہیں کیا۔ راقم نے کہا کہ مسائل پر بحث تو ایک مختلف چیز ہے۔ مجھے کسی اور چیز کی تلاش ہے۔

یعنی!"

مسٹر آصف علی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے پہلا مضمون آپ کے رسالے مخزن میں شائع
ہوا تھا تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کے ساتھ آپ کے مراسم بہت قدیمی ہیں۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ مولانا
کے متعلق ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے کہا "مسٹر آصف علی کا کہنا صحیح ہے۔ مولانا آزاد کا پہلا مضمون واقعی "مخزن" میں شائع ہوا تھا اور وہ مضمون بھی
ایک خاص ملاقات کا نتیجہ تھا جو کلکتہ میں ہوئی تھی۔"

راقم نے گزارش کی "تو پھر اسی ملاقات سے داستان کا آغاز فرمائیے۔" آپ نے کہا "ندوۃ العلماء کلکتہ کی ایک علمی اور
ادبی جماعت تھی۔ اس کی دعوت پر میں تقریریں کرنے کے لئے ۱۹۰۱ء میں کلکتہ گیا۔ مولانا ابوالکلام جن کی عمر اس وقت سولہ
یا سترہ برس کی ہوگی ان دنوں وہیں تھے۔ وہ اپنے بھائی ابوالنصر آہ کے ہمراہ جلسہ میں آئے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو میرے
پاس آئے اور تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے "آپ نے خوب لیکچر دیا۔" تقریر میں ایک بچے کی اتنی دلچسپی دیکھ کر میں اس

---

[1] یہ کتاب اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی اور گھر کے مال و متاع کے ساتھ فسادات کی نذر ہو گئی۔ (آزاد)

[2] یہ واقعہ شیخ صاحب قبلہ نے مدیر مخزن سے بھی بیان کیا تھا اور اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام سے اپنی (غالباً آخری) ملاقات کا دلچسپ حال لکھا

[illegible] کی جانب متوجہ ہوا اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مختصر سی گفتگو [illegible]
بچہ علم و ادب کی گود میں پرورش پا رہا ہے اور فلسفیانہ طبیعت رکھتا ہے۔ میں نے ان سے "مخزن" کے [illegible]
اس کے لئے مضمون لکھئے۔" جب ملاقات ختم ہوئی اور آزاد صاحب تشریف لے گئے تو مولانا عبدالرحمٰن [illegible]
ساتھ ہی پکار کر کہنے لگے: "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ایک لڑکے سے باتیں کرنے لگے۔" میں نے انہیں [illegible]
کی قابلیت اپنی عمر سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے میری بات کو قابل اعتماد نہ سمجھا۔ ان تو انھوں نے مضمون [illegible]
تھا۔ NEWS اور تشریح اس لفظ کی یوں کی گئی تھی کہ اسے NEWS اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں N, E, W, S
یعنی نارتھ، ایسٹ، ویسٹ اور ساؤتھ ہر طرف کی اطلاعات موجود ہوتی ہیں۔ خیال نیا تھا مجھے پسند آیا۔ مضمون مخزن
میں شائع ہوگیا۔

"میر غلام بھیک نیرنگ اس زمانہ میں مخزن کے ہر پرچے پر تنقید لکھ کر بھیجا کرتے تھے جب یہ مضمون ان کی نظر سے گزرا تو انھوں
نے لکھا کہ مجھے یہ مضمون مبتدیانہ معلوم ہوتا ہے مناسب یہ ہے کہ "مخزن" کو طلبہ کا تختۂ مشق نہ بنایا جائے "مخزن" میں فقط
معیاری مضامین شائع ہونے چاہئیں۔ میں نے جواب میں انھیں کلکتہ کی ملاقات کا بالتفصیل ذکر لکھ بھیجا اور مضمون کے
متعلق اپنی رائے ظاہر کی جو بالکل مختلف تھی لیکن وہ قائل نہ ہوئے۔ اس کے بعد مولانا نے امرتسر کے اخبار "وکیل" میں
مضمون لکھنے شروع کئے۔ "وکیل" کے ایڈیٹر شیخ غلام محمد تھے (بعد میں "وطن" کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ اس کے مدیر [illegible]
ان مضامین کے فوراً بعد مولانا پنجاب آئے اور پنجاب والوں کے ساتھ آپ کا رابطہ پیدا ہوا۔ ابتدا میں آپ کو انگریزی سے
واقفیت نہ تھی لیکن بعد میں اپنی محنت سے اس میں مہارت حاصل کر لی۔

مولانا علمی قابلیت آگرہ ہی سے لے کر چلے تھے مولانا شبلی مرحوم کی توجہ اور فیضِ صحبت نے ان کی مذہبی تحقیق کے جذبے کو ترقی دی
اور طرزِ تحریر میں خوبی اور تاثیر پیدا کر دی۔

"مخزن کے زمانہ میں جب میں نے اردو سبھا کی تحریک جاری کی تو مولانا نے مجھے چٹھی لکھی کہ میں اس تحریک کے ایک [illegible]
طور پر کام کروں گا۔ ان کا یہی ادبی ذوق تھا جو بعد میں "الہلال" "البلاغ" اور "ترجمان القرآن" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانپور
کے حادثہ نے آپ کی طبیعت کا رجحان نیشنلزم کی جانب کر دیا، اور آپ انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہوگئے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ مولانا کے ساتھ میرے مراسم آج بھی قائم ہیں اور
اگرچہ فاصلہ کے اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہیں لیکن اس مسافت سے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔
جب میاں افتخارالدین پنجاب کانگرس کے صدر تھے تو مولانا آزاد ہمیشہ ان کے ہاں قیام کیا کرتے [illegible] میاں صاحب
کی کانگرس سے علیحدگی کے ذرا قبل مولانا یہاں آئے تو حسبِ دستور ان کے ہاں ٹھہرے اور ان سے کہا کہ [illegible]
پہلے شیخ عبدالقادر کے ہاں لے چلئے چنانچہ وہ تشریف لائے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

[illegible] کے تعلق سے ہندی اردو کے جھگڑے کا ذکر آگیا آپ نے کہا کہ یہ جھگڑا ہمارا [illegible] پیدا کیا ہوا ہے۔ سب سے پہلے یو۔پی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے کے لئے اس [illegible] بعد میں یہ معاملہ ہندوستان گیر مسئلے کی صورت اختیار کر گیا اور آج ہماری بدقسمتی سے آزادی کی راہ [illegible] کی طرح یہ بھی ایک بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔"

ہندو مسلم جھگڑے کا ذکر آپ نے اس درد بھرے انداز سے کیا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب [illegible] صاحب نے چند مسدار لیڈروں کی طرح اس جھگڑے کا الزام ہندوؤں مسلمانوں کے سر نہ تھوپا بلکہ ایک کامل طبیب کی طرح [illegible] مرض کی تشخیص کی اور بتایا کہ اس سارے مرض کی جڑ غیر ملکی حکومت ہے۔

آپ نے اس سلسلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کا ذکر بھی کیا اور جب ہندوستان کے پر امن ماضی کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا ان کے دل کی کیفیت چہرے پر سمٹ آئی ہے۔

آپ کی یہ دلی تمنا تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی محبت اور مودت کا دور واپس آجائے افسوس کہ اُن کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی ان کی زندگی ہی میں پنجاب کی سرزمین پر انسانی لہو کا ایک دریا بہہ نکلا۔ اسی پنجاب کی سرزمین پر جہاں آپ نے علم و ادب کی متعدد زندگیاں عطا کی تھیں۔

اگست ۴۷ء کے حادثات سے آپ کس قدر متاثر ہوئے تھے اور انھیں آپ نے کس نگاہ سے دیکھا تھا اس کا اندازہ ایک خط مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

". . . . . . میں اگست میں اور ستمبر کے ایک حصہ تک شملہ میں تھا۔ ڈاک کی حالت ان دنوں خراب تھی یہیں پڑا رہا۔ میں واپس آیا تو آپ کا خط مجھے ملا مگر میں یہاں آکر بیمار ہو گیا۔ اب کچھ اچھا ہوں مگر ابھی زیر علاج۔ آپ کو اس وقت تک عزیزم آزاد کی خیریت معلوم ہو چکی ہوگی۔ یہاں سے تو سب لوگ ان دنوں چلے گئے تھے اور اب تک وہی حالت ہے۔ آپ بھی معلوم نہیں پنڈی میں ہیں یا نہیں۔ اگر کالج کھل گیا ہے اور آپ اس میں واپس آگئے ہیں تو مہربانی سے مجھے آزاد کی خیریت کی خبر بھیجیے۔ امید ہے اس اثنا میں وہ آپ سے ملے ہوں گے۔ کیا زمانہ آیا ہے اور ہمارے بدقسمت ملک پر کیا دور انتشار ہے۔ خدا دلوں کی حالت کو بدل دے اور پھر صلح و امن نصیب ہو۔ . . . . "

★

★

★

سید مقبول حسین احمدپوری

آہ عبدالقادر

حضرت شیخ عبدالقادر بانیٔ مخزن کی رحلت کی خبر معلوم کر کے دل کو زبردست دھکا سا لگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنا قرب عطا فرمائے اور ان کے قائم مقام کو جلد بھیجے تاکہ اردو کی دنیا آباد رہے۔

مقبول حسین احمدپوری

پاک دیس کے عبدالقادر تجھے میری آنکھوں انجانے ۔۔۔ ہنست آنن[2] سے رہتے تیار سدا ہر دل کو بڑھانے

لیکن اس ویاکل ہردے میں سدا رہے جانے پہچانے ۔۔۔ گونج رہے ہردے منڈل میں اُن کے منوہر شبد سہانے

چھوڑ کے یہ مٹی کی مایا، وہ بھی گئے بیکنٹھ بسانے

گونج رہے ہردے کی گپھا میں ان کے منوہر شبد سہانے ۔۔۔ دی شاباشی، پیٹھیں ٹھونکیں، دامے درمے کیں امدادیں

بہتیروں نے پائیں اُن سے، من مانی سب اپنی مرادیں

ہاں یہ سچ ہے جگ جیون میں اُن کو ملی انمول بڑائی ۔۔۔ بنی رہیں گی سخنوروں کے دلوں میں دائم اُن کی یادیں

پھر بھی انھوں نے وشو[1] ویاپی پریم لگن کس سے نہ لگائی؟ ۔۔۔ اپنے گنوں سے وہ پاکستان اور بھارت باہر بھی چھائے[3]

اُن کے سہایک میل میل نے اپنی جگہ کس دل میں نہ پائی؟ ۔۔۔ گونج رہے ہردے پردیش میں اُن کے منوہر شبد سہانے

۱ ہمہ گیر ۲ خندہ پیشانی ۳ شہرت پا گئے۔

قطعات

(۱)

سیاست خدمتِ جمہور باشد
ز تفریقِ خلائق دور باشد
نمی داند اگر ایں رازِ وحدت
فقط شورِ انا المنصور باشد

(۲)

بیا اے مشرقِ آزادیٔ ما
بیا اے باعثِ آبادیٔ ما
سر آمد یک زماں در انتظارت
ببیں حالِ دلِ فریادیٔ ما

(۳)

غلامی دشمنِ تاب و توانست
ز جورش ہمہ زباں محوِ فغانست
خریدارش مشو اے تاجِ دل
کہ ایں سودا سراسر ضرر زیانست

(۴)

غلامی شامتِ اعمال باشد
ازو قومے پریشاں حال باشد
پسندد آں کہ ایں افتادگی را
براہِ زندگی پامال باشد

جوش ملسیانی

[illegible]
(صدر شعبہ اردو و فارسی پنجاب یونیورسٹی)

فلرٹ

(افسانہ)

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی،

"ہیلو!"

"نعیم صاحب ہیں!؟"

"جی میں بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"آپ نے پہچانا نہیں؟"

"کون؟ مس عظیم!..... مس دردانہ عظیم!!"

"جی"

"فرمائیے؟"

"میں آپ کے دفتر میں آجاؤں؟"

"شوق سے۔ لیکن دھوپ بہت ہے: آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ آپ کو اگر کچھ پوچھنا ہے تو ٹیلیفون ہی پر پوچھ لیجیے"

"میرا خیال ہے بالمشافہ گفتگو کرنے سے صحیح اطلاع مل سکے گی۔ آپ کو یاد ہے نا: میں نے [illegible] ون سروس کمیشن کے [illegible] کے دفتر میں دیا تھا۔ اگر آپ پر بار نہیں تو میں اس کے متعلق ذاتی طور پر آپ سے مل کر کچھ مشورہ کرنا چاہتی تھی"

"دھوپ بہت ہے لیکن آپ تشریف لانا چاہیں تو شوق سے"

ٹیلیفون بند ہوگیا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی،

"ہیلو!"

"آپ نے پہچانا؟"

"شکریہ!"

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں اُس چائے کی لذت لے رہا ہوں جو اس دن آپ کے ساتھ پی تھی۔"

(قہقہہ) "تو یہ لذت اس قدر طویل بھی ہو سکتی ہے؟"

"جی!"

"آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں شام کو کچھ بھی نہیں کرتا۔ صرف بچوں کے پاس بیٹھتا ہوں۔"

"کون سے بچے؟"

"میرے اپنے بچے۔"

"آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"جی۔ اور سات بچے ہیں۔"

(اُداس آواز) "آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"یہ حقیقت ہے۔"

ٹیلیفون بند ہو گیا۔

گھنٹی:

"وردی"

"آج آپ نے فوراً پہچان لیا۔"

"اس وقت آپ ہی کا ٹیلی فون آتا ہے۔"

"ڈیڈی اور امی آج شام کو ڈرامیٹک کلب کا اسپیشل شو دیکھنے جا رہے ہیں جو صرف کلب کے ارکان اور ان کے خاندان کے لئے دکھایا جا رہا ہے۔ کہئے آپ بھی آنا پسند کریں گے؟ ان کا خیال تھا کہ ان کی طرف سے میں آپ کو دعوت دے دوں۔"

"کیا آپ بھی جا رہی ہیں؟"

"میں تو دیکھ آئی۔"

"تو پھر میرا جانا بے کار ہے۔"

"اگر آپ کو اس پر اصرار ہے تو میں بھی چلی چلوں گی۔"

"فدا کیپٹن رہے گی"

"شکریہ"

ٹیلیفون بند ہو گیا۔

"نہ جانے اس دن آپ کو کس قسم کا خلجان رہا۔ آپ کو لاکھ مرتبہ سمجھایا کہ ڈیڈی اور امی کو ایک اور جگہ ضروری مصروفیت آخری وقت پر یاد آگئی تھی اس لئے وہ شو میں نہ آسکے لیکن آپ تو ان کی خالی کرسیوں کا شکوہ آخری وقت تک کرتے رہے"

"نہیں خلجان وخلجان تو نہیں مجھے صرف اس بات کا افسوس رہا کہ میں ذاتی طور پر ان کا شکریہ ادا نہ کرسکا"

"خیر یہ کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کی طرف سے شکریہ ادا کر دیا تھا"

"نوازش"

"یہ بتائیے کہ یہ شو کیسا رہا! اس دن تو آپ شو کے بعد فوراً بھاگ گئے"

"اچھا تھا"

"آپ کو سب سے زیادہ کون سی لڑکی پسند آئی؟"

"آپ"

"میں!"

"جو میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی"

"آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ شو میں کون سی لڑکی پسند آئی؟"

"ریٹا"

"کیوں؟"

"ٹیلیفون پر اس کی توجیہ کرنا ذرا مشکل ہے"

"پھر آپ کب ملیں گے؟"

"جب آپ فرمائیں"

"میں ڈیڈی سے پوچھ کر آپ کو ٹیلیفون کروں گی"

"بہت بہتر"

"وردی میں بول رہا ہوں"

"جب تو آپ ٹیلی فون اٹھاتے ہی میری آواز پہچان لیتے ہیں۔"

"من اندازِ قدت را می‌شناسم۔"

"کیا کہا آپ نے؟"

"یہ فارسی کا ایک مصرع ہے۔"

"اور اس کا مطلب؟"

"یہ ملنے پر بتاؤں گا۔"

"آپ بہت سی باتیں ملنے پر ٹال دیتے ہیں۔"

"مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔"

"آپ کو تو ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے۔"

"میں نے تو حقیقت عرض کی ہے۔ آج خیام میں میرے ساتھ چائے پی لیجیے۔"

"اوں ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں باہر کم جاتی ہوں۔"

"اس کم میں سے ایک مرتبہ خیام میں بھی آ جائیے۔"

"آپ کو خیام ریستوران بہت پسند ہے۔"

"کچھ ہے تو۔"

"وجہ؟"

"یہ قصہ طویل ہے کسی فرصت پر اٹھا رکھیے۔"

"اچھا میں امی سے پوچھ کر آپ کو ٹیلی فون کر دوں گی۔"

"آپ نے تو پھر ٹیلی فون ہی نہ کیا۔"

"دروی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ امی سے پوچھ کر ٹیلی فون کر دوں گی۔ اور میں گزشتہ دو ہفتوں سے منتظر ہوں۔"

"تو کیا آپ سچ مچ منتظر رہے؟"

"عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال   صد سال می‌تواں بہ تمنا گریستن۔"

"آپ کو معلوم ہے میں فارسی نہیں جانتی۔"

"آپ تو پہیلیاں بجھواتے ہیں۔"

"اور جس کے لئے تم پہیلی بن جاؤ وہ کیا کرے؟"

"... اس کا حل تلاش کرے۔"

"شعلہ میں یہ کرشمہ برق میں یہ ادا   کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے؟"

"کیا کہا آپ نے؟"

"تم نے شعر تو یاد کر دی؟"

"اچھا سنئے، اس دن جاتے پر تو آپ نے عجیب سی بحث چھیڑ دی۔ اور کوئی حل بتائے بغیر چل دیں۔ کیا اپنے کسی ملک کے
رسنے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔"

"آپ کا اشارہ غالباً شادی کے مسئلہ کی طرف ہے۔"

"جی ہاں۔"

"تو وہ کوئی اتنا حل طلب مسئلہ تھا۔ میں نے آپ سے کہا تھا Make hay while the sun shines
حسن، جوانی، تصنع آمیز تہذیب کا ہلکا سا غازہ اور تعلیم۔ کیا یہ سب چیزیں شادی کرنے کے لئے کافی نہیں۔ ایسی لڑکی کو مزید انتظار نہ کرنا چاہیئے۔"

"گویا آپ مجھے بنا رہے تھے۔ اگر آپ کی رائے مان بھی لی جائے تو میرے سوال کا جواب کیا ہوگا؟"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی پسند ہو جو مجھے پسند بھی ہو اس کی تعلیم بھی اچھی ہو اور اس کے اطوار بھی پسندیدہ ہوں لیکن میں اسے
حاصل ہی نہ کر سکوں تو کیا کیا جائے؟"

"در اصل یہ تمہارے تخیل کا کرشمہ اور جذبات آفرینی کا طلسم ہے جس میں تم الجھ رہی ہو۔ جب ہم لندن پہنچتے ہیں تو ہمیں ایک دوست
پہلا مشورہ یہ دیتا ہے: "ایک بس کے پیچھے مت دوڑو۔ اور آجائے گی یہاں ہر پل اٹھی ہوئی ہے۔" میں کہتا ہوں "ایک لڑکی کے پیچھے مت
دوڑو، اور آجائے گی۔"

"اور آپ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک لڑکی کو آپ کا یہ مشورہ قبول کر لینا چاہیئے۔"

"بالکل۔"

"ذرا مشکل سی بات ہے۔"

"پھر کوئی آسان راستہ تلاش کر لو۔"

"آپ ہی تجویز کیجئے۔"

"کسی فرصت کے وقت۔"

"تو کب چلیں ؟"

"جب آپ پسند کریں"

"تو کب چلیں گے ؟"

"آئندہ ہفتے"

"کہاں ؟"

"نسرین باغ میں، شام کے چار بجے"

"چائے کا وقت ہوگا ؟"

"موبیج کو تڑ ریستوراں میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر چائے بھی پی لیں گے"

"آپ کو کون سا شعر زیادہ پسند ہے ؟

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلف مشکیں کی ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے (غالب)

یا گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی (حامد علی خاں)

"دردی اگر سچ پوچھتی ہو تو ان دونوں شعروں کا مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ غالب نے ماضی کی یاد کو اذیت انگیز لذت سے تعبیر کیا لیکن حامد علی خاں دماغ عطر پیراہن لئے ہوئے ۔۔۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے تیری زلفوں کی یاد میں ابھی تک نسرین باغ میں گھوم رہے ہیں کہو دونوں میں سے کون بہتر ہے ؟"

"نہ جانے آپ اتنی جلدی ذاتیات پر کیوں اتر آتے ہیں ؟"

"اس سے بات ذرا جلدی سمجھ میں آجاتی ہے"

"میں تو خاک بھی نہیں سمجھی !"

"تم کیوں سمجھو گی ! نسرین باغ، شام کا تھکا ماندہ سورج، موبیج کو تڑ ریستوراں میں بکھری ہوئی نہروں کے گرد بے فکروں کے گروہ اور کوئی کمبخت یقین دلانے میں مجھ کو کہ تم اس سارے مجمع میں سب سے زیادہ حسین وجمیل ہو۔ قدرت نے تم سے بہت فیاضانہ سلوک کیا ہے ۔ تم جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ اور لپکتا ہوا شعلہ ہے جو ہر پاس آنے والے کی متاع صبر و شکیب کو خاکستر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تم اگر یہ نہ کہ "پھولوں سے ابھی تک مری خوشبو نہیں جاتی" تو اور کیا سوچو گی"

"آپ نے اب پھر شروع کر دئیے۔ میرا تو دماغ دھندلا جاتا ہے"

"اور یہاں دل و دماغ دونوں دھندلائے جا رہے ہیں"

"اور ہونا آپ کو تو اس کا علاج کرنا چاہئے"

"وردی آج شام کو وادیٔ نیل میں ملوگی؟"

"یہ کس لئے!"

"بس تم سے یوں ہی ملنے کو جی چاہتا ہے۔"

"لیکن کل تو آپ مجھ سے ٹیلی فون پر بھی لیتے ہیں!"

"یہ صحیح ہے، لیکن میں تمھیں 'وادیٔ نیل' کے قہوہ خانے کی ان رنگین شمعوں میں دیکھنا چاہتا ہوں جو بجلی سے چلنے کے باوجود پرانی طرز کی ہیئت لئے ہوئے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمھارے کرمائی لباس پر وہ روشنی کیسی معلوم ہوتی ہے اور جب تم ادھر سے گزرتی ہو تو لوگوں کی نگاہیں بے تابانہ تمھاری طرف اٹھتی ہیں۔"

"تو گویا وادیٔ نیل کی تجربہ گاہ میں آپ مجھ پر تجربہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے آپ یہ بھی شرط لگا رہے ہیں کہ میں کرمائی رنگ کا لباس پہن کر آؤں۔"

"تمھیں کچھ اس پر اعتراض ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر چلی آنا۔ کھانا بھی وہیں کھالیں گے۔"

"بہتر۔ شکریہ۔"

"بھلا آپ کیا سمجھے؟"

"کچھ بھی نہیں وردی۔ شوقِ فضول وجرأتِ رندانہ کا فقدان۔"

"کیا مطلب؟"

"جان بوجھ کر انجان نہ بنو۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی۔"

"پھر مجھ سے کیا پوچھتی ہو میں کیا سمجھا۔"

"وہ اس لئے کہ آپ اس رات 'وادیٔ نیل' کے قہوہ خانہ میں کچھ کہتے کہتے رُک گئے تھے۔"

"تو تم یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ میں کیا سمجھ کر رک گیا تھا؟"

"جی۔"

"تم ایسے سوالات ٹیلی فون پر کیوں پوچھتی ہو؟ اس کے لئے اور کوئی موقع نہیں ہوتا؟"

"آپ کو ٹیلی فون پر جواب دینے میں کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر کہئے؟"

"سنو، ہوٹل کے ملحق کمرے میں جہاں دھندلائی ہوئی روشنی ہے وہاں اس کمرے کا پس منظر وہ دیوار پیش کرتی ہے جس پر ایک تصویر میں قاہرہ سے ملحق نشیبی زمین پر نیل خراماں خراماں بہہ رہا ہے۔ قاہرہ کے آدھے امریکی اور آدھے جرمن نمونے کے قریب کے مکانوں کے علاوہ اس تصویر میں دور کے فاصلہ پر اہرامِ مصر بھی نظر آ رہے ہیں۔ اور اس سڑک پر جو قاہرہ کو پورٹ سعید سے ملاتی ہے وہ کتنا خوبصورت گدھا جا رہا ہے۔ اس گدھے پر پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک حبشی سوار ہے جس کی جوانی لباس دریدہ کے دریچوں سے جھانک جھانک کر فلک کے کامنہ چڑاتی ہوئی کہتی ہے۔ ابھی تو میرے بازوؤں میں وہ کس بل ہے کہ تم جیسی ہزاروں آفتوں کو پیس کر رکھ دوں۔ ایک شام اس دیوار کے سامنے اور اس تصویر کے نیچے ایک مرد کے ساتھ ایک لڑکی آکر بیٹھ گئی۔ قہوہ خانہ کے ملازموں نے جلدی جلدی میز پر برتن چن دیئے لڑکی مرد سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟" مرد نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔" لڑکی کہربائی رنگ کا ریشمیں غرارہ سنبھالتی ہوئی پرے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مرد نے لپک کر اسے تھام لیا۔ اور پشت کی جانب سے جب اسے اپنے سینے سے لگایا تو لڑکی کہنے لگی مجھے چھوڑ دو۔ میں ایسے وحشی آدمی کے ساتھ قہوہ خانہ میں نہیں بیٹھنا چاہتی۔ مرد نے اسے ایک دفعہ پھر بھینچا تو اس کا کانپتا ہوا جسم لچک کر رہ گیا۔ مرد نے اس کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ سے اٹھاتے ہوئے کہا "میری طرف دیکھو!" لڑکی نے مرد کی طرف دیکھا تو مرد نے اپنا منہ جھکا دیا۔ لڑکی کا رنگ فق ہو گیا اور مرد نے اسے ایک ہاتھ سے تھام کر پھر نشست پر بٹھا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور لڑکی کے چہرے پر بہت دیر تک ہوائیاں اڑتی رہیں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔"

"بالکل یہی۔"

"دیکھئے میں نے کیسے آپ کی کہانی مکمل کر دی ہے۔"

"تو پھر تم اور کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کیا سمجھے؟"

"میں تمہیں جواب دے چکا ہوں، شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ کا فقدان۔"

"مجھ میں یا آپ میں؟"

"دونوں میں۔"

"آپ کہہ نہیں رہے تھے کہ جرأت انگیزی کے بغیر زندگی ایک بیکار سی بات ہے۔"

"کہی تو تھا میں نے۔"

"لیکن آپ اس پر عمل نہیں کر سکتے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ جانتے ہیں تصویر کے نیچے بیٹھنے والی لڑکی کس قسم کے آدمیوں کو پسند کرتی ہے۔"

"مجھے کیا معلوم۔"

"میں بتاؤں۔"

"بتاؤ۔"

"وہ ایک ایسے آدمی کو پسند کرتی ہے جو بہت گرانڈیل ہو جس کے ہاتھ اور پاؤں پہلوانوں کی طرح [illegible]۔ ایسا آدمی جو [illegible] ایسا آدمی جو اسے سینے سے چمٹانے کی بجائے ایک ہاتھ سے پکڑ کر ہوا میں اچھال دے اور جب وہ چیخیں مارتی ہوئی نیچے گرے تو [illegible] سے اوپر ہی تھام لے۔ اگر یہ آدمی شادی شدہ ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ لڑکی اسے اس کی محبوب بیوی سے چھین لینا چاہتی ہے اور اس طرح زبردستی چھین لینا چاہتی ہے کہ مرد اس لڑکی سے نفرت کرنے لگے۔ اتنی نفرت کہ وہ تنگ آکر اسے زدوکوب کرے۔ یہاں تک کہ لڑکی کی ہچکیاں بندھ جائیں اور اس کے رخساروں اور ہونٹوں سے خون بہنے لگے۔ پھر مرد بچے کی طرح شدید احساسِ ندامت سے اسی لڑکی کے سامنے اپنی حماقت پر تاسف کا اظہار کرے۔ اس وقت لڑکی دونوں ہاتھوں سے اسے تھام کر اس کے دل پر مکمل قبضہ جما سکتی ہے۔ لڑکی کے چہرے پر ایمان اٹھتی دیکھ کر دل تھام کے رہ جانا بے کاری زندگی کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔"

"آپ نے وہ شعر سنا ہے؟

بھاگ آتشیں رخوں کی صحبت سے دور بھاگ   شعلہ بھڑک اٹھا تو بجھایا نہ جائے گا۔"

"یہ شعر اور اس کا شاعر دونوں جرأت آمیز زندگی کی لذت سے ناآشنا تھے۔"

"تو آپ نے کچھ فیصلہ کیا؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔"

"دیکھئے میں نے اس دن چائے پر آپ سے عرض کیا تھا کہ مجھے پہیلیاں بوجھنے میں کوئی خاص لطف نہیں آتا۔ اس چائے سے یاد آیا کہ آپ شیلا اور اس کے خاوند کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ہماری میز پر اٹھ کر کیوں آ گئے۔ ممی کا تو خیال تھا کہ آپ بڑے خوش اخلاق ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ آپ بڑے [illegible] ہیں۔ کیونکہ پھر میں آپ سے پوچھتی ہی رہی کہ آپ کب جائیں گے تو آپ یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ یہ فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے۔ گویا آپ کے سامنے ایک بڑا معمہ تھا جو آپ حل نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کی مسکراہٹ سے میں [illegible]

وہ بھی شاید لڑکا نے کچھ ہی نہ چاہتا تھا، پھر سوچا کہ شاید آپ مذاق کر رہے ہوں اور اب آپ سے میں نے پھر پوچھا ہے کہ آپ نے کچھ فقط
آپھر آپ نے اُلٹی سیدھی سنانا شروع کر دیں . . . . ."

"اور دل کسی کی بات بھی سنو گی یا اپنی ہی کہتی جاؤ گی۔ یقین جانو کہ میں ایک مدت سے "تیر نیم کش" سے گھائل ہونے کا عادی ہوں۔

"دیکھئے پھر وہی بات . . . ."

"اچھا تو سنو تمہیں گناہِ بے لذت میں کوئی مزہ آتا ہے ؟"

"کیا مطلب آپ کا ؟"

"میں کہتا ہوں جب میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے تو ایک دوسرے سے ملنے کا فائدہ ؟"

"آپ کیا فائدہ ڈھونڈتے ہیں ؟"

"جو تم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔"

"آپ بڑے خود غرض ہیں !"

"شاید درست ہو۔ اگر الزام ہے تو غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں کہتی ہوں کہ یہ حقیقت ہے اور ایسی حقیقت ہے جسے نہ آپ جھٹلا سکتے ہیں نہ کوئی اور مرد۔ ہر مرد ایک غرض کے تحت لڑکیوں سے تعلقات پیدا کرتا ہے۔ اور اگر یہ غرض پوری نہ ہو تو جھنجھلا اٹھتا ہے۔ کبھی اسے گناہِ بے لذت قرار دیتا ہے اور کبھی خوشامد کرنے کے بہانے سے تیر نیم کش کو یاد کرتا ہے . . . . . ."

وہ کچھ اور بھی کہتی رہی لیکن میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ "نعیم"

(محمد باقر)

بائرن

ہمارا وہ نیم شبی گشت اب ہمیشہ کو ختم ہوا،
اگرچہ چاند ویسا ہی تابناک ہو،
اور دل ویسا ہی دیوانہ

کیونکہ تلوار جیسے پہلے ہی بیکار ہو جاتی ہے،
اور جسم روح کا ساتھ نہیں دے سکتا،
اسی طرح دل بھی سستانا چاہتا ہے
بلکہ محبت کو بھی آرام کی ضرورت ہے،

اگرچہ رات محبت کے لئے بنی ہے،
اور دن بہت جلد لوٹ آتا ہے،
تاہم اب کبھی چاندنی راتوں میں ہم گشت کے لئے نہیں نکلیں گے۔

اپریل ۱۹۵۰ء

ذوقِ نظر

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن　　　خیزد از سینائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر　　　فطرت از افسونِ او محبوب تر

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن　　　جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے　　　یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

خودی بلند تھی اُس خوں گرفتہ چینی کی　　　کہا غریب نے جلاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر　　　ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیٔ شمشیر

اسی نگاہ میں ہے قاہری و جباری　　　اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی
نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو　　　ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

پروفیسر دلشاد کلانچوی بہاولپوری

اقبالؒ، اُن کا شکوہ اور جوابِ شکوہ

ہندی مسلمانوں کے علمی، ادبی اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی انحطاط اور سارے ہندوستان کی "انگریز غلامی" کی ابتدا اٹھارہویں عیسوی صدی میں ہوتی ہے اور انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہی زمانہ انگریزی سامراج کے عروج کا زمانہ ہے اس وقت غلامی کی بیڑیاں پہننے اور غلامی کی موت مرنے سے پہلے سارا ہندوستان ایک سنبھالا لیتا ہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء ہندوستانی سیاسی و معاشرتی زندگی میں ایک ایسا موڑ ثابت ہوتا ہے جہاں سے ہندوستانی آزادی کی راہ ایک واضح سمت اختیار کرتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے قریب ملت اسلامیہ ہندیہ قعرِ ذلت میں گر چکی تھی علمائے اسلام زمانے کی مصلحتوں اور وقت کی ضرورتوں سے ناواقف، امرائے اسلام اپنے دنیوی جاہ و جلال میں مست و بے پروا اور غربائے اسلام مفلسی اور غلامی در غلامی کی جکڑبندیوں میں مقید۔ اس دورِ انحطاط و نکبت میں مسلمانوں میں سے چند مفکر اور صاحب قلم و بیان سامنے آتے ہیں وہ اپنی تحریروں، تقریروں اور تحریکوں سے اپنی غافل و بے حس قوم کو جھنجھوڑتے ہیں۔ ایسے حضرات میں سید احمد خاں، شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد، وقار الملک، محسن الملک وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مولانا حالی پہلے ہی سے ایک نئے دبستانِ فکر کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مگر مذکورہ سال میں انھوں نے اپنی طویل نظم مسدس مد و جزرِ اسلام لکھ کر اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ مسدسِ حالی اسلام کی شان دار روایات، مسلمانوں کے دورِ انحطاط کے اندوہناک حالات اور آخر میں مسلمانوں سے کمرِ ہمت باندھنے کی پرزور درخواست کا روح افزا مرقع ہے اور بقول رام بابو سکسینہ ایک الہامی کتاب ہے۔ حالی کے علاوہ شبلی اور اکبر الہ آبادی کی طنز و تنقید نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ دیا۔ آزاد اور اسماعیل میرٹھی کی نظموں نے اس میں حب الوطنی کی حس بیدار کی۔ سرسید اور وقار الملک کی سیاسی سرگرمیوں نے اس میں روحِ آزادی پھونکی۔ دیوبند کے مدرسے اور علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم اور ندوۃ العلما جیسے اداروں نے مسلمانوں کی علمی، ذہنی، فکری اور مذہبی روایات کو زندہ رکھنے کی کوششیں کیں۔ اور اس طرح ہند کی مسلمان قوم برائے نام رینگنے اور آگے بڑھنے لگتی ہے۔ یہ حالت بیسویں صدی کے آغاز تک کسی نہ کسی صورت قائم رہتی ہے۔

بیسویں صدی کا آغاز مسلمانانِ عالم کے لئے ہزاروں آزمائشوں کا پیش خیمہ بنتا ہے مسلمان حکومت سے محروم ہو چکے تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان سے مذہبی روح کی سی آخری نعمت بھی چھین لی گئی تھی مسلمانوں کے قلوب نت نئے صدموں سے چھلنی ہوتے جاتے تھے۔ وطنی اور غیر وطنی دشمنوں کی یورشیں ان کے حوصلے پست کر رہی تھیں، ویسے بھی تمام دنیا مادیت، الحاد، تشکک، اور انکار کی لعنتوں میں گرفتار ہو چکی تھی، ملوکیت، قدیم حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید کر رہی تھی کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس سے بڑھ کر کوئی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ عالم قرونِ

قوم اور کمزور قوموں کے اخلاق، مذہب، معاشرت، ادب اور اقتصادیات پر خوب تسلط جما لیا تھا۔ اس پر ان میں تفرقہ ڈال کر ملتوں اور جمعیتوں کو آپس کی خوں ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر رکھا تھا تاکہ وہ غلامی اور انحطاط کی ایذاؤں سے مدہوش اور غافل رہیں اور ان کا استعمار کی چپ چاپ ان کا لہو چوستی رہے۔

ایسے وقت اور ایسے ماحول میں اور گری پستیوں میں ایک دفعہ گر چکنے کے بعد ملتِ اسلامیہ کو ایک بار پھر بیدار کر کے اسلاف کے کارنامے یاد دلانے اور قوم کو ایک ایسے فرد کی ضرورت تھی جو زندگی کے مسائل مسلمانوں کے سامنے کھول کر بیان کرتا، جو انھیں حقائق اور معارف سے روشناس کرا سکتا، جو نئی پود کے نوجوان مسلمان کے ذہن پر اسلامی اثرات ثبت کر سکتا، جو متزلزل ذہنیتوں کو کچھ ایسے جھٹکے دے سکتا کہ وہ گمراہی اور ضلالت کی طرف اسے جانے سے رک جائیں۔ برق و دخان کی کارفرمائی اور زمان و مکان کی تسخیر کے زمانہ میں سب سے بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی اسلام کی برتری اور فوقیت کو مسلمانوں پر ثابت کر کے بتا سکتا کہ اسلام ہی ایک ایسا نظام فکر ہے جو دنیا کو سکون و راحت کی نعمت بخش سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کو ایک پیغام بر کی ضرورت تھی، ایک فلاسفر کی، ایک قومی شاعر کی، ایک حدی خواں کی ضرورت تھی۔

بیسویں صدی کے عین آغاز میں اقبال ایک فلسفی، پیغام بر اور ایک قومی حدی خواں بن کر اسٹیج پر آتا ہے اور ایک پُرخلوص اور پُرجوش پیغام پیش کرتا ہے۔ اسلاف کے شاندار ماضی کو اجاگر کرنے، مسلمانانِ ہند و عالم کو بیدار کرنے اور نوجوانانِ ملت میں شجاعت کا احساس اور خودداری پیدا کرنے کے گیت گاتا ہے۔ اقبال کا دل اسلام کے درد سے لبریز تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عاشقِ رسول تھا۔ اس کا باطن ظاہری و معنوی طور پر اسلام کی تعلیم سے منور تھا۔ اس نے لندن سے بیرسٹری اور جرمنی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی مگر ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا پٹہ اس کے لئے باعثِ ہزار فخر و مباہات تھا۔ اسلام اور اسلام کے رسول سے اس کی وفاداری کا یہ کم ثبوت نہیں کہ اس نے اپنے فکر و حیات کو اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ آخری دنوں میں تو اقبال اسلامیات کی روح بن کر رہ گیا تھا اور اس کی ہستی بجائے خود ایک بلند نصب العین کا عشق بن کر رہ گئی تھی۔

چونکہ اقبال اخوتِ ملی کے پیغام بر، قرونِ اولیٰ کی اسلامی عظمت کے زوال کے اسباب شناس اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے۔ اس لئے یارانِ طریقت اور اربابِ ذوق نے انھیں مجبور کیا کہ وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں کے لئے کچھ نہ کچھ کہا کریں۔ ان دنوں انجمن مذکور پنجاب میں ملتِ اسلامیہ کی تنہا نمائندہ جماعت تھی۔ اور اس کے جلسے علمی و ادبی میلے کی حیثیت رکھتے تھے جن میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، ارشد گورگانی، ابو الکلام آزاد، حشر کاشمیری اور سلیمان سیوہاروی وغیرہ جیسے سحر بیان خطیب اور بلند پایہ شاعر شرکت کرتے تھے۔ اس طرح پبلک میں اقبال کی شاعری کا آغاز انجمن کے پندرھویں سالانہ اجلاس ۱۸۹۹ء سے ہوتا ہے۔ جب کہ انھوں نے سب سے پہلی بار انجمن کے سالانہ جلسہ میں اپنی مؤثر اور مشہور نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ یہ نظم تسلسل، گہرائی، پرجوش طرزِ بیان، حقیقی جذبات اور فراوانیِ خیالات کے لحاظ سے اس قدر مقبول ہوئی کہ یتیم خانہ انجمن حمایت اسلام کے لئے چندے کی بارش ہونے لگی۔ چنانچہ اس کامیابی کے بعد اقبال اب اہتمام سے انجمن کے جلسوں کے لئے نظمیں لکھنے لگے۔ فریادِ امت، دردِ دل، فریادِ امت، بنا سوال، ترانہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں بھی انجمن ہی کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۸ء تک ختم ہو جاتا ہے اور ۱۹۰۸ء سے تیسرے اور آخری دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں اردو نظمیں بہت سی ہوئیں اور بہت خوب ہوئیں خصوصاً ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۱۱ء تک اقبال نے قومیت اور حب ملی سے بھری ہوئی بہترین نظمیں لکھیں جن میں شکوہ، جواب شکوہ، ترانۂ ملی، خضر راہ، طلوع اسلام وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور کے آغاز میں اقبال نے اپنی مشہور و معروف نظم "شکوہ" انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۰۹ء میں پیش کی اور عوام و خواص سے خراج تحسین حاصل کیا۔ شکوہ میں اقبال نے شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ اور مصائب کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر میں شاعر خدا سے التجا کرتا ہے کہ اے خدا! آج کو مسلمانوں کے سینے شرر آباد نہیں ہیں کوئی تیرے دیوانے تجھ سے آس لگائے بیٹھے ہیں ان کو ذوق خود افروزی دے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

شاعر کی اس التجا کا، اس شکوہ کا جواب تیار ہوتے دو سال لگ جاتے ہیں۔ مسلمانانِ عالم کے لئے یہ دو سال نہایت کٹھن اور صبر آزما ثابت ہوتے ہیں۔ بلقان کی جنگ اور طرابلس کی لڑائیاں مسلمانوں کا رہا سہا وقار بھی ختم کر دیتی ہیں۔ خلافت اسلامیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے کو ہوتا ہے۔ اطالیہ نے ترکی سے طرابلس کا علاقہ چھین لیا ہے۔ ابھی یہ زخم تازہ ہی ہوتا ہے کہ بلقان کی عیسائی ریاستیں جو ترکی کے ماتحت تھیں بغاوت کر دیتی ہیں۔ سب شاہانِ یورپ اطالیہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ مظلوم ترکی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اپنے بھی دشمنوں سے مل گئے تھے۔ شریف مکہ بیت المقدس کے عیسائیوں کے قبضہ میں چلے جانے پر خوشیاں منا رہا ہے۔ عراق کے عرب ذوق و شوق سے انگریزوں کو مدعو کر کے ترکوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ شام کے مسلمان غیر حملہ آوروں کے مدد و معاون بنتے ہیں۔ ہندوستان، بلوچستان، سرحدی صوبہ کے لاکھوں مسلمان ترکوں اور خلافت کی قوت مٹانے کے لئے برٹش جھنڈے کے نیچے میدان جنگ میں مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں۔ مسلمان بھائیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور انھیں انگریز اور یورپین اقوام کے مقابلہ میں شکست دلا کر انھیں ان کا غلام اور قیدی بناتے ہیں اور بیت المقدس اور شام کو مسلمانوں سے چھین کر انگریزوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

۱۹۱۲ء کے سال مسلمانانِ عالم کی تاریخ کا ایک نیا باب کھولتے ہیں۔ ہندوستان کے چند مخیر مسلمانوں کو اپنی پستی کا شدید احساس ہوتا ہے اور ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو جنگ بلقان میں مسلمانوں کو امداد دینے کی غرض سے لاہور میں موچی دروازہ کے باہر ایک پرجوش جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ اس جلسہ کا انتظام مولوی ظفر علی خاں کے ہاتھ میں تھا۔ آغا حشر کاشمیری بھی شریک جلسہ ہوئے اور علامہ اقبال بھی۔ اقبال حالیہ واقعات سے پوری طرح واقف اور صد درجہ متاثر تھے۔ خدا سے شکوہ کرنے والا شاعر اب اپنی قوم سے شاکی تھا۔ وہ اپنے شکوے کا جواب پا چکا تھا۔ یہ جواب شکوہ مسلمانوں کے اس عظیم الشان جلسہ میں سنایا گیا۔ اس کی مقبولیت اور تاثر کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جلسہ میں پہلے پہل نظم مذکور کی رونمائی کی جاتی ہے۔ اس کے اوراق مختلف اصحاب بڑی بڑی قیمتوں پر خریدتے ہیں پھر اسی جلسہ میں اس کی سیکڑوں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ زر کثیر جمع ہوتا ہے اور یہ سب روپیہ بلقان فنڈ میں دے دیا جاتا ہے۔

اقبال کا شکوہ عالم بالا کو ورطۂ حیرت میں ڈال چکا تھا۔ خود خدا اپنے محبوب شاعر کے شکوے سے متاثر تھا۔ جواب شکوہ میں خدا کے الفاظ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اگر شکوہ کی شکایت سے بچا جائے تو دونوں نظمیں اقبال کی حماسیہ پُر اثر نظموں سے کم نہیں۔ مسلمانوں کی فتح مندی اور جرأت کا ذکر ملاحظہ ہو۔

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے ۔۔۔ مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے

کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے ۔۔۔ اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اقبال کا ایک اور بند ملاحظہ ہو۔

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ۔۔۔ ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے ۔۔۔ اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں

اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

شکوہ اور جواب شکوہ تشبیہوں اور استعاروں کا بھی ایک شگفتہ گلدستہ ہیں، ملاحظہ ہو۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن ۔۔۔ کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن ۔۔۔ اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک

اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

زورِ خطابت ملاحظہ ہو۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے ۔۔۔ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے ۔۔۔ تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں

ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

جوابِ شکوہ میں شاعر کا زورِ بیان ملاحظہ ہو۔

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی ۔۔۔ برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی

حضرت اثر صہبائی

تجلیات

سوئے حریمِ دوست چلے جا رہے ہیں ہم — خورشید و ماہتاب کو شرما رہے ہیں ہم

غرقِ نشاطِ دل ہے نظر غرقِ رنگ و نور — ہر سمت مشکبار تجھے پا رہے ہیں ہم

گم ہو کے بحرِ نور میں مانندِ موجِ نور — اک عالمِ سرور میں لہرا رہے ہیں ہم

رقصاں ہے سازِ دل ترے مضرابِ حسن سے — نغموں کے پھول بزم پہ برسا رہے ہیں ہم

ہر سانس میں ہے تیری ہی خوشبو بسی ہوئی — پہنائے کائنات کو مہکا رہے ہیں ہم

اک شادماں سرود ہے! ایک جاوداں سرور! — اے عشق! کس مقام پر اب آ رہے ہیں ہم

یہ کس کے آستاں پہ ہے اپنی جبیں اثر
بامِ فلک کو زیرِ قدم پا رہے ہیں ہم

تابش دہلوی

غزل

ی تجسّس مری تمنّا کبھی حقیقت کبھی فسانہ
[illegible] تو سربستہ رازِ ہستی، کھلے تو ہے سرِ زمانہ

خدا کرے اہلِ باغ کو بھی ہوائے سیرِ [illegible] آئے
نئی نئی عشرتِ رہائی نیا نیا ذوقِ آشیانہ

نہ [illegible] کی کیا شکایت جنوں کا خود بھی ہے اب یہ عالم
بی تمنّا غمِ محبت، کبھی تمنّا غمِ زمانہ

مری نگاہوں میں اس سے بڑھ کر نہیں ہے کچھ اعتبارِ منزل
کہ نارسائی کو چاہیے تھا رہِ طلب میں کوئی بہانہ

نہ کوئی آنسو نہ کوئی نالہ، غمِ محبت کسے سناؤں؟
نہ کوئی افسانہ زیرِ عنواں، نہ کوئی عنواں سرِ فسانہ

خفا ہیں صیّاد و باغباں کیوں مجھے یقیں ہے [illegible]
نہ اپنی پرواز ہے چمن تک نہ شاخ شاخ اپنا آشیانہ

مرا طریقِ نیاز مندی الگ ہے سارے جہاں سے تابش
وہاں ہے ذوقِ سجود مجھ کو جہاں جبیں ہے نہ آستانہ

ملّا کی آپ بیتی

(ایک ایرانی افسانہ)[1]

اس بندۂ حقیر کا نام ملّا قربان علی ہے۔ ذکر سید الشہداء میرا کام ہے۔ میں نے یہ پیشہ کب اختیار کیا؟ ٹھیک یاد نہیں۔ میری تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں۔ اگر میں اپنے وطن مسکن اسد آباد کو، جو صوبہ ہمدان میں واقع ہے، واپس جا سکوں تو تاریخ پیدائش معلوم ہو سکتی ہے کیونکہ والد مرحوم نے (خدا انہیں غریقِ رحمت کرے) اپنے ہاتھ سے کتاب زاد المعاد کی پشت پر میری تاریخ پیدائش اور وقت تحریر کیا تھا۔ لیکن اگر اپنے گھر واپس پہنچ بھی جاؤں تو امید نہیں ہے کہ وہ کتاب مل سکے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرے نالائق بھائی نے اسے بھی فروخت کر کے اپنی شراب خوری اور آوارہ گردیوں کی نذر کر دیا ہوگا۔ میری عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ آہ عمر کس قدر گریز پا ہے۔ میری سپید داڑھی پر نہ جائیے۔ غم دنیا اور دین کا منشا یہی ہے۔ غم و اندوہ تو سیاہ چشم کو بھی سپید کر ڈالتے ہیں۔ آہ افسوس! آجکل لوگوں نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگ ایمان دار رہتے۔ خدا سے ڈرتے تھے۔ ایک یہ بھی زمانہ ہے کہ کفر نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مرد اپنی داڑھی منڈوانے کے علاوہ اپنی وضع قطع عورتوں کی سی بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور عورتیں مرد بننے کی کوشش میں اپنا تمام وقت صرف کر دیتی ہیں۔ خدا ان جھگڑالو عورتوں کو غارت کرے، ادھر گرانی مارے ڈالتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ نان تنوری[2] ساڑھے سات پیسہ من کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ اور پندرہ روپے کمانے والا آدمی چار بیویوں اور ان کی اولاد کا خرچ بآسانی اٹھا سکتا تھا۔ ایک یہ زمانہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی چڑھتی ہوئی قیمتوں نے حواس باختہ کر دیا ہے اور عورتوں کے پھوہڑپن سے ان کے خاوند بھی بدحواس ہیں۔۔۔ لیکن مجھے اوروں سے کیا۔ میں تو اس جیل خانہ میں پڑے پڑے سڑ گیا ہوں اور نہ جانے کب تک پڑا رہوں، کاش خدا مجھے موت دے دے تاکہ میری جان ان مصائب سے چھٹکارا پائے۔ پھر بھی پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے وہ جس حال میں بھی رکھے انسان کو راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔ ہاں صاحب تو ایک سفر میں جب کہ میں اپنی والدہ کی میت مشہد مقدس میں دفن کر کے لوٹ رہا تھا تہران پہنچنے تک میرے تمام پیسے خرچ ہو گئے۔ مجبوراً وہیں تہران میں ٹھہر گیا۔ اور ایک اصفہانی ذاکر کے ہاں ملازمت کر لی۔ رفتہ رفتہ میں نے خود بھی ذاکری کا کام شروع کر دیا۔ چونکہ اہلِ بیت کی برکت سے میری آواز پرسوز تھی، میرا کام چل نکلا۔ وہ ذاکر جن کے پاس میں نے ملازمت کر لی تھی وہ خدا کو پیارے ہو گئے اور میں نے ان کی بیوہ سے جو ایک پاکیزہ اخلاق رکھنے والی باعصمت خاتون تھیں، شادی کر لی۔ اس خاتون کے پاس اپنا

---

[1] کتاب ترجمہ درد دل ملّا قربان علی از یکی بود یکی نبود مجموعۂ افسانہ جات نگاشتۂ سید محمد علی جمال زادہ۔

[2] ایران میں گھروں میں روٹی پکانے کا رواج نہیں ہے۔ روٹی نانبائی کے ہاں سے خریدی جاتی ہے۔ جو تُل کر بکتی ہے۔

پڑھنے کا [illegible] ہے۔ جو حاجی صاحب نے اپنی لڑکی کو اپنے ہاتھ سے مجھے دینے کی ہدایت کی ہے۔ میں نے روپے لینے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے لیکن میرے ہاتھ کانپ گئے اور روپے میرے ہاتھوں سے باغیچہ[1] میں گر پڑے۔ لڑکی روپے[2] اٹھانے کے لئے نیچے جھکی اور اس کی چادر گلاب کی جھاڑی سے الجھ کر سر سے گر پڑی۔ اور وہ ۔۔ واہ اللہ میرے سر پر خاک، کھلی ہوئی خود رو جیسے گلاب کی طرح سرخ تمتماتے ہوئے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپانے لگی۔ میری نگاہیں اس کے برق پاش جمال کی تاب نہ لا سکیں۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اور میں روپوں کا انتظار کئے بغیر سرعت کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا لیکن دروازے کے باہر چبوترے پر ٹیک لگا کر دیر تک اپنی خراب حالت کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ جیسے ہی میری حالت کچھ بہتر ہوئی گھر کو روانہ ہو گیا۔ حالانکہ جمعہ کا دن تھا اور مجھے کئی مجالس پڑھنی تھیں میری بیوی نے (خدا حشر کے دن حضرت فاطمہ کے دامن میں اسے پناہ دے) میری حالت غیر دیکھی تو کہنے لگی کہ شاید تمہیں سردی لگی ہے اور میرے لئے قہوہ بنانے لگی۔ لیکن میری طبیعت قابو میں نہیں آئی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے رہ رہ کر حاجی کے گھر کے باغیچے، گلاب کے پودے اور اس حسینہ کے کھلے ہوئے گیسوؤں کا خیال آجاتا تھا۔ میں سوچنے لگا یہ سب شیطان لعین کا پیدا کردہ وسوسہ ہے جو چاہتا ہے کہ مجھ ذاکر اہل بیت کی توجہ ذکر امام سے ہٹا دے تاکہ میں اس جمعہ کی رات کو جو رحمت الٰہی کے نزول کا دن ہے حضرت علی کے فرزند شہید کا ذکر نہ کر سکوں۔ میں شیطان پر خدا کی لعنت بھیجنے لگا مگر کوئی بات نہ بنی۔

میں نے اپنی بیوی سے پوچھا: "تم حاجی کی بیوی کو پہچانتی ہو؟"

اس نے کہا: "دو تین ماہ ہوئے حاجی کے ہاں مجلسِ فاتحہ تھی، میں حقِ ہمسائیگی ادا کرنے کے خیال سے اس کے ہاں گئی تھی۔ پہلی بار حاجی کی بیوی کو وہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک بار وہ مجھے حمام میں ملی تھی۔"

میں نے بیوی سے پھر سوال کیا: "حاجی کی لڑکی کو بھی پہچانتی ہو؟"

میری بیوی کو اس سوال و جواب سے کچھ تعجب سا ہوا۔ طنزاً کہنے لگی۔ "آج رات تم مجھ سے کونسی قسم کے اصولِ دین کے متعلق دریافت کر رہے ہو۔ ان چیزوں سے تمہیں مطلب؟ تمہیں کیا کہ میں حاجی کی بیوی کو پہچانتی ہوں یا نہیں بھلے آدمی ذکر مجالس چھوڑ چھاڑ کر گھر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر میرا دماغ چاٹ رہے ہو۔"

میں نے سنبھل کر جواب دیا: "اے ضعیفۃ العقل تجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ حاجی نے اپنی لڑکی کے شفایاب ہونے پر پانچ جمعہ تک ہر ہفتے ایک مجلس پڑھنے کا وعدہ مجھ سے لیا ہے۔ میں چاہتا تھا یہ معلوم کروں کہ اس کی لڑکی کی عمر کتنی ہے تاکہ اسی مناسبت سے حضرت سکینہ، حضرت شہربانو یا حضرت قاسم کی شادی کی مجلس پڑھوں۔"

میری بیوی نے کہا: "حضرت قاسم کی شادی کی مجلس بہتر رہے گی۔ کیونکہ لڑکی اب سولہ برس کی ہو گئی ہوگی اور ماشاء اللہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے۔"

---

[1] ایران میں اکثر گھروں میں باغیچہ بنایا جاتا ہے اور انگور، ناشپاتی، بہی اور انار کے درخت لگائے جاتے ہیں۔

[2] تومان۔ دس ایرانی ریال یا دس [illegible] کا ایک تومان بنتا ہے۔ ایک تومان پاکستان کے ڈیڑھ روپے کے برابر ہے۔

میں نے بیوی کا شک دور کرنے کے لئے کہا "چاند کی طرح ہو یا بد صورت ہو، مجھ کو اس سے کیا غرض" ... اور پھر میرا دھیان [illegible] کے [illegible] اور دوشیزہ کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کی طرف چلا گیا۔ اور بے ساختہ میرے دل سے ہوک سی اٹھی۔

میری بیوی کچھ دیر بڑبڑاتی رہی، پھر نماز کی تیاری کرنے لگی اور پھر نماز پڑھنے کے بعد وظیفے کی دعائیں پڑھ پڑھ کر چاروں طرف پھونکتی [illegible] [illegible] میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی اور دل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ چاندنی رات تھی چھت پر بتیاں آپس میں [illegible] [illegible] سے جنت نصیب کرے) بغیر آنکھ کھولے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ پھر موسم بہار آگیا اور بتیاں آپس میں [illegible] [illegible] میری آنکھوں میں پھر وہی منظر گھوم گیا، وہی پھولوں کی جھاڑیاں، وہ کھلے ہوئے گیسو اور وہ [illegible] [illegible] طرح کھلا ہوا تھا جس نے میرے دل میں غم کے کانٹے بو دیئے تھے اور میرا دل اس شدت سے دھڑکنے لگا کہ مجھے وہم سا ہونے لگا کہ میرے دل کی شدید دھڑکنوں کی آواز سے میری بیوی جاگ نہ اٹھے۔ اور پھر وہ سامانِ رسوائی ہو کر ایک دنیا دیکھے۔ لیکن دن بھر کی مصروفیتوں نے اسے اتنا تھکا دیا تھا کہ وہ نیند کے اس عالم میں پہنچ گئی تھی کہ نقارے کی آواز سے بھی آسانی سے جگائی نہ جا سکتی تھی۔

میں نے سونے کے لئے سورۂ توبہ اور دعائے خواب پڑھی جو میں نے بچپن میں سیکھی تھی۔ لیکن نیند لانے کی کوئی ترکیب کامیاب نہ ہوئی۔ اور میں سو نہ سکا۔ بیقراری کی حالت میں بستر سے باہر نکلا، ننگے سر ننگے پاؤں چھت پر چلا گیا۔ ہمسائے خواب کے مزے لے رہے تھے۔ چاندنی نے ہر طرف نقرئی چادر بچھا رکھی تھی۔ ہوا کی موج پر تیرنے کی دل گداز صدا کہیں دور سے آرہی تھی اور کوئی بے سرمست نوجوان اپنی خمار آلود آواز میں یہ شعر گاتا ہوا جا رہا تھا۔

شبِ مہتاب و ابر پارہ پارہ   حریفاں جمع و دردِ پیالہ

فضا پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی کہ دفعۃً نزدیک سے چوکیدار نے یا قاضی الحاجات کا نعرہ لگایا۔ چوکیدار کی صدا سے میں عالم محویت سے چونک پڑا۔ ہمسایہ میں ایک شیر خوار بچہ جاگ کر رونے لگا۔ اور اس کی ماں کی کبھی پچکارنے اور کبھی ڈانٹنے کی آواز آنے لگی۔ کتے بھونکنے لگے۔ میں اس وقت چھت پر حاجی کے گھر کی طرف کے گوشے میں منڈیر کے پیچھے چھپا ہوا ایک سوراخ میں سے حاجی کے گھر کے اندر نظر دوڑا رہا تھا۔ میری نگاہیں ایک کمرے کے بستر پر لگی ہوئی تھیں جہاں وہ دوشیزہ محوِ استراحت تھی اور اس کی زلفیں تکیے پر منتشر تھیں۔ اور میں زیرِ لب یہ شعر گنگنا رہا تھا ؎

اللہ رے سکونِ قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیئے   جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

لیکن میں جلد ہی سنبھل گیا اور اپنی حالت پر حیران و پریشان دیواروں کو پھاندتے ہوئے، سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ دیکھا تو میری بیوی پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھی اور مجھے برا بھلا کہتے ہوئے پکار رہی تھی۔

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "ناقص العقل، اپنی چیخ پکار سے سارے ہمسایوں کو کیوں جگا رہی ہو۔ بیوقوف کہیں کی، میں چھت پر گیا تھا تاکہ اس چاندنی رات میں مناجات پڑھوں اور خدا کا شکر ادا کروں۔

وہ بڑبڑائی۔ "مجھے مناجات کی آواز آ رہی ہے۔" اور پھر سونے چلی گئی۔

میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی، لیکن وہ بستر وہ گلاب کی جھاڑی، وہ کھلے ہوئے گیسو اور وہ گلاب کی طرح کھلا ہوا چہرہ ایک کر کے میری نگاہوں میں گھومنے لگے، اور میری حالت پھر دگرگوں ہونے لگی۔ اس دن کے بعد میں گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔ وہ بہار میری حالت خراب تر ہوتی گئی۔ میری بیوی شدت غم سے بیمار پڑ گئی۔ مجالس نہ پڑھنے کی وجہ سے میری آمدنی بند ہو گئی اور گھر کا سامان تھوڑا تھوڑا کر کے فروخت ہونے لگا۔ فقط حاجی کے گھر مجلس پڑھنے جاتا تھا وہ بھی اس بہانے سے کہ حاجی کا گھر نزدیک ہے۔ میری بیوی کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ایک دن اذان صبح کے وقت وہ اس دار فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئی۔ اور دنیا کے رنج و غم سے چھوٹ گئی۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ وہ لاثانی عورت تھی۔ اس دن کے بعد میں تنہا رہ گیا۔ تنہا، بے یار و مددگار۔ میں نے اپنے گھر کا سامان بیچنا شروع کیا۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا، بیچ دیا۔ جو گندم میں نے اکٹھی کی تھی وہ صبح منڈی میں گندم کا بھاؤ چڑھا ہوا تھا اور دس روپے کی چیز کی ایک روپیہ ڈھائی آنے قیمت لگا رہا تھا تین سو روپے میں گروی رکھ کر حکیم کا قرض ادا کیا، اور دوسرے لوگوں کا قرض اتارا، تھوڑا بہت جو بچ گیا وہ میں نے اپنے خورد و نوش کے لئے رکھ لیا۔

ایک دن رات کے وقت میں اپنے کمرے میں اندھیرے میں پڑا ہوا یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے ۔۔۔ کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

اور رو رہا تھا اتنے میں کسی نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ اس اندھیری رات میں کسے میرا خیال آیا۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو حاجی صاحب تھے۔ کہنے لگے "آقائے ملا، میری بیٹی گوہر خانم کی بیماری دوبارہ لوٹ آئی ہے اس کی ماں بہت پریشان ہے۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے درخواست کروں مجلس پڑھ دیں۔ شاید آپ کے فیض کے اثر سے وہ شفا پا جائے۔ میں نے قبول کر لیا اور دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کو پلٹنا چاہا لیکن طاقت نے جواب دے دیا۔ میں اپنے گھر کی ڈیوڑھی کی سیڑھیوں میں گر پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔ تاریکی میں منہ آسمان کی طرف کر کے (خدا مجھے معاف کرے) بہت سی کفر آمیز باتیں بکتا رہا۔ رات آہ و زاری میں کٹی۔ صبح سویرے اپنی بیمار محبوبہ کی خبر حاصل کرنے کے لئے کپڑے پہن کر اور کندھوں پر عبا ڈالتے ہوئے گھر سے باہر نکلا۔ حاجی صاحب کے مکان کے باہر حکیم صاحب کی گھوڑی بندھی ہوئی دیکھی۔ حکیم صاحب کا نوکر گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لئے ہوئے گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

میں نے حکیم صاحب کے نوکر کو جگاتے ہوئے پوچھا: "مریضہ کی حالت کیسی ہے؟"

نوکر نے مجھ پر غصہ آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے جواب دیا: "تم خود مریض معلوم ہوتے ہو ملا جی۔ جو صبح سویرے لوگوں کی نیند خراب کر کے پوچھتے ہو کہ مریضہ کی حالت کیسی ہے؟" پھر تھوڑی دیر توقف کر کے کہنے لگا کہ آپ خود ذہین اور عقل مند انسان ہیں، اگر کسی مریض کی حالت اچھی ہو تو صبح سویرے اس کے گھر میں حکیم کیا لینے آئے گا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ حکیم کا نوکر جو کچھ کہہ رہا ہے حرف بہ حرف درست ہے میں شرمسار ہو گیا اور گھر کو لوٹ گیا۔ گھر کا دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے دل میں کہا کہ اب اس گھر کا دروازہ میری موت کے بعد مردہ خانہ والا[1] کھولے گا۔ میں روتا رہا اور اپنی محبوبہ کے لئے دعائے صحت کرتا رہا۔ دن بغیر کچھ کھائے پیئے گزر گیا۔ شام کے وقت وضو کر کے میں نے نماز پڑھ

[1] ایران کے ہر شہر میں مردہ خانہ بنا ہوا ہوتا ہے جس گھر میں موت ہو جاتی ہے میت مردہ خانہ پہنچا دی جاتی ہے اور غسل میت کا کام مرے ہوئے شخص کے متعلقین کی [illegible] [illegible] ہیں جنہیں ایران میں مردہ شور کہتے ہیں۔

مجھے کوئی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں پاگل ہو رہا ہوں۔ میں نے اسی حالت میں ایک رسی کو بہشت کی
ایک مضبوط شاخ سے باندھ کر ایک پھندا بنایا اور چاہا تھا کہ گلے میں ڈال کر دنیا کے مصائب سے چھٹکارا پا جاؤں کہ اتنے میں کسی
نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دم سادھ لیا، کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں حاجی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جو تمہارا قربان علی، قربان علی
کہہ کر پکار رہا تھا۔ میں بے اختیار دوڑتا ہوا دروازے تک گیا۔ دروازہ کھولنے پر خبر ملی کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس لڑکی کو
تلخ سے جدا کر دیا تھا۔ حاجی مجھ سے درخواست کر رہا تھا کہ میں اس کی لڑکی کی میت کے سرہانے جو صبح کو دفن کرنے کے لئے مسجد میں رکھ
دی گئی تھی بیٹھ کر قرآن شریف پڑھوں اور اس کی روح کو ثواب پہنچاؤں۔ میں نے چاہا کہ اظہارِ حقیقت کرتے ہوئے کہہ دوں کہ میں پڑھا لکھا
نہیں ہوں لیکن میرا گلا گھٹ سا گیا میں کچھ نہ کہہ سکا۔ حاجی میری خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے تاکید کر کے چلا گیا۔ پھر میں رہ گیا اور رنج و
غم کا ہجوم اور تنہائی۔ اس وقت چاندنی سے ایک عجیب سی حسرت برستی تھی اور پھانسی کا پھندا جو میں نے شہتوت کے درخت سے لٹکایا تھا
ہوا کی موجوں سے اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پھندے کا سایہ کسی ایسی گھڑی کا پنڈولم ہے جو زندگی اور موت کے
لمحوں کا شمار کرتی ہے۔ پھر میری نگاہوں میں وہ مناظر گھومنے لگے، وہ چاندنی رات جب جی بھر کر میں نے اپنی محبوبہ کی شکل دیکھی تھی وہ اس
کی بکھلی ہوئی زلفیں، وہ گلاب کا ادھ کھلا غنچہ، میرے دل سے ایک ہوک اٹھی اور میری آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میں نے دل میں کہا
چاہے کچھ ہو میں اس رشکِ آفتاب و مہتاب کی شکل آخری بار ضرور دیکھوں گا۔ میں نے اپنی عبا جس کی میری مرحوم بیوی نے سیکڑوں جگہ سے مرمت
کی تھی اپنے کندھوں پر ڈالی اور مسجد کی راہ لی۔ مسجد پہنچ کر وہ سراپا حسن جسے چند ہی روز پہلے میں نے آخری مرتبہ دیکھا تھا چادر کے نیچے بے جان
پڑی ہوئی تھی اور میں سکتے کے عالم میں بے حس و حرکت اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر گئی ہے، اس چادر کے نیچے وہ
بند سو رہی ہے اور کل وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا دی جائے گی۔ بڑی دیر کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں قرآن خوانی کے لئے آیا ہوں۔ میں نے جو
دعائیں مجھے یاد تھیں پڑھنی شروع کر دیں کیونکہ قرآن پڑھ نہیں سکتا تھا۔ آنسوؤں کے طوفان میں دعائیں پڑھنی بھی محال ہو رہی تھیں چاروں
طرف سناٹا چھا رہا تھا اور رنج و غم کا ہجوم مجھے دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔ ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے زبان میں لکنت پیدا ہو رہی تھی ایسا لگتا
تھا کہ مجھے بھی موت آ جائے گی۔ میں اسی حالت میں ڈوبا ہوا تھا کہ مسجد کے قریب ہی سے کسی تہجد گزار کی آواز سنائی دی جو عالمِ مناجات
میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؂

شب خیز کہ عاشقاں بہ شب راز کنند   گرد در و بامِ دوست پرواز کنند

اس شعر کے سنتے ہی میری حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی محبوبہ کی میت سے چمٹتے ہوئے کہنے لگا۔ اے
کاش زندگی اٹھ کھڑی ہو تو اور موت، نہیں نہیں، تو نہیں مر سکتی اور ساتھ ہی میرے دل میں مجنونانہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ ایک مرتبہ پھر
اس کی صورت دیکھوں میں نے کسی جھجک کے بغیر اس کے منہ سے چادر ہٹا دی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ زلفیں بکھرائے ہوئے مسکرا رہی ہے۔
میری آنکھیں بند ہو گئیں اور بے اختیار میرے ہونٹ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے۔ پھر مجھے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہی
اتنا یاد ہے کہ میری پیٹھ پر ایک سخت ٹھوکر کسی نے لگائی۔ جب ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو اس جیل کی کوٹھڑی میں دیکھا اس حالت میں

کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی ہیں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت گشت کرنے والی پولیس مسجد میں داخل ہوگئی تھی۔ اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر مارتی پیٹتی لہولہان کرکے یہاں جیل خانہ میں پھینک گئی تھی۔ جب بھی کوئی وہ خیال آجاتا ہے کہ میری نگاہوں میں وہ منظرنہ گھومتے ہوں۔ اور میری رگ رگ میں آگ سی نہ بھڑکتی ہو۔ معاف کیجیے گا جیلر صاحب میری آپ بیتی سے آپ کا سر دکھنے لگ گیا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اس واقعہ کو مدت گزر چکی ہے اور جب سے میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

ضمیر اظہر
(حلقۂ ارباب ذوق کراچی)

امیّد

مجھے یقیں ہے کہ اک نہ اک دن نگارِ مہتاب کی جبیں سے

ابھر کے مثلِ خیالِ تاباں

کرن اک ایسی بھی آسمانِ کبود پر آشکار ہوگی

کہ جس کی فیاض روشنی سے تمام تیرہ نصیب ذرّے

کواکبِ سیم گوں کی مانند یک بیک جگمگا اٹھیں گے

زمیں کا بے آب ــــــ خشک سینہ

سہانی گلکاریوں سے آراستہ مثالِ بہار ہوگا

---

[1] ایران میں پولیس کو ایک زمانہ تک بیک وقت انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل رہے ہیں۔

جناب شیر افضل جعفری

مہرانی

(جھنگ دی کڑی)

لوچ آواز میں ہے بات میں رعنائی ہے
اور ہونٹوں کی زیارت کو شفق آئی ہے

عنبریں شام مچلتی ہوئی زلفوں پہ نثار
چاندنی رات جبیں دیکھ کے شرمائی ہے

جھولتی باہوں میں شاخوں کا رسیلا منظر
سُرخ ہاتھوں پہ چناروں کی فضا چھائی ہے

مست قامت پہ بہاروں کے ترانے قرباں
ڈولتی چال میں پُروا نے غزل گائی ہے

پاک پلکوں پہ لجاتی ہوئی عصمت کا سُہاگ
فطرتِ خلد سے آنکھوں نے حیا پائی ہے

ریشمیں انگلیوں پر حُسنِ مشیّت رقصاں
روحِ جبریل اشاروں میں اتر آئی ہے

ہیر کے دیس میں یہ بھاگ بھری مہرانی!
چاند تاروں کی تمنّائیں چُرا لائی ہے

(اپریل ۱۹۵۰ء)

جناب عبدالمحسن مجد الیونی

شیفتہ کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ایک سرسری نظر

نثر و شاعری کی بنیادوں کو استوار کرنے میں جہاں میر، غالب، ذوق اور مومن وغیرہ کے نام آتے ہیں وہاں شیفتہ کا نام بھی ہم کو ملتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اُردو ادب اور فارسی ادب کی جن لوگوں نے خدمت کی ان میں شیفتہ کا مرتبہ کافی بلند ہے۔

مصطفیٰ خاں نام۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ وہ نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خان بہادر مظفر جنگ کے فرزند اور اس زمانہ کے مشہور سپہ سالار اسمٰعیل بیگ ہمدانی کے نواسے تھے۔ نواب مرتضیٰ خاں نے جہانگیر آباد کا علاقہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام منتقل کر دیا تھا۔ جو ان کی اولاد میں اس وقت تک قائم ہے۔

شیفتہ مرحوم ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ میاں جی ابا مال سے عربی، فارسی اور علوم مروجہ حاصل کئے۔ حاجی محمد نور دہلوی سے حدیث قرأت کی تعلیم پائی۔ مولوی کرم اللہ محدث دہلوی سے حدیث پڑھی ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں جب مکہ معظمہ جانے کا اتفاق ہوا حضرت عبداللہ سراج حنفی سے صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے۔ مدینہ منورہ میں شیخ عابد سندھی سے حدیث شریف کے خاص خاص مقامات کا درس لیا۔ حالانکہ آپ صوفی مشرب تھے لیکن سماع کی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ پابند شرع متقی پرہیزگار تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ڈر ہے کہ ہو نہ شوق مزامیر شیفتہ ورنہ کبھی سماع مجرد سنا کروں

کم سخن ہونے کی وجہ سے لوگوں کو ان پر تکبر و غرور کا گمان ہوتا تھا لیکن ان کی بے تکلفی کے جلسے مہذب ظرافت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ کتب بینی سے نہایت ذوق تھا۔ فارسی ادب میں کامل دستگاہ رکھنے کے باوجود اردو ادب سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے۔ اردو رسم الخط میں اس کی اصلاح جس کی ضرورت آج محسوس کی جا رہی ہے شیفتہ مرحوم آج سے ایک صدی پہلے اپنی تحریروں میں رائج کر چکے تھے۔ ان کا خیال بھی پاکیزہ تھا۔ ایام غدر میں بمصداق

"جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"

مصائب کا سامنا ہوا جیل بھیجے گئے، گھر اور اسباب لوٹا گیا۔ آگ لگا دی گئی گھر کے ساز و سامان کے ساتھ کلام بھی جو عمر بھر کی کمائی تھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے جو اپنی فوج لے کر دہلی جا رہے تھے ٹھاکروں کے دست ظلم سے نجات دلائی۔ تحقیق سے بے جرم ثابت ہوئے اور غدر فرو ہونے پر قید فرنگ سے نجات پائی۔ مناصب و مدارج بدستور برقرار رہے۔ صبر و استقلال تسلیم و رضا کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ان کا دائرۂ احباب نہایت وسیع تھا جس میں امراء، فقہا، علماء، ادبا اور شعرا سب ہی شامل تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دہلی پر جو مصیبت آئی اور جس طرح سے دلی غریب لوٹی کھسوٹی گئی اس کا اظہار اس وقت اکثر شعرا نے اپنی اپنی زبان شعر آشوب اور مرثیے لکھ کر کیا تھا۔ شیفتہ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے دلی کی سکونت ہی ترک کر دی اور اپنی جاگیر جہانگیر آباد میں رہنے لگے

[illegible] کہتے ہیں ؎

ہر چند کہ ہے شیفتہ دلّی وطن اپنا ‏ ‏ ‏ ویرانے کی مانند ذرا جی نہیں لگتا

نواب محمد علی خاں جو ریاست رامپور میں ریونیو ممبر تھے آپ کے فرزند اکبر تھے وہ ۱۸۹۹ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ نواب [illegible] خاں [illegible] ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ تیسرے صاحب زادے نواب محمد اسحٰق خاں مرحوم تھے جو عرصہ تک صوبہ متحدہ میں [illegible] کے عہدہ پر مامور رہے۔ پنشن لینے کے بعد مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے آزیری سکریٹری ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ نے بھی سفر آخرت اختیار کیا۔ نواب محمد اسحٰق خاں کے بیٹے صاحب زادے نواب محمد اسمٰعیل خاں بیرسٹر ہیں۔ آپ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر، صوبہ متحدہ کی لیگ کے صدر اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔

دہلی کی علمی صحبتوں اور شیفتہ کی فطری مناسبت طبع کا یہ اقتضا تھا کہ سن شعور کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کہنے لگے۔ فرماتے ہیں ؎

گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی ‏ ‏ ‏ اے شیفتہ اس فن میں ہوں میں پیر طریقت

فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور حکیم مومن خاں مرحوم سے مشورہ سخن رکھتے تھے۔ مومن کے انتقال کے بعد مرزا غالب سے اصلاح سخن لینے لگے۔ مومن کو اپنے قابل شاگرد کی استادی پر فخر اور ان کی قابلیت کا اعتراف تھا۔ شیفتہ کے مشہور تذکرے "گلشن بے خار" کی تقریظ لکھتے ہوئے مومن فرماتے ہیں ؎

آں شیفتہ کہ خرد گرامی باشد ‏ ‏ ‏ سرخیل سخنوران نامی باشد

اکنوں کہ جہد نماند الّا بعدم ‏ ‏ ‏ محمود سنائی و نظامی باشد

مومن نے ایک شعر میں شیفتہ کی سخن فہمی کی داد اس طرح دی ہے ؎

ز تحسین او حسن معنی نیاز ‏ ‏ ‏ ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

مرزا غالب نے ایک قصیدہ میں شیفتہ کی نسبت نہایت اچھے پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں ؎

آں ہمائے تیز پروازم کہ بال ‏ ‏ ‏ در ہوائے مصطفیٰ خاں می زنم

عرفی و خاقانیش فرماں پذیر ‏ ‏ ‏ سکہ در شیراز و شرواں می زنم

شیفتہ کے کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہِ الفاظ اور چستیِ ترکیب نمایاں نظر آتی ہے۔ تلاشِ الفاظ اور ترکیب کی روش میں غالب اور مومن کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن وہ اپنے کلام میں میر تقی کی پیروی اور سادہ بیانی پر فخر کرتے تھے۔ ایک جگہ فرمایا ہے ؎

شیفتہ سادہ بیانی نے بہت چمکایا ‏ ‏ ‏ ورنہ صنعت میں بہت لگ گئے تھے ہم سے

نمونے کے طور پر شیفتہ کے وہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں میر کی جھلک پائی جاتی ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہو شیفتہ ‏ ‏ ‏ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مرنے کا نہ میرے ذکر کرنا ‏ ‏ ‏ قاصد وہ بہت الم کریں گے

دلی میں تو شیفتہ ہے استاد　　　ہم قصد سوئے عجم کریں گے

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ　　　یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

دل لگانے کا ارادہ پھر ہے شاید شیفتہ　　　ایسی حسرت سے جو ہے گزری ہوئی الفت کی یاد

ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی　　　تھام لینا وہ تیرے محمل کو

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام　　　بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شیفتہ کے کلام کی یہ سادگی بتاتی ہے کہ وہ عموماً اپنے استاد مومن اور غالب کی تقلید پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ میر کی صفائی اور سلاست کی چاشنی سے وہ ایک جداگانہ طرز کے موجد تھے۔ فرماتے ہیں ؎

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن　　　کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

ایک دوسرے شعر میں اپنے طرز کی شرح فرمائی ہے ؎

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ　　　معنی شگفتہ، لفظ خوش، انداز صاف ہو

اس پر بھی ان کے کلام میں ایسا حصہ پایا جاتا ہے جس میں مومن کا رنگ آئے بغیر نہیں رہتا لیکن اس رنگ میں بھی کچھ نہ کچھ امتیاز نمایاں ہے، کیا خوب کہا ہے ؎

یاں سبک حرف ملامت واں گراں عرض نیاز　　　سخت جاں میں کب تھا اور نازنیں تو کب تھا

بچتے ہیں اس قدر جو ادھر کی ہوا سے ہم　　　واقف ہیں شیوۂ دل شورش ادا سے ہم

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین　　　دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

مضامین کے اعتبار سے شیفتہ کا کلام تصوف پند و حکمت سے مالا مال ہے۔ ان مضامین کو انھوں نے قطعات ذیل میں نہایت خوبی ادا کیا ہے۔ مثلاً اس خیال کو کہ دنیا میں ہر شخص اپنے خیال میں مستغرق ہے مگر اپنی ماہیت سے بے خبر۔ ایک مشہور قطعہ میں اس طرح نظم فر

ساقی کو میکدے میں سر ناؤ نوش ہے　　　صوفی کو خانقہ میں سر وجد و حال ہے

عاشق کو اضطراب سے عجز و نیاز ہے　　　معشوق کو غرور سے غنج و دلال ہے

مقصود ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت　　　حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے　　　ہر بات منطقی کی برائے جدال ہے

جن کو کہ دستگاہ ہے فن نجوم میں　　　عمر ان کی صرف زائچۂ ماہ و سال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخر نسب لذیذ　　　بعضوں کو ذوق دعوئے فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے　　　منعم غریق لجۂ بیم زوال ہے

جی میں کسی کے خواہش آرائش لباس　　　دل میں کسی کے حسرت جاہ و جلال ہے

کوئی طلب میں مضطرب [illegible] تلمیذ کی | کوئی اسیرِ شوقِ نگارِ حنائی ہے
کوئی فدائے قامتِ آفت خرام ہے | کوئی خرابِ نرگسِ جادو مثال ہے
ناحق کسی کو رشک کسی کو شکایتیں | بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے
کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ | اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

شیفتہ کا اردو دیوان سب سے پہلے ۱۸۴۳ء میں مطبع آئینہ سکندری میرٹھ میں ان کی موجودگی میں چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد چند اور نسخے مختلف مطبعوں سے چھپے۔ ان کے علاوہ ان کی ایک قابل قدر تصنیف "تذکرہ گلشن بے خار" بھی ہے جو ۱۲۴۸ھ تک [illegible] مکمل لکھی گئی تھی۔ اس زمانہ کی رسم کے مطابق شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کا مختصر حال لکھنے کے لئے فارسی زبان اختیار کی گئی ہے۔ اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ شعراء کے کلام پر آزادانہ نکتہ چینی کی گئی ہے اردو شعراء کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں فن تنقید کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے جو تذکرے اردو شعراء کے لکھے گئے ان میں تعریف کے ساتھ تنقید کا پہلو نہیں رکھا گیا۔ ۱۲۵۵ھ (یعنی ۱۸۳۹ء) یعنی سفر حجاز سے واپسی کے بعد شیفتہ نے شعر و سخن کا شغل تقریباً ترک کر دیا تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے | شوقِ صنم و خواہشِ صہبا نہیں رکھتے

فارسی ادب میں شیفتہ کو پوری دستگاہ تھی، فارسی زبان میں ان کی نظم و نثر کا درجہ بہت بلند ہے۔ اپنے سفر حجاز کے حالات انھوں فارسی زبان میں لکھے تھے جو ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں "ره آورد" کے نام سے چھپ کر شائع ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ موسومہ "سراج منیر" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ "رقعات فارسی" ان کے ستاون رقعات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں تصوف کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ اور بہت سے مشکل مسئلے بڑی خوبی سے حل کئے گئے ہیں۔ آپ کا فارسی کلام بھی [illegible] یہاں ہم حسرتی (یعنی شیفتہ) اور غالب کے چند شعر درج کرتے ہیں تاکہ قارئین خود موازنہ کرسکیں۔

رقی | روئے تو بسکہ بود پیشِ نظر ہر ساعت | می تواں دید مثالِ تو در آئینۂ ما
ب | محو کن نقشِ دوئی از ورقِ سینۂ ما | اے نگاہت الفِ صیقلِ آئینۂ ما
رقی | در حریمِ دلِ اصحابِ صفا جا داریم | وائے آن کس کہ بود در دلِ او کینۂ ما
ب | عرصہ بر الفتِ اغیار چہ تنگ آوردہ ست | خوش فرو رفتہ بہ طبعِ تو خوشا کینۂ ما
رقی | کار ساقی و معنی ہمسری کرد جیب | حسرتی بود چہ خوش صحبتِ دوشینۂ ما
ب | غالب امشب ہمہ از دیدہ چکیدن دارد | خونِ دل بود مگر بادۂ دوشینۂ ما

★

جناب صدق امروہوی

رباعیات

(۱)

رفتارِ شبِ [illegible] سنبھل ہی نہ سکے
ممکن ہے یہ طغیان میں بدل ہی نہ سکے
اے کل پہ یقین رکھنے والے! کل کو،
ممکن ہے کہ خورشید نکل ہی نہ سکے

(۲)

کچھ بھی ہو۔ مگر ملے گا دُرِّ مقصود
ہمت کو ثبات ہو، عزائم میں خلود
خود ڈوبتا ہے جس میں جہازِ گرداب
وہ بحر ہے عزمِ ناخدا میں موجود

(۳)

معلوم کی ذرّات کی قوّت ہم ہیں
خورشید کی کرنوں کی حرارت ہم ہیں
پچھلے دس سال میں بڑھا دی کتنی
امکان کے دائرے کی وسعت ہم ہیں

(۴)

کونین کی فطرت کا تقاضا ہم ہیں
واحد دلِ عالم کی تمنا ہم ہیں
تخلیق کے آغاز کے دن سے اب تک
جو کچھ بھی ہوا اُس کا نتیجہ ہم ہیں

★

طفیل ہوشیار پوری

اقبال رحمۃ اللہ علیہ

اے شاعرِ فردوس نشیں نازشِ اسلام!

جھک جاتا ہے سر لب پہ جب آتا ہے ترا نام!

اللہ رے وہ وسعتِ پروازِ تخیل
پایا نہ کسی نے ترا اندازِ تخیل

دنیا کے تخیل کی رسائی ہے فلک تک
اور تیرا افلاک سے ہوا آغازِ تخیل

سمٹے ہوئے تھے کون و مکاں تیری نظر میں

یہ وسعتیں ہوتیں ہی نہیں چشمِ بشر میں

دانائے یگانہ شہِ اقلیمِ معانی
ہے اپنی مثال آپ ہی تیری ہمہ دانی

غواصِ خرد کھائے نہ کیوں غوطے پہ غوطہ
گہرا ہے ترے بحرِ خیالات کا پانی

ہر لفظ ہے آئینہ تری دیدہ وری کا

ہر شعر ہے شاہد تری عالی نظری کا

تہذیبِ فرنگی کی پرستار تھی دنیا
پھندے میں تعیش کے گرفتار تھی دنیا

الحاد کی مے مفت ہی بٹتی تھی جہاں میں
مخمور تھی مدہوش تھی سرشار تھی دنیا

ہر سمت غلامی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی

اک ظلم کی آندھی تھی کہ لہرائی ہوئی تھی

مجبور تھے افکار پہ زنجیر کڑی تھی — ناچار تھے گفتار پہ زنجیر کڑی تھی

لب بند، زباں بند، نظر بند، قلم بند — کیا کرتے کہ کردار پہ زنجیر کڑی تھی

سینوں میں جواں عزمیں دم توڑ چکی تھیں

فولاد شکن ہمتیں جی چھوڑ چکی تھیں!

پر قوم کے اقبال! تری بانگِ درا نے — دہرائے وہ بھولے ہوئے ماضی کے فسانے

سن کر جنہیں رقصاں ہوئے ہستی کے لبوں پر — انسان کی بیداری کے آزاد ترانے

ہر شعر چھلکتا ہوا اک جام خودی کا

ہر بند بھڑکتا ہوا پیغام خودی کا

جینے کا یہ گر تو نے غلاموں کو سکھایا — تقدیر کو تدبیر کے قدموں پہ جھکایا

اے مردِ مسلماں تری جرأت تھی کہ تو نے — سوئی ہوئی ملت کو یہ پیغام سنایا

جو جھکتا ہے اور اس کو جھکا دیتی ہے دنیا!

یوں قعرِ مذلت میں گرا دیتی ہے دنیا

تیری غمِ اسلام میں روتی رہیں آنکھیں — یوں اپنی بصارت کو بھی کھوتی رہیں آنکھیں

چنتا چمن کے گلِ تازہ ترکوں کے چمن سے — آزادی کا اک ہار پروتی رہیں آنکھیں

ان آنکھوں کا صدقہ ہے کہ بیدار ہے ملت

کھوئی ہوئی عظمت کی طلبگار ہے ملت

حبیب اللہ فرج

سربیا کی ایک رات

(ایک ہسپانوی افسانہ)

وسنتی بلیسکو ایبانز (۱۸۶۷ - ۱۹۲۸) اراگان (ہسپانیہ) میں پیدا ہوا۔ شروع شروع میں اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد ازاں ادبیات کی طرف توجہ کی۔ اور سیاست سے بھی دلچسپی لینے لگا۔ اپوکلیپس کے چار گھڑسوار اور خون اور ریت (Blood & Sand) کی وجہ سے اسے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ انہیں سے روڈالف ویلنٹینو کی دائمی شہرت وابستہ ہے۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ اس وقت عموماً پیرس کے تمام تھیٹر بند ہو جاتے تھے۔ کیفے اور ریستوران تو نصف گھنٹہ پہلے ہی اپنے دروازوں کو مقفل کر دیتے۔

ہماری جماعت کسی فیصلہ پر پہنچے بغیر ایک چوراہے کے نکڑ پر ٹھہر گئی تھی۔ جہاں لوگ کلبوں، ریستورانوں وغیرہ سے نکل کر راستے کی تاریکی میں گم ہو رہے تھے۔ کہیں کہیں سڑک پر بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ لیکن ان کی مدھم روشنی کو گھٹا ٹوپ اندھیرا کھائے جا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں کچھ آسمان پر صرف تارے جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب آسمان پر صرف ستارے ہی ملتے تھے۔ لیکن اب آسمان پر جب کبھی سرچ لائٹ پڑتی ہے تو کبھی کبھی دور کوئی زیپلین عنبری رنگ کے ایک مہیب سگار کے مانند دکھائی دینے لگتا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم کہیں رات بتائیں۔ ہم چار آدمی تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف، سربیا کے دو کپتان اور میں۔ بھلا اس تاریک رات میں اور ایسے وقت جبکہ پیرس اپنے تمام دروازے بند کر چکا تھا ہم کہاں جا سکتے تھے؟ سربیائی کپتانوں میں سے ایک کو اچانک ایک ایسے فیشن ایبل ہوٹل کا خیال آیا جو رات بھر کھلا رہتا تھا۔ اور وہ تمام افسر جو رات کو دیر تک جاگنا چاہتے تھے عام طور پر اس ہوٹل میں اس بے تکلفی سے جا بیٹھتے جیسے یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ اور یہ ایک ایسا راز تھا جسے وہ فوجی جو پیرس میں کچھ دن گزارنے کے لئے آیا کرتے تھے اپنے ساتھیوں کو سینہ بسینہ منتقل کر دیتے تھے۔

ہم بڑی احتیاط سے اس ہوٹل میں داخل ہوئے جو بقعۂ نور بنا جگمگا رہا تھا۔ اس میں جا بجا بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے اور ان آئینوں میں برقی ہنڈولوں کا عکس عجیب منظر پیش کر رہا تھا جیسے ہم دو برس پیچھے لوٹ آئے ہوں۔ شراب، شباب و رباب ایک جگہ جمع تھے۔ خوبصورت فیشن کی دلدادہ لڑکیاں موجود تھیں شیمپین اڑ رہی تھی۔ اور ایک حبشی موسیقار رباب کو چھیڑ کر سننے والوں کے دلوں کو گرما رہا تھا۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا جو قبل از جنگ کی فضا یاد دلا رہا تھا۔ جہاں تک مردوں کا تعلق ہے ان میں سے کوئی بھی شام کا لباس پہنے ہوئے نہ تھا۔ فرانسیسی بلجیئن، انگریز، روسی، سربین غرض ہر ملک کے سپاہی فوجی وردی پہنے تھے۔ جو گرد آلود اور بوسیدہ ہو چکی تھی۔ بعض انگریز سپاہی وائلن بجا رہے تھے۔ اور سنگ مرمر کی سی سرد مسکراہٹ کے ساتھ سامعین کی داد قبول کر رہے تھے۔ ایک خاتون سفید ... سے ایک ... خادمہ

لیا۔ [illegible] میں اس کے باپ کا ذکر کرتے تھے کسی لارڈ کا جو اپنی کثیر دولت اور اونچے خاندان کی وجہ سے مشہور تھا۔ [illegible] سپاہی [illegible] کی قربانی کی تمنا کرتے رہے ہیں! اور ساتھ ہی تمام مردِ مجنون نے موت کی زرد دیوی کی قربان گاہ پر اپنی جانوں کو پیش کش کی تھی۔ [illegible] زندگی [illegible] کو شراب کے جام میں غرق کر کے ان ملاحوں کے سے جوش کے ساتھ ساغر پہ ساغر لنڈھانے لگے جو دریا کے کنارے [illegible] اس لئے کہ وہ زندگی کے ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائیں۔

[illegible] سپاہی کپتان نوجوان تھے اور اس امر پر مطمئن کہ ان کے ملک کے حالات نے انھیں پیرس پہنچا دیا تھا۔ وہ اکثر اپنے صوبے کے [illegible] میں زندگی کی یکسانی سے تنگ آ کر پیرس کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ یہ دونوں فنِ نقشہ گری کے ماہر تھے جو ایک ایسے شہر کے باشندوں کا ایک معمولی وصف تھا جہاں سب کے سب شاعر ہوں۔ کوئی ۵ سال قبل جب ہیمر ٹن کا گزر اس وقت کے ترکی کے صوبے [illegible] وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا کہ وہاں کے چرواہے اور سپاہی بھی شاعری کو اپنی زندگی میں بے حد اہمیت دیتے تھے۔

شمپین ختم کرنے کے بعد دونوں کپتانوں نے اپنے ماضی کی تکلیف دہ سپاہیوں کا قصہ چھیڑ دیا۔ بھوک اور سردی کے خلاف جدوجہد، برف باری میں [illegible] ایک کا مقابلہ دس دس سے ہوتا۔ دہشت پسندی کے عالم میں سیکڑوں انسانوں اور جانوروں کی بھگدڑ، اس حالت میں کہ پیچھے سے مشین گن کی گولیاں ان پر برس رہی تھیں اور رائفل کی آوازیں انھیں موت کا نشانہ بنا رہی ہوتیں۔ جلتے ہوئے گاؤں [illegible] جن پر گدھ منڈلا رہے ہوتے۔ شعلوں کے بیچ میں گھرے ہوئے زخمیوں کی کراہ اور چیخ پکار، معمر اور گٹھیا کے مریض [illegible] شاہ [illegible] برف پوش پہاڑیوں میں سے سوار دستوں کے ساتھ شیکسپیر کی کہانیوں کے کسی بادشاہ کی طرح صبر اور خاموشی سے [illegible]

یہ دونوں اپنی داستان سنا رہے تھے اور میں ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ بھرا بھرا جسم، فولاد کی طرح سخت بدن اور عقاب کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی ناک۔ ان کی مونچھیں باریک اور نوک دار تھیں اور ان کی ٹوپی کے نیچے سے پریشان بالوں کے گچھے باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ یہ اس قسم کے آرٹسٹ تھے جن کے خواب آج سے کوئی چالیس سال قبل کی عورتیں دیکھا کرتی تھیں لیکن اس وقت [illegible] رنگ کی وردی میں ایسے جری و جواں مرد سپاہی دکھائی دیتے تھے جو موت سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

یہ دونوں باتیں کئے جا رہے تھے اور آج سے چند ماہ قبل کے واقعات کچھ اس انداز سے سنا رہے تھے جیسے وہ سر بیا کے اس [illegible] کی مہمات ٹھہرا رہے ہوں جس نے برچھے کے بجائے اژدہا ہاتھ میں لے کر جنگلوں کے خوفناک بھوتوں کا مقابلہ کیا تھا۔ کچھ ہی عرصہ قبل ان نوجوانوں نے جو پیرس کے ایک ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے اپنے تجربات سنا رہے تھے خاک و خون میں [illegible] کی قیادت کی تھی۔

[illegible] دوست ہم سے رخصت ہو گیا۔ ان دو کپتانوں میں سے ایک کے قصے میں سامنے کی میز پر بار بار نظریں ڈالے [illegible] جاتا تھا۔ وہ خوبصورت آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہی آنکھیں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ بالآخر وہ ہماری میز سے اٹھ کر سامنے کی میز پر چلا گیا۔ جیسے ان پُر اسرار آنکھوں کی مقناطیسی کشش نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد

[illegible] اور اس کے غائب وہ خوب صورت اور پُراسرار آنکھیں بھی! —

[illegible] سے کم عمر کپتان کے ساتھ جس نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا تنہا رہ گیا۔ اس نے شراب کا ایک گلاس [illegible] [illegible] نظر ڈالی، پھر ایک گلاس غٹاغٹ پی گیا۔ اور اس کے بعد مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ ایسی نظر جو کسی کو اعتماد میں لینے سے قبل ڈالی جاتی ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی زندگی کا کوئی ایسا دردناک واقعہ مجھے سنانا چاہتا ہے جس کی تلخیاں اور یادیں [illegible] [illegible] سنگین بنا دیتی ہے۔ اس نے پھر ایک بار گھڑی پر نظر ڈالی، اس وقت ایک بجا تھا۔

"ٹھیک یہی وقت تھا" اس نے اپنی داستان اسی بے ربط انداز میں شروع کر دی۔ اور اس طرح اپنی خاموشی کو [illegible] اپنایا۔ "آج سے ٹھیک چار ماہ قبل اور آج ہی کے دن!"

اور جیسے جیسے وہ آپ بیتی سناتا گیا میری نظروں کے سامنے برف پوش پہاڑ پھرنے لگے جن پر جابجا [illegible] اُگے تھے۔ اور جب ہوا چلتی تھی تو ان کی شاخوں سے روئی کے گالوں کی طرح برف گرتی تھی۔ میری نظروں کے سامنے اس تباہ شدہ گاؤں کے منڈ بھی پھر گئے جس سے ایک پسپا شدہ سربیائی ڈویژن ایڈریاٹک کی طرف راہِ فرار اختیار کئے ہوئے تھی۔ میرا دوست اس فوج کے [illegible] دستے کی کمان کر رہا تھا۔ یہ دستہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ایک زمانہ میں تو سپاہی تھے لیکن اب ان کی حیثیت [illegible] سے زیادہ نہ تھی۔ یہ فوجی یونٹ ان کسانوں کے شمول سے تعداد میں بڑھ گئی تھی جن کے حواس دہشت اور مصیبتوں کے [illegible] سلب کر لئے تھے کہ انھیں جانوروں کی طرح ہانک پکار کر آگے بڑھانا پڑتا تھا۔ کچھ عورتیں بچوں کو لئے آہ و بکا کرتی [illegible] میں چل رہی تھیں۔ اور اس سکوتِ مرگ میں کچھ دوسری عورتیں جن کے بال سیاہ تھے قد لمبے تھے اور جسم گٹھیلے جب [illegible] راستے میں پڑی ہوئی لاشوں پر جھک کر ان سے بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی نکال لیتی جاتیں۔

اس تاریکی کو اگر کوئی چیز سنگین بناتی تھی تو کھنڈروں میں پھٹنے والے گولوں کی روشنی اور جیسے جیسے تاریکی بڑھتی گئی [illegible] کے اسلحہ کے حملہ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور گولیوں کی سنسناتی ہوئی آواز رات کے حشرات کی آواز سے ہم آہنگ ہو گئی۔

صبح ہوتے ہی شدید اور جان توڑ حملے کا اندیشہ تھا۔ انھیں اس کا علم نہ تھا کہ اس تاریکی میں کون سا دشمن ان کے [illegible] آمادہ ہو کر تعاقب کئے جا رہا ہے۔ آیا یہ جرمن تھے، آسٹریائی تھے، بلغاری تھے یا ترک؟ اُن کا بیک وقت کئی دشمنوں سے مقابلہ تھا پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سربی کپتان نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور ہم اپنے پیچھے مجبوراً ان لوگوں کو چھوڑ جاتے تھے جو سست رفتاری کی وجہ سے ہمارا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ صبح ہونے سے پہلے ہمیں پہاڑ عبور کرنے تھے۔

عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ان کے مویشیوں کی بھی ایک بڑی تعداد رات میں اس قافلہ کے ساتھ آن ملی تھی۔ اور گاؤں میں صرف ایسے ہی نوجوان باقی رہ گئے تھے جو کھنڈروں میں چھپ کر دشمن پر گولہ باری کرنے میں مصروف تھے آخر ان میں سے بھی بہت سے پسپا ہونے لگے۔ اچانک کپتان کو ایک تکلیف دہ خیال ستانے لگا۔

"زخمیوں کا کیا جائے؟"

ایک ایسے گودام کے سامنے میں جس کی چھت گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ بورے پر کوئی پچاس آدمی زندگی اور موت کی کش مکش میں
مبتلا ذلتوں سے کراہ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کئی دن قبل زخمی ہوئے تھے لیکن جو کسی نہ کسی طرح رینگتے گھسٹتے ہوئے یہاں تک
پہنچ گئے تھے ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اسی رات زخمی ہوئے تھے اور جن کے زخموں سے تازہ خون رس رہا تھا ایسی عورتیں
بھی تھیں جنھیں قاتل برچھے سے زخم آئے تھے۔

کپتان اس پناہ گاہ میں داخل ہوا۔ جو نیم مردہ اور سڑتے ہوئے گوشت تازہ اور خشک خون، گندے کپڑوں اور بدبودار سانسوں
سے بھری تھی کپتان کی زبان سے پہلا ہی لفظ سن کر وہ تمام زخمی جن میں ذرہ برابر بھی توانائی باقی تھی قندیل کی مدھم روشنی میں بے چینی سے
حرکت کرنے لگے۔ آہ و بکا کی جگہ خاموشی نے لے لی۔ اور سب پر یوں سکوت تعجب اور دہشت کا سکوت طاری ہو گیا گویا انھیں موت
سے بھی زیادہ کوئی سخت خطرہ درپیش ہے۔ آخر یہ سن کر کہ انھیں دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑے گا سبھی نے اپنی اپنی جگہ سے اٹھنے
کی کوشش کی لیکن ان میں سے کئی ناتوانی اور ضعف سے گر پڑے اور پھر کپتان اور اس کے ساتھی سپاہیوں سے دردناک
التجائیں کرنے لگے: "بھائیو! ہمیں یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تمھیں مسیح کا واسطہ ــــــ"

لیکن رفتہ رفتہ انھیں وقت کی نزاکت کا احساس ہونے لگا۔ اور وہ اپنی قسمت پر صابر ہو کر خاموش ہو گئے لیکن دشمنوں کے بس
میں آنا، اور پھر بلغاریوں اور ترکوں جیسے صدیوں کے پرانے دشمنوں کے بس میں! یہ ناقابل برداشت تھا۔ ان کے دلی جذبات ان کی
زبان پر آ کر رک گئے تھے وہ انھیں زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے مگر ان کی آنکھیں ان کے دل کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ گرفتار
اور غلام بن جانے سے بڑھ کر اور کیا لعنت ہو سکتی تھی۔ اور بہت سے زخمی جن کا موت انتظار کر رہی تھی اپنی آزادی سے محروم ہو جانے
کے تصور سے کانپ اٹھے۔

بلغاریوں کا انتقام موت سے کہیں زیادہ اذیت انگیز تھا۔

"بھائی، میرے بھائی ــــــ"

اور کپتان نے جس نے ان الفاظ میں پوشیدہ التجاؤں کا اندازہ لگا لیا تھا، فرطِ جذبات آنکھیں پھیر لیں۔ اس نے بار بار کہا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں . . . . آپ چاہتے ہیں کہ میں . . ."

سب ہی نے سر کی جنبش کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔

چونکہ انھیں پیچھے چھوڑ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لئے کم از کم یہ تو نہ چاہیئے کہ انھیں زندہ غلام کی حیثیت میں چھوڑ جاؤں
اور اگر آج میں ان کی جگہ ہوتا تو کیا میں خود ان سے ایسی ہی خواہش کا اظہار نہ کرتا۔ پسپائی کی وجہ سے کارتوس اور گولے بارود کی قلت
ہو گئی تھی اس کے سبب سے سپاہی اپنے موجودہ کارتوسوں کے ذخیرے کی جان سے زیادہ حفاظت کرنے لگے تھے۔ کپتان نے اپنی
تلوار نیام سے باہر کر لی بعض سپاہیوں نے تو اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ سنگین استعمال کر رہے تھے لیکن ان کے وار اوچھے پڑ رہے
تھے جس کی وجہ سے گوشت کے لوتھڑے ہوا میں اڑنے لگے، خون کے فوارے جاری ہو گئے اور جان بڑی مشکل سے نکلتی تھی۔ اس لئے تمام

زخمی آہستہ آہستہ کھسک کر کپتان کی طرف جانے لگے جس کے وار کاری تھے اور جس کے ماہر ہاتھوں میں تلوار سے ہلاکت کا عمل مکمل ہو جاتا تھا۔ کپتان کے ہاتھوں مرنے سے نہ صرف اعزاز میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ موت زیادہ تکلیف دہ نہ تھی۔ ایک وار اور بس ————

"بھائی پہلے مجھے، بھائی ————"

اور کپتان اپنی تیز دھار والی تلوار کا نوک دار سرا ان کے حلق میں ایسا چبھوتا کہ ایک ہی وار میں ان کی شہ رگ کٹ جاتی۔

"شخ، شخ" کپتان نے وار کی آواز کا ذکر کیا جس سے میری آنکھوں کے سامنے وہ ہیبت ناک نظارہ ابھر گیا۔

زخمی چاروں گوشوں سے رینگتے، گھسٹتے اس کی طرف آنے لگے اور اس کے قدموں سے چمٹ گئے۔ پہلا قاتل نے منہ ایک طرف پھیر لیا تاکہ وار کرنے کا نظارہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے لیکن اس کمزوری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے وار بھی اوچھے پڑنے لگے جس کی وجہ سے اسے ایک سے زائد بار وار کرنا پڑتا تھا اور اس طرح زخمیوں کی جان کنی کی کیفیت بڑھنے لگی۔

یہ دیکھ کر وہ پرسکون ہو گیا۔ مضبوط دل کے ساتھ ایک کاری ضرب "شخ، شخ۔"

"بھائی اب مجھے، اب مجھے ————"

اور یہ لوگ آگے بڑھنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے جد و جہد کرنے لگے۔ جیسے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں موت سے پہلے دشمن نہ آ جائے۔ اب وہ یہ جان چکے تھے کہ کاری ضرب کے لئے کس انداز میں گردن موڑی جائے۔ ہر شخص اپنی باری کے وقت اپنا سر ایک طرف کر لیتا تاکہ اس طرح گردن اکڑ جائے اور شہ رگ نمایاں ہو کر ابھر آئے اور کپتان کو نوک چبھونے میں کوئی دقت محسوس نہ ہو۔

"بھائی اب مجھے . . . . ." اور خون کا فوارہ بلند ہوتے ہی ایک اور زخمی اپنے ساتھیوں کی ان نعشوں کے ڈھیر پر گر پڑتا جن سے خون یوں خالی ہو رہا تھا جیسے سرخ شراب کے بھرے جام خالی کئے جا رہے ہوں۔

ہوٹل کا مجمع چھٹنے لگا۔ عورتیں وردی میں ملبوس سپاہیوں کا سہارا لئے اپنے پیچھے پوڈر اور خوشبو کی لپٹیں چھوڑ کر جانے لگیں۔ اور قہقہوں کی آوازیں انگریزوں کے وہسکی بھی اپنا آخری راگ سنا کر مدھم پڑ گئے۔

سربیائی کپتان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سفید رنگ کی چھری تھی اور وہ ایک ایسے شخص کے انداز میں جو نہیں بھول سکتا اور جو کبھی نہ بھول سکے گا، میکانی طور پر چھری کا پھل میز پر مارتا چلا گیا ———— "شخ ———— شخ" ————

حیرانی!

بحر و بر کے ہزاروں ہنگامے — مہر و انجم کے آتشیں جامے
آبشاروں کی شورشِ یکساں — اور سمندر میں جوششِ طوفاں
شوکتِ کوہسار کیا کہنا! — مہر و مہ کا وقار کیا کہنا
موسمِ گل کا جوشِ گل پاشی — رنگ و بو کی حسین نقاشی
لالہ و گل کی عطر افشانی — صاف شفاف جھیل کا پانی
نغمۂ جوئبار کیا کہنا! — گلستاں کا نکھار کیا کہنا!
موجۂ نکہتِ نسیمِ سحر — دلنشیں آب و تابِ لعل و گہر

کتنے دلکش ہیں کتنے رعنا ہیں
جوشِ مستی میں رقص فرما ہیں

جستجو ہے نہ آرزو کی خلش — عشق کی آگ ہے نہ غم کی تپش!
یہ سمندر یہ آسمان و زمیں — میرے غم میں کوئی شریک نہیں
سب کے سب دنگ سب کے سب خاموش — اک حجابِ لطیف میں روپوش
اک سکوتِ ازل میں پوشیدہ — رازہائے جہانِ پیچیدہ
نہ کوئی نغمہ اور نہ کوئی ساز — نہ غمِ معرفت نہ سوز و گداز
مست و سرشار بے شعوری ہیں — ناشناسائے ناصبوری ہیں

ان سے کھلتا نہیں حیات کا راز
کتنا مبہم ہے کائنات کا راز

اپریل ۱۹۵۰ء

اک مرا دل ہے ہر گھڑی بے تاب
بے قراری ہے صورتِ سیماب

کب سے پیچیدگی میں غلطاں ہوں
کب سے حیران ہوں پریشاں ہوں

رازِ تخلیقِ کائنات ہے کیا؟
عینِ انساں ہے کیا! حیات ہے کیا!

زندگی کی نمود کیوں کر ہے؟
گرمیٔ ہست و بود کیوں کر ہے؟

ذات کچھ اور ہے ورائے صفات؟
یا کہ مجموعۂ صفات ہے ذات؟

دل نہیں واقفِ رموزِ جہاں
عقل درماندہ جستجو حیراں

موت اور زندگی، زمان و مکاں
ہیں ترے علم ہی کے سِتر نہاں

اپنے افعال میں تو ہوں مجبور
تیری تقدیر ہی میں ہوں محصور

کچھ ارادے میں اختیار سا ہے
اپنی ہستی کا اعتبار سا ہے

خالقِ خیر و شر ہے تیری ذات
کاسبِ خیر و شر ہے میری ذات

ایسے کتنے مسائلِ عرفاں
بحثِ لفظی میں ہو گئے پنہاں

اک معمّا ہے جس کا حل ہی نہیں
فکرِ انساں میں اتنا بل ہی نہیں

مشعلیں جل رہی ہیں چاروں طرف
کارواں ہیں رواں ہزاروں طرف

جل رہے ہیں فلاسفہ کے چراغ
پھر بھی تاریک ہیں قلوب و دماغ

راستہ ہی نظر میں ہے نہ مکاں
فکر کی پیٹھ پر ہے بارِ گراں

آنے جانے میں اختیار نہیں
ایک لمحے کو بھی قرار نہیں

کش مکش جبر و اختیار میں ہے
زندگی سخت خلفشار میں ہے

کتنی چیزیں ہیں ماورائے شعور
پردہ در پردہ جلوہ مستور

راہ ملتی نہیں کہاں جاؤں
گمرہی خندہ زن جہاں جاؤں

امتحاں سخت، زندگی گزراں
وقتِ فرصت قلیل، وہ بھی رواں

حضرت نشتر جالندھری

املا کی غلطیاں

(بسلسلۂ اشاعت گذشتہ)

بعض حضرات عربی کے عام مفرد و مرکب الفاظ کو جو اردو میں نہایت کثرت سے مستعمل ہیں غلط لکھ جاتے ہیں۔ الف ممدودہ اور مقصورہ میں تمیز نہیں کرتے۔ "ذ" کی جگہ "ز"، "ظ" کی جگہ "ض"، "ق" کی جگہ "ک"، یائے معروف (ی) کی جگہ یائے مجہول (ے) تحریر کر جاتے ہیں۔ مثلاً :۔

آسامی :۔ جب یہ لفظ "عہدہ" یا "ملازمت کی جگہ" کے معنی میں استعمال کیا جائے تو اسے اسامی (الف مقصورہ سے) لکھنا چاہئے۔ آسامی (الف ممدودہ سے) لکھنا غلط ہے۔ "اسامی" اصل میں عربی لفظ ہے جو اسم کی جمع الجمع ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں "نام" لیکن اردو والوں نے اسے "عہدہ" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اگر "آسامی" سے مراد آسام کا باشندہ یا چیز ہو تو الف ممدودہ ہی سے لکھا جائے گا۔

اوسط :۔ یہ عربی لفظ ہے۔ اسے یائے معروف (ی) سے لکھنا صحیح اور یائے مجہول (ے) سے لکھنا غلط ہے۔ کیونکہ عربی میں یائے مجہول (ے) نہیں آتی۔ اسی طرح "موسے" کو "موسیٰ"، "عیسے" کو "عیسیٰ" اور "تعالے" کو "تعالیٰ" لکھنا چاہیے۔

اولو العزم :۔ یہ اصل میں "اولو" اور "عزم" سے مرکب ہے۔ "ال" اضافت کا ہے یعنی "ارادے کے صاحب"۔ عام ناواقف حضرات اسے "واؤ" کے بغیر ہی لکھ جاتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

بالمشافہ :۔ "مُشافہَہ" بروزن مُقابلَہ صحیح اور "مُشافہ" بروزن "محالہ" غلط ہے۔ یہ بابِ مُفاعلَہ سے ہے اس لئے وزن پر "مُشافہَہ" آتا ہے۔

بُرقعہ :۔ عربی میں "بُرقُع" تھا۔ اردو والوں نے "بُرقع" کر لیا۔ ناواقف لوگوں نے اس کے آخر میں "ہ" کا بھی اضافہ کر دیا۔ سراسر غلط ہے۔

ذرا :۔ صحیح لفظ "ذرا" (ذال) سے ہے۔ اس کا ماخذ عربی لفظ "ذَرّۃٌ" ہے۔ فارسی میں "ذَرّہ" ہو گیا۔ اردو میں "ہ" کو "الف" میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسے "ز" سے صحیح سمجھنے والے حضرات یہ دلیل لاتے ہیں کہ "ذ" خالص عربی کا لفظ ہے لیکن اردو کو اس بحث سے واسطہ نہیں کیونکہ نہ "ز" خالص اردو کا حرف ہے نہ "ذ"۔ "غیض" "حیض" "ذض" سے ایک الگ لفظ ہے۔ غصے کے معنی میں "غیظ" (ظ) صحیح ہے۔ چونکہ یہ لفظ "غضب" کے ساتھ مل کر مستعمل ہے اس لئے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ "غضب" کی طرح یہ بھی "ض" ہی سے ہوگا۔

موقعہ :۔ مَوقِع یا مَوقَع بروزن مَفعِل یا مَفعَل عربی میں دونوں طرح درست ہے لیکن اردو میں مَوقَع مستعمل ہے۔ عربی اسم ظرف مکان ہے اس کے آخر میں "ہ" کسی

مدیرِ اعزازی کی یاد میں

جناب عبدالعزیز خالد

چمن میں نوحہ کناں ہیں نواگرانِ چمن — بچھڑ گیا ہے مگر میرِ کاروانِ چمن
کہاں وہ پہلی سی جاں بخش نزہت افشانی — کہ پائمالِ خزاں ہے بہارِ سرو و سمن
حیات و مرگ کا پیچاک حلقہ در حلقہ — فراغِ عرصۂ ہستی، فروغِ رنگِ دمن
سراب ہے یہ جہاں بے ثبات ہے دُنیا — فریبِ رنگ ہے نظّارہ سازیٔ گلشن
وہ بذلہ سنج و شگفتہ دماغ و رمز آگاہ — متاعِ نازشِ پنجاب و افتخارِ وطن
وہ جسکے ہاتھوں نے شعر و ادب کو سینچا تھا — وہ جس نے شاہدِ اردو کا طُرّہ [illegible]
وہ جس کے ذوقِ رسا کی سلامتی کی دلیل — رہا ہے اور رہے گا رسالۂ "مخزن"
وہ جس کو شاعرِ مشرق سے ربطِ محکم تھا — وہ رندِ بادہ نشیں، حریفِ بزمِ کہن
وہ یادگارِ کمالاتِ ماضیٔ مرحوم — وہ جسکے دم سے پرانے چراغ تھے روشن
قضا کے دستِ ستم نے اسے بھی چھین لیا — فغاں! کہ برقِ جہندہ سے جل گیا خرمن
کہاں سے آئے گا ایسا مُبصر و ناقد — کہاں یہ پائیں گے ایسا ادا شناسِ سخن
مزارِ شیخ پہ ابرِ کرم کی بارش ہو — فضائے عرش سے انوار کی تراوش ہو

حضرت تمکین کاظمی از حیدرآباد (دکن)

علامہ عبدالقادر ان بزرگوں میں سے تھے جو معمارانِ قوم کہلا سکتے ہیں، علامہ مرحوم نہ صرف تعلیمی اور ادبی حیثیت سے قوم کے معمار تھے بلکہ اخلاق و کردار کی حیثیت سے بھی! مرحوم نے طالب علمی کے زمانے سے قومی خدمت شروع کی تھی اور آخری دم تک کرتے رہے۔

ابتدا ہی سے آپ نے ملک اور قوم و ادب اور شعر کی جو خدمت شروع کی مسلسل ساٹھ سال تک جاری رہی، اردو زبان سے آپ کو دلی عشق تھا اور اس کے سچے شیدائی تھے، چنانچہ نوجوانی ہی میں آپ نے اردو کے شاعروں اور انشا پردازوں پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا جو بڑے اہم اور کارآمد لیکچر تھے چونکہ یہ لیکچرز انگریزی زبان میں تھے اس لیے مستشرقین نے ان کو بہت پسند کیا، یہ مجموعہ [illegible] میں طبع ہوا۔

مخزن سے پہلے اردو میں رسائل یا ماہنامے نہیں نکلتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گلدستے البتہ شائع ہوتے تھے جو نہایت گھٹیا قسم کا ادب پیش کرتے تھے اور جن میں صرف طرحی غزلیں ہوتی تھیں، ادب العالیہ اور تنقید اردو میں بالکل مفقود تھی، ابتداً مخزن ہی نے ادب العالیہ [illegible]

شائع ہونے لگیں اور سنجیدہ اور ٹھوس مضامین شائع کئے۔ علامہ مرحوم بڑے جوہر شناس تھے اور آدمی کو پرکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ اقبال ان کے بہت قریبی دوست تھے۔ ۱۹۰۴ء میں علم اقتصادیات پر جو پہلی کتاب اردو میں علامہ اقبال نے شائع کی وہ علامہ عبدالقادر ہی کی تحریک کا نتیجہ تھی۔ اس وقت علامہ اقبال کی شاعری محض احباب ہی تک محدود تھی اور لمبی نظمیں بھی وہ نہیں لکھتے تھے۔ علامہ عبدالقادر ہی نے علامہ اقبال کو لمبی نظم لکھنے پر اکسایا اور ۱۹۰۰ء میں ان سے "نالۂ یتیم" لکھوا کر انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں پڑھوائی اور پھر مخزن میں شائع بھی کی۔ اس کے بعد علامہ اقبال ترک شاعری کی طرف مائل ہوگئے مگر حسن اتفاق سے ان دنوں لندن میں علامہ عبدالقادر بھی موجود تھے، جنہوں نے اقبال کو ترک شاعری سے بچا کر قوم پر ایک احسان عظیم کیا۔ اس قصہ کی دلچسپ تفصیل بانگ درا کے دیباچے میں ملتی ہے۔

غور فرمائیے کہ علامہ عبدالقادر آڑے نہ آتے اور علامہ اقبال شاعری ترک کر دیتے تو کیا ہوتا؟ اقبال اگر شاعری ترک کر دیتے تو صرف ایک فلسفی رہ جاتے اور بجائے علامہ اقبال بننے کے صرف شیخ محمد اقبال بن کر رہ جاتے۔ نہ تو یہ وسعت نظر و خیال پیدا ہوتی جو شاعری کی وجہ سے پیدا ہوئی اور نہ وہ پاکستان کا تخیل پا سکتے جو آج مجسم طور پر آپ کے سامنے ہے۔ اس طرح پاکستان کی تخلیق کا پہلا سہرا علامہ عبدالقادر کے سر ہے۔ علامہ عبدالقادر نے صرف ان دو ہی (یعنی مومن و علامہ اقبال) کو اجاگر کیا بلکہ اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو منظر عام پر پہنچایا۔ چنانچہ مولانا تاجور نجیب آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے جیسے بھی اسی جوہری کے پرکھے ہوئے ہیں۔ علامہ نے بالخصوص مذہب و ملت اور بالخصوص پنجاب و دکن سب پر اپنے الطاف و شفقت و محبت کے موتی نچھاور کئے ہیں۔ ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں میں نے پہلی بار علامہ مغفور کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل کی اور پہلی ہی ملاقات میں علامہ نے ایسی بزرگانہ شفقت کا اظہار کیا جو انہیں کا اور صرف انہیں کا حصہ تھا۔ میں نے علمی فراخ حوصلگی اور ادبی بلند خیالی مشاہیر ہند میں سے کسی میں اتنی نہیں پائی جتنی علامہ مرحوم میں تھی۔ مجسم علم اور سراپا ادب میں نے بڑے بڑے علما و ادبا کو دیکھا ہے ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مگر جو بات میں نے علامہ عبدالقادر میں پائی وہ کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ آپ حضرات کو حیرت ہوگی کہ مجھ جیسے حقیر طالب علم پر علامہ کی جو نوازش تھی وہ ایسی بزرگانہ اور پر خلوص تھی کہ میرے افراد خاندان اور خاص خاص لوگ بھی اتنا نہ کر سکتے تھے۔

علامہ مرحوم جن دنوں لندن میں تشریف فرما تھے، انہیں دنوں میں نے مومن خاں مومن دہلوی پر مستقل طور پر کام شروع کیا تھا۔ میں نے لکھا کہ یورپ میں کوئی چیز مومن سے متعلق مل جائے تو خیال رکھئے۔ علامہ نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود لندن کے کتب خانوں میں چھان بین کی اور مجھ حقیر کو مطلع فرمایا۔ غور فرمائیے اس حیثیت کا کوئی شخص ایک غیر شخص کے لئے اتنی زحمت برداشت کر سکتا تھا۔ یہ علم دوستی اور ادب پروری علامہ عبدالقادر کے لئے مخصوص تھی۔

علامہ مرحوم نے کبھی پروپیگنڈا پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ خاموش کام اور ٹھوس خدمت کرتے رہے۔

حضرت جوش ملسیانی از نکودر (جالندھر)

شیخ عبدالقادر مرحوم کی وفات حسرت آیات کی خبر میں نے دہلی میں بڑے رنج و اندوہ سے سنی۔ مرحوم کی ادبی خدمات کو اردو زبان کبھی فراموش نہ کرے گی۔ حسن اخلاق اور فراخ دلی و وسعت نظر میں بھی ان کا تو مقابل کوئی نہ تھا۔ مشاعروں کے نہایت موزوں صدر تمام ملک میں صرف دو ہی

[illegible] مرحوم ایک [illegible] تھی، افسوس کہ محفلِ ادب دونوں سے خالی ہو گئی اور ان کا نعم البدل چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے گا۔ [illegible] جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور از لکھنؤ

شیخ عبدالقادر کے انتقال سے اردو کا ایک بڑا محسن اور ہمارے پچھلے ادبی دور کا ایک نمایاں نام ہم سے جدا ہو گیا۔ مرحوم سے علی گڑھ اور دہلی میں مجھے نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ اس لئے ذاتی طور پر بھی ان کی پاکیزہ شخصیت، ادبی ذوق اور علمی تبحر کا قائل تھا۔ اردو زبان و ادب سے جتنی گہری بھی اور والہانہ محبت میں نے کم لوگوں میں دیکھی، وہ واقعی اردو کے عاشق تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی ہر ادبی، اصلاحی اور علمی تحریک کا ساتھ دیا، وہ ایک انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اس وقت آپ کو خط لکھ رہا ہوں تو بے ساختہ میر کی ایک رباعی یاد آ رہی ہے ؎

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے   ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے اِک خلق   خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

مرحوم پر یہ رباعی صادق آتی ہے۔ ان کے سکوت میں وقار تھا، اور ان کے تکلم میں پُرسکون جادو۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے۔ مخزن شیخ صاحب کی سب سے بڑی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ مخزن ہر دور میں ہر قسم کے اچھے نئے اور پرانے ادب کا گنجینہ رہا ہے۔ اس وقت اور بھی اس کی ضرورت ہے۔ ماضی کے قیمتی ورثے کے تسلسل اور نئے تجربات کی تازگی، دونوں کو عزیز رکھنا چاہیے۔ اسی کو میں توازن کہتا ہوں، اور آپ جانتے ہیں شیخ صاحب میں یہ توازن کس حد تک موجود تھا۔

محترمہ نزہت صدیقہ بارہ بنکوی

"آہ! آج ماہنامہ مخزن یتیم ہو گیا"

میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ دل خراش الفاظ قلمبند کرتی ہوں۔ آہ! کن آنکھوں سے یہ چند الفاظ پڑھے اور کیسی ضرب کاری لگی۔ آج ڈاک سے ندائے حرم آیا۔ دن کو فرصت نہ مل سکی تو شام کو پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے گیارہ بج گئے۔ تقریباً تمام رسالہ ختم ہو گیا، خیال ہوا کہ اب صرف فہرست باقی ہے، پھر دیکھوں گی، مگر جو مشیّت کو منظور ہوتا ہے وہ ہی ہو کے رہتا ہے۔ میں سونے چلی اپنے سرہانے سے رسالہ مخزن اور تعمیر حیات اٹھایا معاً ندائے حرم کا آخری صفحہ کھل گیا۔

"المناک حادثہ" کو دیکھ کر دوبارہ مطالعہ کا خیال پیدا ہو گیا۔ نیند کا جیسے پتا ہی نہیں۔ میرے سامنے شیخ عبدالقادر صاحب پر نظریں پڑ گئیں۔ میرے معبود! مرحوم میرے ننھے رسالے کے مدیر اعزازی تو نہیں ہیں کہیں رسالہ مخزن کے ٹائٹل پر اور کبھی صفحۂ ندائے حرم پر نظریں جا پڑتیں۔ بس دیر تک نگاہیں دونوں کا طواف کرتی رہیں۔ بڑھتی ہوئی پریشانی میں اپنے خیال کو غلط ثابت کرنے کی غرض سے غور سے پڑھنے لگی، ناگہاں سطر آخری نے روح فرسا خطرے کی تصدیق کر دی۔ بلکہ میں اندوہ و غم کی شدت میں اس جملے کو زیرِ لب دہرانے لگی "ماہنامہ مخزن آج یتیم ہو گیا ہے"۔

مرحوم ان چند علماء سے تھا جو وقت و ہمیشہ سے بیان سے باہر ہے۔ خداوند بزرگ وبرتر کے عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرما اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور دنیا میں ان کا نام رسالہ مخزن سے زندہ جاوید رہے اور خادم مخزن بہن بھائیوں کو توفیق دے کہ مرحوم کے نام پر ایصال ثواب یا نیز جس وقت رسالہ مخزن ہمارے ہاتھوں میں پہنچے، بجائے اس کے کہ فرط مسرت سے رسالہ کھولیں پہلے در بار حقیقی میں اپنے محسن کے لئے استغفار اور مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھائیں۔

جناب غنی احمد صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ از دہلی

اخبارات سے معلوم کر کے سخت افسوس اور رنج ہوا کہ آپ کے مدیر اعزازی اور اردو ادب کے شیدائی جناب سر عبد القادر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نصف صدی سے زائد عرصے تک سر عبد القادر مرحوم نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مرحوم کو میں نے پہلی اور آخری مرتبہ جامعہ کے جشن سیمیں کے موقع پر تقسیم اسناد کے جلسے میں دیکھا تھا، جب انہوں نے اپنے دست مبارک سے خاکسار کو جامعہ کی سند مرحمت فرمائی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا تھا کہ باوجود پیرانہ سالی کے وہ کیسے جواں ہمت تھے۔ دوبارہ ملاقات کی تمنا ہی رہی لیکن افسوس ہے کہ موقع نہ مل سکا۔

اگرچہ ان کی موت ہم سب کے لئے ایک زبردست نقصان ہے لیکن ان کے انتقال سے جو نقصان آپ کو پہنچا ہے اس کا اندازہ لگانا بہ مشکل نہیں ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جناب عبد المجید صاحب حیرت از موڑک راجستھان (بھارت)

"حضرت شیخ عبد القادر صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر تازہ اخبار "ریاست دہلی" سے ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کون ہے جسے شیخ صاحب کے اس دنیا سے اٹھ جانے کا رنج نہ ہوگا۔ مخزن شیخ صاحب کی یادگار ہے۔ خدا کرے رہتی دنیا تک قائم رہے۔"

جناب عارف شاہوی ناظم اعلیٰ دفتر طلوع اسلام کراچی

بزرگ ملت الشیخ عبد القادر صاحب (مرحوم) کے انتقال کی خبر ملی۔ میرا ایمان ہے کہ حضرت گرامی شیخ صاحب مرحوم یہاں سے جنت میں منتقل ہوئے ہیں، اس مقدس تبادلے پر میں آنسو کیوں بہائے جائیں۔ میں تو خوش ہوں کہ ہمارے مربی جنت نشین ہوئے، رہا یہ کہ وہ اب ہماری محفل میں نہیں رہے تو اس کا فائدہ کیا ہے۔ اگر بات ہی تو تغیر کی ہے کہنا کہ وہ مر گئے ہیں ان کی شان میں گستاخی ہے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں   یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

مخزن المخازن

قندیل

۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء

شاعرِ مشرق سے میری آخری ملاقات

حضرت شیخ عبدالقادر علیہ الرحمۃ

ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ادبی حلقوں میں بہت سے خطاب قوم کی طرف سے یا ان کے ہم عصر عزیزوں کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو سب اپنی اپنی جگہ موزوں ہیں۔ مگر میں ان کے لئے شاعرِ مشرق کا خطاب خاص طور پر موزوں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے تہذیبِ مغرب کا پول کھول کر اہلِ مشرق کے دلوں سے اس رعب کو مٹانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے جو اکثر مشرقی ممالک میں لوگوں کے دلوں پر مسلط تھا اور مشرق میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ مشرق ہر اس بلندی پر پہنچ سکتا ہے جس پر مغرب پہنچ کر اترا رہا ہے۔

میں جب ۱۹۳۴ء میں ہائی کورٹ کے کام سے سبکدوش ہو کر پانچ سال کے لئے اس وقت کے وزیرِ ہند کے محکمے میں لندن گیا تو میرے محترم دوست سر محمد اقبال بحیثیت مجموعی بخیریت تھے۔ ان کی علالتوں کا دور میری غیر حاضری میں شروع ہوا اور جب میں اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر ۱۹۳۷ کے اواخر میں ہندوستان آیا تو میں یہاں آنے کے جلد بعد ان سے ملنے گیا۔ جب میں پہنچا تو وہ ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے اور لحاف اوڑھے ہوئے تھے مگر ان کی وسعتِ اخلاق کی وجہ سے اس حالت میں بھی متعلقین ملنے

والوں کا ایک گروہ ان کے گرد [illegible] بیٹھا تھا۔ اس گروہ میں ایک معزز شہر کا ایک [illegible] اور ایک [illegible] اخبار اور ایک دو ایڈیٹر موجود تھے اور چند نوجوان طالب علم۔

مرحوم مجھ سے بہت محبت سے ملے اور [illegible] مجھے گلے لگایا اور اپنی چارپائی پر ہی بٹھا لیا۔ جو [illegible] بیٹھے تھے وہ چند منٹ ٹھہرے اور پھر یہ سمجھ کر کہ شاید مجھے مرحوم سے بحیثیت ایک پرانے دوست کے بہت سی باتیں کرنی ہوں گی، یکے بعد دیگرے اجازت لے کر رخصت ہوتے گئے اور وہیں آپس میں باتیں کرنے کا موقع دیا۔ ہم ابھی خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان کی صحت کا حال پوچھا اور انہوں نے بتایا کہ اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ وہ مجھ سے انگلستان کے قیام کے حالات سنتے رہے اور بعض دوستوں کی بابت پوچھتے رہے اور میرے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے یہ بھی دعوت دی کہ دوسرے دن میں دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں نے بخوشی یہ دعوت منظور کر لی اور دوسرے دن پھر ان کے ہاں گیا مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس وقت وہ بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھے تھے اور دو اور دوست بھی موجود تھے جو کھانے میں شرکت کے لئے مدعو تھے ایک تو چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے جو اس زمانے میں ان کے معتمد رفیق تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے اور صاحبزادی کی نگرانی کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں اور انہوں نے ان کی تصانیف کی اشاعت بھی [illegible] دلچسپی لی ہے دوسرے صاحب ریاست بہاولپور کے ایک مشہور خاندان [illegible]

انہوں نے سفر کے سلسلے میں تقریر کی ہے اس میں لاہور کے اخبار [illegible]
[illegible] ہے۔

سیاحت ایران کے نام کی جو کتاب اس وقت آزاد سے منسوب ہے اس کے
پہلے حصے میں آزاد کی لاہور سے چلنے کی تقریر ہے اور دوسرے حصے میں تقریر
ہے جو انہوں نے سفر سے واپس آنے کے بعد لکھنا شروع کیا تھا۔ تقریر میں کئی جگہ
آزاد نے سفرنامے کا حوالہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرصت کے
وقت میں بیٹھ کر اپنی یادداشتوں کی مدد سے اس سفرنامہ کو مرتب کیا کرتے تھے
حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔ سفرنامے کا ابتدائی حصہ انہوں نے خاصی
تفصیل سے لکھا ہے لیکن بعد کے بہت سے حصے حذف ہیں۔ مثلاً یہ طہران
تقریباً تین مہینہ رہے سفرنامے میں وہ تین مہینہ کی سرگذشت نہیں ملتی۔ حالانکہ
میں طہران کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ طہران سے مشہد اور مشہد سے ہرات
اور قندھار کے راستے ہندوستان کی واپسی کا حال بھی تشنہ رہ جاتا ہے۔
بعض جگہ صرف چند فقرے لکھے ہیں کہیں کسی مزار کا کتبہ نقل کر دیا ہے بعض
دفعہ کسی اہل زبان سے جو محاورہ یا فقرہ سنا تھا اسے یادداشت کے طور پر
لکھ لیا ہے۔ آزاد نے ایران کا سفر جن مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا تھا وہ اپنی جگہ
بہت مفید اور قابل تعریف ہیں۔ مکتوبات آزاد اور سفرنامے میں انہوں
نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اس وقت لاہور میں کوئی ایسا کتب خانہ نہیں کہ جہاں
سے علم کے شائق کتابیں حاصل کر سکیں۔ اس وقت یونیورسٹی کی لائبریری بھی قائم
نہیں ہوئی تھی۔ اور اہل علم کو اس وجہ سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔

غدر کی مصیبتوں اور حوادث زمانہ نے ۵۵ برس کے بعد آزاد کو
بے حد کمزور اور نحیف کر دیا تھا لیکن اس پر غضب یہ ہوا کہ ان کی چہیتی بیٹی کا
انتقال ہو گیا۔ اس کا ان کے دل و دماغ پر اس قدر اثر ہوا کہ عزیزوں کو ان
کے متعلق کافی تردد پیدا ہو گیا۔ جب سفر کا ارادہ انہوں نے ظاہر کیا تو
دوستوں اور رشتہ داروں نے اس کی مخالفت کی۔ بہت سمجھایا مگر یہ
اپنی دھن کے پکے تھے جس بات کے لئے کمر باندھ لی اسے پورا کر کے دم

دیا۔ وہاں ہزاروں کی رقم صرف ہوئی اور کتابوں کے سلسلے میں [illegible]
تھی۔ قدم قدم پر آزاد کو کتابوں کا خیال تھا اس لئے سفر میں تکلیف برداشت
کی اور یہ مرتبہ کتابیں خریدنے کے سلسلے میں جا بجا [illegible]
کرتے رہے تھے وہاں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔

جب ان کو جہاز پر [illegible] تو انہوں نے [illegible] گفتاری
زبان پر سنتے رہے۔ اسی طرح جب وہ اس جہاز سے [illegible]
انہوں نے اس بات کو نوٹ کیا کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے ہوئے [illegible]
بولتے تھے جیسے ہزاروں داستانیں۔ ایران کے سفر میں ہر مقام پر آزاد کے
کان اہل زبان کی بات بات پر لگے ہوتے تھے۔ جہاں کہیں قافلہ ٹھہرتا
تھا دوسرے لوگ کھانے پینے کی چیزیں لینے نکل جاتے تھے اور یہ علماء
اور فضلاء کی تلاش میں پڑے ہوتے تھے۔ [illegible] شیراز تک
ہر گاؤں میں جا کر اہل علم سے انہوں نے ملاقات کی۔ [illegible] اہل ایران کو
ان کی زبان دانی اور علمیت پر تعجب ہوتا تھا۔

علم کی تلاش اور جستجو کا یہ شوق ہمیں ان کی تمام سیاحت ایران
میں نظر آتا ہے۔ بعض اوقات آزاد کو خود علمائے ایران کی سادہ
زندگی پر تعجب ہوتا تھا کہیں ندی کے کنارے کوئی عالم بیٹھا کپڑے
دھو رہا ہے اور مشتاق طالب علموں کو سبق پڑھا رہا ہے کہیں گلی
میں کوئی جید فاضل سر پر [illegible] لئے جا رہا
ہے اور کہیں کوئی صاحب علم و فضل کسی دوکان کی [illegible] کر رہا ہے۔
ایک جگہ کسی صاحب تصنیف بزرگ کے لڑکے کو [illegible]
پھرتے دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور فرماتے ہیں [illegible]
علم پدر آموز"

شیراز کی حالت [illegible] حافظ اور
سعدی کے وطن کی اس وقت کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا [illegible]
شیراز کی خوش شکل [illegible] روز [illegible]

نے یہاں مشہور ... اور ادیبوں سے ملے۔ شروع میں کچھ افراد
کے دروازہ پر پہنچے تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس سے
یہ مایوس نہیں ہوئے۔ مجالس میں جا کر تے رہے۔ چلنے سے
دو روز پہلے ایک مذہبی عالم شیخ سے ملاقات ہو گئی جو انہیں اپنے
مکان پر لے گئے اور آزاد کو خود شیخ نے اہل علم سے بھی ملوایا۔

اصفہان کو اہل ایران نصف جہان کہتے ہیں۔ شیراز کے
بعد اصفہان کی تاریخی عمارتیں، مدرسے اور مسجدیں دیکھنے کا انہیں
بہت شوق تھا مگر سردی کا موسم سر پر چلا آ رہا تھا۔ اس لئے یہ
اصفہان میں پانچ روز سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے۔ اصفہان سے یہ کاشان
کے راستے طہران گئے۔

علماء اور فضلاء کی عزت اہل ایران کے دل میں تھی کہ ہم
اصفہان میں میر باقر کی قبر، کاشان میں ملا محسن کاشانی کے مزار
پر، بسطام میں حضرت بایزید بسطامی کی تربت پر، اور نیشاپور
سبزوار، مشہد، جام اور ہرات میں بہاؤ الدین آملی، شیخ بہاء الدین
... اسفرائنی، جامی، شیخ جام، امام فخر الدین رازی، اور
واعظ کاشفی کے مزاروں پر زائرین کو فاتحہ پڑھتے اور عقیدت
کے پھول چڑھاتے دیکھتے ہیں۔ ایک جگہ ترازو پر سامان تل رہا ہے
اس کے قریب ہی چبوترے پر علماء دستور گیر بیٹھے سوتے ہیں۔ آزاد
چند لمحے کے لئے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے کے لئے ٹھٹک جاتے
ہیں مگر رخصت ختم ہو رہی ہے اور سفر لمبا ہے۔ اس لئے کہیں ٹک
کر دم نہیں لیتے۔ صرف طہران میں انہوں نے تقریباً تین مہینہ قیام
کیا۔ مگر یہ وقت بھی بہت سی تحقیقوں اور ادبی مشاغل میں صرف
ہوا۔ ایران کے سفر کا حاصل تھا۔ ناصر الدین قاجار کی یورپ کی سیاحت
نے ... مغرب کا ... کیا تھا، اور ان کی وجہ سے
اہل ایران ... رہے تھے۔ قدیم شاعری اور خیال بندی
کی جگہ ... علم و حکمت کی طرف لوگوں کی توجہ تھی۔ آزاد کو
طہران میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کوئی مشہور شاعر نہیں ہے۔

طہران کی علمی مجالس میں اس بات کا بھی بہت خوشگوار
احساس ہوتا ہے کہ اکثر شہزادے اور روسا صاحب تصنیف
ادیب تھے۔ بحیر الدولہ شاہزادہ فرہاد مرزا اور ان کے صاحب
زادے احتشام الملک اور دبیران و میرزا رضا خان ایسے
نام ہمیں سفرنامے میں ملتے ہیں۔ اس زمانہ میں عربی الفاظ
کی جگہ قدیم فارسی الفاظ استعمال کرنے کی تحریک شروع
ہو چکی تھی۔ آزاد کی اس سلسلہ میں مرزا رضا خاں سے بہت
دلچسپ بحث رہی۔ مرزا چاہتے تھے کہ ایک دم سب عربی
الفاظ کا استعمال بند کر دیا جائے۔ آزاد کہتے تھے کہ یہ کام ایک
روز کا نہیں بتدریج کرنا چاہئے اور اخباری اور شاہی اقتدار
کی راستے اس میں حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر قابل
ذکر ہے کہ اس تحریک کا اصل عروج رضا شاہ پہلوی کے
دور میں ہوا۔ اور رضا شاہ نے آزاد کے خیال کے مطابق
اخباروں اور تراجم سے یہ کام لیا۔

طہران میں آزاد نے کتابوں کے انبار کے علاوہ لغت
کے لئے الفاظ کے ذخیرے اور قند پارسی کے لئے اہل زبان
کے محاورے بھی جمع کئے۔ جب مارچ کے مہینے میں موسم
بہار نے سر نکالا اور آخری برف باری ختم ہوئی تو شوق کا زاد
راہ باندھ کر مشہد مقدس روانہ ہو گئے۔ مشہد سے ہرات اور
قندھار کا سفر ایک اور سخت منزل تھی کیونکہ اس علاقے میں
سردی اور برف باری ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے
ایران کی سرحد سے نکل کر آزاد جب افغانستان کے علاقہ
میں داخل ہوئے تو ان پر اپنوں کے محبت اور خلوص کی جگہ
قدم قدم پر انھیں تعصب اور جہالت کا سامنا کرنا پڑا۔ مصیبت
پر مصیبت یہ آئی کہ قندھار کے راستہ میں ایک رات اونٹ

گئے تین گر گئے، عمر اور گی کے بل گرے تھے اس
میں کوئی کسر باقی نہیں تھی مگر خدا کی قدرت بچ گئے۔
بہت چوٹ آئی اور ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ ساربان نے
کر سامان میں لپیٹ کر اونٹ پر ڈال رسی سے کس
بے خبری میں صبح منزل پر پہنچ کر ہوش آگیا، اور پسلی خود بخود
جڑ گئی۔ اس کے باوجود تحقیق کا شوق کسی آن چین سے
نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جہاں موقع ملتا پرانی عمارتوں کے کتبے
نقشے نقل کر لیتے۔ ہر جگہ کتابوں کا دھیان سب سے پہلے
ہوتا تھا۔ ایک مقام پر زور کی بارش ہو رہی تھی اور زمین ایسی
رپٹیلی تھی کہ اونٹ پھسلتے تھے۔ سارا قافلہ ایک میدان میں
ٹھہرا۔ جب سامان اتار لیا تو آزاد نے جان سے زیادہ
کتابوں کو پانی سے بچایا۔ اور ان پر موٹے موٹے گدے
ڈال دیے۔ اور آپ نمک بستہ بیٹھ گئے۔ کوئٹہ پہنچنے کا جو
نقشہ کھینچا ہے یہ ایک ایسے عاشق کی تصویر ہے جو اپنے
محبوب کو ہفت خوانِ رستم طے کرنے کے بعد اپنے ہمراہ لایا
ہے کس اہتمام سے یہ کوئٹہ آتے ہیں۔ یہ انھیں کے الفاظ
میں سنئے :-

"ایک چھکڑا کرایہ پر کیا، اس میں کتابیں
لادیں اور آپ بچھونا بچھا کر اوپر بیٹھا۔"

سیر ایران سفرنامے کے لحاظ سے اگرچہ مکمل کتاب
نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اس کی دلچسپی میں کوئی شبہ نہیں
اس کی تاریخی اعتبار سے یوں بھی حیثیت بلند ہے،
کہ آزاد کی زندگی کے متعلق ہمیں بہت کم باتوں کا علم
ہے۔

ادبی دنیا

غزل

ندیم جعفری

وحشتِ شوق جو اس حسنِ دل آرام سے ہے
کیا سروکار مجھے سرِ زلفِ علم سے ہے
کس طرح عشق فنا سے ہو جنوں کاری ہو
پاک وہ حسن ہر اندیشۂ اوہام سے ہے
درمیاں کیوں رہے یہ سلسلۂ حسن و حجاب
آؤ کھل جائیں کہ خدمت اسی اقدام سے ہے
عالمِ شوق میں جو ہوگا وہی عین درست
کچھ سروکار نہ آغاز نہ انجام سے ہے
کون سنتا ہے زمانہ میں فقیروں کی صدا
اہلِ دنیا کو غرض منصب و اکرام سے ہے
آپ جو چاہیں کہیں آپ کا ارشاد بجا
صرف مطلب ہمیں پابندیِ احکام سے ہے
بتِ خود کام! زمانے میں بجز خالقِ خلق
کون آگاہ تری لذتِ دشنام سے ہے
میرے اشعار میں مستیِ صہبا ہے ندیم
اک ارادت جو مجھے حافظ و خیام سے ہے

نظام المشائخ

شیخ عبدالقادر

ملا واحدی

رسالہ "مخزن" سے پہلے رسالوں کی بجائے گلدستے شائع
ہوا کرتے تھے جن میں عموماً مشاعروں کی طرحی غزلیں چھپا
کرتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کس وقت کی [illegible]

یہ جذبِ عشقِ [illegible] سے ہوں دل بیار ہنوز

[illegible] زخم ہے یہ پوچھ دوستوں سے
کہ دیکھتے ہیں مجھے اکثر اشک بار ہنوز

[illegible] حیات، مرے وقت کے کلیجے میں
تپاں ہے وعدۂ فردا کا انتظار ہنوز

تلاشِ گل کا زمانہ گزر چکا، لیکن
گرہ کشا ہے تمنا کی نوکِ خار ہنوز

نفس کا دشنہ ہے بوستۂ گل و سمن اب تک
جگر کا تیر ہے صوتِ دف و ستار ہنوز

برس رہی ہے مرے خیمۂ تخیل پر
ترانہ سنجیِ مرغانِ شاخسار ہنوز

کسی کے دستِ حنائی نے جن کو بخشا تھا
پڑے ہوئے ہیں گلے میں وہ تازہ ہار ہنوز

پکار دو یہ جوانانِ پیرِ فطرت میں
کہ ہوں دیارِ جوانی کا شہریار ہنوز

مری جناب میں ہیں سرنگوں نگار اب تک
مری جلو میں ہیں صف بستہ گلعذار ہنوز

مری حیات کے شانوں پر اس غبار میں بھی
مچل رہی ہے کوئی زلفِ مشکبار ہنوز

پناہِ سایۂ موئے سفید و بختِ سیاہ
رواں ہے قافلۂ ابرِ سبزہ زار ہنوز

کبھی چمن، کبھی دریا، کبھی گہر، کبھی گل
مری نظر کو نہیں فرصتِ قرار ہنوز

خزاں کا دور ہے پھر بھی مرے تعاقب میں
رواں ہیں جوشِ رسولانِ صد بہار ہنوز

[illegible]

غالب کا کلکتہ

(حمید احمد خاں)

پنشن کا مقدمہ لڑنے کے لیے مرزا غالب [illegible] میں لمبے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں [illegible] کلکتہ تک انھیں شمالی ہند کے اکثر شہروں سے [illegible] حاصل ہوئی۔ لیکن لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، پٹنہ [illegible] توجہ سے وہ حقیقۃً کلکتہ کے لیے [illegible] بنارس کی تعریف میں ضرور ایک رنگین مثنوی فارسی کلیات میں موجود ہے لیکن یہ تعریف بنارس سے کہیں زیادہ "صبح بنارس" کے لیے وقف ہے۔ خلاف اس کے، کلکتہ میں شعر و سخن کے علاوہ اس شہر کی خالص جغرافیائی کیفیتیں بھی غالب کو قابلِ قدر معلوم ہوئیں۔ اس شہر کا پانی، اس کی ہوا، اس کا سبزہ، اس کا [illegible] اس کی ہر چیز ان کے لیے موجبِ فرحت تھی۔

وہ جب دہلی سے چلے تو [illegible] پریشانیوں کا ہجوم تھا۔ ذاتی مکان فروخت کرنا پڑا تھا۔ قرض خواہ [illegible] پھرتے تھے۔ بھائی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس حالت میں کلکتہ پہنچ کر ایک عجیب سی آسودگی محسوس ہوئی جسے انگریز حکام کی [illegible] التفاتوں نے بظاہر مستحکم بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ اور [illegible] عظیم الشان [illegible] انگریزی معاشرت کی آمیزش سے ایک دل فریب رنگینی تھی۔ کلکتہ آ کر مرزا غالب کو ہر لحاظ سے ایک نئے جہان کا انکشاف معلوم ہوا ۔

خوشا روز و خوشا [illegible]
گو رزم [illegible]

[illegible] کلکتے کی [illegible] کا دبدبہ

چلن [illegible] اس شہر کو جنت طراز زندگی میں ایک خاص

مقام [illegible] دیکھ کر غالب کے دل میں خود بخود پیدا ہوا۔

کلکتے سے [illegible] ایک فارسی خط میں ایک مختصر سی عبارت

ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ کی بین الاقوامی

چہل پہل، [illegible] کی رونق اور کلکتے کے مغربی شہر سازوں

کی ہنرمندی کا مرزا غالب کی طبیعت پر کیا اثر ہوا۔

بہ کلکتہ جہانے از ہر گونہ کالا مالا مال، بجز چارہ

مرگ ہر چہ گوئی بیش، ہنر و دانش سہل، وجود

بخت ہر چہ خواہی بہ بازار سخن ارزاں۔

(خط بنام علی بخش خاں رنجور)

دو سال بعد کلکتے کو الوداع کہہ کر پھر دہلی پہنچ گئے۔

مگر اب

رسیدن بہ دہلی تلافی ہجران کلکتہ نکرد، تا بہ شادی

چہ رسد، ہر کہ از اہل نظر مرا نگرد ہرگز نداند کہ

این ماہ سرو بہ منزل رسیدہ بہ وطن آرمیدہ ایست

بلکہ پندارد، دردمندیست از وطن دور افتادہ

تازہ بہ داغ غربت مبتلا۔

(خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

واپس دہلی آتے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے کہ نواب

امین الدین خاں کو کلکتہ روانہ ہوتے دیکھ کر اپنے قیام کلکتہ کی

حسرت آمیز یاد ستانے لگی۔

[illegible] والا قدر ستودہ سیر نواب امین الدین خاں

[illegible] جلب عزم بہ جانب کلکتہ راندہ و من

چون نقش قدم ہم دریں خرابہ خاک بہ سر ماندہ۔

(خط بنام نواب علی اکبر خاں طباطبائی)

کلکتے کے دو سالہ قیام نے غالب کے لئے اس صدہا میل

دور شہر کو نیم وطن بنا دیا تھا۔ وہاں اگر کچھ نئے دشمن بنے تھے تو

کچھ نئے دوست بھی ہاتھ آئے تھے۔ اوپر کے دونوں خط انھیں

دوستوں کی یاد سے معمور ہیں۔ لیکن کلکتہ صرف ان دوستوں کی

وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنی وجہ سے بھی عزیز تھا۔ اس سلسلے میں

وہ مشہور قطعہ دیکھئے جو یوں شروع ہوتا ہے ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اسی قسم کے جذبات کا اظہار نثر میں بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک فارسی خط

میں لکھتے ہیں کہ اگر میں عیال دار نہ ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر

کلکتے میں بس گیا ہوتا۔ پھر کلکتہ کی چار خوبیاں اس طرح گنائی

ہیں:۔

زہے ہوائے سرد و خوشا آب ہائے گوارا

فرخا بادہ ہائے ناب و خرما ثمرہائے شیریں

(خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

یہ شہر جسے ہماری تہذیب کے دور آخر کے اس سب سے

بڑے ترجمان نے اس طرح سراہا۔ اب بھی کلام غالب کے شائقین

کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور رکھتا ہے۔ لیکن آج کا کلکتہ

بلکہ خود تین سال پہلے کا بین الاقوامی کلکتہ، غالب کا کلکتہ نہ تھا

غالب کے وقت سے لے کر اب تک ہندوستان کا جغرافیہ اور

اس کے شہروں کے خد و خال بے حد بدلے ہیں چنانچہ انیسویں

صدی کے ربع اول کا کلکتہ جس میں ابھی نہ ریل نمودار ہوئی تھی

نہ تار برقی نہ بجلی کی روشنی اور نہ کالج اور یونیورسٹی۔ یہ بیچ عنوان

اب موجود نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس شہر میں سوا سو برس پہلے

غالب نے قدم رکھا، اس کی اصل بہار دیکھنے کے لیے ہمیں ایک خاص کاوش کی ضرورت ہے۔

کلکتہ دریائے ہگلی کے مشرقی کنارے پر ایک بے قاعدہ مستطیل کی شکل میں آباد تھا۔ اس کا انتہائی طول چھ میل اور اس کی چوڑائی جو کسی جگہ بھی بہت زیادہ نہ تھی کہیں کہیں دو میل کے قریب پہنچتی تھی۔ شہر کے باہر ہر طرف ایک شاداب اور سرسبز علاقہ تا حد نگاہ پھیل رہا تھا جس کے اوپر مصنوعی اور قدرتی نہروں اور تالابوں کا ایک جال تنا ہوا تھا۔ اس علاقہ کی ہریاول اپنی شادابی اور تنوع سے کلکتہ کو مرشد آباد سے ملاتی تھی۔ مرزا غالب پٹنہ اور مرشد آباد ہی کے راستے سے آئے تھے۔ فروری ۱۸۲۸ء کی جس صبح کو پہر دن چڑھے وہ کلکتہ میں وارد ہوئے انھیں یہ شہر دور سے اسی بے کراں ہریاول کے دامن میں ٹنکا ہوا دکھائی دیا۔ کاسی پور کے گاؤں تک پہنچ کر کلکتہ کی عمارتوں کی پوری شان و شوکت ان کی نظروں میں تھی لیکن اس زمانے میں کلکتہ کا نظارہ دیکھنے کے لئے سب سے اچھا موقع فورٹ ولیم کے سامنے کا میدان تھا۔ یہ وسیع و بسیط سبزہ زار اب بھی موجود ہے۔ اس کے گرد یورپی طرز کی عالی شان عمارتیں حلقہ باندھے کھڑی ہیں اور خود انگریزوں کے خیال میں بھی یہاں سے کلکتہ کی آب و تاب یورپ کے کسی شہر کے مقابلہ میں کم نہ تھی۔ تاج محل اور لال قلعہ کی عمارتوں کے لاشریک حسن کی یکتائی اور بے ہمگی سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ انگریزی تعمیرات ایک الگ کیفیت رکھتی تھیں۔ بادشاہی دور کے آخری شاعر کا ذہن اک نئے جمہوری فن تعمیر کی زیبائش اور یورپی شہر سازی کے اجتماعی آہنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ کلکتہ کی سرکاری عمارتوں میں نہ سنگ مرمر استعمال ہوا تھا نہ سنگ سرخ یہ پوری کی پوری اینٹ اور گچ کی بنی ہوئی تھیں لیکن ان کی شان و شوکت کے فرق کو اس سلیقے سے چھپایا گیا تھا کہ ان عمارتوں کے دیکھنے میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کلکتہ کا گورنمنٹ ہاؤس، ٹاؤن ہال، سینٹ جان کا گرجا اور پرانا مشن گرجا انھیں عمارتوں کے ہیں جو غالب کے زمانہ قیام میں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ کلکتہ کے میوزیم کا اس وقت تک کوئی وجود نہ تھا۔ [illegible] بنا تھا۔

کلکتہ کے جس حصہ میں یورپین آبادی تھی وہاں کی سڑکیں پختہ، فراخ اور صاف ستھری تھیں، لیکن کشادگی کے باوجود ان کے کناروں پر پیادہ روش‌یں ابھی نظر نہیں آتی تھیں[1]۔

شہر کا ہندوستانی حصہ شمال میں تھا، یہ نہ ویسا دل کشا تھا نہ ویسا صاف جیسا جنوب کی طرف کا یورپین حصہ۔ یہاں اکثر گلی کوچے تنگ، ٹیڑھے اور بے ترتیب تھے۔ ان گلیوں میں جابجا پانی کے گڑھے اور تالاب تھے، بہت سے مکان بانس کے بنے ہوئے یا کچے تھے اور ان کی چھتیں چھپر کی تھیں کہیں کہیں پختہ سڑکیں بھی ملتی تھیں اور کسی امیر مسلمان یا ہندو کا بڑا محل بند سا مکان گرد و پیش کی فلاکت میں سے ابھرا ہوا کھڑا نظر آتا تھا۔ ان مکانوں کا نقشہ بالعموم یہ ہوتا تھا کہ ایک مربع صحن کے گرد دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارت کھڑی کی جاتی تھی۔ اوپر کا حصہ عورتوں کے لئے الگ کر دیا جاتا اور نچلی منزل سے مردانہ کا کام لیا جاتا تھا۔

شہر کے مغرب میں ایک وسیع قطعہ زمین دریائے ہگلی کے رخ کھلا پڑا تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ میل سوا میل تک پہنچتا تھا اور سطح آب پر ملک ملک کے چھوٹے بڑے جہازوں [illegible]

[1] کلکتہ کا پہلا فٹ پاتھ ۱۸۵۵ء میں [illegible]

[illegible] تھا [illegible] دریا میں کہیں کہیں کوئی دخانی جہاز بھی نظر آتا
تھا لیکن [illegible] جہاز انگریزوں کا ساختہ "دخانی جہازوں" کے مقابلے
میں [illegible] سے بھی زیادہ تھے۔

[illegible] کا بین الاقوامی حیثیت کا تھا۔
[illegible] شہر کے چوپال [illegible] قائم تھا۔ اس وقت شمالی
ہند میں [illegible] ایک [illegible] مقام تھا جہاں انگریز اور ہندوستانی ایک
دوسرے سے [illegible] شہر کے کم [illegible] ہر موڑ پر ملتے تھے۔ اس بارے
میں کلکتہ کا [illegible] بیان ایک الگ خصوصیت رکھتا تھا۔ شام
کو جب ٹھنڈی ہوا چلتی اور اس [illegible] سبزہ زار پر انگریز مرد اور
عورتیں [illegible] کے لئے نکلتیں تو [illegible] ایک سماں ہوتا جو ہندوستانی
آنکھوں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس نیم
فرنگی نیم ایشیائی شہر میں مغربی اور مشرقی معاشرت کا عجیب
امتزاج نظر آتا تھا۔ انگریز اگر الائچی، عطر اور پان کے استعمال سے
باخبر تھے تو ہندوستانی بھی وسکی اور براولڈ ٹام سے مانوس ہوتے
جاتے تھے۔ اس زمانے کے انگریز حکام نہ صرف فارسی سمجھتے اور
بولتے تھے بلکہ فارسی قصیدہ و غزل سے بھی لطف اندوز ہو سکتے
تھے۔ دوسری طرف اہلِ ہند بتدریج انگریزی مصنوعات کا
استعمال سیکھ رہے تھے اور ان میں سے بعض کو انگریزی زبان
اور علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق تھا[1]

اس نئے چلے تمدن کی جھلک شہر کے وسائل نقل و حمل
میں بھی نمایاں تھی۔ انگریز گھوڑا گاڑی کو پسند کرتا تھا جس کی تین
شکلیں سڑکوں پر چلتی تھیں۔ بند گاڑی، فٹن اور بگی۔ ہندوستانی
اپنی سواری [illegible] بیلی یا آدمی جوتتا تھا۔ اور بہلی یا چھکڑے، تام

[1] [illegible] جس کے مطابق
ہندستان [illegible] تعلیم کے نفاذ کا فیصلہ ہوا۔

جھام یا پالکی میں سوار نظر آتا تھا۔ ان سواریوں سے قطع نظر اونٹ
کی سواری بھی اٹھارویں صدی تک بنگال میں بہت مقبول تھی[1]
بعد میں اس کا استعمال کم ہو گیا مگر یکقلم ترک نہیں ہوا۔ کلکتہ
کے بڑے سرکاری کتب خانہ میں پرانے کلکتہ کی (غالباً ۱۷۹۴ء
کی تیار شدہ) ایک تصویر آویزاں ہے جس میں یورپی حصہ شہر کا
مرکز، چورنگی کا علاقہ، خاص طور پر نمایاں ہے۔ چورنگی کے پاس ہی
ایک تالاب ہے۔ ارد گرد کے مکانات سب انگریزی وضع کے
ہیں۔ مگر چوک میں پالکی، بہلی، رتھ اور شتر سوار بھی نظر آتے ہیں۔
کلکتہ کے مضافات کے لمبے فاصلے طے کرنے کے لئے ایک اور
ذریعہ بھی تھا، کشتی کا سفر۔ لوگ چندر نگر اور ہگلی (بلکہ پلاسی اور
مرشد آباد اور ان سے بھی آگے مونگھیر اور پٹنے) تک کشتی میں
آتے جاتے تھے۔ غالب اپنے ورودِ کلکتہ کے تیسرے ہی دن
بعد دریا کے راستہ سے ہگلی کو روانہ ہوئے۔ کشتی کا سفر انہیں
پسند تھا، وہ ان لوگوں میں نہ تھے جنہیں آبی سفر سے متلی ہونے
لگتی ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی ریل گاڑی کے زمانہ سے پہلے
سب سے زیادہ آرام کشتی کے سفر میں ملتا تھا۔ غالب کا اس عجلت
سے ہگلی کو جانا اسی مقصد سے تھا جسے لے کر وہ کلکتہ آئے تھے۔
یہ واضح رہے کہ ہگلی نہ صرف کلکتہ کے دریا کا نام تھا بلکہ مضافات
کی نئی بستیوں میں سے بھی ایک اسی نام سے موسوم تھی۔ یہ بستی
کلکتہ سے بیس بائیس میل اوپر دریا کے دوسرے کنارے پر تھی
یہاں کی مسجد اور امام باڑہ بہت مشہور تھا۔ اس امام باڑے کے
بانی ایک صاحب کرامت علی تھے۔ مگر انیسویں صدی کے اوائل
میں امام باڑے کی شہرت اور شان و شوکت حاجی محمد محسن کی رہین

[1] نواب سراج الدولہ کی فوج کو میر جعفر نے جب کلائیو کے ہاتھ بیچ ڈالا تو وہ
پلاسی کے گاؤں سے ایک تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر فرار ہوئے۔

ہوئی تھی۔ حاجی صاحب نے ۱۲۱۰ھ میں اپنے انتقال پر اپنی لاکھوں
کی جائداد اس امام باڑے کے لئے بطور وقف چھوڑی تھی جس زمانے
میں غالب کلکتہ پہنچے امام باڑہ ہگلی کے متولی نواب اکبر علی خاں
طباطبائی تھے۔ یہ اپنے علاقہ کے نہایت ذی اثر اور بارسوخ لوگوں
میں تھے اور غالب کو اپنے مقدمہ میں ان سے مدد کی توقع تھی۔

مرزا غالب کو کلکتہ پہنچتے ہی ہندوستانی حصۂ شہر میں دس
روپے ماہوار پر حسب خواہش مکان مل گیا۔ اس کا پتا ان کے ایک
فارسی خط میں یوں درج ہے :-

درکلکتہ قریب چلیت بازار در شملہ بازار نزدیک
تالاب گردد، در حویلی مرزا علی سوداگر۔

اس پتے میں "چلیت بازار" تو ظاہر ہے کہ سہو کتابت
کا نتیجہ ہے۔ کلکتہ میں کبھی کوئی چلیت بازار نہ تھا۔ چیت پور روڈ
غالب کے زمانے میں بھی اسی نام سے موسوم تھی۔ اسی طرح
"تالاب گردد" بھی کلیات نثر کے کاتب سے سہو ہوا ہے۔
یہ ترکیب غالب "تالاب کرگدن" ہے۔ شملہ بازار آج بھی اسی نام
سے موجود ہے لیکن مرزا علی سوداگر کی حویلی کا جس میں غالب
مقیم ہوئے اب صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ تلاش کے باوجود شملہ
بازار میں اب اس حویلی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ البتہ وہ
تالاب قریب ہی موجود ہے جس کا ذکر غالب نے اس مکان کے
پتے میں کیا ہے۔ کلکتہ کے شملہ بازار کو شملہ شہر سے کوئی تعلق
نہیں۔ شمل بنگالی زبان میں کپاس کے پودے کو کہتے ہیں اور
بازار منڈی کو، گویا مغربی پاکستان میں شملہ بازار کا نام
کپاس منڈی ہوتا۔ شملہ بازار کا موجودہ [illegible]
اسٹریٹ متصل [illegible] پرنسپل [illegible]

غالب کے سوانح نگاروں نے کلکتہ کی [illegible]
بحث خاص کر تفصیل کی ہے [illegible] مرزا
قتیل کی زبان دانی کی بحث میں ایک [illegible]
اس کے خلاف آخر تک غالب [illegible]
ہوتے رہے۔ اس قصہ کو بیان [illegible]
"یادگار غالب" میں مولانا حالی نے [illegible]
میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ البتہ ایک [illegible] مولانا
حالی نے [illegible] مرزا غالب نے بھی [illegible]
میں سب سے زیادہ بلند بانگ ایک صاحب بنام [illegible]
علی خاں تھے۔ یہ بھی غالب [illegible] کرتے تھے [illegible]
والے تھے۔ اور کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں آ بسے تھے۔

مدرسہ کلکتہ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں قائم کیا۔ اس کی
موجودہ عمارت ولزلی اسکوائر کے شمال میں ہے۔ یہ ایک دو منزلہ
عمارت ہے جس کی نچلی منزل کے وسط میں ایک [illegible] صحن ہے۔ اس
صحن کو ہر طرف سے دالان گھیرے ہوئے ہیں [illegible] دالانوں کے
پیچھے مدرسہ کے کمرے ہیں۔ اس نچلی منزل کے اوپر اسی طرز کی
دوسری منزل بنی ہے۔ اگست ۱۹۳۸ء میں جب میں کلکتہ گیا
تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مجلس میں مجھ سے کہا کہ
"مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں [illegible] کے قریب
منتقل ہوا۔ غالب کو [illegible] مدرسہ
کی پہلی عمارت [illegible]

---

۱ اس قیاس کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان ہے۔ ۱۹۳۸ء
میں مولانا موصوف نے ایک گفتگو میں راقم الحروف کو بتایا کہ کلکتہ میں مرزا
غالب جس مکان میں رہے وہ گینڈے کے تالاب کے پاس تھا۔

۱ یہ عجیب اتفاق ہے کہ [illegible] مرزا غالب
پیدا ہوئے ایک زمانہ [illegible]

دل کے آئینے میں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

تم سے تھی تری شام میں تھا صبح کا عالم
تم جب سے گئے شام جھلکتی ہے سحر میں

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

یہ نقش عہد گذشتہ کی ہے میت فانیؔ

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا
اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

آل احمد سرور نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ فانیؔ اقبالؔ کے قائل نہیں تھے ممکن ہے ایسا ہو لیکن کس بنا پر یہ واضح نہیں اگر ایسا ہے تب بھی فانی کے یہاں اقبالؔ کے خیالات ملتے ہیں مثال کے طور پر اقبالؔ خدا سے انسان کی مجبوری اور لاچاری کا شکوہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

(مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری)

اور فانیؔ بھی اس جبر و اختیار کی زندگی سے نالاں ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

یا اقبالؔ کو خدا اپنی ہستی سے آگاہ ہی نہیں ہے۔ اور وہ کہتے ہیں ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اور فانی بھی اپنی ہستی سے بے خبر ہیں اور یوں کرتے ہیں ؎

کہتے ہیں یہاں حضرتِ فانی تو نہیں ہیں
اس انجمنِ ناز میں کیا ہم بھی کہیں ہیں

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فانی بھی اقبال کی طرح روحانی جسمانی آزادی کے قائل تھے جو انھیں اس دنیا میں نصیب... وہ بقول مجنوں گورکھپوری یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ زندگی ایک سبق ہے جو فطرت انہیں جبر کر کے سکھاتی ہے لیکن کتنے... اور معصوم انداز میں وہ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

لیکن یہ جانتے تھے کہ اس جبر پر کچھ اختیار نہیں اسی... پھر وہی سوال کرتے ہیں ؎

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا، اب یہ بتا ہم کیا کریں

ایشیا

اکبر الہ آبادی کی تبلیغ حقائق

ظ۔ انصاری

اکبر الہ آبادی اپنی ذاتی زندگی میں تو اس کے قائل تھے انگریزی زبان اور علم و ادب حاصل کیا جائے، انگریزی حکومت کی ملازمت کی جائے لیکن وہ اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہ تھے کہ مسلمانوں کے قدیم معاشرتی اور مذہبی اصولوں میں تقلید...

مخزن

مخزن

فلسفہ ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے

(جناب مرزا محبوب بیگ صاحب، حیدرآباد دکن)

سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ نے جو ایک مشہور انگریز مفکر ہے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے رجعت بہ فلسفہ یا اس کی [illegible] ہیں سے ہے۔ اس کا بنیادی موضوع ہے عقل کی حمایت، اقدار کا اثبات اور فلسفہ کی صفائی۔ یہ اس کتاب کا ضمنی نام بھی ہے۔ ہمیں اس پر یہاں تنقید نہیں کرنی ہے بلکہ ہمارا صرف اس کے ابتدائی باب سے ہے۔ اس باب کا عنوان ہے "عقل کا عالم اسفل" اس میں جوڈ بڑے [illegible] شکایت کرتا ہے کہ آج ہر ایرے غیرے نے فلسفہ پرستی اختیار کرلی ہے اور شیوۂ اہلِ نظر کی بے آبروئی عام ہے۔ یہاں میں اس باب [illegible] اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ بعض لوگوں کے لئے صبر آزما ہوں، مگر مجھے خواستگارِ معافی ہونا منظور نہیں ہے کیونکہ اسے بھی [illegible] گزارش قرار دیا جاسکتا ہے۔ جوڈ لکھتا ہے: "سیانے بھلے اشخاص آخر عمر میں ایک کمزوری کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ جلد یا بدیر یہ سمجھنے لگتے ہیں [illegible] پسند فلسفی ہیں۔ اپنے متعلق کچھ نہ کچھ غلط فہمی ہر شخص کو ہوتی ہے، اس حد تک کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی اس سے آگے [illegible] کرلے، اور قدیم و مشہور کارخانوں کی چلتی ہوئی پیداوار سے مقابلہ کرے تو پھر گڑبڑ رونما ہوتی ہے۔ ہمارے [illegible] ہیں آسے فلسفیانہ دور کے زمانے میں لوگوں نے اس سے راہ و رسم پیدا کی۔ ملاقات کا ذریعہ [illegible] سے بہتر اور کیا ہوگا

ہے۔ ظاہر ہے اس کی توفیق صاحب مقدرت ہی کو ہوگی۔ بڑے آدمی کی ضیافت رد کرنے پر شاید ہی کوئی تیار ہو۔ خاصکر اس وقت جبکہ اس ضیافت کی یہ معلوم نہ ہو محض چٹپٹے کھانے کا یقین ہو خیال ہوتا ہے مقصود خلوت کی گفتگو ہے۔ ممکن ہے فائدہ کی کوئی بات نکل آئے۔ ایسے موقع پر ایسی ملتی ہیں جو کھانے کے بعد غیر متوقع باتیں ظہور میں آتی ہیں۔ کھایا پیا حیرت ہو جاتا ہے۔ فائدہ رہا ایک طرف ملاقات جان کا جنجال بن جاتی ہے بچا چھڑانا دشوار نظر آتا ہے۔ ایک ایسی دعوت کی تفصیل یہاں آپ کی نذر ہے۔ نوع انسان کا آخری پیغام:۔

"چند دن پہلے ایک ممتاز آدمی نے مجھے مدعو کیا۔ اس کا نام ادبی دنیا میں کافی مشہور ہے۔ یہ نام کاروبار کی اعلیٰ صلاحیت کی دلیل ہے یہ نام اخلاص اور معاملات کے سمجھنے کی علامت ہے۔ یہ نام کتابوں کے پہلے ایڈیشنوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کی نشانی ہے۔ یہ نہایت مہذب انسان ہے، اس کے آداب اس کے اطوار اس کی مہمان نوازی یہ سب چیزیں زبان زد ہیں۔ وہ ہر نامور ادیب سے واقف ہے اور ہر نامور ادیب اس سے واقف ہے، وہ ان میں سے اکثر کا دوست ہے اور اس کی دوستی کی عام طور سے قدر کی جاتی ہے۔

میں نے دعوت قبول کر لی۔ میرے سوا اور کوئی مدعو نہ تھا۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ اور میزبان اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کی بات چیت دلچسپ تھی۔ موجودہ واقعات پر اس کی تنقیدیں نپی تلی اور صائب تھیں۔ میں اس کی ہم کلامی سے بہت محظوظ ہوا۔ آدھا کھانا ہونے تک یہ عالم رہا اس کے بعد بعض صریح علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ میرے میزبان کے ذہن نے انتشار شروع کئے۔ عقلی طور پر اس کی آنکھیں جھپکیں، روحانی طور پر اس نے مجھے گدگدایا۔ ایک راز پسندی تھی۔ ایک پس و پیش تھا۔ ایک گومگو کا عالم تھا، بات چیت میں تقریباً سازشی معنویت تھی۔ یہ کچھ اچھے آثار نہ تھے۔ میں نے محسوس کیا کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے، کوئی انکشاف کوئی اعلان قریب الوقوع ہے، اور ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ عرصے سے میرے میزبان کی توجہ کائنات پر مرکوز ہے۔ اس نے اس بارے میں بہت سوچ بچار کیا ہے۔ پچھلے کئی سال اس پر صرف ہوئے ہیں۔ اسی انہماک سے اس کا کاروبار تک متاثر ہوا۔ اب ان افکار کو اس نے قلم بند کیا ہے۔ اس کی دلی تمنا یہ ہے کہ میں ان کے متعلق اپنی رائے بتلاؤں تاکہ وہ انھیں پھیلا کر بیان کرے، تشنہ جزئیات کی تکمیل کرے۔ اس کے بعد اس کا منصوبہ کچھ ایسا تھا کہ وہ دنیا کے مشاہیر فکر و نظر کو دعوت دے۔ ان کے سامنے نوع انسان کے نام اپنے پیام، اپنے منشور کو پڑھے۔ وہ ان کے متعلق ان کے خیالات معلوم کرے۔ پھر اس کی نشر و اشاعت کا انتظام کرے۔ اس کا عنوان تھا "مستقل بالذات ہستی کی ماہیت"۔ اس کا ابتدائی مسودہ ٹائپ کے پندرہ صفحوں پر محیط تھا۔ یہ مصنف کے فلسفۂ کائنات کا محض خلاصہ تھا۔ اس کی عین خواہش تھی کہ میں اس مسودہ کو غور سے دیکھوں، اس کے ایک ایک جملہ کو پڑھوں۔ نکتہ چینی یا داد کی غرض سے نہیں بلکہ ہمدردانہ طور سے سمجھنے کے واسطے۔ اگر میں اتنا کروں تو سمجھ جاؤں گا کہ مجھے زحمت دینے کی وجہ کیا ہے۔ [illegible] علم میں لانا ایک نیک مقصد ہے اور ایک نیک مقصد کے لئے ہر طریقہ حق بجانب ہے۔ میرے میزبان کی ان باتوں [illegible] کہ اس کا فلسفۂ کائنات بے حد اہم ہے۔ اس کا نظریۂ حیات قیمتی اور اچھوتا ہے، میں اس کی جدت پسندی [illegible]

ہوا تھا۔ اس یقین کے ساتھ اس نے مجھے مسودہ دیا۔ یہ صفائی کے ساتھ فیتے سے بندھا تھا۔ فیتے کا رنگ شوخ تھا۔ ٹائپ نفیس تھا اور مکمل بھی۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس مسودے کو دیکھ ڈالوں۔ اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ ان میں ایک جوش، ایک احساس فخر تھا۔ میں نے فیتہ کھولا۔ مسودے پر نظر ڈالی، اسے پڑھا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ ایک بے معنی تقریر تھی۔ طرز سودہ سخن آرائی تھی، مدعیانہ بکواس تھی، اس کے معنی کا درجہ اس کے دعوے کی مقدار سے نسبتِ معکوس رکھتا تھا۔

تصور کیجئے میرے موقف کی دشواری کا۔ میرا میزبان بڑا شائستہ آدمی تھا۔ اس کے آداب و اطوار عمدہ تھے۔ اس کے اخلاق و اوصاف پسندیدہ تھے۔ اس کی شخصیت دل چسپ تھی۔ اس کی گفتگو پُرلطف تھی، اس کی عملی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ پھر اس نے میری بہت پُرتکلف دعوت کی تھی۔ فہرستِ طعام کا انتخاب احتیاط سے ہوا تھا۔ کھانوں کی نفاست تعریف سے بالا تھی۔ دعوت سخت سے سخت ناقد کے لئے بھی کمزوری کا موقع ہے۔ آدمی ہر بات پر خواہ مخواہ ہاں میں ہاں ملانے لگتا ہے۔ اپنے میں وہ اپنے شخصی فکر کی گہرائیوں سے مجھے آگاہ کرتا ہے۔ اپنی نوا اسے راز کا محرم بناتا ہے۔ نوعِ انسان کے نام اپنا آخری پیام، آخری منشور میرے حوالے کرتا ہے۔ اور یہ پیام یہ منشور کیسا تھا؟ مہملات کا پلندہ! اس کے تین چوتھائی کو تو میں سمجھ ہی نہ سکا۔ اور ایک چوتھائی محض پیش پا افتادہ باتوں اور اخلاقی اصلاح کا مجموعہ تھا۔ میں الفاظ کے استعمال میں بند یا بخیل نہیں ہوں، مگر اس وقت غیر معمولی طور پر گنگ تھا۔ ہستی گم تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کہوں، کیسے کہوں۔ میں اپنے میزبان سے نظر نہ ملا سکا۔ اور وہ سمجھے کہ اُبلا آرہا ہے، پُرگوئی زور دل پر ہے، طبیعت بلا کی ہے۔ کبھی کہتا ہے مشاہیر فکر و نظر میں سے کون کون کو بلایا جائے۔ رسل، اینج اور شا تو بہر صورت رہیں گے۔ ان کے علاوہ اور کون مدعو ہوں۔ کبھی کہتا ہے یہ دعوت کب ہو۔ میں پہلو بدلتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اٹھ جاؤں۔ اطمینان ہے کہ دعوت کبھی نہیں ہوگی۔ یہ تو محض خرافات ہے۔ علم و عقل کے یہ ہیکل ایک میز پر جمع ہوں، یہ قطعی محال ہے۔ اور کوئی معجزہ وقوع میں آئے تو بھی وہ اس ہرزہ سرائی کے کبھی روادار نہ ہوں گے۔ میری زبان بند پا کر وہ کہتا ہے مسودے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اب خاموشی کی تدبیر نہیں چلتی۔ شائستگی بھی ایک چیز ہے۔ کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اور میں واقعی سخن سازی پر اتر آتا ہوں۔ بہانہ کرتا ہوں، کہتا ہوں چند دنوں کے لئے باہر جا رہا ہوں، مسودہ میرے پاس وہیں بھیج دیا جائے۔ تاکہ زیادہ احتیاط اور توجہ کے ساتھ اس کا مطالعہ کر سکوں۔ شہر میں اور اتنی اچھی دعوت کے بعد ایک اہم دستاویز کا مطالعہ ممکن نہیں ہے، اور اچھا بھی نہیں ہے کیونکہ یہ گہری توجہ کی مستحق ہے۔ اور ایسی توجہ اس پر بہ حالاتِ موجودہ ممکن نہیں۔ اس کے بعد ایک خوش گوار شام، ایک نفیس دعوت کے لئے میں اپنے میزبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور روانگی کی اجازت چاہتا ہوں۔ مسودہ بعد میں آتا ہے اور تعریف کے ایک خط کے ساتھ مناسب وقت پر واپس کر دیا جاتا ہے۔ اشخاص اور معاملات کے سمجھنے کی صلاحیت اس وقت میزبان کے کام آتی ہے۔ اس کی سادگی جاتی رہتی ہے کیونکہ اس سلسلہ میں پھر کوئی بات میرے علم میں نہیں آئی۔ یہ تاثرات کی حکایت۔ لیکن یہ اپنی قسم کی واحد مثال نہیں ہے۔ ہمارے فلسفی نے ایسی کئی دعوتیں اڑا ڈالی تھیں

میں یہاں ایک خط نقل کرتا ہوں، یہ اسے اسی طرح کی ایک تقریب ملاقات کے بعد وصول ہوا۔ اس قسم کے خطوط ایسے ہی مختلف ادیبوں
کو لازم سے ہیں۔ جو وہ لکھتا ہے: "میں اس کے راقم کا نام بتانا نہیں چاہتا۔ اس پر آپ کو اصرار بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہماری بحث کو اس
سے تعلق نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات کچھ اور ہے۔ یہ خط خام تفلسف سے میری بے حسی کو اجاگر کرتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ اس بے حسی کے
خلاف ایک سا احتجاج ہے اور اس سے میرے فلسفہ سنج دوستوں کے انداز خود اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے۔

مکرمی! ایک دستاویز میں اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ اس میں وہ اسکیم درج ہے جو میں نے گزشتہ شام آپ کے سامنے
پیش کی تھی۔ اسے میرے فلسفے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے پڑھ کر آپ سب استفادہ حاصل کر سکیں گے۔ اس
سے بہت سی دشوار اور مبہم چیزوں کی تشریح ہوتی ہے۔ میرے افکار اور آرا، مبدء فیاض سے مستفاد ہیں یا یوں کہئے کہ فوق الفطرت
ان کا سرچشمہ ہے۔ کائنات کا نیا مفہوم مجھے تذکر کے سقراطی طریقے سے معلوم ہوا۔ یہ سائنسی واقعے کے مطابق ہے۔ اس سے
طبیعات پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اسے کل کائنات کی دید کہا جا سکتا ہے۔ ایسی دید زمانۂ قدیم میں سقراط کو حاصل تھی۔ جدید
میں اسپنوزا کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے فلسفہ کا مطالعہ فلاطون کے مکالمات سے شروع کیا اور پہلی ہی
نظر میں سقراط کے اصلی خیالات دریافت کر لئے۔ فلاطون کا مکالمہ طیماؤس ایک اہم چیز ہے۔ اس میں کائنات کے طبعی پہلو پر
بحث نہیں کی گئی ہے اسی لئے آج کل اسے کچھ زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا۔ ورنہ اس میں کو نیاتی مستقل اور جوہر کے باہمی تعلق کی
نسبت بڑی قیمتی معلومات ملتی ہیں۔ یہ بات محض اس کے مطالعے سے معلوم ہوئی۔ اس وقت تک میں نے جدید طبیعات کے
متعلق ایک لفظ نہیں پڑھا تھا۔ البتہ تذکر کے بعد بہت سی کتابیں نظر سے گزریں۔ لیکن اپنی اسکیم کے خلاف کوئی بات مجھے
کہیں نہیں ملی۔ نہ مکالماتِ فلاطون کی شرحوں میں نہ طالیس سے لے کر ہیگل تک کے نظامات میں۔ نہ جینز، ایڈنگٹن، آئن
سٹائین اور پلانک کے نظریات میں۔ میرا فلسفہ زندگی کے روحانی پہلو سے بحث کرتا ہے۔ میں نے دو رویا دیکھے۔ دن میں اور
عالم بیداری میں۔ انھیں پر میری اسکیم میرے نظام کی اساس ہے۔ اس کے لئے مجھے بڑا ریاض کرنا پڑا۔ کئی سال سخت مطالعہ
میں گزرے۔ بالآخر وہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب اسے کلیدِ کائنات کہا جائے تو بجا ہے۔

یہ ایک جامع نظام ہے۔ ایسی چیز آج تک کبھی مرتب نہیں ہوئی۔ منسلکہ نوشتہ ایک مختصر خاکہ ہے۔ یہ ایں ہمہ اس فلسفہ
کی جملہ روایتی گتھیوں کو قطعی طور سے سلجھا دیا گیا ہے۔ اسے آپ غور سے پڑھئے۔ اپنی رائے سے مطلع اور ممنون کیجئے۔ اب
بھی کوئی مسئلہ لاینحل ہو تو اس کی تشفی سے مجھے بے حد مسرت ہوگی۔

آپ کا مخلص

. . . . . .

مفکروں کو کھانے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ خط اور مسودے بھیجے جاتے ہیں اور کتابیں مفت ملتی ہیں۔ لوگ ان سے متاثر
بھی ہوتے ہیں۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں یہ اہلِ دماغ! شہرت اچھی چیز ہوتی ہے اور شاید بری بھی۔ یہ جب انکا انسان کو
پسندیدہ اور پھر محترم بناتی ہے۔ اس کے علاوہ حد سے زیادہ التفات وبالِ جان بن جاتا ہے۔ ہر وقت کی ملاقاتیں بھی ... یا ...

پر لطف نہیں رہتی۔ یہی حال کتابوں کا ہے۔ ہر کتاب قابل مطالعہ نہیں ہوتی۔ کائنات کے متعلق کتابیں خشک اور سخت ہوتی ہیں معمولی انہیں بھاری پتھر پاتا ہے اور چوم کر چھوڑ دیتا ہے۔ مگر خود فلسفی انہیں نا قابل فہم پائیں تو اس کا مطلب بیشتر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی لکھی ہوئی ہیں، اصحاب فکر و نظر کی تصنیف نہیں۔ نتیجۃً کوئی انہیں پڑھنا نہیں چاہتا ———— کوئی چھوتا نہیں، وہ پڑی سڑتی ہیں یا دیمک کی نذر ہو جاتی ہیں یا چوہوں کی، یا پھر پنساری کے کام آتی ہیں۔ جوڈ کہتا ہے "ہمارے زمانے میں مفکروں کی بہتات ہے، مگر بڑے مفکر ہیں کون۔ کیا وہ جو چھوٹے مفکروں کے ہجوم سے نمایاں ہوں؟ ہمارا فلسفی یہ بھول رہا ہے مگر ہمیں اس کی تردید مقصود نہیں ہے صرف اس کے خیالات پیش کرنے ہیں وہ لکھتا ہے "میں ایک بہت معمولی شہرت کا آدمی ہوں پھر بھی کم و بیش تیس کتابیں مجھے ڈاک سے مفت وصول ہوتی ہیں۔ یہ سب کائنات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور مصنفوں کی جانب سے تحفۃً بھیجی جاتی ہیں۔ ایک ایسی ہی کتاب آج صبح ملی وہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کا نام ہے "عقلی اور غیر متصوفانہ کائنات"۔ یہ ایک امریکی تاجر کی ہے اور شائع اسی کے صرف سے ہوئی ہے۔ اب تک اس کے تین خانگی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ میرا نسخہ اسی تیسری اشاعت سے متعلق ہے۔ اس کا مقدمہ حسب معمول ایک خط کی صورت میں ہے جو میکینیکل انجینئرنگ اسکول کے ایک مددگار پروفیسر نے تحریر کیا ہے! اس کا سب سے سائنس کو دعوت مقابلہ" اس میں کتاب کی جدت اور اہمیت کا خاص طور سے ذکر ہے۔ مصنف کے بارے میں بڑی اچھی رائے ظاہر کی گئی۔ مقدمہ نویس نے اسے معمائے کائنات کا حل کرنے والا قرار دیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے اس کتاب میں "ملت مدید کے معمے" کا حل پیش ہے لیکن سب اس کے ماننے میں کسی کو تامل ہو مگر اس تامل کی وجہ محض وہ آسودہ خاطری ہوگی جو تفکر اور تدبر کی محنت سے بچتی ہے۔ یہ کتاب مباحثہ و حیرانی کا باعث ہوگی۔ اگر آج اسے نظر انداز کر دیا جائے، اس کے مصنف سے اعراض برتا جائے تو اس سے کچھ نہیں ہوتا: بہترین حَکَم ہے۔ راستے اسی کی مستند ہے اور بالآخر وہی عام ہوگی۔ اس لئے آئندہ نسل کے فیصلے کا انتظار ضروری ہے۔ مصنف میری دانست میں ہیں مدینہ دل کا مجنت پیشہ فکر ہے۔ یہ بات میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں . . . ہمیں اس کے ساتھ مل کر کائنات کا کھوج کرنا چاہیے۔ آپ بھی کائنات میں ہیں اس سے باہر نہیں ہو سکتے۔ مقدمہ نویس کے اس اصرار پر میں نے کتاب دیکھی اور غور سے دیکھی۔ یہاں آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کیا وہ واقعی مباحثہ و حیرانی پیدا کرتی ہے؟ مباحثہ کی پوچھئے تو جواب نفی میں ہے۔ حیرانی کی پوچھئے تو اثبات میں۔ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل اس کی سطریں گنجان ہیں۔ اس کا خط خفی ہے۔ اس میں کئی فالتو تصویریں ہیں۔ متعدد خاکے ہیں۔ بہت سی درجہ وار ترتیبیں ہیں۔ ان گراف اعداد و شمار میں، نصیحتوں کی تو کوئی حد نہیں ہے اور سب کچھ بس یہی ہے یعنی باقی رہا مطلب سو غالب مرحوم خوب کہہ گئے ہیں ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا!

فلسفہ آرائی کے لوازم۔ یہاں جو نکتہ پیش کیا گیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ حکمت آرائی صرف فلسفیوں کا کام ہے دانش کی محبت کا دم دیوانے نہیں بھر سکتے ہیں نہ کوئی اور اس کا قطعاً مجاز نہیں ہے کہ فلسفہ کی حدود میں قدم رکھے، اس کا دروازہ بوالہوسوں پر بند ہے۔ وادی طور میں موسیٰ ننگے پاؤں گئے تھے۔ ہر بارگاہ میں حاضر ہونے کا قاعدہ یہی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حق کی جناب میں نیاز خاص لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ اس کے لئے پہلے سے ضروری تیاری کر تے ہیں۔ ان کے دل ادب خوردہ ہوتے ہیں، اور ان میں عاجزی اور منکسر مزاجی

[illegible] تو سچی طلب بھی ہوتی ہے۔ پیشہ ور فلسفی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے مضمون میں مشق و مہارت [illegible]
نگرانی اور رہنمائی کا یعنی درک پیدا ہوتا ہے تعلیم سے۔ لیکن برخلاف سائنس کے بر خلاف ادبیات قدیم یا تاریخ کے فلسفے میں [illegible] قسم
لوگ بہت ملتے ہیں۔ یہ خود کو پانچویں سوار سمجھتے ہیں۔ انھیں خبط ہوتا ہے خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کا اور [illegible]
دکھتا ہے ان کا تفلسف خام اور نارسیدہ ہوتا ہے: ان کے دماغوں میں ہر قسم کا رطب و یابس بھرا رہتا ہے [illegible]
ہے کوتاہ اندیشانہ اشتعال بھی پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی کتابیں بظاہر شاندار دکھائی دیتی ہیں: بیان [illegible]
یہ موجود نہیں ہوتی" بفرض محال ہو بھی تو" اس کی دریافت دقت طلب ہے۔ وہ مصنف کے پر شکوہ اور پر تکلف الفاظ کے انبار میں کہیں
دبی پڑی ہوگی۔ میرے لئے اس گھٹیا معاملہ کا سب سے اشتعال انگیز پہلو یہی ہے کہ اس سچائی کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ میری عقل میری
بات میری تربیت میری تعلیم میری صلاحیت تنقید غرضکہ میری ہر فطری یا اکتسابی قوت اس کے خلاف ہے وہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں
دیتی: وجہ صاف ظاہر ہے۔ زبردستی کے فلسفیوں میں بر خود غلط، خود ساختہ انسانوں کی ساری کمزوریاں ہوتی ہیں: سب سے [illegible] "ہوتا ہے شخص
ہے۔ غالب نے ایک فرضی استاد بلاوجہ نہیں تراشا تھا۔ کیونکہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ
آدمی موضوع کی صحیح تربیت و تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ استاد بتاتا ہے کیا چیز پڑھنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ وہ خشک سے خشک مضمون کو دلچسپ
بنا دیتا ہے۔ بحث و مباحثہ کے ذریعے سے پیچیدہ مسائل و مراتب کو سلجھاتا ہے۔ اسی کی مدد سے تفصیلات پر عبور حاصل ہوتا ہے [illegible]
بصیرت کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ بہرحال استاد کی شخصی توجہ اور امداد ناگزیر امور ہیں۔ ان کے بغیر فلسفہ سے نشاط نہیں [illegible]
تفلسف دشوار ہے۔

اس مسئلہ پر ہمیں غور کرنا ہے۔ جذباتی محرکات سے الگ ہو کر یعنی مقصود اندھی تائید یا تردید نہیں ہے۔ بلاشبہ [illegible]
میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ استدلال قوی اور دلنشین بھی ہے اور برانگیختہ کن بھی۔ آدمی اس کا اقرار بھی کر سکتا ہے اور انکار [illegible]
سچ بات معلوم کرنی چاہتے ہیں۔ خواہ وہ کیسی ہی ہو۔ لہٰذا ذاتی میلان خاطر تقاضائے احتیاط کے خلاف ہے۔ سچ پوچھئے تو بہتر فلسفی [illegible] کے لئے
تعلیم ضروری ہے۔ کسی کو اگر جامعہ کی تعلیم میسر ہو، مشہور اور مسلمہ استادوں کی سرپرستی حاصل ہو، اگر ممتاز مفکروں سے مستفید ہونے کے
موقع نصیب ہوں تو وہ نسبتہً اچھا، قابل اور ہوشیار فلسفی ہو سکتا ہے۔ لیکن ان امور کی بدولت وہ حقیقی فلسفی نہیں بن سکتا [illegible]
تعلیم سے بھی مقدم ایک چیز ہے یہ ہے فطری صلاحیت، صلاحیت حق معلوم کرنے اور جاننے کی، صلاحیت اخذ و قبول کی [illegible]
سرگرمی کی، صلاحیت تنقیدی نظر کی، یہ ہو تو استاد کے فیض صحبت اور ماحول کے عمدہ اثر سے بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ [illegible]
منتخب روزگار استاد بھی کچھ نہیں کر پاتے، بہترین علمی ماحول کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ محض ان اسباب سے آدمی [illegible] نہیں بن سکتا
جو وہ در اصل ہے نہیں طبعی میلان یا صلاحیت بنیادی چیز ہے۔ اگر ہم میں وہ نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ معاملہ [illegible] کوئی ایسا کی
کوئی طاقت ہم میں یہ بات پیدا نہیں کر سکتی، اس کی جگہ نہیں لے سکتی، اس کی اہمیت کو ماننا لازمی ہے اور [illegible]
صلاحیت میں مدارج کا فرق ہے کسی میں وہ کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ، اس کے علاوہ دو چیزیں اور بھی [illegible]

میں سے ایک ہے کلچر، انسانی نسل کی فکر، حُسن کاری اور روایتوں کا علم اور اندازہ۔ گویا صرف فلسفہ کی تعلیم لازمات سے ہے بلکہ فلسفہ کے لئے تعلیم بھی لازمات سے ہے۔ مطلب زیادہ صاف الفاظ میں یہ ہے فلسفے کو فائدہ بخش طریقے سے فقط ایک طرح سیکھا جا سکتا ہے، یہ کہ اُسے تربیت ملے۔ ہمیں اس کی مشق و مہارت کے موافق حالات دستیاب ہوں۔ لیکن فلسفہ کو ہاتھ لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم کو تعلیم یافتہ ہوں۔ یہ چیز مفکر کو بے وقوفی سے بچاتی ہے۔ پیشروؤں اور ہم عصروں کے بیش بہا افکار سے گہری واقفیت نہایت سود مند ہوتی ہے۔ اس سے نگاہ میں بلندی آتی ہے۔ مذاق میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ اور طبیعت میں تنقید کی قوت پختہ ہوتی ہے۔ بایں ہمہ وہ کسی بیوقوف کو مفکر نہیں بنا سکتی۔ دوسری چیز ہے تحقیق۔ تعلیم کے دوران میں اور اس کے اختتام پر مطالعے کا جاری رکھنا۔ اس استقلال و کاوش کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بغیر مفکر اپنا فعل عمدگی سے انجام نہیں دے سکتا۔ عملی دُنیا کے تازہ ترین واقعات و خیالات سے باخبر رہنا بجائے خود ایک لذت ہے۔ لیکن فلسفی کے لئے تو وہ ایک ضرورت ہے۔ کیونکہ اسے وقت کے ساتھ قدم ملائے چلنا پڑتا ہے۔ اس کے موضوع کی پوری تاریخ عصری تاریخ کا تاریخ جس میں عصری افکار سے ہے، بنابریں خالی تعلیم ناکافی ہے۔ سب سے مقدم ہے فطری صلاحیت۔ اس کے بعد ہے کلچر اور آخر میں ہے تحقیق۔ پر کہا جا سکتا ہے کیا تعلیم کے بغیر تفلسف ممکن بھی ہے؟ "تعلیم کے اہم ہونے میں کلام نہیں ہے۔ پھر بھی کہا جا سکتا ہے کیوں نہیں؟ فرض کیجئے ایک شخص ہے اس میں صلاحیت ہے کلچر ہے، ذوقِ مطالعہ ہے مگر حالات اس کے سازگار نہیں رہے، وہ جامعہ کی تعلیم سے فیضیاب نہیں ہوا تو کیا اس بنا پر اسے فلسفہ آرائی کے لئے ناقابل قرار دیا جائے گا؟ یقیناً نہیں۔ وہ اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔ اس مشغلہ میں لگا رہ سکتا ہے۔ اس کا ذاتی شوق، اس کی برداشت، اور اس کی سرگرمی اس کی کمیوں کی تلافی کر سکتی ہے۔ اس سے جوڈ کو بھی انکار نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے فلسفہ طراز حدود جامعہ کے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتے ہیں کیا بلکہ ہوتے ہیں۔ انھیں کے متعلق اس نے ایک جگہ لکھا ہے: "لیکن فرض کیا کہ باتیں آپ سے کرنے کے لئے کوئی نہیں ہے۔ تبادلۂ خیال اور مباحثہ کے مواقع بھی آپ کو حاصل نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں پسندیدہ امر یہ ہے کہ آپ اپنے مطالعے کے لئے بعض قاعدے مقرر کریں اور ان کی سختی سے پابند ہوں۔"

فلسفیوں کا مفاد خاص۔ فلسفہ آرائی کو ایک خاص حلقے تک محدود رکھنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ زیادتی کیا ایک چڑھاپن ہے۔ یہ چڑھا اہل دماغ کی وہ قسم ہے جو اپنے آپ کو بزعم خود بہت شائستہ سمجھتی ہے۔ نتیجۃً عامی اور معمولی چیزوں کی طرف سے اس احتراز سے پتا چلتا ہے کہ اسے اپنی برتری کا شدید احساس ہے۔ اس کی روش نستعلیق اس کی ہر بات سے ٹپکی پڑتی ہے، اس کے قول سے اس کے فعل سے اس کے خیال سے، اسے صرف حسین اور اچھی چیزیں بھاتی ہیں۔ ایسا آدمی انھیں سے محبت بھی کرتا ہے۔ ناتراشیدہ بھدی اشیاء سے اسے گھن آتی ہے۔ ان سے اس کے ذوق کی لطافت مجروح ہوتی ہے۔ اسی لئے اسے معمولی فلسفیانہ تحریریں اور کتابیں پسند نہیں آتیں۔ وہ ان میں سوقیت اور اوچھاپن پاتا ہے اور انھیں واہیات کی پوٹ قرار دے کر ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ عیوب ہی کے مقام پر پڑتی ہے اور وہ ان سے ایک ادائے استکراہ کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔ بگڑ یہ سب عقلی ابلہ فریبی ہے۔ دُنیا میں کہیں نقش بے عیب نہیں ہے۔ کمال اور ناتمامی خواب و خیال کے عالم میں بے میل ہوں تو ہوں روزمرہ کی دنیا میں تو وہ لاینفک طور پر باہم ملے ہوئے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ناتمامی ہر کمال کے ساتھ ہے۔ اور ہر ناتمامی میں ایک شائبہ کمال موجود ہے۔ ڈاکٹر طیب کی ڈگری کا مقالہ کوئی معمولی تصنیف نہیں

ماہوتا۔ لیکن ولیم جیمز، جارج سنتیانا کے مقالے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کا اعلیٰ ترین حصہ فلسفیانہ عظمت و جلالت میں ولیم جیمز کے جاں [illegible]۔ اس [illegible]
ہے خود جوڈ کی ابتدائی تصانیف پڑھنے سے نکتہ چینیاں ہوئی ہیں پھر غیر فلسفیوں کی کوششوں کے متعلق جو کہا جائے کم ہے۔ ایسی ہی بے جا
بات کی مجوزہ میں "تفلسف" کی دلیل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عقل "شرفا" آسمانوں پر رہتے ہیں۔ زمین پر آنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بلا روز زمان [illegible]
نہیں آتا ہے وہ حقائق و واقعات سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ یہ ہوئی ایک بات، دوسری بات یہ ہے طبقاتی پسندی کا رجحان قباحت سے
نہیں ہے۔ جب دنیا میں جنگیں جلد جلد ہوں، زیادہ سے زیادہ تباہ کن ہوں جس کے امکانات، انسانی عقل و فہم کا دیوالہ نکل جانے سے آج
زیادہ ہیں تو لازم ہے کہ تحقیق کی بلند ترشکلوں کے فروغ اور منظم فکر کی روایتوں کے تحفظ کے نام سے کسی نہ کسی معاشرتی تنظیم کی وکالت کی
جائے، اور اہل دماغ مل کر ایک اعلیٰ جماعت بنائیں تاکہ "حقائق سرمدی" کی تلاش جاری رہ سکے۔ اور عوام کو اپنے روزمرہ کے معمولی کاروبار
انجام دینے کی فرصت اور توانائی ملے۔ یہ کوئی بے سروپا بات نہیں ہے۔ اس قسم کی ایک تجویز پہلی جنگ کے بعد مشہور فرانسیسی اہل قلم جولین بینڈا
نے پیش کی تھی۔ جنگ کے بعد حالات ایسی ایسے رونما ہوتے ہیں کہ قوم کا بہترین حصہ، شمول اہل دماغ قربان گاہ ہوس پر بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔
اقتصادی و سیاسی حالات کی ابتری میں عقلی و اخلاقی اقدار و تصورات کی بازی لگتی ہے۔ تحقیقی اور عقلی کام اور پیداوار کا پورا انتظام متاثر ہوتا ہے۔
شائستگی اور ہیئت اجتماعی کو انتشار کا زبردست خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ان وجوہ کے تحت مجوزہ جماعت کا وجود مفید ہوگا۔ کیونکہ اس کا فعل
یہ ہوگا کہ عوام کی جانب سے اور عوام کے لئے سوچے، انھیں روزانہ کے کام کاج میں اتنا وقت نہیں ملتا پھر ان کے اتنا دماغ بھی نہیں ہوتا
اس لئے ہر سماج میں دو طبقے یا ذاتیں ہوں گی۔ سوچنے اور محسوس کرنے والوں کی ایک ذات، جو محض تحقیق میں لگی ہوگی خواہ فلسفیانہ ہو یا سائنسی
دوسری ذات عامۃ الناس کی ہوگی، قدرتاً دلیل اور بڑی بے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تقسیم غیر فطری جیسی ہے کتنی ہی دلکش ہو عملاً اس سے انسانیت
کو نقصان پہنچے گا۔ اولاً قابل غور امر یہ ہے کہ اگر ایسا ہو تو دماغی کام کرنے والوں میں برتری کا احساس تیز ہوگا۔ وہ جسمانی کام کرنے والوں سے
الگ تھلگ رہیں گے۔ انھیں پست و حقیر جانیں گے یعنی بعض طبقاتی خرابیاں بدستور قائم اور مؤثر رہیں گی۔ اور ان دو میں چونکہ باہم کوئی فطری
اور نامی تعلق نہیں ہوگا، اس لئے دو پدر تاریک سماج مصنوعی اور زوال آمادہ ہوگی۔ پھر محض دماغی مزدوری بھی اتنی ہی افسوسناک ہے جتنی کہ
محض جسمانی۔ ثانیاً انسانی فرد فطرتاً تن آسان واقع ہوا ہے۔ اگر فکر و تحقیق اس کی بجائے کوئی اور انجام دے، اگر اسے تا بوں کے ذریعے
اور سے کا حال معلوم ہو تو وہ بالکل مطمئن ہو جائے گا۔ مذہبی اعمال و فرائض، شادی بیاہ کی رسوم وغیرہ آج بھی برہمنوں کے ذریعے انجام
پاتے ہیں مگر اس میں دو خطرے ہیں۔ اہل دماغ کی جماعت نوع انسان کے بڑے سرچشمے سے محروم ہو جائے گی۔ یہ نقصان نہ درست ہے۔ دوسرا
خطرہ یہ ہے آج سائنس داں ریاست کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں وہ سیاست کاروں کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک سے
ایک خطرناک تر ایجاد کر رہے ہیں۔ کل یہی حال اہل دماغ کا ہوگا۔ ریاست ان سے فرمائش کرے گی کہ عوام کے لئے پسندیدہ باتیں تیار کریں یہی
"سرمدی حقائق" شمار ہوں گی۔ اور کم ہمت اور خائف فرد انھیں تیار کپڑوں کی طرح قبول کر لے گا۔ بہ ہر ملکوں میں ایسا ہوتا ہے۔ [illegible]
حالت اور جنگ کی برائیوں کا سان دار چکر چلتا رہے گا۔ وقفے محض تیار اور تازہ دم ہونے کے لئے ملیں گے۔ ثالثاً فرد کے بنیادی حقوق پر کاری ضرب
لگتی ہے۔ آزادیٔ فکر کی کسی پابندی پر معمول محصول دہندہ شاید ہی تیار ہو۔

چالاکی اور آخری چیز ہے۔ فلسفہ میں بھی ایک مفادِ حاصلہ پیدا ہوگا۔ خالص دماغی اور جسمانی مزدوروں میں اس کا میلان ہوتا ضروری ہے اپنی تحقیقات اور اپنے مطالعوں کے لئے مخصوص زبان استعمال کریں تاکہ فن کے راز پوشیدہ رہیں۔ عیار انھیں ایک بند کتاب پائیں اور کسی [illegible] سمجھ ہی نہ سکیں۔ ورنہ مالی خسارے کا قوی اندیشہ ہے۔ ایسے آثار پیشہ ور فلسفیوں کے حلقے میں ابھی سے ہویدا ہیں۔ نئی اصطلاحوں کی کثرت مضامین واداکے اغلاق کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ڈر ہے کہ اگر لوگ فلسفہ کی فنی تربیت حاصل نہ کریں فلسفیوں کی اصطلاحی بولیوں کی تعلیم نہ پائیں اور اچھے طریقے سے فلسفہ آرائی کریں تو جلد یا بدیر فلسفے کی قدر وقیمت پر اثر پڑے گا۔ اس کا رعب جاتا رہے گا اور بازار میں اس کا نرخ گر جائے گا چنانچہ اس مفادِ حاصلہ کی حفاظت واجب ہے اور یہ منحصر اس پر ہے کہ لوگوں کے دماغوں میں بٹھا دیا جائے کہ فلسفہ ایک دقیق مضمون ہے۔ وہ اتنا ہے کہ پیشہ ور فلسفی کی دستگیری کے بغیر پڑھا نہیں جا سکتا۔ افلاطون کی تقلید میں یہ اصحاب سوفسطائیوں کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن اپنے عمل پر شرمندہ نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفیانہ اجارہ داری برقرار نہیں رہ سکتی۔ فلسفہ کو پیشہ ور فلسفیوں کے حلقے سے باہر بھی کافی قبول حاصل ہے۔ اس پر آپ کہہ سکتے ہیں یہ باتیں مغرب کی ہیں جہاں ڈالر اور جوہری بم کے سہارے دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ عین ممکن ہے فلسفہ آرائی اس دیس کے رہنے والوں کی تفریح ہو۔ بے فکروں کو اکثر دور کی سوجھتی ہے یا بڑے آدمیوں کا تفریحی مشغلہ ہو کیونکہ بیکار تونگروں کے لئے وقت کاٹنا دوبھر ہوتا ہے یہ لوگ زندگی کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں۔ متمنی ہوتے ہیں کہ قوت اور تحسین حاصل ہو۔ چنانچہ زمانے کے عقلی فیشن سے واقفیت پیدا کرتے ہیں فیشن خواہ برگساں کا نظریہ وجدان ہو یا فرائڈ کی تحلیل نفسی یا سارترے کا فلسفہ وجود۔ جوڈ کی رائے بھی کچھ ایسی ہی ہے وہ کہتا ہے "اور بعض اصحاب کا ذکر ہوا ہے۔ یہ سب سیانے عملی انسان ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے شہرت، عزت اور قوت پیدا کی۔ مگر کائنات پر غور کرتے وقت وہ معاملہ سادہ کیوں بن جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عمیق اور غامض مابعد الطبیعی تخمین اور مہمل محض میں تمیز بہت دشوار ہے۔ یہ دونوں اکثر باہم جگہ بدل لیتے ہیں۔ فلسفے کی دلکشی کا موجب یہی ہے۔ احمق سے احمق بھی کامیابی سے فلسفیانہ نمائش کر سکتا ہے اور اس نمائش کی پردہ دری ممکن یا آسان نہیں ہے فلسفہ ایک محفوظ چراگاہ ہے اس کی طرف ہر شخص منہ اٹھائے چلا آتا ہے"۔ اس کے علاوہ اور کئی ذیلی وجوہ ہیں (۱) فلسفہ کا موضوع بحث بہت وسیع ہے (۲) اس میں موضوعی عنصر ہمیشہ شامل رہتا ہے (۳) وہ تصدیق کے قابل نہیں ہوتا (۴) وجدان کی وکالت عقل گمراہی پیدا کر رہی ہے۔ (۵) تحلیل نفسی کے اثر سے عقل کی تحقیر اور تخفیف عام ہو چکی ہے اور (۶) فلسفی کے لوازم و ضروریات کی تعیین مشکل ہے۔

یہ سادگی ہے؟ حیرت ہوتی ہے اس توجیہ پر۔ چلے تھے حق و صداقت کے واجبات کی تکمیل کرنے لیکن سب سے زیادہ پامال انھیں واجبات کو کیا ہے۔ بلند بانگ دعووں کا حشر کم و بیش یہی ہوتا ہے۔ واقعات کی اس غلط تعبیر کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ ایک تو مقصد نے نظر اور تناظر کو کچھ مسخ کر دیا ہے دوسرے ایک دبا ہوا غصہ ذہن کے عقب میں ہے وہ پوری تحریر کو رنگ دیئے ہوئے ہے، ابلتی ہوئی پرخاش استدلال کی بحث آرائی، والگ بھر اشتعال یہ سب چیزیں اسی غصہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ بہرحال جوڈ نے صورت حال کی توجیہ میں ٹھوکر کھائی ہے ان کے مینز یا فلاں کی نفسیات کا مسئلہ سیدھا سادہ تھا ہے، نہ پیچیدہ ہے نہ تعجب انگیز۔ تعجب انگیز تو وہ طریقہ ہے جس پر اسے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اختلاف سے مجھے مطلوب نہیں۔ عقلی امور و مباحث میں اس قسم کے اصولی اختلافات خوش آئند ہیں۔ مجھے اعتراض یہ ہے۔ جو

ت طور سے تسلیم کرتا ہے۔ اس کے میزبان بڑے سیانے اشخاص ہیں۔ ان میں کوئی دماغی خرابی نہیں۔ وہ اعلیٰ کاروباری ذہانت اور [illegible]
عملی فراست کے اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے ساتھیوں میں سے کوئی ان کی برابری نہیں کرتا۔ کوئی ان کی حوصلہ مندی کو
نا قابل کر ان کی وقتِ نظر کو، ان کی اصابتِ رائے کو نہیں پہنچا۔ اپنے منصوبوں میں انھیں کامیابی ہوتی ہے زیرکی سے، بعض تنقیدی [illegible]
اور مستقل استقلال سے اس طرح ان کی ہوشمندی ناقابلِ انکار ہے۔ ان کی دقیقہ رسی شک و شبہ سے بالا ہے۔ ان کی عقل تیز [illegible]
ہے۔ ان کی سمجھ پختہ و چالاک ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ وہ کام سے پہلے اس کے ہر پہلو پر سوچ بچار کرتے ہیں
کے نتائج اور مخرجات کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہاں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے انسان عموماً اپنے کاروبار میں ایسے رہتے ہیں۔ ان کی
ہمت اسی پر صرف ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہر کام کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا، یہ فائدہ ہمیشہ روپے آنے پائی کی
میں ہوتا ہے۔ اس خیال کے اصحاب میں علمی ذوق اول تو قرینِ قیاس ہی نہیں ہے۔ زمین شور کو سنبل سے بھلا کیا تعلق۔ اور کسی غلطی
سے وہ ہو بھی تو پنپ نہیں سکتا۔ کار پردازی کے بوجھ تلے دب کر ادھ موا ہو جاتا ہے۔ آدمی ماحول کو بناتا ہے۔ آدمی ماحول سے بنتا ہے
ہوتے ہیں ظاہر ہے۔ ان کا ماحول تو اور بھی زورِ عمل ہوتا ہے۔ کاروباری۔ بے تخیل، کھرا، غیر دلچسپ، ان حالات میں علمی مشاغل
دلچسپی پیدا ہو نہیں سکتی۔ اور ہو تو باقی نہیں رہ سکتی۔ وہ بے عمل قرار پاتے ہیں۔ انھیں بے جا خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود [illegible]
علمی مہم کو عملی مہم پر ترجیح دیں یا ساتھ ساتھ جاری رکھیں تو یقیناً حیرت انگیز بات ہے اور سمجھنا چاہیے کوئی ناقابلِ ضبط فطری میلان ہے
اپنی طبیعت اپنے گردوپیش کے خلاف کچھ نہیں کر پاتا۔ خواہ مخواہ اپنے کاروبار میں نقصان نہیں اٹھاتا۔ اس نکتے سے ہم بحث آگے چل
یں گے۔ سرِدست کہنا کچھ اور ہے۔ جوڈ کا خیال ہے کہ کاروباری آدمی مخصوص اور سرکاری مشکلات پر تو بڑی احتیاط سے غور و فکر کرتا ہے
ہستی اور حیات کے متعلق سوچتے ہوئے وہ بالکل سادہ بن جاتا ہے، اس کی سادگی میں پرکاری نہیں ہوتی، بلکہ وہ کسی مذہبی مجنون یا جامعہ کے
نئے طالب علم کی سادگی کے مانند ہوتی ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے، کہیں دیرینہ ہوشیاری جواب دے سکتی ہے، آدمی تو عادت کا بندہ
یا جیسا کہ جان ڈیوی کہتا ہے عادت والی مخلوق ہے۔ کاروبار کی دماغی تربیت اور ممارست کے اثرات آسانی سے زائل نہیں ہوتے۔ [illegible]
کی گہرائی، فہم و تخمین کی تیزی، عقل و ہوش کی بیداری، درک و تجربہ کی پختگی، ہیچ اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت، یہ چیزیں آسانی سے حاصل [illegible]
نہیں ہوتیں وہ قیمتی ملکیت ہیں اور برخلاف مادی مال و دولت کے نہ خرچ سے گھٹتی ہیں نہ کبھی کسی طرح سے ضائع ہوتی ہیں۔ بہرحال [illegible]
دتیں راسخ ہونے کے بعد مشکل سے چھوٹتی ہیں کسی کو ان کے ترک کی قدرت نہیں ہوتی۔ اس واقعہ کو ڈیوک آف ولنگٹن نے اس طرح بیان
یا ہے، عادت فطرت سے دس گنا زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ لہٰذا کامیاب قسم کے عملی انسان سادہ نہیں بن سکتے۔ ان کی ذہنی تعلیم [illegible]
ہیں جاتی۔ ان کی عادتیں برابر ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ خواہ عمل میں ہو یا فکر میں۔ اس جگہ یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے عملی انسان کی عادتیں عمل
دی ہیں، وہ کامیاب کاروبار کے اثرات اور ضروریات کے تحت بنتی ہیں ان کا دائرہ عمل بھی یہی ہے۔ فکر و نظر میں ان سے کوئی [illegible]
ہو سکتا۔ مگر ایسا شبہ بے بنیاد ہے، جدید نفسیات انسانی ذہن میں مختلف خانوں کو تسلیم نہیں کرتی، اسے ان الگ الگ چیزوں کا [illegible]
نہیں سمجھتی، کہتی ہے وہ واحد ہے۔ ایک مربوط اور مسلسل حرکی وجود ہے، اس کی فکر اس کے عمل میں نفوذ و سرایت کیے ہوئے ہے [illegible]

میں ان کی فکر میں جانچ پرتال یا چھان بین کی عادتیں بالآخر کاروبار تک محدود نہیں رہتیں۔ وہ فکر و نظر پر بھی حاوی ہوتی ہیں۔ دعویٰ بے دلیل
نہیں ہے۔ چونکہ مہرزاں طبعاً تفلسف کی طرف مائل تھے۔ انھیں سوچنے کا چسکا تھا۔ انھوں نے اپنے افکار پوری سنجیدگی سے ترتیب دیئے
و ماں پر بہت وقتوں تک سوچ بچار کرتے رہے۔ اس انہماک سے ان کا کاروبار متاثر ہوا، مالی نقصان کو انگیز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تفکر
سے بڑی گہری دلچسپی ہے، ایسی صورت میں لازم ہے انسان ممکن جتن کرے، چنانچہ ہمارے مال و اردوستوں نے متعلقہ ادب کا نظرغائر
سے مطالعہ کیا پسنگارخ اور دشوار گزار مصنفوں تک کو نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد اپنے افکار قلم بند کئے۔ ان نگارشات کے متعلق آزمودہ
کاروں کی رائے لی، ان کی تنقیدوں سے استفادہ کرنا چاہا، تاکہ خیال کی خامیاں اور استدلال کے جھول درست ہوں مبہم امور واضح
ہوجائیں تاریک گوشوں پر روشنی پڑے تشنہ جزئیات کی تکمیل ہو، ضروری مباحث تفصیل سے ادا کئے جائیں اور غیر ضروری باتیں حذف
ہوں۔ کتابوں کے بھیجنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ غلطیوں اور کمزوریوں کی اصلاح دوسری اشاعت میں ہوجائے۔ یہ تدابیر تو تدبّر کی دلیل
ہیں، روزمرہ کے معاملات میں ناپ تول سے کام لینے والوں سے اس سے کم کی توقع بھی نہیں ہوسکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عملی مسائل و
مراحل سے ہنسٹ کران کی بیدار مغزی ماؤف و معطل ہوجاتی ہے۔ ان کی معاملہ فہمی جاتی رہتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اتنی احتیاط سے تو پتا
چلتا ہے کہ انھیں خود موضوع پر کما حقہٗ عبور نہیں ہے اور اپنے آپ سے بے اعتمادی کی وجہ یہی ہے تو یہ درست ہوگا مگر یوں تو عقل مند سے
عقل مند انسان بھی خطا پذیر ہے۔ اپنی خامیاں ہمیں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ اور بالخصوص جب کہ وہ نظری اور باریک قسم کی ہوں۔ انھیں
معلوم کرنا اور ان سے رجوع ہونا تو عین معقولیت ہے۔ پختہ کار فلسفی بھی تنقیدوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ ہوشیاری کوئی گناہ نہیں ہے
اور ہے تو پھر

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

آخر فلسفی ہی کیوں؟ غرضکہ بہ حیثیت مفکر کے غیر فلسفی احمق نہیں ہوتے۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ ان کے افکار خام
ہوں مبہم ہوں متناقض ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ افکار اصلی ہیں، اس میں کوئی کلام نہیں ہے، رہ گئے ان کے اسقام سو اس
بارے میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو کم و بیش تمام انسانی فکر کی خصوصیت ہیں پھر اعتباری بھی ہیں۔ ابہام ہم سب کے خیالات
میں ملتا ہے۔ کوئی اس سے بچا ہوا نہیں ہے۔ کسی کے ہاں وہ کم ہوتا ہے کسی کے ہاں کچھ زیادہ، کسی کے ہاں بہت زیادہ۔ یہی حال
تناقض کا ہے یہی حال خامی کا ہے۔ سوچنے کی پیہم اور سخت کوششوں کے ذریعے ہی سے ہم ان کمزوریوں پر قابو پاسکتے ہیں۔ ان
کو کم سے کم کرسکتے ہیں۔ بعض ان کوششوں میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں اور بعض کم۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی ان سے بالکل مبرّا
ہو۔ عام انسانی سطح سے تھوڑی بہت بلندی تو میسر آسکتی ہے اور قرین قیاس بھی ہے پر یکسر علیحدگی ناقابل تصور ہے۔ فلسفی تفلسف
سے پیشہ ورانہ لگاؤ رکھتے ہیں، اس کے لئے ضروری فنی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس پر کافی وقت، دماغ اور توانائی صرف کرتے ہیں
موضوع سے گہرے طور پر واقف ہوتے ہیں۔ اور اس میں بڑی بصیرت بہم پہنچاتے ہیں۔ بایں ہمہ زیر بحث نقائص ان کے اپنے حلقے کے
اندر نایاب یا کمیاب نہیں ہیں۔ درجے کے فرق سے یہ نقائص تقریباً سب میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو ڈ نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے

فلسفہ کسے مسائل خوانوں کی آرا رخام ہوتی ہیں۔ جب امر واقع یہ ہے تو عامی ہی نشانِ ملامت کیوں بنے؟ اس کی عقل ناقص ہے ہم مانتے ہیں لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ حمام میں سب ننگے ہیں صرف ایک کا ننگا پن نظروں کیوں کھٹکے؟ فلسفی کی کمزوری سے قاری کی حیثیت مضبوط نہیں ہوتی۔ ہمیں تو عرض صرف اتنا کرنا ہے۔ موخرالذکر کے قیاسات بے قید تخیل کی ہرزہ سرائیاں نہیں ہیں۔ وہ اصلاً اور اصولاً ان کے افکار کی قبیل سے ہیں۔ پھر ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ عامی تفلسف میں ماہر کی برابری کر سکتا ہے۔ بے شک ان میں فرق ہے مگر یاد رکھنا کہ یہ فرق صرف تفکر کی مہارت کا ہے فلسفیوں کو چاہئے کہ خاکسارانِ جہاں کو حقارت سے دیکھنا چھوڑ دیں۔ ما ان میں خود گوئی نہیں۔ یہ ہمارے پیادے ہیں دریدہ دامن اور خستہ حال۔ پھر بھی نامناسب ہے کہ انھیں عناد و تضحیک کا ہدف بنایا جائے۔ ان پر سختی سے حرف گیری کی جائے فلسفیوں کے اس طرزِ عمل کی نسبت دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا

مستند ہے "ان کا" فرمایا ہوا؟

کیونکہ وہ عجیب و غریب راہی ہیں، انھیں منزل کی کوئی پروا نہیں ہے، دلچسپی فقط چلتے رہنے سے ہے، یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہ چلنے لوٹنے اور پھر چلنے سے ہے، وجہ ظاہر ہے کہ اس طرح وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں کے نقوش پا کو مٹا سکتے ہیں۔ گویا ان کا بیشتر وقت صرف ہوتا ہے تنقید و تنقیص پر، وہ کسی کو معاف نہیں کرتے۔ ہر ایک سے الجھتے ہیں منطقی تحلیل کے ماہر کہتے ہیں کہ جملہ مابعدالطبیعیات داں مہمل گو ہیں۔ مابعدالطبیعیات داں کہتے ہیں کہ منطقی تحلیل تو خیر ایک بچکانہ سی ہوئی نیکی ہے، البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ اکثر فلسفی پوچ باتیں کہتے ہیں ان بحثوں سے شبہ ہوتا ہے کہ کیا بے معنی در اصل بے معنی ہے بھی؟ ثانیاً یہ کہ غیر فلسفیوں کے افکار و شاعر کو ہیچ نہ جانئے۔ ان پر ہمدردی اور کھلے ذہن سے غور کیجئے۔ ان کے سطحی عیبوں اور الجھنوں پر صبر فرمائیے ان خرابیوں سے آگے بڑھئے۔ خیالات کے پس پردہ محرکات اور موجبات کو ڈھونڈئیے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کوئی چیز دیدہ و دانستہ مہمل نہیں ہوتی۔ جان بوجھ کر مہمل کہنے کے لئے بھی عقل چاہئے اور عقل کے اس بیجا استعمال پر شاید ہی کوئی عقل مند تیار ہو۔ پھر کوئی مہمل چیز اتنی مہمل نہیں ہوتی کہ قطعاً ناقابلِ اعتنا ہو۔ ناقابلِ اعتنا اور بے بنیاد گہری باتیں جانچ میں لازماً آشکار ہوتی ہیں۔ تلاش بے کار نہیں جاتی۔ پھل مل کے رہتا ہے۔ (باقی)

قائداعظم کا ارشاد

مبادا آپ بھول جائیں

تم آزاد ہو، تم سب کو پوری آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جاؤ، تمہارا تعلق کسی مذہب کسی فرقے، کسی عقیدے سے کیوں نہ ہو حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہم اپنے کام کی بنیاد اس اصول پر رکھ رہے ہیں کہ ہم ایک مملکت کے شہری اور برابر کے شہری ہیں۔ تم اس خیال کو اپنا نصب العین بناؤ اور تم دیکھو گے کہ تھوڑے ہی دنوں میں نہ ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان، نہ مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ اس لئے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے جس کے مطابق ہر شخص اس مملکت کا آزاد شہری ہے۔

(کراچی ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

حضرت اثر صہبائی

سرودِ نو

شاہی میں اگر روحِ فقیرانہ نہیں ہے
مطلوب مجھے شوکتِ شاہانہ نہیں ہے

اصنام ہیں اور گرزِ براہیم ہے غائب
فرعون ہیں اور چوبِ کلیمانہ نہیں ہے

اے شمعِ حرم! تیرا ہی شعلہ ہوا بے سوز؟
پروانوں میں یا جذبۂ پروانہ نہیں ہے؟

ہو خواب تو افسانہ ہی افسانہ ہے یہ زیست
کھل جائے اگر آنکھ تو افسانہ نہیں ہے

صہبائے محبت ہو اگر ساغرِ دل میں
پھر کونسا گوشہ ہے جو میخانہ نہیں ہے

ہر گام پہ ساقی نے دیا مجھ کو سہارا
لغزش یہ مری لغزشِ مستانہ نہیں ہے

آباد ہے اب دل میں محبت ہی محبت
دل ایک طرب زار ہے غم خانہ نہیں ہے

فردوس بدامن ترے جلووں کا تصوّر
میرے لئے ویرانہ بھی ویرانہ نہیں ہے

صہبائیِ سرمست کو دیوانہ نہ سمجھو
دیوانہ نظر آتا ہے، دیوانہ نہیں ہے

جنابِ محمد شریف صاحب چشتی

غزل

بنستا رہا ہے درد بھی درماں کبھی کبھی
کیا کیا ہوئے ہیں زیست کے ساماں کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں ضبط کا اکثر رہا خیال
پھر بھی ہوا ہے چاک گریباں کبھی کبھی

گلشن میں خون، دشت میں خس، بحر و بر میں خوں،
نکھرا ہے یوں بھی رنگِ بہاراں کبھی کبھی

کیا چارہ ہے مشیتِ مولا کے سامنے
یہ کہہ کے ہار بیٹھا ہے انساں کبھی کبھی

برعکس اس کے عزم و تہور کے نام پر
تقدیر ہم نے دیکھی ہے رقصاں کبھی کبھی

تڑپی ہے جب دلوں میں تمنائے انقلاب
بدلی ہے سمتِ گردشِ دوراں کبھی کبھی

رکھا سکوں نے دور ہمیں جس مقام سے
لائی وہاں بھی کاوشِ پنہاں کبھی کبھی

ہم پرفشاں ہوئے ہیں جو پروازِ شوق میں
کی ہے عبورِ سرحدِ امکاں کبھی کبھی

خود بجلیوں نے کی ہے نگہبانیٔ چمن
گزرے ہیں ہم پہ ایسے بھی طوفاں کبھی کبھی

قدرت کی مصلحت ہے کہ کھاتے رہے ہیں مات
مورانِ نیم جاں سے سلیماں کبھی کبھی

آلامِ روزگار نے جینا سکھا دیا
پیاری لگی ہے دولتِ حرماں کبھی کبھی

رکھ دیں نظامِ کہنۂ عالم بدل کے ہم
کھاتا ہے پیچ و تاب یہ ارماں کبھی کبھی

یہ انتہائے رحمتِ پروردگار دیکھ
میرے گناہ پر ہوئی نازاں کبھی کبھی

پایا ہے اپنی روح میں کون و مکاں کو گم
حاصل ہوا ہے اپنا بھی عرفاں کبھی کبھی

اپنی خودی کی خلوتِ رنگیں میں ڈوب کر
دیکھا ہے ہم نے جلوۂ یزداں کبھی کبھی

پروفیسر محمد شمس الدین صدیقی ایم اے (عثمانیہ)
(سی۔ ڈی۔ ہیل سے مستفاد)

...ٹوٹی کہاں کمند!

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد :۔

مہر نگار سلیم کی بیوی۔ عمر ۲۵ سال

سلیم ایک دولت مند تاجر عمر ۳۰ سال

نسیمہ مہر نگار کی پرانی سہیلی عمر ۲۶ سال

راہگیر

مقام سلیم کا مکان زمانہ موجودہ

(مہر اور نسیمہ ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہیں)

نسیمہ :۔ مہر مجھے تو تم پر رشک آتا ہے۔

مہر :۔ واقعی! لیکن کیوں!

نسیمہ :۔ اتنا اچھا مکان، ایک سے ایک بہتر کپڑے ملازمین، موٹر، ریڈیو، ٹیلیفون، غرض کس چیز کی کمی ہے تمھیں! اور ایک میں بیچاری دیکھو اپنے آپ کو کھلانے پہننے اوڑھنے کے لئے ایک دکان میں ملازمت کر رہی ہوں۔

مہر :۔ خدا نے چاہا تو تمھیں بھی ہر طرح کا آرام مل جائیگا مجھے خود کب اس کی توقع تھی کہ میری قسمت یوں چمک جائے گی۔

نسیمہ :۔ کاش تمھاری زبان نیک ہو!

مہر :۔ شادی کر لو کسی اچھے آدمی سے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نسیمہ :۔ اتنی عمر تو ہو گئی میری۔ اب کون کرے گا مجھ سے شادی!

مہر :۔ ابھی بوڑھی تو نہیں ہوئیں نا! کوئی نوکری ہی لے گا۔

نسیمہ :۔ اگر وہ بھی میری ہی طرح کسی دکان پر کام کرنے والا ہو تو فائدہ ہی کیا ہے!

مہر :۔ اری کچھ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا بہتر ہے۔

نسیمہ :۔ لیکن تم بھی تو بتاؤ کہ سلیم صاحب سے کیسے میل ہوا!

مہر :۔ بس یوں سمجھو کہ قسمت اچھی تھی۔

نسیمہ :۔ پھر بھی آخر کیا ہوا؟ آج تو میں سب کچھ سن کر ہی رہوں گی۔ اب ٹال مٹول سے فائدہ نہیں۔

مہر :۔ کہہ تو دیا بس اتفاق تھا۔

مہر :۔ مدت تک شراب پی پی کر مر گیا ہوگا بد نصیب ؟

نسیمہ :۔ کیا واقعی تمھیں اس پر رحم آتا ہے ، مہر ؟
رحم ، محبت [illegible] !

مہر :۔ خدا کے لئے اور کوئی بات کرو ۔

نسیمہ :۔ میں یہی تو کہنے آئی تھی کہ تمھارا بیٹا ابھی
زندہ ہے اور کراچی ہی میں ہے ۔

مہر :۔ ایں !!

نسیمہ :۔ اس کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے ۔

مہر :۔ کیا تمھیں کہیں نظر آیا ؟

نسیمہ :۔ ہاں آج صبح سڑک پر نظر آیا تھا ۔

مہر :۔ تم نے اس سے کہا تو نہیں کہ میں یہاں ہوں ؟

نسیمہ :۔ وہ تمھاری تلاش ہی میں آیا ہے ۔

مہر :۔ تم نے بتا تو نہیں دیا ؟

نسیمہ :۔ وہ صرف تم سے ملنے کی خاطر تو آیا ہے ۔

مہر :۔ کیا تم سے بات چیت ہوئی تھی ؟

نسیمہ :۔ ہاں ۔

مہر :۔ تم نے میرا پتا تو نہیں بتایا نا ؟

نسیمہ :۔ (خاموش رہتی ہے)

مہر :۔ نسیمہ ! یہ تم نے کیا کر دیا ! ہائے اللہ اب میں
کیا کروں !!

نسیمہ :۔ پریشانی کی کیا بات ہے ؟

مہر :۔ یہ تم نے کیا کر دیا ! انھیں معلوم ہوگا تو قیامت
آ جائے گی !!

نسیمہ :۔ وہ تمھیں چاہتے ہیں نا ؟

مہر :۔ اس سے کیا ہوتا ہے ، تم ان کی طبیعت سے
واقف نہیں ۔ اللہ اب میں کیا کروں ! نسیمہ یہ تم نے یہ
کیا ۔ میری بنی بنائی زندگی خراب کر دی ۔ ہائے اللہ اب کر

نسیمہ :۔ اتنی پریشان کیوں ہو ؟ سلیم صاحب
... وہ تو گئی گزری پرانی بات ہے وہ اس کا اثر تھوڑی

مہر :۔ تمھیں کیا معلوم وہ کیسے آدمی ہیں ، اب
ہی حافظ ہے ، خدایا رحم کر !

نسیمہ :۔ لعنت ہے تم پر ! وہ بیچارا تمھاری خاطر
کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہوئے یہاں آیا ہے اور تم اس
پناہ مانگ رہی ہو ، یہ بھی کوئی انسانیت ہے شرافت

مہر :۔ اب تم اپنا وعظ رہنے دو ۔ مجھے ذرا سوچنے
کہ کیا کیا جائے ؟

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

مہر :۔ (ریسیور ہاتھ میں لے کر) ہلو ہلو ! ۔ ۔ ۔ کون
میں آواز نہیں پہچانتی نام بتائیے ۔ ۔ ۔ ۔ او ، بجمی ! ۔ ۔
کیا ۔ ۔ ۔ ؟ آ رہے ہو ؟ ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے ہلو ، ہلو ۔ لاحو
فون بند کر دیا ! ۔ ۔ ۔ اب کیا ہوگا ؟ اب وہ بھی تو آتے ہو
کیا اس کم بخت بجمی کو اسی وقت آنا تھا !

نسیمہ :۔ کیا بجمی ہوش میں تھا ؟

مہر :۔ کچھ کچھ ۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون بند
خدا معلوم کہاں سے کیا تھا ، اب اسے کیسے روکا جائے ؟

نسیمہ :۔ میں کہتی ہوں روکا ہی کیوں جائے ۔

مہر :۔ چپ رہو ! فضول باتیں نہ کرو ۔ مجھے مصیبت
اگ کے پھنسا دیا اور پھر اس پر اطمینان سے بیٹھی تبصرہ کر
شرم نہیں آتی !

نسیمہ :۔ اچھا تو اب یہ رنگ ہے ، ع

خبریں کیوں دیتے ہیں۔

مہر:- جیسے واقعات دنیا میں پیش آتے ہیں ویسی ہی
لکھ دیتے ہیں۔

سلیم:- لیکن اور بھی تو چیزیں ہیں۔ ایسی فضول باتوں سے
کیا فائدہ؟ سوائے اس کے کہ پڑھنے والوں کے اخلاق خراب ہوں
اور کیا فائدہ ہے؟ بھلا ایسی ذلیل عورتوں کے قصے پڑھ کر کچھ حاصل
ہو سکتا ہے؟

مہر:- اپنی رائے ایڈیٹر کے پاس لکھ بھیجو۔

سلیم:- تم ہی لکھ دو ایک خط ایڈیٹر کے نام کہ ایسی فضول
خبریں شائع نہ کیا کرے۔

مہر:- لکھ دوں گی۔ میرا جی ذرا تفریح کو جانے کے لئے
چاہتا ہے چلیں گے آپ؟

سلیم:- نہیں، بہت تھکا ہوا ہوں، لیکن کیا بات ہے
تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟

مہر:- اچھی ہوں خدا کا شکر ہے۔

سلیم:- نہیں کچھ بات ضرور ہے۔ چہرہ زرد معلوم
ہوتا ہے۔ ادھر آؤ، دیکھوں بخار تو نہیں۔

مہر:- نہیں، یونہی طبیعت مضمحل ہے۔

سلیم:- ادھر آؤ، نبض دیکھوں (ہاتھ میں ہاتھ لیکر)
ہاتھ ٹھنڈا ہے، کس قدر ٹھنڈا ہے! تم لیٹ جاؤ بستر پر میں ابھی
[illegible] ہوں۔

مہر:- [illegible] پریشان ہو رہے ہیں۔ میں اچھی
[illegible]۔

سلیم:- پھر بات کیا ہے، رنگ کیوں زرد ہے، جسم
[illegible]

مہر:- اگر خفا نہ ہوں تو کہہ دوں؟

سلیم:- خفگی کی کیا بات ہے، ضرور کہو؟

مہر:- آپ مجھ پر اتنے مہربان ہیں کہ کہنے کی ہمت نہیں
پڑتی!

سلیم:- کیا کوئی چیز کھو گئی ہے؟ مضائقہ نہیں پریشانی
کی کیا بات ہے، اور آجائے گی۔

مہر:- نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

سلیم:- پھر؟

مہر:- ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس سے ممکن ہے
آپ کو کچھ غلط فہمی ہو!

سلیم:- مجھے؟ غلط فہمی؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔

مہر:- بات دراصل یہ ہوئی کہ تھوڑی دیر پہلے ایک ٹیلیفون
آیا تھا۔ . .

سلیم:- کس کا ٹیلیفون؟ کیا مجھے بھی کوئی پیام تھا؟ کوئی
ضروری فون تو نہیں تھا!

مہر:- ایک بالکل غیر متوقع شخص نے ٹیلیفون کیا تھا۔

سلیم:- کون؟

مہر:- لکھنؤ میں ہمارے محلے میں ایک شخص رہتا تھا [illegible]
اس کا نام تھا، وہ بھی اتفاق سے کراچی آیا ہوا ہے۔ اس نے
فون کیا تھا۔

سلیم:- کیا کہتا تھا؟

مہر:- کہتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔

سلیم:- کیا تم سے کوئی رشتہ داری ہے؟

مہر:- نہیں، اسکول میں ہم ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔

سلیم:- گویا دوست ہے، صرف دوست یا کچھ اور!

محمد شمس الدین

مہر :۔ نہیں، بس دوست ہی [illegible]۔

سلیم :۔ تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟

مہر :۔ مجھے خوف تھا کہیں آپ کو کچھ غلط فہمی نہ ہو جائے کیونکہ . . . .

سلیم :۔ کیونکہ کیا؟

مہر :۔ کیونکہ وہ کبھی کبھی پینے کا بھی شوق کرنے لگا تھا۔

سلیم :۔ شراب؟ شراب پیتا ہے؟؟

مہر :۔ ہاں، اور نشے کی حالت میں کبھی کبھی واہی تباہی بکنے لگتا تھا۔

سلیم :۔ لیکن تم نے اس سے دوستی جاری کیوں رکھی؟

مہر :۔ میں نے تو قطع تعلق کر لیا تھا لیکن وہ اب جو یہاں آیا ہے تو مجھ سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا۔

سلیم :۔ خیر، آنے دو، دیکھ لیا جائے گا۔

[illegible] مجھے ڈر ہے کہ وہ ضرور مدہوش اور بے سدھ ہوگا اور خدا جانے کیا کیا بکواس کرے!

سلیم :۔ ایسا تھا تو تم اسے آنے سے منع ہی کر دیتیں۔

مہر :۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس نے فوراً فون بند کر دیا۔ اب وہ تھوڑی دیر میں آنے ہی والا ہوگا۔

سلیم :۔ آنے دو۔

مہر :۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ جو کچھ کہے آپ اس پر توجہ نہ کریں کیونکہ وہ ہوش میں تو ہوگا نہیں۔

سلیم :۔ نہیں معلوم لوگ اتنی زیادہ کیوں پی جاتے ہیں کہ اپنے ہوش ہی کھو بیٹھیں۔

مہر :۔ دیکھئے آپ خفا ہوں خواہ وہ کچھ ہی کہے ممکن ہے وہ آپ کو گستاخی بھی اور مجھے بے تکلفی سے مخاطب کرے لیکن اس کا آپ [illegible]۔

سلیم :۔ کیا تمھاری اس سے [illegible]؟

مہر :۔ نہیں، بس یونہی سی۔

سلیم :۔ پھر وہ [illegible]؟

مہر :۔ کوئی خاص بات نہیں۔

سلیم :۔ پھر وہ [illegible] کیسے [illegible]؟ [illegible] تو یہ ہیں کہ گہری دوستی تھی۔

مہر :۔ لیکن میں نے تو کبھی اس کی [illegible] کی

سلیم :۔ تم ضرور کچھ چھپا رہی ہو۔ بغیر [illegible] کے وہ کیسے بے تکلف ہو سکتا ہے؟

مہر :۔ وہ فطرۃً ہی ایسا ہے۔

سلیم :۔ نہیں، کیا وہ تم سے [illegible] کیوں ہو گئیں؟

مہر :۔ (سسکیاں لے کر) [illegible] میں نے تو کوئی ہمت افزائی نہیں کی۔

سلیم :۔ پہلے کیوں نہیں کہا۔

مہر :۔ (سنبھل کر) کوئی خاص بات [illegible] کہا بھی نہیں۔

سلیم :۔ اس سے بڑھ کر خاص بات اور کیا [illegible] اب معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ سے کیوں چلی آئیں؟

مہر :۔ خدا کے لئے [illegible]!

سلیم :۔ [illegible] کر کے جب بدنامی ہونے لگی تو یہاں چلی آئیں [illegible] ہے نا!

مہر :۔ (رو کر) نہیں، [illegible]۔

سلیم :۔ پہلے ہی کون آتا ہے۔ مجھے اُلّو بنانے کے لئے آئی [illegible] ہو کیوں نہیں کہتیں، اور پھر اپنے آشنا کو بھی یہیں بلا لیا کیوں؟!

مہر :۔ (روتے ہوئے) خدا کے لئے مجھے ایسا نہ کہئے، مجھے اتنا بڑا نہ کہئے!

سلیم :۔ تو کیا اپنے روپئے سے عیش کرنے کے لئے تمہیں آزاد چھوڑ دوں!؟

مہر :۔ ایسا نہ کہئے، میں تو آپ کی کنیز ہوں۔

سلیم :۔ ہاں میری کنیز ہو اور دوسروں کی معشوقہ۔ اور سینہ زوری تو دیکھو اپنے عاشق کو یہیں بلا لیا ہے۔ ذلیل [illegible]

مہر :۔ میں نے نہیں بلایا، آپ کی قسم میں نے نہیں بلایا

سلیم :۔ اب قسمیں کھانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔

مہر :۔ خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھئے! میں ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے معاف کر دیجئے!

سلیم :۔ معاف کر دوں؟ یہی بہت رعایت ہے کہ تمہارا گلا نہیں گھونٹ دیتا، جاؤ نکل جاؤ یہاں سے، دور ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے!

مہر :۔ نہیں، نہیں، ایسا نہ کیجئے، میرا کوئی قصور نہیں میں بے گناہ ہوں۔

(باہر سے دستک کی آواز آتی ہے)

سلیم :۔ لو، آ گیا تمہارا عاشق، جاؤ اب اس کے ساتھ عیش کرو۔

(باہر سے پھر دستک کی آواز آتی ہے)

سلیم :۔ کون ہے؟

راہگیر :۔ (باہر ہی سے) ضروری کام ہے حضور! مجھے فون کرنا ہے، حادثہ ہو گیا ہے یہاں!

سلیم :۔ فون کرنا ہے؟

راہگیر :۔ (باہر ہی سے) جی ہاں، فوراً، درست کیجئے

سلیم :۔ اچھا، اندر آ جائیے۔

(راہگیر کے اندر آنے کی آواز، راہگیر فون اٹھا لیتا ہے)

راہگیر :۔ ہلو، ہلو، ہسپتال سے؟ ہاں، ٹھیک ہے، دیکھئے فوراً ایمبولینس کار جمشید روڈ پر بھجوا دیجئے۔ حادثہ ہو گیا ہے... ایک موٹر کے نیچے آدمی آ گیا ہے۔ بری طرح کچلا گیا، فوراً، فوراً بھیجئے، شکریہ...

سلیم : کہاں ہوا یہ حادثہ؟

راہگیر :۔ یہیں آپ کے مکان کے سامنے!

سلیم :۔ کون ہے وہ بیچارا، کچھ معلوم ہوا؟

راہگیر :۔ ہاں لکھنؤ کا رہنے والا ہے، کچھ خطوط جیب سے نکلے ہیں، نجم الدین نام ہے۔

سلیم :۔ کیا؟ کیا نام بتایا؟؟

راہگیر :۔ نجم الدین۔

مہر :۔ نجم الدین؟

راہگیر :۔ ہاں، کیا آپ جانتی ہیں؟

سلیم :۔ نہیں ہم نہیں جانتے، ہمارے دوست نجم الدین تو لاہور کے رہنے والے تھے۔

راہگیر :۔ خیر خیر، فون کی اجازت کا شکریہ!

(چلا جاتا ہے)

مہرو۔ نشہ میں ٹھوکر کھا گیا ہوگا!

سلیم:۔ شاید۔ لیکن تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟

مہرو۔ پھر کیا کروں!

سلیم:۔ اپنا منہ کالا کرو۔

مہرو: پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے، لیکن میں بےگناہ ہوں، میں نے اسے نہیں بلایا تھا۔

سلیم:۔ ہاں ٹھیک ہے، تم نے نہیں بلایا بلکہ اس کی موت اُسے بلا لائی۔

مہرو۔ میں سچ کہتی ہوں، میرا کوئی قصور نہیں۔

سلیم:۔ تو کیا میرا قصور ہے؟

مہرو۔ (روتے ہوئے) خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھئے۔ نسیمہ نے اسے یہاں کا پتا دیا۔ میں نے نہیں۔

سلیم:۔ میں پہلے ہی نہ کہتا تھا کہ نسیمہ سے میل جول نہ بڑھاؤ۔

مہرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ [illegible] خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھئے، میں ایک [illegible] ہوں۔ مجھے معاف کیجئے کہ میں نے پہلے یہ سب کچھ آپ سے نہیں کہا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔

سلیم:۔ خیر، معاف کرنا تو مشکل ہے، اتنا ہو سکتا ہے کہ بجائے تمہیں گھر سے نکالنے کے خود ہی نکل جاؤں۔

مہرو۔ نہیں نہیں، ایسا نہ کیجئے۔

سلیم:۔ ماہوار خرچ کے لئے تمہیں سو روپے [illegible] کروں گا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

مہرو۔ مجھے روپیہ نہیں چاہئے۔

سلیم:۔ محبت چاہئے نا! اور محبت کرنے والا تو چلا گیا اب میں بھی جاتا ہوں۔

(مہرو تی رہ جاتی ہے اور سلیم چلا جاتا ہے)

پردہ گر جاتا ہے

(شمس الدین صدیقی)

ایک وقت آئے گا

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ آپ ہندو ہیں یا مسلمان، یا پارسی یا عیسائی، مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ آج خواہ مجھ پر کتنی ہی [illegible] ہو رہی ہے، مجھ پر کتنے ہی سخت شدید حملے کئے جا رہے ہیں ــــ اور بعض لوگ تو مجھ پر نفرت پھیلانے کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے اور مجھے اس بات کا صدقِ دل سے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب مسلمان ہی نہیں عظیم الشان ہندو قوم بھی اگر میری زندگی میں نہیں تو میری موت کے بعد میرے نام اور میری [illegible] کو دعائیں دے گی۔

(قائد اعظم)

جناب جگن ناتھ صاحب آزاد

جوش کے بعد

ممکن ہے نظریاتی طور پر بعض لوگ میرے خیالات سے اختلاف کریں، لیکن میں نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی ہے بعض تعلقات کی بنا پر نہیں کہی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ہندوستان میں اس شاعرِ عظیم کے بعد "چراغ گل پگڑی غائب" کا معاملہ ہو جائے گا۔

(ج۔ ن۔ آ)

ہم نشیں! پوچھ نہ آزاد سے تو، کیا ہوگا
عالمِ انجمن دیدہ وراں جوش کے بعد

ہو گی اس طرح سے برہم کہ جمے گی نہ کبھی،
آج کی محفلِ صاحب نظراں جوش کے بعد

جانتے ہیں ادب و شعر کا ہوگا جو نصیب
ہم کو معلوم ہے انجامِ زباں جوش کے بعد

یہ بھی کہنا نہیں آسان ملے گا کہ نہیں
ادب و فن کا کوئی نام و نشاں جوش کے بعد

ایک آوازِ فغاں ہو گی لبِ اردو پر
سینۂ شعر سے اٹھے گا دھواں جوش کے بعد

ذہن و افکار پہ چھائے گی یقیں کی ظلمت
سرد ہو جائے گی قندیلِ گماں جوش کے بعد

تشنہ لب فکر اندھیرے میں بھٹکتا ہوگا
مضطربِ شوق نہ پائے گا اماں جوش کے بعد

صحنِ گلزار سے روتی ہوئی جائے گی بہار
مسکراتی ہوئی آئے گی خزاں جوش کے بعد

حسرتِ دید میں آ کے پریشاں ہو گا
سرِ کہسار گھٹاؤں کا دھواں جوش کے بعد

سرِ میخانہ سے آ آ کے پلٹ جائے گا،
پے بہ پے سلسلۂ ابرِ رواں جوش کے بعد

کچھ بڑی بات نہیں ہے جو شکستہ ہو جائے — بزم میں حوصلۂ پیرِ مغاں جوش کے بعد
اپنی تقدیر پہ فریاد کریں گے شب و روز — مئے دیرینہ و معشوقِ جواں جوش کے بعد
دلبراں، گلبدناں، سیم تناں، ماہ وشاں — ان کو دیکھے گی نظرِ نالہ کناں جوش کے بعد
لیلیٔ شعر کے لب پر یہ سوال آئے گا — کون ہے آج مرا مرتبہ داں جوش کے بعد

دے سکا کوئی جو تسکین تو دے گا اس کو
فقط آزادؔ کا اندازِ بیاں جوش کے بعد

★

دن گزرتے گئے

(مجید امجد)

میں تڑپا کیا، اور گیسوئے ناز — سنورتے گئے، دن گزرتے گئے
میں روتا رہا اور بہاروں کے رنگ — نکھرتے گئے، دن گزرتے گئے
مری زیست پر اُن کے جلووں کے نقش — ابھرتے گئے، دن گزرتے گئے
گلستاں کے آنگن میں کھل کھل کے پھول — بکھرتے گئے، دن گزرتے گئے
میں اُن کے تصور میں کھویا رہا۔! — گزرتے گئے، دن گزرتے گئے

چھلکتے ہوئے جام میں ماہ و سال
اترتے گئے، دن گزرتے گئے

جناب عبدالمجید بھٹی

اجنبی !—

تمتمائے ہوئے رخسار ، یہ پیاری آنکھیں

ملتفت نظروں میں پس پاسی جھجک

شوقِ گفتار میں ڈوبی ہوئی دل کی دھڑکن

رُکتے رُکتے سے قدم میری طرف

اجنبی ! دیدہ و دل میں ہیں تمھاری راہیں

تمتمائے ہوئے رخسار ، یہ پیاری آنکھیں

بحرِ ظلمات میں ہوں جیسے اُجالے رقصاں

جیسے آیا ہو خزاں دیدہ بہاروں پہ نکھار

زندگی پھر سے قدم لینے کو آپہنچی ہو

اجنبی ! تم سے مُلاقات غنیمت ہے اگر

ایسے لمحات کی تعبیر بھی ، الفاظ نہ ہوں

جاوید صدیقی
ایم اے (عثمانیہ)

بے ترتیبی

لوگ کہتے ہیں کہ بے ترتیبی اُجڈ پن ہے، جہالت ہے، بد تہذیبی ہے۔ مگر بے چارے لوگ کیا جانیں بے ترتیبی کی عظمتوں کو۔ انھوں نے کب غور کیا ہے کہ کائنات اور زندگی کی جمالیاتی اساس ہی بے ترتیبی ہے۔ بلند پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا دور افق پر نگاہیں جماتا ہوں تو کتنا دلکش منظر دکھائی دیتا ہے۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کا دھند میں لپٹا ہوا سلسلہ جن پر کے بلند بلند درخت بھی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں معلوم ہوتے ہیں کہیں پانی کے جمع ہو جانے سے چھوٹے بڑے تالاب، کہیں میدان، کہیں ٹیلے، کسی طرف چشمے کی دھوپ میں چمکتی ہوئی تانبا سی لکیر۔ کبھی کہسار کے دامن میں جا نکلتا ہوں تو مسرت کا اندرونی احساس روح کے دروازوں کو کھول دیتا ہے۔ بلند و بالا درخت اور ان کے سائے میں لہلہاتے ہوئے سبزے کا فرش، کہیں کہیں اودے اودے پیلے پیلے پھول، دل چاہے تو کسی درخت کی شاخ پہ بیٹھ کر بے فکری سے سیٹی بجائیے، قہقہے ماریئے، سبزے پر لوٹ جائیے، پہاڑی چشمے کے سرد اور شفاف پانی میں نہائیے یا اس کے کنارے بیٹھ کر مدھم سروں میں گنگنائیے۔ غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کی رنگینی اور حسن کا راز اس کے مناظر کی بے ترتیبی میں ہے۔ یہ بات کسی چمن میں کہاں جہاں روشیں ناپ ناپ کر بنائی جاتی ہیں، جہاں سبزے کو سر اٹھاتے ہی کاٹ چھانٹ دیا جاتا ہے، جہاں کے حوض اور فوارے ایک مخصوص شکل کے ہوتے ہیں۔ آپ سبزے کے فرش پر لوٹ نہیں سکتے، پھولوں کو چھو نہیں سکتے، صرف روشوں پر ٹہل سکتے ہیں۔ آپ اپنی روح کو چمن کے جمال کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر سکتے۔ مبادا اُس کا حسن خراب ہو جائے۔ یہ بات قدرت کے مناظر میں نہیں۔ آپ قدرتی مناظر میں پوری آزادی کے ساتھ کھو جا سکتے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ جو یگانگی، اپناپن اور آزادی قدرت کے بے ترتیب مناظر میں ہے وہ ریاضیاتی طور پر پیمائش کئے ہوئے چمن میں نہیں۔

کبھی آپ میرے کمرے میں آئیں تو آپ کو بے ترتیبی اپنے پورے جمال اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے گی۔ فرش پر، میز پر، کرسی پر، کتابوں کا بے ترتیب انبار رکھا ہوا ہے۔ کسی کونے میں تولیہ، کپڑے اور صابن دانی، کسی طرف پنسل جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ کہیں کرسی اوندھی پڑی ہوئی اور شاید اس کرسی کے نیچے ہی کوئی فلسفہ کی موٹی کتاب، کیونکہ رات جب میں اسے پڑھتے پڑھتے جھنجھلا رہا تھا تو ایک کتا کمال بے فکری سے کمرے میں سیر و سیاحت کی غرض سے آنکلا اور میں نے یہی اس پر دے ماری تھی۔ کرسی پر شاید آپ کو ایک آدھ بلی کا بچہ بھی سوتا ہوا نظر آجائے۔ میں آپ کو اپنی کتابوں کی میز پر بیٹھنے کی دعوت دے سکتا ہوں جس پر چاہیں تو آپ لیٹ بھی سکتے ہیں۔ اور کسی موٹی کتاب سے تکیہ کا کام لے سکتے ہیں۔ یا میں آپ کو اپنے پلنگ پر جھولنے کی دعوت دے سکتا ہوں کیونکہ اس کا بان کافی ڈھیلا

ہو چکا ہے۔ کتابوں کی میز کو کھانے کی میز بنا لینا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ بہرحال آپ سے میرے کمرے کی ہر چیز پکار پکار کر کہے گی کہ ”مجھے استعمال کرو، کیونکہ ہم استعمال ہی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور ہمارا مقصد حیات پورا ہو جاتا ہے جب کوئی ہمیں بے دردی سے استعمال کرتا ہے“۔ برخلاف اس کے آپ اپنے کسی سلیقہ شعار دوست کے پاس جاتے ہیں۔ آپ کمرے کے باہر ہی اپنا ادھ جلا سگریٹ بجھا کر جیب میں رکھ لیتے ہیں، جوتے کی گرد کو دروازے پر جھٹک کر اسے وہیں اتار دیتے ہیں، جب کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو بڑی احتیاط سے کمرے کے فرش پر چلتے ہیں۔ کسی طرف شیشے کی میز رکھی ہوئی ہے جس پر کانچ کا گلدان اور اس میں کاغذی پھول، کسی طرف میز پر ہاتھی دانت کے کچھ نمائشی جانور، اور انگریزی کتابیں جن کے اوراق ابھی تراشے نہیں گئے۔ کرسیاں اور صوفے ایک طرف سلیقہ سے چنے ہوئے، سگریٹ کا گل جھاڑنا ہو تو فرش پر نہیں جھاڑ سکتے، ایش ٹرے تک ہاتھ بڑھانا ہوگا۔ صوفوں پر آپ جوتوں سمیت لیٹ نہیں سکتے۔ کمرے میں بولنگ کی مشق نہیں کر سکتے، میز سے کرسی کا کام نہیں لے سکتے، چائے پینے کے بعد پیالی کو احتیاط سے ٹرے میں رکھنے پر مجبور ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں ”تہذیب اور شائستگی“ کا تقاضا ہیں۔

آپ محسوس کریں گے کہ جو یگانگی، جو اپنا پن، جو آزادی آپ کو میرے بے ترتیب کمرے میں محسوس ہوئی تھی اتنی ہی بیگانگی، غیریت اور پابندی آپ کو اس سلیقہ شعار دوست کے کمرے میں برتنی پڑی ہے۔ کپڑے پر چائے کے ایک قطرے کے گرنے سے بھی آپ کے دوست کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے اور میرے ہاں جوتوں سمیت کتابوں کی میز پر لیٹنے میں بھی کسی کے احساس کو تکلیف پہنچانے کا خطرہ نہیں۔ بے ترتیبی میں کتنی اپنائیت ہے اور کتنا خلوص ہے اور وہ کتنی قدرتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ترتیب میں کتنی بیگانگی، کتنا مصنوعی پن، کتنا بُعد!

ہمیں گھر سے اتنی محبت کیوں ہوتی ہے؟ ہر شخص دن بھر کی تکلیفیں اور کوفت کیا اسی خیال سے برداشت نہیں کرتا کہ آخر میں اُسے گھر جا کر سکون بھی ملے گا۔ کسی شخص کی زندگی سے گھر کو نکال دینا اُسے ذہنی اطمینان اور سکون سے محروم کر کے نفسیاتی الجھنوں کا شکار بنا دینا ہے۔ ہمیں گھر اسی لئے تو پسند ہیں کہ وہاں ہم من مانی کر سکتے ہیں، وہاں زیادہ سے زیادہ بے تکلف بن سکتے ہیں، وہاں ادب آداب کے ساتھ پابندیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں لیٹ سکتے ہیں، ٹانگیں پسار سکتے ہیں۔ وہاں کوٹ پتلون پہننے کی ضرورت نہیں، وہاں چہرے پر اخلاقی مسکراہٹ لانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں بھرپور قہقہہ مار سکتے ہیں۔ اچھل سکتے ہیں، ناچ سکتے ہیں، سر کے بل کھڑے ہو سکتے ہیں اور کوئی نکتہ چیں نہیں جو آپ پر ہنسے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں گھر اس لئے مرغوب ہے کہ وہاں ہمیں اپنا پن محسوس ہوتا ہے، اور یہ اپنا پن بے ترتیب حرکات و سکنات کر سکنے کی آزادی میں پنہاں ہے، یہ حرکات کسی مجلس میں یا راستے پر کرنے کی اجازت نہیں۔ تو پھر کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ انسانی نفسیات کو صحت مند رکھنے میں سب سے زیادہ اہم شے بے ترتیبی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ تہذیب کے معنی ہیں جینے کا سلیقہ یعنی زندگی کے تمام اعمال میں ترتیب پیدا کرنا مگر مجھے اس سے سخت اختلاف ہے اور یقیناً آپ بھی اس میں میری ہم نوائی کریں گے۔ زندگی اپنی فطرت میں بے ترتیب ہے اور اس میں ترتیب پیدا کرنا گویا اس کے فطری بہاؤ پر بند باندھنا ہے۔ زندگی ایک دریا کی طرح، ایک پہاڑی چشمے کی طرح آزاد ہے۔ وہ ہر لحظہ نیا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس

رفتار کہیں مدھم ہے اور کہیں تیز، کبھی وہ سنگریزوں سے کھیلتی ہے اور کبھی چٹانوں کو کاٹ دیتی ہے۔ وہ کسی مخصوص راستے کی پابند نہیں اور یہی تہذیب، ترقی اور پھیلاؤ کے حق میں بڑی رکاوٹ ہے جو اسے باترتیب بنانے کے لئے اس پر پابندیاں عائد کردے۔ تہذیب کے اسی غلط تصور کی وجہ سے ابھی تک انسان مہذب نہیں بن سکا۔ آج جو ممالک تہذیب کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں کیا انہیں واقعی مہذب کہا جا سکتا ہے کیا ہم امریکی، انگریز اور فرانسیسی کو اس وجہ سے مہذب کہیں کہ وہ کسی سے تعارف ہونے پر مسکرا کر کہتے ہیں "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یا اس وجہ سے کہ وہ کوٹ پتلون پہننا جانتے ہیں، چھری کانٹوں سے میز پر بیٹھ کر کھاتے ہیں، کسی خاتون کے آنے پر اس کے لئے اپنی نشست خالی کر دیتے ہیں، حالانکہ یہی ہیں جو ہیروشیما پر جوہری بم پھینکتے ہوئے ذرہ برابر ندامت محسوس نہیں کرتے، گورنگ یا اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے کر مسرت سے دیوانے ہو جاتے ہیں، نہتے ہندوستانیوں پر گولیاں چلا کر اپنی سلطنت کو سنبھالے رکھنے کا حق رکھتے ہیں، کالے رنگ والوں کو کتوں سے بدتر سمجھتے ہیں، شراب پی کر انہیں حرکات کو دہرانے لگتے ہیں جو دس ہزار سال قبل مسیح کے وحشی لوگ کیا کرتے تھے۔ دولت سمیٹنے میں قتل، فریب، دھوکا غرض ہر داؤ پیچ روا رکھتے ہیں۔ اگر ہزاروں سال کی تہذیب کا حاصل یہی کچھ ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑے گا کہ تہذیب ایک ناقابلِ حصول شے ہے، ایسے قوانین بے کار ہیں جو جبر و تشدد سے انسانوں کو ایک اور باترتیب زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ 'ترتیب' والی زندگی پیدا کرنے میں، انسان کی ہزاروں سال کی کاوشیں اور قربانیاں بری طرح ناکام رہی ہیں۔ انسانیت کے اس المیہ سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ترتیب کا حصول ہی ناممکن اور زندگی کی فطرت سے بغاوت کرنا ہے۔ بے ترتیبی ہی زندگی کی اصل ہے اور کوئی تہذیب اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ زندگی کی اس ماہیت کو پورے طور پر نہ سمجھ لے۔

ساری دنیا کو چھوڑیئے، کیا کوئی مہذب سے مہذب مملکت کسی شہر کے کسی گوشے کو بھی باترتیب بنانے میں کامیاب ہو سکی ہے؟ کہیں اونچے اونچے دس منزلہ بنگلے جن میں ہزاروں لاکھوں کے وارے نیارے روز ہو جائیں، اور عین اسی کے برابر چند غار جیسی کچی مٹی کے بوسیدہ مکان، جہاں کے بسنے والے صبح کھاتے ہیں تو شام کے کھانے کی فکر انہیں مارے ڈالتی ہے، کہیں مال روڈ جیسی صاف اور چوڑی سڑک جس کے دونوں جانب فٹ پاتھ بھی ہیں، سبزہ بھی اور سایہ دار درخت بھی۔ اور کہیں لوہاری گیٹ کے اندر کی گلیاں جن میں بمشکل دو ایک شخص ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ کہیں ٹوئیڈ کے نفیس سوٹوں میں ملبوس شرفائے کرام اور کہیں میلی کچیلی چادر میں لپٹی ہوئی بڑھیا، نہیں، کوئی مہذب سے مہذب مملکت بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے اپنی مملکت کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گوشے میں بھی ترتیب پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

انسانی نفسیات بہت ہی پیچیدہ، بہت ہی گنجلک اور بہت ہی غیر مستقل چیز ہے۔ ابھی ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں اور ابھی ایک لمحہ نہیں گزرتا کہ ہمارا ارادہ بدل جاتا ہے۔ ابھی ہمارا ذہن ستاروں پر غور کرنے میں محو ہوتا ہے اور ابھی یکایک ایک چیونٹی کے کاٹنے پر ہم اُف کر کے اسے بیدردی سے مسل دیتے ہیں۔ ابھی ہم فلسفیانہ تصورات میں گم ہوتے ہیں اور ابھی ننھا سا بچہ [illegible] دیتا ہے اور ہم غصہ سے بے تاب ہو کر معصوم کو اس زور سے ڈانٹ دیتے ہیں کہ بیچارا دہشت کے مارے [illegible]

کی ذہنیں کوئی تسلسل کوئی ترتیب نہیں۔ ہمارے جذبات میں کوئی منطقی ہم آہنگی کوئی ربط نہیں، ہمارے ارادوں میں کوئی استقلال، کوئی یکسانی نہیں، ہمارا ذہن ایک بے لگام جنگلی گھوڑے کی طرح ہے جو ایک وسیع جنگل میں ادھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہے اور جسے خود خبر نہیں کہ اب اس کے سامنے کیا چیز آنے والی ہے۔ ہمارے خیالات، جذبات اور ارادے ایک مسلسل بے ربطی، بے آہنگی اور بے ترتیبی کا تیز دھارا ہیں۔ جن میں تسلسل، ترتیب اور ہم آہنگی تلاش کرنا اتنا ہی فضول ہے جتنا کہ موت کے بعد کے حالات کو جاننے کی کوشش کرنا۔
ہماری شخصیت کوئی مستقل چیز نہیں، یہ کوئی سلیٹ کی تختی نہیں جس پر مختلف نقوش بیٹھتے جائیں اور وہ جوں کی توں رہے، یہ کوئی جامد شے نہیں، یہ تو پانی کی طرح ہے جو ہمیشہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے۔ ابھی کچھ ہے اور ابھی کچھ۔ ہماری شخصیت ہے کیا؟ یہی، ہمارے ارادوں، جذبات اور خیالات کا مجموعہ، اور یہ ارادے، جذبات اور خیالات تو ہر لحظہ دگرگوں ہیں تو پھر کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ ہم ہر لحظہ ایک نئی شخصیت ہیں، ہر لحظہ بدلتی ہوئی 'انا' کے مالک۔ ایسے افراد جن کی شخصیت کے اجزا خود اس کے ارادے کے پابند نہیں جس کے ارادے تک خود اس کے اختیاری نہیں، بھلا اُن افراد سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خارجی دنیا میں کوئی نظم و آہنگ پیدا کر سکیں گے۔ جو اپنی داخلی دُنیا میں دو لمحوں کے وقفے کے لئے ترتیب اور آہنگ پیدا نہیں کر سکتے۔ بھلا وہ بیرونی دُنیا کو باسلیقہ، مہذب، مرتب اور قانون و قواعد کا پابند بنانے کا خواب دیکھ کر شیخ چلی سے بہتر کہلا سکتے ہیں؟

'ترتیب' کی اندھی دھن اور 'یکسانی' کی احمقانہ خواہش نے ہماری زندگیوں کو کتنا بے کیف، بے رنگ اور غیر مطمئن بنا دیا ہے۔ دفتر کے کلرک صبح سے شام تک مسلوں کے فائلوں پر قلم گھستے ہوئے اپنی آنکھیں پھوڑ رہے ہیں، مشین کے مزدور ایک ہی کل کو آٹھ گھنٹے تک گھماتے ہوئے خود اس مشین سے کچھ مختلف نظر نہیں آتے، اسکول کے طالب علم ایک گھنٹہ کے بعد دوسرا گھنٹہ بے دلی سے گزارتے ہوئے لکڑی کے تختوں پر بیٹھے ہوئے اپنی جوانیوں کا خاتمہ کر رہے ہیں، استادوں کی حالت ان سے گئی گزری ہے۔ دکان دار صبح سے شام تک ایک ہی قسم کا مال فروخت کرتے ہوئے ایک ہی قسم کی میکانکی مسکراہٹ چہرے پہ لاتے ہوئے شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے۔ کیا یہی زندگی ہے؟ کیا یہی وہ برگزیدہ مقاصد ہیں جن کے لئے قدرت نے ارتقا کے لامتناہی اور تکلیف دہ سلسلے کو قائم کر کے انسان کو اس کی آخری کڑی بنایا؟ کیا یہی وہ کام ہیں جن کے لئے خدا نے اپنے تخلیقی شہکار کے سامنے فرشتوں کو جھکنے کا حکم دیا؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور ہے، تو کیا یہ سب انسان کے اس احمقانہ جنون کا نتیجہ نہیں جو وہ ایک ناقابلِ حصول شے 'ترتیب' کے لئے رکھتا ہے اور جسے وہ غلطی سے 'تہذیب' سمجھ بیٹھا ہے۔ مدرسے، کالج، دفاتر، فیکٹریوں کے مقررہ اوقات، مقررہ اور یکساں کام اسی ترتیب کو پیدا کرنے کے لئے ہیں اور یہ تمام انسانی روح کو کچل کر، اس کے جذبات کو پتھرا کر، اس کی صحت، جولانی اور خوشی کو تباہ کر کے صرف اسے مشین کا ایک پرزہ بنانے میں کامیاب ہو سکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم سب کے سب چھٹی کا اس بے قراری اور اس شدت سے انتظار کرتے ہیں کیوں کہ اُن دنوں اپنے اعمال کے ہم مختار ہوتے ہیں۔ ہم صبح دس بجے تک اپنے گرم لحاف میں پڑے سو سکتے ہیں۔ کپکپاتی ہوئی سردی میں اُٹھ کر شیو کرنے اور منہ دھونے کا خیال تک نہیں ستاتا۔ جلد جلد دو چار نوالے بغیر بھوک کے زہر مار کر کے دفتر بھاگنے یا کام پر جانے کی بجائے ہم اطمینان و فراغت سے نہاتے ہیں، سگریٹ پیتے ہوئے دھوپ میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہیں، اطمینان اور فراغت سے

شش کرتے ہیں اور پھر کوئی بے تکا سا پروگرام بنا کر باہر نکل جاتے ہیں۔ اور ایک دن انتہائی بے ترتیبی اور بے فکری سے گزار [illegible] پورا نہ سکے وہ با ترتیب، کام کے روح فرسا خیال کے ساتھ بستر پر لیٹتے ہیں اور پھر چھ دن تک ہم اپنے آپ میں نہیں رہتے۔ صبح اٹھنے سے لے کر شام کے سونے تک، کام کی تیاری، کام اور کام کی تھکن میں سے کوئی نہ کوئی شے ہمارے ذہن اور جسم پر مسلط رہتی ہے اور ہم مشین کے پُتلے کی طرح کام کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ چھٹیاں نہ ہوتیں تو شاید ہم میں سے ہر شخص کی موت خودکشی ہی سے واقع ہوتی لیکن میں پوچھتا ہوں کہ انسان نے اپنی زندگی کو خود ہی کیوں اجیرن بنا لیا ہے محض بھوک کی تسکین کے لئے لیکن بھوک کی تسکین کے لئے کیا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں! جب تمام دُنیا میں اتنا غلّہ پیدا ہو سکتا ہے جو تمام انسانوں کے لئے کافی ہو تو اس کی مناسب تقسیم کے لئے کیا انسانوں کو مشین بنا دینا ہی کیا ضروری ہے۔

اور جو لوگ ترتیب اور سلیقہ کے مالیخولیا میں مبتلا ہیں وہ نہ صرف اپنی زندگی کو اجیرن کر رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنی زندگی سے بیزار کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ کپڑے میں کوئی شکن آئے اور ان کی پیشانی پر بل آیا۔ فرش پر کوئی داغ پڑے اور ان کے ذہن میں جیسے کسی نے جلتا انگارہ رکھ دیا۔ غلطی سے کوئی برتن ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور سالن بکھر گیا تو وہ ملازم کو مارتے مارتے بھُرتا بنا دیں۔ جو لوگ خود اپنے ذہن کی سلوٹیں درست نہیں کر سکتے وہ بھلا کیا کپڑوں کی سلوٹیں درست کر سکتے ہیں، جو اپنے دل کے گرد و غبار کو صاف نہیں کر سکتے وہ بھلا کیا کتابوں اور میز کے گرد و غبار کو صاف کر سکتے ہیں۔ ترتیب کی لگن ان کی انسانیت کو کھا جاتی ہے، بخلاف اس کے ایک وہ شخص ہے جو یہ جانتا ہے کہ دُنیا کی ہر بڑی سے بڑی ترتیب ذرا سے دھکے، ذرا سی تبدیلی سے مٹ جاتی ہے۔ ترتیب ایک بالکل ہی عارضی [illegible] منزل گری ہے جسے ہوا کا ایک جھونکا، چیزوں کا ذرا سا رد و بدل، بے ترتیبی میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ بے ترتیبی ہی ہے جو ساری زندگی ساری کائنات کی حقیقت ہے اور بالآخر تمام چیزوں کی انتہا ایک بہت بڑی بے ترتیبی ہے۔ وہ یہ اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ بیرونی چیزوں کی سرسری ترتیب میں اپنے وقت، اپنی فکر، اپنی مسرت، اپنی اندرونی دُنیا کی خوشیوں کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگوں کی بڑی سے بڑی غلطی کو فراخ دلی سے معاف کر دیتا ہے، وہ لوگوں سے ملنے جلنے میں بے تکلف ہوتا ہے۔ اس کا دل نکتہ چینی اور تنقید سے پاک ہوتا ہے۔ اور اس میں سب کے لئے ہمدردی، محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تمام چیزوں کو فلسفیانہ بے اعتنائی سے دیکھنا شروع کرتا ہے۔ اور مصنوعی ترتیب، آداب، معاشرتی پابندیوں، حکومت کے قواعد و قوانین، ان سب نے وہ ازلی اور محبتی، ہمدردی، بے ساختہ پن، آزاد خوشی اور مسرت کو اصل تہذیب اور اصل زندگی سمجھتا ہے۔ بے تکلفی، یگانگی اور حرکات [illegible] کی فطری آزادی، جسے نادان اور مشینی انسان "بے ترتیبی" کا نام دیتے ہیں وہ انھیں کو انسانیت کا جوہر سمجھتا ہے۔ [illegible] کہ اس بات میں آپ بھی مجھی سے متفق ہوں گے کہ یہی شخص تہذیب کے صحیح مفہوم سے واقف ہے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟ وحید مدنی

تصحیح فروری کے "مخزن" میں علامہ اقبال کے ایک شعر کی تفسیر کے عنوان سے ایک مضمون کے نیچے چند اشعار [illegible] سے غلطی سے [illegible] کا نام چھپ گیا تھا یہ اشعار دراصل جناب نقوی احمد پوری کے تھے۔ ہمیں اس غلطی پر افسوس ہے۔

غزلیات

بالمکند عرش ملسیانی

شدتِ دردِ آہ سے پوچھو
دل کی باتیں نگاہ سے پوچھو

عظمتِ رحمتِ خداوندی
آرزوئے گناہ سے پوچھو

ان کی پیہم نوازشوں کا اثر
میرے حالِ تباہ سے پوچھو

وقتِ راحت کا کوئی ہے کہ نہیں
رنجِ شام و پگاہ سے پوچھو

کیوں ہے دنیا نظر میں تیرہ و تار
میرے بختِ سیاہ سے پوچھو

ماجرا احتیاطِ الفت کا
پرسشِ ہر نگاہ سے پوچھو

عقل کیوں ہے پناہ کی طالب
وحشتِ بے پناہ سے پوچھو

دلِ خوددار کی زبوں حالی
ہوسِ عز و جاہ سے پوچھو

پستیٔ ہر بلندیٔ دنیا
منتہائے نگاہ سے پوچھو

عرش پر کیوں اڑا دماغ مرا
مفت کی واہ واہ سے پوچھو

★

جلال الدین اکبر

حضرتِ دل نہ ہو گلا کوئی
ورنہ ہو جائے گا خفا کوئی

حاصلِ آہِ سرد کچھ بھی نہیں
کیجئے نالۂ رسا کوئی

دل ربائی کا لازمہ تو نہیں
سخنِ تلخ و ناروا کوئی

ہوتے ہو بات بات پر برہم
کیا کرے تم سے التجا کوئی

ظلم ہر آن، جور ہر لحظہ
یہ [illegible] ظالم ہوئی ادا کوئی

مجھ پہ طعنے ہیں بے وفائی کے
اس جفا پر کرے وفا کوئی

یا خفا مجھ سے بے سبب نہ رہو
یا بتا دو مری خطا کوئی

[illegible] تو کہئے رہے جلال
[illegible] نہیں خدا کوئی

★

عبدالحمید عدم

مسکرانے کا کچھ خیال تو تھا
زہر کھانے کا کچھ خیال تو تھا

یاد اک زخم بن گئی ورنہ
بھول جانے کا کچھ خیال تو تھا

آپ نے راستہ ہی روک دیا
آنے جانے کا کچھ خیال تو تھا

اہلِ ساحل نے غور ہی نہ کیا
ڈوب جانے کا کچھ خیال تو تھا

تو نے انگڑائی ہی نہ لی ظالم
لڑکھڑانے کا کچھ خیال تو تھا

اُن کے آنے کا گو یقین نہیں
اُن کے آنے کا کچھ خیال تو تھا

ہم کو دنیا کا غم نہ راس آئی
دل لگانے کا کچھ خیال تو تھا

شاعر لکھنوی

آنسو شعلوں میں یوں ڈھل رہے ہیں
غم دل کی فضا بدل رہے ہیں

گلشن ہے انھیں کا۔ گل انھیں کے
کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں

ہر سانس ہے جشن میں فروزاں
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

چپ چپ سی ہے تلخیٔ زمانہ
غم جام و سبو میں ڈھل رہے ہیں

مٹ مٹ کے ابھر رہی ہے دنیا
بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں

اللہ رے اعتبارِ ہستی
ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں

اس سمت بھی گردشِ زمانہ
کچھ لوگ ابھی سنبھل رہے ہیں

ساحل پہ انھیں کا حق ہے شاعر
طوفاں کا جو رُخ بدل رہے ہیں

شفقت کاظمی

اک حسن بے مثال ہے پیشِ نظر ہنوز
ہم راہِ عاشقی میں ہیں گرمِ سفر ہنوز

پیشِ نظر ہے جلوۂ شمس و قمر ہنوز
ہم دیکھتے ہیں تم کو برنگِ دگر ہنوز

کیونکر کہوں کہ آپ کو اس سے غرض نہیں
[illegible] ہے قریبِ نظر ہنوز

وہ اور ہوں نوازِ اہلِ تمنا سے بے خبر؟
حسن کی ہر اک ادا ہے محبت اثر ہنوز

اے جوشِ اضطراب! تری زندگی بخیر
ملتی ہے اپنے حال کی مجھ سے خبر ہنوز

باقی ہے حسرتِ وعدۂ باطل کا انتظار
[illegible] ہنوز

[illegible]
[illegible] ہنوز

[illegible] مگر
[illegible] ہنوز

جلیل حسین جلیل

یاد دل سے تری ہٹا نہ سکے
تجھ کو اے دوست ہم بھلا نہ سکے

تو وہ ہے جو رہے تصوّر میں
پاس رہ کر بھی پاس آ نہ سکے

دیکھ کر مست چشمِ ساقی کو
جامِ لبریز ہم اٹھا نہ سکے

ہم نے سب کچھ بھلا دیا لیکن
اک تری یاد کو بھلا نہ سکے

دلِ بلبل کو جو لبھا نہ سکے
گل نہیں ہے جو مسکرا نہ سکے

اس کو غنچہ نہ چاہیئے کہنا
جو سرِ شاخ لہلہا نہ سکے

چل دیا جو، اسے بلا نہ سکے
کھو دیا جس کو اس کو پا نہ سکے

شب کی رنگینیاں نہ دل سے گئیں
سرخیٔ شام کو بھلا نہ سکے

اس کی بزمِ طرب میں آ کے جلیل
غم کا افسانہ ہم سنا نہ سکے

کہیں میں کہ سگریٹ کا ڈبہ کسی میز پر رکھ دیا تو پھر ان کو معلوم نہیں کہاں ہے۔ پھر صبح تک ان کا ذکر نہیں کرتے۔ جب دفتر جانے کا وقت آیا تو سب کی شامت، اب ہم سب گھر میں بھاگ رہے ہیں، بیوی بھی اور بچے بھی، آیا بھی اور بیرا بھی اور وہ خود بھی۔ بیرا کوٹ لے آئیں اور کیا بتاؤں [illegible] اپنا اسباب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر روز مختلف جگہیں ڈھونڈتے ہیں۔

"ڈھونڈتے ہیں؟ . . ."

"مطلب یہ کہ انہیں شاید نادانستہ طور پر اس شغل میں لطف آتا ہے، ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں کہ ایک جگہ کپڑے اتارا کیجئے مگر انہیں کہاں پرواہ۔ روز وعدہ کرتے ہیں سوری (sorry) کہتے کہتے ان کا منہ خشک ہو جاتا ہے مگر دوسرے دن پھر وہی حرکت! بیرے کو میں نے کہہ دیا کہ صاحب آئیں تو آتے ہی ان کے بوٹ اتار دیا کرو۔ مگر جب بیرا آگے بڑھا یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ کیوں میرے پیچھے پڑا ہے۔ مجھ پر رحم [illegible] ابھی سے میرے کپڑے اتارنے کی فکر میں ہے . . . . . دفتر سے آئیں گے تو بات نہیں کریں گے۔ آتے ہی اخبار اٹھایا [illegible] کمرے میں چلے آئے۔ میں نے پیالی بڑھا دی تو لے لی ورنہ چائے پڑی ہے، کچھ کھانے کو بھی ہے مگر نہیں اٹھائیں گے۔ اور جب کھانے کو کہتی ہوں تو مجھ سے کہیں گے: تم سے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ دوپہر کا کھانا دفتر میں پیٹ بھر کر نہیں کھایا جاتا۔ چائے کے ساتھ کچھ بنا لیا کرو۔ میں کہتی ہوں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہے بچے ہی ضائع کرتے ہیں آپ کیوں نہیں کھاتے۔ یہی کہیں گے مجھے کس نے دیا تھا! اب کیا کروں! اتنے سال ہو گئے یہ حالت نہیں گئی۔ سامنے پڑی ہوگی چیز، میں بچوں کو تقسیم کرنے میں مشغول ہو گئی تو بیٹھے ہیں چپ، اخبار سامنے ہے مگر منہ سے نہیں کہتے کہ مجھے چائے بنا دو۔

"میرے سامنے تو کبھی ایسا نہیں کیا!"

"یہی تو ان میں کمال ہے۔ اوروں کے سامنے بالکل بدل جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سر میں چاروں طرف آنکھیں لگی ہیں ہاتھ بڑھانے نہیں پاتی کہ پلیٹ اٹھا لیتے ہیں۔ ہر ایک کو پوچھتے ہیں لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان جیسا متواضع اور ملنسار شخص کوئی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کہیں دعوت ہو، کہیں بھی ہو آں جناب کو دس دفعہ یاد دلاتی ہوں اور پھر بھی آپ تاریخ کو بھول جاتے ہیں۔ سب اپنی جگہ ٹیلیفون کرنا پڑتا ہے کہ اطلاع کروں کہ آج فلاں صاحب یا صاحبہ کے ہاں کھانا ہے آپ ابھی تک کیوں واپس نہیں آئے۔ [illegible] عجیب ستم ظریفی ہے کہ میں لاکھ اچھے کپڑے پہنوں، کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ لباس اچھا ہے۔ میں نے سینکڑوں دفعہ آزمایا [illegible] پہنے ہیں کیا مجال ہے کہ بھولے سے بھی کبھی نکتہ چینی کریں۔ حالانکہ یہ بات نہیں کہ آپ کو لباس کے متعلق کچھ پتا نہ ہو [illegible] ہیں اگر لباس میں کوئی غلطی ہو جائے یعنی رنگوں کی آمیزش غلط ہو جائے تو خواہ ہمیں کسی پارٹی میں جانا ہو پھر بھی کچھ نہیں کہیں گے [illegible] میرے لباس پر کوئی ہزار پھبتی کس دیں گے۔ سیدھی نہیں، مجھ سے مخاطب ہو کر دوسری عورتوں کے لباس میں پچاسوں نقص نکال دیں گے۔ اور اس نکتہ چینی میں ایک دفعہ میرے لباس کی کسی خامی کے بارے میں ایک لفظ بھی براہ راست نہیں کہیں گے۔ مگر پانچ منٹ کی گفتگو ہی میں مجھے پتا چل جائے گا کہ آپ کا روئے سخن کس طرف ہے۔ اور اگر میں کہہ دوں کہ آخر آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں کہہ دیا تھا تو نہایت معصوم چہرہ بنا کر کہیں گے: کیا؟ کس بارے میں؟ مجھے تو کچھ نہیں کہنا تھا۔ آپ کے لباس کے بارے میں! مگر

بہت خوبصورت تھا۔ آپ کو تو لباس پہننے میں خاص سلیقہ ہے جی چاہتا ہے کہ کوئی گھٹیا سا گلدان اٹھا کر اُن کے سر پہ دے ماروں لیکن اس
ت سے ڈرتی ہوں کہ مرہم پٹی بھی مجھے ہی کرنی ہوگی۔

اور سنو! یہ بھی آپ کی عجیب عادت ہے کہ کسی پر نکتہ چینی نہیں کرتے یعنی عیب جوئی کے عادی نہیں ہیں۔ میری ہاں میں ہاں ملا کر خود
دیتے ہیں مگر اور کچھ نہیں کہیں گے مگر جو بات میں کسی کے بارے میں کہہ دوں وہ کبھی نہیں بھولیں گے اور پھر کبھی مجھ سے اسی شخص کی
تعریف میں کوئی جملہ نکل جائے یا برعکس حالت میں کوئی بُرا لفظ اس کے بارے میں کہہ دوں جس کے بارے میں کبھی تعریف کی تھی تو بجائے
یری شامت! نہایت متین لہجے میں فرمائیں گے کہ آپ نے اس دن تو یہ فرمایا تھا۔ ہاں ہوسکتا ہے اس اثنا میں اس شخص میں یہ بات
پیدا ہو گئی ہو۔ آخر ہم لوگ ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ ہماری صفات میں بھی ایسی جلدی جلدی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔
ٹھیک کہا آپ نے بالکل! میں جھنجلا اٹھتی ہوں اور چلا کر کہتی ہوں۔ خدا کے واسطے اپنی منطق مجھ پر نہ بگھاریئے! اس پر بھنویں اٹھا کر مجھے
یک منٹ کے لئے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں اور پھر اخبار یا کتاب پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

"تو کیا ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں، بچوں کو وقت نہیں دیتے؟"

نہیں پڑھتے تو ایسا زیادہ نہیں۔ بچوں کے ساتھ ان کا دستور الگ ہے: بچوں کو باہر لے جاتے ہیں اور ان کو وہ آزادی دیتے
ہیں کہ الامان! دریا پر لے جائیں گے تو خواہ بھرے دریا میں غوطہ لگانا چاہیں انھیں روکیں گے نہیں! میں منت کرتی ہوں تو فرماتے ہیں
تم ان کے حوصلے پست کرتی ہو۔ میں کہتی ہوں اگر یہ ڈوب گئے تو پھر مسکرا کر کہتے ہیں اول یہ کہ میں اچھا خاصا تیراک ہوں دوم انھیں اپنی
جان پیاری ہے، یہ کہتے ضرور ہیں کہ غوطہ لگائیں گے مگر صرف تم کو ڈراتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ غوطہ لگائیں بھی۔ سوم تم ابھی جوان ہو
اور بچے پیدا ہو جائیں گے۔ اب بتاؤ میں ان باتوں کا کیا جواب دوں۔

"تو اب تمھیں اسی طرح چاہتے نہیں؟"

اس کی بھی ایک ہی کہی۔ یا تو ہفتہ ہفتہ پوچھیں گے نہیں اور پھر چمٹیں گے تو اس بُری طرح سے کہ جینا دوبھر کر دیں گے۔ بیمار ہوں گا تو
اس شدت کا کہ میں ہاتھ جوڑتی ہوں "دوسری شادی کر لو" اور بے پروائی ہوگی تو اس قدر کہ کوئی کیسے معمولی واقفیت ہے۔ مگر مجھے یاد ہے
ایک دفعہ مجھے بخار آنے لگا۔ ڈاکٹر لوگ یہ نہ بتا سکے کہ کس قسم کا بخار ہے۔ نہ محرقہ تھا نہ ملیریا نہ اترتا تھا۔ سب قسم کی دوائیں دے رہے تھے
انھوں نے نہ صرف میری تیمارداری خود کی بلکہ مجھے جس چیز کا زیادہ فکر تھا یعنی بچوں کی خبر گیری، وہ بھی اس خوش اسلوبی سے کی کہ مجھے معلوم بھی
نہ ہوا کہ میں بیمار ہوں۔ مگر کیا کروں دوستوں کے ساتھ شکار کو چلے جائیں گے تو مجھے فقط پندرہ منٹ کا نوٹس ہوگا۔ یہ نہیں بتائیں گے کہ کہاں
جا رہے ہیں، کب آرہے ہیں؟ کس چیز کا شکار ہے؟ بس دو لفظ۔ شکار جا رہا ہوں" اور کچھ نہیں۔ بیرے کو حکم ہے کہ ان کا بندوق کیس اور
رائفل کیس ہر وقت تیار رہے، دس منٹ میں تیار ہو جایا جاوے۔ اور لطف یہ ہے کہ دفتر کے معمولی کپڑے پہنتے وقت سارا گھر سر پر اٹھا لیں گے
کوئی چیز آپ کو نہیں ملے گی، اور سب چیزیں مل جائیں تو رومال نہیں ملیں گے مگر شکار جانا ہو تو نہ بیرا طلب ہوگا نہ مجھے۔ بلکہ کئی ملینز گوادینہ
بچوں پر برسیں گے۔ یہ سب چیزیں انھیں اپنے وارڈروب میں پڑی مل جائیں گی، برجس اور بڑے بوٹ، تھیلا وغیرہ، پندرہ منٹ کے اندر

تیار ہوکر چلے بھی جائیں گے . . .

جاتے ہوئے نہ سلام نہ کلام۔ میں سنتی ہوں کہ اُمعاوند ہر وقت بیویوں کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں "بیگم یہ" "اور دلہن وہ" "بہو یہ اور پیاری وہ" "سو سو پیار کے نام ہوں گے اور لاکھ لاکھ چونچلے مگر یہ دفتر جاتے ہیں تو دیکھتے نہیں کہ میں کہاں ہوں اور شکار یاد دورے کے لئے جاتا ہو تو پروا بھی نہیں کرتے کہ میں اندر ہوں یا باہر . . .

"تو تم کبھی کہتی نہیں ہو . . . ."

کہتی ہوں، کہتی کیوں نہیں، مگر کیا تمہارا خیال ہے ان پر کوئی اثر ہو سکتا ہے . . اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پورا کھول کر میری طرف مظلوما نظروں سے دیکھیں گے اور کہیں گے "مجھے تعجب ہے کہ تم یہ کیسے کہتی ہو میں تو ہر لحظہ تمہیں محسوس" کرتا رہتا ہوں، مجھے معلوم ہوتا ہے تم کیا کر رہی ہو، کس کمرے میں ہو، جب میں گھر میں آتا ہوں تو پہلا خیال مجھے تمہارا ہوتا ہے۔ میں ایک نظر میں دیکھ لیتا ہوں کہ تمہارا مزاج کیسا ہے؟ آج نوکروں نے ستایا ہے یا نہیں، بچے شوخی سے باز آئے ہیں کہ نہیں، دھوبی نے کپڑے کھوئے یا نہیں، خانساماں نے سالن جلایا ہے یا نہیں، تمہارا پاؤڈر تمہارے چہرے پر جچا ہے یا نہیں! میں کہتی ہوں توبہ کرو توبہ! تو کہتے ہیں نہیں مانتیں؟ اچھا سنو! کل تم نے سفید نفیٹی کا غرارہ، قرمزی ساٹن کی صدری اور موتیا جارجٹ کی قمیص پہن رکھی تھی، تمہارے بالوں میں نسترینِ شم کا پھول لگا تھا۔ پرسوں تم نے جاپانی سلک کی وہ قمیص پہنی تھی جس کی پشت پر پھول کڑھے ہوئے ہیں، سفید شلوار تھی ساٹن کی، پُرانا سُرخ جوتا تھا، بالوں میں کاسنی پھول تھے۔ وہ کھدر کی شیشوں والی واسکٹ تھی اور پھر پچھلے ہفتے کے تمام کپڑے مجھے سنا دیں گے اور آخر میں یہ کہیں گے: "پیاری! تم میرا خیال مت کیا کرو میں دیوانہ ہوں دیوانہ . . . .

اب بتاؤ ایسے شخص سے کوئی کیسے لڑے . . . .

سید فیاض محمود

یادِ حشر

(۱۸۷۶ء ــــــ ۱۹۳۵ء)

آغا حشر نے جو اُردو کے ایک مشہور ڈراما نویس اور اچھے شاعر ہونے کے علاوہ دوسری گوناگوں قابلیتوں کے مالک تھے، اب سے ۱۵ سال قبل ۲۸۔ اپریل کو لاہور میں وفات پائی تھی۔ ان کی ایک غزل بہ طور یادگار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کسے معلوم تھا عشق اس طرح ناچار کرتا ہے　　دل اس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

نوائے شوق سے گونجی ہوئی ہے عشق کی دُنیا　　یہاں کا ذرّہ ذرّہ گفتگوئے یار کرتا ہے

امیدیں مر کے جی اٹھیں تری جھوٹی تسلّی سے　　ارے کمبخت کیوں جینا مرا دشوار کرتا ہے

میں صدقے آستیں الٹو چھری لو ذبح کر ڈالو　　یہ کیا کم جُرم ہے دل کا کہ تم کو پیار کرتا ہے

چلا ہے حشر پھر اس عافیت دشمن کے کوچے میں　　یہ اپنی قبر اپنے ہاتھ سے تیار کرتا ہے

سعید اختر درانی

سوتا بچہ

ننھے بچے! تو اپنی پاکیزہ نیند میں کھویا ہوا کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے تیرے پھول کی پنکھڑی کے سے نازک ہونٹوں پر یہ دلآویز تبسم کس قدر حسین نظر آتا ہے۔ تیری بند آنکھیں گلاب کے سوئے ہوئے غنچوں کی طرح گھٹی ہیں۔ تیرے گلابی گالوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹوں کی جھائیاں فرشتوں کی پاکیزہ نور کو شرما رہی ہیں۔ تیری بے فکر پیشانی پر حوریں سجدہ ریز ہو رہی ہیں اور تیرے سنہرے ریشمیں بال عنودگی آلود چنبیل کے تاروں کی طرح [illegible] رہے ہیں تیرے خوابوں کی دنیا کس قدر دلکش اور پاکیزہ ہوگی۔ ننھے ستارے! اس میں ہر طرف ایک بے داغ چاندنی چھٹکی ہوگی، جیسے سروں میں گاتے ہوئے نرم نرم جھرنے فضا میں ایک سویا سویا سا خمار آگیں ارتعاش پیدا کر رہے ہوں گے۔ تو سنہری جھیلوں کے سبزے سے ڈھکے ہوئے کناروں پر فرشتوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہوگا۔ تو بھی فرشتوں میں ایک معصوم سا فرشتہ لگ رہا ہوگا۔ گیت گاتی ہوئی بلبلیں جب بے چین امنگوں کا مظہر بنتی ہوں گی، تو تو بھی ان کے پروں پر بیٹھ کر جھیل کی تہ میں چندا ماموں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا ہوگا، تو مسکراتا ہے؟ تجھے میری بات بھلی لگی؟ میں تو ایک کثیف جسم ہوں، تو ایک لطیف روح ہے، جو جنت سے اتر کر میری دنیا میں پاکیزگی اور تقدس کا نور پھیلانے آئی ہے۔ جب تو مسکراتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دامن سے سب گناہ دھل گئے ہیں، میں بے اختیار مسکرانے لگتا ہوں اور مجھے ساری دنیا میں ایک معصوم سی مسکراہٹ پھیلتی نظر آنے لگتی ہے۔ تو من کی آنکھیں کھولے اتنے غور سے کیا دیکھ رہا ہے؟ کیا چندا ماموں بادلوں کے پیچھے چھپ گئے اور جھیل کی تہ تاریک ہوگئی؟ آجا، تو کنول کے پھولوں کی ہلکورے لیتی ہوئی کشتیوں میں بیٹھ کر جھیل سے باہر آجا۔ تو پھر مسکرایا! میں تیرا بوسہ لوں؟ نہیں میں اپنے کثیف ہونٹ تیرے پاکیزہ پھول کے سے ہونٹوں سے مس نہیں کروں گا۔ مجھے ڈر ہے کہیں اس مس سے وہ ایک دم کمھلا نہ جائیں، ان کی پاکیزگی پر داغ نہ لگ جائے۔ نہیں، یہ ہونٹ فرشتوں کے چومنے کے ہیں۔ ان کو فردوس کی حوریں ہی چھو سکتی ہیں۔ نہیں نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرے اس خیال ہی سے تو تیری پاکیزگی آلودہ نہیں ہوگئی؟ ہائے یہی وہم مجھے کھائے جاتا ہے۔ مگر تو سویا رہ! خوابوں کی خوب صورت بستی میں تتلیوں اور بلبلوں سے کھیلتا رہ، مست آنکھوں والی ننھی ننھی ہرنیوں کے ساتھ کلکاریاں مارتا رہ، جھیل کے کنارے سے سیپ چنتا رہ، سدا ہنستا رہ، سدا مسکراتا رہ! اللہ تجھ سے کبھی یہ پاک تحفہ نہ چھینے۔ تجھے کبھی اس دنیا کی آلائشوں سے ملوث نہ کرے، تو ہمیشہ معصوم رہے، ہمیشہ سوتے میں مسکرایا کرے۔ اور میں ہمیشہ تیری پیاری پیاری مسکراہٹوں کو دیکھا کروں ——— اے کاش ایسا ہی ہو!

★

طارق گیلانی

جزیرۂ منورا کی سیر

دار الحکومت پاکستان کے قریب جزیرۂ منورا ایک بہترین سیرگاہ ہے۔ پاکستان کے دوسرے شہروں سے جو لوگ کراچی آتے ہیں وہ ضرور سمندر دیکھنے کی غرض سے منورا کی بھی سیر کرتے ہیں۔ کراچی دُنیا کی بہترین بندرگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور اب تو ایک نئی بندرگاہ کو اور زیادہ خوب صورت بنانے کے لئے بھی تیار کر لی گئی ہے۔ اس کے بعد کراچی کی بندرگاہ بہت ہی خوب صورت اور عمدہ ہونے کے علاوہ دُنیا کی اہم ترین بندرگاہوں میں شمار ہوگی۔

کراچی کی بندرگاہ شہر سے دو تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس علاقے کا نام کیماڑی ہے۔ یہاں آنے کے لئے شہر سے ہر وقت ٹرام اور بسیں تیار ملتی ہیں جو صرف دس یا پندرہ منٹ میں کیماڑی پہنچا دیتی ہیں۔ کیماڑی بھی ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں بھی ہر قسم کی ضروریات زندگی بہ آسانی بہم پہنچ سکتی ہیں۔ کیماڑی پہنچ کر دائیں ہاتھ کو کراچی کی بندرگاہ ہے۔ جہاں سے سامان تجارت جہازوں کے ذریعہ درآمد برآمد ہوتا رہتا ہے۔ جہاز بالکل بندرگاہ کی زمین کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ یہیں سے پاکستان کے حاجی جو سمندر کے ذریعہ سے حج کرنے جاتے ہیں، جہازوں میں سوار ہوتے ہیں۔

یہاں سے بائیں ہاتھ کو ایک اونچا سا گھڑیال نظر آتا ہے۔ اس کے نیچے دو دروازے بنے ہوئے ہیں۔ ایک دروازہ سمندر تک اندر جانے کے لئے ہے اور دوسرا باہر آنے کے لئے ہے۔ اندر جاتے ہی آپ کو آوازیں آئیں گی: "آیئے صاحب بوٹ (کشتی) تیار ہے۔ آیئے صاحب لانچ تیار ہے۔ لانچ وہ کشتی ہے جو پٹرول سے چلتی ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ سمندر میں چلنے والی موٹر ہے۔" لیکن آپ یقیناً لانچ ہی کو پسند فرمائیں گے۔ کیونکہ اس میں کشتی کی بہ نسبت حفاظت زیادہ ہے اور وہ آپ کو بہت ہی کم وقت میں منورا کے جزیرے میں پہنچا دیتی ہے۔ منورا کیماڑی سے ڈیڑھ یا دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر آپ بوٹ میں سوار ہوں گے تو پھر یہ ہوا کی مرضی ہوگی کہ جتنی دیر میں اس کا دل چاہے آپ کو پہنچائے۔ کرایہ دونوں کا یکساں ہے یعنی صرف دو آنے۔

کراچی کے سمندر میں اور بھی بہت سے جزیرے ہیں۔ ایک جزیرہ بابا کے نام سے مشہور ہے اور میرے خیال سے تو اس نام سے بہت لوگ مانوس ہوں گے۔ کیونکہ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں یہاں بہت بڑی بڑی شارک مچھلیاں پکڑ کر لوگوں کو دکھانے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے جزیرہ میں کراچی کے تمام ملاح رہتے ہیں۔ اتنی بڑی دیو ہیکل مچھلیاں پکڑنا انھیں ملاحوں کا کارنامہ تھا۔ خیر جب آپ لانچ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرتے ہوئے جزیرۂ منورا کو روانہ ہوں گے تو آپ ایک خاص لطف محسوس کریں گے۔ ہر طرف سمندر میں جہاز کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چھوٹی کشتیاں اور لانچیں اِدھر اُدھر دوڑ رہی ہوں گی۔ دس بارہ منٹ میں آپ منورا پہنچ جائیں گے۔

نچ کر آپ کو ایک بہت خوب صورت اور بہت بڑی عمارت نظر آئے گی۔ جزیرۂ منورا میں ہر طرف ریت ہی ریت نظر آتی ہے کوئی پون
پیل چلنے کے بعد آپ کو پھر سمندر دکھائی دینے لگے گا۔ آپ اس جگہ سے سمندر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ کیماڑی کے نزدیک جو سمندر کا
انی ہے وہ صرف ایک کُودی سی ہے۔ اس جگہ منورا میں دو ایک ہوٹل ہیں جو بالکل کنارے پر بنے ہوئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر بہت ٹھنڈک
سوس ہوتی ہے۔ گرمیوں میں عجیب ہی سماں ہوتا ہے۔ سمندر میں اس قدر بڑی بڑی لہریں اٹھتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ابھی یہ سب کچھ بہا لے
ائیں گی۔ لیکن وہ آپ کے پاؤں میں آ کر بالکل سست ہو جاتی ہیں۔ سردی کے موسم میں بھی لہریں اٹھتی رہتی ہیں لیکن گرمی کے مقابلے
یں بہت کم۔

یہاں کنارے پر آپ کو اونٹ والے بھی ملیں گے۔ یہ لوگوں کو ادھر اُدھر سمندر کے کنارے پر سیر کراتے ہیں چونکہ اس جگہ بہت
یت ہے اس لئے پیدل چلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اونٹ والے یہ مشکل حل کر دیتے ہیں۔ منورا میں سمندر کے کنارے پر ایک میلہ سا
گا رہتا ہے۔ عورتیں، مرد، بچے، انگریز، پارسی غرضیکہ ہر قسم کے لوگ کراچی سے یہاں سیر کرنے آتے ہیں۔

منورا میں ایک چھوٹی سی لیکن خوب صورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد ریت کے ایک بہت اونچے اور بڑے ٹیلے پر ہے یہاں
ماز پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے، ہر طرف خاموشی ہوتی ہے۔ خاموشی کے اس طلسم کو صرف سمندر کی گرج توڑتی رہتی ہے۔

مسجد کے ساتھ ہی ایک بہت اونچی اور بڑی چٹان ہے۔ اس چٹان کے کچھ حصے ٹوٹ کر سمندر میں گرے ہوئے ہیں جن سے سڑی
ں سمندر کا پانی کچھ دور ہٹ جاتا ہے۔ ان ٹکڑوں پر سے گزرتے ہوئے آپ اس جگہ چلے جائیں گے جو کر Break-water
ہلاتی ہے۔ یہ سمندر میں ایک مصنوعی دیوار بنی ہوئی ہے جس کے ایک طرف پانی ساکن ہوتا ہے اور دوسری طرف لہریں مارتا ہے۔ سردی میں
ونکہ سمندر میں طوفان نہیں آتے اس لئے اس دیوار پر پانی نہیں ہوتا۔ اور لوگ اس پر بیٹھ کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لیکن گرمی میں پانی اس
یوار کو عبور کر جاتا ہے۔ جہازوں کی رہنمائی کے لئے یہاں روشنی کا ایک مینار بنا ہوا ہے جو دور دور تک روشنی پھینکتا ہے۔

منورا میں ایک ڈاکخانہ، ایک ہسپتال اور بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی ہے۔ ٹیلی فون ایکسچینج اور دو تین کلب بھی ہیں۔
زیرے کی لمبائی کم و بیش دو تین میل ہے۔ اور چوڑائی تقریباً پون میل۔

شام کو منورا کے اردگرد سمندر میں کھڑے ہوئے جہازوں کی روشنی ایک عجیب بہار دکھاتی ہے۔ جہازوں میں لوگ اندر ہی اندر
راموفون اور ریڈیو بجا کر سنتے رہتے ہیں اور چاندنی راتوں میں ان جہازوں کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ (طارق گیلانی)

معاونینِ کرام

مضامین کی رسید حاصل کرنے کی غرض سے یا مدیر "مخزن" سے دیگر استفسارات کا جواب حاصل کرنے کے لئے خط کے ساتھ ایک لفافہ
پتا پورا اپنا لکھ کر براہِ کرم ضرور ملفوف کیجئے۔ اس مقصد کے لئے اپنا پتا لکھ کر حسبِ موقع جوابی کارڈ بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ ("مخزن")

ارشد مسعود

گورے گورے پاؤں اور دیواریں

(افسانہ)

نیم تاریک گلی میں سائے گہرے ہو چکے تھے بجلی کے تاروں پر کبوتر اونگھ رہے تھے اور تار خاموش تھے کسی کے خوابیدہ جذبات کی طرح اور کہیں کہیں ان پر گلی کے مکانوں کی دیواریں سایہ ریز تھیں، سامنے کے مکان کے ایک کمرے سے زرد رنگ کی روشنی جھانک رہی تھی زرد رنگ کی روشنی جیسی عموماً بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ صادقہ کا کمرہ تھا۔ دوسرے کمرے سے ہلکے نیلے رنگ کی روشنی دبے پاؤں باہر آ رہی تھی۔ یہ نعیمہ کا کمرہ تھا نعیمہ صادقہ کی چھوٹی بہن تھی۔ تیسرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ یہ کسی خاص شخص کا کمرہ نہ تھا اس لئے سب کا تھا۔ ہمارے مکان کے بالکل مقابل یہی کمرہ تھا۔ سامنے کا مکان ہمارے مکان سے کہیں لمبا تھا۔ اور دوسرے کمرے آگے تک چلے گئے تھے اور برابر والے مکان کے سامنے تھے۔ سامنے کے مکین ہمارے گھر والوں سے اسی تیسرے کمرے کی کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر باتیں کیا کرتے تھے

گلی میں کہیں روشنی تھی اور کہیں تاریکی، اور جہاں تاریکی تھی وہاں نہ تار نظر آتے تھے نہ ان پر سوئے ہوئے کبوتر۔ اس اندھیرے میں ان کی موجودگی کا علم تو اسی وقت ہو سکتا تھا جب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا جاتا۔ پھر روشنی اور تاریکی میں یہی فرق تھا کہ جو چیزیں روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں وہ تاریکی میں دکھائی نہیں دیتی تھیں ورنہ وہی کچھ سایوں کے دامن میں تھا جو روشنی میں تھا وہی تار تھے اور وہی کبوتر۔ جہاں روشنی کے راستے میں کوئی دیوار آ گئی تھی وہاں سائے تھے۔ اور یہ سائے ان چیزوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے، اور بجلی کے تار، ان پر سوئے ہوئے کبوتر، اور دیواروں پر کبوتروں کی بیٹیں سایوں کی اوٹ میں چھپ کر رہ گئی تھیں اور اس وقت روشنی اور تاریکی کی حدیں نہایت وضاحت سے دکھائی دے رہی تھیں۔

اگر آپ کو کمروں کی ترتیب کا علم نہ ہوتا تو بھی آپ روشنی کا رنگ دیکھ کر بلا تامل کہہ سکتے تھے کہ یہ نعیمہ کا کمرہ ہے۔ نعیمہ کے کمرے کو پہچاننا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ نعیمہ پڑھنے کے لئے ٹیبل لیمپ جلایا کرتی تھی اور کمرے کو روشن کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے مختلف رنگوں کے بلب استعمال کرتی تھی۔ یا عام بلب پر مختلف رنگوں کے باریک نفیس کاغذ چڑھا دیا کرتی۔ اُسے روشنی کا رنگ بدل دینے کا بہت شوق تھا ہلکے نیلے اور گلابی رنگ کی روشنی اسے بہت پسند تھی۔ نہ جانے روشنی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا اسے کیوں گوارا نہ تھا۔ اور یہ بھیس بدل کر رنگین گھونگٹ کی دیواروں سے نکلتی ہوئی روشنی نہ جانے اس کی جمالیاتی حس کو کیسی تسکین پہنچاتی تھی۔

سامنے کے مکان کی بات کر رہا تھا۔ اس میں ایک گورنمنٹ کنٹریکٹر رہتے تھے مٹی میں ہاتھ ڈال کر سونا بناتے رہتے نعیمہ اور صادقہ انہی کی لڑکیاں تھیں ٹھیکیدار صاحب کا ایک لڑکا بھی تھا جو باپ سے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا تھا۔ اور آجکل کراچی میں اپنا کاروبار کرتا تھا ٹھیکیدار صاحب کی دونوں لڑکیاں کالج میں پڑھتی تھیں میری بہن زبیدہ کے ساتھ۔ بڑی ہنس مکھ اور ملنسار تھیں۔ ان کے

انرم زرخیز تھے۔ اور وہ خود فضول خرچ تھیں۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ دونوں بیٹیاں والدین کی چہیتی پلی تھیں۔ فضول خرچی کا یہ عالم تھا کہ تعلیم بھی اس کی دستبرد سے نہ بچ سکی تھی۔ نعیمہ اور میری بہن زبیدہ دونوں ایک جماعت میں تھیں۔ دن صادقہ ایک سال آگے تھی۔ اس کے دل میں جو لہر آئی تو وہ ایک سال جان بوجھ کر فیل ہو گئی۔ تاکہ تینوں اکھٹی پڑھیں جس دن صادقہ کا نتیجہ نکلا اس دن وہ اتنا ہنسی کہ ہنس ہنس کر تھک گئی۔ ظاہر ہے کہ میری بہن کے ساتھ ان کی بہت دوستی تھی۔ اپنے مکان کی کھڑکیاں کھلی ہوں تو وہ زبیدہ سے باتیں کیا کرتیں کبھی اسے اپنے مکان پر بلا لیتیں۔ کبھی خود ہمارے ہاں آ جایا کرتیں۔ زبیدہ کے ذریعے سے ہی کبھی کبھی کسی کام کو کہہ دیتیں مثلاً کبھی کوئی کتاب یا نمونہ دے کر بازار سے کوئی چیز منگوا لیا کرتیں۔ مجھ سے کتابیں بھی مانگ کر پڑھا کرتیں۔ جب کتاب واپس آتی تو اس پر صادقہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی شعر بھی ہوتا۔ لیکن نعیمہ نے کبھی کوئی شعر میری کتاب پر نہیں لکھا تھا۔ اپنا کوئی مضمون دکھانا ہوتا تو زبیدہ کے ہاتھ بھیج دیتیں۔ صادقہ کی کاپی میں بھی جگہ جگہ شعر لکھے ہوتے۔ وہ زبیدہ کے ساتھ کبھی مجھے بازار سے بھیجتیں سینما کا انھیں بہت شوق تھا۔ میں کوئی فلم دیکھ کر آتا تو پوچھ بھیجتیں کیسا تھا۔ اگر اچھا ہو تو کسی دن ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیئے"۔ ان کے اتنا نزدیک رہنے کے باوجود دونوں بہنیں مجھ سے پردہ کیا کرتیں۔ وہ الگ بات تھی کہ جب میں ان کے ساتھ ہوتا تو صادقہ اکثر نقاب الٹ دیا کرتی لیکن نعیمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ اپنے آپ کو چھپائے رکھتی۔ یہ بات نہیں وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح سے وہ قطعی طور پر اپنے آپ کو چھپا سکتی ہے اور اس طرح میں اس کی دید سے محروم رہ سکتا ہوں یا میں نے اسے دیکھا نہیں اور دیکھ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں نے اس کے چھپنے کے باوجود بارہا اسے دیکھا ہے اور دیکھتا رہوں گا اور اتنے قرب کے باعث وہ مجھ سے مکمل پردہ کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ نہ اس کے پردہ کرنے کا یہ مقصد تھا کہ وہ اپنے آپ کو مجھ سے اس طریقے سے چھپائے کہ میری نظر اس پر کبھی نہ پڑ سکے۔ یا اس کے خدوخال اور جسم کی بناوٹ کا اندازہ نہ لگا سکوں بلکہ وہ اس لئے پردہ کرتی کہ قاعدے کی بات یہی تھی۔ اور وہ ان قواعد پر کاربند رہنے کو بجا خیال کرتی۔

صادقہ نعیمہ سے ذرا ہی بڑی تھی، یہی دو سال جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں دونوں بہنیں خوب صورت بھی تھیں اور خوش مزاج بھی، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں کی صورت یا مزاج ایک جیسے تھے۔ نعیمہ کا قد ذرا لمبا تھا صادقہ سے اور صادقہ کا جسم ذرا بھاری تھا نعیمہ سے۔ دونوں خوب صورت تھیں لیکن دونوں کے حسن میں فرق تھا۔ دونوں خوش مزاج تھیں لیکن دونوں کے مزاج مختلف تھے۔ اور بعض دفعہ ان کی خوش مزاجی کے موقع بھی الگ الگ ہوتے۔ دونوں کی آنکھیں دلآویز تھیں لیکن ان کی تحریریں جدا تھیں۔ صادقہ کی مسکراتی ہوئی روشن آنکھوں میں ستارے ناچتے رہتے اور میرے دیکھنے پر یہ روشنیاں چھپا نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ ان کا رقص زیادہ معصوم اور والہانہ ہو جاتا۔ جب وہ نظریں میری نظروں سے ملتیں تو ان میں ننھی ننھی بجلیاں رقصاں ہوتیں لیکن نعیمہ کی آنکھوں میں جو ستارے جھانک رہے ہوتے میرے ساتھ آنکھیں [illegible] ہوتے ہی ایک دم کہیں چھپ جاتے۔ جیسے اچانک کسی گہرے بادل نے انھیں اپنی اوٹ میں چھپا لیا ہو۔ اور نہ جانے یہ بادل کہاں سے آ جاتے، اور میرے لئے ان آنکھوں میں ہمیشہ اندھیری رات ہی ہوتی۔ اور اپنے لئے ان آنکھوں میں اندھیری رات دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہوتی۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے

نعیمہ کی آنکھیں زیادہ پسند تھیں۔ اس لئے نہیں کہ ان میں اچانک میرے لئے اندھیری رات چھا جاتی بلکہ اس لئے کہ وہ مجھے زیادہ اچھی لگتی تھیں، جب وہ آنکھیں چھپ جاتیں تو میں اداس ہو جاتا۔

جب صادقہ کھڑکی میں کھڑی ہوتی اور میں اُسے دیکھتا تو وہ چھپ نہیں جاتی تھی، بلکہ مجھے دیکھ کر میری موجودگی کو جان بوجھ کر نہ جانتے ہوئے وہاں کھڑی رہتی مسکراہٹیں ہونٹوں پر ناچنے لگتیں اور ننھے ننھے خوبصورت ستارے کپکپانے لگتے۔ لیکن جب میں نعیمہ کو کھڑکی میں سے دیکھتا تو وہ کسی اوٹ میں ہو جاتی میری موجودگی کا احساس اسے اس شدت سے ہوتا کہ سر کو ایک مخصوص انداز سے جھٹک کر کھڑکی سے ہٹ جاتی، اس کے اس انداز میں ایک تمکنت صاف دکھائی دیتی۔ گو مجھے بعض دفعہ محسوس ہوتا کہ تمکنت سے زیادہ تمکنت دکھانا مقصود ہے لیکن اس کا یہ رویہ مجھے اداس بنا دیتا۔ اور میں سوچتا صادقہ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اس کا صبیح چہرہ بے نقاب ہے، اور کبھی میں عجیب باتیں سوچتا مثلاً یہ کہ کاش صادقہ نعیمہ ہوتی اور نعیمہ صادقہ ہوتی —— پھر یہ نعیمہ حسن کے چہرے پر نقاب کیوں پہنے رہتی ہے؟ اس کا چہرہ کسی دیوار کے پیچھے کیوں ہے؟ لیکن مجھے اس سے کیا۔

لیکن اس کے باوجود مجھے اس سے کچھ تھا ضرور۔ بات "مجھے اس سے کیا" کہہ دینے سے ختم نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے یہ انداز میرے جذبات کو اس طرح مجروح کرتے کہ چوٹ میری خواہش کے خلاف گہرائی تک جا پہنچتی۔ اور بعض اوقات باوجود کوشش کے غصہ تھوکنے کی بجائے پی جاتا۔ اس کی اس حرکت سے نہ صرف اس کا دلآویز چہرہ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا بلکہ اس کی بے رُخی مجھ پر ایک بوجھل سا احساس طاری کر دیتی۔

ایک دن میں ڈیوڑھی میں سے گزر رہا تھا کہ مجھے صادقہ آتی ہوئی دکھائی دی، میں راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا، اس نے مجھے دیکھ کر نقاب الٹ دیا، اور کن انکھیوں سے دیکھتی ہوئی مسکراتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے پیچھے نعیمہ آ رہی تھی اس نے نقاب الٹ رکھا تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے چہرے کو چھپا لیا۔ میں چڑ گیا اور زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا باہر نکل گیا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھے چڑانے کے لئے ایسا نہیں کرتی بلکہ میں سوچتا، کاش وہ مجھے چڑایا ہی کرتی، لیکن وہ تو صرف "قاعدے کی بات" کیا کرتی تھی لیکن ایک بات صاف ظاہر تھی کہ اتنی راہ و رسم، اتنا قرب ہونے پر بھی یہ بے رُخی، یہ بے اعتنائی گویا ایک اشارہ تھا کہ ہمارے دل میں تمہارے لئے ذرا سی بھی جگہ نہیں۔ اس مکانی قرب کے باوجود تم ذرا سی توجہ حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے ہو۔ مجھے بس سے صدمہ پہنچتا، کیا میں اتنا ناقابلِ التفات ہوں؟

میں اپنے آپ سے کہتا "نعیمہ! میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے کسی غیر معمولی گرمجوشی سے پیش آؤ۔ لیکن اس سرد مہری اور بے رُخی کا سامنا کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے —— بہت مشکل ہے"

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر میں اس کی سرد مہری سے جھنجلا کیوں اٹھتا ہوں؟ اور جب مجھے اپنی جھنجلاہٹ کا کوئی جواز نہ ملتا تو میں اور جھنجلا اٹھتا۔ اور اس جھنجلاہٹ سے مجھے سخت نفرت تھی میرے لئے یہ ایک مشکل مسئلہ بن گئی تھی۔ یہ جھنجلاہٹ ایک سحاب کی طرح صادقہ کے التفات کو بھی اوجھل کر دیتی۔ یہ تو ایک پرانی اور جانی پہچانی ہوئی بات ہے کہ آپ کسی لڑکی سے کہیں "مجھے تم سے محبت ہے" یا

انخواستہ نفرت ہے لیکن بھلا یہ بات بھی کبھی سننے میں آئی ہے کہ آپ کہیں کہ نعیمہ! مجھے تم سے جھلاہٹ ہے یہ تاہم یقین کیجیے مجھے ایسے
ہا ایک عجیب سے جذبے نے بہت پریشان کیا حتیٰ کہ میں سوچتا، کاش سامنے کے مکان میں صرف صادقہ ہی ہوتی، نعیمہ نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا
اور اگر سے محبت ہی ہوتا تھا تو صرف نعیمہ ہی ہوتی صادقہ نہ ہوتی ـــــ یہ دونوں یکجا کیوں ہیں؟ ـــــ اور میں نے پہلو بہ پہلو لیٹی ہوئی
چلتی اور تاریکی کی واضح حدود کو گھورتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو سامنے کے مکان میں پہاڑ پر جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دو تین دن تو کچھ ضروری چیزیں لیا
یدنے کے لیے مخصوص کر دیئے گئے، اس کے بعد ایک دن بھی ضائع کیے بغیر چلنے کا پروگرام بن گیا۔ لیکن اچانک ٹھیکیدار صاحب کو
ب ضروری کام کے لیے رکنا پڑ گیا۔ اور وہ بھی دو تین ہفتوں کے لیے۔ لڑکیوں کے خوابوں پر اوس پڑ گئی۔ اس طرح تیار ہو کر رک جانے
سے وہ بہت اداس ہو گئیں۔ گرمیاں اور پھر چھٹیاں۔ اتنے دن اب بیکار یہاں پر کیونکر گزارے جائیں۔ ان حالات میں گرمی کچھ زیادہ ہی
محسوس ہونے لگی۔ دو تین دن تو وہ چپ چپ پھرتی رہیں۔ پھر سوچنے لگیں اس طرح یہاں رہ کر تو ہم پھک جائیں گے، گرمی سے نہیں،
بی کے احساس سے، گرمی کے احساس کو کم کرنے کی کوئی نہ کوئی تجویز ضرور کرنی چاہیے ـــــ اور آخر انھوں نے ایک تجویز ڈھونڈ
نکالی۔

شام کا وقت تھا۔ میں گھوم کر لوٹ رہا تھا۔ ہماری گلی کے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ اس میں سے تین لڑکیاں اتریں اور گلی میں داخل
ہوئیں۔ ٹھیکیدار صاحب کے مکان کے پاس پہنچیں تو دوڑ کر اندر چلی گئیں۔ کھڑکیوں میں کھڑی صادقہ اور نعیمہ انھیں اچھل اچھل کر دیکھ رہی
تھیں۔ مہمانوں کی آمد اور میزبانوں کے استقبال سے وہ شور مچا کہ توبہ! صادقہ اور نعیمہ کو اداسی دور کرنے کی یہ ترکیب سوجھی کہ انھوں نے
خط لکھ لکھ کر سہیلیوں کے گھروں سے سہیلیاں اور رشتہ داروں سے رشتہ دار لڑکیاں منگانا شروع کیں۔ پھر جو اندھا دھند لڑکیاں آنے
لگیں تو دو تین دن تک یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ کل کتنے عدد لڑکیاں آ چکی ہیں۔ آخر کار صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ کوئی سات آٹھ کے قریب
لڑکیاں جمع ہو گئی ہیں۔

سامنے کے مکان میں اس قدر لڑکیاں ہوں تو دھیان خواہ مخواہ ادھر ہی لگا رہتا ہے لیکن اتنی لڑکیوں کی خبر گیری کرنا میرے بس
کی بات نہ تھی۔ در و دیوار پر اس قدر زور سے انوار کی بارش ہوئی کہ دیواریں گرنے کو آ گئیں۔ اتنی لڑکیاں دیکھ کر میرے تو قدم اکھڑ گئے۔ ایک
ہی گھر میں آٹھ دس لڑکیاں جمع ہوں تو وہ گھر بھر کو سر پر کیوں نہ اٹھا لیں۔ اتنی لڑکیاں اگر ایک دم سیڑھیاں ہی اترنے لگیں تو دیواریں ہلا دیں
یں۔ سامنے کے مکان میں نت نئے پروگرام بنتے رہتے اور پھر اس شور کے ساتھ کہ میں زبیدہ سے پوچھتا اس احتیاط کے ساتھ کہ آواز
ساتھ والے مکان میں چلی جائے کہ یہ مکان ہے یا مرغیوں کا ڈربہ؟"

شکل و صورت کے اعتبار سے سب لڑکیاں اپنی اپنی جگہ خوب تھیں لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ آپ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ یہ ہاتھ جو
آپ دیکھ رہے ہیں کیا اسی لڑکی کے ہیں جس کا خوب صورت گول چہرہ ابھی ابھی آپ نے دیکھا تھا۔ یہ لڑکیاں ایک دوسرے میں یوں گڈمڈ ہو گئی
تھیں کہ کوئی بات ہی نہ بنتی تھی۔ اتنی لڑکیوں کا دھیان رکھنا بھی بہت مشکل تھا اور دھیان ادھر سے ہٹانا بھی بہت مشکل تھا۔ جبکہ سامنے کھڑکیوں

ہیں خوب صورت چہرے ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ۔ پھر جب وہ ہولے ہولے گانے لگتیں تو گاتی ہی چلی جاتیں ۔ باتیں کرتیں تو باتیں ہی کئے جاتیں ، ہنسنے لگتیں تو ہنستی ہی چلی جاتیں ۔ چوڑیاں بجنے پہ آتیں تو بجے ہی چلی جاتیں ۔ اور رات کے سناٹے میں آنچلوں کی سرسراہٹ میں کتنے ہی بے شمار سانس الجھ جاتے ، اسے دلکشی ہی کہہ لیجئے لیکن اتنی زیادہ اور بے سروپا دلکشی کے مقابلے میں میں بوکھلا گیا ۔ پھر میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ چھٹیاں کسی پُرسکون جگہ گزاری جائیں ۔ ویسے بھی مجھے تیز خوشبوئیں ، تیز جلوے ، تیز سگریٹ اور شوخ رنگ کبھی نہیں بھاتے ۔ اس کے برعکس ہلکے سگریٹ پینے کا عادی ہوں ۔ ہلکے رنگوں اور بھینی بھینی خوشبو پر جان دیتا ہوں ۔ پھر اگر آپ خوشبو کے اوپر خوشبو رکھ کر خوشبوؤں کے انبار لگا دیں تو میرے نزدیک یہ خوشبو نہیں رہتی ۔ خوشبوؤں کے اس انبار کو خوشبو کہنا ایسا ہی ہے جیسے آندھی کو صبا کا ایک لطیف جھونکا کہہ دیا جائے ۔

لیکن میں جانے ہی والا تھا کہ ایک پھول ایسی خوبی سے جھاڑی سے علیحدہ ہو کر گرا اور ایک بھینی بھینی خوشبو نے اپنے آپ کو خوشبوؤں کے اس انبار سے اس سلیقہ کے ساتھ علیحدہ کیا کہ میں نے فوراً ہی جانے کا ارادہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا ـــــــ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اپنے ساتھ میرے لئے ایک عجیب کیفیت لے کر آیا ۔ ہوا یوں کہ ـــــــ لیکن معاف فرمائیے ، ابھی نہیں ـــــــ اس سے پہلے ایک اور واقعہ سُن لیجئے : ۔

ایک دن میں باہر سے آ کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تو ٹھٹک کر رہ گیا ۔ ایک لڑکی برقع اوڑھے کھڑی میری کتابوں کی الماری میں کچھ اُلٹ پلٹ کر رہی تھی ۔ اس کی پُشت میری طرف تھی ۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ یکایک مڑی لیکن تھی ۔ ایک دم گھبرا گئی ۔ نقاب سے چہرہ چھپا لیا ۔

"میں زبیدہ سے ملنے آئی تھی ۔ نہ جانے کہاں گئی ۔ آپ کے کمرے میں شاید میری ایک کاپی ہے ۔ اسے ڈھونڈنے کے لئے چلی آئی ۔"

"کاش آپ یہ بتانا ضروری نہ سمجھتیں ـــــــ آپ شوق سے آیئے ، آپ کا اپنا کمرہ ہے ـــــــ ایک کاپی تو وہ پڑی ہے سامنے میز پر !"

اس نے "اوہ" کہہ کر میز پر سے اٹھالی ۔

"لیکن آپ تو چل دیں ۔ ٹھہریئے ذرا بیٹھئے ۔ ابھی آجائے گی زبیدہ ۔ یہیں کہیں گئی ہوگی ۔"

"نہ جانے کب آئے گی ؟"

"ذرا ٹھہر جائیے ۔ کبھی ہم سے بھی بات کر لیا کیجئے ۔ ابھی تو آپ یہاں کھڑی تھیں ۔ میرے آنے پر چل دیں ۔ میرے آنے سے کیا کمرہ اتنا بُرا ہو گیا ہے ۔ میں کوئی ایسا بُرا تو نہیں !"

وہ گھبرا کر بولی ، "نہیں یہ بات نہیں ۔ میں اب چلتی ہوں ، نہ جانے کب آئے گی زبیدہ ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے ۔"

میں نے اسے باتوں میں لگانے کے لئے کہا ۔ "وہ نیا ناول دیکھا آپ نے ، وہی کتاب جس کے پاس آپ کا ہاتھ تھا ۔ وہ جو الماری

یں پڑی ہوئی ہے ایک ایسی لڑکی کی داستانِ عشق ہے جو ایک لڑکے سے محبت کرتی ہے اور نہیں بھی کرتی۔"

"کرتی ہے اور نہیں بھی کرتی"

"دراصل وہ اس لڑکے سے صرف بھیس بدل کر عشق کرتی ہے۔"

"بھیس بدل کر ــــــ!"

"ہاں، یہی تو عجیب بات ہے اس میں ــــــ دونوں کالج کی اسٹیج کے ہر دلعزیز اداکار تھے۔ لڑکے کو لڑکی سے والہانہ محبت تھی۔ لڑکی جب اسٹیج کا لباس پہن لیتی تو اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی اور لڑکے کی ہمت بندھ جاتی، لیکن جس وقت وہ اسٹیج کے کپڑے اتار کر اپنے کپڑے پہن لیتی تو لڑکے کی بندھی ہوئی ہمت توڑ دیتی۔ جیسے ان کپڑوں کے ساتھ اس نے سرد مہری کا جامہ پہن کر اپنی محبت کو چھپا لیا ہو ــــــ اور لڑکا سوچتا رہ جاتا . . . . بہت دلچسپ مطالعہ ہے۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے میں نے ناول اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اچھا اب چلتی ہوں۔"

"ذرا ٹھہر جائیں تو کیا کوئی حرج تھا، آپ کہاں روز روز آتی ہیں اس کمرے میں ــــــ ایک بات پوچھوں؟!"

وہ خاموش کھڑی رہی جیسے کہہ رہی ہو "پوچھ لیجئے" لیکن کہا کچھ بھی نہیں۔

"آپ کو نفرت ہے مجھ سے؟" یہ سوال میں نے بڑی مشکل سے ادا کیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اور بھی گھبرا گئی پھر بولی:۔

"نہ جانے آپ کیا پوچھ رہے ہیں مجھ سے ــــــ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"کاش آپ اس کمرے کو اتنا برا نہ سمجھتیں!"

"نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں ــــــ خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ میں اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ میں چونک کر ایک قدم اُدھر ہٹ گیا۔ میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ وہ چلی گئی اور میں نہ جانے کتنی دیر بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

میں چائے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ زبیدہ چائے بنا رہی تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں پہلے درجے کا احمق ہوں۔ اس آگہی پر مجھے نہایت تلخ خوشی ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ میں ایک ایسا قہقہہ لگاؤں جو اس تلخ خوشی کا غماز ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے سے جیسے ایک پردہ ہٹ گیا۔ ایک لڑکی کی بے رخی پر اتنا پریشان ہونے کی کوئی وجہ بھی نہ ضرورت۔ آخر کون ہوتی تھی نغمہ میری جو میں اس قدر پریشان تھا۔ اور میں نے زبیدہ سے کہا "میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میں تیز چائے نہیں پیا کرتا۔"

"لیکن میں نے آپ کے لئے چائے تیز تو نہیں بنائی!"

میں اپنے خیالات میں کھو گیا۔ زبیدہ بھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی "بھائی جان"

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ جب اسے کوئی مطلب ہوتا تو وہ مجھے اسی طرح ادب سے بلایا کرتی۔

"کیوں، کیا بات ہے ؟"

"آپ مری نہیں چلیں گے کیا ؟"

میں نے حیران ہو کر کہا "مری! وہ کیوں ؟"

"صادقہ، نعیمہ اور ان کی کچھ سہیلیاں بھی جا رہی ہیں"

"تو میں کیا کروں ——— اسی ہلڑ سے تو تنگ آ کر تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ بہت جلد ایبٹ آباد جا رہا ہوں"

"انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے"

"تو پھر چلی جاؤ"

"لیکن اماں نہیں مانیں گی، ان کے ساتھ میرے اکیلے جانے پر . . . ."

"تو پھر میں کیا کروں ——— تم کہنا کیا چاہتی ہو ؟"

زبیدہ نے میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے کہا "اگر آپ چلیں تو اماں شاید مان جائیں"

"میں!" میں نے کہا "میں !؟"

"کیا حرج ہے، آپ کے لئے ایک الگ کمرے کے انتظام کا ذمہ لیا ہے انھوں نے۔ ہمارے لئے بالکل الگ تھلگ ایک کمرہ ہوگا۔ بلکہ صادقہ نے کہا ہے جو کمرہ بھی پسند آئے گا آپ کو دے دیا جائے گا"

"نہیں، نہیں میں نہیں جا سکتا۔ میرا پروگرام بن چکا ہے۔ میں نہیں جا سکتا تم لوگوں کے ساتھ"

"کتنا اچھا ہوتا اگر آپ چلتے۔ یہاں میری ساری چھٹیاں یونہی گزر جائیں گی"

"تم جانا چاہتی ہو تو جاؤ ——— مجھے کیوں گھسیٹتی ہو کانٹوں میں"

اس نے چڑ کر کہا "مری میں کون سے کانٹے ہیں جو ایبٹ آباد میں نہیں ہیں"

"مری میں تو نہیں ہیں۔ لیکن یہ جو جا رہے ہیں یہاں سے"

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ گلی میں جھانکا، بجلی کے تھرکتے ہوئے تاروں کو لاپروائی سے دیکھا اور سامنے مکان پر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے کھڑکی میں سے کسی لڑکی کے دو گورے گورے خوب صورت پاؤں بڑے مزے سے جھانک رہے ہیں۔ کھڑکی کا ایک دروازہ کھلا تھا اور دوسرا بند اور لڑکی بند دروازے کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پاؤں اتنے خوبصورت تھے کہ میں پہلے تو کتنی دیر تک مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر جب اور کوئی کام کرنے لگا تو نظر بار بار ادھر ہی چلی جاتی۔ میرا دل چاہا کہ ان پاؤں سے کوئی بات کی جائے۔ آخر میرے منہ سے بے اختیار نکل ہی گیا "کیا پیارے پیارے پاؤں ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ پاؤں بھی اتنے خوب صورت ہو سکتے ہیں" پاؤں جھینپ کر ایک دم بند دروازے کی اوٹ میں چھپ گئے۔ میں نے کہا "بہت شرمیلے پاؤں ہیں" کھڑکی تھوڑی سی ہلی اور کچھ دیر تک چپ

کے بعد پاؤں پھر ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکنے لگے۔ اس کے بعد کمرے میں کوئی آیا تو دروازہ ایک دم بند ہو گیا۔ اس دن کے بعد وہ پاؤں روز کھڑکی میں ملتے۔ میں انھیں محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا اور وہ نہایت معصومیت سے ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکتے رہتے اور جب اس کمرے میں آتا تو اچانک کھڑکی کا دوسرا دروازہ بھی بند ہو جاتا۔ پھر ایسا شور مچتا کہ میں اپنے کان بند کر لیتا۔

مجھے ان پاؤں کا ایک ایک نقش یاد ہو گیا تھا جیسے وہ میرے دل میں بس گئے ہوں، داہنے پاؤں پر ایک سیاہ تل تھا جو بہت خوبصورت ہوتا۔ ان کی معصوم خوبصورتی نے میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ میں کہتا کیا متناسب پاؤں ہیں۔ دراصل تناسب ہی حسن اور حسن میں تناسب ہے۔ میں ان کی تعریف کرتا تو وہ مسکرا اٹھتے یعنی میں سمجھتا کہ وہ مسکرا رہے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ میں سمجھتا کہ جس کے یہ پاؤں ہیں وہ مسکرا رہا ہے۔ یا پھر اُسے مسکرانا چاہئے۔ یا اسے نہیں تو کم از کم پاؤں کو تو ضرور مسکرانا چاہئے ——— اور واقعی ان پاؤں کے پیچھے مسکرا رہا ہوتا۔ ورنہ پھر میں یوں محسوس کرتا کہ پاؤں مسکرا رہے ہیں ——— آپ اتنی سی بات پر حیران ہو رہے ہیں۔ اس وقت پاؤں لڑکی تک مسکرا اٹھتی۔ ابھی کائنات کا تو میں نے نام ہی نہیں لیا۔ غالباً آپ کو تجربہ نہیں ان باتوں کا۔

میں سوچتا، نہ جانے یہ کس کے پاؤں ہیں۔ کون سی لڑکی ہے ان حسین پاؤں کی مالک، چہرہ ضرور دیکھا ہوگا اس لڑکی کا لیکن نہ وہ کونسا چہرہ ہے جس کے یہ پاؤں ہیں، ایسے خوب صورت اور معصوم، سپیدۂ سحر کی طرح دل فریب ——— اور پھول کی نازک!

اب ان پاؤں کی خاطر اس لڑکی کو بھی ڈھونڈنا ہوگا۔ پاؤں نووارد معلوم ہوتے تھے۔ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے کل تو یہ بھی کہ اگر میں ایک ایک کر کے ساری نئی لڑکیوں کو دیکھ بھی لیتا تو ان کے جدا جدا پاؤں کا حلیہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا لڑکیوں کو پاؤں سمیت دیکھنا بہت کٹھن کام تھا۔

میرے دل میں یہ خواہش ہر وقت چٹکیاں لیتی رہتی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کس لڑکی کے پاؤں ہیں۔ ان پاؤں کے ساتھ ساتھ وہ غائبانہ میرے دل میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ لیکن نہ جانے وہ کونسی لڑکی تھی۔ میرا دل ہی نہیں، یہ پاؤں بھی گواہی دیتے تھے کہ وہ لڑکی حسین ہوگی لیکن بعض اوقات میں ان پاؤں ہی پر قناعت کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ میں ان سے بہ حیثیت پاؤں کے محبت کرنے کا بھی اہل ہوں۔ اس میں یہ خوبی تھی کہ جب تک پاؤں کے اصلی مالک کا پتا نہیں چلتا تھا، اس وقت تک یہ پاؤں کسی کے ساتھ جا سکتے تھے اور یہ آزادی صرف اتنی ہی دیر تک قائم رہ سکتی تھی۔ جتنی دیر تک یہ غیر یقینی حالت قائم تھی اور اس شخص کا تعین نہیں تھا جس کے یہ پاؤں تھے معلوم ہونے پر تو یہ آزادی چھن جاتی۔ پھر یہ پاؤں نہ صرف سامنے کے مکان کی لڑکیوں ہی میں سے کسی کے جا سکتے تھے بلکہ موجودہ غیر یقینی حالت میں آپ ان پاؤں پر جو سراپا چاہتے تعمیر کر سکتے تھے۔ اور اپنے تخیل کی بہترین تصویر کے ساتھ جوڑ سکتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک دعوتِ فکر تھی اور اس لئے یہ پاؤں اور بھی زیادہ عزیز ہو جاتے۔ کیونکہ ان کا تعلق آپ کے تخیل کی تصویر کے ساتھ قائم ہو گیا تھا۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ آپ کو پاؤں سے بہ حیثیت پاؤں ہی کے عشق ہوتا کسی خاص کے پاؤں ہونے کی حیثیت سے ان کی یہ صلاحیت کسی صورت بھی قائم نہ رہ سکتی تھی۔ خیر یہ تو میرے عشق کے فلسفہ کا ایک پہلو تھا لیکن پھر

بھی اکثر میرے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی کہ ان پاؤں کی مالک کون ہے؟

ایک دن میں نے کہا "کیا ہی اچھا ہو کہ ان گورے گورے پاؤں میں کالے سلیپر پہنے جائیں۔ دوسرے دن یہ دیکھ کر میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کہ دونوں مانوس پاؤں سلیپر پہنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ چاہ کا جواب چاہ سے دیا جا چکا تھا کہ دیکھو ہمیں تمھاری خواہش کا کتنا خیال ہے۔ گویا یہ دوسری طرف سے عشق کا اقرار تھا۔ میں جھومنے لگا۔ ایک لطیف احساس انگڑائیاں لینے لگا اور میں ایک گیت کے بول گنگنانے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری روح کے کسی گوشے میں شعروں کی ایک کان نکل آئی ہے۔ دراصل شاعری اور محبت میں ایک گہرا تعلق ہے۔ خالِ رُخ پر لوگ سلطنتیں قربان کر چکے تھے۔ آج میں خالِ پا پر اپنی کائنات لٹا دینے کو تیار تھا۔

میں نے سوچا جس لڑکی کے پاؤں اتنے خوبصورت ہیں وہ خود کتنی خوب صورت ہوگی۔ دن بھر میری عجیب حالت رہی۔ پھر وہ پاؤں چھپ گئے سورج بھی چھپ گیا۔ اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی اور میں اپنے بستر پر لیٹ گیا تو اس وقت بھی میں اسی عالم میں تھا۔ وہی لطافت، وہی سرور مجھے خوابوں کے حسن زاروں میں لیے لیے پھرا۔ جیسے کوئی پری کسی بچے کی انگلی پکڑے اسے پرستان کی سیر کراتی ہے۔ اس رات میں نے کہکشاں کو جا کر چھو لیا تھا۔ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن میرا آج تک یہی خیال ہے کہ میں نے واقعی اس رات کہکشاں کو چھو لیا تھا۔ وہ رات میری نہایت پیاری راتوں میں سے تھی۔ جو بیت جانے پر بھی خوشبو کی ایک لپٹ کے مانند یاد کے دریچوں سے اکثر لوٹ آتی ہیں۔

اس رات کبوتر تاروں پر ناچتے رہے۔ ان کے تاروں پر پھڑپھڑانے سے ایک ہلکا سا شور بلند ہوتا جس کے جواب میں میری روح کی گہرائیوں سے راگ کے سوتے پھوٹ پڑتے۔ میں خواب میں بھی ان آوازوں کو سنتا رہا۔

دوسرے دن اچانک مجھے خیال آیا، کیا عجب یہ پاؤں بھی مری جا رہے ہوں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ یہ بھی ساتھ جا رہے ہیں یا نہیں۔ کس سے پوچھا جائے اور کس طرح پوچھا جائے۔ کیوں نہ انہی سے پوچھ لیا جائے۔ اور میں نے پاؤں سے مخاطب ہو کر کہا "آپ بھی چلیں گے کیا؟"

"کہاں؟" نہایت آہستہ یہ آواز آئی۔ تاکہ کوئی آواز ہی سے نہ پہچان لے کہ بولنے والا کون ہے۔

"یہی مری!"

"ہاں ——"

اس کے بعد میری کسی بات کا جواب نہ ملا۔ اور مجھے آہ بھر کر خاموش ہو جانا پڑا۔

ادھر یہ مری جانے کی تجویز کسی نے زبیدہ کے کان میں ایسی پھونکی کہ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی۔ وہ برابر مُصر رہی۔ وہاں کی دلچسپیوں کے سبز باغ دکھاتی۔ وہاں یہ ہوگا وہاں وہ ہوگا۔ اس کا دل بہت چاہ رہا تھا مری جانے کو۔ ایک دن میں نے اس سے چڑ کر کہا "بھئی تم بھی عجب آفت ہو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔" تو وہ لڑنے پر اتر آئی کہنے لگی "تم بھی تو کتنے ڈھیٹ ہو" وہ جب مجھ سے کبھی لڑنے پر آتی تو اسی طرح مخاطب ہوا کرتی "اتنی منتیں کسی اور کی کی ہوتیں تو کبھی کا مان گیا ہوتا۔"

ایک دن زبیدہ کہنے لگی: "صادقہ آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہے۔" اس کے بعد صادقہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی: "آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ آپ کی ہر ایک چیز کا خیال میں خود رکھوں گی، جو بھی کمرہ آپ کو پسند ہوگا آپ کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا۔ پھر آپ بھی مری میں ہوں گے تو بڑا مزہ رہے گا۔"

میں نے کہا: "لیکن میں وہاں کیا کروں گا، آپ کی تو وہاں سہیلیاں ہوں گی، میں وہاں کیا "دیواروں" سے باتیں کیا کروں گا؟"

وہ ہنس پڑی: "دیواروں سے کیوں —— ہم کوئی دیواریں ہیں کیا؟"

"تو اور کیا۔ ابھی دیکھ لیجئے، یہ جو آپ اس دروازے کے پیچھے کھڑی ہیں یہ ایک دیوار ہی تو ہے، آپ اس دیوار سے پوچھتی ہیں اور میں اس دیوار کو جواب دیتا ہوں۔ ہم اور آپ اس دیوار ہی سے تو باتیں کر رہے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی: "میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو وہاں "دیواروں" سے باتیں نہیں کرنا پڑیں گی۔"

"لیکن مجھے اس کا یقین کیسے آئے جب آپ مری چلنے کی دعوت بھی دروازے کے پیچھے سے دے رہی ہیں۔"

وہ نہ جانے زبیدہ سے مخاطب تھی یا مجھ سے: "اس وقت تو سامنے آکر دعوت دینا بہت مشکل ہے —— ان کے کہنے سے تو اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔" مجھ سے کہا: "آپ ضرور چلئے۔ دیکھئے میرا کہنا رائیگاں نہ جائے۔" اور زبیدہ سے کہا: "اچھا اب میں چلتی ہوں۔" پھر وہ سیڑھیوں کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے بولی: "اچھا تو اب آپ تیار ہیں نا؟" اس وقت میری طرف اس کی پشت تھی، اور رخ دیوار کی طرف تھا۔ میں نے کہا: "یہ دیوار تو آپ کو جواب دینے سے رہی۔"

وہ پھر ہنس پڑی، اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ وہیں کھڑی رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر وہ یکایک مڑی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا بے نقاب چہرہ میرے سامنے تھا درمیان میں کوئی دیوار نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ ہاں مجھے ایک چیز واضح طور پر یاد ہے۔ ان آنکھوں میں روشنی کی متحرک لکیریں تھیں جیسی رات کو آسمان پر تاروں کے ٹوٹنے سے پیدا ہو جاتی ہیں، اس کے ہونٹ تھوڑے سے ہلے پھر کانپے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی اور سر کو ایک طرف جھکا کر نیچے بھاگ گئی۔

میں نہ جانے کتنی دیر لیٹا چھت اور دیواروں کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ رات بھی مجھے نہیں بھولے گی۔ مری جانے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ اس رات اس زور کی آندھی آئی کہ معلوم ہوتا تھا مکانوں کی چھتوں اور دیواروں کو اڑا کر ہی دم لے گی۔ ساتھ ہی مینہ برسنے لگا۔ ہم چھت پر سوئے ہوئے تھے اٹھ کر نیچے کی طرف بھاگے برابر کے مکان کی چھتوں اور صحنوں میں سوئے ہوئے لوگ برساتیوں اور کمروں کی طرف دوڑے۔ نیچے اپنے کمرے میں آکر میں نے بجلی کا لیمپ جلایا اور آہستہ آہستہ بستر بچھانے لگا۔ سامنے کے مکان میں چارپائیاں اٹھانے کے بعد رکھنے کا شور ہو رہا تھا۔ میں لیمپ بجھائے بغیر ہی لیٹ گیا۔ اور بوندوں کے گرنے کا شور سنتا رہا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تھوڑی دیر لیٹے رہنے کے بعد میں اٹھا۔ اور بارش کا نظارہ کرنے کے لئے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ بوندوں کے شور کے ساتھ ہوا بھی شور مچاتی ہوئی اور سیٹیاں بجاتی ہوئی گلی کی دیواروں میں سے گزر رہی تھی۔ اور بوندوں کو اپنے ساتھ دور تک ہانک لے جاتی تھی جہاں وہ دیواروں سے ٹکرا جاتیں۔ بھیگے

ہوتے بجلی کے تار بار بار ہل رہے تھے۔ کبوتر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ گلی کا بھیگا ہوا فرش کہیں کہیں روشنی پڑنے کی وجہ سے چمک رہا سامنے کے مکان کی کھڑکی کے پاس ہی سوئی ہوئی کسی لڑکی کے دو چھوٹے چھوٹے پاؤں نظر آرہے تھے۔ میں نے فوراً وہ پاؤں پہچان لیے گویا بارش سے بھاگ کر یہ لڑکی یہیں کھڑکی کے پاس ہی سو گئی تھی۔

کھڑکی کے پٹ کی بغل میں کواڑ کی پلی کھلی تھی۔ اور جھکڑ کے زور سے دروازہ بار بار بج رہا تھا۔ پاؤں جھنجلا اٹھے۔ دو تین کروٹ بدل گئیں۔ میں اس امید پر کھڑا رہا شاید کوئی اٹھ کر کبھی کواڑ بند کرے گا۔ وہ ہوا کے زور سے کھلتا اور پھر بند ہو جاتا اور پاؤں کی جھنجلاہٹ کے باوجود برابر بجے جا رہا تھا۔ آندھی تو کواڑ کی اوٹ کو سرے ہی سے اڑا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ آخر پاؤں یک دم غائب ہو گئے۔ ایک سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی چارپائی سے اٹھا۔ دو قدم چلنے کی آواز آئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک لڑکی کھڑکی کی طرف بڑھتی آرہی تھی؟ اس کے چہرے پر روشنی پڑی تو میں چیخ اٹھا۔

"یہ تم ہو —— تم —— نعیمہ یہ تمھارے پاؤں ہیں ؟"

وہ ٹھٹک کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے کچھ سوچ کر آگے بڑھ آئی۔ مسکرانے لگی۔ اور مسکراتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

"نعیمہ! یہ تمھارے پاؤں ہیں ؟"

اس نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا

لیکن میں کہے گیا: "نعیمہ تم! —— نعیمہ تم بڑی شریر ہو!"

مسکراہٹیں بے نقاب ہو گئیں۔ ان پیاری پیاری آنکھوں کے آغوش میں مسکراتے ہوئے بے شمار ستارے جھانکنے لگے کسی بادل کی اوٹ میں چھپے نہیں۔ میں نے کہا، کتنے بے شمار ستارے ان بادلوں نے اپنی اوٹ میں چھپا رکھے تھے۔ اب ان بادلوں کو جیسے کسی آندھی نے اڑا دیا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ تار ناچ اٹھے۔ اور خوابیدہ کبوتر بیدار ہو کر غٹر غوں کرنے لگے۔ (ارشد مسعود)

جوش ملیح آبادی

رات ہے تاریک اور رہ رہ کے کوندے کی لپک چھو رہی ہے آسماں کی ظلمتِ خاموش کو

جیسے اس مجبور کی آنکھوں کا عالم، جو غریب حال کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا نہ ہو

صادقین احمد صدیقی امروہوی

رباعیات

(۱)

محنت کی رقم کو چھانٹتا ہے کتنا
حصہ بڑھ بڑھ کے بانٹتا ہے کتنا
اس "ہاری"[1] کو محنت کا صلہ دینے پر
اُفوہ! "وڈیرا" ڈانٹتا ہے کتنا

(۲)

اس مردِ زبوں حال کے جینے پہ ہے گرد
بالوں میں ہے گرد خاک تو سینے پہ ہے گرد
سوکھے ہوئے لب ہیں سانس میں ہے تیزی
چہرے پہ پسینہ اور پسینہ پہ ہے گرد

(۳)

جو آکے بدل دے گا یہ سارا اسلاد
اور اپنے عزائم میں نہ ہوگا ناچار
اے کاش تمنا ہو، نئی عورت کی
میں پیدا کروں گی نسلِ نو کا سردار

(۴)

اک حاملہ عورت کو لئے دل پہ خراش
جس وقت کیا تھا روحِ فردا نے تلاش
پوشاک، شکم پہ تنگ دیکھی، تو کہا:
اے مادرِ انسانِ توانا شاباش!

---

[1] سندھ میں ہاری اس مزدور کو کہا جاتا ہے جو کاشت کار کا کام انجام دیتا ہے۔ برخلاف اس کے "وڈیرا" زمیندار کو کہتے ہیں جو ہاری کے مقدر کا سولہ آنے مالک ہوتا ہے۔ ہاری بیچارہ بڑی سخت زندگی گزارتا ہے۔ یہ دونوں رباعیاں ایک ہاری ہی کو دیکھ کر کہی گئی تھیں۔ سندھی ہاری اور اردو والی مترادف ہیں

مُدیرِ اعزازی کی یادمیں

قطعۂ تاریخِ وفات

(حضرتِ صدق جائسی)

وہ عہد ہُوا اقتدار وقیوم سے پیوست — رکھتے تھے جسے جان سے بڑھکر فصحا دوست

خواہش تھی کہ تاریخ اچھوتی بھی ہو سچ بھی، — لکھا قلمِ صدق نے، مرحوم خدا دوست
۱۳۷۹ھ

سادہ قطعہ

بزمِ ادب میں ہوش کسی کے بجا نہیں — اُردو ادب کا محسنِ اعظم گزر گیا

راہِ طلب میں چھوڑ دیا راہبر نے ساتھ — ماتم ہے باقیوں میں کہ ساقی کدھر گیا

[illegible] زیدی

شیخ مرحوم

ظلمتِ شب کے لئے صبح کی تنویر چراغ
چشمِ انساں کے لئے تھی تری تحریر چراغ
قدرتِ شعر و سخن چیز ہے کیا جان لیا
حسنِ غالب کو ترے علم نے پہچان لیا
شمع اک راہ دکھاتی گئی پروانوں کو
چاکِ دامن نظر آتا گیا دیوانوں کو
فکرِ امروز کو اندیشۂ فردا بخشا
نظمِ اقبال طلب دیدۂ بینا بخشا
سُن کے اسرارِ خودی دل نے حلاوت پائی
تلخ الفاظ میں ایماں کی لذت پائی
حسنِ اقبال ہے منت کشِ تفسیر ابھی
ہاں مسلماں ہیں زندانیٔ تقدیر ابھی
ذوقِ نظارۂ انساں ہے گلزار طلب
اور دلِ شاعرِ حساس ہے افکار طلب
چین آئے گا نہ گل چیں کی ہوسناکی کو
کون سمجھے گا یہاں گل کی قباچاکی کو
"حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا"
شاید اب تجھ سا سخن فہم نہ ہوگا پیدا

نقوی احمد پوری

زبانِ اردو کا محسنِ اعظم

حقیقت تو یہی ہے نکتہ سنج و نکتہ داں تو تھا
اگر اغیار تھے قطرہ تو بحرِ بے کراں تو تھا
تری آنکھوں پہ اسرارِ نہاں تھے فاش فطرت کے
کہ فطرت کے اشاروں کا حقیقی رازداں تو تھا
حقیقت میں تجھے تھی راہِ منزل سے شناسائی
زمانہ کارواں تھا اور میرِ کارواں تو تھا
جوانوں کی رگوں میں تو نے خونِ سرد گرمایا
وہ شعلہ فکر شعلہ سنج اور شعلہ بیاں تو تھا
ترے ہی دم سے اب تک شاخِ اردو تھی ثمر والی
ادب کی شاخ جس سے سبز تھی وہ باغباں تو تھا

پروفیسر آغا صادق

آخری ملاقات

یہ آخری ملاقات تھی جو ادبِ اُردو کی اس جلیل القدر شخصیت سے ہوئی اور اس مختصر صحبت کے تاثرات میرے دل پر ہمیشہ کے لئے مُرتسم ہو گئے۔ کچھ عرصے سے میرے پہلے مجموعۂ کلام کا مسودہ شیخ مرحوم کے پاس تھا۔ آپ نے کئی بار خطوط میں بھی اور زبانی بھی عدیم الفرصتی اور خرابیٔ صحت کی معذرت فرمائی۔ امسال لاہور آنے سے پہلے کوئٹہ سے میں نے ایک خط شیخ مرحوم کی خدمت میں لکھا خلافِ معمول اس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ اسی وقت یہ اندیشہ ہوا تھا کہ خرابیٔ صحت شدید صورت اختیار کر چکی ہے کیونکہ آپ معمولی بیماری اور کمزوری کی حالت میں بھی متعدد خطوط مجھے لکھوا کر بھیجتے رہتے تھے۔

یکم جنوری کی شام کو لاہور پہنچ کر اپنے ایک عزیز کے ہاں مزنگ میں قیام پذیر ہوا۔ اور ۲۔ جنوری کو گیارہ بجے مرحوم کے درِ دولت پر حاضر ہوا، تو آپ کے صاحب زادے جناب ارشاد قادر کی زبانی معلوم ہوا کہ مالش کا وقت ہے، آپ بعد دوپہر تشریف لائیں تو مل سکیں گے۔ چنانچہ میں دو بجے پھر گیا تو ایک نوکر میرا کارڈ لے گیا اور جلد واپس آکر مجھے شیخ مرحوم کے کمرے میں پہنچا گیا۔

آپ بڑے بڑے تکیوں کے سہارے بستر پر بیٹھے تھے اور مجھے حیرت اور مسرت ہوئی کہ میرا مسودہ "صبح صادق" آپ کے سامنے تھا اور آپ کچھ لکھ رہے تھے۔ چہرے اور ہاتھوں پر نقاہت کے آثار ظاہر تھے۔ سلام کا جواب دیا اور مصافحہ فرمایا۔ پلنگ کے برابر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ برابر ہی دوسری کرسی پر ایک صاحب تشریف فرما تھے، ان کی طرف اشارہ کر کے کہا "پروفیسر صاحب تپش مرحوم کے صاحبزادے ہیں" "آپ سے ملئے، اتنے میں یہ مکمل کر لوں۔ میں نے اس کا بیشتر حصہ آپ کے آنے سے پہلے لکھ رکھا تھا۔ آج آپ کے آنے کی اطلاع ملی تو اسے مکمل کرنے بیٹھا ہوں"۔

اس دوران میں پروفیسر صاحب اور میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے، چند منٹ کے بعد کاغذ کے دو ورق مسودے پر سے اٹھا کر مجھے دیئے اور کہا "اسے دیکھ لیجئے کہیں کہیں قطع و برید ہو گئی ہے"۔

میں نے وہ تحریر پڑھ کر پروفیسر صاحب کی طرف بڑھا دی اور شیخ مرحوم کوئٹہ کی ادبی مجالس کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر فرمایا کہ "علامہ مرحوم نے جو میرے نام پیغام دیا تھا ؎

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اگرچہ ہماری زندگی کی راہیں الگ الگ رہیں اور مستقل طور پر ہم نشینی حاصل نہیں رہی۔

یارانِ نکتہ داں

ندیم جعفری

(فیروزی)

فروری کے انتخابات میں جناب صدق جائسی کی غزل خوب ہے۔ میں ذرا قدیم رنگِ تغزل کو پسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ گاہے گاہے "مخزن" میں اس رنگ کا کلام بھی شائع ہوتا رہے۔

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

غالباً میں نے غزل کا یہ شعر "ہمایوں" میں پڑھا تھا جس کو دس سال کا عرصہ گزرتا ہے لیکن ابھی تک یہ شعر مجھے یاد ہے۔ ہاں اچھے شعر کی خاصیت بھی یہی ہوتی ہے۔

جناب جگن ناتھ صاحب آزاد

(فروری، مارچ)

فروری کے پرچے میں سید عابد علی کی غزل مجھے بہت پسند آئی ہے خاص کر یہ شعر ؎

کوئی صیاد خوش نہیں آتا
ہوسِ قید و بند رکھتا ہوں

"مخزن المخازن" کی ترتیب میں بڑی محنت صرف کی جاتی ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔ اس کی افادیت ہر لحاظ سے مسلمہ ہے۔

مارچ کے مخزن میں حضرت جوش ملسیانی کے اشعار کا عنوان "قطعات" ہے۔ میرے خیال میں انھیں رباعیات کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ اشعار مروجہ رباعی کے اوزان میں نہیں لیکن ہیں تو بحر ہزج ہی کے زحاف میں۔ ما باطاہر لے؟ اکابر بحر ہزج کے اسی زحاف میں میں پیش کئے ہیں اور تو دنیا بھر میں رباعیات با باطاہر کہتے ہیں۔ قطعات کہنا اس لئے موزوں نہیں کہ پہلے دو مصرعے مقفیٰ ہیں اور قطعہ کی پابندی یہی کہتی ہے کہ قطعہ بغیر مطلع کے ہونا چاہیئے۔

مقبول حسین احمد پوری کی نظم مجھے بہت پسند آئی۔ یہ ہمارے ادب کی بدقسمتی ہے کہ مقبول حسین کی وہ قدر نہیں جس کے آپ مستحق ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت تک کسی کو خدا نے اتنی توفیق نہیں دی کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع کرے۔

صدق امروہوی کی رباعیات میں بڑی جان ہے۔ رباعی کے پہلے دو مصرعوں میں "اگر" کی "اگر" کی تکرار نہ ہو تو اس کا اور بلند ہو جائے۔ یہ رباعی بہت ترقی پسندانہ خیالات کی حامل ہے۔

میرے مضمون میں کتابت کی ایک غلطی رہ گئی ہے صفحہ کی آخری سطر میں لکھا ہے "حفیظ جالندھری نظم پڑھ رہے تھے، مجو پہ جبکا عالم تھا . . ." یہ اصل میں یوں ہے:

الٰہی نظم پڑھ رہے تھے مجھ پر وجد کا عالم تھا۔
عدم کی غزل اور محترمہ صفیہ شمیم کی رباعیات بہت دن
ے "مخزن" میں نہیں چھپیں لہذا انھیں یاد دہانی کرا دیجیے۔

"رفیق علی خان گوہر"

(مارچ)

شمس الدین صدیقی صاحب تو خوب لکھنے لگے ہیں یا رچ
"مخزن" میں ان کا ڈرامہ پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ ڈرامہ کیا
ہے آجکل کے ادیبوں کی حالت کی ہو بہو تصویر ہے۔ بہ لحاظ
ن بھی ان کا انداز اور مکالمہ قابلِ تعریف ہے۔ بہرحال آپ
نے یہ بہت اچھا قدم اٹھایا ہے کہ لائق اشخاص کی خدمات حاصل
نے میں دیگر ماہناموں سے بازی لے جانے کی کوشش
تے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا مضمون "شاعری میں
بان پسندی" بھی موضوع کے لحاظ سے اچھوتا ہے۔ سچ تو
ہے کہ ہمارے ادیبوں میں نئی چیز پیش کرنے کی خواہش و
شش نہیں ہے۔ اسی لئے جب کوئی نیا موضوع پڑھنے کو
تا ہے تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے لیکن ایک بات ضرور
ض کروں گا کہ پروفیسر موصوف نے "رخِ روشن کے آگے شمع
کر . . ." والے شعر کی مٹی پلید کر دی ہے۔ یہ شعر اس تحقیر و
حیک کا مستحق نہیں ہے لیکن بحیثیت مجموعی مضمون اچھا ہے
عابد علی عابد کی غزل پسند آئی اور بہاریہ نظموں میں تاثرات
مل بہار" اچھی ہے۔ فیاض محمود کا افسانہ "بھوک کے ہاتھ" پڑھا۔
نانوں کے معیار کو ذرا اونچا کیجیے۔ سر عبدالقادر کی وفات پر جو
لمی تاثرات ملک کے اشخاص نے پیش کئے ان کا انتخاب بھی
مدہ ہے۔ امید ہے کہ آپ کی ادارت میں "مخزن" سونے دن

رات چوگنی ترقی کرے گا۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

بشیر ساجد صاحب

(مارچ)

جب سے آپ نے "مخزن" کی ادارت سنبھالی ہے ارادہ
کرتا رہا کہ "ہمایوں" میں آپ کے دورِ آخر کی مختصر راہ و رسم کو
تازہ کروں۔ لیکن دن، ہفتے اور مہینے یوں ہی گزرتے چلے گئے۔
اب کے جو مارچ کا پرچہ دیکھا اپنے تین واجب الاحترام اساتذہ
فیاض محمود صاحب، حمید احمد خاں صاحب اور ڈاکٹر محمد باقر
صاحب سے ایک ہی محفل میں ملاقات ہو گئی۔ بے اختیار آپ کو
مبارک باد دینے کو جی چاہا کہ آپ کے طفیل یہ ممکن ہوا ورنہ کالج
چھٹنے کے بعد جناب حمید احمد خاں صاحب کے علاوہ باقی دونوں
حضرات تو نایاب سے ہو گئے ہیں۔ نومبر ۱۹۴۰ء کے "ہمایوں"
میں میرا ایک مضمون فیاض صاحب کی افسانہ نگاری کے متعلق چھپا
تھا۔ اس کے بعد کچھ اور لکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ فیاض صاحب
نے دوبارہ موقع ہی نہیں دیا۔ وہ لوگ جن کی افسانہ نویسی کا آغاز
فیاض صاحب کے زیرِ ہدایت ہوا آج کئی کئی مجموعوں کے مصنف
ہیں۔ اور اردو ادب میں ایک امتیازی مقام کے امیدوار،
نہیں بلکہ دعوے دار۔ لیکن فیاض صاحب "رنگ دیتے ہو کر رہ
گئے"۔ تاہم اب امید ہو چلی ہے کہ آپ ان سب حضرات کو مجبورِ
نگارش کرتے رہیں گے۔

مارچ کے پرچے میں حمید احمد خاں صاحب کا مضمون
"شاعری میں ہیجان پسندی" اپنی قسم کی واحد کوشش ہے۔
جس میں اُردو شاعری کے ایک مخصوص پہلو کو بالکل نئے زاویے
سے دیکھا گیا ہے۔ آج تک کسی نقاد نے ادھر نگاہ نہیں دوڑائی

ملتی ہے اگرچہ کہیں کہیں ہیجان پسندی اور استعجاب انگیزی آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔

قبلہ ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے شیخ عبدالقادر مرحوم کے متعلق مفرطی انداز میں خوب لکھا ہے۔ لیکن صلا کے پہلے کالم کے تیسرے پیرا کے آخر میں ۱۹۴۰ کی بجائے ۱۹۲۰ء ہونا چاہئے۔ اس کی تصدیق دوسرے کالم کے دوسرے پیرا سے ہوتی ہے۔ نیز ۱۹۴۰ میں تو ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں تھے۔ قبلہ فیاض صاحب سے کہئے گا کہ ارباب ذوق بھوکے ہاتھوں کے علاوہ ان کی دیگر تخلیقات کے بھی بھوکے ہیں۔ یوسف ظفر کا 'رنگ تغزل' اور عابد علی صاحب کی غزل خوب ہے۔

سیّد فیاض محمود

(اپریل)

مخزن کی اشاعت اپریل میں باقر صاحب کا ڈراما فلرٹ دیکھنے میں آیا ....؟ یعنی وہ لڑکی بیباک ہے؟ وہ صاحب شوقین ہیں؟ انھیں ان باتوں کا پتا نہیں ہے؟ وہ اس سے مذاق کر رہے ہیں؟ وہ اپنا امتحان لے رہے ہیں؟ وہ دنیا کے حال اور سماجی اقدار کا جائزہ لے رہے ہیں؟ جنسی بھوک پر ترحم آمیز تبصرہ کرتے ہیں یا محض دل لگی فرما رہے ہیں؟ کچھ تسلی نہیں ہوتی۔ کیا میرا خیال غلط ہے کہ وہ عظمت فرمانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پروفیسر شمس الدین صدیقی

(مخزن کا ڈراما نمبر؟)

اگر ممکن العمل اور قابل قبول ہو تو میری ایک تجویز یہ ہے کہ مخزن کا ایک شمارہ "تمثیل نمبر" رکھا جائے اور اس کے لئے ملک کے مختلف تمثیل نگاروں سے تعاون کی درخواست کی جائے۔ تمثیل کی صنف کو ترقی دینے اور مقبول کرنے کے لئے یہ ایک مفید قدم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ رسالہ کی محدود ضخامت طویل تمثیلوں کی اشاعت میں مانع آئے گی اس لئے ایک ایکٹ کی تمثیلیں ہی اس میں شامل کی جائیں تو زیادہ تمثیلیں چھپ سکیں گی۔ اگر اس امر کا بھی اہتمام کیا جا سکے کہ اس میں تمثیل کی تمام قسمیں جیسے طربیہ، المیہ، Trag-Comedy، مضحک نقل، غنائیہ وغیرہ کے نمونے پیش ہو جائیں تو اس تمثیل نمبر کی اہمیت اور قدر و قیمت اور بھی بڑھ جائے گی۔

مخزن! یہ تجویز اچھی ہے مگر ڈراما لکھنے والے حضرات کی توجہ اور مدد کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اگر معاونین کو یہ تجویز پسند ہو تو وہ اس نمبر کے لئے خود نوشتہ اور مترجمہ ڈرامے بھیجیں اگر کوئی صاحب منظوم ڈراما لکھ سکیں یا نظم میں کسی اچھے ڈرامے کا ترجمہ کر سکیں تو وہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا ڈراموں کا فنی معیار اور زبان کی صفائی اور خوبی اُن کی قبولیت کی ضمانت ہوگی۔ نمبر اسی وقت شائع ہوگا جب ایک پورے نمبر کے لئے اچھے ڈرامے جمع ہو جائیں گے۔

املا اور تلفظ کی غلطیاں

املا اور تلفظ کی غلطیوں کا سلسلہ بڑا مفید ہے۔ اگر ہو سکے تو اس کے لئے اور زیادہ جگہ مختص کیجئے۔ چونکہ پنجاب کے باشندوں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک کتابی زبان کی سی ہے اس لئے صحت زبان کی یہ تحریک یہاں اور زیادہ مفید اور ضروری ہے۔ اگر "اردو بولئے" کی تحریک بھی بڑے پیمانہ پر شروع ہو جائے تو اس سے اردو کی ترویج، ترقی اور اشاعت میں بڑی مدد ملے گی۔ (شمس الدین صدیقی)

مخزن المخازن

پرواز

بحضورِ قائدِ اعظمؒ

پھر تو نے مجھ کو جذبۂ ایماں عطا کیا
تو نے ہمیں حیات کا ساماں عطا کیا
عزمِ جواں، ثباتِ فراواں عطا کیا
دستِ جنوں کو تارِ گریباں عطا کیا
پائے سکوں کو عشق کا میداں عطا کیا
ملت تھی دردمندِ غمِ روزگار سے
ملت کو تو نے درد کا درماں عطا کیا
افسانۂ حیات کا عنواں نہ تھا کوئی
افسانۂ حیات کو عنواں عطا کیا
کانٹے ترس رہے تھے سرِ رہگذارِ شوق
کانٹوں کو اعتبارِ گلستاں عطا کیا
مورانِ خاک باز کو تیری نگاہ نے
تختِ سبا و بختِ سلیماں عطا کیا
دریا کی تہ میں سوئی ہوئی تھی جو تھک کے موج
اس موج کو تبسمِ طوفاں عطا کیا
قطرے بھی چند جن کو میسر نہ تھے انھیں
سامانِ اہتمامِ خمستاں عطا کیا
پروانۂ نظر تھا اندھیرے میں سر بہ جیب
پروانۂ نظر کو چراغاں عطا کیا
مایوس ہو چکا تھا کرم تا بجیبِ کفر
پھر تو نے اس کو جذبۂ ایماں عطا کیا
تو کیا گیا کہ ظلمتیں ابھری ہیں دور دور تک
کچھ ڈوبتی ہوئی سی ہیں نبضیں حیات کی

ڈاکٹر کریم چودھری ایم۔ اے

نوائے وقت

اُردو کی کس مپرسی

حکومت کا اعلان ہے کہ اُردو پاکستان کی دفتری اور سرکاری زبان ہے۔ یہ اعلان صرف پنجاب کی صوبائی حکومت ہی کا نہیں مرکزی حکومت کا بھی یہی فیصلہ ہے مگر اعلان اور دعوے کی حیثیت میں عمل کچھ بھی نہیں۔ دو سال پہلے پنجاب میں اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی مگر اس کمیٹی کا ایک جلسہ بھی منعقد نہ ہو سکا چند ماہ ہوئے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ یہ کمیٹی دوبارہ قائم کی گئی مگر ہمیں معلوم نہیں کہ اس نئی کمیٹی کا بھی کوئی جلسہ ہوا یا نہیں بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی کمیٹی بھی ابھی تک پڑی سو رہی ہے۔ یہ صوبے کا حال ہے۔ مرکز کا حال اس سے بھی دلچسپ ہے وہاں سارا کاروبار انگریزی میں چل رہا ہے اور تعلیم کے محکمے کے باقی محکموں میں تو اس ڈگر پر چل رہا ہے گویا ابھی صدیوں پاکستان کی سرکاری زبان انگریزی ہی رہے گی۔ وزیرِ تعلیم آنریبل فضل الرحمان ہر دوسرے مہینے اُردو کی سرکاری حیثیت کے متعلق

...کئی اعلان فرما دیتے ہیں مگر کاغذی اعلانوں سے کیا فائدہ؟ جن منسٹروں کو ان اعلانات پر عمل کرنا ہے اُن میں سے اکثر تو اپنے بچوں سے بھی انگریزی ہی میں گفتگو فرماتے ہیں۔

ایک طرف یہ حال ہے دوسری طرف مرکزی حکومت میں مسٹر زاہد حسین ایسے زندہ دل بزرگ ہیں۔ زاہد حسین صاحب نے یہ دلچسپ تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان کی عام زبان اُردو کی بجائے عربی ہو جانی چاہیے۔ خدا جانے یہ بات انھوں نے کس جذبے کے ماتحت کہی ہے۔ ان کی نیت یقیناً نیک ہوگی مگر اسٹیٹ بنک کے گورنر کو حقائق سے ضرور آگاہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہاں بائیسکل کو رد ہے ہیں اور زاہد حسین صاحب یہ فرماتے ہیں کہ آپ کو رولز رائس میں سوار ہونا چاہیئے۔

حکومت کو چاہیئے کہ وہ اُردو سے اس مذاق کو ختم کرے۔ اور پوری سنجیدگی کے ساتھ وہ تمام اقدامات کیئے جائیں جو اُردو کو ملک کی دفتری اور سرکاری زبان بنانے کے لئے ضروری ہیں اردو کے حامیوں کا جن میں ہندوستان کے ہم بھی شامل ہیں دعویٰ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اردو ہندی کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے مگر جب عمل کا وقت آیا تو ہندی کے حامیوں نے دو سال کی مدت میں اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا مگر اُردو کے دوست ابھی تک کمیٹیوں ہی کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ہماری زبان (علی گڑھ)

اُردو کا مستقبل

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

اُردو جب کہ اب تک تعصب بلکہ عصبیت سے برسر پیکار ہے، اگر اب بھی اسی طرح رہی اور اُردو والوں نے اس کو سیاسی اور ملی محاذ سے دور رکھا تو عجب نہیں کہ حکومت (ہند) کو موجودہ قرار داد اور طرزِ عمل میں ترمیم کرنا پڑے اور قومی زبان کے بارے میں وہ اس فارمولا پر عمل کرنے پر مجبور ہو جو مہاتما گاندھی نے قرار دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے ہندو حضرات بھی تعداد میں کم نہیں جو اس سنسکرت آمیز ہندی سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔

سر عبدالقادر مرحوم

اُردو ادب کی تعمیر اور ترقی کا ایک بڑا نشان گر گیا۔ سر عبدالقادر مرحوم اُردو کے دورِ جدید کے معماروں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ شخصی حیثیت سے بھی وہ ہمارے کلچر اور اخلاق کی ایک بہت ہی دلنواز یادگار تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ملک کے ادبی رسائل میں لاہور کا رسالہ "مخزن" اُردو ادب کا سب سے بڑا علمدار سمجھا جاتا تھا، پھر رفتہ رفتہ خود شیخ صاحب کی شخصیت کلچرل اور ادبی حیثیت سے نمایاں ہونے لگی اور ان کی پختگی کا زمانہ تو وہ تھا کہ جہاں بیٹھ گئے بجائے خود ادب اور تہذیب کی ایک انجمن بن گئے۔ افسوس ہے کہ اب اس رنگ ڈھنگ کی شخصیتیں جو اپنے اندر ایک مخصوص کشش رکھتی تھیں تقریباً ناپید ہوتی جاتی ہیں۔ شیخ صاحب کی وفات بلاشبہ اردو ادب کی دنیا کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس سے بھی زیادہ ان کی وفات گویا انسانیت کی محفل میں قدیم تہذیب، اخلاق اور قدیم کلچر کی ایک روشن شمع کا گل ہو جانا ہے۔ "ہماری زبان"

ادبی دُنیا

میراجی اور ہندو دیومالا

(جمیل جالبی)

آخر میں ایک بات کا سمجھنا اور ضروری ہے جو میراجی کی شاعری میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ میراجی نے پرانے ہندوستان اور اس کی روایات کا کیوں سہارا لیا۔ میراجی نے ہندو مذہب کے قدیم اساطیر کو کیوں اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اور دوسرے مذہب کی روایات و اساطیر کو کیوں نظر انداز کیا۔ اگر میراجی کی زندگی اور ان کی شاعری کو پس منظر میں رکھ کر سوچا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہاں حسین کرشن تھے اور دلکش اور رومان انگیز گوپیاں، چھیڑ چھاڑ، آزادی سے ملاقات عشق اور محبت کی باتیں، نہ پابندی نہ روک ٹوک۔ غرضکہ جنسی آزادی کے تمام ذرائع موجود تھے۔ میراجی بھی اسی آزادی کے خواہاں تھے مگر یہ آزادی کہاں، اس لئے انھوں نے ماضی کی تاریخ سے ایک ایسا باب ڈھونڈ نکالا جس میں افسانویت، پُراسراریت کے علاوہ ذہنی تسکین اور جنسی و اعصابی ہیجان کی آسودگی کا بے حد سامان تھا اور انسانی تہذیب کی تاریخ میں صرف یہی دَور تھا جو ان کے خیالات کو تقویت پہنچا سکتا تھا۔ اب اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ میراجی نے سماج کی پابندیوں سے پیدا شدہ ردِعمل اور اثرات کو آسودہ کرنے کے لئے ایک ذہنی دُنیا بنائی اور اس ذہنی دُنیا کے سہارے کے لئے ہندو دیومالا کو اپنایا۔ ورنہ میراجی کو اگر کسی اور مذہب، تہذیب اور معاشرت میں بھی جنسی آسودگی کا سامان اور تاریخی واقعات میسر آجاتے تو وہ اس کا دامن پکڑنے سے کبھی گریز نہ کرتے۔

غرضکہ وہ لوگ جو میراجی کی شاعری سے صرف اس لئے پرہیز کرتے ہیں کہ وہ مبہم ہے، سمجھ سے بالاتر ہے تو میں بھی ان کو وہی جواب دوں گا جو پال ویلیرے نے ملارمے کی شاعری کے جواز میں دیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سہل انگار ہیں جو ایک کتاب سے مقابلہ کرنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ پڑھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ مصنف کے سے غور و فکر اور اشتیاق کے ساتھ تحمل، اطمینان اور توجہ سے پڑھیں وہ اسی وقت اسے سمجھ سکیں گے۔ میراجی کو پڑھتے وقت بھی بڑے تحمل اور غور کی ضرورت ہے۔

نگار

اسماعیل میرٹھی

(بسم اللہ بیگم)

مولوی اسماعیل نظیر کے بعد دوسرے سنگ میل ہیں۔ جن پر نظیر، آزاد، حالی، شبلی سب کا اثر ہے لیکن وہ نظیر سے قریب تر ہیں۔ جدید شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی، پُرانے بُت ٹوٹ چکے تھے یا ٹوٹ رہے تھے۔ لیکن نئے حرم کی بنیادیں آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھیں۔ اسمٰعیل نے اس وقت قدم رکھا کہ دیواریں بن چکی تھیں محرابیں جھکائی جانے والی تھیں۔ اسمٰعیل نے اپنا محراب کا نمونہ اس عمارت میں شامل کیا اور وہ اس وقت تک ہمارے سامنے نمونہ کی حیثیت میں موجود ہے۔ لیکن جو چیز انھیں حالی، آزاد، شبلی سے ممیز کر کے نظیر سے قریب تر لے آتی ہے وہ نصب العین کا فرق ہے۔ ان حضرات نے اخلاق و موعظت کو لیا اور شعریت ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ اسمٰعیل نے شعریت کو نہ چھوڑا۔ ان کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ موضوع، طرز ادا اور اسلوب مخاطب کی فہم کے مطابق ہو یہی وجہ ہے کہ ان کی حدیں نظیر کی حدوں سے ملتی ہیں۔ اسمٰعیل کی نظمیں زیادہ تر

بچوں کے لئے لکھی گئیں۔ اس لئے اس میں تخیل اور زبان کی سادگی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گائی جا سکتی ہیں۔ اسمٰعیل کے یہاں سادگی اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی ہے۔ یوں تو آزاد بھی سادگی کے دعویدار تھے لیکن ان کی لفظی نقاشی نے سادگی میں عیب پیدا کر دیا۔ حالی اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں لیکن ان کی سادگی خشک اور بے مزہ ہو جاتی ہے۔ نظیر کی سادگی ضرور اُن کے ہم پلہ ہے لیکن اب نظیر کے الفاظ نامانوس سے معلوم ہوتے ہیں اور اسمٰعیل کے الفاظ، بیان اور خیال میں یہ بات نہیں ہے۔ دوسری چیز اسمٰعیل کی نظموں کا تنوع ہے اور اس اعتبار سے ان کا کلام عوام کا ادب بننے کے لائق ہے۔ ان کے موضوعات عوام کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ اسلم کی بلی، ہماری گائے، پن چکی صبح کی آمد وغیرہ نظمیں براہِ راست ہمارے دل پر اثر کرتی ہیں۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی شخص ہمارے خیالات و جذبات کو شعر کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کر رہا ہے منظر نگاری میں شفق، رات، گرمی کا موسم اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ مقامی رنگ نظیر کے بعد اسمٰعیل میں بھی ملتا ہے۔ نظیر کے یہاں عمومیت ہے اور یہاں انفرادیت۔ نظیر کے یہاں طوالت ہے اور ان کے یہاں اجمال لیکن اگر نظیر سے اسمٰعیل پیچھے رہ جاتے ہیں تو صرف اس بات میں کہ ان کے یہاں جذباتی ہیجان کی کمی ہے اور کمی کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مخاطب بچے ہیں۔ وہ جزئیات پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

زو آئی ہے زور شور کرتی — دہانِ زمین کو کترتی
کس زور سے بہہ رہا ہے نالا — اونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا
بل کھا کے ندی نکل گئی ہے — رُخ اپنا ادھر بدل گئی ہے

بچوں کے تخاطب کی وجہ سے اصنافِ سخن میں سے انھوں نے زیادہ تر مثنوی کو انتخاب کیا ہے بحر کی سادگی، اختصار اور ردیف کے قافیے کی ڈھیلی گرفت کے باعث یہی صنف موزوں خیال کی گئی۔ عرصے تک اپنے خیال، جذبے اور تخیل کو انتظار کی کیفیت میں نہیں رکھ سکتے، خمس اور مسدس لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے۔ اگر مثنویت سے ہٹے بھی ہیں تو الفاظ کی موسیقیت اور ٹیپ کے مصرع کی تکرار سے اس کمی کو پورا کر لیا ہے۔ اس سلسلہ میں صبح کی آمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے
خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے
سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے

اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی
اِدھر سے اُدھر دوڑ کے آتی جاتی
دُموں کو ہلاتی پروں کو پھُلاتی
مری آمد آمد کے ہیں گیت گاتی

اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے
سو وہ نو لکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے
عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے

اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

نظم ان کی بہترین نظموں میں سے ہے۔

کلیم الدین صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسمٰعیل کی نظموں میں تازگی ہے معصومیت ہے اور باوجود قوافی کو نظر انداز کرنے کے ان کی نظموں میں ترنم اور موسیقیت ہے گویا نظیر کے بعد اگر کسی کی

ری کچھ نہ کچھ گیت کی تعریف میں آتی ہے تو وہ اسمٰعیل کی نظمیں

همایوں

اقبال اور نطشے

(صفیہ احمد)

بعض لوگ اقبال کے مردِ مومن کے تصور کو نطشے کے فوق البشر (superman) کے تصور سے ماخوذ سمجھتے ہیں مگر ان دونوں تصورات میں [illegible] فرق بنیادی ہے۔ اقبال کا مردِ مومن اخلاقِ فاضلہ کا [illegible] عمل [illegible] اعلیٰ اقدار کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کے برعکس نطشے کسی اخلاقی ضابطے کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک مصائبِ زندگی میں نکوکاری کا کوئی مصرف نہیں محض قوت درکار ہے جس سے کمزوروں پر غلبہ حاصل کر کے اقتدار پر قبضہ کیا جا سکے۔ اقبال کا مردِ مومن اگرچہ جدوجہد، محنت کوشی خطرات کے مقابلے اور مقاصد آفرینی سے اپنی خودی کی تکمیل کرتا ہے اور اس طرح عناصرِ قدرت پر قابو پاتا ہے لیکن اس کی تکمیلِ خودی کی جدوجہد اخلاقی قوانین و ضابطوں کی حد کے اندر [illegible] ہے۔ نطشے کا فوق البشر کسی انسان کی اخلاقی خوبیوں کو اس کی کمزوری پر محمول کرتا ہے۔ اقبال اور نطشے کے تصورات میں افتراق کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ نطشے خدا کے وجود کا منکر ہے (اور وہ کسی پیغمبر کی رسالت پر بھی ایمان نہیں رکھتا) نطشے کا خیال یہ تھا کہ انسانوں کی غلامانہ ذہنیت کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خدا کے تصور کو ان کے دلوں سے حرفِ غلط قرار دے کر محو نہ کر دیا جائے (نقلِ کفر کفر نباشد) وہ کہتا تھا: خدا مر گیا تاکہ فوق البشر زندہ رہے۔

گویا نطشے کا فوق البشر محض "لا" کا قائل ہے۔ اقبال کا مردِ مومن اس کے مقابلہ میں خیر البشر ہے اور وہ لا کے ساتھ الا کا بھی قائل ہے۔ ایمان و ایقان اس کی زندگی کا جوہر ہے۔ اسی ایمان کے بل بوتے پر وہ رزمِ حیات میں نصرت و کامرانی حاصل کرتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کے مردِ مومن کی ایک اور خصوصیت عمل کے اعجاز سے حیات کی تجدید کرنا ہے۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

خلّاقی اس کا جوہرِ طبعی ہوتا ہے۔ اس کی قوتِ فکر زندگی کے خوابِ پریشاں کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ خلّاقِ دوجہاں کا صحیح نائب ہوتا ہے اس لئے اس کی خلاقیت کی نیابت بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق و تسخیری قوت سے ہر اس طاقت کو مسخر کرتا ہے جس سے اس کا سامنا ہوتا ہے اور اس شیار کائنات میں زندگی کی نئی روح پھونک دیتا ہے

مردِ مومن کے اس حیات پرور شعار کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے زمین و آسمان کو بدل کر رکھ دے چنانچہ وہ حقائق کی نئی توجیہات کرتا ہے اور تاریخ کی تخلیقی رَو کو جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ جب اس میں "یقین" جلوہ گر ہوتا ہے تو وہ قابل و روح الامین پیدا کرنے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔ وہ جانِ عالم ہے۔ جمیع موجودات کا خلاصہ ہے۔ اقبال نے اس کی ہستی کو "سوارِ اشہبِ دوراں" اور "فروغِ دیدۂ امکاں" کہا ہے۔ اس کی ذات سے ایجاد و تسخیر کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ "دولتِ یقین" سے مالا مال ہونے کے بعد خدا کا خلیفہ ہونے کی حیثیت میں اپنی تخلیقی قوت کے لئے خدا کی خلاقی کے مقابلہ میں مساوی درجے کا دعویٰ بھی کرتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

یہی نہیں تخلیق کے معاملہ میں اس کا مقام اس سے بھی بلند تر ہے ؎

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

وہ ہر نئی کشاکش کے بعد ایک جہانِ تازہ پیدا کرتا ہے۔ اس کی بلند پروازی کا یہ عالم ہے کہ وہ سپہر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ؎

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی
صد جہاں می روید از کشتِ خیال ما چو گل
یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

مردِ مومن کے قلب میں سکون نہیں ہو سکتا۔ اس میں ہمہ وقت ایک ہیجان برپا رہتا ہے۔ اس کا خمیر شاید سیماب سے اٹھایا گیا ہے۔ وہ کسی شے کو بھی اپنی دسترس کی حد سے باہر نہیں سمجھتا ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معارف

پنجاب کا ننگِ اسلام کتب فروش

(شاہ معین الدین)

ہم کو معلوم ہوا کہ پنجاب کا کوئی خود غرض ناشر دارالمصنفین کی کتابوں کو چھپوا رہا ہے اور چند سکوں کے لئے ہندوستان کے اس اسلامی ادارے کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم سے بھارت کے اسلامی ادار[وں کو] جو نقصان پہنچا ہے اس سے دارالمصنفین بھی محفوظ نہیں چونکہ اسلامی علوم و فنون اور اردو زبان و ادب کا ادارہ ہے اور اس کی کتابیں انہی موضوعوں پر ہیں اس لئے ہندوستا[ن کی] تقسیم سے پہلے بھی ان کے خریدار قریب قریب کل مسلمان اور [illegible] علاقہ تھا۔ ہندوستان میں ان کی مانگ زیادہ تر دلی اور حیدرآباد میں تھی۔ اس لئے موجودہ انقلاب کا اثر دارالمصنفین کی تجارت پر بہت پڑا۔ حیدرآباد اور بھوپال سے تھوڑی بہت جو امداد [ملتی تھی] وہ چند دنوں کی مہمان ہے اور اب اس کا مدار بڑی حد تک پاکستان کی تجارت پر رہ گیا ہے، دونوں ملکوں کے درمیان سکہ کے اختلاف نے اور بھی مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن وہ عارضی ہیں اور یقین ہے کہ دیر سویر اس کا کوئی حل نکل آئے گا اور اس وقت بھی پاکستان [میں] کتابیں جا رہی ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر دارالمصنفین بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے جس کا تذکرہ ان صفحات میں کیا جا چکا ہے، ان حالات میں اگر پنجاب کے کسی ناشر نے اس کی کتابیں چھاپنا شروع کر دیں تو اس کی تجارت بالکل ختم ہو جائے گی اور اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ دوسری مملکت کی وجہ سے سرِدست اس کا قانونی تدارک مشکل ہے، گو انشاء اللہ اس کی کوئی نہ کوئی تدبیر کی جائے گی لیکن یہ ہم سے زیادہ اہلِ پاکستان کا فرض ہے کہ اگر وہ ہندوستان میں اسلامی آثار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو پاکستان اور پنجاب دونوں کی حکومتوں کو اس ننگِ اسلام و ننگِ انسانیت تاجر کو ایسی عبرتناک سزا دینی چاہئے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو۔

سائیکولوجی

کامیابی کے گُر

(از جوزف گرین)

• دوسروں کے کاندھوں کا بوجھ نہ بنیئے ـــــ خود اپنے بھروسے پر زندہ رہنا فیصلہ کرنا تاریکیوں سے مقابلہ کرنا سیکھیے۔

• بہت زیادہ تن آسانی نہ چاہیئے، اپنی ہر خواہش کو ... لانے میں عجلت نہ کیجئے۔

• حد سے زیادہ محتاط بننے کی کوشش نہ کیجئے۔

• کبھی یہ نہ سوچئے کہ زندگی بیکار ہے۔ چاہے آپ کو اس میں ... امید نظر آتی ہو۔ کیونکہ یہ عادت آپ کو ذرا ذرا سی رکاوٹ ... رہے گی۔

• ... دوسروں کو تنقیدی نظروں سے نہ دیکھیئے۔ اگر ان کے اعتراض بجا ہیں تو اپنی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کیجئے اگر وہ بیجا ہیں تو ہنس کر ٹال دیجئے کیونکہ ایسے رخنے تو پڑا ہی کرتے ہیں۔

• جس سے بھی آپ ملیں اس کی اچھائیوں کا اعتراف کر لیجئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی اچھائیوں کو بھی فراموش نہ کیجئے۔ اور کوشش کیجئے کہ وہ بھی آپ کی صلاحیتوں کا معترف بن جائے۔

• اپنی اچھائیوں کے اظہار کے بیجا مواقع تلاش نہ کیجئے۔ یہ نہ بھولئے کہ وہ خود بخود ظاہر ہوتی رہیں گی۔

• یاد رکھئے کہ دنیا انھیں لوگوں کو پسند کرتی ہے جو اپنی راہیں آپ پیدا کرتے ہیں ـــــ یعنی ـــــ دوسروں کی تقلید نہ کیجئے۔

• "خود رحمی" کی لذت کا شکار نہ بنئے اور نہ اس کی کوشش کیجئے کہ دوسرے آپ پر ترس کھائیں۔

• اپنے آپ سے کبھی جھوٹ نہ بولئے۔ اور نہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دیجئے۔

قومی زبان (کراچی)

سب سے زیادہ اہم مسئلہ

اُردو کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس کی اہمیت کا انکار پاکستان کے وجود سے انکار کے برابر ہے۔ قائدِ اعظم مرحوم نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو شخص اردو کے قومی زبان بنائے جانے سے انکار کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے لیکن اُردو کو وہ درجہ عطا کرنے کے لئے جس کی یہ مستحق ہے ہم نے اور ہماری حکومت نے اب تک کیا کیا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر پاکستان کے عوام یا حکومت سے پوچھا جائے تو اس کا کوئی جواب اطمینان بخش نہیں ملے گا۔ خود اربابِ حکومت اور زعمائے ملّت نے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اور اُردو کو جلد سے جلد ملکی اور دفتری زبان بنانے کے متعلق زور دیا ہے لیکن اس چیخ پکار سے کیا حاصل ہے جبکہ اس کے لئے کوئی عملی اقدام نہیں کیا جاتا۔ کم از کم اتنا تو ہوتا کہ انگریزی کے روز افزوں اقتدار کو گھٹا کر اردو کو ابھرنے کا موقع دیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ انگریز کا یہ بدترین ترکہ اب تک ہم پر اور ہماری حکومت پر بُری طرح مسلط ہے اور ہمارے حکام اور تعلیم یافتہ طبقہ کے سر پر ہر وقت بھوت کی طرح سوار ہے۔ ایسا کہنے والے بھی موجود ہیں کہ انگریزی یہاں سے پچاس سال تک تو نہیں جا سکتی اور ہماری صوبائی یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے تو

کم از کم پانچ سال تک اس کی عمر میں اضافہ کر ہی دیا ہے۔ ہمارے انگریزی معاصر نے اس اردو دشمنی اور انگلش نوازی پر جامعہ مذکور کے ارباب حل و عقد کو اس روش پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور محکمہ اور مرکزی حکومت کو اردو سے تغافل پر نہایت سختی سے ٹوکا ہے اگر اخبارات واقعی عوام کی آواز ہیں تو یہ آواز بھی بہرے کانوں سے ٹکرا کر "صدا بصحرا" ثابت ہو رہی ہے۔ ہمارے تو زعمائے ملت بھی اردو کی اہمیت پر بار بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ابھی گذشتہ مئی میں محترمہ فاطمہ جناح نے جو اُردو کی زبردست مؤید و حامی ہیں گجرات کے زنانہ کالج کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں پھر اُردو کے مسئلہ پر زور دیا ہے۔ آپ نے دوران تقریر میں فرمایا

> "اس وقت سب سے زیادہ اہم مسئلہ زبان کا ہے۔ جو بہت آسان ہوتے ہوئے بھی پیچیدہ اور مشکل بنا دیا گیا ہے۔ ہماری اپنی زبان اُردو ہونی چاہیئے جس کو تمام پاکستانی بہت آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن ہم انگریزی کو قابل فخر سمجھتے ہیں یہ غلامانہ ذہنیت کی وہ تلچھٹ ہے جس کا اثر ہماری قومیت کے لئے سم قاتل کے برابر ہوگا۔

اس سے زیادہ واضح اور پُر زور الفاظ میں اُردو کے مسئلہ پر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حقیقتِ اسلام

جاوید نامۂ اقبال اور مسلمان

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

چونکہ جاوید نامہ بدقسمتی سے فارسی میں ہے اور اکثر مقامات پر فلسفہ، مذہب اور تصوف کے حقائق و معارف بیان ہوئے ہیں۔ اس لئے ۱۲، ۱۳ سال گزر جانے کے بعد بھی یہ کتاب بیجانوے فی صدی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے "نقش سلیمانی" کا حکم رکھتی ہے۔ لہٰذا اس جگہ اس کا مختصر تعارف خلاف محل نہ ہوگا۔

یہ کتاب جسے ہم فارسی زبان میں بجا طور پر اقبالؒ کا شاہکار کہہ سکتے ہیں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی شاعری میں حقائق نگاری کے اعتبار سے مثنوی مولانا روم کو چھوڑ کر کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ساری انگریزی شاعری میں اگر کوئی کتاب اس کے پاسنگ قرار دی جا سکتی ہے تو وہ ملٹن کی مشہور "فردوس گم شدہ" ہے یا جرمن میں گوئٹے کی فاؤسٹ۔ اس پایہ کی کتاب کسی زندہ قوم مثلاً ہندوؤں میں شائع ہوئی ہوتی تو اب تک خدا معلوم کتنی زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہوتے اور کتنی شرحیں لکھی جا چکی ہوتیں۔ ناظرین خود دیکھ سکتے ہیں کہ جو قوم گیتانجلی کو آسمان پر چڑھا سکتی ہے اور اس کے مصنف کو نوبل پرائز کا مستحق بنا سکتی ہے وہ قوم جاوید نامہ کو بھگوت گیتا کا ہم پلہ قرار دے سکتی تھی۔

لیکن افسوس! اقبال اس قوم میں پیدا ہوا جو خدا، رسول اور قرآن کے بجائے زن، زر، زمین کی پرستار بن چکی ہے اور لذات دنیوی کے حصول کو مقصد زندگی قرار دے چکی ہے۔ بہ الفاظ دیگر نہایت سرعت کے ساتھ راہ فنا پر گامزن ہے یقیناً قوم کی اسی روش کو مدنظر رکھ کر اقبالؒ نے ۱۹۲۴ء میں اس تلخ صداقت کا اعلان کر دیا تھا۔

اوچمن زادے چمن پروردۂ من دمیدم از زمین مردۂ

یعنی بھلا میرا اور گوئٹے (Goethe) کا موازنہ! وہ چمن میں پیدا ہوا اور چمن میں پلا بڑھا۔ اب رہا میں، تو میں بیچارہ ایک مردہ قوم میں پیدا ہوا ہوں۔

تبرکاتِ مخزن

(منقول از "مخزن" فروری ۱۹۰۸ء)

پان

ایشیا کی مہمان نوازی کا پلہ یورپ سے ہمیشہ بھاری رہا ہے۔ یورپ میں اگر تواضعاً تمباکو اور چائے پیش کی جاتی ہے تو ایشیا میں علاوہ ان کے عطر اور پان بھی پیش کیا جاتا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اچھی چیزیں ہیں اور مفید۔

یوں تو عالمِ نباتات میں اچھے اچھے خوشنما پتے ہیں مگر جو فروغ پان کے پتے کو حاصل ہے اور کسی پتے کو حاصل نہیں سبز، مائل بزردی پتلا اور کرارا ایک دُنیا ہے کہ پان پر جان دیئے دیتی ہے۔ طب کی رُو سے دیکھیئے تو پان کو مقوی دل و دماغ و معدہ مصفیٔ خون مخرجِ رطوبات مانا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ ان امور کی تصدیق کرتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد لازمی طور پر گلے میں چکناہٹ رہ جاتی ہے جس کا دفعیہ کوئی خشک چیز کھانے سے بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کھانے کا مزا اور کچھ کچھ بقیہ زبان اور دانتوں میں ناگوار ہ جاتا ہے۔ ان کے لئے پان سے بہتر شاید ہی اور کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ پان کھانے سے منہ سُتھرا۔ دانت صاف طبیعت بشاش اور معدہ صحیح رہتا ہے مگر یہ کب جب پان سے جائز حدود کے اندر فائدہ اٹھایا جائے۔ ورنہ یہی پان عادتی کے باعث بجائے معدہ کو تقویت پہنچانے کے مضعفِ معدہ ہو جاتا ہے۔ دانتوں کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے اور صفائی سے غفلت کی جائے تو مسوڑوں، دانتوں کی چمک کو مٹا کر دانتوں کا ستیاناس کر دیتا ہے

یہ تھا طبی پہلو پان کے فوائد کا حُسن پرستی کی نظر سے دیکھئے تو پان میں اور بھی دل فریبی اور دل ربائی کی ادائیں موجود ملیں گی کسی حسین بالخصوص صبیح حسین کی بارتیب سفید براق بتیسی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر پان جو قیامت کے سامان پیدا کر دیتا ہے اس کا بیان الفاظ میں مشکل ہے۔ ذرا لبوں پر مسکراہٹ آئی اور ایسا معلوم ہوا گویا شفق میں بجلی کوند گئی۔

پان بنانے اور پیش کرنے کے بہت سے طریقے ہیں کہیں اس کی مثلث نما گلوریاں بنائی جاتی ہیں کہیں مستطیل کہیں مخروطی شکل کی۔ ان میں سے ہر ایک انداز بجائے خود قابلِ قدر ہے کسی سلیقہ شعار حسین کے نازک نازک ہاتھوں کی بنی ہوئی گلوریاں طشتری یا خاصدان میں رکھی ہوئی ملاحظہ کیجئے۔ معاً گلوری لے لینے کو جی نہ چاہے تو ہمارا ذمہ۔ ہندوستان کے خاص خاص رنگین شہروں میں پان اور پان کی فروخت سے وہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو یورپ میں ہوٹلوں کی مدارات سے۔

پان کے لوازم میں الائچی تو ایک معمولی بات ہے۔ زیادہ تکلف مقصود ہو تو کتھے کو عطر میں بسایا جاتا ہے۔ زعفران مشک اور تری ڈالی جاتی ہے اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ تکلف کا بنا ہوا پان نہایت مفرح ہوتا ہے۔

تبصرہ

اسلام اور ملکیت زمین

مؤلف: جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ

ناشر: وکیل الدیوان۔ ربوہ (جھنگ)

طباعت وکتابت بہتر، کاغذ عمدہ۔ جلد بندھی ہوئی سرورق خوشنما، رنگین تقطیع ۲۲×۱۸/۸ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک

آجکل جاگیرداری کا مسئلہ بحث کا ایک اہم موضوع بنا ہوا ہے اور زمینداری اور جاگیرداری کو جلد تر ختم کر دینے کی ایک عام رَو عوام کے دلوں میں موجزن ہے۔ یہ کتاب اسی بحث کے متعلق ہے جس میں جناب مصنف نے نہایت عالمانہ طور پر مگر بڑی سلاست کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا فرمایا ہے؟ صحابۂ عظام کا عمل کیا تھا؟ اور آئمہ کرام نے اس کو کس نظر سے دیکھا تھا؟ کتاب میں اپنی بات کو منوانے کے لئے غلط استدلالات اور دور از کار تاویلات سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ہر پہلو کو نہایت سادگی اور صفائی سے پیش کیا گیا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ الجھن اور اینچ پیچ سے بالکل پاک ہے ہر بات کی دلیل دی گئی ہے اور ہر دعوے کو قرآن کریم، حدیث شریف اور اقوالِ آئمہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ ایک خوبی اس میں یہ بھی ہے کہ ہر مسئلہ کے متعلق جس قدر اعتراض پیدا ہوتے ہیں ساتھ کے ساتھ ان کے تسلی بخش جوابات بھی دے دیئے گئے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک خشک مضمون ہے مگر باوجود اس کے کتاب دلچسپ ہے اور یہ مصنف کی انشا پردازی کا کمال ہے۔ کتاب کے اہم موضوع یہ ہیں: ملکیت اشیاء کے متعلق اسلام کے قوانین کیا ہیں؟ زمین کی ملکیت کو اسلام نے کن حدود میں تسلیم کیا ہے اور مالک کو کیا حقوق دیئے ہیں؟ اور یہ حقوق کن اصول کے ماتحت دیئے گئے ہیں؟ کیا جاگیرداری اسلام میں جائز ہے؟ اس کے متعلق اسلامی احکام کہ مملوکہ زمین خود کاشت کرنی چاہئے یا لگان پر بھی دی جا سکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا جواب کہ کیا حکومت کسی فرد واحد کی جائداد یا مال پر جبراً قبضہ کر سکتی ہے؟ آخر کے دو بابوں میں مسلم لیگ زمیندارہ کمیٹیوں کی بعض خامیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور زمینداروں کی موجودہ زبوں حالی کی اصلاح کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ اس طرح ۶۳ صفحات پر یہ مفید اور قابل مطالعہ کتاب ختم ہوئی ہے۔

کتاب کے ایک نقص کی طرف بھی ہم ناشر کو توجہ دلانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کتاب کھولتے ہی شروع میں "غلط نامہ" پر نظر پڑتی ہے جس سے صاحبِ ذوق قاری کے دل پر کتاب کی شان اور حیثیت کے متعلق کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔ اول تو کتاب میں غلطیاں ہونی ہی نہیں چاہئیں۔ اگر کاپیاں لکھی جانے کے وقت یا پروف پڑھنے کے دوران میں احتیاط اور غور کے ساتھ غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے تو کتاب کے چھپنے کے بعد غلط نامہ لگا کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ دراصل غلط نامہ لگانا اس ادبی جرم کا خود اقرار کرنا ہے کہ پروف ریڈر نے کاپیوں کی صحت کرنے میں تساہل ہوا ہے۔

محمد اسمٰعیل پانی پتی

دُور دراز ملکوں کا سفر
کے، ایل، ایم
کے ذریعہ چند گھنٹوں میں طے کیجیے
آپکو جب کبھی اور جہاں کہیں جانا ہو!
چاہیے یورپ، امریکہ، افریقہ، مغربی مجمع الجزائر، چاہے مشرق بعید یا دُنیا کے کسی اور بڑے شہر۔۔ کے۔ ایل۔ ایم کا ہوائی جہاز آپکو وہاں نہایت آرام کیساتھ بہت جلدی پہنچا دیگا۔ اس زمانے میں دُور دراز شہر بھی کے۔ ایل۔ ایم کے آرام دہ جہازوں میں سفر کرنے سے بالکل نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔
دورانِ پرواز میں لذیذ کھانے اور ناشتے کے۔ ایل۔ ایم کی طرف سے مُفت پیش کئے جاتے ہیں اور جی چاہے تو مزہ سے سونے کا بھی انتظام ہے۔
آپکو خواہ مغرب کی جانب جانا ہو یا مشرق کی جانب، کے۔ ایل۔ ایم سب سے بہتر ذریعہ ہے۔
تفصیلی معلومات اور نشست حاصل کرنے کیلئے اپنے سفری ایجنٹس سے ملئے یا پتہ ذیل پر تشریف لائیے۔
کے، ایل، ایم
رائل ڈچ ایئرلائینز
میکلوڈ روڈ۔ کراچی
KLM
ROYAL DUTCH
AIRLINES
اشتہار

فہرستِ مضامین

مخزن ماہانہ

دورِ سوم

جلد سوم از ماہ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۵۰ء

جنوری ۱۹۵۰

مخزن

صفحۂ اوّل

موجودہ اشاعت کے ساتھ مخزن کی تیسری جلد کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس لئے جلد بندی کے لئے جنوری تا جون کے کل پرچوں کی ایک مکمل فہرست اس مرتبہ بھی حسبِ سابق مخزن کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔

اس موقع پر میں ہندو پاکستان کے ان تمام احباب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد اور ہمت افزائی سے "مخزن" نے ڈیڑھ سال کے اس قلیل عرصے میں ادبی صحافت کی بزم میں پھر ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔

صالح اور صحت مند ادب کی اشاعت مخزن کے اجرا کی بنیادی اغراض میں سے ہے، اس زمانے میں اس کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ آزادیٔ وطن کے ساتھ ہی بعض غلامانہ ذہنیت کے روحانی بیماروں اور ازلی یاس پرستوں نے اپنے شعر اور افسانے میں نہایت زور شور سے اس قسم کا گمراہ کن پروپیگنڈا شروع کر دیا جس سے خیال ہوتا تھا کہ یاس و قنوط کی تبلیغ کے سوا ادیب اور ادیبوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ حالت تھی جب ایک خاموش عزم کے ساتھ مخزن نے اپنا کام شروع کیا۔ اب علم و ادب کی خدمت کے ساتھ اس کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اپنے مخصوص رنگ میں دشمنانِ وطن کے گمراہ کن پروپیگنڈا کا توڑ بھی کرتا رہے۔ مخزن نے اس سلسلے میں اہلِ وطن کی جو خدمت انجام دی وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس اشاعت کے لئے ہمیں حضرت تاثیر نے اپنی نظم "آزادیٔ وطن" عنایت فرمائی ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے ایک تاریخی نظم سمجھی جائے گی کہ اس میں تمام گمنام شاعر جو قنوطیت کے ہوا خواہوں نے اس گمراہانہ پروپیگنڈا کے بہت سے حوالے موجود ہیں جس کے ذریعے سے انھوں نے آزادیٔ وطن کے موقع پر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس تمام پروپیگنڈا کے بعد حضرت تاثیر کی یہ نظم، راقم کی رائے میں آزادیٔ وطن کے بدخواہوں کو اہلِ پاکستان کا آخری اور قطعی جواب ہے۔ اور "مخزن" بھی اپنے شاعر کا ہم زبان ہو کر کہتا ہے کہ:

یہاں ہم تو اتنا ہی سمجھا ہے خود امام اپنا ہے ۔۔۔ برا بھلا، جو ہے سب انتظام اپنا ہے

دور بھرہ رسیدہ ایم بہ آں منزلے کہ منزلِ ماست ۔۔۔ بآں کہ عزمِ بلند و نگاہ بیباک است

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ۔۔۔ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اس اشاعت کے تنقیدی مضمون میں سید فیاض محمود صاحب نے اقبال کی شاعری کا ایک نسبتاً بھولا بسرا رُخ پھر ہمیں دکھایا ہے۔ اس موضوع پر اور مضامین لکھنے کی ابھی گنجائش ہے۔ شاید سید صاحب خود ہی کچھ لکھیں یا ممکن ہے ان کا مضمون پڑھ کر کوئی اور صاحب ادھر متوجہ ہو جائیں۔

"بزمِ مخزن" میں اس مرتبہ ہم اپنے قدیم کرم فرماؤں میں سے سید علی اختر حیدر آبادی، جناب تابش صدیقی، حضرت سلام مچھلی شہری، حضرت فضا جالندھری اور جناب بشیر ساحر صاحب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ امین الرحمٰن صاحب ایک مدت کے بعد تشریف لائے ہیں۔ انھیں اب مصوری سے دلچسپی ہے نہ افسانے اور ڈرامے سے۔ ان کے تبدیلئ مذہب کچھ یوں ہے ع میں ان کے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں۔

مدیر

مخزن

آزادئ وطن:

خطاب بہ جوانانِ وطن

ڈاکٹر تاثیر،

جو راہبر تھے، وہ مانا کہ راہزن نکلے
مگر یہ رند بھی اربابِ مکر و فن نکلے

نئی شراب، نئے جام بیچنے والے
خمار خوردۂ مے خانۂ کہن نکلے

وہ "انقلاب" کے جلوے محلسراؤں میں
وہ ان کی شعلہ نوائی ـــــ گھنیری چھاؤں میں

قلندری کی نمائش پہ زورِ پیشِ عوام
رسومِ کج کلہی اپنی بارگاہوں میں !—

چمن کو دیکھ کے کہتے ہیں یہ بہار نہیں
یہ پھول پھول نہیں ہیں، یہ لالہ زار نہیں
مری نگاہ سے میرے چمن کو کیوں دیکھیں
انھیں تو اپنی نظر پر بھی اعتبار نہیں

سحر سے اِن کو گلہ ہے تجلیات نہیں
مگر سحر جو ہے آخر سحر ہے رات نہیں
لہو میں ڈوب کے نکلا ہے آفتاب اپنا
اُفق پہ داغ اگر ہیں تو کوئی بات نہیں

یہ کرگسوں کے بسیرے، ہجوم زاغ و زغن
وہیں پہ ہوں گے جہاں شاہباز ہوتے ہیں
ابھی تھی رات، ابھی نور کا ظہور ہوا

سحر کا وقت ہے، سائے دراز ہوتے ہیں!۔

وہی بہار وہی آب و گل سہی، لیکن
ہر اک نہالِ چمن بار ور نہیں ہوتا
ہزار پیچ ہیں موج و صدف کی منزل میں
ہر ایک قطرۂ نیساں گہر نہیں ہوتا

یہاں یہ دام بچھا ہے تو دام اپنا ہے
بُرا بھلا جو ہے، سب انتظام اپنا ہے
ہر اک روش کو بدل دو، بدل دو تم، لیکن
ہو آشیاں کہ قفس، یہ مقام اپنا ہے

رسیدہ ایم بآں منزلے کہ منزلِ ماست
بآں کہ عزم بلند و نگاہ بے باک است
گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است"

سید فیاض محمود

اقبال اور نوجوان

ذیل کا مقالہ سید فیاض محمود نے ۲۰۔ اپریل کی شام کو آر۔ پی۔ اے۔ ایف کالج کے طلبہ کی بزم ادب میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا تھا، اور ان کے مخاطب زیادہ تر نوجوان تھے۔ فیاض صاحب نے اپنے سامعین کو اقبال کی شاعری کے اس حصے کی طرف توجہ کرنے کی تلقین کی ہے جو محض شاعرانہ ہے معلمانہ نہیں۔ اور جس میں نوجوانوں کو خالص انسانی دلچسپی کا بہت سا سامان مل سکتا ہے۔ فیاض صاحب کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے کہ آجکل ہم اقبال کے ابتدائی کلام پر زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ ہم اقبال کو بہ حیثیت شاعر کے کم اور بہ حیثیت معلم کے زیادہ جانتے ہیں۔ اس صورت حال میں فاضل نقاد کا ہماری توجہ کو شاعر کی شخصیت کے ایک بھولے بسرے پہلو کی طرف منعطف کرنا ایک بڑی خدمت ہے۔ یقیناً ہمیں اقبال کے قدیم کلام کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر ہم اقبال کو بطور ایک خالص شاعر کے بھول چکے ہیں تو یہ خود اقبال کے بھی منشا کے مطابق ہے۔ آخر میں خود انھوں نے بہت واضح طور سے کہہ دیا تھا کہ میں ادیب یا شاعر نہیں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ شعر کے حیلے سے اپنی بھٹکی ہوئی قوم کو راہ راست پر لاؤں ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

مدیر

اقبال کی شاعری، ان کے فلسفۂ حیات اور ان کے پیغام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہی موضوعات پبلک میں مقبول بھی ہوئے مگر ان تینوں میں سے ان کی شاعری پر نسبتہً کم توجہ کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ہم لوگوں نے ان سے محض "سبق" حاصل کرنے کا سامان لیا ہے۔ ہر موضوع پر ان سے استصواب کیا جاتا ہے اور ہر موقع پر ان کے اشعار تبرک یا سند کے طور پر پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سے ہم لوگوں کو فائدہ بہت ہوا ہے مگر جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وہ رفتہ رفتہ اقبالیات یعنی مطالعۂ اقبال سے غائب ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ علامہ مرحوم کی شخصیت ایسی جامع تھی کہ انھوں نے اپنی طویل زندگی میں بہت سے مسائل سے دلچسپی ظاہر کی اور طبیعت میں آمد بلا کی تھی اس لئے ہر موضوع پر شعر موزوں ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے کلام میں جو زیادہ تر ضرب کلیم اور ارمغان حجاز میں جمع ہے شعریت کم اور پند و نصائح کا عنصر زیادہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جو کچھ اقبال کے قلم سے نکلا اس میں "جذب و مستی" اور شدتِ احساس اس درجے کی ہے کہ ٹھوس سے ٹھوس مضمون کے ادا کرنے میں بھی ایک خاص روانی پائی جاتی ہے جو طبیعت میں ایک ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

میں اس مضمون میں اقبال کے ایک غیر معروف اور عرفِ عام میں غیر ضروری پہلو سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خطاب زیادہ تر ان

حضرات سے ہے۔ اسی لئے میں نے اقبال کے فارسی کلام سے رجوع نہیں کیا۔ اُردو میں بھی وہ وہ ذخیرہ موجود ہیں جن کی مثال دنیا
بمشکل سے ملے گی۔ فارسی کلام میں انھوں نے اپنے فلسفہ خودی، مفہوم عشق، عقل و خرد، ابلیس اور تخلیق، حیات اور ممات پر زیادہ زور
ڈالی ہے۔ مگر اردو کے دواوین میں بھی ان سب موضوعات کے متعلق بہت کچھ مواد موجود ہے۔ لہٰذا میں یہ ضروری بھی نہیں سمجھتا کہ
کی شاعری پر بحث کرتے وقت ہم ان کے فارسی اشعار لازماً پیش کریں۔

یہ مضمون میں نے اس لئے بھی منتخب کیا کہ میرے سننے والے نوجوان لوگ ہیں۔ جن کا ذہن ابھی ان دقیق مسائل کی طرف مائل
نہیں ہوا۔ اور شاید جنھیں سمجھنے کے لئے ابھی ان میں کوئی جستجو بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے لئے ابھی بہت وقت ہے اور اگر آپ
سے وہ سمجھنا بھی چاہیں تو بہ قدر شوق وہ یہ شغل بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی ممانعت نہیں۔ مگر چونکہ مجھ پر بھی شباب کا دور گزر چکا ہے
ابھی تک ان احساسات کو بھولا نہیں اور نہ میں ان کی ناقدری ہی کرنا چاہتا ہوں، اس لئے حال میں "بانگِ درا" کا مطالعہ کر
مجھے خیال آیا کہ جب یہ کتاب چھپی تھی میں فرسٹ ایر میں تھا۔ اُن دنوں مجھ پر اقبال پڑھتے وقت ایک کیف طاری ہو جاتا تھا اور چونکہ
تک بالِ جبریل اور ضربِ کلیم وغیرہ نہیں چھپی تھیں ہم بانگِ درا ہی کو آسمانی برکت سمجھ کر چھاتی سے لگائے پھرتے تھے۔ اس سے
اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں وہ جوہر موجود ہو گا جو نوجوانوں کو پسند آئے۔ یہ خیال اس لئے بھی دماغ میں پختہ ہوتا گیا کہ گزشتہ برس
میں جب کبھی اقبال کا ذکر ہوا، اور سیکڑوں دفعہ ہوا ہو گا احباب کو میں نے بانگِ درا کو نظر انداز ہی کرتے پایا۔ میرے اس خیال کو اس
بات سے اور تقویت ہوئی کہ "آہنگ" کی تازہ اشاعت میں پہلے ہی صفحہ پر کسی صاحب کا خط چھپا ہے جس میں وہ ایڈیٹر سے درخواست
ہیں کہ بالِ جبریل کے علاوہ اور کتابوں سے بھی رجوع کیجئے۔ ظاہر ہوا کہ ریڈیائی دنیا اور موسیقاری فضا میں بھی بالِ جبریل کی غزلوں یا
سے زیادہ سروکار رکھا گیا ہے۔ یہ کیوں؟

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بالِ جبریل میں اقبال اپنی تمام پختگی اور جذب و مستی بلکہ وجد اور کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اور اس کے
بس ما بانگِ درا کو ہم خام سمجھنے پر مجبور سے ہو گئے ہیں۔ ضربِ کلیم میں ایک تو تکرار زیادہ ہے۔ دوسرے اس کے اشعار میں وہ ذوق و شوق یا وہ
پن نہیں جو بالِ جبریل کا طغرائے امتیاز ہے۔ مگر ہم لوگ اقبال کی جادو نگاری سے فریب کھا کر یہ بھول جاتے ہیں کہ بانگِ درا میں اقبال
کی شخصیت زیادہ نمایاں ہے۔ کیونکہ یہ وہ دن تھے جب انھوں نے عبائے سرداری پہنی تھی اور نہ قلندر کی گدڑی۔ ارمغانِ حجاز تک پہنچتے
وہ دانائے راز بن چکے تھے۔ مگر بانگِ درا کے زمانے تک ان میں عام انسانوں کے تمام فضائل موجود تھے۔ مثلاً کہیں زاہد سے چھیڑ
چھاڑ ہے۔ یعنی ؎

تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں اس کو — رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

کہیں واعظ سے الجھتے ہیں ؎

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں — لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے!

عشق نہ حقیقی ہے نہ مجازی، نہ وہ عقل کی ضد ہے نہ وہ محض خودی کے حصول کا آلہ۔ کہتے ہیں ؎

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر　　ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

یا ؎

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ہم نشیں　　پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

عشق ابھی ایک ذوقِ تپش ہے، ابھی، اس میں عملی کے آثار پیدا نہیں ہوئے، فرماتے ہیں ؎

عشق نے کر دیا مجھے ذوقِ تپش سے آشنا　　بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز ہے

بعد میں عشق کا پرتو بدل جاتا ہے عشق کو رازِ کائنات سے تعبیر کرتے ہیں مثلاً مسجدِ قرطبہ میں عشق کی تعریف یوں کی ہے ؎

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ　　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اس سے آگے اگرچہ اور کچھ بھی لکھنے کی گنجائش نہیں مگر دو ایک مثالیں اور بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اسی نظم میں آگے فرمایا ہے ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق ہے نورِ حیات عشق ہے نارِ حیات

ایک قطعہ میں لکھا ہے ؎

جمالِ عشق و مستی نے نوازی　　جلالِ عشق و مستی بے نیازی

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر　　زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اب بتائیے یہ عشق کیا چیز ہے، کیونکہ فرماتے ہیں ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

یا پھر ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ ایک معمہ سا ہے جسے عشق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے کہ محققین کو اس کا جواب ان کے کلام کے مطالعے سے مل جائے گا مگر میرا مطلب فقط یہ ہے کہ بعد میں ان کے ہاں عشق کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ اور عشق سے مراد خواہ وہ زندگی کی روحِ [illegible] لیں یا تخلیقِ ارتقا کا اصول، خواہ وہ اس سے رمزِ کائنات کا تصور پیش کریں یا اسے عقل کی ضد قرار دے کر اسے اصلِ ایمان میں سمو دیں، ظاہر ہے کہ عشق سے مراد اب وہ جذبہ نہیں جو ہم جیسے خاکیوں کے نصیب میں آتا ہے۔ اقبال کے عشق کو سمجھنے اور اس سے متمتع ہونے کے لئے خاص قسم کا ذہن چاہئے۔ اور خاص قسم کا شوق! ورنہ ہم میں سے اکثر لوگوں کے لئے اقبال کی شاعری افیون بن کر رہ جاتی ہے۔ جب سن لیتے ہیں تو واہ واہ کا شور مچ جاتا ہے اور ہم پر نشہ بھی طاری ہو جاتا ہے مگر جب سرور اترا تو سب ختم!

اب آپ ایک اور نکتے پر غور کیجئے۔ ہم نے یہ بات مسلمہ طور پر مان لی ہے کہ انسان کے ذہن کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے ماہروں نے قوم کی قوم کا ذہنی تجزیہ کر کے ان کو مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ فارسی شعر زبان زدِ عام ہے ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد　　خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

ہم لوگ بھی کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں جس کو ہم نصیب کہتے ہیں وہ اسی احساس کی خارجی شکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسی احساس کو ہم قدرت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ دراصل ہم جانتے ہیں کہ ہم سب کی اہلیت برابر نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ خود قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے "ہم نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی۔ ایک ہی کنبہ میں کوئی ذہین ہوتا ہے کوئی غبی، کسی میں موسیقی سمجھنے کی قابلیت ہوتی ہے اور کوئی پکے راگ کو مینڈک کے ٹرّانے کے برابر سمجھتا ہے۔ ہم افسر انتخاب کرتے وقت علیحدہ علیحدہ نفسیاتی قسم کے امتحان لیتے ہیں۔ اور عام ہوا بازوں کے انتخاب میں اور قسم کا۔ سول سروسوں کے علیحدہ امتحان ہیں اور کلرکوں کے مختلف! اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہم سب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے ہم سب کو جدا جدا قسم کے ذہن عطا ہوتے ہیں، جدا طبیعتیں، و مختلف ماحول۔ جب انسانی فصل یک کھیت پیدا ہوتی ہے تو ظاہر ہے کوئی جو بن کر نکلتا ہے کوئی چنا۔ سب کی مختلف قابلیتیں اور مختلف دلچسپیاں۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ عشق جو مفہوم اقبال کے بعد کے کلام میں موجود ہے۔ اور جو مبہم ہونے کے باعث عام لوگوں کے ادراک سے بالاتر ہے۔ اسے سب لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جائے۔ اور یہ منوایا جائے کہ یا تو اقبال کا فلسفۂ خودی اور نظریۂ عشق و عقل سمجھو یا اسے پڑھو ہی نہیں اور اگر تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے یا کم از کم اس کے متعلق جھوٹ سچ کچھ نہیں بول سکتے تو تمھیں اقبال پڑھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا کوئی حق نہیں۔

آپ میں سے بعض شاید یہ کہیں کہ آپ کو اقبال کے کمتر خیالات کی تعریف کرنے سے کون روکتا ہے، اگر آپ چین عرب ہمارا گانا چاہیں تو بصد شوق گائیے۔ اور اگر آپ ع آتا ہے یاد مجھ کو بچپن کا وہ زمانہ ہی پڑھنا پسند کریں تو یہ آپ کی مرضی! یہ درست ہے مگر اس سے کج بحثی کا پہلو نکلتا ہے اور میں آپ کے سامنے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہوں۔ مذکورۂ بالا بحث سے میری مراد فقط یہ ہے کہ انسان میں لکیر کا فقیر بننے کی خاصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ جو بات نو آدمی کہیں گے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح دسواں شخص بھی وہی بات کہنے لگ جائیگا۔ بیس سال سے میں دیکھتا آیا ہوں کہ اقبال کو ہم شاعر مشرق، حکیم مشرق، درویشِ باصفا کہنے کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص یہ جرأت نہیں کرتا کہ اقبال کی شخصیت کے بارے میں کچھ تحقیق کی جائے۔ ابھی وقت ہے کہ ان کے احباب، ملاقاتیوں اور معاصرین کی مدد سے وہ قیمتی مواد جمع کیا جائے جو آئندہ نسلوں کی توجہ اور دلچسپی کا موجب ہوگا۔ مگر ہم لوگ ابھی سے ان کو ایسی چوٹی پر بٹھا چکے ہیں کہ ان کے اصلی خد و خال دھندلے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی حال ان کی شاعری کا ہو رہا ہے۔ ان کی شاعری سے ہم وہی برتاؤ کر رہے ہیں جو ہم نے اپنی مقدس کتابوں سے کیا ہے یعنی ان کو سمجھنے کے بجائے انھیں پوجنے لگے ہیں اور ذریعۂ تعلیم اور وسیلۂ تسکینِ روحانی بنانے کے بجائے محض انھیں ذریعۂ ثواب بنا کر ان سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اب اقبال کے فلسفہ سے واقف ہونا ہمارا ادبی ایمان ہو گیا ہے اور شاعر کا وہ پہلو جس سے قلبِ انسانی کی تفریح بتسکین، تزئین ہوتی ہے ہم نے قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔

اقبال اب عوام کے شاعر نہیں رہے اب وہ خواص کی ملکیت بنتے جا رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں خاصۂ خاصان کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا جائے گا، اس کے بعد شاید وہ تعویذ بن کر رہ جائیں۔ یہ نہ ہو تو بھی اقبال سے یہ سخت ظلم ہے کہ عوام کو ان سے بیگانہ رکھا جائے اور نوجوانوں سے جو ان کا خطاب ہے یا جوانی کے دلچسپ موضوعات پر جہاں کہیں انھوں نے کچھ کہا ہے اسے حقیر جان کر اس سے منہ پھیر لیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں کیا کچھ پیش کر سکتا ہوں اس کا جواب میں ابھی عرض کرتا ہوں اور ان طویل جملہ ہائے معترضہ کے بعد پھر عشق جیسے دل نواز موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ بانگِ درا میں اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے ہاں عرصے سے قائم اور رائج ہے۔

یہاں گنجائش ہوتی تو فارسی کے چند اشعار کی مدد سے میں آپ پر واضح کر سکتا تھا کہ عشق سے بوالہوسی ہمارے ہاں کبھی مراد نہیں لی گئی۔ غالب کے
عشق کا وہی بلند مفہوم موجود ہے جو آپ کو دنیا کے بہترین شعراء میں مل سکے گا۔ کہا ہے ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال   تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

پھر کہا ہے ؎

نقشِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا   گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

یہاں نقشِ قیس یعنی جذبۂ عشق کو صحرا یعنی دنیا کے لئے باعثِ رونق قرار دیا ہے۔ عاشق کی ذات سے، اس کے عشق کی ضو سے دنیا کی زینت
۔ اس سے بھی بڑھ کر عشق کی یہ تصویر ہے ؎

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر   کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

کائنات کا زیر و بم بھی عشق ہی کا پرتو ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو چشم و چراغِ صحرا ہے اور انسان کی تپش سے ہی اس کرۂ ارض پر زندگی اپنے
تمام ممکنات کے ساتھ جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ اقبال بھی اول اول عشق سے یہی یا اسی قسم کا مفہوم لیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا   بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

وہ عشق جس کی وجہ سے شباب کی تازگی اور زندگی کا شوق دل میں پیدا ہوتا ہے اس کی مثال اقبال کی نظم حسن و عشق سے بہتر آپ کو ملنا
مشکل ہے۔ وہ عشق جو آدمی کو فنا فی المطلوب ہونا سکھاتا ہے۔ اور جو عشقِ مجازی کی انتہا ہے۔ اس نظم کے پہلے بند میں اس خوبصورتی سے ادا
ہے کہ اقبال کے ہاں بھی اس کی مثال کم ملے گی۔ ملاحظہ ہو ؎

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر   نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل   چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم   موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

عشق سے قطعِ نظر اقبال کے ہاں اسی مقبول اندازِ نظر کو دیکھئے جو بعد میں ایسے مشہور اشعار میں رونما ہوا ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر   ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

یعنی زندگی کے مسائل اور اصلِ حیات سے بحث، کائنات کے چلن اور احکامِ خداوندی سے آویزش! اس مضمون کے پہلے اظہار میں جو
شش ہے وہ اب بھی اسی طرح موجود ہے۔ آپ شکوہ ہی کو لیجئے۔ شکوہ جوانانِ امت کی پکار ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ پکار درست ہے یا نہیں،
روا ہے یا ناجائز۔ جوانوں کو پکار کی خواہش ہوتی ہے اور عادت! وہ اپنی کمزوریوں کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دینا بہتر سمجھتے ہیں۔ انھیں فقط اپنی تکلیف
اور ماندگی، اپنی شکست، اپنی بےبضاعتی اور مجبوری سے سروکار ہوتا ہے، اگر بس میں ہو تو وہ اپنی کمند آسمان پر پھینکنے سے بھی نہیں چوکتے۔
ان کی ہمت کی دلیل ہے۔ یہی ان کی جرأت کا ثبوت! آپ مسدس حالی پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ وہ ایک مظلوم اور مغلوب کی فریاد ہے۔ وہ

ہماری بے بسی کا اعتراف ہے۔ شکوہ میں اقبال نے اسی حالت کا ذکر کیا ہے۔ مگر اپنی اولوالعزمی اپنی جسارت اور اپنی پامردی کا حوالہ دے کر جسے پڑھنے سے ہر مسلمان بچے کا دل جوشِ نمو سے دھڑکنے لگتا ہے۔ ہر لڑکا اپنے باپ دادا کے قوانین سے الجھتا ہے۔ اس بچے کی اٹھان ہی ٹھیک طرح نہیں ہوئی جس کے دل میں بغاوت کا جذبہ لئے ہوئے نہ ہو۔ شکوہ بھی اسی قسم کی بغاوت کا اظہار ہے! جوابِ شکوہ ایک بوڑھے باپ کی فہمائش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ نوجوان نصیحت سننا پسند نہیں کرتے خواہ وہ ان کے لئے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ چنانچہ شکوہ میں جو جوش موجود ہے جوابِ شکوہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی موجود نہیں۔

اور نظموں کو لیجئے۔ مثلاً نوجوان ایسی نصیحتوں کو سننا پسند کرتے ہیں ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری		وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

انھیں اس قسم کی للکار مرغوبِ خاطر ہوتی ہے ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر		بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

عقل اور عشق کی وہ دائمی ضد جو انھوں نے بعد میں پیش کی ہے اور جو اکثر جگہ مبہم ہو کر رہ گئی ہے اول اول ایسے اشعار میں پیش کیا گیا تھا اور یہ اشعار دل میں فوراً اتر جاتے ؎

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے		اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

یا

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق		عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور Know thyself یعنی اپنی حقیقت پہچانو اور Realise thyself یعنی اپنی قوتوں کو اجاگر کرو کی تلقین جو بعد میں خودی کی ممکنات میں تبدیل ہو گئی ابھی تک عام فہم ہے اور نوجوانوں اور عوام کی پہنچ کے دائرے میں ہے۔

شمع و شاعر میں کہتے ہیں ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا		دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا		ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

پھر کہا ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو		قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ		تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی مضمون جو شمع و شاعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا		ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

خضرِ راہ میں ان پُر شوکت الفاظ میں ادا ہوتا ہے ؎

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول		غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

اور طلوعِ اسلام کا یہ بند نوجوانوں کے لئے ایک ایسا خوش آیند پیغام ہے جس کی مثال اقبال کے ہاں بھی نہیں مل سکتی ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

اور پھر ؎ تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے کلام میں جو نزاکتیں بھی پائی گئی ہیں وہ ان کے پہلے کلام میں بھی موجود ہے بلکہ ان کے پہلے اظہار میں سادگی اور دلکشی دونوں موجود ہیں اور وہ جوش اور جذبہ جو اقبال کے کلام کا خاص جوہر ہے اس آسان فہم کلام میں بھی اسی طرح کارفرما ہے مگر ہاں ان کا خطاب نوجوانانِ ملت سے ہے اور ان الفاظ میں ایک ایسی تڑپ ہے جو ہمیں خود اپنی جوانی کے ایام میں گرما دیا کرتی تھی۔ اقبال کو نہ ہم شاعر کی حیثیت سے سمجھنا اور پڑھنا بھول گئے اور انھیں ہم نے فلسفی قرار دے دیا تو یہ ہمارے ذہن کی پستی ہوگی اور ہمارے لئے نقصان دہ۔ باقی رہا اقبال کا درویشانہ مسلک اور قلندری اور استغنا پر اصرار تو وہ بھی پہلے ہی سے موجود ہے اور ایسی زبان میں جسے عوام اور نوجوان سمجھ سکیں ؎

دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی — غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

اور پھر ؎ تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

آخر میں مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کی تنقیص نہیں بلکہ میں خود اب بالِ جبریل کو زیادہ پڑھتا ہوں مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کتاب کا خطاب اُس نوجوان سے نہیں جس سے اقبال بانگِ درا میں مخاطب ہوتے تھے اور بعض اوقات میں نے ایک خاص لذت کی کمی بھی محسوس کی ہے۔ آجکل جو اقبال کے "پختہ" کلام پر اتنا زور دیا جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ کسی زمانے میں بانگِ درا بھی تو جنوں پر ورد ہوا کرتی تھی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ اوراق کو الٹا تو محسوس ہوا کہ وہاں اقبال براہِ راست نوجوانوں سے مخاطب ہوتے تھے اسی لئے پہلے کلام میں صراحت اور تازگی زیادہ ہے، لطف یہ ہے کہ گہرائی کی کمی بھی نہیں۔ (سید فیاض محمود)

مُعاونینِ کرام

مضامین کی رسید حاصل کرنے کی غرض سے یا مدیرِ "مخزن" سے دیگر استفسارات کا جواب حاصل کرنے کے لئے خط کے ساتھ ایک لفافہ اپنا پورا پتہ لکھ کر براہِ کرم ضرور ملفوف کیجئے۔ اس مقصد کے لئے اپنا پتا لکھ کر حسبِ موقع جوابی کارڈ بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ پتا لکھنا بہرحال ضروری ہے۔

(مخزن)

حضرت علی اختر حیدرآبادی

انوار

آزاد کہ ہوں اسیر، بک جاتے ہیں ۔۔۔ نادار کہ ہوں امیر، بک جاتے ہیں
اللہ بچائے ہوسِ زر تجھ سے ۔۔۔ کیا دین و دل ضمیر بک جاتے ہیں

ہر چند کہ مٹھی میں ہوائیں ہیں اسیر ۔۔۔ ہے پیشِ نظر شمس و قمر کی تسخیر
دنیا کو بنانے کے جنوں میں لیکن ۔۔۔ انساں نے بھلادی ہے خود اپنی تعمیر

دن زحمت و آلام کے ڈھل جاتے ہیں ۔۔۔ بل گیسوئے دوراں کے نکل جاتے ہیں!
ایسی بھی تو چلتی ہے گلستاں میں ہوا ۔۔۔ کانٹے گل و ریحاں میں بدل جاتے ہیں!

بیدار اگر دل میں رہے حسن عمل ۔۔۔ سینہ ہے اگر صاف تو کیسی ہل چل
موجیں، جو سفینوں کو ڈبو دیتی ہیں ۔۔۔ اُن موجوں کے آغوش میں کھلتا ہے کنول

حضرت جلال الدین اکبر

غزل

کیا ستم تو نے لطفِ یار کیا
دل کو بیتاب و بے قرار کیا

ہائے وہ لذّتِ سزا ہم نے
جرمِ الفت ہزار بار کیا

سُن نہ سکتے تھے میرا حال اگر
کیوں نگاہوں کو لطف بار کیا

ایک آنسو میں کہہ دیا غمِ دل
کس قدر ہم نے اختصار کیا

اس کے انکارِ نازپرور نے
وصل کا عہد استوار کیا

بےکسی میں غمِ محبّت کا
دشمنوں ہی کو رازدار کیا

کچھ نہ بن آئی جانِ مضطر سے
جبر پر صبر اختیار کیا

آج کیوں نازنے تمنّا سے
سخنِ تلخ و ناگوار کیا

سخنِ میر نے مجھے اکبر
بے نیازِ مے و نگار کیا

پروفیسر محمد شمس الدین صدیقی
(ایم اے (عثمانیہ)

جل تو جلال تو!

(ایک ایکٹ کا مضحک طربیہ)

افراد

حبیب .. .. .. حسینہ کا چچا زاد بھائی

نیاز .. .. .. حسینہ کا ماموں زاد بھائی

نسیمہ .. .. .. حسینہ کی ماں

ثمن .. .. .. حسینہ کی کم سن بہن

مقام نسیمہ کا مکان .. .. زمانۂ حال

وقت .. سہ پہر

(متوسط گھرانے کے ایک مکان کا نیم آراستہ کمرہ نسیمہ ایک کرسی پر بیٹھی ہے حبیب دوسری پر۔ نسیمہ کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی، بھاری بھرکم جسم اور شوخ رنگ کا لباس۔ حبیب کوئی ۲۵۔۲۶ سال کا نوجوان جو صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اس کے سامنے ایک تپائی پر کچھ پھل رکھے ہوئے ہیں)

نسیمہ:- لو، حبیب میاں، کچھ پھل تو چکھو۔ چائے ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہے۔

حبیب:- چچی جان آپ نے خواہ مخواہ یہ تکلف کیا۔

نسیمہ:- اس میں تکلف کیا ہے۔ پھل تو گھر میں موجود ہی تھے اور چائے روزانہ بنتی ہی ہے۔

حبیب:- آپ تو مجھے بالکل غیر سمجھ رہی ہیں، گویا میں بھی کوئی مہمان ہوں جس کی تواضع ضروری ہے۔ مجھے اس وقت ذرا جلدی ہے، فرمائیے کس لئے یاد فرمایا؟

نسیمہ:- وہ تو تمہیں معلوم ہو ہی جائیگا۔ یہ لو پہلے کیلا کھاؤ اور ہاں یہ سیب لو، اچھا ہے۔

حبیب:- (لیتے ہوئے) شکریہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اب سیدھے یہاں سے ایک ٹی پارٹی میں جانا ہے اس لئے میں اپنے پیٹ میں کچھ جگہ رکھنا چاہتا ہوں۔

نسیمہ:- تو کیا تمہارا پیٹ بھی کوئی چڑیا کا پیٹ ہے کہ اتنی جلدی بھر گیا؟ لو اور لو، تکلف نہ کرو۔

حبیب:- جی، اب معاف کیجئے بہت کافی ہے میں کوئی تکلف نہیں کر رہا ہوں بلکہ واقعی اب اور گنجائش نہیں ہے۔ ٹی پارٹی کا بھی تو خیال رکھنا ہے، فرمائیے، کس لئے یاد کیا؟ میں کیا

ست کر سکتا ہوں ؟

نسیمہ :۔ بات دراصل یہ ہے حبیب میاں کہ گزشتہ دو
ماہ سے مجھے حسینہ کی شادی کی فکر گھلا رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔

حبیب :۔ (استفہامیہ اور سہمے ہوئے انداز میں) جی کیا
آپ نے ؟ حسینہ کی شادی ؟

نسیمہ :۔ ہاں، اب وہ ماشاء اللہ سیانی ہوگئی ہے
کی شادی تو کرنا ہی ہے نا !

حبیب :۔ جی ہاں، اس میں کیا شک ہے، ٹھیک بات
ہے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

نسیمہ :۔ لیکن کیا ؟ اور میں اس فرض سے جلد از جلد
سبک دوش ہوجانا چاہتی ہوں۔

حبیب :۔ میں آپ کا مطلب خوب سمجھ گیا لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

نسیمہ :۔ اب یہ لیکن ویکن چھوڑو، میں کوئی ٹال مٹول سننا
نہیں چاہتی۔

حبیب :۔ لیکن اس کے لئے مجھے کچھ وقت بھی تو دیجئے ،
سوچنے سمجھنے اور دیکھنے بھالنے کا موقع بھی تو دیجئے ۔

نسیمہ :۔ وہ تو ظاہر ہے میں اپنی بیٹی کو کنوئیں میں تو دھکیلنا
نہیں چاہتی۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر ہی بر کا انتخاب کرنا ہوگا۔

حبیب :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اچھا تو گویا بر کی تلاش
کرنا ہے؟

نسیمہ :۔ تو تم کیا سمجھ رہے تھے ؟

حبیب :۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں بیاہ کا پورا انتظام مجھی کو
نہ کرنا پڑے۔

نسیمہ :۔ پورا نہ سہی۔ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ۔۔۔ اپنے
چچا کے انتقال کے بعد میرا ہاتھ تم نہ بٹاؤ تو اور کون بٹائے گا ؟

حبیب :۔ جی ہاں ویسے تو میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں
لیکن چچی جان میں کہتا ہوں کہ بر کی تلاش کے لئے دور جانے کی کیا
ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔

نسیمہ :۔ تو کیا واقعی تم خود اس مسئلے پر غور کر رہے تھے ؟

حبیب (بوکھلا کر) میرا مطلب تھا نیاز کے ہوتے ہوئے
اور کہیں تلاش کے لئے جانے کی کیا ضرورت ہے ؟

نسیمہ :۔ نیاز !

حبیب :۔ جی ہاں نیاز، ابھی وہ کنوارا ہے اور ایک دن
اسے بھی شادی تو کرنی ہی ہے ۔

نسیمہ :۔ ٹھیک ہے ۔

حبیب :۔ اور اندھیرے میں تیر چلانے سے تو یہی بہتر ہے
کہ وہ ایک دیکھی بھالی لڑکی سے شادی کرے۔ کیوں چچی جان ٹھیک
ہے نا ؟

نسیمہ :۔ سو فی صدی ٹھیک ہے لیکن ظاہر ہے میں خود تو
نیاز سے یہ نہیں کہہ سکتی۔

حبیب :۔ خیر، اس کی آپ فکر نہ کیجئے (اٹھتے ہوئے) میں
نیاز سے کہہ لوں گا، اور بھلا اس کے پاس انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے

نسیمہ :۔ بہ ظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

حبیب :۔ کوئی وجہ ہو بھی نہیں سکتی۔ حسینہ ماشاء اللہ پڑھی
لکھی، سمجھدار، سلیقہ مند اور ناک آنکھ کی اچھی ہے، اس سے شادی
کرکے تو نیاز کے بھاگ کھل جائیں گے۔

نسیمہ :۔ ارے تم تو جلنے لگے۔ ابھی تو تفصیل سے کوئی
بات ہوئی ہی نہیں۔

حبیب :۔ میں تھوڑی دیر میں پارٹی سے واپس آجاؤں گا

نسیمہ :۔ تو واپس یہیں آؤ گے نا یہیں ؟ ابھی تم نے چائے بھی تو

ہنسیں۔

حبیب:۔ جی ہاں، واپسی میں میں ہیں ہوتے ہوئے جاؤں گا تفصیل سے اسی وقت بات کریں گے۔ اس اثنا میں آپ بھی ساری باتیں سوچ لیجئے۔

نسیمہ:۔ اب اس میں سوچنا کیا ہے حبیب میاں۔ تم نے تو میرے دل کی بات جان لی۔ میں اپنی لڑکی کو کسی ان جانے آدمی کے حوالے کرنا خود ہی پسند نہیں کرتی تھی۔ اب خاندان میں تمھارے اس نیاز کے سوا اور کون تھا؟ . . . .

حبیب:۔ (جلدی سے) جی ہاں نیاز ہی موزوں ترین ہے۔ اچھا اب وقت کم ہے، فی الحال اجازت دیجئے۔

نسیمہ:۔ تو واپسی میں آؤگے نا؟

حبیب:۔ (جاتے ہوئے) جی ہاں ضرور۔

(حبیب چلا جاتا ہے)

نسیمہ:۔ (بلند آواز سے) شمن، شمن!

شمن:۔ (دور ہی سے) آ رہی ہوں امی۔

نسیمہ:۔ جلد آؤ۔

(شمن آتی ہے۔ شمن کی عمر دس گیارہ سال سے کم نہیں)

شمن:۔ جی امی؟

نسیمہ:۔ لو، یہ سب اٹھا لے جاؤ اور میوہ دان میں رکھ دو۔

شمن:۔ ارے! یہ تو جیسے کا ویسا ہے۔ کیوں امی، بھائی جان نے کچھ نہیں کھایا؟

نسیمہ:۔ ہاں ایک پارٹی میں جا رہے تھے تھوڑی دیر بعد پھر آئیں گے

شمن:۔ تو پھر رہنے دو نا یہیں۔

نسیمہ:۔ نہیں ری پگلی، وہ تو خوب کھا پی کر آئے گا۔ ہاں البتہ چائے چولھے ہی پر رہنے دے۔

شمن:۔ اچھا۔

نسیمہ:۔ جاؤ لے جاؤ یہ سب پھل وغیرہ۔

(باہر سے آواز آتی ہے: "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟")

نسیمہ:۔ ارے یہ تو نیاز کی آواز ہے! کیوں شمن؟

شمن:۔ ہاں امی۔ انھیں کی آواز ہے۔

نسیمہ:۔ دیکھو تو سہی۔ اچھا یہ پھل رہنے دے یہیں۔

شمن:۔ وہی ہیں امی۔

نسیمہ:۔ (بلند آواز سے) آجاؤ نیاز میاں۔

(نیاز اندر آجاتا ہے)

نیاز:۔ آداب عرض پھوپھی جان۔

نسیمہ:۔ جیتے رہو، آؤ بیٹھو۔

شمن:۔ آداب بھائی صاحب۔

نیاز:۔ اوہ! شمن! اچھی تو ہو؟

شمن:۔ جی ہاں۔ امی چائے لے آؤں؟

نسیمہ:۔ ہاں ہاں، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے

(شمن چلی جاتی ہے)

نسیمہ:۔ کہو نیاز میاں اچھے تو ہو؟

نیاز:۔ جی ہاں اللہ کا فضل ہے۔ ادھر سے گزر رہا تھا سوچا کہ آپ کو سلام کرتا چلا جاؤں۔

نسیمہ:۔ شکریہ۔ کبھی کبھار اسی طرح آجایا کرو۔

نیاز:۔ کہئے سب خیریت تو ہے نا؟

نسیمہ:۔ ہاں، خدا کا شکر ہے۔

نیاز:۔ حسینہ کا اسکول ٹھیک چل رہا ہے؟

نسیمہ:۔ ہاں اسکول کے بعد شام تک واپس آتی ہے۔

بصد خیرہ شمس الدین

نے کل بس اسی کی فکر ہے۔

نیاز:۔ کیوں، کیا ہوا؟

نسیمہ:۔ کچھ نہیں اب وہ سیانی ہو گئی ہے نا، اسی لئے

بڑا فکر ہے۔

نیاز:۔ سیانی ہو گئی ہے تو پھر کر ڈالئے شادی۔ اس میں

ت کیا ہے!

نسیمہ:۔ یعنی! یعنی کیا تم . . . ! (بوکھلا کر نیاز کو دیکھنے

ہے)

نیاز:۔ ہاں، ہاں میں اس کی پوری تائید میں ہوں نیک

میں دیر کا ہے کی۔

نسیمہ:۔ کیا واقعی! سچ مچ تمہارا یہی خیال ہے؟

نیاز:۔ اور فرمایئے اس سلسلہ میں آپ کی میں کیا خدمت

سکتا ہوں؟

نسیمہ:۔ خدمت! بس اس کے لئے ایک اچھا سا دولہا

ن کر دو۔ بالکل اپنے جیسا۔

نیاز:۔ میرے جیسا! کیا آپ مجھے بنا رہی ہیں۔ میں

لائق ہوں۔

نسیمہ:۔ بس مجھے تو تم جیسا ہی درکار ہے۔

نیاز:۔ اجی میری کیا حیثیت ہے اس کے لئے تو ایسا

ہا ہے میری نگاہ میں کہ بس!

نسیمہ:۔ سچ! کون! تمہارا دوست ہے!

نیاز:۔ ہاں اور آپ بھی اسے جانتی ہیں۔

نسیمہ:۔ یعنی!

نیاز:۔ حبیب۔ اور کون؟

نسیمہ:۔ حبیب؟

نیاز:۔ ہاں۔

نسیمہ:۔ تم نے اپنا نام بدل کر حبیب تو نہیں رکھ لیا ہے؟

نیاز:۔ نہیں پھوپھی جان میں حبیب کا ذکر کر رہا ہوں۔

ماشاء اللہ وہ مجھ سے زیادہ کماتا ہے۔ مجھ سے زیادہ شکیل ہے۔ اعلیٰ

گریجویٹ ہے، شریف ہے، منکسر مزاج ہے، غرض وہ تو ایک ہیرا ہے

اور حسینہ کے لئے اس سے بہتر دولہا تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے

بھی نہیں ملے گا۔

نسیمہ:۔ لیکن . . .

نیاز:۔ لیکن کیا؟ پھوپھی جان آپ خاطر جمع رکھئے میں

اسے راضی کر لوں گا اور بھلا اس میں انکار کی گنجائش ہی کیا ہے؟

نسیمہ:۔ انکار کی گنجائش!

نیاز:۔ ہاں ہاں، انکار کی تو گنجائش ہی نہیں کہ حسینہ

اس کی دیکھی بھالی لڑکی ہے۔

نسیمہ:۔ عجیب معاملہ ہے۔ یک نہ شد دو شد۔

نیاز:۔ میں سمجھا نہیں آپ کا مطلب۔

نسیمہ:۔ تو تمہارے خیال میں حبیب کو کوئی اعتراض

نہیں ہوگا؟

نیاز:۔ ظاہر ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ سنتے ہی اس کی

تو باچھیں کھل جائیں گی۔

نسیمہ:۔ سچ؟

نیاز:۔ اور کیا، بھلا حسینہ سے اچھی دلہن اسے اور کونسی

مل سکتی ہے!

نسیمہ:۔ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ کسی غیر کو دینے کی

بجائے اپنوں ہی میں اپنی بیٹی دوں۔

نیاز:۔ اور اب یہ معاملہ تو بس طے سمجھئے۔

نسیمہ :۔ واقعی؟ تمھیں حبیب پر پورا بھروسا ہے؟

نیاز :۔ بالکل، اب یہ میرا ذمّہ ہے، اس کی آپ فکر نہ کیجئے۔

(شمن چائے لے آتی ہے)

نسیمہ :۔ لو، نیاز میاں چائے لے لو۔

نیاز :۔ شکریہ (چائے کی پیالی لیتا ہے) لیکن یہ اتنی بے یقینی کیوں ہے آپ کو؟

نسیمہ :۔ اب تھوڑی دیر میں حبیب آجائیگا اور تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کیوں اتنی الجھن میں ہوں۔

نیاز :۔ آپ کو کیا الجھن ہے؟ الجھن تو مجھے ہو رہی ہے

نسیمہ :۔ لیکن دیکھو حبیب سے بہت سلیقے اور نرمی سے ذکر کرنا۔

نیاز :۔ میں بھی کیا کوئی دودھ پیتا بچّہ ہوں جو آپ سبق دے رہی ہیں۔

نسیمہ :۔ مجھے تو خوف ہے کہ معاملہ الٹ نہ جائے۔

نیاز :۔ ناممکن۔ اس کی آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔

نسیمہ :۔ اچھا شمن اب تم جاؤ۔ (شمن کے جانے کے بعد) اچھا تو اب دوسری تفصیلات پر کیوں نہ غور کریں۔

نیاز :۔ جی ہاں ضرور۔

نسیمہ :۔ پہلے جہیز کا معاملہ لو۔

نیاز :۔ جہیز؟

نسیمہ :۔ ہاں، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں حسینہ کے ساتھ اتنا جہیز نہیں دے سکتی جتنا کہ دینا چاہتی ہوں۔

نیاز :۔ وہ تو ظاہر ہے۔

نسیمہ :۔ البتّہ اگر تمھارے ماموں زندہ ہوتے تو وہ اتنا کچھ دیتے کہ کسی کو شکایت کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔

نیاز :۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

نسیمہ :۔ آمین۔ ان کے انتقال کے بعد سے تو بس لے دے کے بس وہی رعایتی وظیفہ ہے جو سرکار سے ملتا ہے۔

نیاز :۔ جی ہاں یہ تو سب جانتے ہیں۔

نسیمہ :۔ اس لئے جو کچھ کرنا ہے ایک حد کے اندر کرنا ہے۔

نیاز :۔ ظاہر ہے لیکن اس میں فکر کی کون سی بات ہے۔ جہیز کی اہمیت ہی کیا ہے۔ ... آپ اس پرانے خیال کو چھوڑئیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمام حالات سے واقف ہوتے ہوئے حبیب جہیز پر زور نہیں دے گا۔

نسیمہ :۔ امید تو ہے سمجھدار اور پڑھے لکھے نوجوان سے یہی ہے۔ پھر بھی روزمرہ ضرورت کے برتن اور مسہری اور بستر وغیرہ تو میں نے حسینہ کے لئے تیار کر رکھے ہیں۔

نیاز :۔ بس بس، یہ بہت کافی ہے۔ بقیہ سب سامان دولھا میاں خود فراہم کر لیں گے۔

نسیمہ :۔ اب رہا مہر کا سوال . . . .

نیاز :۔ مہر؟ یہ بھی پرانا خیال ہے، اب اس زمانے میں آپ کو بھی اس پر زور نہیں دینا چاہیئے۔

نسیمہ :۔ ظاہر ہے، زور تو نہیں دے سکتی لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ مہر بہت کم بھی نہ ہونا چاہیئے۔

نیاز :۔ بیمہ کی پالیسی کو مہر کا بدل سمجھا جا سکتا ہے۔

نسیمہ :۔ ہاں، ہو تو سکتا ہے لیکن اس کی مالیت کم از کم چار ہزار روپئے تو ہو۔

نیاز :۔ چار ہزار کچھ زیادہ نہیں ہیں، خصوصاً حبیب کے لئے۔ چار ہزار پر میں اسے راضی کر لوں گا۔

نسیمہ :۔ جوڑے کے لئے تین سو سے زیادہ دینا تو میرے
بس کے باہر ہے۔
نیاز :۔ بس بس بہت کافی ہے۔ کیا جوڑے کی رقم سے
کوئی عمر بھر کے لئے کپڑے بنانے ہیں۔
نسیمہ :۔ اور سب مہمانوں کو کھانا کھلانا بھی مشکل ہے
اس لئے میرا خیال ہے کہ چائے اور بسکٹ کا انتظام کرنا چاہیئے۔
نیاز :۔ ٹھیک ہے۔ کھانا وانا کھلانے کا رواج تو عرصہ
ہوا ترک ہو گیا۔
نسیمہ :۔ سونے کے زیور میں صرف نکلس، انگوٹھی اور ایر
رنگ ہیں۔ ہاں چاندی کی پازیب بھی ہے اور پاندان بھی۔
نیاز :۔ بس بس ٹھیک ہے۔ بہت کافی ہے۔
نسیمہ :۔ تو تمہارے خیال میں اور کسی چیز کی خاص ضرورت
تو نہیں؟
نیاز :۔ جی نہیں۔ جو کچھ ہے وہی بہت ہے۔ اور پھر شادی
کوئی جہیز یا زیور سے تھوڑی کرتا ہے۔ وہ تو لڑکی سے کرتا ہے۔
نسیمہ :۔ اور لڑکی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟
نیاز :۔ خیال کیا، وہ تو حبیب کی دیکھی بھالی ہے۔
نسیمہ :۔ پھر بھی تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ کوئی کمی تو نہیں
ہے نا!
نیاز :۔ جی نہیں ماشاء اللہ خوب صورت ہے سلیقہ
مند ہے، اور حسبِ ضرورت پڑھی لکھی ہے اور کیا چاہیئے؟
نسیمہ :۔ حبیب ابھی تک نہیں آیا!
نیاز :۔ کیا وقت دیا تھا؟ میرا مطلب ہے کب آنے کا وعدہ
کیا تھا؟
نسیمہ :۔ کسی پارٹی میں جا رہا تھا، واپسی میں آنے کا وعدہ
کیا تھا حسینہ کے اسکول سے واپس آنے سے پہلے آ جائے گی چائے

(باہر سے آواز آتی ہے "میں اندر آ جاؤں؟")

نسیمہ :۔ لو وہ آگیا (آواز) آجاؤ حبیب میاں۔

(حبیب اندر آتا ہے اور نیاز کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے)

حبیب :۔ اوہ نیاز!
نیاز :۔ جی ہاں جناب، میں۔
نسیمہ :۔ بیٹھو حبیب میاں، ذرا دیر نیاز سے باتیں کرو
میں اتنے چائے بنا لاؤں۔

(نسیمہ چلی جاتی ہے)

حبیب :۔ نیاز اچھا ہوا کہ تم سے یہیں ملاقات ہو گئی۔
میں تم سے ملنا ہی چاہتا تھا۔
نیاز :۔ میں بھی تم سے ملنے کا مشتاق تھا۔ ابھی ابھی بھابی
جان سے تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔
حبیب :۔ اور میں بھی تمہارے ہی بارے میں ان سے
گفتگو کرنے کے لئے آیا تھا۔
نیاز :۔ میرے بارے میں! کس سلسلے میں؟
حبیب :۔ شادی کے!
نیاز :۔ کس کی شادی! میری!
حبیب :۔ اور کس کی، تمہاری اور حسینہ کی شادی!
نیاز :۔ میں! (پریشان ہو کر) یہ میں کیا سن رہا ہوں۔
حبیب :۔ وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔
نیاز :۔ تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ میں ابھی ابھی تمہاری
اور حسینہ کی شادی کے بارے میں بھابی جان سے باتیں کر رہا تھا
حبیب :۔ کیا؟ (چونک کر) میری شادی؟! تم نے بھنگ تو
نہیں پی رکھی؟ میں تمہاری شادی کا ذکر کر رہا ہوں اور تم میری کا!

کیا مطلب؟

نیاز :۔ وہی مطلب ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔

حبیب :۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے! یہ ناممکن ہے۔

نیاز :۔ کیوں؟ ناممکن کیوں ہے! آخر حسینہ کی شادی کسی سے تو ہو گی۔

حبیب :۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم بھی اس سے شادی کرو اور میں بھی؟ یہ ناممکن ہے۔

نیاز :۔ کون سنحرا کہتا ہے کہ میں اس سے شادی کر رہا ہوں

حبیب :۔ اور یہ کون احمق کہہ رہا ہے کہ میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔

نیاز :۔ کیوں! بھلا تم شادی کیوں نہیں کرو گے؟

حبیب :۔ مجھے حسینہ سے نفرت ہے، میں ہرگز اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

نیاز :۔ مجھے بھی حسینہ سے نفرت ہے، میں بھی اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

حبیب :۔ لیکن میں تو چچی جان کو یقین دلا چکا ہوں کہ تم انکار نہیں کرو گے۔

نیاز :۔ اور میں بھی یہی یقین انھیں دلا چکا ہوں، بلکہ جہیز، زیور، دعوت وغیرہ کی سب تفصیلات بھی طے ہو چکی ہیں۔

حبیب :۔ خیر، تفصیلات تو تمھاری شادی کے بھی کام آ سکتی ہیں۔

نیاز :۔ لیکن کرو گے تو تمھیں۔

حبیب :۔ میں تو ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔

نیاز :۔ کیوں! تمھیں کیوں نفرت ہے؟

حبیب :۔ اس لئے کہ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا دم پسند نہیں کرتا۔

نیاز :۔ لیکن کیوں؟

حبیب :۔ کیوں!! اس لئے کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔

نیاز :۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، میں پوچھتا ہوں کہ کیوں نفرت ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔

نیاز :۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے، اس کی [illegible] سے نفرت ہے، اس کی آواز سے نفرت ہے۔

نیاز :۔ صورت سے! اس کی صورت میں بھلا کیا خرابی ہے؟ کیا وہ کانی ہے، لنگڑی ہے، بھینگی ہے؟ کالی ہے، آخر کیا بات ہے؟

حبیب :۔ بس، اس کی اتنی سی صورت، چپٹی آنکھیں مجھے بالکل پسند نہیں۔

نیاز :۔ واہ رے عقل مند، گول چہرہ اور نرگسی آنکھوں کی خوب قدر کی۔

حبیب :۔ اور چال تو دیکھو کیسی بھدی اور بے ڈھنگی اُف! تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں!

نیاز :۔ کبک دری کی اس کے سامنے کیا حیثیت ہے! واہ کیا مستانہ چال ہے اور تم اسے بھدی کہتے ہو۔ اندھے ہو بالکل اندھے۔

حبیب :۔ اور آواز بالکل بھینس کی سی۔ لاحول ولا

نیاز :۔ بھینس کی سی! کیا تمھارے کان خراب ہوئے ہیں؟ شہنائی بلکہ گھنگروؤں کی آواز بھی حسینہ کی میٹھی آواز کا مقابلہ نہ کر سکے اور تم کہتے ہو بھینس کی سی آواز ہے۔ کیا تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟

حبیب:۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، مجھے اس سے نفرت ہے
تمھیں پسند ہے تم ہی کر لو اس سے شادی۔

نیاز:۔ میں نے کب کہا کہ مجھے پسند ہے؟

حبیب:۔ گول چہرہ، نرگسی آنکھیں، مستانہ چال،
گھنگروؤں کی سی آواز، یہ سب کس کی تعریف ہو رہی تھی؟

نیاز:۔ اس میں کیا کلام ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے
نفرت ہے، میں اس کو بیوی بنانے کا خیال تک نہیں کر سکتا۔

حبیب:۔ کیوں؟ آخر کیوں؟؟

نیاز:۔ کیوں؟؟ ذرا قد تو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا
تاڑ کا جھاڑ کھڑا ہے۔

حبیب:۔ قد! قد میں کیا خرابی ہے؟ سرو و شمشاد
تو اس سے شرما جائیں۔

نیاز:۔ اور بال تو دیکھو ذرا، کوئلے جیسے سیاہ!

حبیب:۔ واہ! کیا بال ہیں، ملائم، معطر اور کالے
بادلوں کے مانند سیاہ! بیوقوف کہیں کے، کوئلے کے ذکر کا یہاں
کیا مقام ہے؟

نیاز:۔ اور گردن ملاحظہ ہو۔ اونٹ کی سی لمبی، لاحول ولا
قوۃ!

حبیب:۔ صراحی دار گردن کی یہ توہین؟ لعنت ہے
تم پر اور تمھاری آنکھوں پر۔

نیاز:۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، مجھے تو اس سے نفرت ہے
تمھیں پسند ہے، تم ہی بناؤ اسے اپنی بیوی۔

حبیب:۔ مجھے پسند ہے؟ یہ کون کہتا ہے؟

نیاز:۔ اور پھر یہ سرو کے سے قد، بادلوں کے سے بال اور
صراحی دار گردن کا قصیدہ کون پڑھ رہا تھا؟

حبیب:۔ اس سے کسے انکار ہے لیکن اس کی صورت
اس کی چال اور اس کی آواز پر بھی تو غور کرو۔

نیاز:۔ پھر وہی، دیکھو حبیب تم کم سے کم حسینہ پر جھوٹے
الزامات تو نہ لگاؤ۔

حبیب:۔ گویا تم بڑے ہی سچے الزامات لگا رہے ہو۔

نیاز:۔ خیر، جھوٹے اور سچے کو چھوڑو اور سنجیدگی سے
اس معاملہ پر غور کرو۔

حبیب:۔ میں تم سے یہی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

نیاز:۔ میں تم سے ادب و احترام کے ساتھ التجا کرتا
ہوں کہ میری بات رکھ لو اور راضی ہو جاؤ۔

حبیب:۔ اور بھلا میری بات تم کیوں نہیں رکھ لیتے۔
میں نے بھی تو چچی جان سے وعدہ کیا ہے کہ تمھیں راضی کرلوں گا

نیاز:۔ دیکھو حبیب، اگر تم ہی حسینہ کو یوں رد کر دو گے
تو اور کون اس سے بیاہ کے لئے تیار ہوگا؟ کس قدر بری بات ہے
بیچاری کی کس قدر بدنامی ہوگی!

حبیب:۔ اگر اس سے ایسی ہی ہمدردی ہے تو پھر تم
خود کیوں پیچھے ہٹ رہے ہو؟

نیاز:۔ کہہ تو دیا کہ مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔

حبیب:۔ اور اتنی دیر سے میں کیا کہہ رہا ہوں۔

نیاز:۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ آخر کسی کو حسینہ سے شادی
کرنا ہی ہے، وہ خاندان کے باہر کیوں بیاہی جائے؟

حبیب:۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں اس کا تم پر زیادہ
حق ہے۔

نیاز:۔ خیر، حق کا تو سوال چھوڑو، وہ تو تم پر مجھ سے زیادہ
ہے اور پھر چونکہ تمھاری تنخواہ زیادہ ہے اس لئے تم اس بے چاری

یتیم لڑکی کو زیادہ خوش رکھ سکو گے ۔

حبیب :۔ تمھاری تنخواہ کونسی کم ہے ؟ کیا تم چاہو تو اسے خوش نہیں رکھ سکتے ؟

نیاز :۔ لیکن تم مجھ سے زیادہ گورے چٹے اور حسین ہو وہ یقیناً تم پر مرتی ہو گی ، ذرا سوچو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ تو تم پر مرے اور تم اس سے دور بھاگو ۔

حبیب :۔ اور تم مجھ سے زیادہ قوی اور تنومند ہو ، اس کے بارے میں کیا خیال ہے ۔ کہیں عورتیں بھی مردوں کے رنگ روپ کو دیکھتی ہیں ؟ وہ تو بس صحت مند ، توانا تگڑے آدمی پر جان دیتی ہیں بھلا تمھیں دیکھ لینے کے بعد وہ اور کسی پر کیسے جان دے سکتی ہے ؟

نیاز :۔ اب تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ تمھارا اخلاقی فرض کیا ہے ؟

حبیب :۔ فرض تو تمھارا ہے نہ کہ میرا ۔ واہ بھئی واہ ، یہ بھی خوب دل لگی ہے ۔

نیاز :۔ دل لگی ہے ! شرم نہیں آتی تمھیں ۔ اس اہم مسئلے کا یوں مذاق اڑاتے ہو ؟

حبیب :۔ مذاق تو تم اڑا رہے ہو نہ کہ میں ۔ اب مجھے چچی جان کے سامنے کس قدر خفیف ہونا پڑے گا !

نیاز :۔ گویا میں بہت ہی سرخرو ہو جاؤں گا ؟ تم نے میرا سر بہت ہی اونچا کر دیا ہے نا !

(دونوں منہ پھلائے بیٹھے رہتے ہیں ۔ نسیمہ چائے لئے آتی ہے)

نسیمہ :۔ لو نیاز ، ایک پیالی پی لو ۔ حبیب میاں چائے لو ۔ (دونوں چائے کی پیالیاں لے لیتے ہیں)

نسیمہ :۔ کیا بات ہے ۔ دونوں چپ چپ !

حبیب :۔ کوئی خاص بات نہیں ۔ بعد میں آپ سے کہہ دوں گا ۔

نیاز :۔ بعد میں کیوں ؟ ابھی کیوں نہیں ؟

حبیب :۔ چچی جان بات در اصل یہ ہوئی کہ حسینہ کے بارے میں ہماری رایوں میں اتفاق نہیں ہو سکا ۔

نیاز :۔ میں ان کو کہہ رہا ہوں کہ حبیب کا زیادہ حق ہے لیکن وہ نہیں مانتے ، مجھی کو مجبور کرتے ہیں ۔

حبیب :۔ چچی جان نیاز سے بہتر داماد ملنا آپ کو مشکل ہے

نیاز :۔ پھوپھی جان حبیب سے بہتر داماد تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا ۔

نسیمہ :۔ اگر تم دونوں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تو پھر حسینہ ہی کی پسند پر اس معاملے کا فیصلہ چھوڑنا پڑے گا ۔

نیاز :۔ چچی جان مجھے یقین ہے کہ حسینہ حبیب کو پسند کریگی ۔

حبیب :۔ اور مجھے بھی اس کا یقین ہے چچی جان کہ وہ نیاز کو زیادہ پسند کرے گی ۔

نیاز :۔ پھوپھی جان اس بارے میں حسینہ کی رائے لینا ستم ظریفی کی انتہا ہو گی ۔

حبیب :۔ جی ہاں چچی جان ، ایک مشرقی لڑکی سے اس قسم کی رائے حاصل کرنا اس کے لئے کڑی آزمائش ہو گی وہ بیچاری کیسے کہے گی کہ وہ نیاز کو پسند کرتی ہے ۔

نسیمہ :۔ تو پھر فیصلے کی کوئی اور ترکیب بتاؤ ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تم دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دینا بہت ہی مشکل ہے ۔

حبیب :۔ ترجیح کا کیا سوال ہے چچی جان ، میں بڑی خوشی سے دست بردار ہوتا ہوں ۔

نیاز :۔ نہیں ، یہ نہیں ہو سکتا ۔ میں حبیب کے حق پر غاصبانہ

غلط پسند نہیں کرتا۔

جبیب:۔ اس میں غاصبانہ قبضہ کی کیا بات ہے میں اپنی خوشی دست بردار ہو رہا ہوں۔

نیاز:۔ میں تمہارے اس ایثار کی قدر کرتا ہوں لیکن انصاف مجھے پسند نہیں۔

نسیمہ:۔ تو پھر آخر تم لوگوں کا مطلب کیا ہے! جلد کسی نتیجے پر پہنچو، تھوڑی دیر میں حسینہ واپس آجائیگی۔

نیاز:۔ شمن کہاں ہے؟

جبیب:۔ کیوں؟ کیا شمن کی رائے لینے کا ارادہ ہے

نیاز:۔ نہیں، مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔

نسیمہ:۔ (بلند آواز سے) شمن! او شمن!!

(شمن آتی ہے)

شمن:۔ جی امی!

نسیمہ:۔ بولو نیاز، شمن سے کیا کام ہے؟

نیاز:۔ (جیب سے ایک سکہ نکالتا ہے) دیکھو جبیب یہ سکہ ہے۔ اس میں کون سا رخ تم اپنے لئے منتخب کرتے ہو چت یا پٹ؟

جبیب:۔ اچھا! تو گویا اب سارا معاملہ تقدیر کے حوالے کرنا ہے۔ الٰہی مدد!

نیاز:۔ بولو، کونسا رخ؟

جبیب:۔ چت، لیکن اس کے معنی کیا ہوں گے؟

نیاز:۔ اگر سکہ چت رخ پر گرے تو تم شادی کروگے اور پٹ گرے تو میں۔ تو شمن یہ سکہ تم اچھالو ہوا میں۔

شمن:۔ لائیے (سکہ لیتی ہے)

جبیب:۔ (دبی زبان سے) الٰہی مدد! الٰہی مدد! جل تو جلال تو!

نیاز:۔ (دبی زبان سے) المدد یا رب العالمین!!

(شمن سکہ اچھالتی ہے جو فرش پر گر کے گول پھرتا ہوا دو اینٹوں کے مابین درز میں جا کر کھڑا پھنس جاتا ہے، نہ چت نہ پٹ! اس دوران میں جبیب اور نیاز منہ ہی منہ میں بہت کچھ پڑھتے رہے جبیب زور سے پٹ کہتا ہے اور نیاز چت، پھر سکہ کو اینٹوں کے مابین پھنسا دیکھ کر دونوں اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔)

جبیب:۔ لیجئے چچی جان، تقدیر کا فیصلہ دیکھ لیجئے۔ نہ چت ہے نہ پٹ۔

نیاز:۔ یعنی دونوں میں سے کوئی بھی شادی نہیں کریگا!

نسیمہ:۔ (نہایت سراسیمہ) پھر! پھر اب کیا ہوگا! سکہ ایک دفعہ اور اچھال لونا!

جبیب:۔ جی نہیں۔ یہ تو قسمت کا مذاق اڑانا ہوگا۔

نیاز:۔ تقدیر کا منہ چڑانا ہوگا۔

نسیمہ:۔ پھر!

جبیب:۔ آپ پریشان کیوں ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک حسینہ کے لئے کوئی موزوں رشتہ تلاش کر لوں چین سے نہ بیٹھوں گا۔

نیاز:۔ پھوپھی جان آپ خاطر جمع رکھئے، میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کروں گا۔

جبیب:۔ آپ دیکھئے تو سہی، ایک ہفتہ کے اندر اندر میں کوئی موزوں رشتہ طے کرا دوں گا۔

نیاز:۔ بھلا حسینہ جیسی خوب صورت اور سلیقہ مند شریف اور پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنے میں کسے عذر ہو سکتا ہے۔ ختم

پروفیسر شمس الدین

دن ہے اندر اس کے لئے جوڑا تلاش کر لیا تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجئے

جلیب: ۔ جی چچی جان آپ فکر نہ کیجئے سب ٹھیک ہو جائیگا

تسنیمہ: ۔ خدا کرے تمھاری زبان نیک ہو۔

نیاز و جلیب: ۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ آداب عرض

(دونوں چلے جاتے ہیں اور تسنیمہ حیرانی و حسرت سے انھیں دیکھتی رہ جاتی ہے۔)

پردہ گر پڑتا ھے

(شمس الدین)

غزل

حضرتِ تابش صدیقی

نہ وہ خلش، نہ تمنّا، نہ وہ طلب نہ جنوں
ہے کچھ دنوں سے محبّت کا حال سخت زبوں

بھلا کے بھی انھیں سو بار ہم نے دیکھ لیا
کبھی جو ہوش میں آئے تو پھر وہی مضموں

حیات یوں بھی گزر جائے گی مگر پھر بھی
جو تم کہو تو محبّت کا کوئی خواب بنوں

حیات کیا ہے، سوا اس کے کچھ نہیں معلوم
تمام ذوقِ طلب، یا تمام سوزِ دروں

وہ شے کہ حسن کہیں جس کو اور ہی کچھ ہے
نہ چشم و گیسو و رخسار، نے قدِ موزوں

خرد نے بڑھ کے اٹھا تو دیئے نقاب، مگر
جنوں کا عالمِ حیرت وہی ہے۔ کم نہ فزوں

حضرت قیوم نظر

تو

روش روش پہ ترانے گلوں کے افسانے
ہزار شعبدے پیدا چمکتے رنگوں سے
بہار کھیل رہی ہے نئی امنگوں سے

بکھیر اٹھتی طرحدار گلبدن شاخیں
عواں درختوں کی بڑھتی ہوئی کڑی باہیں
تری نگاہ کی مستی بغیر کچھ بھی نہیں

تمام باغ پہ بیگانگی ہے لہراتی
کسی کلی کے چٹکنے کی دل نواز آواز
مرے خیال کی آغوش میں نہیں آتی

سحر کے دامنِ لرزاں میں دیکھتا ہوں میں
وہ سنگ زاروں سے ڈھلتی مہیب تاریکی
رگوں میں جس نے مری جوئے درد جاری کی

ہوا کی موجوں سے ٹکرانے والی چمگادڑ
پھسلتے چاند کی کرنوں کو جذب کرتی ہوئی
جھپٹتی جاتی ہے چڑیوں ہی پر گزرتی ہوئی

اداس شام بھی کیا لے کے آئی میرے لئے
نحیف تارے — یہ پلکوں پہ رینگتے آنسو
طویل راتوں میں چپ چاپ جلنے والے دیئے

جناب مرزا محبوب بیگ صاحب صبا
(از حیدرآباد دکن)

فلسفۂ ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے

(بہ سلسلۂ ماسبق)

تخمین و تفکر کی جڑیں ہماری ہستی کے اندر بہت دور تک چلی گئی ہیں۔ استعارے کی زبان میں کہا جا سکتا ہے وہ ہماری روح کی اتھاہ اور نامعلوم گہرائیوں میں پیچیدہ طور سے پیوست ہیں۔ عقل آرائی عملی مہم بے شک نہیں ہے۔ وہ ہو کیسے سکتی ہے۔ بہتیرے تو اسے عملی گناہ سمجھتے ہیں لیکن وہ معمولی معنوں میں نظری مہم بھی نہیں ہے۔ اس کا مقام، نظریہ اور عمل دونوں سے پرے ہے۔ وہ دونوں سے زیادہ قیمتی اور غامض ہے نظریہ ایک بیچ کی منزل ہے۔ بقولِ غالب وہ محض قبلہ نما ہے عین قبلہ نہیں ہے۔ تخمین تو ہستی کے حضور میں انسانی ذہن کا ردِ عمل ہے۔ نامتناہی مطلق، ناقابلِ فہم اور بزرگ تر کا شعور ہماری فکری قوتوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ ہم اندھیرے میں راہ ٹٹولتے ہیں۔ ہمارے تہ ظلمتوں کے پردے چاک کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں روشنی کی پیاس ہوتی ہے تاکہ عروق و اعصاب سے مجہولیت کا تشنج دور ہو۔ ذہن سے امتلا کی کیفیت جاتی رہے۔ ہم سب کا یہی حال ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ہر فرد غالباً ایک نہایت ننھی، نازک اور فانی موج ہے ذہنی توانائی کی۔ یہ توانائی اس موج میں جزئی طور سے ماسکے پر آتی ہے اور پوری شدت سے زندہ رہتی ہے۔ گو یہ زندگی عارضی ہوتی ہے مگر بہ مرورِ زمانہ مجموعی حیثیت سے دنیا کی ثروتِ فکر اور دقتِ نظر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح انسانی روح کی ایک احتیاج ہے شدید اور تشفی طلب۔ اور روح اس تشفی کے درپے ہے۔ پوری سنجیدگی، سچائی، شان، شرافت اور لگن کے ساتھ۔ تفلسف اسی تشفی کا دوسرا نام ہے۔ آپ اسے روح کا اپنا انکشاف بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بڑی اہم سرگرمی ہے۔ اس میں عقل کی خنکی اور متانت کے ساتھ تاثر کی حدت بھی ملتی ہے۔ نتیجتاً اس کے اندر ایک احترام آمیز پاکیزگی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسے فکر و ادا کے سانچوں میں ڈھالنا خالص فن ہے۔ ان سانچوں کی خوبی یا خرابی سے فن کار کی مہارت کا اظہار ہوتا ہے زیادہ کچھ نہیں۔ نمود سے الجھنے والے چاک ہائے دامن میں انگلیاں ڈالتے ہیں اور ان سے کھیلتے رہ جاتے ہیں جو ماورے کے پانے کی کوشش نہیں کرتے، وہ اسے پا نہیں سکتے۔ آدمی محتاط ہو ضرور، پر نہ اس قدر کہ احتیاط کو منزلِ مقصود قرار دے۔ اس کے علاوہ اس میں سمجھ ہو، اخذ و قبول کی صلاحیت ہو تاکہ قلبِ حقیقت کی خفیف ترین ضربات کو بھی محسوس کر سکے۔

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ لہٰذا فلسفہ بھی ادھچاپن یا ہیچ کاری نہیں ہے۔ اسے خوش اسلوبی سمجھنا غلطی ہے تفریحی مشغلہ ٹھہرانا بیوقوفی ہے۔ یہ رائیں نتیجہ ہیں اس کی ماہیت کے غیر صحیح اندازے کا، وہ ان سے کہیں زیادہ بلند، وزنی اور سنجیدہ ہے۔ اس میں ہماری دنیا کی نمائش، بیہودگی، سطحیت اور کلفت نام کو نہیں ملتی۔ وہ تو ایک پاک و صاف چودھویں رات ہے۔ پُر اسرار، جلیل، لطیف سرد اور مست کن۔ وقت کاٹنے کے بیسیوں طریقے ہو سکتے ہیں۔ توفیق منحصر ہمت پہ ہے۔ پھر دل بہلانا سہل، سبک اور دلچسپ چیزوں سے

شک اور بھاری مصروفیت سے تفریح نہیں ہوتی ۔ بلکہ طبیعت میں گرانی پیدا ہوتی ہے ۔ غور و فکر، دماغ سوزی ہے کوئی پُرلطف حرکت نہیں ہے
دمی اسے کسی جبر یا دباؤ کے تحت ہی انجام دے سکتا ہے ورنہ معمولاً پسند نہیں کرتا ۔ لہٰذا تعجب ہوتا ہے کہ لوگ حسن کاری سے دلچسپی نہیں
یتے ، تاریخ کو ہاتھ نہیں لگاتے ، ادب کا ذوق پیدا نہیں کرتے ، حالانکہ یہ دلکش اور نظر نواز مضامین ہیں ۔ وہ رجوع کرتے ہیں تو بس فلسفے سے ۔
ں کی خشکی مشہور ہے ۔ ایک مختلف نقطۂ نظر سے جوڈ بھی یہی کہتا ہے ۔ آخر جیات اور کائنات سے کم کوئی چیز انھیں عقل آرائی کے لئے کیوں
اسند نہیں آتی ؟ لیکن یہ تعجب بے جا ہے ۔ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کیوں فلسفہ سے رجوع نہ کریں ؟ ہم جانتے ہیں اس کی سردی کی کشش
، وجہ کیا ہے ۔ کیا چیز ہر کس و ناکس کو اس کی طرف کھینچتی ہے ۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے ۔ نیاز کی تشریح
، شرح پہلے صرف ایک آدھ آہ سے ہو جاتی تھی ۔ وہ پرانا زمانہ تھا ۔ نئے دور میں بولنا زیادہ پڑتا ہے ، دو چار جملوں سے کام نہیں بنتا ۔

یہاں تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے ۔ لوگ عام طور سے عقل آرائی کی طرف قوی میلان رکھتے ہیں یعنی ہم سب سوچتے ہیں ۔ اور یہ
سوچ ہماری استعداد کے مطابق ہوتا ہے عقل ، استطاعت اور وزیفے کے اعتبار سے لوگ یکساں خوش نصیب نہیں ہوتے ۔ لہٰذا اگرچہ
علیم ، تربیت اور ممارست کے اثرات بالآخر محسوس ہو کر رہتے ہیں ، مگر ان سے محض اس میلان کی تہذیب ہوتی ہے ۔ اور اس کی کارکردگی
ھتی ہے ۔ اے ۔ ایس ۔ راپورٹ لکھتا ہے : "پیشہ ور گھڑی ساز کون ہے ؟ وہ جو اس فن کو اپنی زندگی کا واحد اور خاص مقصد قرار دے ۔ ایسا
فص فنی تعلیم حاصل کرتا ہے مسلسل مشق سے قابلیت اور مہارت بہم پہنچاتا ہے ۔ اسے غیر ماہر کے مقابلہ میں طریقہ اور عمل سے زیادہ واقفیت
ہوتی ہے ۔ اور وہ تھوڑی سی محنت سے بہتر نتائج پیدا کرتا ہے ۔ اسی طرح پیشہ ور فلسفی کون ہے ؟ وہ جس کی زندگی کا مقصد اعظم یہ ہو کہ
شیار کی ماہیت کا مطالعہ کرے اور ان کی عمیق تحقیق انجام دے ۔ افکار اس کے آلات ہوتے ہیں اور اس میں مشق کی وجہ سے اشیار
اتعقل جلد تر کرنے کی اہلیت ہوتی ہے ۔" (فلسفہ کا قاعدہ صـ۲) بہ الفاظ دیگر مطلب یہ ہے کہ فلسفہ کے اصطلاحی پہلو پر بعض لوگوں کو بڑا عبور
ہوتا ہے ۔ ایسے اشخاص نسبتہً زیادہ کامیاب طریقے سے عقل آرائی کرتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں دوسرے ہیں جنھوں نے فلسفے کی
خاص طور سے تعلیم نہیں پائی ۔ انھیں ممارست کے موقع نہیں ملے ۔ یہ بھی عقل آرائی کرتے ضرور ہیں لیکن ان کی فکر میں صفائی اور تیزی
نہیں ہوتی ۔ اس کی کمزوریاں ، جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کچھ تو تعلیم و تربیت کی افسوس ناک کمی سے ہیں اور کچھ خلقی ہیں ۔ ان کو کلیتہً ختم
نہیں پایا جا سکتا ۔ اور یہ مستقل چوکسی اور محنت کے طلبگار ہیں ۔ لہٰذا غیر فلسفیوں کے افکار و یقینیات کو مہمل و بے معنی قرار دینا زیادتی ہے
لیکن جوڈ کو اصرار ہے وہ کہتا ہے ۔ بڑی عمر میں عناصر کا اعتدال جاتا رہتا ہے ۔ عجیب عجیب قسم کے جسمانی اور دماغی عارضے لاحق ہوتے ہیں
دولت مندوں اور بڑے تاجروں میں فلسفہ کا "مانیا" علامت ہے ۔ قوارکے اضمحلال کی یعنی دماغی قوتوں کے ہم وقت اختلاط سے جو قولی
احملہ ہوتا ہے ۔ اس کو شدت اور سمت ملتی ہے آجکل کی عام عقلی فضا سے ۔ ہمارے زمانے میں عقل کا اعتبار اٹھ گیا ہے جس کا لازمی
نتیجہ یہ ہے کہ ہر کھوسٹ بڑھیا فلسفے کے یوسف کی خریداری کا خبط دماغ میں رکھتی ہے ۔ احمقوں کی بن آئی ہے اور وہ اپنے ناشائستہ افکار
انشا پردازی کے زور سے عمیق افکار بنا کر پیش کئے جا رہے ہیں ۔ اس طرح دو امور تنقیح طلب ہیں ۔ آیئے ان سے نمٹ لیں ۔ ہماری
لیل بھی مکمل ہوگی اور بحث کی روانی میں فرق بھی نہیں آئے گا ۔

تحلیل نفسی ایک نفسیاتی نظریہ ہے۔ وہ ایک خاص سائنسی طریقۂ علاج کی تعمیم اور پیداوار ہے۔ اس کا مقصد ہے انا کو تقویت دینا، اس کے میدانِ نظر کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا۔ انا کی تنظیم کو وسیع اور مضبوط کرنا۔ حقیقت انا کی شعوری نظام کے توسط سے ہمارے نفس کے جبلی حصے (اِڈ) کو متاثر کرتی ہے۔ اس اثر اور ربط کی وجہ سے اِڈ کا ایک جزو بدلتا ہے اور بہتر طریقے سے منظم ہوتا ہے۔ یہی انا ہے۔ خارجی دنیا سے یہ تعلق انا کے لئے بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اسے اوّل الذکر کا مشاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے اول الذکر پر مسلسل اور کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اسے اوّل الذکر سے ادراکات ملتے ہیں۔ یہ ادراکات اس کے اندر یادداشتی نقوش چھوڑتے ہیں۔ وہ ان نقوش سے خارجی دنیا کی سچی تصویر بناتا ہے۔ اور حقیقت کے ساتھ مطابقت کے ذریعے سے اس تصویر سے جذبی اثرات خارج کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اِڈ کی نقل و حرکت کے راستوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے۔ وہ حواس اور عمل کے درمیان فکر کا عنصر داخل کرتا ہے۔ یہ عنصر التوا اور تعویق کا موجب ہوتا ہے۔ تجربہ کی باقیات حافظے میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ انا فکر کے دوران میں انہی باقیات سے استفادہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ اصولِ لذت کو ترک کرتا ہے۔ اور بجائے اس کے اصولِ حقیقت پر عمل کرتا ہے۔ تاکہ بزرگ تر سلامتی، تسکین اور کامیابی میسر ہو۔ اصولِ لذت کا اِڈ کے اعمال پر غلبہ ہے اور ان اعمال سے جو چیزیں متعین ہوتی ہیں ان پر غلبہ ہے۔ اس اصول سے اصولِ حقیقت کی طرف عبور بڑی اہم چیز ہے۔ اس سے مہتم بالشان نتیجے حاصل ہوتے ہیں۔ انا حقیقت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں حقیقت کی تعلیم۔ عقل و ہوش اسی طرح ترقی کرتے اور پختگی کو پہنچتے ہیں۔ بہتیرے اصحاب کہتے ہیں کہ تحلیل نفسی غیر عقلیت کی وکالت کرتی ہے لیکن اوپر کے بیان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دراصل یہ اشخاص صرف اتنا جانتے ہیں کہ فرائڈ کی دریافتوں سے پتا چلا ہے کہ غیر عقلی اوہام اور آزار عام ہیں جبلتیں اور خواہشیں ہماری عقلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمارے نقاطِ نظر کو رنگ دیتی ہیں۔ ہمیں اپنے انداز یا اعمال کے محرکات کا شعور نہیں ہوتا اور ہم ان چیزوں کے لئے وجوہ تراش لیتے ہیں۔ ان کی نظر اس پر نہیں پڑتی یا وہ اسے عمداً نظر انداز کرتے ہیں کہ تحلیل نفسی اعلیٰ درجے کے فنی ذرائع سے کام لے کر صورتِ حال کی اصلاح کرتی ہے۔ اس کے سامنے صحتِ دماغی کا ایک معیار ہے۔ اس کی سفارش وہ ہر ایک سے کرتی ہے عصبی بیماروں سے بھی انسانوں سے۔ لوگ حق و صداقت کا دم تو بہت بھرتے ہیں۔ لیکن تحلیل نفسی کے بارے میں اسے بالکل بھول جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ ہمارے عزیز ترین التباسات کی دشمن ہے۔

وسطِ شاہراہ میں واقعہ یہ ہے کہ عقلیت کی مخالفت کی ہے فلسفیوں نے اور یہ طوفان اٹھا دو جگہ سے۔ فرانس سے اور امریکہ سے۔ جرمن تصوریت کی حد سے زیادہ عقلیت اور منطقی باقاعدگی سے دنیا یوں ہی تنگ تھی۔ پھر سونے پر سہاگے کا کام کیا سائنس کی میکانیت اور جبریت نے، ثنویت کے تجربی پہلو نے، اسپنسر کی ارتقائیت اور لاادریت نے۔ خلق کھوئی ہوئی چیزوں کے لئے ترس رہی تھی۔ ایسے میں برگساں نے اپنا تخلیقی ارتقا پیش کیا۔ غیر عقلیت کا راگ بڑے ہی میٹھے سُروں میں الاپا۔ اس میں مدد تھا۔ قابلیت تھی۔ امتیاز تھا۔ دنیا مست و بیخود ہو گئی۔ استاد کے سُریلے بول بے ساختہ زبانوں پر جاری ہو گئے۔ ہندوستان کی فضا بھی ان سے گونج اٹھی۔

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

عقل کے خلاف اس لڑائی میں ولیم جیمز برابر کا حلیف تھا۔ غزل رسیلے انداز سے گائی جا رہی تھی۔ کمی فقط ساز کی تھی۔ یہ اس نے
ی کردی۔ ان دونے ہم عصر فکر پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ مداح تو انھیں بہت کچھ سمجھتے ہیں لیکن بڑے آدمیوں کی عام قسمت ہے
لوگ انھیں سراہتے بہت ہیں سمجھتے کم ہیں۔ لہٰذا مسیح موعود ان فلسفیوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ یہاں مجھے ان نظریوں کی تردید
بس کرنی ہے۔ یہ کام مجھ سے بدرجہا زیادہ قابل حضرات نے عمدگی سے انجام دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقل نے ثابت کر دیا ہے
دہ کمی نہیں ہے اس کے دشمن تکتے ہیں۔ اسے ذلیل نہیں کیا جا سکتا۔ خواہشات اور تعصبات کی دلدل میں چٹان کی سی مضبوط چیز
نا ایک ہے کوئی اسے چھوڑ دے۔ یہ اس کی اپنی پسند ہے، اُسے کون روک سکتا ہے مگر بچا بھی کون سکتا ہے۔ دلدل کا قاعدہ ہے اس
ں جو اترا ابھر نہیں ابھرا۔ نکلنے کی ہر تدبیر الٹی پڑتی ہے لیکن ہمیں کہنا صرف اس قدر ہے کہ عقل کی تحقیر معقول ہے۔ برگساں اور جیمز عقلی
زمی میں مصروف تھے۔ ہرچند یہ سرگرمی تخریبی تھی تاہم اس کے فلسفیانہ ہونے میں کلام نہیں ہے یہ مطلب زیادہ صاف الفاظ میں یہ ہے
دونوں مفکر فلسفہ آرائی کر رہے ہیں۔ فلسفہ کے وفادار ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی وفاداری باغیانہ قسم کی ہے۔ وہ خلوص اور
تقلال سے باور کرتے ہیں کہ فلسفہ عقل کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا موخر الذکر کا استیصال ضروری ہے لیکن ان کی بغاوت محبت
خدانہ ہے۔ ان کا نظام نیا نہیں ہے۔ وہ روسو یا پروٹاگورس کے زندقہ کا احیا ہے۔ پھر یہ بغاوت محض خودکشی ہے۔ فلسفہ غیر عقلی بن کر
سفہ نہیں رہتا نمکینی چھن جانے کے بعد نمک نمک نہیں ہوتا۔ صحیح طریق کار ایک ہی ہے کہ عقل کے آزادانہ فعل کی ہمت افزائی
جائے۔ اس کی خامیوں کو دور کیا جائے۔ اور بہ وقت تمام ہی کیوں نہ ہو اسے طاقتور بنایا جائے، ورنہ زیج کمی سے قوی اندیشہ ہے
حالت وجدان یا تشکیک سے سازش کرے اور نتیجۃً گمراہی عام ہو۔ بہرحال برگساں اور ولیم جیمز کے نظریئے عین فلسفہ ہیں۔ اسی طرح
ن کی تردید بھی فلسفہ ہے۔ اس حقیقت کی طرف ایک عام اشارہ ارسطو نے کیا ہے کہ اگر آپ فکر کے موافق ہیں تو فکر کر رہے ہیں اور اگر
پ فکر کے خلاف ہیں تو فکر کر رہے ہیں۔ کیونکہ اپنی بات آپ کو ثابت کرنی ہے۔ بہرحال آپ فکر کر رہے ہیں، اور واقعۃً فکر کو جانے بغیر
کر رہے ہیں) فلسفہ میں نظریہ اور عمل ایک ہیں یعنی صحیح طور پر سوچنے کے لئے ناگزیر ہے کہ سوچنے کی ابتدا اور مشق کی جائے۔ خواہ یہ کوشش
روع میں بے ڈھنگی ہی کیوں نہ ہو۔ غیر تربیت یافتہ ذہن بھی رفتہ رفتہ صحیح استدلال کے اصول اور اسالیب معلوم کر لیتا ہے۔ یوں ہم
ب عقل آرائی کرتے ہیں۔ کیونکہ دل سے چاہتے ہیں کہ ماحول سے ذہنی طور پر مطابق ہوں۔ لہٰذا غیر فلسفی محض سرائی نہیں کر رہے
نجیدگی سے تفلسف میں مشغول ہیں معقولیت کا اثبات اور اس پر اپنے یقین کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ چیز عقل کی تخفیف کے مغائر ہے۔
عمل کی تخفیف سے استفادے کے مغائر ہے۔

پھر مجھے یہ بھی تسلیم نہیں ہے کہ تخمین فلسفیوں کا کام ہے یا بڑے آدمیوں کا یعنی یا تو پیشہ ہے یا خبط ہے اور بہر صورت ایک خاص
لفنے کی چیز ہے۔ واقعے کے بیان کا یہ پیرایہ نامناسب ہے بلکہ کہنا چاہئے غلط ہے۔ کیوں کہ چھوٹے آدمیوں کے افکار کا وجود بدیہی ہے

جوڈ اُسے مانتا ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے: "چھوٹے آدمیوں کے تاملات کا تو کوئی ذکر نہیں" اس پر مبنی مضمون کی اس نے تکمیل نہیں کی۔ اسے غیر ضروری خیال کیا یا ناممکن جانا یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن آخری صورت ہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ مذکورہ تصور پر گہری نظر کرتا تو ظاہر ہو جاتا، اس کی توجیہ بے بنیاد ہے۔ عوام یہی نہیں جانتے کہ فلسفہ کس چیز کا نام ہے۔ اس کا کیا مصرف ہے، اس کا کوئی طریقہ بھی ہے، اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ لفظ فلسفہ ہی سے ناواقف ہوتے ہیں تو ان بیچاروں کو کیا خبر کہ اس کا موضوع وسیع ہے یا محدود۔ وہ تصدیق کے قابل ہے یا نہیں۔ اس میں موضوعی عنصر موجود ہوتا ہے یا مفقود اور آپ چلئے صرف اتنا بتا دیجئے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اشخاص میں سے کتنے اس سے آگاہ ہیں ——— بحث صحیح یا غلط معلوم ہوتی ہے نہیں ہے ——— تحلیل نفسی کا ماحصل یہ ہے۔ فلسفہ تغیر پر کہتا ہے۔ نتائجیت کی تعلیم یہ ہے کہ یقیناً بہت کم۔ جن سے توقع ہو سکتی ہے، اُن کا حال اس طرح یہ ہے تو رہبر دیا عامی کا کیا ذکر۔ لیکن عوام کو اگر ان چیزوں کی اطلاع نہیں ہے اگر وہ بالکل انجان ہیں تو انھیں تفلسف کی ترغیب عقل کی بے اعتباری سے نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ کچھ اور ہو گی، کچھ اور ہونی چاہیئے۔ لہٰذا عامیانہ افکار کا، جو دخطرناک ہے۔ وہ جوڈ کی توجیہ کو ختم کئے دیتا ہے مگر اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا فلسفہ بھی پروفیسروں یا سرمایہ داروں کا اجارہ نہیں ہے۔ دُنیا میں ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں۔ یہ ہیں عوام۔ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے پست اشخاص۔ ان میں ادنیٰ متوسط طبقہ کے شہری ہیں۔ پڑھے لکھے اور معمولی طور پر آسودہ، ان میں کسان اور مزدور ہیں۔ محنت کش اور مفلس، ان پڑھ یا معمولی طور پر پڑھے لکھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی بھینٹ۔ ان کے بھی دماغ ہیں، ان کے بھی نظر ہے۔ یہ غور و فکر کرتے ہیں فلسفیانہ نظر سے کام لیتے ہیں۔ بہر حال ہم سب سوچتے ہیں۔ عالم ہوں کہ عامی، خواص ہوں کہ عوام، یہاں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں ہے، دیج پنج کا فرق نہیں ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں ملٹن نے فردوسِ گم شدہ میں جہنم کا ایک منظر پیش کیا ہے۔ شیاطین بہاڑی پر عالی خیالات میں محو ہیں۔ زمین پر انسانوں کی حالت ان سے مختلف نہیں معلوم ہوتی۔ جارحانہ کارروائی، فرقہ وارانہ فساد اور معاشی لوٹ کے باوجود یہ خود فریبی بہت پُرلطف ہے۔ یہ ایں ہمہ آپ کی تسکین کی خاطر کو کہا جا سکتا ہے کہ شیاطین عذاب کا احساس کم کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں۔ انسان کے محرکاتِ فکر اتنے سادہ نہیں ہوتے یعنی ہم سوچتے بلاوجہ نہیں ہیں۔ ہمارے افکار متعین ہوتے ہیں بغیر کسی محرک کے ہمار عقل لڑانا بعید از فہم ہے۔ تفلسف ایک خشک، محنت اور اکتا دینے والی سرگرمی ہے، زندگی کے اہم اور آسان مشاغل کو چھوڑ کر اس میں کوئی کیوں لگے؟ مگر ہمارے محرکات بے حد پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں عقل کافی رسوا ہو چکی ہے جہل محض کو گہرے اور دقیق خیال سے تمیز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اطلاع بیکار ہے محض لذت کی خاطر کون غور و فکر کرتا ہے۔ ہر چند یہ ایک محرک فکر ہے مگر اس کے علاوہ چند اور بھی ہیں زیادہ اہم اور قابلِ قدر عقل آرائی کا نا قابلِ ضبط میلان کئی اجزاء سے مل کر بنا ہے ان کی قدر و قیمت مختلف ہے۔

یہ ہے عوامی فلسفہ بہر حال ہم سب فلسفی ہیں، ذہنی اعتبار سے نہ سہی واقعہ کی رُو سے تو ضرور ہیں۔ جوڈ اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نے واضح طور سے کہا ہے کہ فلسفے کی دُنیا میں بیوقوفوں کی بہتات ہے۔ یہ ہر چند برادر فروشی ہے، ناروا تلخ نوائی ہے

اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ بہ قول علامہ اقبال ہمیں سروکار گہر معنی سے ہے صدفِ بیان سے نہیں ہے۔ پھر کوئی گولی نگلتے ہوئے آدمی منہ
نا ہی ہے فلسفی کے لفظی معنی ہیں حکمت کا شیدائی۔ حکمت ہم میں خلقی طور سے موجود نہیں ہوتی۔ یا پوری طرح خلقی نہیں ہوتی۔ وہ ہمیں ملتی
اپنے معاشرتی ماحول سے۔ لیکن آدمی محض اس کی موجودگی سے فلسفی نہیں بنتا۔ آدمی تو فلسفی بنتا ہے اس کی شدید طلب یا محبت سے
ایسی طلب یا محبت بلاشبہ نوعِ انسان کا فطری خاصہ ہے۔ اس میں ماہر اور غیر ماہر کی تفریق نہیں ہے۔ ماناعالی کو اکثر اپنے فلسفہ کی خبر
میں ہوتی لیکن اس کے تمام افکار و افعال اسی سے فیضان پاتے ہیں۔ یہی ان افکار و افعال کی تصوراتی بنیاد ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ ذہنی پس
ظر میں رہتا ہے۔ اس نوبت پر کہا جائے گا کہ معمولی آدمی فلسفی ہو نہیں سکتا۔ وہ بطورِ خود مسائل پر آزادانہ اور مستقل طور سے غور و فکر نہیں
تا۔ یہ غلط ہے، وہ سوچتا ضرور ہے۔ البتہ اس کی فکر اصطلاحی فلسفیوں کی طرح عمیق اور منظم نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد یہ کبھی نہیں ہوتا کہ
ئی مکمل نظامِ فکر ترتیب دے۔ وہ تو محض اپنی تشفی چاہتا ہے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ دنیا کو پریشان کرنا اسے
نہیں آتا۔ لہٰذا اس کا فلسفہ حکمت کا مقبرہ نہیں ہوتا، متناسب اور خوب صورت بالکل تاج محل کی طرح۔ وہ تو ایک زندہ فلسفہ ہوتا ہے،
کہا جاتا "خونِ جگر" سے ہے۔ اس میں زندگی کا قلب دھڑکتا ہے۔ زندگی کی گرمی اور تڑپ ملتی ہے۔ زندگی کا تضاد جھلکتا ہے۔ وہ تجریدیں
میں معقولیت ہے۔ مگر یہ دعویٰ کیا آج قابلِ قبول بھی ہے؟ ہاں ضرور ہے، پیشہ ور فلسفی عامیوں کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی عقل آمائیوں
پر آوازے کستے ہیں۔ کیونکہ انہیں فلسفے کے اصطلاحی پہلو پر قدرت نہیں ہوتی۔ ان میں استدلالی چالاکی کم پائی جاتی ہے۔ مگر یہ کس نے
ہا کہ فلسفہ محض پیشہ ورانہ اور فنی مطالعہ کی چیز ہے۔ یقیناً اس سے دوسروں کو بھی دلچسپی یا عقیدت ہو سکتی ہے۔ ہو سکتی ہے کیا معنی۔
ہوتی ہے۔ یہ وہ ہیں جو حکمت، صداقت اور یقین کی سچی طلب رکھتے ہیں۔ ان کا فلسفہ اصطلاحی فلسفہ سے کچھ مختلف ہوتا ہے، ایک سادہ،
مبہم اور خام سی شے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں کہ معمولی، متمول ہوں کہ نادار، سن رسیدہ ہوں کہ نوعمر، اونچے عہدہ دار ہوں کہ ادنیٰ محصول
دہندہ، سب کے فلسفۂ حیات کی کم و بیش یہی حالت ہوتی ہے۔ فلسفے کا فنی سنجیدہ اور درسی مطالعہ جامعاتی تعلیم کا مضمون ہے۔ ہر شخص
علیٰ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ ہر شخص فلسفہ کا مضمون نہیں لیتا۔ بایں ہمہ ہر شخص کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ یہ چونکہ ہم سب کا ہوتا ہے لہٰذا اسے
معمولی فہم و فراست کا فلسفہ کہنا موزوں ہوگا۔ لیکن یہ نام رِیڈ اور اسٹیورٹ نے اپنے دبستان کے لئے پسند کیا ہے پھر اسے بعض
ثنویت پسندوں نے بھی استعمال کیا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ کوئی اور لفظ اختیار کیا جائے۔ بعض نے اسے سادہ ثنویت کہا ہے۔
بعض نے بازاری فلسفہ اور بعض نے غیر فلسفیوں کا فلسفہ۔ یہ نام لائقِ پذیرائی نہیں ہیں۔ ان سے پیشہ ورانہ برشتگی کی بو آتی ہے۔
ڈی۔ ایس۔ روبنسن نے اس قسم کے فلسفے کو عوامی فلسفہ کہا ہے۔ ہم اس کا اتباع کریں گے۔ پر یہ عامیانہ فلسفہ ہے آخر کیا؟

دنیا کی ہر بڑی اور اہم کتاب کا ایک پیام ہوتا ہے۔ زندگی اور کائنات کے متعلق ایک نقطۂ نظر۔ یہی اس کا فلسفہ ہے۔ گو وہ
لسفہ کی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح ہر بڑا شاعر، ہر بڑا فن کار، ہر بڑا قلندر، ہر بڑا مصلح ایک فلسفی بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کا مقصد یہ نہیں
ہے کہ فلسفی ہونا انسانی عظمت کی نشانی ہے۔ انسانی شرف کا معیار تو صرف ایک ہے۔ اچھی دنیا کی تخلیق، زندگی کے درد و شر میں امکانی تخفیف
نسانی بہبود اور مسرت کے بزرگ تر درجے تحقق اور اس کے لئے فلسفی ہونا ناگزیر نہیں ہے۔ میرا مطلب کچھ اور ہے۔ میں بتلانا چاہتا

ہوں کہ غیر فلسفیوں کا فلسفہ کیسا ہوتا ہے لیکن بڑے کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہو۔ یہ محض از راہ توضیح ہے۔ ہر شخص کے سامنے زندگی اپنے اور سب پہلوؤں کے ساتھ آتی ہے۔ دنیا اپنی گوناگونی اور پیچیدگی کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ ایک چھوٹی سی اقلیت بے شک سوچ و بچار کی قوی رغبت رکھتی ہے لیکن معمولی طور سے انسان دماغی مشقت سے بھاگتا ہے وہ سمجھتا ہے زندگی گزارنے کے لئے کسی غار یا تہ خانہ یا مطالعہ گاہ میں بند ہونا لازمی نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ لمحے اس کی زندگی میں ایسے آتے ہیں کہ وہ شدت سے محسوس کرتا ہے کہ کوئی یونہی سا معاملہ نہیں ہے —————— کئی امور اور مسائل ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ ان پر غور نہ کرنا زندگی سے غداری کے برابر ہے۔ نجات فرار یا انکار میں نہیں ہے مقابلے میں ہے، لہٰذا وہ دنیا اور زندگی کی طرف سنجیدگی سے پلٹتا ہے۔ ان پر غور و فکر کرتا ہے۔ پہلے تو کچھ حیران ہوتا ہے، لڑکھڑاتا ہے مگر بعد میں سنبھلتا ہے اور حسب حیثیت اپنے نتیجے اخذ کرتا ہے۔ اسے ضرورت یقین کے ایک زندہ نظام کی ہوتی ہے۔ اولاً زندگی گزارنے کے لئے اور پھر عقلی اور اخلاقی اغراض کے لئے۔ وہ ایک فلسفۂ حیات، ایک تصور کائنات ترتیب دیتا ہے۔ مگر اس میں مرتکز مسلسل اور مربوط فکر کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لئے وہ کوئی مکمل نظام تصنیف نہیں کر پاتا۔ اس کی دانش مختلف طریقوں سے مرتب اور محفوظ ہوتی ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔ مقولے، کہاوتیں، نکتے، ملفوظات، نصیحتیں، نثر، قسم کے اشعار، گہری باتیں، سبق آموز اخلاقی قصے، تشبیہات، اساطیر اور تمثیلات۔ نماز، روزہ اور دنیا جہان کی ہر چیز کے فلسفے اسی فرد میں آتے ہیں۔ عامی ہمیشہ دوسروں کے ذہن سے نہیں سوچتا اپنے دماغ سے بھی کام لیتا ہے لیکن سعدی اور میر سے حسب موقع استفادہ ضرور کرتا ہے۔ تاکہ اپنی روح سے آنکھ ملا کر کہہ سکے جتنی چیزیں باہر سے مل سکتی تھیں وہ سب میں نے سمیٹ لی ہیں۔

غالباً کچھ شرح اور چاہیے۔ فلسفہ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ وہ فکر کے ذریعے سے اشیاء کی تحقیق (ہیگل)۔ یہ چیز کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ یہ کیسے ہے؟ اس قسم کے سوالات ہر ذہن میں معمولاً پیدا ہوتے ہیں۔ ہم ان پر اپنی بساط کے موافق غور کرتے ہیں۔ غالب کے دو مشہور شعر ہیں ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

یہ آفتاب کیا، یہ سپہر بریں ہے کیا؟ سمجھا نہیں تسلسل شام و سحر کو میں
اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں
کھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں
حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

کچھ تفصیل اور سنئے:۔

اب ہم اسٹون سے "فطری فلسفی" کی تعریف سنئے:۔

"ہاں چرواہے تجھ میں کچھ فلسفہ بھی ہے؟"

"ہاں، صرف اتنا، میں یہ جانتا ہوں آدمی اگر بیمار زیادہ ہو تو اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ زر، ذریعہ اور قناعت تین بہترین دوست ہیں، یہ جسے میسّر نہیں وہ بڑا بدقسمت ہے۔ بارش سے نمی پیدا ہوتی ہے۔ آگ جلاتی ہے۔ اچھی چراگاہوں میں بکریاں جلد موٹی ہوتی ہیں۔ رات، سورج کے ڈوب جانے کا نام ہے۔ فطرت سے عقل و فن سیکھئے۔ جس نے ایسا نہیں کیا وہ اچھی تعلیم سے محروم ہے۔ اس کے ماں باپ دور اندیش نہیں تھے۔"

بحث کا نچوڑ اے۔ ایس۔ راپوپورٹ کے الفاظ میں یہ ہے: "انسان کو حیوان پر فوقیت ہے۔ اس لئے کہ اس میں قوت فکر پائی جاتی ہے۔ حیوان بھی دیکھتا اور سنتا ہے لیکن وہ ان قوتوں سے فوری ضرورتوں کی تسکین کا کام لیتا ہے۔ اس کے برعکس انسان حیات اور فطرت کے گوناگوں مظاہر کو دیکھتا ہے۔ ان کی باہمی اضافات پر غور کرتا ہے اور ان کے متعلق استدلال کے ذریعے سے تعقلات اور تصورات ترتیب دیتا ہے تاکہ مجموعی حیثیت سے کائنات کی توجیہ کرے۔ اشیاء کا صحیح مفہوم سمجھے۔ اس چیز کی کوئی عملی اہمیت نہیں ہے۔ اسی لئے اسے فلسفیانہ نظر کہتے ہیں۔ اشیاء پر ایسی نظر ڈالتے ہوئے ہم کرتے کیا ہیں؟ ہم ان کے متعلق سوچتے ہیں . . . . ان کی ماہیت، ان کے ماخذ، ان کی حقیقت اور ان کے علائق پر غور کرتے ہیں۔ ان امور پر کسی نہ کسی وقت ہر شخص توجہ کرتا ہے۔ اسی لئے اوسط درجے کی عقل کا آدمی ایک حد تک فلسفیانہ نظر سے کام لیتا ہے اور کم و بیش فلسفی ہوتا ہے بشرطیکہ حسی لذتوں میں غرق نہ ہو۔" (کتاب مذکورۂ بالا ص۲) ایک اور جگہ یہی مصنف لکھتا ہے: "فلسفہ زندگی سے جدا نہیں ہے۔ وہ ہماری اسی زندگی سے متعلق ہے۔ کائنات اس کی درس گاہ ہے۔ مظاہر و آثار فطرت اس کا موضوع بحث ہیں اور عقل انسانی اس کی درسی کتاب ہے۔ وہ ہر شے سے بحث کرتا ہے، خواہ یہ شے دنیا ہو، اس کے مظاہر ہوں، حیات ہو یا ہماری باطنی زندگی۔ اس کا دائرۂ عمل بے حد وسیع ہے۔ یہ ذات سے لے کر افلاک تک کو محیط ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی میں کسی نہ کسی وقت ضرور فلسفی ہوتا ہے۔ کیونکہ عالم اور حیات پر سوچ بچار کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک انسانی عقل ہے فلسفی بھی ہے۔" (کتاب مذکورۂ بالا حسن خاتمہ) جی۔ کے۔ چسٹرٹن نے ایک کتاب لکھی ہے "زنادقہ"۔ اس کے دیباچے میں وہ کہتا ہے: "بعض اصحاب فرماتے ہیں کسی شخص کے متعلق دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کائنات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ یہ کوئی بے بنیاد یا معمولی چیز نہیں ہے۔ اسے سب سے زیادہ عملی اور اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک آدمی مکان کرایہ پر لینا چاہتا ہے۔ بلاشبہ مالک مکان کو اس بات کی جانچ پڑتال کر لینی چاہیئے کہ کرایہ دار کون ہے؟ وہ کیسا ہے اس کی حیثیت اور آمدنی کیا ہے؟ مگر طبیعت اور حیثیت سے بڑھ کر دریافت طلب ضروری امر کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ جاننا ہے کہ کرایہ دار کا فلسفہ کیا ہے؟ اگر کوئی سپہ سالار جنگ کی سوچے تو اس پر یہ معلوم کرنا لازم ہے کہ غنیم کی تعداد کیا ہے، اس کے اسلحہ کیسے اور کتنے ہیں؟ لیکن تعداد اور اسلحہ سے زیادہ اہم اطلاع یہ ہے کہ غنیم کا فلسفہ کیا ہے؟ سوال محض اس قدر نہیں ہے کہ نظریہ کائنات کا اثر دنیوی معاملات پر کیا پڑتا ہے؟ بلکہ یہ ہے کہ بالآخر اس کے سوا کسی اور شے کا اثر پڑتا بھی ہے؟" ولیم جیمز کی رائے بالکل یہی ہے۔ "نتائجیت" اس کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ اس کے افتتاحی خطبے میں وہ لکھتا ہے: "خواتین و حضرات! میں یہ بخوبی جانتا ہوں ہم میں سے ہر ایک کا ایک فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ ہمارے نقطۂ نظر کی تعیین کرتا ہے۔ یہی انداز ہمارے متعلق سب سے اہم، سب سے دلچسپ چیز ہے . . . ہمارا یہ فلسفہ کوئی حقیر یا رسمی شے نہیں

ہے۔ وہ نام ہے زندگی کے حقیقی اور گہرے مفہوم کے خاموش احساس کا۔ یہ احساس ہمارے قلب کی گہرائیوں میں پایا جاتا ہے۔ کتابوں سے اس کا صرف ایک حصہ حاصل ہوتا ہے یہ ہمارا خالص شخصی اور انفرادی طریقہ ہے۔ اسی سے ہم دنیا کی سرگرمی اور کشمکش کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ (ص ۲۵۰) ایڈورڈ اشپرانگر کہتا ہے "تغیرات کا سرچشمہ نئی واردات قلب ہیں۔ یعنی اپنی ذات اور کائنات کا نیا احساس۔ اس میں بڑے بڑے مسئلے پوشیدہ ہیں۔ خواہ انھیں ہم الفاظ و تصورات میں ظاہر کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ نوجوان کے دل میں زندگی کا عظیم الشان معما کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ جدت کے سبب سے یہ خلش اور گہری ہوتی ہے۔ زندگی سے خود نت نئے مابعد الطبیعی مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں اب تک بہت سے نقیض ہیں۔ جو دور نہیں ہوئے۔ اور جن کا پہلو بہ پہلو رہنا ناممکن ہے۔ مگر مبدء فیاض نے خود ہمارے اندر ان مشکلات کا ایک عارضی حل پیدا کر دیا ہے۔ . . . اس کا نام ہے داخلی احساس زندگی۔ یہ مجموعی احساس حیات ایک طرح کا سربستہ فلسفہ ہے نوجوانوں بلکہ سب سادہ دلوں کے فلسفیانہ نظریہ کی جڑ ہے۔ یہ نظریئے مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں . . . . نوجوانی میں احساس شخصیت کی مجموعی کیفیات بہت سے رنگ بدلتی ہیں۔ آہستہ آہستہ بہت دن میں جا کر ان کی مخصوص ترکیب نفسی وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ فلسفیانہ غور و فکر محض ایک ذریعہ ہے جستجوئے نفس اور تشکیل نفس کا۔ نوجوانوں کو یہ دعویٰ نہیں ہوتا۔ ان کے فلسفیانہ خیالات خارجی حقیقت پر مبنی ہیں۔ پھر بھی انھیں وہ کلی اصول قرار دینا چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے داخلیت کے اس دور میں بہت بھولا پن ہوتا ہے۔ نوجوان احساس ذات کے نقطہ کو ذہنی دنیا کا مرکز سمجھ لیتے ہیں۔ مگر پختہ کارانہ فلسفے کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جبکہ انسان اپنے نفس کو مغلوب کر چکا ہو۔ اور اپنی ذات کو بھی زندگی کے عظیم الشان قانون کی محض ایک خاص شکل سمجھنے لگا ہو۔ یہ ایک دور دراز اور دشوار گذار راہ ہے۔ تاہم نوجوانوں کے بھولے خود ساختہ نظریئے اسی راہ کے ابتدائی مرحلے ہیں" (نفسیات بعنوان شباب مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین ص ص ۳۰۴، ۳۰۵) ڈبلیو۔ ای۔ ہوکنگ رقم طراز ہے "نوجوانی کے زمانے میں آدمی تخلیق کا ایک نہایت اہم کام انجام دیتا ہے یہ ہے اپنے فلسفے کی تشکیل۔ اس سے کوئی بچتا نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ نوجوان اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں میں برابر کا پاتا ہے۔ رتبہ اقتدار میں تغیر رونما ہوتا ہے . . . قابلیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ تنقید کا میلان پیدا ہوتا ہے۔ جوانی میں اپنی رائے پر غرور کوئی اوچھا پن نہیں ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے۔ ذمہ داری کی قبولیت اور ذہنی تعمیر کے لئے آمادگی . . . نوجوان پہلی مرتبہ اس بات کا احساس کرتا ہے کہ اسے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ وہ اخلاقی طور پر اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اب اسے اس کی برداشت نہیں ہوتی کہ چیزوں کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے" (فطرت انسانی اور اس کی جدید تشکیل ص ۲۴۳)

عامیانہ فلسفہ اور ارتقائے فرد آپ نے اندازہ کیا ہوگا۔ فلسفہ ہمارے وجود کے رگ و پے میں بہت دور پھیلا پڑا ہے۔ فرد ابھی عقلی پختگی کو نہیں پہنچا ہے۔ اس کا شعور ذات پوری طرح مکمل نہیں ہوتا ہے۔ اس کی جامعی تعلیم بھی شروع نہیں ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ہستی کے اسرار سے مشتعل اور مسحور پاتا ہے۔ دنیا کی بے پایانی اور زندگی کے عظیم ذخیرے کا مبہم احساس اسے بے چین کر دیتا ہے۔ قوی عقلی تجسس اسے ترغیب دیتا ہے۔ خودی کا تیز جوش اسے اکساتا ہے۔ نتیجتاً اس کا صورت پذیر نفس ایک بڑی گتھی سے الجھ پڑتا ہے۔ ہر چند وہ مؤخر الذکر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی ساز و سامان نارسیدہ ہوتا ہے مگر وہ اس چیز کو

مالی سے چھوٹنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ نوجوانی مزاحمتوں کا صحیح اندازہ نہیں کرتی۔ انھیں خاطر میں کم لاتی ہے۔ اپنی سی کئے جاتی ہے۔
حال وہ خود دنیا پر اور دنیا میں اپنے مقام اور مستقبل پر کرتا ہے۔ فطرت اور انسان کے باہمی تعلق کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اور ان کی مشترکہ
ل کے بارے میں قیاس آرائی سے کام لیتا ہے۔ اسے بصورت احتیاج حکمت اور صداقت کے ملتے ہوئے یقین کی ہوتی ہے۔ اس
یح ایک نظریۂ حیات، ایک فلسفۂ کائنات رفتہ رفتہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ ایک عقلی تعبیر یا توجیہ ہے ہستی کے جملہ مسئلوں کا وحدت یافتہ حل۔
اس میں قابلِ اعتراض کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہماری دلچسپی کی پوری چیزیں موجود اور محفوظ رہتی ہیں۔ یہ ہماری ایک عام اور مثالی خواہش
کوشش ہے۔ ہم ایک مقصد کو بہترین سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے خیالات، احساسات اور اعمال کو منظم کرتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ
وجہ کن امور کے لئے کرنی یا ہونی چاہئے۔ ہمارا یہ تصورِ کائنات ہمارے جملہ افکار و اعمال میں جاری و ساری رہتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ کسی کا
، سٹاک ایکسچینج کا ہو، چرواہے کا ہو، عام رہرو کا ہو، یہ دراصل ایک سنجیدہ چیز۔ اسے نظرِ حقارت سے دیکھنا بہت ہی سطحی حرکت
ہے۔ اس کے لئے فلسفیانہ پس منظر کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے لئے تنقیدی تربیت غیر ضروری ہے۔ عامیانہ فلسفہ کا بہت ہی معمولی
و ضبطِ تحریر میں آتا ہے۔ بڑا حصہ یا تو ملفوظی شکل میں ہوتا ہے۔ یا پھر تحریر اور تقریر میں آئے بغیر موجود اور مؤثر رہتا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی
خلا میں سوچتے یا سوچ سکتے ہیں۔ ہر فرد کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اسی انداز سے وہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو دیکھتا ہے۔ اسی انداز
ے وہ اشیا اور اشخاص کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں۔ ایک چیز کو مشاہدین مختلف نقاط سے دیکھتے ہیں۔
لف تناظرات حاصل کرتے ہیں۔ یہ تناظرات مساوی طور پر حقیقی ہوتے ہیں اور مساوی طور پر شخصی ہوتے ہیں۔ کسی مشاہد کی جگہ دوسرا نہیں
سکتا۔ معمولی فرق سے تناظر بدل جاتا ہے۔ مگر یہ پھر بھی کوئی مکمل تشبیہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مشاہدین کی جگہ کیمروں کو رکھ دیجئے۔ ان کی لی
ہوئی تصویروں میں بھی شخصی عنصر ملے گا۔ لہٰذا انداز کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ یہ محض مزاج نہیں ہے، اس کے ترکیبی اجزا میں مزاج
، تعقل فکر ہے، تجربے ہیں، خواہشیں ہیں، تمنائیں ہیں، امیدیں ہیں، خوف ہیں، تعصبات ہیں، توہمات ہیں۔ مختصر یہ کہ عامیانہ فلسفے
شخصی رنگ بہت گہرا ہوتا ہے۔ وہ بڑی حد تک ایک تخلیق ہے۔ اس میں فن کار کا تصور مجسم ہوتا ہے۔ اس میں فن کار کا تاثر ابھرتا ہے
ں میں فن کار کی شخصیت جھلکتی ہے۔ آدمی عقل آرائی کرتے ہوئے واقعات پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ واقعات سے زیادہ ان کے معنی اور
میت سے سروکار رکھتا ہے۔ معنی اسے کسی شے میں ملتا ہے۔ اہمیت وہ کسی دلچسپ شے کو دیتا ہے۔ اور یہ امور فرد اور سماج کے ساتھ
ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔ تثمین یا تعیینِ قدر کا کام اعلیٰ درجے کے شخصی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ کس کو چننا، کس کو رد کرنا، یہ چیز کلیتہً ہماری
منحصر ہے۔ یہ انداز بحث و توجہ کی اشیا کو متعین کرتا ہے۔ بحث و توجہ کے طریقے کو متعین کرتا ہے۔ بحث و توجہ کے نتائج کو متعین
رتا ہے۔ واقعات تو ہم سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے نتائج ہم بالکل مختلف اخذ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم مختلف افراد
وتے ہیں۔ یوں ہماری راہیں واقعات پر مبنی نہیں ہوتیں۔ واقعات کی تعبیر و توجیہ پر مبنی ہوتی ہیں یعنی خیالی و اشارتی یقینیات پر مبنی ہوتی
یں۔ اور جب ہم ایک مرتبہ واقعے کی سرحد عبور کر جاتے ہیں۔ اسے معنی عطا کرتے ہیں۔ اس سے معنی اخذ کرتے ہیں تو ہماری شخصیت یا
ہمارے انداز کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ عامیانہ فلسفہ میں داخلی، تاثری اور تخیلی کیفیت بہت ہوتی ہے ــــ اس کی وجہ یہی ہے مگر یہ محض

تخلیقِ خیال آرائی نہیں ہے۔ یہ محض جذبات کی تسکین کے لئے نہیں ہے۔ بے شک یہ منطقی طور پر ناقص ہوتا ہے، مدعیانہ ہوتا ہے نظا ہوتا ہے۔ تجربہ و عقل کے سوا علم کے اور ذریعوں کو تسلیم کرتا ہے۔ تاہم اس میں تخیل کے علاوہ کچھ تعقل بھی ملتا ہے۔ یہ جذبہ کے ساتھ ساتھ تجسس کو بھی آسودہ کرتا ہے۔ اس طرح یہ بہت زیادہ شخصی اور موضوعی بیان ضرور ہے۔ پر ایک حد تک کائنات اور زندگی کی تصویر ہے ہم دنیا میں رہتے ہیں، دنیا سے ربط و اتصال رکھتے ہیں۔ دنیا کے متعلق سوچتے ہیں۔ زندگی بیداری کو مستلزم ہے، اونگھتے نہیں کر سکتی۔ انسان کا یہ شخصی فلسفہ ایک نہایت قیمتی جنس ہے۔ جیمز کہتا ہے۔ یہ زندگی اور کائنات کو ایماں داری اور تعمق نظر سے دیکھنا ہے یہ ان چیزوں کے معنی اور اہمیت دریافت کرنا ہے، اس فلسفے اور اس کے محرکات و مبادیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کا بہترین طریقہ ہے کہ ہم ارتقائے فرد پر نظر کریں۔ صرف اس طرح ہم جان سکتے ہیں کہ معمولی فہم و فراست کے فلسفہ کی بنیادیں کیا ہیں؟

انسان اور حیوان میں فرقِ عقل و نطق سے کیا جاتا ہے۔ حیوان کو کہتے ہیں حیوانِ مطلق۔ انسان کو کہتے ہیں حیوانِ ناطق۔ عقل و نطق میں باہم گہرا تعلق ہے۔ الفاظ فکر کا ذریعۂ اظہار بھی ہیں۔ اور تصورات و تعقلات کو ہمارے ذہنوں میں قائم رکھنے کے موجب بھی لیکن عقل و ہوش سے زیادہ اہم ان کے مخصوص نقائص ہیں۔ یعنی اصل خطِ امتیاز انسان کی استعداد جنون ہے۔ شاخِ گل کا سایہ حیوان کے لئے صرف آرام کی چیز ہے لیکن وہ انسان کو اپنی نظر آتا ہے عشق اور خفقان کے مضامین شاعروں نے کئی طریقوں سے باندھے ہیں ان میں لطف و استنان اور جوہر طبع کے علاوہ کچھ گہری سچائی بھی ہے۔ افراد انسانی اوسط سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ہر قابل قیاس سمت میں مختلف ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم سب بچوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ ہم میں زندگی کے جملہ حالات اور منازل میں برابر موجود اور موثر رہتا ہے۔ معمولی بروز کے دوران میں فردِ ذہنی اعمال کو خارجی حقیقت کے مطابق کرتا ہے اور ہوش مند بنتا ہے۔ لیکن جملہ نازک وقتوں میں وہ بچپن کی ذہنیت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ فسادِ نفسی کی حالت میں انسان بچہ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمیں بچے کی خصوصیات پر غور کرنا چاہیئے۔ اس کے ابتدائی ماحول اور تعلیم کے عوارض و حالات کو دیکھنا چاہیئے۔ (باقی)

صدق جائسی
(از اورنگ آباد دکن)

غزل

ہ مست آنکھیں جنھیں تڑپا کے چھپتا نہیں آتا
انھیں افسوں نہیں آتا کہ افسانا نہیں آتا

قاب سردمہری بدنما ہے روئے زیبا پر
کہ ٹھنڈی شمع کے نزدیک پروانا نہیں آتا

شودِ کارِ دل موقوف ہے چشمِ عنایت پر
ابھی شانے کو ہر گتھی کا سلجھانا نہیں آتا

فائے غیر برحق، دل کو سمجھاؤں مگر کیوں کر
نہیں آتا ہے جب پہلو پہ دیوانا نہیں آتا

رہے سبزہ ہرا جس نے لحد کی آبرو رکھ لی
سنا تھا بیکسی میں کام بیگانا نہیں آتا

ادا اذنِ حضوری دے جسے وہ روبرو جائے
جلو میں آئینے کے آپ سے شانا نہیں آتا

گھٹا سو بار دیکھی ہے مگر ایسی نہیں دیکھی
کہیں زاہد تو رندو سوئے میخانا نہیں آتا

چلو مسجد میں بزمِ وعظ ہے دم بھر کو ہو آئیں
تمھیں فرقت میں دل اے صدق بہلانا نہیں آتا

حضرتِ سلام مچھلی شہری
(از لکھنؤ)

ایک خط کا جواب

آج میں لکھ تو رہا ہوں تمھیں یہ خط لیکن
کوئی دشمن مرا مفہوم بدل دے نہ کہیں
خود تمھاری ہی کوئی بدلی ہوئی سخت نظر
میرا یہ جذبۂ معصوم بدل دے نہ کہیں

اپنے کردارِ محبت پہ بھروسا کر کے . . .
آج لکھنا ہیں بہرحال مجھے چند سطور
دل کی وہ بات جو چھپی ہے اک مدت سے
آج آجائے زباں پر تو بھلا میرا قصور ؟

تم کو حیرت تو نہیں ہوگی کہ میرے دل میں
خود تمھاری ہی کوئی بات نہاں ہے شاید
حُسن کی صبحِ سمن بار خرامیدہ ہے
عشق کی تاروں بھری رات نہاں ہے شاید

اس سے پہلے کہ میں یہ بات مکمل نہ کروں
میری تحریر کے آغاز سے مت گھبرانا
بات کہنے کے لئے بات بنا لینے دو . . .
بہکے بہکے سے اس انداز سے مت گھبرانا

اے نہ ہے عہدِ گزشتہ کی یہی شامِ اودھ
جلوہ گاہِ ادب و شعر نظر آتی تھی
اور وہ ایک پری چہرہ کہ جو وقتِ خرام
آئینے چار طرف دیکھ کے کتراتی تھی

یہی ہم لوگ کہ ہیں آئینۂ پیکرِ وقت
جائزہ نقشِ مقابل کا لیا کرتے ہیں
ہم سے ٹکرا کے تصاویر تو مٹ جاتی ہیں
اور ہم لوگ بہرحال جیا کرتے ہیں

شاعری فکر کے کردار کی زیبائش ہے
اور خود اپنا یہ کردار سمجھتا ہوں میں
صنفِ نازک ہمہ شعلہ، ہمہ جلوہ، لیکن
احترامِ لب و رخسار سمجھتا ہوں میں

تم سے شکوہ ہے کہ روزانہ ملاقات میں بھی
تم نے جب بھی کوئی موضوعِ سخن چھیڑا ہے
تم کو اس بات کا احساس تھا، بھرپور احساس
ایک عورت" کے مقابل دلِ شاعر کیا ہے؟

میں نے جب لالہ و شبنم کی کہانی چھیڑی
تم نے چپکے سے کہا ——

ن ڈھل جانے پہ پھولوں کا تبسم دیکھو!
ں نے سازِ غمِ دل کو بھی اگر جنبش دی
م نے ہولے سے کہا —
مہرِ اربابِ گلستاں کا ترنم سُن لو!

تم نے کچھ بھی نہ کہا اور میں یہ سوچا کیا
ن تمھاری خموشی کا بھی مطلب ہے
تم نے باتیں بھی اگر کیں تو میں یہ سمجھا کیا
تیری لفظوں کو مفہوم سے نسبت کب ہے

میں تھکا ہارا سا تھا تم نے بڑھا کر بوتل
میرے کردارِ محبت کو پرکھنا چاہا
گھٹا گھر آئی، فضا ہنسنے لگی، میں نے بھی
ساغرِ لالہ میں انگاروں کو رکھنا چاہا

تم نے اک بربطِ افسردہ کو جنبش دے دی
گیت رقصندہ ہوئے —
تم یہ گھبرائیں کہ گیتوں کی صدا تیز نہ ہو
تم نے خود راکھ کو چھو کر اسے سوزش دے دی
ذرّے تابندہ ہوئے —
تم نے سوچا کہ یہ آتش ہے، ہوا تیز نہ ہو!
اور اب آنچل کو سمیٹے ہوئے یہ کہتی ہو
"میں تو یہ آگ لگانے کو نہیں آئی تھی"
ساز کو چھیڑ کے کہتی ہو "یہ نغمہ کیسا؟"
میں یہاں خود کو لٹانے تو نہیں آئی تھی!"

کتنی معصوم ہو، اس طرح پریشان نہ ہو
تم نے پرکھا تو مجھے پھر بھی کسر باقی ہے
اپنے کردار کی سوگند کہ میرے دل میں
عظمتِ مریم و سیتا کا اثر باقی ہے!

تم نے آئینے سے "عورت" کی حقیقت پوچھی
آئینہ ٹوٹ گیا —
تم نے صیاد سے گلزار کی حالت پوچھی
وہ تمھیں لوٹ گیا —
اور خطا اس میں تمھاری ہے نہ میری تقصیر
تم وہی زہرۂ تخئیل ہو، میں اب بھی سلام

"ایک شاعر نے غریبی میں محبت کی تھی"
اور اک بات بھی سوچو، تو مری زیست حرام
میری تقصیر کہ موضوعِ سخن کی خاطر
میں نے ہر خط میں نئی بات کا آغاز کیا
میری تقصیر کہ بے بال و پری کے باوصف
میں نے جذبات کو آمادۂ پرواز کیا

تم ہمیشہ مری نظروں میں ہو قرآں پہ جبیں
میں تمھیں چھونے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا
میرے کردار میں لغزش تو نہیں آئے گی۔
وعدۂ ترکِ محبت بھی نہیں کر سکتا۔

سلام مچھلی شہری

امین الرحمٰن

پشاور کے بچھو

پشاور آنے سے پہلے بچھوؤں کے متعلق میری واقفیت صرف اتنی تھی کہ کبھی بچپن کے زمانے میں قاعدہ میں میں نے یہ پڑھا تھا کہ بچھو سے کسی نے پوچھا کہ تو جاڑے میں باہر کیوں نہیں نکلتا؟ تو (اس نے کہا) "گرمیوں میں میری کون سی خاطر ہوتی ہے کہ جاڑے میں باہر نکلوں"۔ مجھے اعتراف ہے کہ پشاور آنے سے پہلے بچھوؤں کے متعلق میری تمام معلومات صرف اتنی ہی تھیں جنھیں ہمارے قاعدے میں ایک لطیفے کے طور پر بیان کیا گیا تھا اور پشاور کے قیام نے مجھے بچھوؤں کو قریب سے دیکھنے، انھیں سمجھنے، ان پر غور کرنے اور ان سے ڈرنے کے اس قدر مواقع بہم پہنچائے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو اب انھیں بچھوؤں کی زندگی، ان کی طرزِ معاشرت، ان کی عادات، ان کے اخلاق و آداب، ان کے اسرار و رموز پر ایک ضخیم کتاب لکھ سکتا ہوں!

پشاور پاکستان کے ان چند شہروں میں سے ہے جن کی قدیم زمانے سے رزم و بزم کی اپنی روایات چلی آتی ہیں۔ اہلِ پشاور ایک خاص قسم کی طرزِ معاشرت رکھتے ہیں جس کی اپنی بلند پایہ خصوصیات ہیں۔ ایک خاص قسم کی وضع داری یہاں کے لوگوں میں پائی جاتی ہے جس کی اپنی الگ روایات ہیں۔ اور پھر یہی نہیں۔ اگر خارجی صفات کے لحاظ سے پشاور کو دیکھا جائے تو یہ شہر اور بھی زیادہ خوبیوں کا حامل نظر آئے گا۔ صاف شیریں پانی، توانائی بخش ہوا، آنکھوں میں کھب جانے والا سبزہ، سدا بہار دنیا کی یہ پشاور کی خصوصیات ہیں۔ خیبر، مہمند، کوہاٹ اور چراٹ کے سرمئی پہاڑ اس شہر کے چاروں طرف ایک ہیبت ناک شکوہ سے کھڑے ہیں۔ بازار میں نکل جاؤ تو پھل ہی پھل دکھائی دیں گے۔ کابل کے سردے، قندھار کے انار، تیمن کا انگور، ادھر سرخ و سپید سیب، زرد خوبانیاں اور وہ تمام خوش ذائقہ پھل جن کے لئے اٹک کے اُس پار کے لوگ ترستے رہتے ہیں۔

یہ پشاور ہے۔ گندھارا تہذیب کا گہوارہ، شمال سے آنے والے حملہ آوروں کی ترکتاز کا پہلا ہدف، "قصہ خوانی" جیسے رومانی بازار کا مالک ـــ اور گرمیوں میں خوفناک بچھوؤں کی تربیت گاہ!

پشاور کے بچھوؤں سے غائبانہ تعارف مجھے اسی رات ہوگیا تھا جس رات میں عازمِ پشاور ہوا۔ میری بدقسمتی دیکھئے کہ میں پشاور آیا بھی اس موسم میں جو بچھوؤں کے عنفوانِ شباب کا موسم ہوتا ہے اور جس میں بچھوؤں سے براہِ راست سابقہ پڑتا ہے۔ گاڑی کے جس ڈبے میں میں سفر کر رہا تھا وہیں اتفاق سے ایک بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے جو وضع قطع اور لب و لہجہ سے پشاور کے رہنے والے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے افسردہ دیکھ کر بڑی محبت سے مجھ سے گفتگو فرمانے لگے:

"ـــ تو آپ پہلی مرتبہ پشاور تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں پہلی مرتبہ ہی سمجھئے ـــ"

"کیا مطلب؟"

"پشاور جانے کا اتفاق تو اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے لیکن صرف تین دن تک وہاں ٹھہرا تھا۔"

"خوب۔ اور اب؟"

"اور اب یوں سمجھئے کہ ایک غیر معین عرصہ کے لئے جا رہا ہوں۔"

"خوب۔ غیر معین عرصے کے لئے؟"

"جی ہاں۔ غالباً آپ نے میری آنکھوں کو غور سے نہیں دیکھا جو اسی غم میں رو رو کر سوج گئی ہیں —"

"خوب۔ لاہور چھوڑنے کا غم ہے؟"

"جی ہاں زندگی میں پہلی بار لاہور سے ایک غیر معین عرصہ کے لئے جدا ہونا پڑا ہے، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر اور ولوں۔ میرا خیال ہے پانچ منٹ میں دل کا غبار کافی نکل جائے گا۔"

وہ بزرگ میری اس صاف گوئی پر مسکرائے اور بولے "تو بہت خوب، میں اتنی دیر میں وضو کر لیتا ہوں۔"

میں نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال لیا۔ ہم شاہدرہ سے آگے نکل آئے تھے۔ اور اب پاکستان میل کا طاقتور انجن فراٹے بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا، اور دھوئیں کے منگنے متوازی اپنے پیچھے چھوڑ رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں لپٹے ہوئے درخت، کھیت، مکان اور تار کے کھمبے وغیرہ بڑی تیزی کے ساتھ گزرتے چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بزرگ وضو سے فارغ ہو کر بولے "اب اطمینان سے باتیں کیجئے گا۔"

میرا اس وقت باتیں کرنے کو مطلق جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی کڑا کر کے بولا "جی!"

وہ بزرگ بولے "پشاور خوب جگہ ہے برخوردار۔ اس لئے نہیں کہ میرا شہر ہے بلکہ اس لئے کہ واقعی خوب جگہ ہے۔ آب و ہوا بہت اچھی، بڑے کا گوشت، تکے کباب، تازہ پھل، قہوہ اور خمیری روٹی یہاں کی عجیب چیزیں ہیں۔ آپ یقیناً انھیں پسند کریں گے۔"

میں ان بزرگ کی باتیں سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس لئے کہ میں ایک ایسے شہر کو جا رہا تھا جو میرے لئے تقریباً اجنبی تھا، اس لئے میں بھی ان بزرگ سے بعض مفید باتیں پوچھنا چاہتا تھا جو پردیس میں کام آئیں۔ وہ بولے "آپ اکیلے ہی سفر کر رہے ہیں یا بال بچے بھی؟"

"جی نہیں اکیلا ہی سفر کر رہا ہوں۔"

"بال بچوں کے بغیر پردیس میں آپ کا دل کیسے لگے گا؟"

"لگانے کی کوشش کروں گا۔"

"تو خیر بال بچوں کو بعد میں بلوا لیجئے گا۔"

"جی نہیں، انھیں بلوانے کا کوئی سوال ہی نہیں۔"

"خوب، وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ میری تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔"

"خوب! دراصل میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ آپ پہلی مرتبہ پشاور جا رہے ہیں نا، اس لئے۔"
اب تو میں چونکا اور دل ہی دل میں ڈرا کہ نہ جانے کیا بات ہے جس سے یہ بزرگ مجھے آگاہ کرنا چاہتے ہیں سوچنے لگا یقیناً کوئی اہم معاملہ ہوگا جبھی انھوں نے آگاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ میں سہمی سہمی نظروں سے اُن بزرگ کو دیکھنے لگا۔ وہ بولے:۔
"آپ چونکہ گرمیوں میں پشاور جا رہے ہیں اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو پشاور کے بچھوؤں سے خبردار کر دوں۔ ذرا ان سے محتاط رہیئے گا!"
بچھوؤں کا نام سن کر میں ایک دم حیرت سے اپنے برتھ سے تقریباً اچھل پڑا۔
"کیا فرمایا آپ نے؟"
"جی ہاں بڑے موذی ہوتے ہیں یہ پشاور کے بچھو!"
اب تو میں واقعی گھبرا گیا مگر یقین نہ آیا کہ بڑے میاں واقعی سچ فرما رہے ہیں بولا "آپ بچھوؤں ہی کے متعلق فرما رہے ہیں نا، سچ مچ کے بچھوؤں کے متعلق؟"
"تو آپ کیا سمجھے تھے میں سیلولائیڈ کے بچھوؤں کے متعلق آپ سے باتیں کر رہا ہوں؟"
یہ کہہ کر انھوں نے میری سادگی پر ایک زور کا قہقہہ لگایا قہقہہ کیا تھا بچھوؤں کے متعلق میری ناواقفیت پر ایک چبھتی ہوئی سی طنز تھی۔ جون کا مہینہ، احساس کمتری سے پسینہ چھوٹ گیا مگر فوراً ہمت کر کے اور بڑے اعتماد سے بچھوؤں کے متعلق اپنی واقفیت جتانے کے لئے بولا!
"آپ بچھوؤں ہی کے متعلق فرما رہے ہیں نا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچھو سے کسی نے پوچھا کہ تو جاڑے میں باہر کیوں نہیں نکلتا تو بولا،"
وہ بزرگ میری بات کاٹ کر بولے: "جی ہاں جی ہاں وہی بچھو، ماشاءاللہ اب آپ سمجھ گئے۔"
رات زیادہ گزر چکی تھی۔ نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور ان بزرگ نے بچھوؤں کے متعلق جو خبردار کیا تھا اس نے میرے دل و دماغ کو ایک عجیب وحشت آمیز مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اور زندگی میں پہلی بار میں حشرات الارض کی اس خاص نوع سے ڈرنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے برتھ پر لیٹے لیٹے سو گیا لیکن بچھوؤں کا خوف کچھ اس بری طرح سے دل و دماغ پر مسلط تھا کہ خواب میں بھی بچھو ہی بچھو نظر آنے لگے۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے بچھو، اور یہ تمام بچھو دیکھتے دیکھتے ایک بڑا سا بچھو بن گئے جس کے منہ سے دھواں اور چنگاریاں نکل رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس بچھو کی پیٹھ پر اپنی سیٹ ریزرو کرا رکھی ہے اور یہ بچھو مجھے کشاں کشاں پشاور کی طرف لئے جا رہا ہے۔

۱۵ جون کی صبح کو میں نے پشاور چھاؤنی کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ ان ہم سفر بزرگ کی بچھوؤں سے متعلق نصیحت کو حرزِ جان بنائے ادھر اُدھر بچھوؤں کو دیکھتا بھالتا، ناپ تول کر قدم رکھتا پلیٹ فارم سے باہر آ گیا۔ خدا کا شکر کہ اب تک کوئی بچھو نظر نہ پڑا تھا سوچا، ہو سکتا ہے بڑے میاں یہ دیکھ کر کہ پہلی بار پشاور جا رہا ہے مجھ سے ستم ظریفی کر گئے ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ تانگے والے سے بچھوؤں کے متعلق پوچھ لوں۔ پھر سوچا کہ اگر یہ بڑے میاں کی ندرت طبع کی اختراع تھی تو یہ تانگے والا خواہ مخواہ ہنسے گا۔ اور اگر پشاور کے بچھوؤں کا واقعی کوئی وجود ہے تو یہ بزدل سمجھے گا چنانچہ

پکا ہو رہا تانگے کو خوب غور سے دیکھ بھال کر کہ کہیں مجھ سے پہلے اس تانگہ پر کوئی بچھو سوار نہ ہو گیا ہو بیٹھ گیا اور تانگہ سیدھا منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوا۔

حمید میرے پرانے دوست ہیں۔ خوش ذوق، خوش مذاق اور خوش گفتار۔ یہ تین خوبیاں ان کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں ہیں، اور پھر اتفاق سے ہم ایک ہی محکمہ میں نوکر ہیں اس لئے پشاور میں قیام و طعام کا مسئلہ ان کے وجودِ مسعود کی وجہ سے طے پا چکا تھا۔ اب میرے لئے اگر کوئی پریشان کن مسئلہ رہ گیا تھا تو یہی بچھوؤں کا مسئلہ تھا۔ تمام راستے یہی سوچتا آیا تھا کہ حمید سے جاتے ہی یہ ذکر چھیڑ دوں گا۔ خیر جوں توں کر کے گھر پہنچا۔ حمید بڑے تپاک سے پیش آئے، اور پھر ہنسی مذاق کے قہقہے اپنے مکان کی چار دیواری میں گونجنے لگے۔

آخر حمید بولے: "خیر باتیں تو ابھی بہت سی کرنے کی ہیں مگر ابھی تک شیو تم نے نہیں کی، ہاتھ منہ تم نے نہیں دھویا، لباس تم نے تبدیل نہیں کیا، منہ ہونق لگ رہے ہو، ان سے فارغ ہو لو تو اطمینان سے ناشتا کریں۔ بیٹا! تمھارے لئے ناشتہ ابھی اس ٹھاٹ کا تیار کرایا ہے کہ کیا یاد کرو گے۔ تمھیں فرنچ ٹوسٹ پسند ہیں۔ ذرا آج میری نگرانی میں بنے ہوئے فرنچ ٹوسٹ کھا کر دیکھنا۔ تمھیں آملیٹ بہت پسند ہیں۔ ذرا آج آملیٹ کھا کر دیکھنا۔ بس آملیٹ تیار ہو رہا ہے تمھارے لئے کہ اشتہا چوگنی ہو جائے اور چائے کا پانی میں نے خود گرم کیا ہے اور پھر خود اپنے ہاتھ سے چولہے پر نکوزی رکھ کر آیا ہوں . . . "

میں اس وقت بچھوؤں کے خیال میں مگن تھا۔ سچ پوچھیے تو اس وقت ذہن میں بچھو ہی بچھو بھرے ہوئے تھے۔ میں جھنجھلا کر بولا۔ "قبلہ آپ تو ناشتے کا ذکر اس طرح لے بیٹھے ہیں گویا میں پشاور میں ناشتا ہی کرنے تو آیا ہوں۔ سمجھا آپ کو کون بتلائے کہ میرے لئے ناشتے سے کہیں زیادہ اہم باتیں ہیں۔"

حمید میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر چونکے اور بولے: "ہاں ہاں تو بتاؤ نا . . . "

"قبلہ ذرا مجھے پشاور کے بچھوؤں کے متعلق کچھ بتائیے کہ یہ کیا بلا ہیں؟ ان کا حسب نسب کیا ہے؟ ان کی عادات کیا ہیں؟ پشاور میں انھوں نے کیوں قیام کر رکھا ہے — آخر حفظِ ما تقدم کے طور پر ان تمام باتوں کا جاننا میرے لئے ضروری نہیں کیا؟"

یہ سن کر حمید نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے میں بھی کچھ اسی قسم کی طنز تھی جو میرے ہم سفر بزرگ کے قہقہے میں تھی۔ بولے: "یہ تم سے پشاور کے بچھوؤں کا ذکر کس نے کر دیا؟ بھئی اچھا ہوا تم پہلے سے خبردار ہو چکے ہو ان سے۔ کیا بتاؤں حشرات الارض کی اس سے زیادہ موذی نوع روئے زمین پر اور کوئی نہ ہو گی۔ اہلِ پشاور پر تو ان کا خاص کرم ہے۔ جتنی دیر میں تم نہاؤ گے میں تمھارے لئے ایک مکسچر تیار کر دوں گا، پینے کے لئے نہیں لگانے کے لئے۔ اگر خدانخواستہ بچھو کاٹ کھائے جس کا اب ہر لمحہ امکان ہے تو یہ مکسچر بڑے کام آئے گا۔ بس ابھی پانچ منٹ میں تیار ہو جائے گا۔"

ایک تو میں بچھوؤں سے پہلے ہی خوف زدہ سہما سہما سا تھا اس پر حمید کی بات۔ خوف سے میرا جی بالکل ہی چھوٹ گیا اور میں کرسی پر دھڑام سے گر پڑا۔ نہ شیو کرنے کی فکر نہ نہانے کا ہوش، نہ ناشتے کی اشتہا بس آنکھوں کے سامنے بچھو ناچنے لگے . . . حمید نے جو میری یہ حالت دیکھی تو مجھے دلاسا دیا اور کہا: "مجھ پر بھروسا رکھو۔ مجھے یہاں کے بچھوؤں کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ بچھوؤں کے متعلق مجھے اپنا گائیڈ سمجھو۔ بس اب تم اطمینان سے غسل کر لو تاکہ ناشتا کر لیں۔"

اور اسی لمحے حمید سچ مچ نہایت ایمانداری سے بچھوؤں کے متعلق میرے گائڈ کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ طوالت کے خوف سے ان تمام ہدایات کو یہاں قلم بند نہیں کرسکتا جو بچھوؤں سے بچنے کے لئے مجھے حمید کی طرف سے وقتاً فوقتاً ملا کرتی تھیں۔ وہ واقعی میرے رحمت ثابت ہو رہے تھے۔ موقع محل کے مطابق مجھے بچھوؤں سے خبردار کرتے رہتے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا غسل خانے کی طرف۔"

"بہتر۔ مگر ذرا بچھو وچھو سے محتاط رہنا۔"

"کیا کر رہے ہو؟"

"ٹائی لگا رہا ہوں۔"

"ذرا دیکھ بھال کے۔ بعض اوقات ٹائی کے ساتھ بچھو بھی لگ جاتا ہے۔"

"کیا کر رہے ہو اب؟"

"ذرا سینڈل پہن رہا ہوں۔"

"بھئی احتیاط سے دیکھ لینا اسے۔ بچھو بسا اوقات جوتے کے اندر گھس کر ہی قیلولہ کیا کرتے ہیں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا اپنے کمرے کی طرف!"

"مگر سیڑھیوں پر سے اترتے وقت در و دیوار کو بالکل ہاتھ نہ لگانا، کہیں کوئی بچھو نہ چمٹا ہوا ہو۔"

"کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا گھر آپا کو خط لکھ رہا ہوں۔"

"بھئی پیڈ کو بہت احتیاط سے دیکھ لینا۔ کاغذوں کی تہہ میں کہیں کوئی بچھو نہ چھپا ہو۔"

"کیا کر رہے ہو اب؟"

. . . لاحول ولا قوۃ بچھو بچھو! یا اللہ یہ کیا مصیبت ہے۔ میں کہاں آن پھنسا ہوں! آخر میں نے تنگ آ کر جواب دیا "ذرا واصل ہونے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔"

"بہتر، مگر ذرا دیکھ لینا راستے میں کہیں کوئی بچھو نہ ہو۔"

اور ایک ہی ہفتے کے اندر اندر مجھے پشاور کے بچھوؤں سے سابقہ پڑنے لگا۔ ہر روز گھر میں سے دو چار بچھو نکلنے لگے۔ خاص کر شام کے وقت تو اکثر بچھو نکلا کرتے تھے۔ ایک بات یاد رکھنے گا۔ بچھو تمام دن سوتے رہتے ہیں شام کے قریب گھر سے باہر نکلتے ہیں اور پھر دن چڑھے تک

ندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کوئی بچھو گھر پر کھانا نہیں کھاتا بلکہ سب تازہ شکار مار کر کھاتے ہیں۔ ان کا ڈنک کیڑے کو ڈوری کی کڑیاں پکڑ لیتا ہے
کو محض تفنن طبع کے لئے کاٹتے ہیں کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہوتا۔ ویسے دیکھنے میں بچھو آپ کو بہت سست نظر آئے گا لیکن جب چلتا ہے
تیزی سے چلتا ہے اور شکار کے وقت تو بہت مستعد ہوتا ہے، پھرکی کی طرح بھاگتا پھرتا ہے اور چلتے وقت دم کو ہمیشہ اوپر اٹھائے ہوئے
ہے بلکہ اسی سے ان کی اکڑ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ بچھو جتنا زیادہ مغرور ہوگا اتنا ہی زیادہ اپنی دم کو اوپر اٹھائے ہوئے ہوگا۔

جوں جوں گرمی زیادہ ہوتی جا رہی تھی بچھوؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دو چار روز میں یہ تعداد بڑھ کر چھ سات روزانہ تک پہنچ گئی۔
ے آتے ہی نوکر سے پہلا سوال یہ ہوا کرتا تھا "آج کتنے نکلے؟" اور اس بات کی حسرت ہی رہی کہ کبھی تو نوکر کا جواب نفی میں ہو۔ چنانچہ میں نے نوکر سے
ہ جس طرح گھر کے حساب کتاب کے لئے اس نے ایک کاپی بنا رکھی ہے اسی طرح بچھوؤں کے حساب کتاب کے لئے بھی ایک کاپی بنا لے تاکہ
افزائش کی رفتار کا پتا چلتا رہے۔

گھر ہی دنیا میں ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں آدمی آزادی سے چل پھر سکتا ہے۔ لیکن خدا غارت کرے ان بچھوؤں کو ان کی وجہ سے اپنے گھر میں بھی
ا نقل و حرکت محال بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں جس گھر سے روزانہ چھ سات بچھو نکلنا معمول کی بات ہو وہاں
س حد تک اپنی نقل و حرکت کی آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

اندرون شہر کے پرانے، تاریک اور سیلے مکانوں میں تو یہ بچھو اور بھی آفت ڈھاتے ہیں۔ وہاں تو ان کے کنبے کے کنبے کئی کئی پشتوں سے آباد
نتیجہ یہ ہے کہ مکینوں کے لئے یہ وبال جان بن گئے ہیں۔ ایک تو پشاور کی گرمی الاماں دوسرے یہ موذی بچھو بس کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہوتا ہے رات
ہ مچا ایک ہاہاکار مچی ہوتی ہے کبھی اس گھر سے یکلخت چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں تو کبھی اس گھر سے۔ ادھر بچھو نامراد کا ڈنک بھی کچھ اتنا
ندہ ہوتا ہے کہ اس کے ڈسے ہوئے کو مارے درد کے کسی کل چین نہیں پڑتا۔ لاکھ دوا دارو کرو درد اپنے وقت ہی پر جاتا ہے!

لیکن ایک بات ضرور ہے کہ ان بچھوؤں کے دم سے پشاور کی مجلسی زندگی میں اچھا خاصا ہنگامہ رہتا ہے۔ آپ اگر گھر میں ہیں تو بچھو کا ذکر
گھر سے باہر ہیں تو بچھو کا تذکرہ۔ جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو آغاز گفتگو تقریباً اسی قسم کا ہوتا ہے:

"السلام علیکم، خان صاحب مزاج بخیریت ہیں؟"

"وعلیکم السلام، آپ کہئے خیریت ہے بچھوؤں سے تو امان ہے؟"

"اجی کہاں آج ہی تین بچھو صبح سویرے سے نکل چکے ہیں۔ شام تک دیکھئے ان کی تعداد کہاں تک جا پہنچتی ہے۔"

ہمارے یہاں تو جب دو ہمسائیاں آپس میں بات چیت کرتی ہیں تو ان کی گفتگو کا آغاز یہ ہوتا ہے: "بہن! آج تم نے کیا پکایا ہے؟" لیکن
ل جب دو پڑوسنیں آپس میں بات چیت کرتی ہیں تو پوچھتی ہیں:

"بہن بچھوؤں کی کہو، کتنے نکلے ہیں آج؟" اور اس کے بعد پوچھتی ہیں کہ "بہن! تم نے کیا پکایا ہے؟"

جب کسی کے گھر سے کوئی بڑا بچھو نکلتا ہے تو کوشش یہی کی جاتی ہے کہ اسے زندہ پکڑا جائے تاکہ دوستوں کو دکھایا جائے اور پھر صبح ہی
ح دوستوں، واقف کاروں اور رشتہ داروں کے یہاں اس مطلب کی اطلاع بھیج دی جاتی ہے۔ صبح ہی صبح نوکر آن کر دروازہ پر دستک دیتا ہے

"خان صاحب کے گھر سے رات بہت بڑا بچھو نکلا ہے، آپ کو دکھانے کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ آج شام آپ چائے ہمارے ہاں ہی اور پھر چائے پی جا رہی ہے۔ بچھو دیکھا جا رہا ہے۔ اُسے چھیڑا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ بچھوؤں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

"جی یہ بچھو تو اس بچھو کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو گزشتہ سال ہمارے گھر سے نکلا تھا۔ صاحب یقین مانیئے بینگن جتنا بڑا اور اتنا ہی کالا!"

"جی بچھو ایک دفعہ ہمارے یہاں سے نکلا تھا۔ اس سے زیادہ ظالم بچھو آج تک دیکھنے میں نہیں آیا کم بخت جب اپنا ڈنک لوہے کی سلاخ پر زور سے مارتا تھا تو سلاخ میں سے چنگاریاں نکلتی تھیں۔ . . ."

"صاحب ایک دفعہ ایک مادہ بچھو کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس کی پیٹھ پر دو درجن چھوٹے چھوٹے بچھو چپکے ہوئے!!"

جتنے مُنہ اتنی باتیں، اور یہ محاورہ بچھوؤں کے بارے میں تو بالکل صحیح اترتا ہے۔ حشرات الارض کی اس خاص نوع کو شمال مغربی صوبہ کے لوگوں کی زندگی میں اس حد تک دخل ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے توہمات، ان کی لوک کہاوتوں اور ان کے لوک گیتوں میں جا بجا بچھو کا تذکرہ ملتا ہے۔

یہاں کے لوگوں میں بچھوؤں کے متعلق بہت سی دل چسپ باتیں مشہور ہیں۔ بچھو کے متعلق یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اندھا بہرا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی قوتِ شامہ بڑی تیز ہوتی ہے۔ اپنے شکار کو دور ہی سے سونگھ لیتا ہے۔ ایک لوک کہاوت یہاں کے لوگوں میں مشہور ہے کہ بچھو پیدا ہوتے ہی اپنے ماں کے جسم کو کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ مادرکش ذات پروان چڑھتی ہے۔ ایک اور اعتقاد جو بچھوؤں کے متعلق یہاں کے لوگوں میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ اگر بچھو کو فوراً مار ڈالا جائے تو اس کے کاٹے کا زور بڑھنے نہیں پاتا۔ ورنہ جوں جوں بچھو پھرے گا درد بھی بڑھتا جائے گا۔ یہاں کے لوگ دوا دارو کی بہ نسبت "دم درود" پر زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں چنانچہ پشاور اور مضافات میں ایسے کئی لوگ مل جائیں گے جو دم درود سے بچھو کے کاٹے ہوئے کا علاج کرتے ہیں۔ اگرچہ خود مجھے اس قسم کے علاج معالجہ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن کہا جاتا ہے کہ جوں جوں دم درود پڑھا جاتا ہے مریض کا درد گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دم درود پڑھنے والا شخص ہاتھ میں ایک چھری لے کر مریض کے جسم کے اس حصّے پر پھیرتا جاتا ہے جس میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ جوں جوں وہ چھری کو اوپر سے نیچے کی طرف لاتا ہے مریض یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا درد کم ہوتا جا رہا ہے یا "اترتا جا رہا ہے"۔

"دم درود" کرنے والے حضرات کے متعلق میں نے ایک بات سُنی ہے کہ اگر ان لوگوں کی ایک دوسرے سے کٹی چھنی ہو تو یہ ایک دوسرے کے دم کا اثر زائل بھی کر دیتے ہیں۔ ایک دوست نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ ان کے محلے میں ایک شخص کو بچھو نے کاٹ لیا۔ ایک صاحب کو دم درود کے لئے بلایا گیا۔ ابھی انھوں نے اپنا عمل شروع ہی کیا تھا کہ ایک دوسرے صاحب تشریف لے آئے جو خود دم درود کے ماہر تھے اور ان دونوں میں بَیر تھا۔ چنانچہ دوسرے صاحب نے پہلے صاحب کا "دم بند کر دیا"۔ اب ایک تیسرے صاحب تشریف لائے۔ انھیں بھی اپنے دم درود پر گھمنڈ تھا۔ انھوں نے آتے ہی ان دونوں کا "دم بند کر دیا"۔ علیٰ ہٰذا القیاس دم بند کرنے کے اس رقیبانہ عمل میں تقریباً پانچ ماہرین نے حصّہ لیا۔ اور یہ شقی لوگ اپنی کرامات دکھانے میں اس تندہی سے مصروف تھے کہ ان میں کسی نے بیچارے کژدم گزیدہ کا کچھ خیال نہ کیا جو درد کے

بچیلا اتھا!

صوبہ سرحد کے لوک گیت اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے پاکستان کے لوک گیتوں کے ذخیرے میں ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں۔
یہ لوک گیت بھی عوام کے سیدھے سادھے جذبات کی اسی طرح ترجمانی کرتے ہیں جس طرح پنجاب کے لوک گیت یا سندھ یا بنگال کے۔
ں کے متعلق جب میں نے اپنا یہ مضمون لکھنا شروع کیا تو مجھے خیال آیا کہ سرحد کے لوک گیتوں میں ضرور کہیں نہ کہیں بچھو چھپے ہوں گے۔
حشرات الارض کی یہ موذی نوع یقیناً پشتو کے بعض نہایت دلچسپ اور مؤثر لوک گیتوں کا موضوع بن چکی ہوگی۔ کیونکہ لوک گیت ہی کسی
یا قوم کے عوام کے اصل جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے بعض دوستوں اور واقف کاروں سے اس کا تذکرہ کیا تو بعض نہایت
لوک گیت اس سلسلہ میں مل گئے۔ طوالت کے خوف سے بچھوؤں کے متعلق صرف چند مشہور لوک گیتوں ہی کی مثالیں دے سکوں گا۔
بچھوؤں کے متعلق ایک بات یاد رکھیے گا کہ عام طور پر ان کی آماجگاہ گھر ہی ہوتے ہیں خاص کر کچے مکانوں میں رہنا تو انھیں بہت پسند
یہی وجہ ہے کہ بچھو دیہات میں شہروں کی بہ نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ پشتو کے لوک گیتوں میں بچھوؤں کا جو تذکرہ ملتا ہے اس میں عورتوں
کی بات کو بڑا دخل ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بچھو عام طور پر گھروں میں رہتے ہیں اور کھیتوں وغیرہ میں کم ہوتے ہیں اس لئے عورتوں سے
ہی زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔

مختلف ملکوں کی شاعری میں عشق کی واردات کو بیان کرنے کے لئے جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے جاتے ہیں وہ بڑی حد تک
ملک کی اپنی تہذیبی روایات اور معاشرتی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ صوبہ سرحد کے عوام کی زندگی میں بچھوؤں کا اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا
سا دخل ضرور ہے۔ اس لئے واردات قلب کے بیان کرنے میں لوک گیتوں کے نامعلوم شاعر بچھو جیسی موذی نوع کو بھی تشبیہ و استعارے
کے لئے مستعار لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ کہیں تو یہ بچھو جدائی کا بچھو بن جاتا ہے اور کہیں محبت کا مطلب ہر دو صورتوں میں
شدت احساس کا اظہار ہے۔ ایک ٹپے میں جو پشتو کے لوک گیتوں میں ایک نسبتہً زیادہ مشہور اور مقبول صنف ہے۔ ایک مہجور عورت اپنے
واردات ہجر و فراق کو یوں بیان کرتی ہے:

خلقه مرم نه پاتے کیگم	اے لوگو! اب میں مرتی ہوں۔ میں اب بچ نہیں سکتی۔
د بیلتانه لړم په زړه خوړلے یمه	(کیونکہ) جدائی کے بچھو نے میرے دل پر ڈنک مارا ہے۔

اس ٹپے میں جدائی کے احساس کی جو شدت بیان کی گئی ہے اس سے غالباً وہی لوگ زیادہ لطف اٹھا سکتے ہیں جنھیں ایک طرف تو
غم ہجر نے نڈھال کر رکھا ہو اور اس پر بچھو نے بھی کاٹ رکھا ہو۔

ایک اور ٹپے میں جس میں اگرچہ بچھو کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا لیکن (بچھو کے) زہر سے واردات قلب کو یوں بیان کیا گیا ہے:

په فریاد و ژړا مے شو	میرا معاملہ اب گریہ و فریاد سے ہے
د مینے زهر م اوس زړه ته ورخاته	(کیونکہ) محبت کا زہر میرے دل تک پہنچ گیا ہے

یہاں زہر سے مراد بچھو کے زہر سے ہے اور زہر کو محبت سے تشبیہ دینا عام ہے۔ ایک اور ٹپے میں محبت کا لاعلاج ہونا یوں بیان کیا گیا

سہ م چیچلے خو بہ شمی	بچھو کا کاٹا تو تندرست ہو سکتا ہے
خو نہ د عشق م محبت خوہلی زہ روغ نہ	لیکن وہ (بدنصیب) جسے محبت نے ڈنک مارا ہو کبھی تندرست نہیں ہو سکتا۔

نہ صرف عشق کی وارداتوں کو بیان کرنے کے لئے پشتو شاعری میں بچھو تشبیہ و استعارے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے بلکہ بعض معلم اخلاق بچھو کو اپنے پند و نصائح کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایک ٹپے میں ایک شاعر اپنے زمانے کے دوستوں سے اس طرح نالاں ہے:

یارانِ دنن زمانے خلقنہ	اے لوگو آجکل کے دوست
لکہ سرم کوی پہ پٹہ کنہ او ونہ	بچھو کی طرح ہیں جو چوری چھپے ڈنک مارتا ہے۔

بچھوؤں سے متعلق دو لوک گیت خصوصیت سے بہت پسند آئے۔ ایک تو وہ ہے جس میں ایک لڑکی کنوئیں پنگھٹ یا غالباً چشمے سے پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے چلی آرہی ہے کہ اسے بچھو نے کاٹ کھایا ہے، اور وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

موریے ملا زر پشہ راغواپہ	اے ماں جلدی کر ملا کو بلا
منگے پہ سر سہم پہ لار کنے او خو بہمہ	ابھی پانی کا گھڑا میرے سر پر ہی تھا کہ بچھو نے مجھے کاٹ کھایا۔

آپ شاید اس ٹپے کو ایک سیدھا سادا لوک گیت سمجھیں جس میں محض "گرد م گندی گی" کا ایک اتفاقی واقعہ بیان کیا گیا ہے لیکن دراصل بات نہیں بلکہ یہ ٹپہ ایمائی شاعری کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ دیہات میں ہی بچھو آسانی سے محبوب اور عاشق کی ملاقاتوں کا ایک ذریعہ بھی بن سکتا ہے بشرطیکہ عاشق بچھو کے کاٹے کا علاج کرنے کے لئے مشہور ہو تاکہ اسے بلایا جا سکے۔ دیہات میں بچھو کے کاٹے کا علاج عام طور پر "دارو" کی بجائے "دم درود" ہی سے کیا جاتا ہے۔ جو ملا کا کام ہے۔

دوسرا گیت دراصل ایک طویل گیت ہے۔ مجھے اس کے چند اشعار ہی مل سکے ہیں۔ یہ گیت عام طور پر دیہات کی لڑکیوں کو یاد ہوتا ہے، جو کبھی کبھی کورس کی شکل میں گاتی ہیں۔ گیت کی دھن سادہ لیکن نہایت شوخ ہے کیونکہ گیت کا اصل مفہوم بھی کچھ شوخ ہی سا ہے۔ گیت اس طرح شروع ہوتا ہے

او مورے راد ڈکا لہم دے لہم دے	اے میری ماں! دوڑ کر آ (دیکھ) بچھو ہے بچھو!
مورے ڈیوہ راؤرہ اوکئی تلوار	ماں چراغ لیتی آنا۔ ذرا جلدی
ڈوبے خوہمہ اوکئی اعتبار	ہائے (اس نے) کاٹ کھایا۔ میرا یقین کر لے،
د دیرہ درد لہ م پہ سترگو کنے تورتم دے	اب درد کی شدت سے میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہے۔
او مورے راد ڈکا لہم دے لہم دے	اے میری ماں دوڑ کر آ

اس کی ماں جواب دیتی ہے:

ما چہ ورتہ ویل چہ نژدے نہ شے	میں جو تجھے کہتی تھی کہ اس کے قریب نہ جانا

ذے خوبے خدائیگو ردمہ بہ نہ شے — خدا گواہ! اب جو اس نے تجھے کاٹ لیا تو تندرست نہیں ہو سکتی!

ملاتہ لاڑ پوشہ ملا بہ دے خسے دم دے — اب ملّا کے پاس جا کہ اسے دم کرنا آتا ہے۔

اس کے بعد ماں اور بیٹی دونوں ملّا کے پاس جاتی ہیں:

مور او لور دواڑہ شوے روانے — ماں اور بیٹی دونوں ملّا کے پاس چل دیں

ملّا کبن ملاتہ شوے کیسا بیانے — وہاں ملّا کو یہ سارا دکھڑا سنایا

لورم خوبے دہ لیرم نصیب ئی کم دے — کہ میری کم نصیب بیٹی کو بچھو نے کاٹ کھایا ہے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ اس گیت کے دوسرے بند کسی قدر عریاں ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے اس گیت میں بھی بچھو کو ایمائی معانی پہنانے گئے کا مفہوم جو بنی تشریح کے اعتبار سے یقیناً جنسی بے باکی کا مظہر ہوگا۔ ایما و اشارہ کے پردوں میں اس طرح چھپ جائے کہ محض ایک سادہ سا گیت بن کر نظر آئے۔ اور یقیناً یہ گیت اس لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس گیت میں بار بار ایک ٹیپ کا مصرع آتا ہے:

او مورے سل ذو کا لیرم دے سہم! — اے میری ماں دوڑ کر آ دیکھ بچھو ہے بچھو!

اس مصرع کی تکرار گیت کی موسیقیت میں بہت کچھ اضافہ کرتی ہے اور یہ گیت اپنے اسی مصرع کی رعایت سے مشہور ہے۔

آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ بچھوؤں کا یہ تذکرہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ شاید آپ نے ایک کہاوت نہیں سُنی کہ سانپ کا ذکر شروع ہو جائے تو مجھ سنے ہی میں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے یہی بات حشرات الارض کی اس نوع کے متعلق بھی حرف بہ حرف صحیح اترتی ہے۔ پشاور میں ایک کہاوت ہے کہ دیوالی آئی اور بچھو زیرِ زمین سونے کے لئے چلے گئے۔ لوڑھی آئی اور وہ پھر نکل آئے۔ الحمد للہ کہ گرمیوں کا موسم ختم ہو چکا ہے اور دیوالی گزر چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی کچھ عرصے کے لئے تو پشاور کے بچھو بھی سطحِ زمین سے نابود ہو چکے ہیں۔ ورنہ بچھوؤں کے زمانے میں کس کم بخت کو مضمون کی سوجھتی تھی اور اب اگر میں یہ مضمون لکھ سکا ہوں تو محض اس لئے کہ آجکل زندگی بچھوؤں سے کامل طور پر مامون و محفوظ ہے۔ اور مضمون لکھتے مجھے بار بار نہ تو چھت کی طرف دیکھنا پڑتا ہے اور نہ در و دیوار کی طرف۔ اور نہ یہ فکر ہے کہ کہیں میری میز کے نیچے پاؤں کے قریب کوئی بچھو اس امید میں آ بیٹھا ہو کہ ذرا موقع ملے تو قیلولہ کرنے کے لئے جھٹ جوتے کے اندر گھس جائے۔

(تتمہ جو بچھوؤں سے متعلق میری یادداشتوں پر مشتمل ہے)

۱۔ بچھو در اصل حشرات الارض کے اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس سے مکڑی۔ حسب و نسب دونوں کا ایک جگہ جا کر مل جاتا ہے۔ اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جن بچھوؤں کے آبا و اجداد نے "عقربی تہذیب" کی ارتقائی منزلیں طے کر لیں مکڑی انھیں جناب بچھوؤں کی اولاد میں ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں بچھوؤں میں مابعد الطبیعات پر غور و خوض کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ مکڑی انھیں فلسفی بچھوؤں کی اولاد میں سے ہے جو اب تک چپ چاپ کونے کھدروں میں مابعد الطبیعاتی مسائل پر غور و خوض کرتی رہتی ہے۔

۲۔ ایک بزرگ بچھو نے اپنی اولاد کو نصیحت کی تھی کہ اپنی زندگی میں کم از کم ایک انسان کو ضرور کاٹنا ورنہ حشر کے دن نامراد اٹھو گے۔ ...

کے بچھو اپنے جدامجد کی نصیحت پر عمل کرتے ہیں۔ خواہ اس پر عمل کرتے ہوئے انھیں اپنی جان عزیز تک کھونا پڑے۔

۳۔ حکایت۔ ایک چھوٹا بچھو اپنے باپ کا ڈنک پکڑے بازار میں جا رہا تھا کہ باپ کا جی چاہا کہ تفنن طبع کے لئے کسی آدمی کے ڈنک جلائے۔ اس نے ایک بوڑھے فقیر کے ڈنک مارا جو سڑک کے کنارے بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ بوڑھا درد کے مارے چلا اٹھا اور لگا بچھو کو بد دعا دینے۔ خدا نے اس کی بددعا سُن لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باپ اس شوق گزیدگی میں اپنا بیٹا ہجوم میں کھو بیٹھا جو آخر کو لوگوں کے پاؤں تلے کچلا گیا۔

۴۔ لطیفہ:۔ ایک محروم الفت بچھو نے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں ختم کرنے کی ٹھانی۔ ارادہ کیا کہ کسی کو کاٹ کھائے تاکہ لوگ اسے ہلاک کردیں۔ چنانچہ خودکشی کی نیت سے ایک باغ میں گیا جہاں ایک محروم الفت شخص بیٹھا اپنی ناکامیٔ محبت پر آنسو بہا رہا تھا اور اس کی محبوبہ اسے چھوڑ کر مزے سے آئس کریم کھا رہی تھی۔ ناگاہ بچھو نے اسے ڈنک مارا۔ آدمی درد سے بلبلا اٹھا۔ شور سن کر اس کی محبوبہ بھی دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے اپنی لغزش سے کچل دیا۔ اور اس شخص پر رحم کھا کر اس سے شادی کا وعدہ کرلیا!

۵۔ ایک شاعر بچھو نے اپنی محبوبہ کی تعریف میں ایک آزاد نظم لکھی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے:

میری محبوبہ تمام دوشیزہ بچھوؤں سے زیادہ خوبصورت ہے،
اس کے جسم پر سیاہ اور زرد دھاریاں ہیں۔
اس کا ڈنک دیکھنے میں جتنا نرم و نازک ہے،
اپنے فعل میں اتنا ہی زہریلا ہے،
جب میری محبوبہ تمکنت سے کاٹھ کباڑ میں اپنے آٹھ سبک قدموں سے چلتی ہے
تو جھنجھلاہٹ سے اپنی دم کو اوپر اٹھائے ہوئے ہوتی ہے،
میری محبوبہ تمام دوشیزہ بچھوؤں سے زیادہ شوخ و شنگ ہے،
کیونکہ اس کا ڈنک انسان کو چوبیس گھنٹے تک تڑپاتا ہے!!

امین الحسن۔ پشاور ۱۹۔ نومبر ۱۹۵۰ء

قطرہ قطرہ میشود دریا

دو غزلیں

فضا جالندھری

یہ عالم ہے تیرے نظاروں کے بعد
نظر گل فشاں ہے شراروں کے بعد

یہ رنگِ چمن دل نگاروں کے بعد
ہنسے پھول کھل کر بہاروں کے بعد

کرن پھوٹنے کو ہے خورشید کی
شبِ غم کے ڈوبے ستاروں کے بعد

نگاہوں میں جیسے سما سی گئی
وہ نکھری تجلی نظاروں کے بعد

دھڑکتے ہیں کلیوں کے ننھے سے دل
دہکتے ہوئے چاند تاروں کے بعد

یہ تقدیر اب دیکھئے کیا دکھائے
ان اشکوں کی خونیں بہاروں کے بعد

نظر اب ستاروں پہ رکتی نہیں
مگر تیرے رنگیں اشاروں کے بعد

فضا یوں ہوئی ہیں فضائیں اداس
نہ دیکھیں بہاریں بہاروں کے بعد

بشیر ساجد

جورِ اصنام وہی ہے کہ جو تھا
دورِ آلام وہی ہے کہ جو تھا

جلوۂ بام وہی ہے کہ جو تھا
مجھ پہ الزام وہی ہے کہ جو تھا

آپ کی مہرِ خموشی کے طفیل
دل کا پیغام وہی ہے کہ جو تھا

کیسے احساسِ تغیر ہو ندیم
رنگِ ایام وہی ہے کہ جو تھا

کون تقریر کی لذت پہ مرے
حسنِ ایہام وہی ہے کہ جو تھا

دل کی دنیا میں بدستور ترا
شہرۂ عام وہی ہے کہ جو تھا

عالمِ حسن و حکایت میں بشیر
مردِ گمنام وہی ہے کہ جو تھا

کیپٹن محمد خیرالدین صدیقی

بیدِ مجنوں

(ایک ریڈ انڈین کہانی)

آپ نے بید مجنوں کا پودا تو دیکھا ہوگا جس کی پتیاں ہمیشہ کانپتی رہتی ہیں مثل مشہور ہے "بید کی طرح کانپنا" یہ مثل بید مجنوں کی پتیوں کے ہلنے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہوا نہ چلنے پر بھی بے حس و حرکت اور ساکن نہیں رہتیں۔ ریڈ انڈین لوگ کہتے ہیں کہ صبا ایک جھیل کے کنارے اپنی بہن کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہتا تھا وہ نہایت حسین و جمیل جوان تھا۔ قبیلے کی تمام کنواری لڑکیاں اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا جو سچی اور ایماندار ہو۔ ہر شام صبا کی بہن اس لڑکی کے ساتھ جھیل کے کنارے چہل قدمی کرتی جو اس کے بھائی سے شادی کرنے کی خواہش مند ہوتی۔ غروب آفتاب کے بعد صبا آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے جھیل کے کنارے کنارے اپنی گاڑی پر واپس آتا۔ اپنے بھائی کو واپس آتے دیکھ کر صبا کی بہن لڑکی سے کہتی "دیکھو بھائی واپس آ رہا ہے وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا جو اسے دیکھ سکے، کیا تم اسے دیکھ سکتی ہو؟" لڑکی جھوٹ بولتی اور جواب دیتی "ہاں وہ مجھے صاف نظر آ رہا ہے" پھر صبا کی بہن پوچھتی "بتاؤ اس کے گھوڑوں کی باگیں کاہے کی بنی ہیں؟" اور ہر لڑکی قیاساً جواب دے دیتی "ہرن کے پٹھوں کی، بھینس کی کھال کی، ہرن کی کھال کی . . ." یہ سن کر صبا کی بہن جواب دیتی "تمھاری صبا سے شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ تم نے اس کو دیکھا نہیں اور جھوٹ بول دیا۔" اور اس طرح دوشیزہ لڑکیاں بصد حسرت و یاس ناکام واپس جاتیں۔

قبیلے کی ایک لڑکی کا نام "آبِ خنک" تھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور وہ اپنے باپ اور دو سوتیلی بہنوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ جب اس کا باپ شکار کھیلنے جاتا تو اس کی بہنیں اس سے بدسلوکی کرتیں، جھوٹے برتن منجھواتیں، جنگل سے ایندھن منگواتیں، کنویں سے پانی بھرواتیں اور صرف پھٹے پرانے کپڑے اسے پہننے کو دیتیں کیونکہ ان کو اس کے حسن سے حسد تھا۔ "آبِ خنک" کے ہاتھ کام کرتے کرتے پھٹ گئے تھے اور بدن پر چیتھڑے لٹکے رہتے تھے پھر بھی وہ قبیلے کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اتنی بدسلوکیوں کے باوجود اس کی بہنوں کے حسد کی آگ کم نہ ہوئی اور ایک دن انھوں نے چولھے میں سے جلتی ہوئی لکڑیاں نکال کر "آبِ خنک" کو مارا، اس کا منہ جھلس دیا اور وہ نہایت بدنما اور بد اطوار ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد "آبِ خنک" جھیل کے کنارے اکیلی پھر رہی تھی کہ صبا کی بہن نے اس کو دیکھ کر خیر و عافیت پوچھی۔ "آبِ خنک" نے اپنی بپتا سنائی۔ صبا کی بہن نے اظہار ہمدردی کے بعد اس سے پوچھا "دیکھو میرا بھائی آ رہا ہے، کیا وہ تمھیں دکھائی دیتا ہے؟" "آبِ خنک" نے جواب دیا "نہیں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" لیکن ایک لمحہ کے بعد اس نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور بولی "ہاں، اب وہ مجھے دکھائی دے رہا ہے۔" صبا کی بہن نے پوچھا "بتاؤ اس کے گھوڑوں کی باگیں کاہے کی بنی ہیں؟" "آبِ خنک" نے جواب دیا "قوس قزح کی"۔ صبا کی بہن نے کہا "آبِ خنک تم نے حقیقتاً میرے بھائی کو دیکھ لیا اور اب اس سے تمھاری شادی ہوگی" اور وہ "آبِ خنک" کو صبا کی جھونپڑی پر لے گئی۔ جھونپڑی پر پہنچ کر صبا کی بہن نے اپنے بھائی کو تمام ماجرا سنایا تو صبا نے "آبِ خنک" کے چہرے پر ہاتھ پھیرا — ہاتھ پھیرتے ہی اس کے چہرے کے سب داغ دھبے غائب ہو گئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ جب صبا کو معلوم ہوا کہ "آبِ خنک" کی بہنوں نے اس سے اتنی بے دردی کا سلوک کیا ہے تو اس نے ان کو بلا کر بہت سخت سست کہا، وہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ پھر سزا کے طور پر صبا نے ان کو بید مجنوں کے پودوں میں تبدیل کر دیا جو ہمیشہ صبا کی سرسراہٹ سن کر خوف سے تھر تھرانے لگتے ہیں۔

مخزن المخازن

نیا دور

ایران میں اجنبی

ن ۔ م ۔ راشد

(تیسرا کینٹو)

ن م ۔ راشد کی زیر تصنیف طویل نظم "ایران میں اجنبی" کا تیسرا کینٹو شاہ ایران رضا شاہ پہلوی سے متعلق ہے جنھیں جدید ایران کی تشکیل کہنا چاہیئے۔ جنگ کے زمانے میں جس وقت راشد ایران میں تھے ایران ایشیائی ممالک میں سب سے زیادہ بے چارہ اور بے بس ملک بن کر رہ گیا تھا۔ اور ایرانی اپنے سب سے بڑے محسن کے احسانات تک فراموش کرتے جا رہے تھے۔ البتہ جنگ کے بعد ایران نے از سر نو اپنی خودی کا راز پا لیا ہے۔ اور جن حالات کی طرف اس کینٹو میں اشارہ ہے وہ ایران کا منظر گزراں بن کر رہ گئے ہیں۔ (نیا دور)

رضا شاہ!

تجھ پر سلام اجنبی کا!

سلام ایک ہندی سپاہی کا تجھ پر!

مجھے تو کہاں دیکھ سکتا ہے؟

تیری نگاہیں تو البرز کے پار افق پر لگی ہیں!

یہاں ۔ میں ترے بت کے نیچے،

چمکتی ہوئی سیڑھیوں پر کھڑا ہوں!

رضا شاہ!

رضا شاہ!

اے دار یوش اور سیروس کے جانشیں

یہ قلمرو،

تجھے جس کی تزئین کی لو لگی تھی،

جسے تو خدا کی اماں میں بھی دینا گوارا نہ کرتا،

یہی شہریور کے الم زا حوادث کے بعد

آج بے جان لاشہ بنی

تیرے قدموں میں بے بس پڑی ہے!

وطن اور ولی عہد کی والہانہ محبت،

ترے ہوش و فکر و عمل کے لئے،

کونسی چیز مہمیز کا کام دیتی تھی،

سب جانتے ہیں!

مگر تو وہ معمار تھا جس کو

بوسیدہ بنیاد سے کوئی مطلب نہ تھا،

اور رخنوں کو آنکھوں سے روپوش کرنے میں

چھت اور دیوار و در کی جبیں پہ گلگونہ ملنے میں

دن رات بے انتہا تندہی سے لگا تھا!

یہ سچ ہے کہ نادر اگر نیم شب

صبح کے وحشت افزا ارادے کو افشانہ کرتا

تو یوں قتل ہونے کی نوبت نہ آتی۔

مگر یہ نزی حد سے گزری ہوئی رازداری

کہ جس نے تجھے

اپنے افکار کے قید خانے میں

محصور سا کر دیا تھا،

وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں

فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو

جہاں ہر عقیدے کو اپنے

نوا الہام کے شیشۂ کور میں دیکھتا تھا

جہاں ایک چھوٹا سا روزن بھی ایسا نہ تھا،

جس میں ملت کے افکار کی اک کرن کا گزر ہو،

اسی کا نتیجہ کہ اک روز

کہتے کو ماہیں بہت تھیں،

مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے۔

اور تھے بھی تو کر ہو گئے تھے،

تجھے اس زمیں سے گئے دو برس ہو چکے ہیں،

تری یاد تک مٹ چکی ہے دلوں سے،

کبھی یاد کرتا ہے کوئی تو کہتا ہے:

"وہ کیمیا گر

جو کرتا رہا سب سے وعدے

کہ لاؤں گا سونا بنا کر

مگر شہریوں کے مس و سیم تک

لے کے چلتا بنا ہے؟"

یہ طہران جو تیرے خوابوں میں،

پاریس کا نقشِ ثانی تھا

یوں تو یہاں رہگذاروں میں

بہتا ہے ہر شام سیما فروشوں کا سیلابِ جاری،

یہاں رقص گاہوں میں اب بھی

بہت جھلملاتی ہیں محفل کی شمعیں

یہاں رقص سے چور،

یا جامِ بادہ سے مخمور ہو کر

وطن کے پجاری

بآہنگِ سنتور و تار و دف و نے

لگاتے ہیں مل کر،

وطن!! اے وطن!! کی صدائیں!

مگر کون جانے یہ کس کا وطن ہے؟

کہ پاریس بھی آج اس کا ہیولا ہے بیچارگی میں

کہ اس پر فقط برقِ خرمن گری تھی،

اسے شعلہ ہائے نیستاں نگلتے چلے جا رہے ہیں!

ماہِ نو

میر کا اختصار اور نظیر کا طولِ کلام

(حضرت اثر لکھنوی)

میر کا قطعہ ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ پڑا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

اور نظیر کا قطعہ ہے ؎

ایک دن ایک استخواں اوپر پڑا جو میرا پاؤں
کیا کہوں غفلت میں کیا کیا مجھکو اس دم دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی
اور کہا غافل کبھی ہم بھی تو صاحب جان تھے
ابرو و بینی جبیں نقش و نگار و خال و خط
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے
رات کو سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ
بیٹھنے کو دن کے کیا کیا طاق اور ایوان تھے
لگ رہے تھے دل کہیں چنچل پریزادوں کے ساتھ
کچھ کسی سے عہد تھے اور کچھ کہیں پیمان تھے
ہو رہے تھے قہقہے اور بج رہے تھے چہچہے
ساقی و ساغر صراحی عطردان و پان تھے
ایک ہی چکر اجل نے آن کر ایسا دیا
پھر نہ ہم تھے اور نہ یہ سب عیش کے سامان تھے
ایسی بے دردی سے ہم پر پاؤں مت رکھئے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

حضرت مجنوں نے یہ کہہ کر نہ اپنی راشکست نہ اور اظفر فرمایا اعتنا کی ضرورت نہ سمجھی، حضرتِ ادیب کی عبارت یہ ہے:

دونوں شاعروں نے ایک ہی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اور ایک ہی اثر لیا ہے مگر جو زور اور جتنا اثر میر نے دو شعروں میں بھر دیا ہے اس کا عشر عشیر بھی نو شعروں میں نہ سما سکا اس کے اور اسباب بھی ہوں گے لیکن خاص سبب یہی ہے کہ میر نے اختصار سے کام لیا۔ اور نظیر نے بیکار طول دیا نظیر بھی اگر اختصار پر نظر رکھتے تو ان کے قطعہ میں بھی اثر کا ایک عالم ہوتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کے قطعہ سے شروع کے دو شعر اور آخر کا ایک شعر لے لیا جائے اور درمیان کے چھ شعر نکال دیئے جائیں تو یہ قطعہ بن جاتا ہے ؎

ایک دن اک استخواں اوپر پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں غفلت میں کیا کیا مجھکو اس دم دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی
اور کہا غافل کبھی ہم بھی تو صاحب جان تھے
ایسی بے دردی سے ہم پہ پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

مجھے حضرت ادیب سے اتفاق ہے کہ اس اختصار سے نظیر کے قطعہ میں ایک گونہ تاثیر پیدا ہو گئی اور خوش ہوں کہ انھوں نے پھر بھی اس قطعہ کا میر کے قطعہ سے موازنہ نہیں کیا کیونکہ اتنی تراش و خراش کے بعد بھی میر کے قطعہ کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ ایک مغرور و متکبر انسان کے کاسۂ سر میں چور چور ہونے پر بھی اس کے لہجے کا تیکھا پن جو دوران حیات میں تھا قائم رکھنا اور شکستوں کو چین جبیں کی یادگار بنا دینا۔ تاہم اس کی زبان سے درسِ عبرت دینا تخئیل کی وہ سحر کاریاں ہیں جس کی نظیر شاید ہی دُنیا کی کسی شاعری میں ملے۔ یہ کاسۂ سر کچلے جانے پر نظیر کے پیشکردہ کاسۂ سر کی طرح آہ نہیں کرتا بلکہ ڈانٹ کر کہتا ہے کہ "دیکھ کے چل راہ بے خبر" اور صرف اس اظہار سے کہ "میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا" اپنی پامالیوں کو عبرت کا مُرقع بنا دیتا ہے۔ (اقتباس)

آجکل

پرستانِ جنجیرہ

(بمبئی کے قریب جزیرہ جنجیرہ کی بیگم نازلی رفیعہ کی مہمان رہ کر رخصتی کے وقت مسز سروجنی نائیڈو مرحومہ کے تاثرات)

"اے میری اچھی میزبان!
"کاش میں ہمیشہ تیرے خوبصورت جزیرے میں رہ سکتی۔

میں یہاں ہمیشہ رہ کر انتہائی مسرت محسوس کرتی ہوں
اے پریوں کی حسین ملکہ !
اے کبھی نہ ختم ہونے والی بہاروں کی ملکہ !
اے پھولوں کی شہزادی !
تیرا جزیرہ کس قدر مسحور کن ہے ۔
جہاں
اب بھی عہدِ قدیم کی دلآویزیاں تابندہ اور ضوفشاں ہیں ۔
جہاں
اب بھی پرانے زمانے کی پُرسکون زندگی میسر ہے ۔
کاش میں اس رنگ و بو کی دُنیا میں ہمیشہ رہ سکتی ۔
جہاں
جنگلی کبوتر آزادی سے اُڑتے ہیں ۔
جہاں
کھجوروں کے جھنڈ ہیں
جن میں کلیاں پھوٹتی ہیں
اور جہاں
سمندر کی لہریں مدھم سُروں میں سہانے گیت گاتی ہیں ۔
جذبات سے بے قابو ہو کر میرا جی چاہتا ہے ۔
کہ سمندر کے کنارے لیٹ جاؤں
اور سمندر کی مترنم لہریں مجھے لوریاں دے دے کر سلا دیں
اور مجھے ایک میٹھی اور پُرسکون نیند آجائے
تیرے جادو انی اور مسرت سے لبریز جزیرے میں
ہمیشہ بہاریں رقصاں رہتی ہیں ۔
لیکن میں اب یہاں زیادہ نہ ٹھہر سکوں گی ۔
میں یہاں سے چلی جاؤں گی ،

اور ضرور چلی جاؤں گی
وہاں چلی جاؤں گی
جہاں سے ایک چنگھاڑتی ہوئی دُنیا چیخ چیخ کر تیز اشارو ں سے
مجھے بلا رہی ہے ۔
تقدیر کے نقارے کی چوٹیں مجھے گرج گرج کر جلدی جلدی
بلا رہی ہیں ۔
تیرے جزیرے سے دور پار
دور
بہت دور
تیرے محل کے ان سفید سفید گنبدوں سے دُور
جو چاندنی رات میں چمک رہے ہیں
اور چاندنی میں جن پر غنودگی کا عالم طاری ہے
تیرے قلعے کی دیواروں سے دُور
جو چاندنی رات میں سہانے خواب دیکھ رہی ہیں
مجھے شریک ہونا ہے
اس بپھرے ہوئے جلوس میں
جو جوشیلے نعرے لگا رہا ہے
جو جنگِ آزادی کے لئے آگے بڑھ رہا ہے
ایسی جنگ کے لئے
جو محبت ، نیک نیتی اور حق کی حامل ہے
جو باطل سے لڑی جائے گی
ایسی جنگ جس میں شیر دل سپاہی تلواریں سونتے آگے
بڑھ رہے ہوں گے ۔
جس میں میں اس لئے شریک ہونے جا رہی ہوں
کہ میں جنگ کے آتشیں نغمات کا پرچم لے کر آگے آگے چلوں

جس میں مَیں اس لئے شریک ہونے جا رہی ہوں
کہ میں کمزور دلوں کی ڈھارس بندھاؤں
اور ہمت ہار جانے والے لرزاں ہاتھوں کی امید کے دامن
کی طرف رہبری کروں
جس میں میں اس لئے شریک ہونے جا رہی ہوں
کہ حق کی فتح ہو
اور فتح کی خبر تمام دنیا میں مسرت پھیل جائے
امن وامان صداقت اور محبت پھر برقرار ہوں

(مترجمہ ابوالحسن نغمی)

نقوش

بخیالِ خویش خبطے

شوکت تھانوی

استغفراللہ مولوی نور اللہ ہم سے کن گناہوں کا عذاب ہیں؟

ہزار مرتبہ سمجھایا کہ مولانا چاہے جیسی قسم لے لیجئے پاکستان صرف ہم نے نہیں بنایا ہے اور نہ اس کے آئین کے ذمہ دار ہم ہیں ہمارا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ پاکستان کا نعرہ بلند کرنے میں ہم ضرور شریک تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد جتنی خوشی دوسرے مسلمانوں کو ہوئی ہوگی اگر اس سے زیادہ ہم کو ہوئی ہو تو چور کی سزا وہ ہماری مگر توبہ کیجئے وہ تو غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے، جان کو آ گئے ہیں زندگی عذاب کر رکھی ہے اور اب یہ قطعی طے ہے کہ ہم دونوں بہ یک وقت اس دنیا میں رہ ہی نہیں سکتے۔ یا مولوی نور اللہ زندہ رہیں گے یا ہم خود کوئی اس سلسلہ میں بزدلی خودکشی کی ترغیب دے یا ہمت قتل کی ترکیب سمجھائے۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ گھر سے نکلا اور مولانا نے دبوچا۔ "حضرت۔ میں نے کہا السلام علیکم۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے اپنا پاکستان" اور ہم نے گھوم پھر کر دیکھا تو صرف ایک راہگیر نظر آیا جو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی بائیسکل پر سوار جا رہا تھا۔ اب ہم حیران ہیں یا اللہ اس راہ چلنے والے کی کونسی بات مولانا کو ایسی ناگوار گزری ہے ہم کو پاکستان کے طعنے دیئے جا رہے ہیں۔ ابھی ہم سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مولانا بالکل حریف بن کر بولے "نام رکھا ہے پاکستان دعویٰ یہ تھا کہ صاحب ہم کو ایک ایسا خطۂ زمین چاہیے جہاں ہم اپنی روایات کو زندہ کر سکیں ہم کو ایک ایسی مملکت چاہیئے جہاں ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور دنیا کو اسلامی جہاں بانی سے ایک مرتبہ پھر روشناس کر سکیں، اور حال یہ ہے کہ اب تک ڈاکٹر پوجے جا رہے ہیں۔ انگریزی دواؤں کے بغیر گویا زندہ ہی نہیں رہ سکتے جب تک انگریزی میں لکھا ہوا نسخہ نہ ہو اس وقت تک جیسے موت ٹل ہی نہیں سکتی"

حیرت سے پوچھا "کس کا ڈاکٹر مولانا کس کی دوا کہاں کے نسخے؟"

ان ہی تیوروں سے بولے "شیخ صاحب بیمار ہیں نا؟ اسلامی اخلاق ہے کہ عیادت کرنا چاہیئے پڑوسی کی۔ میں بھی چلا گیا دیکھنے، تو دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر وہی انگریزی دواخانہ سے آیا ہوا مکسچر رکھا ہوا ہے اور منہ میں وہی حرارت دیکھنے کا انگریزی آلہ لئے پڑے ہیں۔ میاں میں پوچھتا ہوں کیا دنیا جہان سے حکیم اڑ گئے ہیں۔ کیا یونانی طب دنیا سے نابود ہو چکی ہے اور کیا پاکستان بن جانے کے بعد یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ یہاں اب بھی ڈاکٹروں کو عروج حاصل ہو اور حکیموں کو پاکستان میں بھی نہ پوچھا جائے۔ اپنا اسلامی طریقہ علاج چھوڑ کر ہم آزاد ہونے کے بعد بھی انگریزوں ہی کی غلامی کر رہے ہیں"

عرض کیا "ہر چند کہ خود میرے داڑھی نہیں ہے مگر میں اکثر غور کیا کرتا ہوں کہ آخر اہل پاکستان سے داڑھی کیوں نہیں رکھوائی جاتی!"

مولانا کو ایک بھولی ہوئی بات یاد آگئی ریشِ مبارک پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ "اب دیکھ لیجئے کہ ہمارا نیا بجٹ آیا ہے بہت عمدہ بجٹ ہے یعنی میزانیہ۔ معاف کیجئے گا میں نے بجٹ اس لئے کہا تھا کہ شاید میزانیہ نہ سمجھیں۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ نہایت لاجواب ہے یہ میزانیہ لیکن اگر اس میں داڑھی مونڈنے والوں پر ایک ٹیکس، جزیہ ہی کہنا چاہیئے اس ٹیکس کو، بہرحال اگر داڑھی مونڈنے والوں پر ایک جزیہ عائد کر دیا جاتا اور یہ داڑھی مونڈنے کے استروں کے نرخ بڑھا دیئے جاتے، اور حجاموں پر پابندیاں عائد کر دی جاتیں تو یقیناً اندازہ ہوتا کہ حکومت کا منشا کیا ہے۔ جناب والا اگر داڑھی مونڈنے پر جزیہ عائد کر دیا جاتے اور مونچھیں مونڈنا خلاف قانون قرار دے دیا جائے انگریزی وضع کے بال بغیر طبی سند کے کوئی نہ رکھ سکے اور یہ انگریزی سامانِ آرائش ممنوع قرار دیا جائے تو نقشہ ہی نہ بدل جائے پاکستان کا۔" پھر لیجئے آپ کوٹ اور پتلون زیب تن کئے ہوئے ہیں کیا یہ آپ کا قومی لباس ہے؟

عرض کیا "مولانا یہ بات آپ نے کچھ واقعی معقول نما کہی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارا قومی لباس طے نہیں ہوا ہے"

مولانا بولے "تو آخر کب طے ہوگا، جب یہ سوٹ آپ کی کھال بن کر رہ جائے گا؟"

عرض کیا "مولانا قصہ دراصل یہ ہے کہ ابھی اہم کاموں کا انبار ختم نہیں ہوا ہے کہ ان جزئیات کی طرف بھی توجہ دی جا سکے۔ ابھی تو اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے کے نہایت اہم مسائل میں الجھے ہوئے ہیں سب کے سب۔"

کہنے لگے "بس دیکھ لو مجھ کو نہایت شریفانہ لباس پہنے کھڑا ہوں۔"

ہم نے سر سے پیر تک مولانا کا جائزہ لے کر عرض کیا "ممکن ہے کہ یہ شریفانہ لباس ہو مگر ہم کو ان میں سے کچھ چیزیں غیر شریف طبقے کے لئے بھی تو چھوڑنا پڑیں گی، آخر وہ بچارے کیا پہنیں گے۔"

کہنے لگے "دیکھئے صاحب یہ رہا صافہ، نہایت متین چیز بھی ہے اور بھاری بھرکم بھی، جتنا چاہے اس کو خوش نما بنا لیجئے پھر یہ کہ خالص اسلامی چیز ہے۔"

عرض کیا "دیکھئے قبلہ، اختلاف یہیں سے شروع ہو جائے گا اس لئے کہ قومی لباس میں اگر اب تک کوئی چیز طے ہو سکی ہے تو وہ صرف سر کی پوشش ہے اور شاید آپ بھول رہے ہیں کہ جناح ٹوپی کو قومی لباس کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔"

مولانا نے بھی عید کے دن جناح کیپ پہنی تھی جو خود تو بی کوڑی معلوم ہی ہوتی تھی مگر مولانا اس حد تک کنتیلی نظر آتے تھے کہ گویا ذرا سر جھکایا اور ناک سے بھاپ نکلتا ہوا چائے کا پانی نکلنے لگا۔ غالباً خود مولانا کو بھی اپنا وہ حلیہ یاد آ گیا ہوگا کہنے لگے "جناح ٹوپی ہے تو ٹھیک مگر عمامہ بھی ترک نہ کرنا چاہیئے۔ بہرحال چلیئے جناح ٹوپی ہی اس کے بعد لمبا کرتا کرتے پر جاڑے میں صدری اور گرمیوں میں کچھ نہیں۔"

مولانا شاید لباس کی اور بھی تفصیل بتاتے کہ ان کے صاحبزادے نوکر کے سر پر گھوڑا اٹھوائے جاتے ہوئے نظر آئے تو مولانا نے پکارا۔

"یہ کہاں لے جا رہے ہو؟"

جواب ملا "بڑھئی کے ہاں لے جا رہا ہوں صبح ٹوٹ گیا تھا نا۔"

اور ہم نے مولانا سے پوچھا "قبلہ یہ گھوڑا اور آپ کے یہاں؟"

کہنے لگے "ارے بھائی یہ کوئی میرا گھوڑا تھوڑی ہے جب مکان پر قبضہ کیا ہے تو یہ چیزیں مکان ہی سے نکلی تھیں لہٰذا اب مجبوراً ان کو استعمال کرنا ہی پڑتا ہے اور جب ان چیزوں کو استعمال کرتا ہوں ضمیر بھی ملامت کرتا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی پاکستان ہے مگر میں تو یہی حال ہر طرف دیکھ رہا ہوں اور دیکھ دیکھ کر جل رہا ہوں۔"

(ملخص)

ساقی

غــــزل

اثر لکھنوی

بے کئے سے رہا ان کو، روتے پھرنا ساقوں کو،
ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو

صبح کو جلوہ بر منبر، شب کو پیر میخانہ
اب کہئے تو بھلا کیا کہئے ایسی مقدس ذاتوں کو

وہ جو نہ آئے بادل چھائے، گرجے برسے کھل بھی گئے
اس کے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو

ادب اور افادیت

محمد حسن عسکری

ادیب کے لئے نظریہ اتنی اہم چیز نہیں ہے جتنی تخلیق کرنے کی اہمیت۔ ادیب اسے ادب کے نظریئے ہیں تو چونکہ راہ راست تخلیق رد ہو یا جاتا ہے، اس لئے اس نظریہ کا پیرو چاہے گھٹیا چیز ہی لکھے مگر اس کی تخلیق کسی نہ کسی حد تک فنی طور پر مؤثر ضرور ہوگی۔ افادی ادب کے نظریئے میں خطرہ یہ ہے کہ بعض دفعہ لکھنے والے کو افادیت ہی افادیت نظر آنے لگتی ہے۔ اور پھر چونکہ ادب ادب نہیں رہتا تو افادی ادب بھی نہیں رہتا۔ اس لئے ایسی تحریروں میں سے افادیت بھی غائب ہو جاتی ہے۔ مثال کے لئے اشتراکی روس کا تقریباً فی صدی ادب موجود ہے۔ یہ مانا کہ آدمی ہنگامی حالات اور ضروریات کے مطابق بھی لکھے لیکن اگر وہ ادیب ہے تو اسے یہ تو دیکھنا چاہیئے کہ یہ ہنگامی صورت ہے کیا۔ اگر لوگوں کے اندر جذبہ عمل بیدار کرنا یا انھیں میدان جنگ کی طرف دوڑانا ہی ٹھہرا تو یہ کام زیج بازار میں کھڑے ہو کے زندہ باد، مردہ باد کے دو چار نعرے لگا دینے سے بھی ہو سکتا ہے۔ ادب کا کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا کہ ہنگامی حالات کے ماتحت لوگوں کو ہنگامی طور پر عمل کے لئے تیار کر دے۔ ادب کا کام پوری انسانی زندگی کو نظر میں رکھ کر یہ بتانا ہے کہ مخصوص حالات میں ایک خاص قسم کا عمل کیوں ضروری ہے۔ نعرے بھی اپنی جگہ ضروری ہیں اور لوگوں کو فوراً میدان جنگ میں پہنچانا ہو تو شاید ادب سے زیادہ کام کرتے ہیں لیکن سوال اس وقت کا ہے جب سپاہی اجتماعی شعور سے کٹ کر اپنے انفرادی شعور میں واپس آ گئے ہوں یعنی مثال کے طور پر جب وہ لڑ نہ رہے ہوں، بلکہ دشمن کے انتظار میں مہینہ بھر سے ایک جگہ خالی پڑے ہوں تو ایسے وقت ہمیں بند و بست یہ کرنا ہے کہ انھیں اپنا عمل مہمل یا غلط یا فضول نہ معلوم ہونے لگے۔ یہاں صرف سچا ادب ہی ہمارے کام آ سکتا ہے، ایسا ادب جو ہمارے عمل کے مختلف پہلو ہمارے سامنے لائے اور ہمیں یہ دکھائے (بلکہ دیکھنے دے) کہ اس قسم کا عمل ہمارے لئے کیوں ضروری ہے؟

یہاں کمیونسٹ حضرات یہ اعتراض کریں گے کہ عمل کی ضرورت کے بارے میں شک و شبہ تو صرف انحطاط پذیر طبقوں کے افراد کے دل ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ محنت کش طبقے کو اپنی راہ عمل صاف نظر آتی ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات جوش میں آ کے یہی بات "سچے مسلمانوں" کے بارے میں بھی کہہ دیں لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا عمل مؤثر بھی ہو اور کئی سطحوں پر مؤثر ہو تو انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے آنکھیں چرانا کوئی دانش مندانہ فعل نہیں ہے۔ (اقتباس)

نگار

اشتہار بازی

رشید احمد صدیقی

اشتہار پر جو ایمان نہ لائے وہ کافر ہے، یہاں کافر سے مراد کسی کا

کفر ہیں میر انکے کلام سے ہے . . . .

. . . .

. . . . مجھے دواؤں کے اشتہار سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے نہیں کہ میری بعض کمزوریوں کی دوا ان اشتہارات میں ملتی ہیں بلکہ ان اشتہارات میں دواؤں کی کرامات کا حال پڑھ کر مجھ میں اکثر یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اس مبارک مرض میں میں بھی مبتلا ہوتا!

بچپن میں مجھے حکیم صاحب کی گولیوں کے اشتہار سے بہت دلچسپی تھی طفلی کی جہاں بہت سی رنگینیاں ختم ہوئیں وہاں حکیم صاحب کی گولیوں کا اشتہار بھی مجھے داغ دے گیا۔ اس زمانہ میں مجھے انگریزی نہ آتی تھی اور اردو کے املا کی اصلاح کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب کے نام کو ہر طرح پڑھتا تھا۔ املا صحیح پڑھنے کے لئے میں نے اپنے مولوی صاحب سے پوچھا تو اول تو انھوں نے اس سے اختلاف کیا کہ میں اسٹیشن جاؤں اس لئے کہ کیا معلوم کسی دن انجن کا نشانہ غلط بیٹھے اور پٹریوں پر چلنے کے بجائے پلیٹ فارم پر دوڑ پڑے۔ دوسرے یہ کہ اسٹیشن پر نامحرم تصاویر ہوتی ہیں۔ ایک دن انھیں گولیوں کا اشتہار ایک اردو اخبار میں نظر آیا۔ میں نے مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ پہلے تو غور سے سارا اشتہار پڑھ ڈالا، اس کے بعد بولے اس میں کیا قباحت ہے، یہ دیکھو لکھا ہے کہ مردانگی دوا ہے۔ مرد کو فارسی میں کہتے ہیں بچپن، اس کا مصدر ہے بچپن۔ بچپن سے بچم۔ میں نے کہا بچم، بولے بچم صاحب کی گولیاں۔ پھر خاصا تھا نہ لیکن ہمدردانہ انداز سے بولے آخر اس میں دقت کیا تھی؟ تم کیا پڑھتے تھے؟ میں نے کہا کہ میں بھی قریب قریب یہی پڑھتا تھا۔ بولے آخر میں بھی تو سنوں، میں نے کہا میں تو اس کو حکیم پڑھتا تھا بولے یہ بھی صحیح ہے بعض نسخوں میں یہ بھی آیا ہے۔

لکھنؤ کے سب سے آباد اور پُر رونق بازار میں ایک دن ایک شخص نظر آیا لمبی گھنی داڑھی۔ آدھی بالکل سیاہ اور آدھی بالکل سفید۔ ہاتھوں سے باری باری نصف داڑھی کو دائیں بائیں جنبش دیتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا۔ پہلے ایسی تھی، اب ایسی ہے۔ لڑکوں اور بے فکروں کا ایک ہجوم ساتھ تھا۔ اب معلوم ہوتا تھا جیسے کسی قومی اسمبلی میں کوئی گھن گرج ریزولیوشن پاس کیا جا رہا ہو۔ ہم کو بتایا گیا کہ دنیا میں ایک نیکی کی جائے تو آخرت میں ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا تجربہ یہ ہے کہ آخرت میں ایک گناہ کرنے سے دنیا میں ستر سے کہیں زیادہ عذاب اٹھانے پڑتے ہیں (اقتباس)

ادب لطیف

حفیظ کے گیت

عابد علی عابد

اب حفیظ کے گیتوں کا تذکرہ آتا ہے۔ گیت غالباً شعر کی سب سے پرانی صنف ہے۔ اس کا رس، اس کا لوچ، اس کا سنگار اور اس کی مٹھاس فوراً دل کو موہ لیتی ہے۔ شعر کی باقی اصناف کی طرح اس کا موضوع بھی محدود نہیں۔ بہار، خزاں، برکھا رت، کھلتے ہوئے پھولوں سے لے کر مرجھائی ہوئی پتیوں تک اور ادھر برہا کی رات کے اضطراب سے لے کر شام نشاط کی شادکامیوں تک سبھی کچھ گیت کے دائرے میں شامل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ گیت میں فکر کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ جذبے میں سرشار اور احساس میں رچے ہوئے ہوتے ہیں اس اعتبار سے گیت کا مزاج باقی تمام اصناف سے مختلف ہوتا ہے دوسرا مشکل گیت کے سلسلے میں یہ ہے کہ یہ گائے جانے کے لئے لکھا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ شاعر گاتا ہے اور لکھتا ہے۔ فارسی میں گیت کے مقابل ہمیں ترانہ ہے جسے اب باطی بھی کہتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ سب اچھے ترانے لکھنے والے موسیقی سے بھی ماہروں کی طرح آشنا تھے۔ اردو میں

نے کے لئے بھی ضروری ہے کہ شاعر موسیقی کے رگ ریشے سے واقف
ہوگا تو گیت یا تو ہندی اوزان کی نقلید میں کچھ بے ربط ٹکڑوں کا
گا یا نغمے کے قالب میں سمانے سے انکار کرتا رہے گا آپ زبردستی
ے تو اور بات ہے کیونکہ زبردستی سے تو بعض گانے والے غزل
دھ کھرٹ راگ میں بھی گاتے ہیں۔ بہرحال حفیظ گیت لکھنے کے
ت موزوں تھا اور ہے۔ اس نے ہر قسم کے گیت لکھے ہیں۔ بانکے
ں بھرے ایسے جن میں جذبہ بہت کھنچا ہوا ہے اور ایسے بھی جن
بذبہ ابلا پڑتا ہے۔ میری رائے میں اس کا سب سے اچھا گیت "جاگ
رشن جاگ"، جسے سن کر (پڑھ کر نہیں کہا میں نے) کبھی کبھی دل
یال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر محض اپنے آپ سے مخاطب ہے اور محبت
انے گا رہا ہے۔ اور دبی چنگاریاں سلگا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں
مہ گیت اب بھی لکھے جا رہے ہیں اور اس معاملے میں گیتوں کو مقبول
ے کا سہرا میرا جی کے سر ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ان گیتوں میں کچھ
نہیں معلوم ہوتی۔ کچھ تو یہ گیت کے مزاج میں رچے ہوئے نہیں
۔ اور کچھ اس لئے کہ لکھنے والے بیشتر موسیقی کے رموز سے ناآشنا
۔ ظاہر ہے کہ میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صرف مغربی
ستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں میرے خیال میں بیش و کم شعر کی
نف کا مستقبل روشن ہے۔ اور روشن بھی کیوں نہ ہو مغربی پاکستان
بیشتر حصے شعر کے پنپنے کے لئے نہایت موزوں واقع ہوئے ہیں۔
وہ حصے ہیں جن کے متعلق کسی نے کہا ہے:

ں روز بہتا ہے دریائے خوں
یہاں موت سے کھیلتا ہے جنوں
ں نوجوانوں پہ مرتی ہے موت
یہاں مرنے والوں سے ڈرتی ہے موت
ہاں سوز میں ساز پانی میں آگ
یہاں جوگ میں مل گیا ہے بہاگ

(ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ)

تبرکاتِ مخزن

غزل

منقول از مخزن - جنوری ۱۹۰۸ء

کیا دل نے تکل کر خود ہی استقبال پیکاں کا
فراغت شرط ہے رتبہ یہی کہتا تھا مہماں کا

اسی کے منتظر ہیں ہم بھی جس کی تو ہے اے بلبل
بہار آنے پہ ہوگا فیصلہ دست و گریباں کا

صدائے آفریں سے تیری آنسو بچھ گئے دل کے
مگر پوچھا نہ تو نے حال بھی کچھ چشم گریاں کا

یہ کیا آئے ہوئے بیٹھے ہو بالیں پر عیادت کو
اجل کو فکر ہے تجھ سے زیادہ تیرے درماں کا

نہیں معلوم آئی تھی حیا کم بخت کو کس سے
کہ حسرت نے مرے ارمانِ دل میں آکے منہ ڈھانکا

ابھی تک خبر ہے لیکن بہار آنے دے اے بلبل
بلا لائے گا تیرے سر پہ یہ غنچہ گلستاں کا

اجل کو جا کے سمجھا دو ذرا تکلیف تو ہوگی
نہیں خاطر میں لاتی کچھ بھی کہنا میرے درماں کا

نکالا پیر سے پھر دل میں رکھا دست وحشت نے
خدا کی شان ہے اب رتبہ ہو یہ خارِ مغیلاں کا

تنک باقی ہے اب تک گو تری محفل میں بیٹھا ہوں
کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوھر کو بیاباں کا

محمد علی جوہر بی۔ اے (آکسفورڈ)

یارانِ نکتہ داں

عبدالسلام خورشید (لاہور)

"ہیر رانجھا"

"مخزن" کے جنوری نمبر پر اتفاق سے ابھی ابھی نظر پڑی۔ استادی محترم پروفیسر حمید احمد خاں کا مقالہ "ہیر رانجھا" سب سے پہلے پڑھا۔ کیونکہ پنجاب کے لوک رومان، لوک گیت اور لوک ناچ اور پنجابی ادب میرے محبوب موضوع ہیں۔ یہ مقالہ ہیر رانجھا کے کئی اوجھل پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے لیکن چند باتیں محل نظر ہیں جنھیں بڑے ادب کے ساتھ پروفیسر صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ اگرچہ وارث شاہ کی عظمت مسلمہ ہے اور وہ پنجابی کا سب سے بڑا شاعر ہے لیکن ہیر رانجھا کے قصے کو ادبی رنگ دے کر پنجابی نظم کی شکل میں پیش کرنے کا امتیاز اس سے پہلے تین شاعر حاصل کر چکے تھے۔ سب سے پہلے دامودر نے سولھویں صدی میں اکبر کے عہد میں ہیر رانجھا کو نظم کیا۔ پنجابی ادب کے نقادوں کا بیان ہے کہ اس کی زبان مغربی پنجاب کی بولی "لہندی" کا ایک حسین و جمیل مرقع ہے اور اس کا ادبی پایہ بلند ہے نیز اس کی کہانی وارث کی کہانی سے کافی مختلف ہے۔ دامودر کے بعد ۱۶۹۲ء میں ایک شاعر احمد کوی نے ہیر لکھی ہے کی کہانی ہو بہو وہی ہے جو وارث نے لکھی۔ اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وارث نے اپنا پلاٹ یہیں سے لیا۔ احمد نے ہیر کا خاکہ تیار کیا وارث نے اس میں رنگ بھرا اور اسے زندۂ جاوید کر دیا۔ وارث کی ہیر سے تیس سال پہلے مقبل شاہ نے خوبصورت اور ٹھیٹ پنجابی میں ہیر رانجھا کا قصہ نظم کیا اور دونوں کی زبان آپس میں بہت ملتی ہے۔ خود وارث شاہ نے اعتراف کیا ہے کہ اس سے پہلے بھی کئی لوگ اس پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں، ملاحظہ ہو:

ہور شاعراں چکیاں چھوتیاں نی　　گلاں مٹھیاں وچ خراس دے نیں
سمجھ لین عاقل ہوش غور کر کے　　ایہہ رکھیا وچ لباس دے نیں

۲۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اٹھارویں صدی میں مغربی پنجاب میں خود اس علاقے کی بولی ادبی کاوش کا مرکز بنی۔ یہ بیان قابلِ غور ہے۔ میں اٹھارویں صدی سے پہلے کے پنجابی شاعروں کے نام پیش کرتا ہوں جو اپنے اپنے زمانوں کے شاعر تھے اور جن کا کلام آج بھی بعض حلقوں میں بہت مقبول ہے:

صوفی شعرا:

۱۔ شیخ ابراہیم فرید ثانی (۱۴۵۰ - ۱۵۵۴) آپ پنجابی زبان کے پہلے صوفی شاعر تھے اور پاک پتن میں آپ کا کلام آج بھی پڑھا جاتا ہے۔

۲۔ مادھو لال حسین (۱۵۳۹ - ۹۹) "کافیاں شاہ حسین" کے نام سے آپ کی اٹھائیس کافیوں کا مجموعہ اب بھی بازار میں بکتا ہے۔

۳۔ سلطان باہو (۱۶۳۱ - ۹۱) "مجموعہ ابیات سلطان باہو" طبع ہو چکا ہے اور کئی قوالوں کو نسلاً بعد نسلٍ سینہ بہ سینہ ان کا کلام یاد چلا آتا ہے۔

دوسرے شعرا:

۱۔ مولوی عبداللہ عبدی۔ سترھویں صدی کے آغاز میں شعر کہے۔ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ دامودر۔ سولھویں صدی کا شاعر جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

۳۔ بیلو۔ جس نے مرزا صاحباں کو سب سے پہلے پنجابی نظم میں پیش کیا۔ سترھویں صدی کے شروع میں ہوا۔

۴۔ حافظ برخوردار۔ مرزا صاحباں، یوسف زلیخا وغیرہ کا مصنف۔ سترھویں صدی کے اواخر میں۔

۵۔ احمد کوی۔ جس نے سترھویں صدی کے اواخر میں ہیر ختم کی۔

۶۔ فقیر درزی۔ مذہبی مسائل پر نظمیں کہیں۔

مندرجہ بالا فہرست میں میں نے صرف ایسے پنجابی شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو اولی کاوشوں کی بنا پر پنجابی ادب کی نشو و نما میں کافی حصہ لے چکے ہیں اور یہ سب اٹھارھویں صدی سے پہلے ہوئے۔

بشیر ساجد (کراچی)

شیفتہ کا دیوان

بدرالحسن اختر بدایونی کے بیان (مطبوعہ اپریل) کے مطابق شیفتہ کا دیوان ان کی زندگی میں ۱۲۸۰ھ میں مطبع آئینہ سکندری میرٹھ میں چھپ گیا تھا لیکن میرے پاس دیوان شیفتہ کا ایک خاصا پرانا نسخہ ہے جس کے آغاز میں ناشر کی طرف سے ایک نوٹ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیفتہ کا محض فارسی کلام ان کی حیات میں چھپا تھا اور مسودہ دیوان چھپنے والا تھا۔ جسے بعد میں سید محمد میر حسن مہتمم مطبع رضوی دہلوی نے حسب فرمائش شائقین "بہ جستجوئے تمام بہم پہنچا کر" طبع کرادیا۔ افسوس ہے کہ اس نسخہ کے دو چار آخری اوراق غائب ہیں۔ ورنہ خیال ہے کہ سالِ طباعت بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ نسخہ ۱۲۸۰ھ کے کتنا عرصہ بعد چھپا۔ کاتب مرزا عبدالغفار بیگ ہیں۔ واللہ اعلم کونسا بیان درست ہے۔ اختر بدایونی کا یا مہتمم مطبع رضوی دہلوی کا؟

ڈاکٹر باقر صاحب کا افسانہ "فلرٹ" خوب ہے لیکن عنوان کھٹکتا ہے۔ کیا اردو واقعی اتنی بے مایہ ہے کہ انھیں فلرٹ کا ترجمہ یا مطلب ادا کرنے کے لئے کوئی موزوں لفظ نہ مل سکا؟

شیر افضل جعفری کی "بھنگ دی گڈی" "غامی" پسند آئی ۔ ہیر کے دیس میں یہ بھاگ بھری جوانی چاند تاروں کی تمنائیں چرا لائی ہے۔

حامد صدیقی کی "حیرانی" بھی خوب ہے۔

عبدالمجید حیرت (ٹونک راجستھان)

اشعار

مئی کا مخزن ملا۔ اس اشاعت میں یاران نکتہ داں کا اضافہ دیکھ کر چند وہ اشعار درج کرتا ہوں جو اس گنہگار کو پسند آئے ۔

فردوس بداماں ہے تجلی جلووں کا تصور ۔۔۔ ویرانہ بھی میرے لئے ویرانہ نہیں ہے (ذہین بلیاوی)

حضرتِ دل یہ ہو گلا کوئی ۔۔۔ ورنہ ہو جائیگا خفا کوئی
مجھ پہ طعنے ہیں بیوفائی کے ۔۔۔ اس جفا پر وفا کرے کوئی
یا خفا مجھ سے بے سبب نہ ہو ۔۔۔ یا بتادو مری خطا کوئی
([illegible])

کیوں ہے دنیا نظر میں تیرہ و تار ۔۔۔ میرے بختِ سیاہ سے پوچھو
عرش پر کیوں اڑا دماغ مرا ۔۔۔ حضرت کی واہ واہ سے پوچھو
([illegible])

ان کے آنے کا گو یقین نہیں ۔۔۔ ان کے آنیکا کچھ خیال تو تھا (عبدالعلیم)

مٹ مٹ کے ابھر رہی ہے دنیا ۔۔۔ بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں (شاعر لکھنوی)

باقی ہے تیرے وعدۂ باطل کا اعتبار ۔۔۔ آنکھیں لگی ہوئی ہیں تری راہ پر ہنوز (شفقت کاظمی)

کوئی صیاد خوش نہیں آتا ۔۔۔ ہوس قید و بند رکھتا ہوں

(سید علی محمد صبا عابدی کا شعر جسے پنڈت جگن ناتھ صاحب آزاد نے پسند کیا) اور حضرت آغا حشر مرحوم کی غزل دیکھ کے معلوم ہوا کہ عاشق اس طرح نام لکھا ہی کرتی ہے۔ شک نہیں کہ ایک تبرک ہے۔ کاش آغا مرحوم کا غیر طبع کلام کتابی صورت میں

مطبوعات

دیوانِ غالب مع شرح از: پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی

یہ کتاب ۱۹۵۰ء کی اہم ہندوستانی مطبوعات میں سے ہے۔ حضرت جوش نے یہ شرح لکھ کر اور آتما رام اینڈ سنز دہلی نے دیوانِ غالب اور اس کی شرح چھاپ کر ثابت کر دیا ہے کہ غالب اپنے وطن میں حسبِ سابق اب بھی مقبول ہے اور بھارتی اہلِ علم اور اہلِ شوق میں اب بھی اس کے پرستاروں کی کمی نہیں۔ حضرت جوش کی لکھی ہوئی اس شرح میں خاص بات یہ ہے کہ یہ مبتدیوں ہی کے لئے نہیں منتہیوں کے لئے بھی یکساں مفید ہے کیونکہ شرح اشعار میں حضرت جوش نے معنوی نکات حل کرنے کے ساتھ ہی معمولی الفاظ کے معنی بھی لکھ دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں کسی شعر کی ایسی خوبیوں پر نظر ڈالی گئی ہے جو خاص حضرتِ جوش کی تحقیق اور کاوشِ ادبی سے اجاگر ہوئی ہیں، وہیں ان شعری محاسن کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جنھیں ادبا تو سمجھتے ہیں لیکن طلبہ اور مبتدی نہیں سمجھ سکتے۔

ایک اور خوبی یہ ہے کہ اگرچہ حضرتِ جوش غالب کے غایت درجہ معتقد ہیں لیکن انھوں نے غالب کے کم پایہ اشعار کی تعریف نہیں کی بلکہ بڑی جرأت سے ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے اور بعض ایسے شعروں کو علی الاعلان محض قافیہ پیمائی قرار دیا ہے ؎

عش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو — ہوئی پھر اس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن — اٹھائے کیوں کوئی رنجورِ خستہ تن تکیہ

اس غزل کا ایک اور شعر بھی اگرچہ اسی قسم کی قافیہ پیمائی کے ذیل میں آتا ہے مگر حضرتِ جوش نے اپنی ذہانت سے اسے جو نئے معنی پہنائے ہیں وہ جدید ترقی پسندوں کے لئے جو "دنیا بھر" کے بجائے "جہان بھر" اور "راست قامت" کے بجائے "سرو قد" اور "کھٹیا" کے بجائے "ستادہ" وغیرہ کی عجیب و غریب ترکیبیں گھڑتے ہیں باعثِ عبرت ہوں گے۔ اب وہ شعر اور اس کی شرح ملاحظہ فرمایئے:

رو دار کھو نہ رکھو تھا جو لفظ تکیہ کلام — اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن، سخن تکیہ

شرح: اہلِ سخن اب الفاظ اور ترکیبوں کو اپنی مرضی سے بگاڑ رہے ہیں۔ فصیح اور غیر فصیح کی انھیں کوئی پروا نہیں۔ تکیہ کلام کو سخن تکیہ کہنے لگے اور اسے ایجادِ بندہ کہہ کر معترض کا منہ بند کر دیا۔"

غالب کے زمانہ میں تکیہ کلام کو سخن تکیہ کہنے والے تو کیا ہوں گے انھوں نے تو محض ایک قافیہ کی رعایت سے یہ بے مزہ سا شعر کہا تھا لیکن حضرت جوش نے اپنے عہد کی حالت کو منظر رکھ کر اس کی جو تشریح کی ہے اس نے اسے ضرب المثل کا سا درجہ بخش دیا ہے اور یہ ایسے موقعوں پر بہت لطف دے سکتا ہے جب کوئی شخص "دیباچہ" یا "تمہید" کی جگہ "پیش لفظ" لکھے یا "ہاں خوب یاد آیا" کی جگہ "سر راہے" وغیرہ کی سی بے محل ترکیبیں استعمال کرے۔

ایک اور شعر کی تشریح میں حضرت جوش نے غالب پر ایک بجا اعتراض کیا ہے۔ شعر ہے:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

حضرت جوش اس شعر کی شرح کرنے کے بعد لکھتے ہیں "دفن کرو کی جگہ گاڑو اس شعر میں کھٹکتا ہے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ مفعول برہمن ہے اور یہ لفظ احترامی زبان کا نہیں۔"

اس نکتہ پر ایک برہمن ہی کی نظر جا سکتی تھی، عام پڑھنے والے تو غالب کے احترام کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ کر سکتے تھے۔ ہندی میں دفن کرنا کی جگہ لفظ گاڑنا بالکل درست ہے لیکن جیسا حضرت جوش نے کہا اردو زبان کی شائستگی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

غالب کا ایک شعر ہے:

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے — اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

اس کی شرح پنڈت جی نے یوں کی ہے: "منزل سے یہاں راہ منزل مراد ہے۔ واماندگی کے معنی ہیں ہار تھک کر ایک جگہ پڑ رہنا۔ فرماتے ہیں، راہ چلنے کی تکلیف کیوں اٹھائیں ناکامی و نامرادی کو ہم سے عشق ہو گیا ہے اور وہ ایک قدم بھی چلنے نہیں دیتی۔ یہی کہتی ہے خدا کے لئے مجھے تنہا نہ چھوڑو یہیں رہو۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ واماندگی کی وجہ سے ہم منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے تکلیفِ سفر کیوں اٹھائیں۔"

اس شعر کی قریب قریب ایسی ہی شرح دیگر تمام شارحین نے بھی لکھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ "عشق ہے" کے الفاظ کے مفہوم کی طرف ان شارحین نے توجہ نہیں کی۔ "عشق ہے" اردو کلمہ ہے جو فقیروں درویشوں اور ان کی دیکھا دیکھی عوام میں تحسین و آفرین کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے — اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے

پنجابی میں بھی یہ کلمہ بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ پنجابی میں عشق کو "اشک" اور "ہے" کو "اے" کہتے ہیں چنانچہ پنجاب کے لوگ "عشق ہے" کی جگہ "اشک اے" کا کلمہ عام طور سے استعمال کرتے ہیں۔ اس تشریح کے بعد شعر کا مفہوم صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ آفرین ہے واماندگی جس کے طفیل رنجِ راہ کھینچے بغیر ہمارا وہ قدم بھی جو اٹھائے نہیں اٹھتا در اصل منزل میں پہنچ چکا ہے۔ یہ منزل غالباً خود واماندگی ہے۔

اس مختصر تبصرہ میں جوش صاحب کی نکتہ آفرینیوں کی داد کما حقہ نہیں دی جا سکتی۔ اہل نظر کو خود اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

آخر میں ایک فروگذاشت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ غالباً کتاب کے پروف احتیاط سے نہیں دیکھے گئے اسی وجہ سے اس میں کتابت کی غلطیاں جا بجا ملتی ہیں۔ ہم حضرت جوش کو با ادب یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ایک غلط نامہ الگ چھپوا کر اس کتاب میں شامل کر دیں کیونکہ بعض اشعار بھی غلط چھپ گئے ہیں۔ اور اندیشہ ہے کہ اس طرح وہ غلط صورت ہی میں رائج ہو جائیں گے۔ چند غلطیوں کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ اور غلطیاں بھی ہوں گی:

غلط	صحیح
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دے	تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا	جمع خرچ ("خرچ" اردو لفظ ہے جس میں عطف جائز نہیں)
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے ہوئے ہیں	چھدے پڑے ہیں

	مطبوعہ
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا	نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے	جانا کہ اک بزرگ
تم کو بھی ہم دکھائیں گے مجنوں نے کیا کیا	دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے	بادۂ گلفام
تماشا کر اے محو آئینہ داری	تماشا کہ اے محو آئینہ داری
نہ نالے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے (تمہید)	نہ تڑپنے کی اجازت
جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے (تمہید)	جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں	آنے کا عہد کر گئے
رنج نومیدیٔ جاوید گوارا کیوں ہو	رنج نومیدیٔ جاوید گوارا کیوں ہو
پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی	پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
مقاصد ------	مفاسد
شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق	خوشا لذتِ فراغ
باوجودیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں	پیدائی نہیں

فراغ کی جگہ فراق بعض اور نسخوں میں بھی چھپا ہے لیکن اس لفظ سے شعر بے لطف ہو جاتا ہے۔ یہاں جس لذت کا ذکر ہے وہ لذتِ فراق نہیں بلکہ لذتِ فراغ ہے۔ سینے کے شق ہو جانے سے "پردہ داریٔ زخمِ جگر" کے تکلیف دہ کام سے عاشق کو فراغت حاصل ہوگئی ہے نسخۂ ... میں بھی فراق کا لفظ ہی چھپا ہے۔ اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں تو ممکن ہے غالب نے فراق کو بعد میں فراغ سے بدلا ہو۔

کتاب کا تبصرہ اور طالب علموں کے لئے چند ہدایتیں حضرت جوش نے خود لکھی ہیں۔ ان مضامین میں جو خاصے مفصل ہیں بہت مفید اور شعری نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اس اضافے سے کتاب اور زیادہ مفید ہوگئی ہے۔ حجم ۴۴۸ صفحات۔ قیمت مجلد پانچ روپیے۔

پتا: ۱۔ جناب پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی نکودر، ضلع جالندھر

۲۔ میسرز آتما رام اینڈ سنز کشمیری گیٹ دہلی۔

مُلا فندوی

یہ حضرت تماشائی کی لکھی ہوئی ایک طنزیہ تمثیل ہے جسے بک ڈپو انجمن ترقی اردو، اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔ قصہ کی بنیاد یہ ہے کہ لوئر بر... نمائے ہند کی ایک ریاست میر گڑھ کے والی اپنی عزیز ترین بیگم کی ناگہانی وفات پر دنیا سے بیزار اور دین کے دل دادہ ہو گئے۔ انگریزی تعلیم کو بر قوت کرنا چاہتے تھے مگر انگریزوں کے خوف اور اپنے چالاک دیوان کے سمجھانے سے اس بات پر رضامند ہو گئے کہ علومِ مشرقی کا الگ دار العلوم قائم کیا جائے جس میں دین کی تعلیم لازمی ہو۔ چنانچہ دور دور سے اساتذہ بلائے گئے۔ اس قصہ کے ہیرو ملا فندوی اسی درس گاہ کے استاد ہیں۔ قصہ ... واقعات ...

ثیں آئے۔ تمثیل اپنے مکالموں کی خوبی، پُرلطف طنز و مزاح اور کامیاب کردار نگاری کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ خاص طور سے صنف
ـت زبان قابل توجہ ہے۔ آجکل بہت کم ایسی اچھی زبان دیکھنے میں آتی ہے۔ قصے کے تمام افراد دارالعلوم کے اساتذہ اور دیگر عہدہ دار ہیں۔ اس
ر ماحول کی تصویر کشی میں مصنف نے بڑا کمال دکھایا ہے۔ اگر آپ ریاستی زندگی کے جیتے جاگتے مرقع پُرلطف اور نکھری ستھری زبان میں دیکھنا چاہتے ہیں
ۂ فدوی ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا اوپر درج ہے۔

اللہ۔ محمد۔ ماننے کی باتیں۔ کرنے کی باتیں۔ نہ کرنے کی باتیں

یہ پانچ چھوٹی چھوٹی خوبصورت کتابیں جناب عبدالمجید صاحب بھٹی کے سلسلۂ تعلیم القرآن سے متعلق ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہ مختصر رسالے اسلامی تعلیمات کا
ہیں۔ اگر کوئی شخص صرف انہی کتابوں کو ایک دفعہ پڑھ لے تو اسے مذہب اسلام کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل ہو سکتی ہے علاوہ ازیں یہ بالکل
نئے انداز سے لکھی گئی ہیں سلیس زبان اور شاعرانہ طرز بیان نے ان کو نہ صرف سریع الفہم بنا دیا ہے بلکہ ان میں ایک ایسی دلکشی بھی پیدا کر دی ہے
بچے بھی انھیں شوق سے پڑھنا چاہیں گے۔ اگر مدارس کی ابتدائی جماعتوں کے مطالعہ کی کتابوں میں بھٹی صاحب کی یہ تالیفات شامل کر لی جائیں
محکمہ تعلیم کے ارباب حل و عقد ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ پانچوں کتابوں کی قیمت ۲؍۔ پتا: قومی کتب خانہ لاہور

تہمت

یہ ابوسعید قریشی کا دوسرا ناول ہے جو مکتبۂ اردو لاہور نے شائع کیا ہے۔ جن لوگوں نے قریشی صاحب کا پہلا ناول ڈرپوک پڑھا ہے وہ
جانتے ہیں کہ قریشی صاحب کس پائے کے لکھنے والے ہیں۔ ان چند سطور کو محض اطلاع سمجھئے مفصل تبصرہ آئندہ مہینے شائع ہوگا۔ حجم ۲۵۵
صفحات۔ قیمت مجلد تین روپیے۔ پتا اوپر درج ہے۔

بہترین ادب ۱۹۴۹ء میں

تقریباً ساڑھے چار سو صفحات کا یہ مجموعہ مرزا ادیب نے حال میں مرتب کر کے شائع کیا ہے اور حق یہ ہے کہ بڑا کام کیا ہے۔ اس
مجموعہ میں علمی، ادبی اور تفریحی مضامین بھی ہیں۔ اور نظمیں، غزلیں، گیت، قطعات، رباعیاں اور افسانے ڈرامے بھی۔ مقالہ نگاروں میں
سجاد ظہیر، احتشام حسین، صلاح الدین احمد، جاوید اقبال قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں احمد ندیم، ساحر لدھیانوی، عارف عبدالمتین، یوسف
ظفر، مختار صدیقی، قتیل شفائی، جگر، جاں نثار اختر، ساغر بھٹی، جوش، عدم کے نام نمایاں ہیں۔ مزاح نگاروں میں صرف پطرس، رشید احمد
اور کنھیا لال نظر آتے ہیں۔ افسانہ اور ڈراما لکھنے والوں میں کرشن چندر، مرزا ادیب، منٹو، اشک وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کتاب
بہ حیثیت مجموعی پڑھنے اور رکھنے کے قابل ہے۔ قیمت چھ روپیے۔ جلد خوب صورت ہے اور کاغذ اور کتابت و طباعت نفیس۔ پتا: مکتبۂ اردو

وہ آگئے

یہ نوجوان افسانہ نگار حضرت کوثر گوہانوی کے گیارہ مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے انقلاب ۱۹۴۷ء میں شہید ہونے والوں کی
مقدس روحوں کے نام معنون کیا ہے لیکن یہ سب افسانے شہیدوں کے متعلق نہیں، موضوعات مختلف ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔ پتا:
مکتبہ فردوس ادب ملتان۔ پاکستان۔

مدیر

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمۃ نے

پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا

جلد ۴ نمبر ۱

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور - جولائی ۱۹۵۰ء

سالانہ	سات روپے
ششماہی	چار روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

The "Makhzan" Lahore

ادارۂ مطبوعات نوائے وقت لمیٹڈ لاہور

صفحۂ اوّل

اشاعتِ جولائی سے مخزن کی چوتھی جلد شروع ہوتی ہے یہ خوشی کی بات ہے کہ اس جلد کا آغاز ایک نایاب اور یادگار مضمون سے ہوتا ہے ہم حضرت پرختساں ابدالی کے ممنون ہیں اور ہماری طرح تمام قارئینِ مخزن بھی ان کے ممنون ہوں گے کہ انہوں نے اپنے جلیل القدر جدِ امجد کے ادبی نوادر میں سے یہ بیش بہا گوہر ہمارے لیے منتخب کیا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ پورے برِ اعظم کے غالب شناس اور غالب پرست لوگ اس مضمون کو سر آنکھوں پر جگہ دیں گے۔ یہ مضمون جہاں غالب کی علمی زباں دانی اور ان کی اُستادانہ نکتہ سنجی و نکتہ آموزی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، وہیں یہ ان کے حسنِ طبیعت، خلق و مروّت اور مخلصانہ دوست نوازی کا آئینہ بھی ہے۔ جب کبھی غالب کی کسی نئی چیز کا انکشاف ہوتا ہے غالب جو زندۂ جاوید ہے، زندہ تر نظر آنے لگتا ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ اسی طرح مدتوں جاری رہے۔

ہمارے فاضل دوست مرزا محبوب بیگ کا مسلسل مضمون "فلسفۂ ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے" اس پرچے میں تکمیل کو پہنچتا ہے یہ آخری قسط غالباً دلچسپ ترین ہے

ایک موقع پر ہم نے اپنے قلمی معاونین کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنی پڑھی ہوئی نئی اور پرانی کتابوں پر "مخزن" میں تبصرے لکھیں۔ عسکری صاحب نے ایک آدھ مضمون کے بعد پھر کسی صاحب نے اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ زیرِ نظر اشاعت کے لئے صہبائی صاحب نے ممتاز شیریں صاحبہ کے متعلق ایک مضمون عنایت فرمایا ہے جس میں انہوں نے ممتاز شیریں کو نقاد بننے اور افسانہ نگاری ترک کرنے کا مشورہ دیا ہے

ممتاز شیریں صاحبہ کے افسانوں کے متعلق فی الحال "مخزن" کی رائے کو محفوظ سمجھنا چاہیے۔ اس وقت ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ "مخزن" کا یہ منصب نہیں کہ کسی کو کچھ لکھنے سے روکے۔ "مخزن" کے صفحات سب کے لئے کھلے ہیں۔

کتابوں پر اسی قسم کا ایک تنقیدی مضمون وزیر حسن صاحب دہلوی کی کتاب "چاند بی بی سلطانہ" پر محترمہ رضیہ جہاں آرا نے بھی "مخزن" کے لئے لکھا ہے وہ کسی آئندہ اشاعت میں شامل ہوگا۔

اس پرچے میں ایک عربی اور ایک طاؤسی افسانہ شائع ہو رہا ہے۔ ایک "ترقی پسندانہ" ڈرامہ بھی ہے جس کے لئے ہم غلام رسول صاحب تنویر کے ممنون ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی ایک فلسفیانہ نظم مدت کے بعد دستیاب ہوئی ہے جو اس پرچے میں شامل ہے حضرت تاثیر نے مزید توجہ فرمائی ہے اور ان کی ایک دلکش غزل ان اوراق کی زینت ہے۔ حضرت وقار کی شگفتہ غزل میں "ترقی پسندی" کے جراثیم ملتے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ "تیل ابھی تلوں میں ہے"۔

ہمارے نوجوان شاعر خلیل الرحمن اپنی نظم "انتقام" کے آئینے میں منتقمِ حقیقی کے نائب نظر آتے ہیں۔ کاش ظالم ان کی نظم سے عبرت اندوز ہوں۔ جگن ناتھ آزاد کا "سازِ ہندی" اردو ہے اور یہ محض قرآن کی زبان ہی میں نہیں قرآن کی اصطلاحات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس بھی صاحب کا "پاکستانی گیت" ہندی "بھاشا" میں ہے۔ یہ سلسلۂ مفاہمت خوب ہے ۔۔۔ یوسف جمال انصاری کی نظم اور سید فضل الحسن صاحب شفقت کاظمی کی غزل آپ پسند کریں گے۔ شفقت صاحب مولانا حسرت موہانی کے ہم نام ہی نہیں "تقبل خوشی اُن کی خاکِ پا" بھی ہیں اور ہماری رائے میں ان کے رنگ میں کامیاب غزل لکھنے والے [illegible]

جو لوگ مخزن کی قدر کرتے ہیں، امید ہے کہ ان کے لئے موجودہ پرچہ کچھ [illegible] نہ ہوگا۔

مخزن

حضرتِ غالب کی اصلاحیں

اپنے ایک تلمیذ کے کلام پر

(حضرت رضا آبدالی عظیم آبادی)

حسب تحریر آنجناب غالب کی اصلاحیں حاضر خدمت ہیں۔ ان اصلاحوں کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دادا مرزا صاحب کے شاگرد تھے اور یہ اصلاحیں اُن کے کلام پر ہوئی ہیں۔ وہ اصلاحی مسودہ اب تک بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہے جناب عرشی صاحب پروفیسر ہندو یونیورسٹی نے ایک مثنوی کی اصلاحیں مجھ سے ہی حاصل کر کے "ہندستانی" (الہ آباد) کی ایک اشاعت میں چھپوائی تھیں۔ جس میں میرا حوالہ بھی دیا تھا۔ نیز ان کی کتاب "خطوطِ غالب" جلد اول کے مقدمہ میں ان اصلاحوں کا ذکر میرے حوالے سے موجود ہے۔

تذکرۂ خمخانۂ جاوید، تاریخ شعرائے بہار جلد اوّل، نادر خطوطِ غالب، تبرّ رساہدائی مطبوعہ لکھنؤ میں جنابِ صوفی کے حالات چھپ چکے ہیں۔ (ر-ا)

مرزا غالب کے تلامذہ میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جس کو ان کی لقائے صوری کی مسرت تو حاصل نہ ہو سکی، اور ان سے بالمشافہ استفادہ و اصلاح کا انہیں موقع نہ مل سکا، مگر رسل و رسائل ان کے ربطِ باطنی کا وسیلہ بنے اور خط و کتابت کے ذریعہ ان کے کلام پر اصلاح ہوتی رہی۔ اور یہ جماعت بھی کثیر تھی۔ حضرتِ غالب کے اسی دوسری قسم کے تلامذہ میں راقم الحروف کے دادا جناب صوفی منیری بھی تھے۔ ان کا پورا نام سید ابو محمد جلیل الدین حسین عرف شاہ فرزند علی ہے۔ یہ صوبہ بہار کے مشہور اور تاریخی قصبہ منیر شریف ضلع پٹنہ کے باشندے تھے۔ ان کا ذکر تذکرۂ خمخانۂ جاوید جلد پنجم

(صفحہ ۲۴۰۔ ۴۰۴، ۳۰۳) میں ملتا ہے اور صاحب تذکرہ نے ان کی شاعری کے متعلق یہ رائے دی ہے:۔

"اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے"

خود مرزا غالب نے اپنے نامۂ نامی میں ان کے کلام کے متعلق یہ رائے دی ہے:۔

"بے غائلہ تکلف و تملق کلام آپ کا معجز نظام ہے، لفظ عمدہ، ترکیب اچھی، معنی بلند۔ ۔ ۔ ۔"

("معارف" اعظم گڑھ۔ نومبر ۱۹۲۰ء)

حضرت صوفی اردو، فارسی کے قادر الکلام اور باکمال شاعر ہی نہ تھے بلکہ متعدد فارسی و اردو تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ "راحت روح"، "وسیلۂ شرف"، "ذریعۂ دولت"، "خطارِ است" وغیرہ کے مصنف بھی تھے۔ آپ صرف تخلص ہی کے صوفی نہ تھے بلکہ ایک ممتاز خانوادہ متصوف کے چشم و چراغ تھے اور خود مسلکاً بھی صوفی صافی تھے۔ "مصطلحات المتصوفین" ایک ضخیم تصنیف، تصوّف سے ان کے شغف کا نتیجہ ہے۔

جناب صوفی منیری نے ۲۲، ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کو اپنے وطن قصبہ منیر شریف سے اصلاح سخن کی غرض سے چند اردو مثنویاں اور مرثیا صاحب کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ، تلمذ کی استدعا پر مشتمل، ایک عریضہ کے ساتھ حضرت غالب کی خدمت میں ڈاک کے ذریعہ بھیجا، اس طرح وہ مرزا صاحب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔

مرزا صاحب نے اصلاح فرما کر اپنے ایک نامۂ نامی کے ساتھ مسودہ واپس بھیجا، وہ اصل اصلاحی مسودہ اب تک خاندانِ صوفی میں بحمد اللہ محفوظ ہے۔

حضرت غالب کا مکتوب رسالہ "معارف" اعظم گڑھ (نومبر ۱۹۲۰ء) اور نادر خطوط غالب" مرتبہ حضرت رضا ہمدانی میں شائع ہو چکا ہے۔

استاد شاگرد کی اس پہلی مراسلت میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں، جن سے اگلے بزرگوں کے اخلاق، ان کے حسنِ اعتقاد، اخلاص اور سان کی وضعداری کا دلوں پر گہرا نقش بیٹھتا ہے۔ جناب صوفی اصلاحِ کلام کے لئے حضرت غالب کو انتخاب کرنے کی وجہ اپنے عریضہ مورخہ ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

". . . اگرچہ بجہد خراسان این فن برائے اصلاح این کلام خبط و این تحریر بے ربطِ من فردوسی و خاقانی باشند مگر چوں فیضِ باطن دریں خاندان از ہماں بقعۂ متبرکہ و عطیۂ اعلیٰ از حضرت خواجۂ خواجگان عرش آستان حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی قدس اللہ سرہٗ مبذول شدہ، نخواستم کہ بحکم آنکہ "دری گیر محکم گیر" بآستانۂ دیگر جبہہ سایم، ہر چہ از فیض ظاہر و باطن بمن رسد از ہماں جا ارد و یار باشد۔ ۔ ۔ ۔"

آخر میں عرض کرتے ہیں:۔

"معہود است کہ کاملاں را بناقصاں و توانگراں را بفقیراں لطفے عام باشد، چنانکہ آفتاب را بر ماہ و بر جانقصانی و بے لطفے تحقہ او لطفے تمام و نظرے تام باشد، بے تکلف خود را بآستانۂ فیض کاشانۂ نواب فلک جناب مستغنی عن المدح والثنا یعنی حضرت غالب متعنا اللہ ببرکات انفاسہ برساں و بخیال این و آں مدہ، برخیز و کار خود کن۔ ناچار بہ قیع بے غیرتی بہ خود

انداختہ سطرے چند بذریعہ عرضداشت بنظر غلامان پیش می کند نظرے فرمودہ آید۔ زیادہ حد ادب و التسلیم"۔
جناب صوفی چونکہ خانوادۂ سیادت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے مرزا صاحب نے اپنے نامۂ نامی میں تحریر فرمایا کہ۔
"۔۔ حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں فقیر غالب کی بندگی قبول ہو۔ اپنے اباؤ اجداد کے بوڑھے غلام کو آپ نے اتنا کیوں بڑھایا کہ وہ بےچارہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ کافی تھا اوراق اشعار کا بھیج دینا اور حک و اصلاح کی اجازت دینی۔ میری مدح آپ کے غلاموں کو موجب ننگ و عار اور میرے آبا و اجداد کو ذریعۂ عز و افتخار۔۔"

مسودہ میں قصیدہ مدحیہ کے عنوان پر یہ رباعی لکھی ہے ؎

غالب! ز در تو مدّعے می خواہد　　ایں دیدہ کہ کحل اثمدے می خواہد
از مہر سلیمان سندے می خواہد　　عنوان قبالۂ نصیب صوفی

مدحیہ قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

بصدر مرتبہ مسند نشین جاہ و جلال　　فلک جناب اسداللہ خان دام اقبالہ

یہاں مرزا صاحب نے اسداللہ خاں کو خط کشیدہ کر دیا (: اسداللہ خاں) اور سامنے حاشیہ پر لکھا ہے "علی کا غلام، تمہارا خانہ زاد" اور جہاں قصیدہ مدحیہ شروع ہوا ہے، وہاں حاشیہ کے اوپر کے حصہ میں "الامر فوق الادب" لکھ دیا ہے۔

اب اصلاحیں پیش کی جاتی ہیں، کہیں مصرعہ کی جگہ مصرعہ اور شعر کی جگہ شعر بدلا ہے بعض شعر قلمزد کئے ہیں، کہیں صاد (ص) بنائے ہیں۔ وجہ اصلاح کمتر لکھی ہے۔ جہاں وجہ لکھی ہے وہاں اصلاح کے ساتھ وجہ اصلاح نقل کی جاتی ہے۔ جہاں ترمیم کی ہے وہاں اصل کے ذیل میں اصلاح کر کے خطوط ہلالی میں (غالب) لکھا جائیگا۔

یہ اصلاحی مسودہ تین مثنویوں (۱) مثنوی لواء الحمد (۲) مثنوی کشش عشق (۳) مثنوی روش عشق۔ اور ایک فارسی قصیدۂ مدحیہ مشتمل بہ استدعاء تلمذ پر مشتمل تھا۔ یہ تینوں مثنویاں اردو کی ہیں۔ لواء الحمد کا موضوع حلیۂ نبوی ہے اور یہ مثنوی چھپ چکی ہے۔ دوسری دونوں اب تک طبع نہیں ہوئیں۔ مثنوی لواء الحمد کی اصلاحیں جناب مولوی مہیش پرشاد صاحب۔ استاذ بنارس یونیورسٹی اپنے ایک مقالہ میں بعنوان "غالب کی اصلاح ایک مثنوی پر" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے رسالۂ ہندستانی کی ایک اشاعت (جلد پنجم) میں پیش کر چکے ہیں۔ اس لئے اس مثنوی کی اصلاح قلم انداز کر کے اس وقت بقیہ دونوں مثنویوں اور قصیدہ کی اصلاحیں پیش کش ہیں:۔

قصیدہ کے اشعار

اصل شعر:۔　بکوچہ و علم افروخت طبع شمع خیال　　بنور ہوش خرد جست روش راہ کمال
اصلاح:۔　خویش　　(غالب)

نگاہ شوق دو دیدۂ برائے استقبال　　قرار و صبر بہ تعظیم او ز جان برخاست

مرزا صاحب نے جاں کے نون کو قلمزد کر کے جا بنا دیا یعنی ؎

قرار مہر بہ تعظیم او ز جا برخاست　　　نگاہ شوق دو دید از برائے استقبال
خیال گفت کہ ایں یوسف است ... خواب　　　ندیدہ بود بہ بیداری ایں چنیں جمال

اصلاح:- "خیال گفت کہ یوسف بخوابم آمدہ است" (غالب)

نشان سعد نظر بر سپہر خوبی او　　　قران مشتری و ماہ بود از رخ و خال

مرزا صاحب نے اس شعر کو قلمزد کر دیا اور کوئی وجہ نہ لکھی۔

نمرد زندہ چرا اگر دم مسیحا کیش　　　فسردہ گر دل پژمردہ بود ہمچو زگال

اصلاح:- "دمش مسیحا وار" (غالب)

شد از نوازش او تارِ نغمہ ہر رگ جسم　　　طرب رسید پئے انتقامِ اضمحلال

اصلاح:- "ساز" (غالب)

اصلاح کے بعد اب شعر کی یہ صورت ہو گئی

شد از نوازش او تارِ ساز ہر رگِ جسم　　　طرب رسید پئے انتقامِ اضمحلال
بگفتمش کہ چساں سر ز خاک بر دارد　　　فروتنی بود افتادِ سبزۂ پامال

اصلاح:- "فتادہ کہ بود سبزہ ساں بہ رہ پامال" (غالب)

شگفتہ گفت کہ روزے بخاک بود ولو　　　بہ آمد از دل خستہ ات مراد نہال
"دمد ثمر کہ بر آرد ز خستۂ تو نہال" م (غالب)

مصرع ثانی دو طرح تھا، پہلی شکل کو حضرت غالب نے قلمزد کیا اور دوسرا قائم رکھا اور اس پر (م) بنا دیا۔

زہے مکان فلک منزلت رفیع الشان　　　خہے مکین ملک مرتبت ستودہ خصال

اصلاح:- "پایہ" (غالب)　　"رتبہ" (غالب)

گرفت مادہ ہائے سخن از صورت　　　کہ نفس ناطقہ را عقل آمد از فعال

حضرت غالب نے اس شعر کو قلمزد کر دیا۔ وجہ نہ لکھی۔

گرفتہ شمع بفانوس خود ز مہر فلک　　　بشرق و غرب بگردید روز و شب مہ و سال

اصلاح:- "نہادہ عینک شمس و قمر بدیدہ فلک" (غالب)

وجہ اصلاح:- "وہاں کہ حاجت روشنی کی نہیں . . . " (غالب) (نقطے کرم خوردہ الفاظ کے قائم مقام ہیں)

ہما بہ بیدِ کمالت چو داغ نقصان نیست　　　مباد مہر فروغ ترا کسوف زوال

اصلاح:- "بکمال تو" (غالب)

وجہ اصلاح :- "چو داغ ہم از روئے صورت و ہم از روئے تلفظ مکروہ" (غالب)

بہ بحثِ بخت دلیل از دلیلِ خصم تو باد　　کہ قطرۂ عرقش نقطہ باد بر رخِ دال (غالب)

(صاد کردہ حضرتِ غالب)

رُباعی

سب تیغِ زباں سے انہیں پہچانتے ہیں　　غالب وہ ہیں سب اہلِ سخن جانتے ہیں (غالب)

یہ شیرِ خدا کے نام کی ہے برکت　　تو نام اسد اللہ کا سب مانتے ہیں (غالب)

اس رباعی میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ البتہ استاد نے ہر مصرع پر دو دو صاد کئے۔

مثنوی کششِ عشق

دل ہر اک اس کے سوز کا ہے گھر　　دود آہن میں، سنگ میں ہے شرر

(حضرت غالب نے اس شعر کو قلم زد کر دیا، وجہ نہ لکھی)

آج ہی کل میں ٹوٹے گی توبہ　　مے کشی ہم سے چھوٹے گی توبہ ص (غالب)

مرحلا تقا کا طے ہے آج　　دانۂ سبحہ نقلِ مے ہے آج ص (غالب)

ناک میں تنکا بالپن کا گواہ　　وضع سادی، مگر خدا کی پناہ ص (غالب)

(ان تینوں شعروں پر حضرت غالب نے ص بنائے)

پھر نشاں بھی مرا بتا دینا　　کوئی نقشِ قدم مٹا دینا

اصلاح :-　　"اس کے دروازہ کا پتا دینا" (غالب)

یہ شعر مثنوی کا ہے اور ایک سلسلہ سے مربوط ہے، مختصر یہ کہ ایک مبتلائے عشق جوان جو ننگ و نام سے بے پروا ہو کر سنگِ درِ معشوق کا ہو رہا تھا، جوشِ جنونِ عشق میں صبا کو قاصد بنا کر کہتا ہے ؎

اے صبا گر ہو واں گزار ترا　　کہیو اس گل سے حالِ زار مرا

کھلیو ان گیسوؤں کو الجھا کے　　دل کا الجھاؤ کہیو سلجھا کے

. . .　　. . .　　. . .　　. . .

حالِ وحشت سنائیو میرا　　سلسلہ تو ہلائیو میرا

نام پوچھے۔ تو "ننگ" کہتے ہیں　　کے گھر ؟ کہیو غم میں رہتے ہیں

پھر نشاں بھی مرا بتا دینا　　کوئی نقشِ قدم مٹا دینا

گویا اپنی پامالی اور فنا پذیری اور انجامِ عشق کی طرف اشارہ ہے کہ مٹتے ہوئے نقشِ قدم کا سا حال ہو گیا ہے۔ حضرتِ غالب نے سابقہ اشعار ؎

کشش دل سے مضطرب ہو کر　　آ گرا اس کے آستانے پر

کبھی چہرے سے خاک در ملتا　　گہ جبیں آستانے پر ملتا

"ملتا" کا لحاظ کر کے اور سیاق و سباق کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے مصرعہ:

کوئی نقش قدم مٹا دینا

قلمزد کر کے ع "اس کے دروازہ کا پتا دینا" اصلاح کی۔

گھر میں تو فرش گل پامال خواب　　اور در پہ ترے میں خانہ خراب

اصلاح:- "اور میں در پہ تیرے خانہ خراب" (غالب)

درمیان میں سلسلۂ کلام کی مناسبت سے ایک غزل آگئی ہے۔ ذیل کے دو شعر اسی غزل کے ہیں:-

اب جنوں ہاتھ مت بڑھا کر یہاں　　نہ گریباں ہے نہ دامن ہے

مصرعہ اول کا پہلا لفظ دو طرح نظم ہوا تھا، مرزا صاحب نے "اب" کو قلمزد کر کے "اے" رہنے دیا یعنی ؎

اے جنوں ہاتھ مت بڑھا کر یہاں　　نہ گریباں ہے نہ دامن ہے

جام تجھ بن ہے حلقۂ ماتم　　مجلس بادہ بزم شیون ہے

اصلاح:- "بن تیرے" (غالب)

گرم بیداد شہر کیا دو باش　　طعنوں سے دوستوں کے دل میں آگ

اصلاح:- "طعنہ" (غالب)

وصل مشکل، قرار مشکل ہے　　ایک میں ہوں ہزار مشکل ہے

اصلاح:- "اور" (غالب)

ہوتا ہوں جس سے جا کے فریادی / یا جس کے پاس　　مجھ پہ کرتا ہے عشق جلادی

مصرعہ اول کے دو نسخے تھے۔ اصلاح یوں ہوئی ع

اصلاح:- "جس سے ہوتا ہوں جا کے فریادی" (غالب)

مصرعہ اول میں "ہوتا" کی الف بری طرح دب رہی تھی اور مصرعہ کی دونوں شکلوں میں کوئی شکل بھی اس عیب سے خالی نہ تھی، اصلاح سے یہ عیب رفع ہو گیا۔

بھولے بھی میری یاد گاہ (آہ) نہ کی　　رحم کی مجھ پہ اک نگاہ نہ کی

اصلاح:- "نگاہ" (غالب)

دو نسخے تھا، دوسرا نسخہ "آہ" قلمزد کیا، پہلا (گاہ) رہنے دیا یعنی ع

بھولے بھی میری یاد گاہ نہ کی

جان ٹھہری ہے آنی کہ کب تک   ہے ترا انتظار یہ کب تک

اصلاح:- "آگئی جانِ مضطرب" (غالب)

تو نمائش میں واں رہے تہمہ دم   مٹ گیا میں برنگِ نقشِ قدم

اصلاح:- "ہر" (غالب)

یو نہیں چندے رہا بحالِ خراب   دوزخِ ہجر میں اسیرِ عذاب

اصلاح:- "یوں ہی" (غالب)

"یو نہیں" کی جگہ "یوں ہی" بنایا گویا املا کی تصحیح کی۔

حسرت دید بس نکل جا ئے   دل سے دل کی ہوس نکل جائے (غالب)

جی دیا ہم نے مدعا نہ ملا   خوں بہا اور خوں بہا نہ ملا (غالب)

اوپر کے دونوں شعر استاد کی صاد سے مزین ہوئے۔

اب ٹھہرنا ہوا محال مجھے   میں چلی آپ سے سمحال مجھے

اصلاح:- "سنبھال" (غالب)

دل کو چاک جگر سے راہ ہوئی   بیقراری قرار گاہ ہوئی (غالب)

نہ رکھا ضعف نے پکڑ کر پاؤں   آبلوں نے نہ روکا پڑ کر پاؤں

اصلاح:- "پاؤ" (غالب)   "پاؤ" (غالب)

اس شعر کی اصلاح کے سلسلہ میں کوئی نوٹ نہیں لکھا ہے۔ صرف پاؤں کے آخری نون کو کاٹ دیا ہے اور "پاؤ" رہنے دیا ہے۔ کیونکہ مصلاحی کی پہلی مثنوی وداد المحد کے ایک شعر کی اصلاح میں، جس میں "پاؤں" کا لفظ آیا تھا؛ پاؤں کے آخری نون کو کاٹ کر یہ نوٹ لکھ چکے تھے "پاؤ قافیہ چھاؤ اور گھاؤ کا ہے۔ آگے اس کے نون لکھنا غلط ہے۔ گریاں بصیغۂ جمع یوں لکھا چاہیئے: پاؤؤں" (غالب)

نہ ہوئی سدِ رہ کدورتِ دل   نہ ہوئی اشک کی ندی حائل

یہ شعر مرزا صاحب نے قلمزد کر دیا اور سامنے یہ نوٹ دیا کہ "ندی بتشدید ہے" (غالب)

سر سے پانک پہنانے یہ روزنہ   کو دیا غرقِ آبِ لعل و گہر

اصلاح:- "پہنا دیا زیور" (غالب)

گر پڑی جھم سے ایک بار اس میں   بھر رہا تھا زبس غبار اس میں

اصلاح:- "دھم" (غالب)

نوٹ:- "دھم بدال مفتوحہ و ہائے مضمرہ و میم" (غالب)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

من کا دیا

چراغ اپنے تمنا نے جلائے　　زمانے نے وہ پھونکوں سے بجھائے
قمر تھا شب میں فردوس نظارہ　　ہے نورِ روز میں محض ابر پارہ
ستارے آرزوؤں کے تنک تاب　　سحر میں کرمکِ شب تاب نایاب
گلستاں میں چراغِ لالہ و گل　　ہیں سب بادِ خزاں سے آخرش گل

تمنائیں بجھیں پر دل ہے روشن
چراغِ لعل سے محفل ہے روشن

دیا جلتا ہے جو قلب و نظر سے　　وہ ہے تابندہ تر نورِ سحر سے
تمناؤں میں تھراتی رہی لو　　مگر من نے کبھی کھوئی نہیں ضو
نہیں پائندگی برق و شرر میں　　دیا من کا ہے جلتا رہگزر میں
یہ دل ہے عرش کی قندیل گویا　　کہ نور اس نے حوادث سے نہ کھویا

یہ نورِ جلوہ ہائے ایمنی ہے
یہ خورشیدِ ازل کی روشنی ہے

ڈاکٹر تاثیر

طریقِ آشنائی

ایک غزل

وہ ملے تو بے تکلف، نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریقِ آشنائی، نہ رسومِ جام و بادہ

تری نیم کش نگاہیں، ترا زیرِ لب تبسّم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریبِ سادہ

یہ دلیلِ خوش دلی ہے مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ، وہ جبیں کہ ہے کشادہ

مرے دل نے خوب سمجھا جو کہا تری نظر نے
یہ ہوس کا ہے تقاضا کہ زباں سے ہو اعادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کمتر مری تاب سے زیادہ

وہ قدم قدم پہ لغزش وہ نگاہِ مستِ بادہ
بہ طرازِ زلفِ سرکش بہ کلاہِ کج نہادہ!

غلام رسول تنویر

اور شوپنہار حیران کھڑا تھا

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

اداکار

جلیل۔ فلسفے کا پروفیسر۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ۔ مگر چہرے کی دائمی شگفتگی کی وجہ سے پچیس تیس سال سے زیادہ عمر کا معلوم نہیں ہوتا۔

صادقہ۔ جلیل کی بیوی۔ عمر پینتیس سال سے متجاوز۔ گو جسم ابھی بھرپور تازگی کا مظہر ہے مگر چہرے کی گہری لکیریں ادھیڑپن سے بڑھاپے کی طرف جا رہی ہیں تاہم کبھی کبھی یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ کھلکھلا کر ہنس دے تو یہی گہری لکیریں ادھیڑپن سے بڑھاپے کی طرف جانے کی بجائے جوانی کی طرف مڑ جائیں گی۔

اختر:۔ جلیل کا دوست

زینو:۔ نوکرانی

اشرف:۔ ڈاکٹر

زمانہ موجودہ

مقام:۔ سونے کا کمرہ۔ کمرہ دستور کے مطابق ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی غیر معمولی نہیں جو توجہ کا مرکز بن سکے۔ آرائش کے لیے مینٹل پیس پر دو تصاویر رکھی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک جوان اور فیشن پرست سی لڑکی پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لئے سائیکل کے ساتھ لگی کھڑی ہے اس کی تمام خوبصورتی اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ میں سمٹ آئی ہے۔ دوسری تصویر میں غالباً یہی لڑکی چند خوش پوش لڑکوں اور لڑکیوں میں گھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کا گاؤن پہن رکھا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں شاید کوئی ڈگری ہے اور دوسرے میں ایک بڑا سا کپ۔ تمام لڑکے اور لڑکیاں چھیڑ چھاڑ کے سے انداز میں کھڑے ہیں۔۔۔ صادقہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی ان دونوں تصویروں کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ باہر سے شور و غل کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جلیل گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

جلیل:۔ خدا کے واسطے کبھی تو یہ محسوس کر لیا کرو کہ تم پر بھی چند ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔

صادقہ (لمحہ بھر کے لئے بے معنی طور پر اس کے چہرے کو گھورتی رہتی ہے پھر یکایک اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں) خدارا کبھی تو تم

بھی یہ کہ دو کر میں نے ہمیشہ چند ذمہ داریوں کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے

جلیل: کیا یہی احساس ذمہ داری ہے کہ تم شائستہ کے ساتھ یکایک انوری کی رخصتی پر بھی تل گئی ہو۔

صادقہ: میں حیران ہوں آخر اس میں قباحت کیا ہے؟!

جلیل: کیا اس میں کوئی قباحت ہی نہیں کہ ایک ماں اتنے بھونڈے طریقے سے اپنی بیٹی سے گلو خلاصی کرانے پر تل جائے اور پھر۔

صادقہ: (ٹوک کر) جب دونوں کا نکاح ایک خاندان میں ہو گیا تو پھر ایک کو گھر بٹھائے رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟

جلیل: شائستہ تو خیر سترہ سال کی ہو گئی ہے مگر انوری کی بھی عمر ہی کیا ہے۔

صادقہ: کیا پندرہ سال کوئی عمر ہی نہیں ہوتی۔ میری شادی بھی تو اسی عمر میں ہوتی تھی۔

جلیل: نہیں تم اس وقت اٹھارہ سال کی تھیں۔

صادقہ: تو یہ کونسا بڑا فرق ہے۔ ۔ ۔ اور پھر جب اسے رخصت ہی کرنا ٹھہرا تو آج کیا اور کل کیا۔

جلیل: مگر اس قدر جلد اسے رخصت کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ۔ ۔ کوئی سامان بھی تو نہیں خریدا۔ (گھڑی دیکھ کر) ایک تو بج گیا ۲½ بجے برات رخصت ہو رہی ہے۔ — اتنے کم وقت میں تیاری کیسے ہو سکتی ہے۔

صادقہ: اس کے لئے میں سب تیاری کر چکی ہوں۔

جلیل: تو یوں کہو کہ سب کچھ بہت مدت سے سوچ چکی ہو۔ — آخر اس نفرت کا باعث کیا ہے؟

صادقہ: شاید تم بھولتے ہو کہ میں بھی اس کی ماں ہوں۔

جلیل: ماں ہوتے ہوئے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ تمہاری

--- اور شوہر ہنار حیران کا

سگی بیٹی تمہارے گھر میں اور دو سال بسیرا کرے؟

صادقہ: میں اپنے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتی

جلیل: اگر ایسا ہی تھا تو اتنا تکلف کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتیں۔

صادقہ: اگر مجھے ان سازشوں کا علم ہوتا تو شاید میں اس سے نہ چوکتی۔

جلیل: یہ کونسی سازشیں ہیں جن کا ذکر ہر وقت تمہاری زبان پر رہتا ہے؟

صادقہ: فطرت کی رنگین سازشیں ۔ ۔ ۔!

جلیل: صادقہ فلسفہ میں نے بھی پڑھا ہے۔ اور بیس سال فلسفہ پڑھاتا بھی رہا ہوں مگر یہ بیہودہ خیالات میرے ذہن میں تو کبھی پیدا نہیں ہوئے جن کا ذکر تم کئی دفعہ کر چکی ہو تم نے فلسفے کا ایم۔ اے درمیان ہی میں چھوڑ دیا تھا اگر کر لیتیں تو شاید۔ ۔ ۔

صادقہ: (ٹوکتے ہوئے) اگر کر لیتی تو شاید اس غلطی کی مرتکب ہوتی ۔ ۔ ۔ اس رنگین جال میں نہ پھنستی جو ۔ ۔

جلیل: (ٹوکتے ہوئے) یہ جال بھی تمہارا اپنا ہی پیدا کردہ تم خود تو اس جال میں پھنسی ہی تھیں مجھے بھی پھانس لیا۔

صادقہ: میں نے کوئی جال پیدا نہیں کیا۔ ہاں یہ میں ضرور تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمہارے لیکچروں کی مداح تھی۔ اور جس چیز کو قابل قدر سمجھتی ہوں اس کی تعریف کرنے میں میں نے کبھی مروت سے کام نہیں لیا۔

جلیل: وہ تو میں بھی جانتا ہوں اور اس کا اظہار بھی تم کئی دفعہ کر چکی ہو — لیکن میری اور اپنی کتابوں پر جگہ جگہ میرا نام کیوں لکھا تھا؟ تمہیں کیوں اس کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔

صادقہ:۔ نام لکھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کوئی جال تیار کر رہی تھی۔ حال تو تم تیار کر رہے تھے جو لیکچر کے دوران میں اپنی پوری توجہ مجھی پر مرکوز رکھتے تھے اور جس دن میں نہ آتی تھی کلاس کو چھٹی دے دیتے تھے۔

جلیل:۔ یہ واقعی میری کمزوری تھی۔ . . . مگر میرے یونیورسٹی نہ آنے پر تم تمام دن کے لئے یونیورسٹی سے کیوں غائب ہو جاتی تھیں؟

صادقہ:۔ (کھسیانے پن سے) ہاں یہ میری بھی کمزوری تھی۔ . . . مگر مجھے کیا علم تھا! یہ اندھا پن مجھے فطرت کے رنگین جال میں دھکیل دے گا۔

جلیل:۔ (چڑ کر) تو اس رنگین جال کے لئے میں قصوروار نہیں۔

صادقہ:۔ (اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے) میں نہ جانتی تھی کہ جس خوشی کو میں اپنی کل کائنات سمجھ بیٹھی ہوں۔ وہی میری کائنات کی تباہی کا باعث ہو گی۔ . . .

جلیل:۔ (سخت بیزاری سے) صادقہ۔ آخر یہ کس کائنات کا رونا رونے بیٹھ جاتی ہو تم؟

صادقہ:۔ اس کے متعلق مجھ سے بہتر تم خود جانتے ہو (مینٹل پیس پر پڑی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کر کے) جانتے ہو یہ تصویر میں نے کب کھنچوائی تھی؟

جلیل:۔ (بے پروائی سے) ہاں جانتا ہوں۔ شادی سے پہلے جب تم میرے ساتھ جنگلوں کی سیر کو گئی تھیں۔

صادقہ:۔ اس وقت معلوم ہے تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟

جلیل:۔ (بدستور بے پروائی سے) نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

صادقہ:۔ تمہیں کچھ یاد نہیں! — مگر وہ یاد میری رگ رگ میں نشتر کی طرح اتری ہوئی ہے۔ اور جب میں اس تصویر کو دیکھتی ہوں تو اس نشتر کی چبھن اور شدید ہو جاتی ہے۔ . . . تم مجھے دخترِ

—— اور تمہارا حیران کھڑا تھا

سے گھرے ہوئے ایک ٹیلے پر لے گئے تھے۔ وہاں سے تم نے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے یہ کہا تھا:- "صادقہ دور درختوں کی اس قطار کو دیکھو جو افق کے قدموں میں لیٹی ہوئی شفق میں گھل گئی ہے اور جس کے پیچھے ایک وسیع کائنات سسک رہی ہے اس لا متناہی کی مغربی دنیا کو حسن بیباک کی دنیا کہا جاتا ہے شادی کے بعد ہم اس مغربی کائنات کی سیر کو نکلیں گے۔" . . . اور پھر تم نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیا۔ وہاں بھی افق میں کھوئی ہوئی درختوں کی قطار موجود تھی مگر اس جگہ شفق کے بجائے ہلکی ہلکی پراسرار سی روشنی پھوٹ رہی تھی پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے افق کے پیچھے سے پورا چاند جھانکنے لگا اور تمام وادی جیسے نور کے سانچے میں ڈھل گئی تم نے میرے سر کو اپنے سینے کا سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "پھر ہم مغرب کی سسکتی ہوئی وادی سے مشرق کے ان خنک خنک راستوں پر جا پہنچیں گے جو گل و یاسمن کی گود میں لپٹے لپٹے عشق و مستی کی دنیا جا نکلتے ہیں۔ —" اور پھر . . .

اور پھر . — . .

جلیل:۔ (بیزاری سے) اور پھر ہم واپس آ گئے تھے۔ . . . اور پھر اس کے ایک ہفتے بعد ہم نے شادی کر لی تھی۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟

صادقہ:۔ (چونک کر انتہائی نفرت سے) ہاں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ اس کے ایک ہفتے بعد ہم نے شادی رچا لی تھی اور شادی کے بعد دو ہی تین سال میں دو لڑکیوں کو جن کر ان کے پالنے پوسنے میں لگ گئی اور انہی کا منہ ناک پونچھتے اور نازبرداریاں کرتے کرتے میں نے زندگی کے اٹھارہ سال گزار دیئے۔ اور اب ایک گبریلے کی طرح جہاں تھی وہیں مرنے کا

سامان تیار کر رہی ہوں۔

جلیل:۔ سب انسان یہی کہتے آئے ہیں۔ تم نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔

صادقہ:۔ وہ سب میری ہی طرح فطرت کی سازش کا شکار ہیں ہماری جنسی کمزوری فطرت کا ایک کامیاب حربہ ہے جلد ہی ہمیں اس سے چانس ملتی ہے۔ دو ہماسے اندر ایک اندھے جذبے کو جنم دے کر ہمیں اس کی قربان گاہ پر چڑھا دیتی ہے جہاں ہم کسی نئی ہستی کو جنم دے کر خود ختم ہو جاتے ہیں۔

جلیل:۔ یہ تم نہیں شوبہار بول رہا ہے۔

صادقہ:۔ ہاں یہ شوبہار کی آواز ہے جسے میں اس وقت نہ سن سکی، جب میں گڑھے کے منہ پر کھڑی تھی۔ کاش یہ آواز میں نے اس وقت سن لی ہوتی۔

جلیل:۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ یہ زندگی سے سہمے ہوئے ایک شخص کی آواز ہے جو سونے سے پہلے اپنے تکیے کے نیچے ایک بھرا ہوا پستول رکھ لیتا تھا اور حجام سے اس لئے حجامت نہیں بنواتا تھا کہ کہیں وہ استرے سے اس کا گلا نہ کاٹ ڈالے۔

صادقہ:۔ وہ زندگی سے ڈرتا نہ تھا۔ چوکنا ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ فطرت کی سازشوں سے باخبر تھا اس لئے کسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔

جلیل:۔ صادقہ میں تمہیں اس کے متعلق کیا کیا بتاؤں تمہیں اس کی زندگی کے حالات سے شاید پوری واقفیت نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بقول تمہارے فطرت کی سازشوں سے باخبر تھا بلکہ اس کی وجہ وہ جذبۂ نفرت تھا جو خود اس کی ماں کے رویہ سے اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں جو اس کے باپ سے ہمیشہ ناخوش رہی، اس کے باپ کی وفات کے بعد دوسری شادی رچا بیٹھی اور شوبہار کے ذہن میں نفرت کے وہ بیج بو گئی جو ہیلٹ کے ذہن میں اس کی ماں ملکہ نے بوئے

—— اور شوبہار حیران کھڑا ہے

تھے۔ ہیلٹ کی تباہی کا باعث بھی وہ اندرونی خلفشار تھا جسے اس نفرت نے تخلیق کیا اور شوبہار بھی اسی اندرونی خلفشار کی وجہ سے دنیا سے بھاگتا رہا۔ بہتّر سال کی مسلسل تنہائی نے اس کے لئے ایسے وسیع و عریض خلا تخلیق کئے کہ جن میں کھو کر وہ کبھی واپس نہ آسکا۔

صادقہ:۔ اور یہی وہ لامحدود خلا ہیں جنہیں میں حقیقی دنیا سمجھتی ہوں جہاں ہماری انفرادیت اپنی دنیا خود پیدا کرتی ہے۔ وہ کسی انجانی دنیا میں کسی انجانے ہاتھ کے اشارے پر نہیں ناچتی۔ شوبہار کی مضبوط انفرادیت نے اسے جوانی کے اس اندھے جذبے سے محفوظ رکھا جس میں میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے پھنس گئی ۔ ۔ ۔ مگر اب میں نے بھی اپنے بچاؤ کے لئے ایک راستہ نکال لیا ہے۔ شائستہ اور انوری اپنے اپنے گھروں کو جا رہی ہیں اور مجھے اپنی ذمہ داریوں سے نجات مل جائے گی۔ میرے لئے ایک بار پھر قدرت کے وہ دروازے کھل جائینگے جنہیں فطرت نے مسدود کر دیا تھا۔

جلیل:۔ (گھبراہٹ سے) کیا مطلب ہے تمہارا؟

صادقہ:۔ مطلب یہی کہ میں نے جو بھاڑ اٹھارہ سال جھونکا ہے اسے اور زیادہ جھونکنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے بھی حق ہے کہ میں تمام بکھیڑوں اور جھگڑوں اور جھمیلوں سے آزاد ہو کر کائنات کی وسعتوں پر چھا جاؤں۔

جلیل:۔ تو کیا تم اپنی ازدواجی زندگی بھی ختم کرنا چاہتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں نے ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔

صادقہ:۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں کیونکہ میں تمہیں بھی انہیں پھندوں میں گرفتار دیکھتی ہوں جن میں میں خود جکڑی ہوئی ہوں۔

نبیل :۔ ساجدہ تم فرض سے ہٹ کر خود غرضی کی طرف مائل ہو رہی ہو جو ۔ ۔ ۔

ساجدہ :۔ لیکن میرے نزدیک میرا یہ احساس مجھے خود غرضی سے اونچا دور لے جا رہا ہے فطرت ہمارے اردگرد زمین کی خواہشات کا جال بچھا کر ہمیں اس میں اسیر کر لیتی ہے ہم ان خواہشات میں جکڑے ہوئے ان کی تسکین کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور پھر اسی چکر میں پھنس کر ختم ہو جاتے ہیں۔ فطرت کی یہ گہری سازش ہماری خود غرضی کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے۔ میں خود غرضی سے ہٹ کر خود داری کی طرف جا رہی ہوں تاکہ اپنی کھوئی ہوئی انفرادیت دوبارہ حاصل کر لوں۔

نبیل :۔ لیکن تمہاری یہ خواہش بھی تو خود غرضی پر مبنی ہے۔

ساجدہ :۔ اگر تم خود غرضی کہنے پر اتنے ہی مصر ہو تو سنو کہ زندگی سب سے بڑی خود غرض ہے جو اپنی تخلیق ہی دوسرے کی موت سے شروع کرتی ہے جانور جانوروں کو ۔ ۔ ۔

(ساجدہ کا فقرہ ابھی نامکمل ہی ہے کہ اختر جلیل کو پکارتا ہوا بڑی گھبراہٹ میں سامنے کے دروازے سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ ساجدہ اس کی طرف استعجاب سے دیکھتی ہوئی ایک بغلی والے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے)

اختر :۔ ارے بھئی کیا یہی وقت بحث کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ برات جانے کے لئے تیار کھڑی ہے اور تم میاں بیوی یہاں بیٹھے راز و نیاز میں محو ہو۔

جلیل :۔ خاک راز و نیاز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ حد سے زیادہ جذباتی آدمی یا تو خودکشی کر لیتا ہے اور یا کم از کم پھر دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔

اختر :۔ خیر یہ تو ہوتا ہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ آج اتنے جھنجھلائے ہوئے کیوں ہو۔ بھابی بھی آج خلاف معمول بہت تیز تھیں۔ کیا وجہ ہے؟

جلیل :۔ وجہ کیا ہے۔ پنجرے سے اڑنے کے لئے پر تول رہی ہے۔

اختر :۔ یہ پہیلیوں میں باتیں نہ کرو ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کچھ کہنا ہے تو صاف صاف کہو۔

جلیل :۔ کیا بتاؤں میں نے اسے فلسفہ اس لئے پڑھایا تھا کہ وہ ایم۔ اے مکمل کر لے مگر ۔ ۔ ۔ ۔

اختر :۔ (ٹوک کر) تو کیا فیل ویل ہو گئیں؟

جلیل :۔ سن تو لو ۔ ۔ ۔ اسے فلسفہ اس لئے پڑھایا تھا کہ وہ ایم اے مکمل کرے اور مجھے اس الجھن سے نجات مل جائے جو اس کی یہ ادا اسی دیکھ کر پیدا ہوتی تھی کہ وہ ایم اے مکمل نہیں کر سکی۔

(باہر شور و غل تیز ہو جاتا ہے)

اختر :۔ بھئی ذرا مختصر ۔ ۔ ۔ برات تیار کھڑی ہے۔

جلیل :۔ مختصر ہی تو کہہ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ہاں تو وہ پڑھایا ہوا فلسفہ الٹا ایک اور الجھن کا باعث ہو گیا۔

اختر :۔ تمہیں تو بچاس دفعہ سمجھایا ہے کہ یہ فلسفہ ولسفہ عورتوں کے بس کا روگ نہیں۔ ذرا سوچو تو سہی دنیا نے بے شمار ادیب اور شاعر عورتیں پیدا کیں مگر کوئی ایسی فلاسفر عورت بھی پیدا ہوئی جو افلاطون و ارسطو کی جگہ لے سکے۔

جلیل :۔ یہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ تو سن لو ۔ ۔ ۔ ۔ وہ فلاسفر بننے کی کوشش نہیں کر رہی بلکہ ایک فلاسفر کے فلسفہ سے بہک گئی ہے۔

اختر :۔ تو بہکنے دو۔ چند ہی دنوں میں دماغ خود بخود ٹھکانے آ جائیگا تمہیں اُن سے کوئی کاٹنے واٹنے کا خطرہ تو ہے نہیں؟

جلیل :۔ اختر یہ مذاق کا وقت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ دیکھو نہیں یہ ہے انوری کو بھی شائستہ کے ساتھ

رخصت کیا جا رہا ہے۔

اختر :۔ (استعجاب سے) تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہیں.... الوری کو بھی رخصت کیا جا رہا ہے . . . میں تو کچھ نہیں سمجھ سکا۔

(صادقہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہے اور ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہیں)

جلیل :۔ (تیزی سے صادقہ کو تھام کر) خیر تو ہے صادقہ . . . —— تمہارا چہرہ . ——

صادقہ :۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے . . . آپ اختر میاں کو میرے پاس چھوڑ جائیے۔ لڑکیاں کار میں بیٹھی ہوئی آپ کی منتظر ہیں۔

جلیل :۔ اختر تم ڈاکٹر اشرف کو باہر سے بلا لاؤ . . . . وہ حاجی صاحب کے پاس بیٹھے تھے (نوکرانی کو پکار کر) زینو ——زینو ادھر آؤ۔ تم صادقہ کے پاس ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

(جلیل اور اختر مقابل کے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں)

صادقہ :۔ زینو۔ مجھے اس پلنگ پر لٹا دو۔ غسلخانے سے چلمچی اٹھا لاؤ . . . مجھے قے ہو رہی ہے۔

زینو :۔ بی بی کہو تو ایک لیموں اٹھا لاؤں۔ نمک لگا کر چاٹ لینا۔

صادقہ :۔ (بستر پر دراز ہوتے ہوئے) چلمچی یہاں رکھ کر لیموں بھی لے آؤ۔ وہ بھی چاٹ لیتی ہوں۔

(زینو چلمچی رکھ کر بغلی دروازہ سے باہر نکل جاتی ہے۔ سامنے کے دروازہ سے ڈاکٹر اشرف داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر :۔ (نبض دیکھتے ہوئے) صبح کیا کھایا تھا آپ نے ؟

صادقہ :۔ کچھ بھی تو نہیں کھایا صبح سے صرف چائے کی ایک پیالی پی ہے۔ پھر معلوم نہیں دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔

(ڈاکٹر اشرف کچھ دیر تک ملاحظہ کرنے کے بعد صادقہ کو ہدایات دے کر باہر چلے جاتے ہیں۔ باہر شہنائیوں کی آواز ذرا تیز ہو کر مدھم ہو جاتی ہے جلیل گھبراہٹ کے عالم میں داخل ہوتا ہے)

جلیل :۔ صادقہ . . . . (صادقہ بدستور گم سم پڑی ہے) صادقہ . . . . . (جھنجھوڑ کر) صادقہ . . . . . بولتیں کیوں نہیں ؟

(صادقہ افضل کی طرف منہ پھیرتی ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کوئی آواز سنائی نہیں دیتی)

جلیل :۔ خود ہی تو دونوں کو بیک وقت رخصت کر دیا پھر رونے سے کیا حاصل ہمیشہ من مانی کرتی آئی ہو۔

صادقہ :۔ (ایک ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے) کاش میرے جی کی کبھی تو مانی جاتی۔

جلیل :۔ یہ بھی تو تمہارے ہی من کی مانی گئی ہے۔

صادقہ :۔ ہاں میرے ہی من کی مانی گئی ہے . . . . . تمہارے جیل میں سڑتی رہی کہ کبھی تو اس کا دروازہ کھلے گا۔

جلیل :۔ (بیزاری سے) صادقہ تکرار سے کیا فائدہ . . . . تم جانے پر اتنی ہی تلی ہوئی ہو تو مجھے کوئی اعتراض تم چاہو تو جا سکتی ہو۔

صادقہ :۔ میں چاہوں تو جا سکتی ہوں مگر میرے چاہنے سے ہے۔ میرے پر تو کاٹ لئے گئے ہیں جلیل —میں حاملہ

جلیل :۔ (حیران و ششدر) ہیں ! . . . . تم ! .

صادقہ :۔ ہاں ڈاکٹر نے یہی کہا ہے . . . . میرے لئے !

کے تمام راستے پھر مسدود ہو گئے ہیں۔ کاش میں نے لمحے بھر کے لئے اپنی آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد سازشوں کے جال نہ دیکھے ہوتے۔ کاش میں اسی طرح آنکھیں بند کئے سوئی رہتی۔ ۔ ۔ مگر اب میں اور کچھ نہیں دیکھنا چاہتی۔ میرے ارد گرد سازشیں۔ جال اور پھندے سبھی کچھ ہے مگر میں دیکھے بغیر، سوچے بغیر اور محسوس کئے بغیر ان میں پھنستی چلی جاؤں گی۔ میں آنکھیں نہیں کھولوں گی۔ میں نے فطر

سے ٹکرے کر اپنا جسم چھلنی کر لیا ہے۔ فطرت مجھ پہ پھر غالب آ چکی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہار گئی ہوں جلیل! میں ہار گئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے پھر سلا دو جلیل۔

(اپنے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ کر سسکیاں لینا شروع کر دیتی ہے)

(پردہ)

★

راحل صحرائی

سنہرا جال

شامِ اودھ، نہ صبحِ بنارس خیال میں
دیوانے آج مست ہیں اپنے ہی حال میں

ایوانِ شب میں نور فشاں ہے چراغِ ماہ
رقاصِ قلب محو ہے رقصِ جمال میں

نغماتِ نور چاند کی پیاری زبان سے
گونجے ہیں شرق و غرب و جنوب و شمال میں

کھیتوں کی سبز پوش فضاؤں پہ ہے خمار
لغزش سی آ رہی ہے ہواؤں کی چال میں

جھونکے ہوا کے عطر بداماں خنک خنک
گم ہو رہے ہیں گرمیٔ شوقِ وصال میں

اک نوجواں کہ بیس برس کا ہے سِن ابھی
وارفتگیٔ شباب کی ہے چال ڈھال میں

اِس چاندنی میں ہے اُسے اک چاند کی تلاش
الجھی ہوئی نظر ہے ستاروں کے جال میں

ظفر اقبال حشر

غزل

ہر خوشی غم سے بدل کر رہ گئی
دھوپ آئی اور ڈھل کر رہ گئی

چمپئی عارض پہ وہ اشکِ رواں
پھول پر شبنم مچل کر رہ گئی

بعد پروانے کے شمعِ سوگوار
دو گھڑی محفل میں جل کر رہ گئی

ان کا غم ہم کو ودیعت ہو گیا
ساری دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

حشر اُن کی پرسشِ نیگا تو دیا
موت بھی پہلو بدل کر رہ گئی

حضرت وقار انبالوی

تیل ابھی تلوں میں ہے

چہرے ابھی اداس ہیں، کرب ابھی دلوں میں ہے
قافلۂ حیات ابھی درد کی منزلوں میں ہے

راہ بری تھکی تھکی، راہ زنی بڑھی چڑھی
پائے ثباتِ کارواں، راہ کی مشکلوں میں ہے

عقل تو نامراد تھی، عشق بھی مات کھا گیا
ہیبتِ غم کی داستاں، شوق کی محفلوں میں ہے

نورِ امید ملگجا، ظلمتِ یاس رنگ پر
نقص کے معجزوں کا ذکر آج بھی کاملوں میں ہے

ضرب کی ٹیس کب تھمی، زخم سے کب لہو رکا،
مشورہ میرے قتل کا آج بھی قاتلوں میں ہے

نقشِ جدید کی لگن کھا گئی ہر قدیم کو،
نقش گروں کی آرزو گردشِ متصل میں ہے

حاصلِ عشق غم سہی، خشک سہی نہالِ شوق
آتی ہے پے بہ پے صدا تیل ابھی تلوں میں ہے

جناب خلیل الرحمن صاحب

انتقام

جرم کے ساتھ ہی آغازِ سزا ہوتا ہے
ظلم ہی کاٹتے ہیں ظلم کے بونے والے
جوہرِ آئینہ ہے اصل و اساسِ عالم
نقش ہو جاتا ہے ہر ذرّۂ عالم پہ گنہ
اور پھر اس کو مٹانے کے لئے
زندگی برق کی مانند تڑپ اٹھتی ہے۔

تم نے بویا ہے بھیانک فولاد،
خون کی پیاسی بھڑکتی ہوئی آگ،
پاکدامانی کی جانسوز دہکتی آہیں،
آنسو، فریاد، فغاں،
ماؤں کی گود میں بچّوں کی بریدہ لاشیں،
آدمیت کے دلِ زندہ کا زخم،
وحشت و خوف سے بے حس مخلوق
موت و ذلت کی کشاکش میں اسیر،
تم سے منسوب ہے لمحات کے اوراق میں یہ باب۔
تم نے وہ جرم کیا ہے کہ ہوئے ہیں جس سے
قلبِ انسان کے معبد ویران،
چشمِ انسان کے تابندہ صنم خانے فسردہ سنسان۔

خلیل

ہاں مگر یاد رہے
تم نے جو ہاتھ اٹھایا ہے کسی بے کس پہ
اس کی تصویر نگاہوں میں رہے گی محفوظ
زندگی خواب کے اسرار میں ڈھل جاتی ہے:
کسی مظلوم کے سینے سے جو فریاد کا سوز اٹھتا ہے
بار بار اس کی صدا آتی ہے:
تم نے جو خون بہایا ہے کسی بے کس کا
اس کی فریاد فضاؤں میں رہے گی محفوظ
یہی مظلوم پکار اٹھیں گے آخر اک دن:
"عدل اے اہلِ جہاں عدل کرو!
"تم سے فریاد ہے عدل!
"ہمیں دیکھو — ہمیں محسوس کرو
"اور پھر ایسا جہنم کرو تیار کہ جس میں ان کی
"ہڈی ہڈی سے دھواں اٹھتا رہے
"یہ بجھائیں تو بجھا بھی نہ سکیں
"اور جلائیں تو جلا بھی نہ سکیں
"جل کے مرجانا بھی ان کے لئے حسرت بن جائے!
"یہ وہ عصمت کے درندے ہیں — وہی موذی ہیں
"ظلم سے جن کے زمیں کانپتی تھی"

اور پھر قہر کا سیلاب گراں آئے گا
سرخ لاوے کی طرح موج بموج
قصرِ ظالم کے در و بام پہ چھا جائے گا

جولائی سنہ ۱۹۹۰ء

جناب مرزا محبوب بیگ صاحب

فلسفہ، ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(ق) فطری قوتیں اور شخصیتیں:- بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بہت کمزور بہت بے بس ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی ضرورتیں، ...ہوتی ہیں۔ پہلی چیز ہے ملی اور مناسب گرمی۔ دوسری چیز ہے ہوا اور دودھ کا انجذاب۔ تیسری چیز ہے سانس اور فضلات کا اخراج۔ ...کی تکمیل کے لئے قدرت نے اسے ساز و سامان دیا ہے۔ مگر یہ ہے بالکل ادنیٰ اور ناکافی قسم کا۔ بھوک لگے تو وہ روتا ہے پیٹ میں درد ہو تو وہ روتا ہے ...ہو تو وہ روتا ہے۔ اسی مناسبت سے اسے ماں کی محبت اور دیکھ بھال حاصل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو پھر اس کا جینا دشوار ہے۔ اگر ماں بچے کی ...متوجہ ہو، اسے وقت پر دودھ پلائے، اسے گرم اور پاک و صاف رکھے، اس کی بےچینی کے اسباب کو دور کرتی رہے تو کوئی بات نہیں ...سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی خبر گیری مناسب طور سے نہ ہو۔ اس سے لاپروائی برتی جائے۔ اسے غذا بر وقت اور کافی نہ ملے تو ...درد و کرب ہلکان ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کر پاتا۔ پہلی صورت میں اسے لذت و سکون کا احساس ہوتا ہے۔ یہ یقین ہوتا ہے کہ ضرورت ...چیز فوراً مل جائے گی۔ وہ طبعاً امید پرور ہوتا ہے۔ اس کی دنیا اچھی چیزوں سے بھری ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں اس پر غم و غصہ کا خوف نفرت کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اس کی سیرت پر برا اثر چھوڑتی ہیں۔ وہ یاس پسند بن جاتا ہے۔ اس کی دنیا میں ہر طرف بری ہی بری چیزیں ہوتی ہیں ...لذت و درد کا یہ امتیاز بہت ابتدائی اور بنیادی چیز ہے۔ بچہ لذت بخش چیزوں سے محبت کرتا ہے اور پر درد چیزوں سے اسے اتنی ہی نفرت ہوتی ہے۔ لیکن اچھی چیزوں کی اچھائی کو ان کی اصلی ماہیت سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ یہی حال بری چیزوں کی برائی کا ہوتا ہے طبیعت ...راضی ہو تو کھٹی بھی اچھی دودھ بھی اچھا۔ ناراضی ہو تو دونوں خراب۔ پھر بچہ وہم اور واقعہ میں فرق نہیں کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انجذاب و اخراج کے واقعی اور خیالی افعال یکساں حقیقی ہوتے ہیں۔ وہ کئی چیزیں واقع میں جذب و خارج کرتا ہے۔ وہ کئی چیزیں وہم میں جذب و خارج کرتا ہے ...وہ اچھی چیزوں سے ممکن حد تک گہرا اتحاد و ارتباط چاہتا ہے۔ لہذا انہیں فرط محبت سے نگل لیتا ہے۔ وہ بری چیزوں کو تباہ و برباد ... کرتا ہے اور انہیں بھی کھا جاتا ہے، کیونکہ اس طرح ان کی جداگانہ ہستی ختم ہوتی ہے۔ وہ اچھی چیزوں کو بطور صفات کے خارج کرتا ہے اور بری چیزوں کو بطور جنگجویانہ آلات کے۔ محبت اور نفرت کا عملی نتیجہ ایک ہوتا ہے۔ بہر حال بچپن کی یہ لمبی نتائج کے اعتبار سے بہت بڑی چیز ہے۔ ...قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ خلقی طور پر بے حد جنگجو ہوتا ہے۔ یہ جنگجوئی اس میں پیدا ہوتی ہے اس کی کمزوری سے اور نتیجۃً بھوکوں مرنے کی دہشت سے۔ اس دہشت کی وجہ سے بچے کے ذہن میں کئی فاسد خیالات کئی جنگجویانہ اوہام گشت لگاتے ہیں اسے ماں کی چھاتیوں پر کوئی قابو نہیں ہوتا ... ان پر حملہ کرنا انہیں کاٹنا ان کا پورا مالک ہونا چاہتا ہے۔ اس جنگجوئی سے وہم و خیال میں کئی ایذا رساں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ تخیل میں ...

کیونکہ بالعموم یہ جذب خارج کرتا ہے۔ آخری چیز یہ ہے کہ بچے کی قوتِ واہمہ بہت قوی ہوتی ہے۔ خارجی چیزیں داخلی حیثیت اختیار کرتی ہیں بیرونی اذیت دہندے جزوِ نفس ہو کر اندر خطرناک بن جاتے ہیں۔ یہ حالات بنیاد ہیں حیاتیتی لقیمات کی۔ بچہ کچھ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اسے بُرے خیال، بُری چیزیں اور چیزوں کے بُرے اجزا باہر اور اندر سے ستاتے ہیں۔ لیکن مزید برآں وہ بہ حال بے نتیجہ نہیں رہتی۔ اس سے احساس ہوتا ہے چاہے جانے کا، لہذا اچھے سیاروں، اچھی چیزوں، اور چیزوں کے اچھے اجزا کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ مقدم اور زیادہ ابتدائی ہے بچہ ناکامی، دہشت، اور غصّے کی وجہ سے اچھی چیزوں کو برا بنا ڈالتا ہے۔ یہ حیاتیتی لقیمات بہت اہم ہیں۔ ہمارے شعوری اور غیر شعوری افکار اور افعال پر ان کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

مگر بچہ بہت زیادہ بے بس ہی نہیں ہوتا، وہ بہت زیادہ عرصے تک بے بس رہتا ہے۔ ماں باپ کو اس کی پرورش اس کی پرداخت، اس کی حفاظت بہت دنوں تک کرنی پڑتی ہے۔ ایک بات یہاں ذہن نشین رکھنی ضروری ہے۔ بچے کا صرف جسم ابطا پذیر ہوتا ہے یعنی اس کی جسمانی نشو و نما دیر سے ہوتی ہے۔ اس کی جنسی تسکین کی استعداد کافی مدت کے بعد پختگی کو پہنچتی ہے۔ لیکن اصل یہ ابتدائے عمر میں رسیدہ ہوتا ہے۔ لبیڈو کی قبل از وقت نشو و نما مخرج چیز ہے۔ وہ دودھ پیتا بچہ جنسی اشتعال محسوس کرتا ہے۔ وہ چھاتی کو چوستے چوستے کاٹنے لگتا ہے۔ اس طرح یہ چاہتا ہے کہ ماں کو چیر کر اس میں گھس جائے۔ اس ننھی سی عمر میں بعض جبلّی یا نیم اضطراری حرکات دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ ہیں پیڑو کے دھکے جو علانیہ شہوانی معنی رکھتے ہیں۔ مزید برآں بچہ اس زمانے میں اپنے اور ماں باپ کے اعضاءِ خاص سے گہری دلچسپی لیتا ہے۔ بہرحال جنسی خواہش ذہنی اور تناسلی دونوں محاذوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ پھر بھی ذہنی تہیّجات مقدم ہیں۔ وہ تناسلی تہیّجات کے لئے نمونوں کا کام دیتے ہیں۔ اس دور میں بچہ اپنے آپ کو اور اپنے ماں باپ کو تکمیل یافتہ ہستیاں تصوّر کرتا ہے۔ وہ اپنے جنسی تہیّجات کو مؤخر الذکر کی طرف منتقل کرتا ہے۔ ان ابتدائی اوہام میں ذہنی سادیت بہت ملتی ہے۔ ایسی ہی خبیثوں کو بہت علد حقیقی ماں باپ سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اچھے ماں باپ کی مثالی ہستیاں بھی نشو و نما پاتی ہیں۔ اس طرح ارواحِ سعیدہ و خبیثہ، ارباب و شیاطین وجود میں آتے ہیں۔ یہ سب ماں باپ کی اچھی یا بُری غیر شعوری تصویریں ہوتے ہیں۔ انہیں مافوق الفطری شخصیتوں کا یقین روحیت و مظاہر (ANIMISM) کہلاتا ہے۔ اسے بچے کے ذہنی ارتقا کی اوّلین منزل سے تعلق ہے مگر وہ خالص شکل میں کہیں نہیں ملتی ہمیشہ مافوق الفطری مگر غیر شخصی قوتوں کے یقین یعنی حیاتیت (ANIMATISM) سے ملی جلی ہوتی ہے۔ کیونکہ بچے کی جسمانی اور عقلی نشو و نما ابطا قبول کرتی ہے اور یہ ابطا نا ہموار ہوتا ہے۔

جنسی اشتیاق اور تجسّس ۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ چیز بنیاد ہے انسانی خاندان اور معاشرتی زندگی کی۔ بچے کی نشو و نما کی رفتار جتنی سست ہوگی اتنا ہی وہ ماں باپ کی توجہات کا محتاج اور ممنون ہوگا۔ اس طرح دو نسلوں کے درمیان طویل اور گہرے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ انحصار و محبت کے اس لگاؤ میں ماں باپ کی طرف سے کئی مہیّجات فراہم ہوتے ہیں جب بچے میں تناسلی لذّت کی اہلیت نہیں ہوتی۔ لہذا وہ لبیڈو کی ان تقاضوں کو جذب نہیں کر سکتا۔ امکان ہے احتباس یا دوسری مدافعتی ترکیبوں کے ذریعے سے ردِّ عمل کرتا ہے۔ یہ ترکیبیں ابطا کی حیاتیاتی قوتوں کے نفسیاتی نتیجے ہیں۔ لیکن احتباس سے کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔ البتہ اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ چنانچہ بچپن کی شہوانیت جنسی تجسّس میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تجسّس بہت ابتدا میں بیدار ہوتا ہے۔ دوسرا بچہ آتا ہے ماں باپ کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ اب زیادہ خیال کرتے

ہیں نووارد کا۔ اس پر زیادہ وقت اور محبت صرف کرتے ہیں۔ پہلا بچہ خود کو معزول سا محسوس کرتا ہے۔ سوچتا ہے یہ غاصب کہاں سے ٹپک پڑا۔ یہ بچے آتے کہاں سے ہیں؟ اس طرح بچے کی جنسی دلچسپی مرکوز ہوتی ہے حمل اور توالد کے اعمال پر۔ یعنی پیدائش کے مسئلے پر۔ یہ ہمارے بچپن کا سب سے دلکش مسئلہ ہے۔ اور بچے اسے حل کرنے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں۔ بڑے آدمی ان سے سچ کبھی نہیں بولتے۔ اس کو وہ پا جاتے ہیں۔ وہ ان کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے۔ سمجھتے ہیں کہ بڑے انہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ انہیں عمداً لاعلم اور علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ بطور خود حل تلاش کرتے ہیں۔ نفسیات دانوں نے ایسے بہت سے طفلانہ نظریوں کا پتا چلایا ہے۔ وہ کہتے ہیں بچہ سب سے پہلے یہ فرض کرتا ہے کہ بچے پیدا ہوتے ہیں غذا کے ساتھ کسی چیز کے کھانے سے۔ اس وقت وہ یہ نہیں جانتا کہ بچے صرف صنفِ نازک کے ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے اس کا پتا چل جاتا ہے اور وہ یہ نظریہ ترک کر دیتا ہے۔ ایک عرصہ گذرنے پر اسے محسوس ہوتا ہے کہ باپ کو بچوں کی پیدائش سے کچھ تعلق ہے۔ مگر کیا ہے کس قسم کا ہے۔ وہ دریافت نہیں کر پاتا۔ اتفاق سے کبھی ماں باپ کو تنہائی میں یکجا دیکھ لیتا ہے تو ہمخوابی کا سادیتی تصور پیدا ہوتا ہے۔ مگر شروع میں وہ وظیفۂ جنسی اور تولید کے درمیان کوئی ربط نہیں قائم کرتا۔ بعد میں یہ چیزیں لازم و ملزوم سمجھی جاتی ہیں۔ مگر مرد کے عضو سے وہ پیشاب کے سوا اور کوئی فعل منسوب نہیں کرتا۔ عام طور سے سب بچے یہ مانتے ہیں کہ وہ مقامِ مستقیم سے پیدا ہوئے ہیں۔ بالکل فضلے کی طرح۔ بعض اوقات بچوں کو بڑے اس طرح تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ اسی اختلاف کا اظہار و اعادہ ہے۔ گویا زنانہ عضو برازسے متعارف ہے۔ آگے چل کر اس غلطے سے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اس وقت باور یہ کیا جاتا ہے کہ بچے ناف یا سینے میں سے نکلتے ہیں۔ بہر حال کچھ اس سے تجسس پسند بچہ جنسی واقعات کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن ان نظریاتِ تولید سے پتا چلتا ہے کہ وہ انسانی وجود کے اسرار و رموز کو حل نہیں کر سکتا۔ اس کی نارسیدہ جنسی ساخت اس مسئلے کے سمجھنے میں بڑی رکاوٹ ہے۔

بایں ہمہ یہ آگہی طلبی برابر اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ یہ بڑی ہٹیلی چیز ہے۔ یہ ظاہر ہوتی ہے بچوں کے سوالوں میں۔ بچوں کا کھوجی پن مشہور ہے۔ وہ اکثر پوچھتے ہیں اور مسلسل پوچھتے ہیں۔ فلاں چیز کیا ہے؟ وہ ایسی کیوں ہے؟ وہ کہاں سے آئی؟ اس کو کس نے بنایا؟ یہ فطری سوال عموماً بدل جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ ہے انسان کا مبدء۔ اور یہ شدت سے حل کا متقاضی ہے۔ بڑے ان سوالوں سے بہت جلد تنگ آ جاتے ہیں۔ وہ ٹال مٹول کرنے لگتے ہیں۔ جواب میں آئیں بائیں شائیں کر دیتے ہیں۔ یہ بے سر پا جواب ان کی بے دلی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے بچوں کو بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ ان کے سوال اہم نہیں ہیں۔ مگر بچے پھر بچے ہیں۔ وہ نئی نئی باتیں پوچھتے ہیں۔ اور بے تکان پوچھے چلے جاتے ہیں۔ ان کے جواب بھی اطمینان بخش نہیں ہوتے۔ ان تمام سوالوں میں مسئلے کی اصل حقیقت غیر شعوری ہوتی ہے۔ یہ غیر شعوری بنتی ہے احتباس کے اثر سے۔ احتباس کے اعمال ایک حد تک تو بچے کی ذہنی نشو و نما کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر وہ وجود میں آتے ہیں بچے کے ماحول کے اثر سے۔ بچے کا قریبی انسانی ماحول اس سے صراحتاً یا کنایتہً یہ کہتا ہے کہ ایسے سوال ناپسندیدہ ہیں۔ نامناسب ہیں۔ ممنوع ہیں۔ قصے کہانیوں میں یہ مضمون بہت ملتا ہے۔ کسی بات کے پوچھنے سے منع کیا جاتا ہے لیکن وہ بات پوچھی ضرور جاتی ہے۔ نتیجۃً کوئی نہ کوئی مصیبت آتی ہے۔ زندگی اور کہانی کا چکر چلتا رہتا ہے۔ یہ ممنوع سوال اکثر و بیشتر ہیرو کے مولد، ماں باپ اور پیدائش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر ہیرو کی شخصیت سے بھی مربوط ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ نوعِ انسان کے مبدء سے مربوط ہوتے ہیں۔ اوڈی پس کا قصہ ایک مشہور مثال ہے۔

قصے کہانیاں، داستانیں، اساطیر اور توہمات عصبی بے چینی سے نمٹنے کی ترکیبیں ہیں۔ غیر عقلی بے چینیاں زندگی کے اصلی محرک ہیں۔ وہ حقیقتے
عقل، فہم، نطق، تخیل، حافظے اور ارادے سے بھی زیادہ بنیادی اور اہم ہیں۔ حیوان تو صرف حقیقی خطروں اور ضرورتوں کی صورت میں عمل کرتے
ہیں لیکن انسانوں کے بیشتر جوابی اعمال خیالی خطروں اور ضرورتوں کے نتیجے ہوتے ہیں۔ جبلی جوابی اعمال بھی جزو غیر عقلی غرضوں سے متعین ہوتے ہیں
غیر جبلی جوابی اعمال تو تمام تر عصبی پریشانیوں کو قابو میں لانے کے طریقے ہیں۔ یہ عصبی بے چینیاں بچپن کی صورت حال سے پیدا ہوتی ہیں۔ لاشعور میں حاجتیں اور
جبلی تقاضات مجبور اور مضطرب رہتے ہیں۔ پھر جن ہیجانات کا نکاس نہیں ہوتا ان کی وجہ سے تاثرات کی شدت بڑھ جاتی ہے۔ جبلی توانائی کا ایک حصہ زندگی کے اغراض و اعمال
کے استعمال نہیں ہوتا لہٰذا انہیں چھپی ہوئی شکلوں میں پیش کرتا ہے اس طرح ممنوع لذتوں کو حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی چیز قصوں کی غیر معمولی کشش و تاثر کا باعث ہے اور بد قسمتی سے کوئی انسا

گھر اور باہر کی دنیا

۔۔اس طرح قصوں وغیرہ کے بنیادی مضامین یہ ہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن! ان سے قائم تعلقوں سے جنسی تعلقات پیدا
کرنا اور انہیں مار ڈالنا یا کھا لینا۔ لہٰذا سزا ایک بالکل غیر متعلق اور نامعقول چیز ہے تو پھر خیالی لذت بھی کیوں اس کی آمیزش سے پاک نہیں ہے؟ اس سے
ایک عمل کا پتا چلتا ہے۔ اسے نفسیات داں ثانوی تدقیق (SECONDARY ELABORATION) کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قصہ شعوری ذہن کے
لئے بے ضرر بن جاتا ہے۔ اخلاق منی اور شعوری زندگی کا مرکزی مطالبہ ہے۔ سزا کے بغیر بنیادی غیر شعوری اوہام کی تسکین گھناؤنی اور باعتبار زمانہ
غلط ہوتی۔ باعتبار زمانہ غلط ہونے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فرد کی زندگی میں ایک وقت ہوتا ہے۔ اس وقت وہ جبلی تسکین کے خلاف داخلی رکاوٹیں نہیں
رکھتا۔ یہ واقعہ ہے چھوٹے بچے اخلاق سے بالکل بے تعلق ہوتے ہیں۔ ان میں بمقابلہ تہیجات کے اندرونی مزاحمتیں نہیں ہوتیں۔ انہیں جبلی مطالبات
کی تسکین کے برخلاف کسی باطنی کشمکش کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ نفسیاتی طور پر حیوانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ زندگی کی بڑی اور بسیط ضرورتیں
آسودگی چاہتی ہیں۔ پھر دنیا اور وجود کے خطروں سے حفاظت بھی اہم چیز ہے۔ انہیں وجوہ سے بچہ ماحول کے اشخاص کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ صرف
سے محبت خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔ خود غرضی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بات بچے کے بارے میں صحیح ہے۔ یہ بات ماں باپ کے بارے میں صحیح نہیں
بچوں کی پرورش اور پرداخت بڑی شخصی قربانیوں کو مستلزم ہے۔ اس میں صحت کا نقصان ہے، توانائی کا نقصان ہے، وقت کا نقصان ہے، آرام
کا نقصان ہے، ذاتی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کا نقصان ہے۔ پھر بھی ماں باپ ان مطالبات کو بخوشی خوشی پورا کرتے ہیں۔ بچوں کو وقت پر غذا دیتے ہیں
انہیں پاک، صاف اور گرم رکھتے ہیں۔ ان کی بے چینی اور تکلیف کے اسباب دور کرتے ہیں۔ ان کی ضرورت کی چیزیں بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے آئندہ
کا سود و بہبود کو مقدم جانتے ہیں۔ ان کو دنیا اور زندگی کے خطرات سے بچاتے ہیں۔ ان کی خاطر اپنی جان تک کو جوکھم میں ڈالتے ہیں۔ ان کی ناز برداری
میں ان کی آسائش اور احتیاج کی تکمیل میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ بچے ان کے اپنے نفوس کی توسیع ہیں۔ ان کی اپنی ذوات کے اجزا ہیں
ان کی اپنی شخصیتوں کے تسلسل ہیں۔ وہ بچوں کے ذریعے سے اپنی ناکامیوں اور حوصلہ مندیوں کی تلافی چاہتے ہیں۔ یہ عین خود غرضی ہے، گو اخلاقی اور معاشرتی
طور پر پسندیدہ ہے۔

اس وجہ سے ماں باپ بچوں کے اخلاق و عادات پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے چال چلن کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انہیں آداب و اطوار سکھاتے ہیں۔ انہیں
بتاتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے، کیا نہیں کرنا چاہئے۔ ماں باپ کے ساتھ برتاؤ کیسا ہو۔ بھائی بہن سے پیش کیونکر آئیں۔ معاشرتی اوامر و نواہی کی یہ تعلیم بہت
ابتدائی عمر میں شروع ہوتی ہے۔ ماں سب سے پہلے روکتی ہے۔ اعضائے تناسل کو چھونے سے۔ پھر باپ سمجھاتا ہے۔ ماں باپ کا ادب کرو۔ ان کا

مرزا محبوب بیگ

مجھ کو آپ کی حیرانی کا احساس ہے۔ لوگ تو گناہ و بزدہ کے اعتراف پر دلیر ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے کردہ گناہوں کی جوابدہی میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ انسانی امور و معاملات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تحلیل نفسی نفسیات کی سائنسی بنیاد ہے۔ اس کا طریقۂ تحقیق سائنسی ہے۔ لہٰذا وہ اخلاقیات سے بالکل الگ ہے یعنی اسے سروکار صرف واقعات سے ہے۔ یہ واقعات کیسے ہیں؟ اسے وہ نہیں دیکھتی۔ میں نے یہاں اس کی تحقیقات کے بعض حقائق اور نتائج پیش کئے ہیں۔ ایک ایسے بیان میں لازماً تفصیل کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو متعلقہ ادب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہ بھی چیز واضح ہوتی ہے۔ اکثر اوقات چکر کا راستہ اڑنگ سیدھے راستے کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے۔ انحرافات کبھی کبھی اصل موضوع میں گہری کا یہ عطا کرتے ہیں۔ یہ سب سخن ہائے ناگفتنی تھے۔ محض آپ کی خاطر انہیں گفتنی بنانا پڑا۔ لہٰذا یہ جس قدر کم ہوں مناسب ہے۔ تاکہ ہم اس موضوع سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

بعض مفکرین نے ایسی باتیں کہی ہیں جو ہماری موجودہ بحث کے لحاظ سے قیمتی ہیں۔ ان سے عوامی فلسفے کے سرچشموں پر روشنی پڑتی ہے۔ روشنی کے سوا اور کون نشان منزل شے بھی سکتا ہے۔ آئیے ان خیالات پر غور کریں۔ انہیں کچھ طول دے کر بیان کریں۔ تاکہ پتا چل سکے کہ زیر بحث فلسفے کی بنا پھوٹتی کہاں سے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو دونوں کہتے ہیں کہ انسان کو سوچ بچار پر مائل تجسس و استعجاب نے کیا۔ سقراط پہلے تو ایپی ٹس سے فنی مسئلے بیان کرتا ہے اور اس کے بعد پوچھتا ہے: "میں سمجھتا ہوں۔ اس سے قبل تم نے ان پر ضرور غور کیا ہوگا"۔

"ہاں سقراط تم سچ کہتے ہو۔ میں نے ان پر بہت سوچ بچار کیا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی ان پر توجہ کرتا ہوں مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتا ہوں آخر ان کے معنی ہیں کیا؟ بعض اوقات تو میرا سر چکرانے لگتا ہے"۔

"اب سمجھا میرے دوست تھیوڈورس نے تمہیں فلسفی کیوں کہا۔ اس کا خیال بالکل درست ہے۔ حیرت فلسفیوں کا مخصوص احساس ہے۔ فلسفے کی ابتدا ہوتی اسی سے ہے"۔ (مکالمات افلاطون یعنی ایپی ٹس۔ مترجم جوئٹ۔ جلد چہارم صفحہ ۲۱۱) ارسطو لکھتا ہے: "انسان آج بھی فلسفیانہ غور و فکر حیرت کی وجہ سے کرتا ہے۔ پہلے بھی وہ سوچتا اسی سبب سے تھا۔ شروع میں حیرت قریبی مسائل پر ہوتی تھی۔ بعد میں بڑی پیچیدگیاں حیران کرنے لگیں۔ حیران شخص کو اپنی لاعلمی کا احساس ہوتا ہے . . . . . وہ حکمت کی تلاش صرف علم کی خاطر کرتا ہے کسی فائدے کے لئے نہیں کرتا۔ واقعات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے ہم اس قسم کے علم کی جستجو عموماً اس وقت کرتے ہیں جبکہ ضروریات زندگی مہیا کر چکتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم کسی فائدے کے مدنظر حاصل نہیں کیا جاتا"۔ (دیکھئے یونانی فلسفۂ قدیم کے مبادی صفحہ ۱۲ بحوالہ مابعد الطبیعیات ارسطو باب اول فصل ۲) تجسس اور تعجب جذبات فطری اور جبلّی ہیں۔ دنیا کے آثار و مظاہر اور زندگی کے تغیرات و اتفاقات ہم میں حیرت اور شوق تحقیق پیدا کرتے ہیں۔ جہدِ حیات طبیعی ماحول پر عمل کو مستلزم ہے جینے کے لئے کرنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ عمل فکر سے مقدم ہے۔ سوچنے سے بہت پہلے آدمی کو عمل کرنا پڑا۔ یہ صحیح ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ ہم طبیعی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مختلف عوارض و حالات کے باہمی رشتوں پر غور و خوض کریں۔ ان تصورات کو ترتیب دیں تاکہ اشیاء کا صحیح مفہوم متعین اور معلوم ہو صرف اسی طرح ہم طبیعی ماحول پر بہتر طریقے سے ردّ عمل کر سکتے ہیں۔ سوچ بچار عمل سے بے تعلق نہیں ہے۔ عمل کی کمزوری کی دلیل نہیں ہے وہ اصلاً و ابتداً عمل کے لئے ہے۔ عملی اغراض و مفادات کے لئے ہے۔ انسان فطرت کے حوادث اور واقعات میں غور کرتا ہے۔ ان رازوں کو فاش کرنا چاہتا ہے۔ ان کے متعلق صداقت معلوم کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ اچھی طرح

نے کو عمل کس طرح کرنا چاہیئے؟ عملی زندگی کی تشکیل کن بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں ہو؟ مادی اغراض کی تکمیل اور حفاظت کیونکر کی جائے؟ بالِ وجود اور عالم کے مسئلوں سے بحث کرنے کا منشاء یہ ہے کہ عمل کے لئے ایک واضح اور حقیقی بصیرت حاصل ہو۔ مگر عقل کا استعمال بت عمل کے لئے ہوتا ہے فقط کام اور کشمکش کے اوقات میں ہوتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ نکرِ عملی مفادات کی تکمیل ضرور کرتی ہے مگر اس کا یہ راز اصل نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اہم چیز اور ہے۔ وہ بتدریج محض نظری قیاسی امور سے دلچسپی پیدا کر لیتی ہے۔ خالص علمی کاموں میں مشغول ہے۔ صداقت کو صداقت کی خاطر دریافت کرنا چاہتی ہے۔ علم کو علم کی خالص مسرت کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے یعنی بشری ذہن کائنات اور زندگی کے مسئلوں سے محض ان کی اپنی خاطر بحث کرتا ہے۔

یہ مسئلے مختلف اور متعدد ہیں۔ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کہاں سے آئی؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس پر زندگی کب اور کیسے آئی؟ اس میں اس زندگی کا انجام اور مقدر کیا ہے؟ یہ زندگی اور موت کیا شے ہیں؟ زندگی موت پر ختم ہوتی ہے یا کسی نہ کسی شکل میں اس کے بعد بھی جاری رہتی ہے؟ یعنی مرتے ہی فنا یا غیبت ہے یا فنائے مطلق؟ یہ وجود کے اسرار و رموز ہیں۔ یہ اشیاء اور اشخاص کے اسباب اور مبدوں سے تعلق رکھنے والے مسئلے ہیں۔ ان کے جاننے کا شدید اشتیاق ہم میں ہوتا ہے۔ بالخصوص نوجوانوں میں تو بہت زیادہ، کیوں کہ ان کی شخصیت حالتِ تکوین میں ہوتی ہے۔ وہ فلسفیانہ نظر یہ ہی نفس کی اسی تشکیل و تکمیل کو دیکھتے اور پاتے ہیں۔ یہ مسئلے بڑے گہرے اور مستقل ہیں۔ ان پر ہم پر اپنی ہمت کے مطابق غور اور توجہ کرتے ہیں۔ متمدن اور غیر متمدن قوموں اور قبیلوں میں تخلیقِ کائنات اور میلادِ آدم کے مختلف نظریے اور قصے ملتے ہیں۔ یہ اسی شدید اشتیاق اور اسی گہری دلچسپی کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں۔ خود سائنس کا بہترین کارنامہ اسی زبردست خواہش کا نتیجہ ہے، اور فلسفے کے جملہ نظامات بھی اسی ذریعہ سے وجود میں آتے ہیں یعنی یہ کہ وہ سب فطرت اور انسان کے باہمی تعلق اور انتہائی معنی و اہمیت کی توجیہیں ہیں۔ اس قسم کی توجیہ ہر شخص کرنی چاہتا ہے۔ اس کی تمنا انسانی فطرت کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔

چند شخصی محرکاتِ فکر:- ڈی۔ ایس۔ رابنسن لکھتا ہے: "ہم فلسفیانہ مسئلوں پر غور و فکر اس لئے نہیں کرتے کہ اس سے ہمیں ایک مہی مدہوشی و سرمستی حاصل ہو بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ ہم بنے ہی کچھ اس طرح ہیں کہ ان مسئلوں سے الجھیں، حیران ہوں، تھک کر پیچھے ہٹیں، اور پھر سے الجھیں۔ انسان جب تک انسان ہے۔ جب تک تجسس کی آگ اس کے سینے میں فروزاں ہے، وہ ان مسئلوں کے جواب جاننے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہے گا خواہ یہ حرکت بے لذت ہی کیوں نہ ہو، خواہ اس سے غم و الم میں تخفیف کے بجائے اضافہ ہی کیوں نہ ہو، خواہ مذہبی عقیدوں کی تسکین اور قوت زائل کیوں نہ ہو جائے۔ خواہ دنیا کے بہتر بنانے کی خواہش فضول نظر کیوں نہ آئے۔ دنیا جب تک انسانی ذہن کو مہیب پُراسرار معلوم ہوگی فلسفہ برابر موجود رہے گا، اور پوری آب و تاب کے ساتھ موجود رہے گا۔ نگاہ کے آگے کے حجابات آدمی کو بے چین کرتے ہیں۔ وہ انہیں اٹھا دینا چاہتا ہے تاکہ حقیقت کو روبرو دیکھے۔" (موجودہ زمانے کا فلسفہ ص ص ۲۸ و ۲۹) غرض کہ ہم سب فطرۃً یہ جاننا چاہتے ہیں۔ جس دنیا میں ہم پیدا ہوتے اور زندگی گذارتے ہیں وہ در اصل ہے کس قسم کی؟ اس کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ وہ قوانین کیا ہیں جو فطرت اور ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی پر حاوی ہیں؟ بالفاظِ دیگر انسان میں علم کی خواہش بے حد قوی ہے۔ وہ اتنی قوی ہے کہ مٹ نہیں سکتی۔ وہ اتنی قوی اس لئے ہے کہ بنیادی ہے۔ علم کی خواہش کی طرح بقائے نسل کی جبلت کے مانند وہ عقل کی نشو و نما کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔ مشہور فلسفی ایف۔ ایچ۔ بریڈلے کہتا ہے "وجود ...

معلوم کرنا خود ایک جبلت ہے۔ یہ بالکل فطری امر ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہستی کے متعلق متجسس پائیں۔ اس تجسس کی تشفی پوری طرح نہ ہو سکے تو یہ تسکین سے خالی نہیں ہے۔ علم کی جدوجہد کے ہر مرحلے میں ہمیں لاعلمی کا احساس ہوتا ہے۔ اور حصول علم کی مساعی جاری رہتی ہیں۔ اس طرح طلب علم کی تسکین جتنی کی جاتی ہے، اتنی ہی وہ بڑھتی جاتی ہے۔ روایت میں اسے شجرِ ممنوعہ کی حرص سے تعبیر کیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ حرص کتنی شدید اور کتنی بے پناہ تھی۔ حیرت اور علم کی جدوجہد کا شک سے بڑا قریبی تعلق ہے۔ ہر صورت میں ہمیں لاعلمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے ہم اپنی معلومات سے غیر مطمئن ہوتے ہیں، تلاش صداقت کی تحریک ہوتی ہے اور آدمی سوچ بچار کی طرف مائل ہوتا ہے۔

عقلی تجسس بڑا محرک ہے۔ اس سے انسان چاہتا ہے کہ کائنات اور حیات کے اصلی و اساسی حقائق کو جانے، ان کی توجیہ کرے۔ اس خواہش کی شدت بچپن اور شباب کے نفسیات اور تجربات سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ بچپن کے تجربات عصبی بےچینیاں پیدا کرتے ہیں۔ ان بےچینیوں کے مختلف نمونے معین کرتے ہیں اور ان نمونوں کے مناسبِ حال جوابوں کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح ان بےچینیوں سے نمٹنے کی ترکیبیں وجود میں آتی ہیں۔ توہم اسی نوع کی چیز ہے۔ فوق الفطری شخصیتوں اور غیر شخصی چیزوں یا قوتوں کے نفسیات کا ہمارے افکار پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہ غیر عقلی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی عقلی چھان بین ہمیں گوارا نہیں ہوتی۔ لہذا عموماً ہم ان پر معقولیت کا رنگ چڑھاتے ہیں، انہیں معقول اور قابلِ پذیرائی بناتے ہیں، ان کی جا و بیجا حمایت کرتے ہیں کیونکہ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی تائید کا حق ادا نہ کیا جا سکے تو پھر انسانی مسرت مکمل نہیں ہو سکتی۔ بعض اذہان اس کوشش میں بڑی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ مختلف فلسفیانہ نظامات اس کی شہادت دیں گے۔

اب روزمرہ کے حوادث اور واقعات کو لیجیے۔ زندگی کے ہر لمحے میں اور ہر موڑ پر ہمیں بہت سی چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہم طرح طرح کے تجربات و مشاہدات سے ہو گزرتے ہیں۔ موت و حیات سے، درد و لذت سے، خیر و شر سے، عزت و ذلت سے، عروج و زوال سے، قحط و افراط سے، محبت و نفرت سے، جلال و جمال سے۔ ہر شخص ان سے بخوبی واقف ہے کیونکہ ان سے مفر نہیں ہے۔ زندگی عبارت انہیں سے ہے۔ ان سے جذبات میں ہیجان برپا ہوتا ہے۔ طبیعت میں خلش سی ہوتی ہے۔ بہت سے مسائل و مباحث پیدا ہوتے ہیں۔ آدمی ان پر توجہ کرتا ہے، تاکہ الجھن دور ہو، بدمزگی جاتی رہے اور ذہنی توازن بحال ہو۔ کون نابلد ہے ان حالات سے جو ہمیں بہت زیادہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کس کو تجربہ نہیں ان واردات کا جن کی شافی توجیہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے عامیانہ فکر کا۔ اس سے عوامی فلسفہ کی ثروت اور گہرائی بڑھتی ہے۔ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، ان کے تجربے مختلف ہوتے ہیں، پھر ان تجربوں میں سے بعض کو وہ دوسروں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ محض اس لئے کہ مختلف افراد ہوتے ہیں کوئی اپنی عزیز ترین ہستی کی جدائی سے متاثر ہوتا ہے۔ کسی کی نظر اس خطرے پر ہوتی ہے جس سے وہ بال بال بچ نکلا۔ کوئی ایک خواب یا قصہ کو نہیں بھلا سکتا۔ بعض پر قومی انقلاب یا حادثے کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کسی کو محبت و نفرت کے گہرے جذبات زیادہ وزنی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی نیکی کی مسرت یا گناہ کی پشیمانی کو اہم سمجھتا ہے۔ اور چند ایسے بھی ہیں جو احساسِ جمال سے مست ہوتے ہیں۔ بہرحال تجربات کی طرف ردِ عمل مختلف ہوتے ہیں۔ اور اس طرح مختلف اور متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ متعلقہ اذہان کے تنوع کو منعکس کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے طریقے پر اپنے سوالات ترتیب دیتا ہے۔ اپنے طریقے پر ان پر غور و فکر کرتا ہے اور اپنے طریقے پر انہیں حل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتا ہے۔ یہ جوابات ہمارے تعصبات، تصورات، نفسیات اور میلانوں سے مل کر بنتے ہیں۔

تمتۂ کلام :- وہ کہتا ہے کہ فلسفہ کی نشو ونما میں عام سماجی زندگی اور تمدن کو بڑا دخل ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہم اسے تہذیب و تمدن
۔اب سمجھیں۔ اسے انسیات، قومی زندگی، تاریخ، مذہب، ادب اور معاشرتی اداروں کے مطالعے کے ساتھ ملا کر پڑھیں، کیونکہ اس کا مبدہ
و معاشرتی ہے، عقلی نہیں ہے: "فلسفہ بظاہر انتہائی معقولات سے بحث کرتا ہے، لیکن اصل میں اس کا دستہ سخن اور طرف ہے۔ اس کا موضوعا
ن افکار ہیں جو معاشرتی روایات میں پوشیدہ ہیں۔ پھر اس کے سرچشمے دو ہیں۔ معاشرتی مقاصد کا تصادم اور بے میل عصری رجحانات سے موروثی
ون کا اختلاف۔ جب ایک مرتبہ یہ مان لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مستقبل کے فلسفے کا فریضہ کیا ہے۔ یہ کہ معاشرتی اور اخلاقی تزاعات کے متعلق حکا
ت کو واضح کرے اور ان اختلافات سے بحث کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ ایک چیز مابعد الطبیعی زبان میں غیر حقیقی معلوم ہوگی لیکن اسے معاشرتی
ت اور نصب العینوں سے متعلق کیجیے۔ وہی شدید طور سے پر معنی بن جائے گی۔" (فلسفہ کی جدید تشکیل ص ص ۲۶-۲۵) یہ ایک خیال انگیز ساعب
اس سے پورا پورا اتفاق نہیں کر سکتے تاہم اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ اس خیال سے فلسفہ عوام کے ایک اہم سرچشمے پر روشنی
ہے: "معاشرتی ماحول، اصطلاحی فلسفہ کے نظاموں کی صورت گری میں مؤثر حصہ لیتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جائے تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ
فلسفے کے تصورات و یقینیات کی تخلیق کا موجب ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ ہر جگہ سے افکار و آرا غیر شعوری طریقہ سے، خذ و قبول کرتا ہے اور یہ عمل
عمر بھر جاری رہتا ہے۔ عوام کے علم و تجربہ میں بہت سی چیزیں کئی طرح سے آتی ہیں اور وہ ان سب کو اپنے سابقہ تصورات و یقینیات سے
ملاتے ہیں۔ اسی لئے ان کا فلسفہ غیر آزمودہ مفروضات اور مسلمہ صداقتوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کچھ تو زندگی کے اہم تجربات پر غور و خوض کر
ہوتی ہیں۔ اور کچھ معاشرتی ماحول سے جذب کی جاتی ہیں۔ فرد کے افکار و افعال پر ان کا زبردست اثر ہوتا ہے، اور ان میں ترمیم و تبدیل ہمیشہ ہوتی رہتی
(ڈی ایس رابنسن کتاب مذکورہ بالا ص۔۱)

عوامی فلسفے کے مبادی کی اس تفصیل پر نظر کیجیے۔ اور اس کا مقابلہ فرد کی ذہنی نشو ونما کے بیان سے فرمایئے۔ آپ کو ان میں گہری مماثلتیں ملیں گی
۔ ایک ایک مبدء کی اصل و اساس کو بخوبی دریافت کر لیں گے اور اس طرح قطعی طور پر یہ اطمینان ہو جائے گا کہ عوامی فلسفہ فرد کے خلقی ساز و سامان، بچپن کے
ات اور معاشرتی ماحول کی پیداوار ہے۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے انکار فضول ہے۔

یہاں عوامی فلسفہ کی ماہیت کا یہ بیان ختم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زیر نظر مضمون بھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑیں گے
اور میری طبیعت متکبرانہ بے توجہی کو روا نہیں رکھتی۔ یقیناً آپ یہ پوچھیں گے: "اجی اتنی کد و کاوش کی، اتنی لمبی چوڑی بحث کی، مگر نتیجہ کچھ
جیسا ہی رہا۔ ایسی ہی صورت میں کہتے ہیں۔ کوہ کندن و کاہ بر آوردن۔ آپ کے ہاتھ کیا لگا؟ ایک نقطۂ نظر، ایک نجی عقلی معاملہ۔ یہ صوفت و معقول
نہیں ہے۔ بلکہ بالکل جدا چیز ہے۔" گزارش یہ ہے کہ یہاں ایک وسیع میدان سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے اصطلاحی فلسفہ کو تامی تعلق ہے۔ فکر
ہر کو جامع از ہر حال روح کی خود کلامی ہے (افلاطون) لہٰذا عوامی اور اصطلاحی فلسفوں میں فرق درجہ کا ہے۔ اس بات کو فلسفی بھی مانتے ہیں۔ اس میں شک
ہے۔ وہ قل پر رائی کی غیر فنی کوششوں کا مذاق اڑاتے ہیں مگر ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے عوام کے خیالات صحیح
ہوں۔ اسی لئے وہ معمولی فہم و فراست کو تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی رائیں دراصل وہی ہیں۔ جو سب کی ہیں۔ بقیہ فلسفی توجہ دیتے
باتوں پر جنہیں ہر شخص سچا سمجھتا ہے۔ یہ دہائی دیتے ہیں معمولی فہم و فراست کی۔ یا اشتے ہیں عملی فلسفہ کی۔ ان امور سے خود عیاں ہے کہ وہ عوامی فلسفے

بزدلی میں ضرور۔ مگر اسے رد کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ نتیجۃً اسے اپنی عقل آرائیوں سے بلحاظ نوعیت مختلف نہیں جانتے۔ دوسری بات یہ کہی ہے کہ آپ نے فلسفیانہ جاگیرداری ختم کر دی۔ بہت اچھا کیا۔ یہ دور ہی جمہوریت کا ہے۔ یہ مہربانی کر کے اتنا بتائیے کہ یہ آپ کا عوامی فلسفہ کہاں بھی جاتا ہے؟ کیوں نہیں۔ یہ اسی تحت الثری دنیا میں ملتا ہے جو ڈو کے میزبان شہادت دیں گے۔ پھر آپ اسے ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہر گھر سڑک پر ہر کوچے میں ہر بازار میں ہر موڑ پر۔ ضرورت صرف ایسی آنکھوں کی ہے جو بینا ہوں۔ ایسے قلب کی ہے جو سلیم ہو۔ ایسے ذہن کی جو بے تعصب ہو۔ یہ آپ کا میرا ہر ایک کا فلسفہ ہے۔ معمولی حالات میں ہم روٹی کپڑے اور اچھی حیثیت کی دھن میں لگے رہتے ہیں، اس پر دھیان نہیں دیتے۔ پھر یوں بھی اس کی ہمیں بیشتر خبر نہیں ہوتی۔ صرف شدت کے وقتوں میں اس کا شعور ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسے مواقع پر شخصیت کو لگتی ہے۔ ایک نکتہ چینی یہ ہو گی: عوامی اور اصطلاحی فلسفوں کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟ ان میں نامی گرامی رشتہ ہے۔ یہ کہنا دراصل کچھ نہ کہنا اس رشتہ کی نوعیت ظاہر کیجئے۔ وہ کاریگری چیز ہے۔ ورنہ بظاہر تو ان میں بڑا فرق ہے، اور اس کا وجود ہی آپ کے لئے چیلنج ہے۔" بالکل بجا ارشاد ہے، لیکن اجازت ہو تو ایک بات کہوں۔ آپ کے اعتراضات ختم ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ آپ کی کیفیتِ چشم کو دیکھ کر سودا کا شعر یاد آ رہا ہے۔ موجودہ سوال دلچسپ ضرور ہے لیکن ایک تو میں لکھتے لکھتے تھک چکا ہوں، اور پھر اس سے بحث کا یہ کوئی محل بھی نہیں ہے۔

مرزا محبوب

★

جلیل حسین جلیل

چاندنی رات

کبھی پھولوں کی لطافت میں تجھے پایا ہے — کبھی خوابوں میں تخیل تجھے لے آیا ہے

تیری آنکھوں کی زبانی جو سنا تھا میں نے — بار بار اُس ترے پیغام کو دہرایا ہے

ملک کی خدمتِ بے لوث کا رنگین خیال — جب بھی آئی ہے تری یاد تو ساتھ آیا ہے

جب ترے غم میں تری یاد میں دیکھا ہے اُسے — چاندنی رات نے اکثر مجھے بہلایا ہے

جلوۂ حسن ہے یہ تیرا تصور تو نہیں — دیکھ اے ذہن رسا دیکھ یہ کون آیا ہے

ترے آنچل کا حسیں پھول بنے تو اچھا — یہ جو آنسو مری آنکھوں سے نکل آیا ہے

اے جلیل ان کا تصور ہی نہیں وجہ سکوں
اُن کے جلووں نے بھی کچھ دن ہمیں بہلایا ہے

جگن ناتھ آزاد

سازِ ہندی

بھگت کبیر کا ایک نغمہ

اے مجھ کو تلاش کرنے والے

میں تیرے قریب ہوں یہیں ہوں		تیری رگِ جاں سے بھی قریں ہوں
مندر میں نہیں قیام میرا		مسجد میں نہیں مقام میرا
کعبہ نہیں میرا آستانہ		کیلاش نہیں مرا ٹھکانہ
رسموں میں گِھرا ہوا نہیں میں		پردوں میں چھپا ہوا نہیں میں

اے مجھ کو تلاش کرنے والے

میں تیرے قریب ہوں یہیں ہوں		تیری رگِ جاں سے بھی قریں ہوں

صادق ہے گر اشتیاق تیرا		مشکل نہیں کچھ وصال میرا
اپنا مجھے بے گماں سمجھ تُو		اس شوق کو کامراں سمجھ تو

اے دوست! کبیر کا ہے یہ قول		بھارت کے فقیر کا ہے یہ قول
وہ ذات ہے زندگی نفس کی
وہ ذات ہے کیا؟ ندا جرس کی

عبدالمجید بھٹی

گیت

اکھیاں چمکیں، آنگن ناچے
کاگا کہیں پیا آئے
آشا ٹھگنی اک اک پل میں سو سو روپ دکھائے

بن بتی بن تیل اُجالا
دیکھے من متوالا
دیپ کی لو میں جاگے اندھیرا ایسا رنگ جمائے
آشا ٹھگنی اک اک پل میں سو سو روپ دکھائے

روپ دکھائے آنکھ چرائے
بہلائے پھُسلائے
پل میں ہنسائے پل میں رُلائے، ہوک پہ ہوک اٹھائے
آشا ٹھگنی اک اک پل میں سو سو روپ دکھائے

اکھیاں چمکیں، آنگن ناچے
کاگا کہیں پیا آئے

جاوید صدیقی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

جنوں

جنوں کی تعریف میں اردو اور فارسی کے شعراء عرصے سے رطب اللسان ہیں لیکن ان کی یہ تعریف صرف شعر و شاعری کی حد تک ہی رہی، ورنہ حالی مرحوم یادگارِ غالب میں غالب کی اس کیفیت کا تذکرہ ضرور کرتے جب کہ دیوانگی میں ان کے دوش پر زلف یعنی ان کی جیب میں ایک تار بھی نہیں یا جبکہ شوریدگی کے ہاتھوں سے سر و بالِ دوش ہو جانے پر وہ صحراؤں میں دیوار کی تلاش میں پھر رہے تھے اور دور دور تک انہیں دیوار نظر نہیں آتی تھی۔ غالب کی تو میں نے ایک مثال لی تھی اس لئے کہ اردو شعراء میں سے کسی کی مثال لینا ہو تو سب سے پہلے غالب ہی کے اشعار ذہن میں چلے آتے ہیں ورنہ اردو کے قدیم سے قدیم شاعر سے لے کر جدید سے جدید شاعر تک (شاید ترقی پسند شعراء کو مستثنیٰ کیا جا سکے) بلا استثناء ہر شاعر نے جنوں، وحشت، دیوانگی کی تعریف میں کم از کم اتنے اشعار ضرور لکھے ہیں جتنے کہ فانی نے موت اور غم پر یا جوش نے شراب پر لکھے ہیں۔ اردو شاعری کے جہاں اور بہت سے مخصوص مضامین ہیں مثلاً برق و آشیاں، گل و بلبل، مجنوں و فرہاد، تصوف، معشوق کی جفا اور عاشقوں کی وفا، وہاں جنوں اور اس کے تعلق پر بھی بڑے بڑے مضامین باندھے گئے ہیں اور جس طرح ان تمام الفاظ کو اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ادا کر کے ان میں نئے اور اچھوتے معنی پیدا کر دیئے اسی طرح جنوں کا لفظ بھی اقبال کے ہاں آ کر ایک خاص برگزیدگی اور فلسفیانہ معنی کا حامل بن گیا۔ اقبال نے بتایا کہ زمانہ صرف عقل کو مشعلِ راہ سمجھا ہوا ہے حالانکہ جنوں بھی صاحبِ ادراک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صاحبِ ادراک جنوں کا تعلق۔ اس جنوں سے نہیں ہو سکتا جو صرف موسمِ بہار میں اچھلتا ہے، اور جس کا حملہ ہونے سے پیشتر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں شاید کچھ فاصلہ نہ رہے۔ البتہ اس [illegible] سے ضرور اس کا تعلق ہے جو خلعتِ انگریزی پہ پیرہن چاک چاک کو ترجیح دیتا ہے، اور اس عشق سے بھی جو ایک جست میں زمین و آ[illegible] کو طے کر دیتا ہے، اور جو ایسے راز سے آگاہ کرتا ہے جسے نفسِ جبریل کے بغیر کہنا مشکل ہے۔

دنیا میں ہر بڑے آدمی پر ایک نہ ایک دفعہ ایسی منزل ضرور آئی ہے جب اسے لوگوں نے دیوانہ، مجنوں اور پاگل کہا لیکن ان کی لوگوں کی یہ دیوانگی تھی جس کی وجہ سے آج انسانی تہذیب، آرٹ اور اخلاق اس منزل پر ہیں۔ ایسے ہوشمند لوگ جو کبھی "جنون" یا "پاگل پن" برگزیدہ مقام تک نہ پہنچ سکے، اچھے کاروباری، اور مزدور ضرور ہو سکے لیکن انسانیت کے اس جوہرِ اعلیٰ سے محروم رہے جسے کوئی عشق کہتا ہے اور کوئی دیوانگی۔ عقل و ہوش سے باہر نہ آسکنے والے، روپے آنے پائی کے ہیر پھیر اور جگ ہنسائی کے ڈر سے کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ صبح سے لے کر شام بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ان کے ذہن پر پُر امن شہری بنے رہنے اور پرسکون زندگی بسر کرنے کا خیال چھایا رہتا ہے اور وہ رسم و رواج کے کولہو کے بیل کی طرح اکتا دینے والی یکسانی کے ساتھ زندگی گزارے چلے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر وہ شخص دیوانہ یا پاگل ہے جو ان کے چھوٹے پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا، اور ان کی فرسودہ حدود کی پابندی نہیں کرتا۔ بھلا وہ شخص پاگل نہیں تو کیا ہے جو کھانے پینے سے بے پرواہ بیٹھا کسی خیال میں گم ہے پہننے اوڑھنے کی پرواہ نہیں اور جو سڑک پر سر جھکائے یوں چلا جا رہا ہے کہ سامنے آنے والے راہگیر اگر خود نہ بچ جائیں تو ضرور وہ ان سے ٹکرا جائے۔ وہ شخص

دیوانہ نہیں تو پھر کیا ہے جسے سکندر نے کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو تو اس نے جواب دیا تھا کہ براہ کرم دھوپ چھوڑ کر ہٹ جائیے۔ اس شخص کو مجنوں نہ کہیں تو کیا کہیں جسے زہر کا پیالہ دیا گیا تو اس نے پی لیا، اور جس نے رومی سپاہی کے سوال پر کہ کیا تم ارشمیدس ہو؟ سیدھا سادا جواب دینے کی بجائے زمین پر کھینچے ہوئے کہا کہ شکل مت بگاڑو۔ اور نتیجہ اس کا قتل ہو گیا۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا کہ ایک شخص حمام سے ننگا نکل کر میں نے پا لیا۔ میں نے پا لیا کے نعرے لگاتا ہوا بازار میں بھاگنے لگا۔ ہوشمند لوگ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں، جرأت رندانہ، اور خطرناک اقدام سے بچتے ہوئے، یہ سب سے زیادہ محفوظ راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ اپنی زندگی کو مقررہ اصولوں پر پرسکون طور پر بسر کئے جانے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھتے ہیں لیکن ایسے لوگ جنہیں حقیقت کی لگن رہتی ہے جو اٹھتے بیٹھتے کائنات میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں، جن کا دل انسانوں کے دکھوں پر آٹھوں پہر جلتا رہتا ہے، اس آتشیں صداقت کی دہکتی آگ کو جو ان کے سینے میں آتش فشاں کی طرح کھولتی رہتی ہے، تمام انسانوں کے دلوں میں منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک پرسکون زندگی بسر کرنا اور کھانے کو سب سے زیادہ ضروری قرار دینا، حاجات کو پوری سرگرمی سے انجام دیتے رہنا، لباس، رہن سہن اور نشست و برخاست کے رتی رتی بھر آداب کو بجا لاتے رہنا مضحکہ خیز تضییع اوقات، اور بے معنی ہے۔ وہ ساحل کے سکون کو موت اور طوفان کی کشمکش کو زندگی سمجھتے ہیں۔ ایسا خلیق اور غیر معمولی ذہن کا انسان جس کا عظیم اور وسیع دنیا کا تخیل بلند ہے اور اس تخیلی دنیا کے لئے جس تخلیق کو موزوں سمجھتا ہے، اس میں ہوشمند انسان شامل نہیں، اس کا شاکی انسان، جرأتِ رندانہ کا مالک، صداقت کے لئے بے پایاں تڑپ رکھنے والا، اپج، جدت، اور ندرت عمل کا قائل، بے باک، خود سر، جری اور غیرمعمولی ہوتا ہے۔ اس مثالی معیار پر کسی کو پہنچا ہوا نہ دیکھ کر اسے سخت صدمہ ہوتا ہے، وہ اس میں تخلیق کا المیہ محسوس کرتا ہے۔ اگر تمام انسان بھیڑ بکری سے بہتر خصوصیات نہیں رکھتے۔ تو انہیں اس کثرت سے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اقبال شکوہ کرتے ہیں -

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل　　کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

دن میں چراغ لے کر شہر کی گلیوں میں ڈھونڈتے ہیں اور انہیں کوئی انسان نہیں ملتا۔ نطشے کو فوق البشر کی آمد کے تصور میں پناہ ملی۔ اور ہوشمند انسان، ان خیالوں کو مجذوب کی بڑ کہتے ہیں، ہوائی باتیں، جو ان کی سطح سے اتنی اونچی ہیں کہ سمجھ ہی میں نہیں آ سکتیں۔ بھلا ایسے اشخاص جو ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں نہ ہم سمجھ سکیں اور نہ جن پر عمل کرنے کی سکت پا سکیں، پاگل نہیں تو کیا ہیں۔

مجنوں کے برگزیدہ لقب سے بڑے بڑے پیغمبر بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ بھلا کہیں یہ باتیں کسی عقلمند شخص میں پائی جا سکتی ہیں کہ وہ اپنے خاندان، قبیلہ اور قوم کے فائدے کے لئے اپنی ذہانت اور محنت صرف کرنے کی بجائے ایک پیغام۔ ایک ہوائی پیغام کی تبلیغ کئے چلا جا رہا ہے۔ اس کے سامنے دولت کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں، حسین سے حسین عورتیں پیش کی جاتی ہیں، بادشاہی اور حکومت کا لالچ دیا جاتا ہے مگر وہ ان کی طرف نظر بھر کر ملتفت نہیں ہوتا۔ آخر اس شخص کو کس چیز کی دھن ہے کہ نہ اسے دولت کی پڑی ہے، نہ عزت کی، نہ لوگوں کے لعن طعن کا ڈر ہے، نہ دشمنوں کے ستانے کا اور نقصان پہنچانے کا خوف، نہ بڑوں کا پاس ہے نہ چھوٹوں کا لحاظ، نہ اپنی صحت کی فکر ہے نہ کھانے پینے کی پروا، بس کہے چلے جاتا ہے کہ خواہ تم میرے داہنے ہاتھ پر سورج رکھ دو اور بائیں پر چاند مگر میں اپنے پیغام کی تبلیغ سے باز نہیں آ سکتا۔" اپنوں کو بیگانہ بنا لینا، دوستوں کو دشمن کر لینا، روپیہ پیسہ، عزت، شہرت، اقتدار کو ٹھکرا دینا، کسی ہوشمند اور عقلمند انسان کا کام نہیں، مگر... اس شخص کو جنون ہو گیا ہے مگر یہی وہ مقدس جنون تھا جس کے پرتو سے آج ساڑھے تیرہ سو برس تک ایک عالم فیضیاب ہو رہا ہے۔ اقبال جب کہتا ہے کہ

زمانہ عقل کو سمجھے ہوئے ہے مشعلِ راہ　　　کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

یا،

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں　　　خدا اگر نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

تو اس کی مراد اسی قسم کے جنوں سے ہے۔

شیکسپیئر کے اس مقولے کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر، عاشق اور مجنوں میں کچھ فرق نہیں۔ میرے خیال میں شیکسپیئر نے تین قسم کے اشخاص کو در اصل تخلیقی رجحان کا نمائندہ لیا ہے۔ شاعر سے اس کی مراد صرف شعر کہنے والا ہی نہیں، اور ایسا شعر کہنے والا تو یقیناً نہیں جس کے پیچھے شاگردوں کا لشکر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، یا جو کسی اسکول کی بنیاد ڈالنے ہی کو تکمیلِ فن سمجھ بیٹھا ہو۔ شاعر سے مراد ایک سچا آرٹسٹ ہے۔ اس طرح مصور، ادیب، موسیقار، سنگ تراش، رقاص، اکیٹر، فلسفی بلکہ میں تو کہوں گا کہ سچا سائنسدان بھی شیکسپیئر کے لفظ "شاعر" میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک بڑے سائنسدان کو بھی مشاہدہ اور تجربہ سے زیادہ اپنے تخیل کی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ کیا فرق ہے جب ایک شاعر کہتا ہے کہ قمری، چاند کے عشق میں تڑپ رہی ہے، بلبل گلاب کی کشش سے بیتاب ہے۔ اور پروانہ شمع کے عشق میں نثار ہو رہا ہے اور جب سائنسدان کہتا ہے کہ پتھر، زمین کی کشش کی وجہ سے گر پڑتا ہے، زمین، سورج کی جاذبیت کی وجہ سے پروانہ وار اس کے گرد چکر لگا رہی ہے، اور مثبت برق، منفی برق کی طرف قوت کی وجہ سے کھنچی جا رہی ہے۔ ایک داستان گو اور افسانہ نویس کو جزئیات کی مصوری میں جس باریک مشاہدہ اور قوی تخیل کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ تخیل اور مشاہدہ کو وہ موجد کام میں لاتا ہے جو آواز کو برقی لہروں میں تبدیل کرنے کے لئے، برق کو روشنی بنا دینے کے لئے، کل پرزوں کی ترتیب اور آلات کی جزئیات کے متعلق سوچتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر اور ادیب کی پرواز پر کوئی پابندی نہیں اور موجد اور سائنسدان کا تخیل، اصولوں اور مادی مجبوریوں کا پابند ہے۔ اس وجہ سے ایک سائنسدان کے تخیل کو زیادہ قطعی اور زیادہ دقیق ہونے کی ضرورت ہے اور یقیناً ایک بڑا سائنسدان، بڑے شاعر کی نسبت زیادہ تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔ سائنسدان کے تخلیقی تخیل کو شاعر کے بے مہار تخیل پر اس طرح بھی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے تخیل کو صرف ذہنی لطف و لذت تک محدود نہیں رکھتا بلکہ عملی شکل دے کر انسانیت کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ بہر حال شیکسپیئر کے ذہن میں شاید شاعر سے مراد صرف شاعر ہی ہو لیکن اس اعزاز کو صرف شاعر تک محدود کر دینا میں جائز نہیں سمجھتا اور ایک سچا آرٹسٹ، سچا فلسفی، اور سچا سائنسدان، شاعر اور عاشق کی طرح مجنون کے معزز لقب سے سرفراز کئے جانے کا مستحق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑا کام تخلیقی تخیل کا رہینِ منت ہے اور تخلیقی تخیل کو حرکت میں لانے کے لئے جس جذبے، جس لگن اور جس انہماک کی ضرورت ہے اسی کو اصطلاح میں جنوں کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بڑے ذہین اور قوتِ متخیلہ کے زبردست پیمانے پر مالک ہوں، لیکن آپ کی یہ ذہانت اور تخیل آپ کی تن آسانی، سہل پسندی اور عشرتِ امروز کے عقیدے کی وجہ سے بیکار پڑی زنگ آلود ہو رہی ہو۔ جب تک آپ میں کسی مقصد کے لئے وہ شوق، وہ لگن، وہ دوسری تمام چیزوں سے بے پروا ہو کر اس ایک مقصد کے لئے ہمہ تن جگہ صرف کر دینے کا جذبہ نہ ہو، جسے عشق کہہ لو، شوق کہہ لو یا جنوں، اس وقت تک آپ کی ذہانت اور تخلیقی تخیل کی پوری توانائی حرکت میں نہیں آ سکتی۔

ایک بے مقصد زندگی گزارے جانے سے بہتر کسی مقصد کے لئے زندگی گزارنا ہے۔ خواہ یہ مقصد غلط ہی کیوں نہ ہو۔ کم از کم ایسے شخص کو زندگی کے بامعنی اور سنجیدہ ہونے کا تو احساس ہے، کم از کم وہ ایک جذبے، ایک سرشاری اور انہماک کی کیفیت کا تو آشنا ہے۔ ہر چیز کو عقل اور ہوشمندی

کی تمناؤں پہ تو ہنسنے والے، اتنی بھی مسرت حاصل نہیں کرتے جتنی ایک بچہ مٹی کا گھروندا بنا کر حاصل کرتا ہے۔ اور عمیق روحانی مسرت سے تو صرف وہی لوگ سرشار ہوتے ہیں جو ایک مجبور کے لئے۔ ان میں سوز و گداز اور جان دینے کی تڑپ رکھتے ہوں۔ اس راہ میں کانٹے انہیں پھول سے بہتر اور ہر امر زیادہ گوارا معلوم ہوتا ہے۔ وہ درد کے علاج میں بھی درد کی لذت پر جان دیتے ہیں، اور ایسے درد کی طلب رکھتے ہیں جس کی کسک لازوال ہو۔ اور جب یہی جذبہ، زیادہ شدت اختیار کرتا ہے تو آہستہ آہستہ یہ ہر مرض کا علاج اور ہر غم کا مداوا بن جاتا ہے ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

جنوں کے اسرار صرف اسی پر کھلتے ہیں جو خود کسی جنوں میں مبتلا ہو۔ ایک با آدمی کہتا ہے ع

ہر چند عقلِ کُل شدہ ئی بے جنوں مباش

مگر میں اس بارے میں آپ کو زیادہ مجبور نہیں کرتا کیونکہ آپ کو تو ابھی گھر کے آٹے دال، بچوں کے کپڑے، اور کل کے دفتر یا کاروبار کے متعلق بہت کچھ سوچنا ہے آپ تو ایک پرامن شہری ہیں، ہیں نا؟

جاوید صدیقی

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی

غزل

غم کہاں اب تو غم پرستی ہے — یہی شاید کمالِ ہستی ہے
شوقِ کامل نہ رہنما ہو اگر — ہر بلندی، دلیلِ پستی ہے
اے دلِ بے خبر گریز نہ کر — غمِ الفت فروغِ ہستی ہے
رازِ آزادئ چمن مت پوچھ — ذرہ ذرہ اسیرِ ہستی ہے
اُٹھ گیا کون تیری محفل سے — ہر طرف یاس کیوں برستی ہے
دردمندانِ شوق سے پوچھو — پردۂ غم میں رازِ ہستی ہے
نہ وہ ذوقِ وفا نہ ذوقِ نظر — متغیر سا رنگِ ہستی ہے

گر نہیں اس کو جستجو تیری
کیوں پریشاں غبارِ ہستی ہے

یوسف جمال انصاری
ایم۔ اے

جانِ سخن

وہ جانِ خوبی و محبوبی وہ دلآرائی — قرار بن کے دلِ بے قرار میں آئی

خزاں نصیب چمن میں بہار جاگ اٹھی — سیاہ خانے میں لی صبحِ نو نے انگڑائی

وہ ایک نغمہ ہے سازِ ازل سے ہم آہنگ — وہ اِک کلی ہے برنگِ چراغِ سینائی

وہ ایک کیف ہے، اک رمز، اک تاثر ہے — وہ ایک لوچ ہے، اک لحن، ایک رعنائی

وہ ایک شعرِ حسیں نغمہ سازِ فطرت کا — وہ حسن کارِ ازل کا خیالِ یکتائی

وہ حسنِ سیرت و صورت میں آپ اپنی مثال — وہ اعتبارِ وفا ہے بظرفِ زیبائی

ترانہ ریز لبوں پر ہوئی جو موجِ شباب — گدازِ روح سے آنکھوں میں اشک بھر لائی

مرے سخن میں سمائی ہے بن کے جانِ سخن — مرے خیال پہ احساس بن کے وہ چھائی

نیازِ عشق! بجا لا ہزار سجدۂ شکر
درِ صنم پہ مبارک تجھے جبیں سائی

سید فضل الحسن صاحب شفقت کاظمی

غزل

شکرِ جفا بھی شکوۂ بیداد ہو گیا — برہم کچھ اور وہ ستم ایجاد ہو گیا

تم کو جفا کے بعد ندامت نہیں ضرور — اپنی بلا سے گر کوئی برباد ہو گیا

کیا چیز تھا وہ نام کہ رنجِ فراق میں — وجہِ قرارِ خاطرِ ناشاد ہو گیا

اُس دل میں فکرِ عیش کی گنجائشیں کہاں — جو دل کہ تیرے درد سے آباد ہو گیا

اک تو کہ میرے حال کی جس نے خبر لی — اک میں کہ تیری راہ میں برباد ہو گیا

ناکامیاں فراغ کی تمہید بن گئیں — ہر وردِ عاشقی سے میں آزاد ہو گیا

اچھا کیا کہ تم نے جفا میں کمی نہ کی — دل کامگارِ لذّتِ بیداد ہو گیا

ہر چند ان کا عہدِ کرم سچ نہ تھا مگر — تسکینِ اضطراب کی بنیاد ہو گیا

شفقت کہ دیر سے تھا پریشانِ عاشقی
آخر نثارِ حُسنِ خداداد ہو گیا

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی
ترجمہ ملک مسعود احمد بی۔اے

جہنّم

(ایک مصری افسانہ)

سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی (۱۸۷۶ء - ۱۹۲۴ء) کو جدید مصری ادیبوں میں بڑا ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس کی تحریروں میں جدید افسانہ نگاری کے جراثیم ملتے ہیں۔ لیکن طرزِ فکر سے وہ زیادہ بے تعلق نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تحریریں جدید و قدیم کا حسین امتزاج ہیں۔ اور بے تکلف جس طرح بھی چاہے لکھتا چلا جاتا ہے۔ "نظرات" منفلوطی کی وہ مایۂ ناز تصنیف ہے جس نے مصری ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ "العبرات" (آنسو) منفلوطی کی روایات کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اور "الہاویہ" بھی اسی سے لیا گیا ہے

(م۔م۔و)

زندگی کے دن یوں تو کتنے زیادہ نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں ہیں بہت ہی کم۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی ساری زندگی میں صرف ایک سال زندہ رہا۔ اور یہ سال بھی بس آنکھ جھپکتے میں یوں ختم ہوا جیسے وہ ستارہ جو آسمان پر صرف ایک رات چمک کر ہمیشہ کے لیے نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ عمرِ عزیز کا نصف حصہ ایک ایسے دوست کی تلاش میں بسر ہوا جو دوستوں کو ایسی نظروں سے نہ دیکھے جن سے ایک تاجر اپنے سامانِ تجارت کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ اٹھارہ سال ہوئے کہ مجھے بڑی تلاش و جستجو کے بعد ایک ایسا دوست میسر آ گیا جس کے آئینۂ رخ میں مجھے انسانی کمال کی روشن تصویر درخشاں نظر آنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ اور میری نظروں میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی گئی۔ ہماری محبت کا پیمانہ بالکل صاف شفاف تھا، کسی قسم کی کدورت نے اسے قطعاً مکدر نہ کیا تھا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ حادثاتِ زمانہ کے ہاتھوں مجھے اپنے دوست سے جدا ہو کر اپنے وطن جانا پڑا۔ اس عزیز دوست کی رفاقت سے محرومی کے سوا مجھے قاہرہ کی اور کسی چیز کی جدائی کا قطعاً افسوس نہ ہوا۔ کچھ عرصے تک ہمارے درمیان سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا۔ پھر اس کے خطوط کم تعداد میں موصول ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بند ہی ہو گیا۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا۔ طرح طرح کے گمان دل میں پیدا ہوتے لیکن اس کے خلوص اور دوستی کے متعلق میں نے کسی قسم کے شک و شبہ کو دل میں کبھی جگہ نہ دی۔ کئی دفعہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جا کر اس سے ملوں لیکن موقع نہ ملا۔ آخر چند سال بعد قاہرہ لوٹا ارادہ یہ تھا کہ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اپنے دوست سے ملوں۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا کہ میں نے اس کے گھر کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر میری آنکھوں نے وہ نظارہ دیکھا جس کی دردناک یاد ابھی تک دل میں باقی ہے۔

ایک وہ وقت تھا کہ آج سے کئی برس پہلے اس گھر کو باغِ بہشت کی شکل میں چھوڑ گیا تھا اقبالمندی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ اور اس کے مکینوں کے چہرے فرحت و شادمانی سے چمکتے نظر آتے تھے اور آج میں نے یوں محسوس کیا گویا کسی وحشت آفریں مقبرے کے سامنے کھڑا ہوا ہوں جس میں سے نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے نہ کسی انسانی وجود کی شکل نظر آتی ہے۔ اور نہ کسی چراغ کی روشنی ہوتے جھانکے سر باہر نکالتی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میں اس

بجھا نرگسی ویران مکان کی طرف نکل آیا ہوں۔ لیکن اسی وقت چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز میرے کانوں میں آئی اور ساتھ ہی کھڑکیوں وغیرہ سے مدھم سی روشنی بھی نظر پڑی۔ میں نے دروازہ کی طرف قدم بڑھایا۔ دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری دفعہ پھر کھٹکھٹایا تو دروازہ کھلا اور کمسن بچہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہتھیلی پر ایک ٹمٹماتا ہوا دیا رکھے میرے سامنے آیا۔ میں نے اس کے چہرے کو دیئے کی روشنی میں دیکھا تو اس کے خدوخال باپ سے ملتے جلتے نظر آئے۔ آخر میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی بچہ ہے جو کل تک گویا اس گھر کے چمن کا پھول اور اس کے آسمان کا ماہ تاباں تھا۔ میں نے اس کے والد کے متعلق پوچھا تو اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا، اور چراغ سے رہنمائی کرتا ہوا مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس کا ساز و سامان نہایت بوسیدہ اور گرد آلود تھا۔ مگر در و دیوار کے بعض دھندلے نقوش کی وجہ سے میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں ہم مسلسل بارہ مہینے تک لطف و نشاط کی محفلیں جمائیں اور خوب مزے سے دن گزار رہے تھے۔ اس کے بعد میرے اور اس بچے کے درمیان ایک مختصر سی گفتگو ہوئی اور وہ سمجھ گیا کہ میں کون ہوں۔ مجھے بھی معلوم ہو گیا کہ ابھی اس کا باپ گھر نہیں آیا۔ غالباً تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ پھر وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اس کے بعد واپس آکر بولا کہ میری والدہ آپ سے میرے والد کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ میرا دل خوف و دہشت سے دھڑکنے لگا کہ خدا خیر کرے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ ایک نامعلوم سا خطرہ مجھے محسوس ہونے لگا۔ پھر میں نے نظر جو اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی دروازے سے لگی کھڑی ہے۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے سلام کا جواب دیا۔ پھر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے مجھ سے یوں مخاطب ہوئی "کیا تمہیں معلوم ہے کہ زمانے کے ہاتھوں تمہارے دوست پر کیا گزری ہے؟" میں نے جواب میں کہا "نہیں، میں نے تو اس شہر میں سات سال کے بعد آج ہی قدم رکھا ہے" کہنے لگی "کاش! تم اس سے جدا نہ ہوتے کیونکہ تم اس کے لئے زبردست سہارا تھے اور تمہارا وجود اس کے لئے زمانے کے فتنہ و فساد کے خلاف گویا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ تمہارے جاتے ہی وہ ایک شیطانی گروہ میں گھر گیا۔ جو اسے طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر برائی کی طرف راغب کرتا رہا۔ جیسا تمہیں علم ہے وہ ایک ناتجربہ کار اور سادہ لوح نوجوان تھا۔ بالآخر وہ خود بھی گرا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی بدبختی کے اس گڑھے میں لے گرا جسے تم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو" میں نے حیرت سے پوچھا "محترم خاتون! تم کس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہو اور وہ کونسا شیطانی گروہ ہے جس نے اسے گھیر کر تعفن لت میں دھکیل دیا ہے؟" اس نے کہا "میں ساری کہانی تمہارے سامنے بیان کرتی ہوں: تمہارا دوست بہت اچھی زندگی بسر کر رہا تھا کہ ایک بیک اس کی اپنے دفتر کے افسرِ اعلیٰ کے ساتھ راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ اس کے ان مصاحبوں میں داخل ہو گیا جو کسی وقت بھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اس دن سے اس کی حالت تبدیل ہوتی گئی اور اس کے اخلاق و عادات کی صورت بھی آہستہ آہستہ بگڑتی چلی گئی۔ وہ بیوی بچوں سے دور رہنے لگا اور رات کے پچھلے پہر سے پہلے کبھی گھر کا منہ نہ دیکھتا۔ شروع شروع میں تو میں نے افسرِ اعلیٰ کی دوستی کو اس کے لئے نیک شگون خیال کیا تھا۔ اور اس کے علیحدہ رہنے سے مجھے اور میرے بچوں کو جو تکلیف ہوتی تھی، اس کو بطیب خاطر برداشت کرتی تھی، مگر ایک رات وہ بے حد مغموم اور آزردہ خاطر واپس آیا۔ میں اس کے قریب ہو گئی تو ایک تیز شراب کی بو اس کے منہ سے آئی۔ میں سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اور جان گئی کہ میرے شریف اور سادہ لوح خاوند کو اس راستے پر اسی افسرِ اعلیٰ نے لگایا ہے اور اسے اپنا دوست نہیں بلکہ شراب و کباب کی محفلوں کے لئے ندیم بنایا ہے۔ میں نے اپنے خاوند کو ہر عزیز چیز کا واسطہ دیا۔ اور اس امید پر کہ شاید وہ پھر راہ راست پر آ جائے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ پہلے کی طرح زندگی بسر کرے، میں نے جی بھر کر اس کے سامنے آنسو بہائے مگر بے سود۔

پھر بعد میں مجھے اس بات کا علم ہوا کہ جو ہاتھ اسے ناؤ نوش کی طرف لے گئے تھے، انہوں نے قمار بازی کی طرف بھی اس کی رہنمائی کی ہے۔ یہی اس پر
تعجب نہ ہوئی کیونکہ برائیوں کا راستہ ایک ہی تو ہے۔ اور جو شخص ایک دفعہ اس راہ پر آجائے وہ یقیناً اس کی گہرائیوں میں پہنچ کر دم لیتا ہے۔ جو علاوہ
ن کل تک ان کو واکر بھی پینے سے پرہیز کرتا جس میں شراب کی بو سنگھ لیتا آج وہ پیسے دھیلے کا سے زنش، قمار باز، اور شرم و حیا سے بالکل عاری ہو چکا تھا
یہی باپ اور شوہر بعض خاوند جس کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس کے بچوں یا بیوی کا دل ذرا بھی مکدر ہو۔ آج بے رحم باپ اور نالائق خاوند ظاہر ہو گیا تھا۔ بچے
بھی اس کے پاس جاتے، وہ انہیں مارتا پیٹتا اور اپنی بیوی کی توہین گالی گلوچ سے کرتا۔ وہ غیرت دار حیادار شخص جو اپنی عزت کو متاع حیات سے بھی زیادہ
سمجھتا تھا، اب ایسا بے غیرت اور ذلیل ہو گیا تھا کہ بعض اوقات تو رات کے وقت اپنے بدکردار دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے جس منزل میں میں اور میرے
سوئے ہوتے وہاں آجاتا۔ اور وہ سب مل کر کسی ایک کمرہ میں بڑے مزے سے جام پر جام لنڈھانے میں مصروف ہو جاتے۔ نشے میں چور ہو کر جب
وہ جو اس کمرہ میں بیٹھتے، تو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگتے کبھی تالیاں بجاتے، رقص کرتے، دوڑتے بھاگتے میرے کمرے میں بھی گھس آتے اور بعض دفعہ
ان میں کوئی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے ہودگی سے تکتا، یا میرے سر پر سے دوپٹہ اتار پھینکتا۔ میں اپنے خاوند کے سامنے ایک کمرے سے دوسرے کمرے
رف بھاگتی پھرتی، اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتا، مگر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ بعض دفعہ تو میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور رات کی تاریکی ہی
رے لئے دوپٹے اور چادر کا کام دیتی۔ اور میں کسی پڑوسن کے گھر میں پناہ لے کر رات کا باقی حصہ وہاں گزار دیتی۔"

یہاں پہنچ کر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ بولتے بولتے رک سی گئی۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں بھی تصویر غم بنا دل ہی
ل میں رو رہا تھا بالآخر اس نے سر اٹھایا، اور سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے یوں گویا ہوئی "چند ہی سال گزرنے پائے تھے کہ اس کا تمام سرمایہ ختم ہو
ا۔ اب قرض ناگزیر تھا چنانچہ قرض لیا۔ اور جب اس کا بوجھ بھی بڑھ گیا تو جائداد رہن رکھنی پڑی۔ اور اب لے دے کر صرف ملازمت باقی ہے۔ اور
را تنخواہ کے قلیل حصے پر گزارہ ہوتا ہے۔ تنخواہ کی خوشی بھی عارضی ہی ہوتی ہے، کیونکہ چند ساعت کے بعد یہ یا تو قرض خواہوں کی جیبوں میں پہنچ جاتی ہے، یا
مار بازوں کی نذر ہو جاتی ہے ہمارا مکان بھی بک چکا ہے۔ اب ہم نئے مالک کو کرایہ ادا کرتے ہیں۔

یہ سلوک تو زمانے کے ہاتھوں اس سے ہوا ہے، اور جو کچھ مجھ پر اور میری اولاد پر بیتی ہے، اس کا قصہ یوں ہے کہ پورا ایک سال ہو چکا ہے کہ میں
نے اپنے تمام زیور ایک ایک کرکے بیچ دیئے۔ سود خواروں اور رہن لینے والوں کی دکانیں میرے کپڑوں اور گھر کے ساز و سامان سے بھری پڑی ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ اگر میرا ایک غریب مگر دردمند رشتہ دار نہ ہوتا، جو کبھی کبھی میری مدد کر دیا کرتا ہے، تو میں یقیناً اپنے بچوں سمیت عدم کو سدھار چکی ہوتی۔

اے میرے معزز بھائی! شاید تم اپنے مفلوک الحال دوست کی اصلاح کے معاملے میں میرا ہاتھ بٹا سکو، اور کسی مناسب طریقے سے اسے بدبختی
و مصیبت سے نجات دلاؤ۔ اس امر کے پیش نظر کہ اس کے دل میں تمہارے لئے بے حد عزت و احترام ہے، میں سمجھتی ہوں کہ صرف تم ہی اس کام کی
لیت رکھتے ہو۔ اور سب لوگ اس بات سے عاجز آ چکے ہیں۔ اگر تم ہم پر یہ احسان کرو، تو تادم زیست ہم اسے فراموش نہیں کریں گے۔" اس کے بعد
س نے سلام کیا اور چلی گئی۔ پھر میں نے لڑکے سے پوچھا کہ میں تمہارے باپ سے گھر پر کس وقت ملاقات کر سکتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ صبح کچہری جانے سے پہلے
ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ دریافت کرنے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ لیکن میں اپنے پہلو میں ایک اضطراب اور سوزش لے کر لوٹا جس نے مجھے ہر لمحہ بے چین
ئے رکھا۔ میری آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ اور رات بڑی مصیبت سے کٹی۔ دوسرے دن جب سورج نے اپنی زردیں شعاعیں زمین پر بکھیرنی شروع

کیں میں اپنے اس پرانے دوست سے ملنے کے لئے گیا، جس کے باعث میں کل سے پہلے تک سب سے زیادہ خوش نصیب شخص تھا، میرے دل میں اضطراب تھا۔ ایسا اضطراب جو دوڑ کے میدان کی طرف جانے والے اس شخص کو محسوس ہوتا ہے، جس نے اپنی ساری پونجی کی بازی لگا رکھی ہو اور جانتا ہو کہ ایک لمحے کے بعد سب سے زیادہ خوش نصیب انسان بننے والا ہوں، یا سب سے زیادہ بدنصیب۔

اب میں سمجھا کہ چہرے دلوں کے آئینے ہوتے ہیں۔ اگر دل روشن ہوں تو چہرے بھی روشن، اور اگر دلوں میں تیرگی چھائی ہوتی ہو تو چہرے بھی تاریک ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس سے جدا ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔ اور میرے صفحۂ ذہن سے اس کی شکل و صورت کا تصور بالکل محو ہو چکا تھا۔ ہاں مرے حافظے میں صرف عظمت و بزرگی کا ایک درخشاں نور باقی تھا۔ جو اس کے خندان و شادان چہرے پر مہرِ نیمروز کی طرح چمکتا تھا۔ اب جو آنکھیں چار ہوئیں تو چہرے پر وہ چمک دمک نظر آئی جس کا دھندلا سا تصور میرے ذہن میں موجود تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید میں کسی اور شخص سے ملاقی ہوا ہوں۔ اپنے سامنے وہ شفق رنگ چہرہ نظر آیا جو ہر دم متبسم رہتا تھا بلکہ میں نے اس کے بجائے ایک ایسا بدبخت و بدنصیب آدمی دیکھا جس نے بڑھاپے کا لباس وقت سے پہلے پہن لیا تھا اور تیس سال کی عمر میں ساٹھ سال کو پہنچ گیا تھا۔ اس کی بھویں لٹک گئی تھیں، پلکیں بوجھل اور آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں اور پیشانی پر گہری شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر پہلی بات جو میں نے کہی وہ یہ تھی: "اے میرے دوست! تیری ہر چیز بدل گئی حتیٰ کہ صورت بھی"۔ اس نے میرے دل کی بات کو پا لیا۔ چنانچہ خاموشی سے ایسے آدمی کی طرح سر جھکا لیا جو زندہ رہنے پر زندہ درگور ہو جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا: خدا کی قسم! میں حیران ہوں کہ آخر تجھ سے کیا کہوں، کیا میں تجھے نصیحت کروں حالانکہ کل تک تو خود میرے لئے ناصح تھا، اور رہبری کا وہ ستارہ جس سے میں زندگی کی تاریکیوں میں نور حاصل کیا کرتا تھا، اور کیا میں ان فرائض کی طرف رہنمائی کروں، جو اللہ تعالیٰ نے خود تیرے وجود اور تیرے اہل و عیال کے لئے تجھ پر واجب قرار دئیے ہیں، حالانکہ میرے علم میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے تو ناواقف ہو تو کیا میں تجھ سے یہ درخواست کروں کہ اپنے عاجز بچوں اور غم زدہ بیوی پر رحم کر، جن کے لئے اس دنیا میں تیرے سوا کوئی سہارا نہیں، حالانکہ تو اپنے پہلو میں ایسا دردمند دل رکھتا ہے جو بسا اوقات اجنبیوں کے لئے بھی بیقرار رہا کرتا تھا،

"میرے آقا! یہ زندگی جو تو بسر کر رہا ہے، اس کی تمنا تو وہ نکمے لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ جو ہر لحاظ سے بالکل نا اہل ہوتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے شرم و ندامت کے مارے ہی وہ ایسے کاموں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، یہاں تک کہ اس بدبختی و شقاوت سے نجات پا کر دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تو ان میں سے نہیں ہے۔

"میرے دوست! اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ تو قبر کا راستہ طے کر رہا ہے۔ تو دنیا سے دل برداشتہ اور ملال بھی تو نہیں پھر آخر خودکشی کرنے والے کی طرح اس سے مایوس ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اگر تیری اخروی زندگی اس دنیا کی زندگی کے خسارے کو پورا کر دیتی، تو میں تجھے معذور سمجھ لیتا۔ لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک وہ وقت تھا کہ تو خوش حال تھا اور اب مفلسی کے پنجے میں گرفتار، پہلے تجھے صحت اور طاقت نصیب تھی اور اب تو کملائے ہوئے پھول کی طرح بے روح ہے، پہلے تو شریف اور باعزت تھا اور اب ذلیل و رسوا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے تو پھر روئے زمین یقیناً بدبختوں سے خالی ہے۔ اگر تیرا مقصدِ حیات صرف موت طلب کرنا ہی ہے، تو اس آرزو کو پورا کرنے کا سب سے آسان

یہ یہ ہے کہ زہر کا ایک گھونٹ پی کر فوراً مر جائے ۔ یہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہوگا، کیونکہ اس صورت میں تجھے عذاب بھی زیادہ ہوگا، اور تیرے گناہوں میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا میرے دوست! ہمارے لئے وہ بدبختی کیا کم ہے جو اس زندگی میں قضاو قدر کی طرف سے نصیب ہوتی ہے، چہ جائیکہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی اس بدبختی میں اضافہ کرتے رہیں۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ اور مجھ سے اس بات کا عہد کرو کہ اس کے بعد تو میرے لئے ویسا ہی بن جائے گا، جیسا پہلے کسی زمانے میں تھا ہم جدا ہونے سے پہلے خوش نصیب تھے اور جدائی کے بعد بدبخت بن گئے خدا کرے اب پھر مل کر بیٹھنا نصیب ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ پہلے کی طرح بزرگی و عظمت کے سائے میں از سر نو خوش نصیبوں کی سی زندگی بسر کریں۔“ اس کے بعد میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جنبش نہیں آتی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: ”آخر کیا وجہ ہے کہ تو میری جانب ہاتھ نہیں بڑھاتا؟“۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اس نے روتے ہوئے کہا: ”اس لئے کہ میں جھوٹا اور عہد شکن بننا نہیں چاہتا۔“ میں نے پوچھا: ”تجھے یہ عہد پورا کرنے سے کونسی چیز مانع ہے؟“ اس نے جواب دیا: ”مجھے ایسا کرنے سے صرف یہ بات باز رکھتی ہے کہ نیک بختوں کی سعادت میں میرا کوئی حصہ نہیں۔“ میں نے پوچھا: ”اگر تو بدبخت بن سکتا ہے، تو نیک بخت کیوں نہیں بن سکتا؟“ اس نے جواب دیا: ”اس لئے نہیں بن سکتا کہ نیک بختی آسمان ہے اور بدبختی زمین۔ اور زمین پر سے آسمان کی طرف پرواز کرنے سے آسان ہے۔ میرے قدم غار کے کنارے سے پھسل چکے ہیں، اور اب میں تہ تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تلخ زندگی کا پہلا گھونٹ پی چکا ہوں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تلچھٹ تک پی جاؤں۔ اس راستے میں صرف ایک چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، اور وہ یہ کہ میں شروع سے جام شراب کو منہ ہی نہ لگاتا۔ لیکن چونکہ میں لگاتار مے نوشی کرتا رہا ہوں، اس لئے جو کچھ خدا نے میری تقدیر میں لکھ دیا ہے، اب اس سے کوئی مفر نہیں۔“ میں نے کہا: ”بس پختہ عزم کرنے کی دیر ہے، پھر ایک لمحے میں تو ان بری عادتوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔“ اس نے جواب دیا: ”عزم راسخ کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب ارادہ ہو، اور میری یہ کیفیت ہے کہ میں ایک مغلوب الحال شخص بن گیا ہوں، نہ تو میرا ارادہ ہے اور نہ مجھے ارادے پر کوئی اختیار ہے۔ اس لئے میرے دوست! مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تقدیر میرے ساتھ جو چاہے سو کرے۔ اور اگر تم بدبخت گناہ گاروں پر آنسو بہانا گناہ خیال نہیں کرتے، تو پھر آج سے اپنے ایک بدنصیب دوست پر خوب آنسو بہاؤ۔“ اس کے بعد وہ بلند آواز سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بغیر ایک لفظ کہے اٹھ کر چلا گیا۔ میں بھی اٹھ کر واپس چلا آیا، مگر اس وقت میں اپنے پہلو میں جو درد اور کرب محسوس کر رہا تھا، اسے صرف خدا ہی جانتا ہے۔

وہ دفتر کا افسر اپنے ندیم و ہمنشیں کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا۔ اس سے اکتا کر پہلے تو اسے اپنی مجلس نا و نوش سے نکالا، اور پھر اسے کام میں نااہل قرار دے کر اسے ملازمت سے بھی علیحدہ کر دیا اور اس کی خراب و خستہ حالت کو دیکھ کر کیا مجال تھا ایک آنسو بھی اس کی آنکھ سے ٹپکا ہو۔ مالک مکان نے اس کے بعد اسے چند مہینوں سے زیادہ مہلت نہ دی، اور آخر اسے مکان سے باہر نکال دیا اور اس نے مع اپنی بیوی اور دو بچوں کے ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر ایک پرانے مکان کے بوسیدہ بالاخانے میں پناہ لی۔

اس کے بعد اگر مجھے اسے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو صرف شراب خانے کی طرف آتے جاتے ہی دیکھتا۔ اگر جاتے ہوئے دیکھ لیتا تو میں اپنا منہ پھیر لیتا

لڑھکتے ہوئے دیکھ پاتا تو اس کے پاس جاکر اس کے منہ پر لگی ہوئی مٹی، یا پیشانی سے بہتا ہوا خون پونچھ دیتا، اور گھر تک پہنچا آتا۔

اسی طرح ماہ و سال گزرتے رہے، اور اس کی جسمانی صحت اور عقل و ہوش کو برابر فنا کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ ایک چلتا پھرتا مگر بکھرا بکھرا خواب نظر آتا۔ راستے میں بے خبر اور سرگرداں ہو کر چلتا، اور اسے اپنے پاس کی کسی چیز کی خبر تک نہ ہوتی۔ اگر سامنے سے کوئی چیز آجاتی تو اس سے نہ ہٹتا جب تک کہ وہ بالکل قریب ہی نہ آجاتی۔ وقتاً فوقتاً ٹھہر جاتا، اور اپنے اردگرد نظریں گھما کر دیکھنے لگتا گویا کوئی چیز کھو گئی ہے جسے تلاش کر رہا ہے حالانکہ اس کے پاس گم کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ کبھی اپنے کپڑوں ہی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا، حالانکہ ان کپڑوں میں سوائے پیوندوں اور چیتھڑوں کے رکھا ہی کیا تھا۔ جو بھی اس کے سامنے آجاتا وہ گھور گھور کر اس کو دیکھتا، گویا دشمن اس کے سامنے کھڑا ہے، حالانکہ نہ تو اس کا کوئی دشمن تھا، اور نہ دوست۔ کبھی کبھی بچے اس کے کندھوں پر چڑھ جاتے، تو آہستہ سے انہیں ہٹا دیتا، جیسے کوئی گہری نیند سونے والا جگانے والے کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے۔ جب اس کا پیٹ شراب سے خالی ہو جاتا، اور نشہ اتر جاتا، تو شراب خانے جا پہنچتا۔ جیتا اور خوب پیتا، اور اپنی پہلی حالت پر آجاتا۔

اس کی دکھیاری بیوی روزی کا وسیلہ ڈھونڈنے سے عاجز آگئی۔ دونوں بچوں کو روتا ہوا دیکھ کر خود بھی رو دیتی۔ ان بچوں کی زبانیں خاموش تھیں مگر آنسو دل کی ترجمانی کرتے تھے۔ اسے اپنے لئے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا، سوائے اس کے کہ وہ راستہ اختیار کرے جو ایسے وقت میں ہر مجبور و بے کس شخص کو کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اپنے دونوں بچوں کو کسی گھر میں نوکر رکھوا دیا، جہاں رہ کر وہ اپنا پیٹ بھی پالتے اور غریب ماں کو بھی کھلاتے۔ وہ اپنے بچوں سے بہت کم مل سکتی۔ اس کا خاوند بھی بہت کم گھر میں آتا۔

اب وہ بیچاری بغیر کسی مونس و غمخوار کے تن تنہا رہ گئی تھی۔ ہاں ہمسایہ میں رہنے والی صرف ایک بڑھیا تھی جو کبھی کبھار اس کے یہاں آنکلتی، اور جب وہ بڑھیا چلی جاتی، تو تنہائی میں اپنی خوش نصیبی کے وہ دن یاد کیا کرتی جب اس کا خاوند شریف تھا، اور وہ اپنے ستاروں کی طرح خوبصورت اور چمک دمک رکھنے والے بچوں کے ساتھ عیش و عشرت کی آغوش میں بے فکری کی زندگی بسر کیا کرتی تھی۔ پھر اپنے ذہن میں اس کایا پلٹ کا نقشہ لاتی کہ کس طرح اس کا خاوند عزت و شرافت کے مرتبے پر فائز تھا، ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا، اور کس طرح وہ موتیوں کا ہار بکھر گیا جو گویا زمانے کے گلے میں بیش قیمت زیور تھا۔ اور وہ موتی بکھرنے کے بعد خاک پر پڑے ہوئے سنگریزے بن گئے جنہیں ہر راہگیر اپنے قدموں کے نیچے روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ جب یہ باتیں یاد کرتی تو اس طرح روتی جیسے پہلی جانے والے کے بعد اس کا کوئی عزیز بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ رو رو کر اپنے آپ کو فنا کر دے گی۔ لیکن باوجود اس نے اپنے دل میں کبھی اپنے خاوند کے خلاف کینہ و عداوت کو جگہ نہ دی، حالانکہ حقیقت میں اس کی اور اس کے بچوں کی بدبختی کا باعث وہی تھا، وہ ایک شریف عورت تھی، اور ہر شریف عورت کا شیوہ ہے کہ کبھی اپنے آفت رسیدہ خاوند سے بے وفائی نہیں کرتی۔ وہ اسے ان نظروں سے دیکھتی جن سے شفیق ماں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھتی ہے۔ اس پر رحم کھاتی اور شفقت سے پیش آتی۔ اگر بیمار ہو جاتا تو اس کی خبر گیری کے لئے راتوں کی نیند حرام کر لیتی، اور اگر زخمی ہو کر لوٹتا تو زخموں کی مرہم پٹی کرتی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ جب کسی رات شراب خانہ والے دیکھتے کہ اس کے پاس شراب کے دام نہیں ہیں تو اسے شراب خانہ سے نکال دیتے، اور وہ بدبخت چیختا چلاتا گھر کی طرف لوٹتا اور بڑی بے قراری سے شراب طلب کرتا۔ اس کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے اس کی بیوی یا تو کھانے پینے کی رقم لا کر اسے دے دیتی، یا خود جا کر شراب کی اتنی مقدار خرید لاتی جو اسے سکون بخش دے۔

اس بیچاری پر تباہی و بربادی کا بوجھ تھا، زمانے نے اس میں ایک اور بوجھ کا اضافہ بھی کر دیا۔ ایک دن اسے محسوس ہوا کہ وہ اس بدبختی کی دنیا میں ایک نئے بدنصیب کو جنم دینے والی ہے اس پر بے ساختہ وہ چیخ چیخ کر رونے اور فریاد کرنے لگی۔

وہ اپنی جان پر سب تکلیفیں برابر برداشت کرتی رہی، یہاں تک کہ وضعِ حمل کا وقت آن پہنچا۔ اس وقت بوڑھی پڑوسن کے سوا اور کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ تیز بخار میں مبتلا ہو گئی۔ اسے کوئی ایسا طبیب میسر نہ آسکا۔ جو انسانی ہمدردی کے لئے اس کا علاج کرتا، کیونکہ ایک ایسے شہر میں جہاں اکثر مریض کے مرجانے کے بعد بھی اس کے رشتہ داروں سے اپنے علاج معالجہ کی فیس مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتے، بھلا ایسے نیک دل اور خدا ترس ڈاکٹر کہاں مل سکتے ہیں جو بلا معاوضہ علاج کریں۔ آہستہ آہستہ موت کی گھڑیاں قریب آتی گئیں، اور بالآخر اس نے اس حالت میں جان دی کہ سوائے ننھی بچی کے جو اپنی ماں کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی، اور کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ عین اسی وقت وہ خانماں خراب چیختا چلاتا شراب مانگتا گھر میں داخل ہوا اور آتے ہی بیوی کی تلاش شروع کر دی تاکہ وہ حسبِ معمول اس کی حاجت کو پورا کر سکے۔ اس نے تمام کمرے میں نظر دوڑائی، اور دیکھا کہ وہ چٹائی پر پڑی ہے۔ اسے خیال آیا کہ شاید سوتی پڑی ہے۔ وحشت آگے بڑھا اور بچی کو اٹھا کر اس سے دور پھینک دیا۔ اور پھر لمبے زور سے اسے جھنجوڑنے لگا مگر اس کے باوجود اس نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ اسے کچھ شبہ سا ہوا اور ایک دم ایک خیال بجلی کی سرعت سے اس کے دل میں دوڑ گیا۔ اب اس کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں جھکا اور اس کے چہرے کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، تو یوں محسوس ہوا کہ مرحومہ کی ابھری ہوئی بے نور آنکھوں میں سے موت اسے گھور رہی ہے خوف و دہشت کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹنے لگا، اور اسی حالت میں اس کا پیر بچی کے سینے پر جا پڑا۔ ایک دردناک ہلکی سی چیخ نکلی، اور اس کے بعد اس نے ذرا جنبش نہ کی۔ اس بدبخت ازلی نے ایک زور کی چیخ ماری اور کہا "ہائے بدقسمتی او ہائے بدبختی!!" اور جنون و وحشت کے عالم میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اور گلی کوچوں میں دیوانہ وار دوڑنے لگا اس کا سر دیواروں اور ستونوں سے ٹکراتا جاتا تھا اور وہ انسانوں اور حیوانوں کو برابر ادھر ادھر کرتا جاتا تھا، اور ساتھ ہی چیختا جاتا "ہائے میری بچی! ہائے میری بیوی! آؤ تم سب میری طرف بڑھو، اور مجھے پکڑ لو!!" آخر دوڑتے دوڑتے وہ تھک کر چور ہو گیا اور یک دم زمین پر گر پڑا۔ ایڑیاں رگڑتا جاتا تھا۔ اور مرغِ نیم بسمل کی طرح تڑپتا جاتا تھا۔ اس کے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ عبرت کی تصویر بنے اس کے حال پر افسوس کر رہے تھے، اس لئے نہیں کہ وہ اس کے جاننے پہچاننے والے تھے، بلکہ اس لئے کہ وہ اس کی پیشانی سے بدبختی کی علامتیں پڑھ رہے تھے۔ تھوڑے سے وقت میں جب اسے ہوش آیا، تو اس کی رہی سہی عقل بھی جاتی رہی۔ بس گھنٹہ دو گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ اسے ہسپتال میں بیڑیاں پہنے ہوئے پایا گیا۔ کس قدر قابلِ رحم تھا وہ، اس کی شہید بیوی، اس کی معصوم روندی ہوئی بچی، اور غم و الم میں مبتلا اس کے بچے!

(ملک مسعود احمد)

*

معاونین کرام

مدیر "مخزن" سے اپنے خطوط کا جواب حاصل کرنے کے لئے براہِ کرم اپنے خط کے ساتھ حسبِ موقع ایک لفافہ یا کارڈ **اپنا پتا لکھ کر** ضرور ملفوف کیجئے۔ محض ٹکٹ بھیجنا کافی نہیں ہے، نہ ضروری ہے۔

"بابا"

شیرخواری سے فارغ ہوتے ہی انسانی بچہ زندگی کی کشاکش سے مجبور ہو کر بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ طبعی فعل ہے کہ ہونٹ بند کرے اور پھر کھولے۔ اس ہونٹ بند کر کے کھولنے کی حرکت سے عام طور پر جو آواز نکلتی ہے وہ "با" ہوتی ہے۔ بچہ "با" "با" کرتا رہتا ہے۔ یہ بے معنی "بابا" آخر کار بامعنی لفظ بن جاتا ہے اور تقریباً ہر زبان میں اس لفظ پر باپ نے چھاپا مارا۔ دوسری آواز غالباً "نا" "ما" ہوتی ہے۔ یہ آواز ماں کی نذر ہوئی۔ انگریزی میں "پاپا" باپ اور "ماما" ماں۔ ہمارے ملک میں بابا، دادا، چاچا، ماما، کاکا، سب لفظ مردوں نے ہتھیا لئے۔ دلی والے ماما ماں کا بھائی بگاڑ کر ماموں اور چاچا کو چبا کر چچا کہتے ہیں۔ دلی میں "ماما" کی آواز نوکرانی کے لئے مخصوص ہو گئی۔ ہزارہ کے علاقہ میں لفظ کاکا از راہ ادب ہر بزرگ کے لئے مخصوص ہے مگر پنجاب والے لاڈ سے بچے کو کاکا کہتے ہیں۔ بوڑھے اور بچے کی اس لفظی یگانگت میں اک گونہ لطف ہے۔ دلی والوں کا نشہ یہ پر زور ہے۔ بچے کو ننھا پکارتے ہیں، دودھ پلانے والی کو انا کہا جاتا ہے۔ پنجابی میں اندھے کو "انھا" کہا جاتا ہے۔ اندھا شاید اندیکھا کا اختصار ہو۔ بیچارہ آنکھ سے بھی گیا اور یہ ترکیب بھی گنوا بیٹھا۔ لاہور اور دہلی میں اگر کسی کا ذکر تحقیر سے کرنا ہو تو کہہ دیتے ہیں "بچا یاد ہی رکھے گا"۔

لکھنے والے اور بولنے والے بچے کی پہلی بے اختیاری صدا کو عجیب عجیب طرح سے استعمال بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی "بچے" جیسے لفظ کو بگاڑ کے "اور بچا" کہہ کر بچے پر نادانستہ ظلم بھی کرتے ہیں۔ عجیب استعمال کا نمونہ اور قابل داد نمونہ ہے، وہ ترکیب "بابائے قدم" کے وزن پر "بابائے اردو" کہہ کر رائج کی گئی۔ اب یہ ترکیب پھیل رہی ہے اور آجکل "بابائے صحافت" کے نوبت نقارے بج رہے ہیں۔ اردو اور صحافت دونوں مونث لفظ ہیں۔ لکھنے والے ان باباؤں کے ہاں بیٹیوں کی بھرمار کیوں کر رہے ہیں؟ بابا لوگ کے ہاں منّا کیوں [illegible] ہے؟ یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ "ابو" والی ترکیب کیوں غیر مستعمل ہوتی جا رہی ہے۔ اگلے وقتوں کے بزرگ ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالعلا کہلانے سے نہ جھجکتے تھے۔ فضل بیٹے کا نام ہے۔ خیر بھی بیٹے کا نام ہے چاہے کچھ نہ ہو۔ علا یعنی "لا" بابا میں بھی تذکیر جھلک رہی ہے۔ اب رجحان طبقہ اناث کی طرف کیوں ہے؟ کیا اردو والے اب تک ملکہ وکٹوریا سے مرعوب ہیں؟ اور اس لئے کہ حضرت غالب نے قصیدہ لکھا اور ملکہ کا بت اب تک ایک مخصوص قانون ساز عمارت کے سامنے ہے۔ بابا کو مرد نہ چھوکریاں بخشتا "بارش بابا ہم بازی" والی بات ہے: صحافت کے صحیح معنی تو معلوم نہیں مگر صحیفے کئی پیغمبروں پر اترے، مصحف پاکیزہ بلکہ پاک ترین کلام یا پاک چہرہ۔ صحافت کیا کھائی ہے یا خوش خطی یا عبارت آرائی؟ اگر محض لفاظی ہے تو کون سی انوکھی بات ہے؟ ڈرتے ڈرتے کہنا ہی پڑتا ہے کہ صحیفے اتارنے والی عالم الغیب ہستی کو ادیب اگر اور کچھ تحفہ پیش نہیں کر سکتے تو کم از کم "بابا" عطا کرنے سے پرہیز کریں۔

قلم کش کو قلم بدولت میر ساختہ" والی بات صحیح مگر قلم کش خطابوں کے بھوکے کیوں بنیں اور اگر خطاب پسندیدہ عطیہ نہیں تو اہل قلم خطاب ساز ہونے سے کیوں گریز نہیں کرتے؟

جیووانی بکیشیو
ترجمہ محمد حبیب اللہ اوج

گلِ ریحاں

جیووانی بکیشیو اطالوی افسانہ نگار ہے جو ۱۳۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۷۵ء میں چل بسا۔ مشہور مصنف دانتے کا یہ گہرا دوست اور پرستار تھا اور اس نے دانتے کی زندگی پر جو کتاب لکھی وہی دانتے کے متعلق معلومات کا واحد ذریعہ ہے۔ بکیشیو کی شہرت اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "De.cameron" سے ہوئی جس میں ایک سو کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط بیان کی گئی ہیں اور چوسر، شیکسپیئر اور ڈرائیڈن اسی کے خوشہ چیں ہیں۔

بہت زمانے کی بات ہے کہ مسینا میں تین بھائی رہتے تھے جو تجارت پیشہ تھے اور اپنے باپ کی موت کے بعد اس کی چھوڑی ہوئی کثیر دولت کے مالک ہو گئے تھے۔ ان کی ایک بہن لسابٹیا بھی تھی، نہایت ہی حسین و جمیل لیکن ان بھائیوں نے ابھی تک اس کی شادی نہیں کی تھی۔ ان تینوں بھائیوں کی دکان میں ایک خوش رو اور خوش شکل نوجوان لورنزو ملازم تھا۔ لسابٹیا کے معصوم دل پر لورنزو کا قبضہ تھا اور وہ اسی کے تصور میں گم رہتی تھی، لورنزو بھی لسابٹیا کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا لیکن دونوں نے یہ محبت ان تینوں بھائیوں سے پوشیدہ رکھی تھی اور یہ تینوں بھائی بھی اس معصوم محبت سے بے خبر اپنے کاروبار ہی میں مصروف رہتے۔ ایک رات لسابٹیا اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی کہ اس پر اس کے سب سے بڑے بھائی کی نظر پڑ گئی اور اس نے ایک نظر میں سارا معاملہ بھانپ لیا۔ رات اس نے جوں توں کر کے کاٹی اور صبح ہوتے ہی سارا ماجرا اپنے بھائیوں کو سنایا اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ اس وقت یہ ظاہر کیا جائے گویا ہمیں اس محبت کا علم نہیں اور مناسب وقت کا انتظار کیا جائے تاکہ بدنامی اور خاندان کی رسوائی نہ ہو۔ چنانچہ وہ لورنزو سے اسی بے تکلفی کے ساتھ پیش آتے رہے اور ایک دن سب نے مل کر یہ طے کیا کہ کہیں تفریح کو جائیں۔ لورنزو ان کی سازش سے بے خبر ان کے ساتھ چلا گیا۔ دور جنگل میں جا کر تینوں بھائیوں نے لورنزو کو قتل کر ڈالا اور پوشیدہ طور پر اسے دفن کر دیا۔ گھر آ کر تینوں بھائیوں نے لسابٹیا سے کہہ دیا کہ لورنزو کو کسی کام سے دور بھیج دیا گیا ہے۔ لسابٹیا کو اپنے بھائیوں کی بات کا یقین نہ تھا لیکن چونکہ دن ہفتے، ہفتے مہینوں اور مہینے برسوں میں بدل گئے مگر لورنزو واپس نہیں آیا اور بے چاری لسابٹیا اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ ایک دن جب اس نے اپنے بھائیوں سے بہ اصرار لورنزو کے متعلق استفسار کیا تو بڑے بھائی نے کہا "تجھے لورنزو سے کیا مطلب؟ خبردار اب اس کے متعلق ہم سے پوچھا ورنہ ہم ایسا جواب دیں گے جس کی تو مستحق ہے۔" بے چاری خاموش ہو گئی، چپکے چپکے راتوں کو اس کی یاد میں روتی، اس کی کے لیے منتیں مانتی اور بسا اوقات اس کے تصور میں رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔

ایک رات جب روتے روتے اس کی آنکھ لگی تو اس نے لورنزو کو خواب میں دیکھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور خون سے شرابور۔ وہ کہہ رہا تھا "لسابٹیا! واپسی کی امید نہ رکھ، آخری دن جب میں تجھ سے جدا ہوا، تیرے بھائیوں نے مجھے قتل کر دیا۔" اس کے بعد لورنزو نے اس مقام کا پتا بتایا جہاں وہ دفن کیا گیا تھا۔ لسابٹیا کی آنکھ کھل گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہنے لگیں۔ دوسری صبح بھائیوں کے سامنے یہ بہانہ کر کے کہ میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں لسابٹیا جنگل کی طرف روانہ ہوئی اور خواب میں بتائے ہوئے مقام پر جا کر اس نے زمین کھودی جو بہت ہی نرم ثابت ہوئی۔ کھودنے کے بعد اس نے اپنے عاشق

اور لپیٹ کر رونے لگی۔ کاش وہ اسے باعزت طریقے سے دفن کر سکتی۔ بالآخر اس نے ایک تیز چاقو سے اپنے عاشق کا سر علیحدہ کیا، وحش کو پھر سے دفن کیا، گھر واپس ہوئی اور کمرہ بند کر کے پہلے تو اس سر کو ہزار دفعہ پیار کیا اور آنسوؤں میں نہا گئی بعد ازاں اسے ایک مہین ریشمی کپڑے میں لپیٹا اور ایک خوبصورت گملے میں جس میں عام طور پر ریحان کا پودا لگایا جاتا ہے دفن کر دیا۔ اس پر مٹی ڈال کر ریحان کے تخم بو دیئے اور اسے پانی کی بجائے گلاب کے عرق یا اپنے آنسوؤں سے سینچنے لگی۔

گلاب کے عرق، آنسو اور روغن شدہ اختلاط نے پر سر سے مٹی زرخیز ہو گئی اور پودے میں غیر معمولی خوبصورت اور خوشبودار ریحان کے پھول آئے ساجیتا کا معمول تھا کہ وہ آنسوؤں سے اس پودے کو سینچتی تھی اس سے اس کی صحت روز بروز بگڑتی گئی۔ ہمسایوں کے توجہ دلانے پر بھائیوں نے یہ گملا اس سے چھین لیا جس پر اس نے کھانا پینا تک ترک کر دیا اور رات بھر روتی رہی۔ یہ دیکھ کر بھائیوں نے گملا توڑ کر راز معلوم کرنے کی ٹھانی گملا توڑنے پر لورنزو کا سر برآمد ہوا جسے انہوں نے گھنگریالے بالوں سے پہچان لیا اور افشائے راز کے ڈر سے اسے دور نیپلز لے جا کر پھر سے دفن کر دیا اور ساجیتا غمِ فراق میں روتے روتے اپنے محبوب سے جا ملی۔

سلام مچھلی شہری

اے دلِ بے خانماں.....!

(از لکھنؤ)
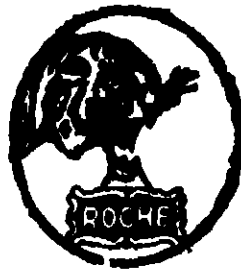
"پیارے مجاز! اب میں وہ نظم اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں جس کے باعث کل کی "ادبی صحبت" میں خواہ مخواہ ہنگامہ ہو گیا۔ شکر ہے کہ اوروں کی طرح خود تم نے میری اس نظم کو کوئی چیلنج نہیں سمجھا۔ بہرحال ادبی ناقدوں کی دنیا صرف "We Three" تک محدود نہیں ہے اور اسی لئے ؎

اب حیات و شعر کے ناقد سے پوچھنا چاہیئے
کونسا "آوارہ" ہم دونوں میں کچھ ذی ہوش ہے

لکھنؤ ۴ مارچ ۱۹۵۰ء

تمہارا "سلام"

سوؤں کی آگ یا کلیوں کی محفل ڈھونڈ لے
دلہ موجوں سے یا آغوشِ ساحل ڈھونڈ لے
نفس کی موت یا بزمِ عنادل ڈھونڈ لے
اے دلِ بے خانماں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

س کچھ آیا نہیں اب تک مگر پھرتے ہوئے
ن گزرتا جا رہا ہے دربدر پھرتے ہوئے
ں گلی مڑتے ہوئے، اس راہ پر پھرتے ہوئے
اے دلِ بے خانماں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

ا بھی رقصندہ تھے ہر شور رنگ و بو کے قافلے
ا بھی گونجے تھے انہیں منزلوں پہ دلکش قہقہے
ا بھی سب بیگانہ تھے اور آج بھی بیزار سے

اے دلِ بے خانماں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے
یہ اندھیری رات کی پریوں کی جلوہ گاہ ہے
یہ جو بل کھاتی ہوئی ہے میکدے کی راہ ہے
اس طرف فی الحال مل کی چمنیوں کی آہ ہے

اے دلِ بے خانماں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!
جانے کیسی خوابِ آزادی کی یہ تعبیر ہے
ہر قدم پر سوچتا ہوں، پاؤں میں زنجیر ہے
خندہ زن ہے موت لیکن زندگی دلگیر ہے

اے دلِ بے خانماں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!
یا تو ہم سے چھوٹ جا، غیروں سے ناتا جوڑ لے
یا تو گھبرا کر در و دیوار سے سر پھوڑ لے

یا تو رات آتی ہے، ہنس کر چاند ملے توڑ لے
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

آگیا دھرتی کے قدموں پہ سمٹ کر آفتاب
شیخ کے ہاتھوں سے جیسے گر پڑے جامِ شراب
جیسے اک مزدور دوشیزہ کے ہاتھوں میں گلاب
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

پہلے پہلے بھی دلِ گیتی میں تھا اک درد سا
وقت کے گیسوئے پریشاں، رخ پہ عالم زرد سا
آج اک ماحول تو ہے، لاکھ ہو کچھ سرد سا
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

اے زہے سعیِ مسلسل، آج یہ عالم تو ہے
ہم غریبوں سے مزاجِ خسروی برہم تو ہے
اپنی اک آواز تو ہے اپنا اک پرچم تو ہے
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

آج صیادوں کے فتنے خود اسیرِ دام ہیں
جتنے جادو ہم پہ چل سکتے تھے سب ناکام ہیں
ہم بھی خود اک درس، اک مقصد ہیں، اک پیغام ہیں
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

کارخانوں کے مقابل مرمریں ایواں بھی ہیں
دیکھنا، بدلی ہوئی صورت میں کچھ شیطاں بھی ہیں
ہوشیار، اس بھیڑ میں تخریب کے ساماں بھی ہیں
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے

پھر نہ ہو جائے کوئی آمادۂ لطف و کرم
پھر نہ لٹ جائے حسینوں میں غریبی کا بھرم
اک شگوفہ مسکرائے اور بہک جائیں قدم
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

تو نے پہلے بھی انہیں پھولوں میں ڈھونڈی تھی پناہ
تو نے پہلے بھی ستاروں ہی پہ ڈالی تھی نگاہ
وائے بر ذوقِ طرب آگئیں بہ ایں حالِ تباہ!
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے

دن تو ڈھلتا جا رہا ہے، شام بھی ڈھل جائیگی
اور شبِ تاریک پھر سو آفتیں لے آئے گی
تب کہیں موجِ شمیمِ صبحِ نو لہرائے گی!
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے

ڈھونڈنا کیا، تیرا فردوسِ حسیں ہے سامنے
تازہ پھولوں کی فضائے دلنشیں ہے سامنے
راہ یہ ہے — منزلِ کیف آفریں ہے سامنے
اے دلِ بے خاناں! اب اپنی منزل ڈھونڈ لے!

سلام مچھلی شہری

قدوس صہبائی

ممتاز شیریں کا افسانوی ادب

(فاضل مضمون نگار کی رائے سے مخزن کا اتفاق لازم نہیں)

کچھ عرصہ ہوا جب ممتاز شیریں کے افسانوں کا ایک مجموعہ "اپنی نگریا" شائع ہوا ہے "اپنی نگریا" پر دو چار عام تبصرے اب تک شائع ہوئے ہیں مجھے ان سے اتفاق نہیں یہی مقصد اس مضمون کے لکھے جانے کا محرک ہوا ہے ——

اردو کی خاتون افسانہ نگاروں کے تذکرے میں سعادت حسن منٹو کا نام کچھ "جنس نامانوس" کا سا احساس پیدا کرتا ہے۔ لیکن بڑی مشکل یہ پیدا ہوئی ہے کہ پاکستان و ہندوستان میں مشکل سے ایک دو خاتون افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر عصرِ حاضر کی تمام خواتین نے بشمول عصمت چغتائی، منٹو کی جنس نگاری کے بہت گہرے اور دور رس اثرات گذشتہ سترہ اٹھارہ سال کے عرصے میں قبول کئے ہیں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور کے نام اس حیثیت سے نمایاں ہیں۔ تسنیم سلیم چھتاری اور ناہید عالم کے نام بھی افسانہ نویس خواتین کے زمرے میں کچھ دن سے سامنے آ رہے ہیں لیکن ان دونوں نے بھی جنس کے موضوع پر جتنا کچھ لکھا ہے اس میں منٹو کسی نہ کسی موڑ پر ضرور نمایاں نظر آیا ہے۔

اصل میں ان خاتون افسانہ نگاروں کا گھریلو ماحول قدامت پرستی کا گہوارہ رہا ہے ممتاز شیریں کے سوا سب نے یو پی کے متوسط طبقہ کے اندر خاص استبدادی ماحول میں پرورش پائی ہے اور ان کے وہی افسانے قابلِ ذکر ہیں جن میں جنسی گھٹن، پردہ دار گھروں کی مستبدانہ شرافت تابی کے گہرے نقوش اور صنف نازک کی بے بسی اور کمتری کے لرزہ خیز انکشافات ہیں۔ یا اس سے آگے بڑھئے تو متوسط طبقے کی حدیں پھلانگ کر اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں اور لڑکوں کی جنسی بے راہ روی (FLIRTATION) کلب اور رقص گاہوں کے رومان، انگریزی معاشرت کی نقالی اور انگریزی نما اردو کے مکالمے ہیں۔ اس لئے عصمت سے لے کر قرۃ العین حیدر تک ان سب کی ادبی تخلیق میں زندگی کے اتھاہ سمندر سے صرف چند قطرے جھلکتے دکھائی دیں گے۔ اپنے گھر کی چار دیواری یا زیادہ سے زیادہ اپنے مخصوص ماحول کی عکاسی۔ اس کے سوا جو بھی کچھ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے وہ غیر حقیقی اور بھونڈا ادب ہے۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ اسلوب اور زبان و بیان میں عصمت اور ہاجرہ مسرور ایک صف میں اور تنہا قرۃ العین حیدر دوسری صف میں اپنا اپنا ایک خاص اور نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

لیکن ان سب خاتون افسانہ نگاروں میں دو نام یعنی ممتاز شیریں اور صدیقہ بیگم سیوہاروی کے ایسے ضرور ہیں جن کی انفرادیت ادب میں نمایاں ہے۔ پچھلے پانچ سال کے عرصے میں ممتاز شیریں نے تنقیدی ادب اور صدیقہ بیگم سیوہاروی نے جو افسانوی ادب پیش کیا ہے اس میں بلیغ ادبی مطالعے اور سماجی شعور کی ایک جھلک موجود ہے۔ صدیقہ بیگم کی زندگی بڑی تلخ کامیوں میں گزری ہے۔ شاید انہیں اپنے عزیزوں سے اور اس کے نتیجے میں سوسائٹی سے بہت سی تلخ یادگاریں ملی ہیں یہ تجربے انہیں متاثر کئے بغیر نہیں رہے ہیں وہ سخت اشتراکی بن گئی ہیں ان کا ادب بھی اس جذبے سے متاثر ہوا ہے اور

انہوں نے پورے جوش انتقام کے ساتھ اشتراکی ادیبوں کی صف میں اپنی انفرادیت کو گم کر دیا ہے۔ لیکن میرا موضوع چونکہ ممتاز شیریں کی ادبی زندگی اور صلاحیتوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اگلی سطور میں انہیں کے تنقیدی اور افسانوی ادب سے بحث کروں گا۔

آجکل ممتاز شیریں مشہور ادبی دوماہی رسالہ "نیا دور" کی مدیرہ ہیں لیکن اس حیثیت میں ظاہر ہونے سے پہلے ہی جب "نیا دور" بنگلور سے شائع ہوتا تھا ان کا نام ادبی حلقوں میں مشہور ہو چکا تھا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی وہ تنقیدیں اور تنقیدی جائزے تھے جو وہ اردو کے افسانوی ادب پر بالخصوص اور ادبی تحریکات پر بالعموم اپنے رسالے میں شائع کرتی رہتی تھیں۔ اگرچہ ابتداً ان تنقیدوں میں فنی اور لسانی خامیاں عام تھیں۔ جن کی ضروری اصلاح آج تک نہیں ہو سکی لیکن حقیقت میں وہ ادوار ان کے شیدائی بعض شناس تھے اسی لئے انہوں نے نیا دور کے اندر ہر سال کے افسانوی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے بعض مشہور افسانہ نگاروں کے ساتھ ہی ساتھ ایسے ایسے غیر معروف اور غیر مستحق افسانہ نگاروں کو بھی اپنی ستائش کا مستحق سمجھا جن کا تعلق چند مشہور افسانہ نگاروں سے تھا یا جن کی تائید بعض ادبی گروہ کر رہے تھے۔ لیکن جن کی ادبی تخلیقات میں نہ فن کی عظمت موجود تھی نہ ان کے موضوعات میں کوئی خصوصیت یا ندرت تھی۔ انہوں نے بعض اوقات ذاتی اور شخصی پسند یا ناپسند اور بعض وقت رسالہ کی شہرت اور اپنی ہر دلعزیزی کے عام ہونے یا نہ ہونے کے باعث بعض ناموں کو نظر انداز کیا بلکہ بعض ایسی ادبی شخصیتوں کو سامنے لانے سے گریز کیا جو اس کی مستحق تھیں اور اس طرح افراد کو افکار پر ترجیح دی مثلاً سنہ ۱۹۴۴ء کے افسانوی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے کرشن چندر سے لے کر کوثر چاند پوری تک کو انہوں نے نوازا مگر درمیان میں سے ابراہیم جلیس اور بعض دوسرے قابل ذکر افسانہ نگاروں کو نظر انداز کر گئیں۔ حالانکہ جلیس کی افسانہ نویسی کا یہ وہی اس کے عروج کا زمانہ تھا وہ طنز پر اور طنز کی زبان پر بڑا قدرت حاصل کر چکا تھا۔ دکن میں اسے قبول عام حاصل تھا اور حیدر آباد کے باہر اس کی شہرت پر لگا کر اڑ رہی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ ممتاز شیریں اور صمد شاہین نے جلیس کو نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ دبی زبان میں اس کی مخالفت بھی کی اس کے برعکس مہندر ناتھ (کرشن چندر کے بھائی) کو جو بالکل مبتدی تھے اور اس وقت مشکل سے جن کی کوئی کتاب شائع ہوئی تھی ممتاز شیریں نے بے پناہ خراج عقیدت پیش کیا اور صرف ایک دوسرے درجے کے افسانے "جہاں میں ستارے" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ جملہ تک لکھنے میں تکلف یا تامل نہیں کیا کہ مہندر ناتھ کے فن نے ستاروں کو چھو دیا ہے!

لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ انگریزی فن تنقید کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مطالعہ میں وسعت ہوتی گئی اور اسی مطالعہ کے نتیجے میں وہ اپنی شہرت کا جواز پیش کر سکتی ہیں۔ گذشتہ چار سال میں انہوں نے نہ صرف غیر ملکی زبانوں کے افسانوی ادب کو پڑھا ہے بلکہ اصول تنقید پر کافی دسترس حاصل کی ہے۔ اور پاکستان آنے کے بعد نئی ریاست کے نئے مسائل کو ایک باشعور رفقا کی طرح ترقی پسند زاویۂ نگاہ سے سمجھا ہے وہ ادب کی آفاقی قدروں کی چاپک ہیں اور ادب میں سماجی شعور کی پوری پوری ترجمانی کرنے کے باوجود محض اس اشتراکی نظریہ کی سخت مخالف ہیں جس میں ایک خاص سیاسی گروہ بندی کے پروگرام کی تشہیر و تبلیغ کی جائے۔ وہ اسے ادبی عصبیت اور تنگ نظری سمجھتی ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ ترقی پسند قدریں کل انسانیت کے لئے ہیں اور جس انسانی گروہ کے جو مخصوص سماجی مسائل ہیں انہیں پوری دیانت داری کے ساتھ ادب میں پیش کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ اسی لئے قیام پاکستان کے بعد ان کا زاویۂ نگاہ نئی ریاست کی وفاداری کے ہمہ گیر تصور کی بنیاد بن کر ترقی پسند ادب کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر نے پاکستان میں نئے ادب کے واحد ادیبوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ ان کی تنقیدوں میں غیر ممالک کی ادبی تحریکوں اور ادیبوں کے حوالوں سے اسی تصور ادب کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ نیا دور کے ان ادبی جائزوں اور تنقیدوں نے جو ممتاز شیریں کے قلم سے شائع ہوئی ہیں انہیں اس لئے بھی ایک منفرد خاتون

البرادیلہ ہے کہ اتفاق سے کوئی دوسری نقاد خاتون ہند و پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ ان کے ارد گرد مداح ادیبوں کا ایک بڑا حلقہ ہو چکا
ہے ان کے شوہر صمد شاہین بھی شامل ہیں اور رسالہ "نیا دور" کا ادبی حلقہ بھی ان کا ہمنوا ہے۔

لیکن ممتاز شیریں کے افسانوں کا مجموعہ "اپنی نگریا" شائع ہونے کے بعد بعض تنقید نگاروں کی جانب سے انہیں ایک بلند پایہ افسانہ نگار بھی ثابت
کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں غالباً ان میں سے اکثر افسانے غیر منقسم ہند میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ محض یہ افسانے شیریں کو ایک
بلند پایہ افسانہ نگار بھی تسلیم کرا سکتے ہیں۔ البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان افسانوں میں موضوعِ جنس کی بہتات کے باوجود کسی افسانہ کے کردار فرائیڈیت کے
جنسی بے راہ روی کے شکار نہیں ہیں۔ اور کسی افسانے میں جنس دوسری خاتون افسانہ نگاروں کی طرح ان کے تفکر پر قبضہ نہیں کر سکا ہے۔

ممتاز شیریں کے ان افسانوں میں ایک باشعور نقاد کا اثر نمایاں ہے لیکن ایک ایسا نقاد جب فن کے پیچ و خم میں خالص افسانوی ادب کو پرکھ
نا چاہتا ہے تو اس کی افسانوی تخلیق عموماً بے ڈھنگ ہو جاتی ہے اور شیریں کے افسانوں میں تنقیدی شعور اور شادی کی سماجی انسٹی ٹیوشن کے غالب
موجود ہونے کے باوجود وسیع زندگی کی بہت ہی محدود جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ حقیقی زندگی سے خود ان کی ناآگاہی اور محض اپنے
تک رسائی ہے۔ "اپنی نگریا" کے افسانوں کی تخلیق پر لکھتے ہوئے وہ ابتدا ہی میں یہ اعتراف کرتی ہیں کہ

> "ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میرا مشاہدہ بہت محدود ہے مجھے ادب کے مطالعہ کا بہت کچھ موقع ملا ہے لیکن زندگی
> کے مطالعہ کا بہت کم اسلئے میرے افسانوں کا دائرہ بھی محدود ہے میرا نظریہ ہے کہ قریبی مشاہدے اور گہرے مطالعہ کے
> بغیر کسی اچھے اور گہرے افسانہ کی تخلیق مشکل ہے۔
>
> میرے ایک دو افسانے قریبی مشاہدے اور مطالعہ کا نتیجہ ہیں لیکن اکثر میری اپنی زندگی اور تجربے کے محور کے گرد
> گھومتے ہیں ——" (اپنی نگریا ص ۲۲۱)

اس اعتراف کے بعد یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ زندگی محض وہ نہیں جو ممتاز شیریں گذارتی ہیں اس لئے ان کا افسانوی ادب بڑے محدود دائرے
میں ہے۔ وہ کبھی ایسی افسانہ نگار نہیں بن سکتیں جس کا مشاہدہ اور زندگی کا اصل تجربہ ایک افسانہ کی تخلیق کا باعث ہو ظاہر ہے کہ محض اکتسابی او
سے اصل زندگی کی جھلکیاں افسانے میں دھندلی اور بے روح ثابت ہوتی ہیں یہ بھی مشکل ہے کہ ایک خاص مرحلے پر کوئی ادیب اپنے سماجی ماحول
ذہنی حلقے سے کٹ کر صرف اس لئے علیحدہ ہو جائے کہ وہ ادب کی خاطر زندگی کے طوفانوں میں خود کو جھونک دیتا ہے بالارادہ کم از کم ممتاز
کے لئے ایسا کرنا سخت ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے ممتاز شیریں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے بمقابلہ عصمت
قرۃ العین حیدر زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال کی بڑی خامیاں نظر آتی ہیں ممکن ہے اس کی وجہ ان کا جنوبی ہند سے دیرینہ وطنی تعلق ہو یا ان
وسیع ادبی مطالعہ ، جسے وہ انگریزی زبان میں جاری رکھتی ہیں لیکن جب اپنا حاصل مطالعہ اردو ادب پر اردو زبان میں منطبق کرتی ہیں یا افسانہ
ہیں تو الفاظ کا غلط استعمال، جملوں کی غلط تشکیل، لاتعداد اصطلاحوں، ترکیبوں اور صرف و نحو کی غلطیاں مجموعی تاثر کو کم کر دیتی ہیں اور ان کی
جس کا مرکزی خیال اور اسلوب عمل اور فنی نقطۂ نظر سے یا نفسیاتی زاویے سے مکمل ہوتا ہے۔ زبان کی الجھنوں سے افسانے یا تنقید کو آورد
یا تانی کا پھیکا رنگ دے دیتا ہے

قدوس صہبائی　　　　　جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

یوں تو افسانہ اور تنقید دونوں میں یہ کیفیت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے لیکن افسانے کی زبان میں خصوصاً فن کا عروج مضمر ہوتا ہے خرابی اکثر اسلوب پر بھی گہرا اور برا اثر ڈالتی ہے اور افسانے کو گھٹیا بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ممتاز شیریں کو انہیں وجوہ کی بنا پر افسانہ نویسی کو بہت ہی مناسب ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک باخبر نقاد کی حیثیت سے وہ آگے چل کر ادب میں ایک درجہ حاصل کر سکیں۔ بشرطیکہ وہ زبان و اصلاح پر پورا وقت صرف کر سکیں۔ اور اس طرح وہ برعظیم کے نقادوں کی صف میں ایک قابل قدر اضافہ کر سکیں۔

فن تنقید ایک بہت مشکل اور اہم ادبی صنعت ہے لیکن کمیونسٹوں اور قدامت پسندوں نے اس فن کو ہر دو جانب سے اس طرح استعمال کیا ہے کہ ذہنی عظمت ناپید ہو چلی ہے۔ تیسرے درجے کے اشتراکی نقادوں کی طرح "رجعت پسند، سرمایہ دار، زوال پذیر" اور اسی نوع و جنس کے خالی خولی الفاظ تنقید کا صحیح معیار پیش نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے زندگی کے مروجہ نظاموں کا تقابلی مطالعہ سائنس اور فن کے سے آگاہی تاریخ ادب اور ماضی کے ادب سے وابستگی اور خود اشتراکیت کی بنیاد یعنی "جدلی مادیت" اور مارکسزم کے عقائد کے تحقیقی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اکثر مارکسی نقاد جو نہ مارکسزم کو سمجھتے ہیں نہ جنہوں نے غیر ملکی ادب اور ادبی تنقید کا مطالعہ کیا ہے جن میں سے اکثر انگریزی بھی نہیں جانتے اور بیالوجی، طبیعیات، کیمیا، ریاضی، اقلیدس بلکہ خود مارکسزم کی اقتصادی اصطلاحوں کو بھی نہیں سمجھتے اپنی تنقیدوں میں چھوٹے اردو کتابچوں سے (جنہیں کمیونسٹ پارٹی مزدوروں کے لئے چھاپتی ہے) طویل اقتباسات نقل کر دیتے ہیں تا کہ اپنے مضمون کی کسی نہ کسی ڈھب سے علمی ثابت کر سکیں۔ حالانکہ عموماً ایسے اقتباس بے محل، ناموزوں اور نفس مضمون سے غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ہمارے صحیح معیار پر بہت کم پورے اترتے ہیں۔ ممتاز شیریں کی تنقیدیں بھی اگر زبان و بیان کی خرابیوں سے پاک ہو جائیں تو کم از کم ان میں اثر و دلکشی آ جائے گی۔

میں نے ان کی چند تنقیدیں پڑھنے کے بعد غالباً ڈھائی تین سال پہلے ان کا ایک افسانہ "آزادی" یا "آزادی کی صبح" (صحیح عنوان پڑھا تو میرا تاثر یہی تھا کہ انہیں افسانہ نگاری پر کبھی مکمل عبور نہ ہو سکے گا۔ اس کی وجہ زبان کے استعمال پر کامل قدرت نہ ہونے میں ہی ڈھونڈ ہے۔ "اپنی نگریا" کے افسانوں میں ہر صفحے دو صفحے کے بعد یکایک کسی جملے، خصوصاً کسی محاورہ، کسی ترکیب، اصطلاح، یا کسی صرفی یا نحوی غلطی سے پڑھنے والا ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے لامحالہ وہ تسلسل جو ایک افسانہ پڑھنے کے لئے ضروری ہے ٹوٹ جاتا ہے یہی باعث افسانے میں اس کو کم کرنے کا ہے۔ خود تنقید میں بھی بعض اوقات وہ خیال کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتیں اور انہیں الفاظ نہیں ملتے مثلاً ایک جگہ اپنے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں۔

"یہ الگ الگ طرح پیش کئے گئے ہیں" ۔۔۔ (اپنی نگریا ص ۲۳۴)

غالباً مقصد یہ ہے کہ افسانے مختلف موضوع، اسلوب یا ہیئت کے پیش نظر لکھے گئے ہیں لیکن انہیں اس مفہوم کے ادا کرنے صحیح الفاظ نہ مل سکے۔ اور وہ "سہل الممتنع" کا سہارا لینے پر مجبور ہوئیں۔

اسی طرح اپنے افسانے "انگڑائی" کے متعلق ایک جملے میں جس کی بڑی بھدی تشکیل کی گئی ہے جب اردو کے الفاظ ان کے ذہن میں تو انہیں انگریزی لفظوں کی پناہ لینی پڑی۔ اگرچہ میں خود کسی جامع مقصد کے لئے انگریزی کے الفاظ کا استعمال ممنوع نہیں سمجھتا لیکن اس شرط کے

قدر

اور بدل موجود نہ ہو نیچے میں وہ جملہ درج کر رہا ہوں جس کی بدصورتی کھٹکتی ہے دیکھئے ۔

"انگڑائی کا وقفہ بہت کم ہے ایک آدھ گھنٹے کا اور پچھلی محبت کی جو تفصیلی تصویر اور دو محبتوں میں جو تقابل بنایا ہے اس میں NARRATION اور REFLECTION کا امتزاج ہے" (اپنی نگریا ص۱۳۴)

کے سب سے اچھے کہے جانے والے افسانے "آئینہ" کی یہ دو ترکیبیں مجھے کھٹکتی ہیں ۔

"مجھے ان نتھنوں پر بھی راکھ دھول . . ."

"گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑی تھی . . . . . ." (اپنی نگریا ص۱۴۴)

کشیدہ الفاظ کی ترکیب استعمال فصاحت اور محاورے دونوں کے خلاف ہے ۔

اسی طرح خود ان کی زندگی اور نیا دور کی جدوجہد سے جس افسانے (اپنی نگریا) کا گہرا تعلق ہے اس کی زبان نسبتۃً صحیح ہے اور اسی لئے اس میں روانی بھی ہے لیکن وہ بھی غلط ترکیبوں یا جملوں کی غلط تشکیل سے مبرا نہیں ہے مثلاً ایک طویل سا جملہ یوں لکھا گیا ہے۔

"کبھی ذرا ملتے جلتے موضوعات پر الگ الگ طریقے سے لکھے گئے یا الگ الگ نظریے پیش کرتے ہوئے مضامین یا افسانوں کی اس طرح ترتیب دیتا جیسے ایک ہی مقام سے نکل کر چاروں طرف بکھرتی ہوئی ایک . . . . . . دو دو افسانوں یا نظموں کے درمیان ایک ایسی نظم لا دیتا جس میں اپنے آگے اور پیچھے کے دونوں مضمونوں کا رنگ ملا ہوا" (اپنی نگریا ص۱۴۰)

زبان و بیان اور طرز ادا کے متعلق ممتاز شیریں کے ادب سے اگر مثالیں پیش کی جائیں تو ایک بڑا مضمون مکمل ہو سکتا ہے لیکن غالباً تمام ہی اردو ممتاز شیریں کے تنقید نگاروں نے یا تو صنف نازک کی مروت کو ملحوظ رکھا یا اس جانب توجہ ہی نہ کی چنانچہ "اپنی نگریا" پر محمد حسن عسکری نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں خاتون افسانہ نگاروں کے متعلق بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں مثلاً جس چیز کو میں نے "منٹو کے ادب کا جنسی اثر" ظاہر کیا ہے عسکری نے اس کی توضیح میں اسے عصمت کا اثر ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"آجکل نئی افسانہ نگار خواتین میں یہ مرض وبا کی طرح پھیل گیا ہے کہ جنسیات کے متعلق کوئی بات بالکل منہ پھٹ طریقے سے کہہ دی جائے جس سے لوگ چونک پڑیں کہ ارے لڑکی ہو کے اتنی بے حیائی غرضکہ لکھنے والیوں کو شہرت کا بڑا سستا نسخہ حاصل ہو گیا ہے۔ جلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ اپنی دانست میں یہ لوگ عصمت چغتائی کی پیروی کرتی ہیں مگر عصمت کی سی فنکاری اور فنی سنجیدگی کہاں سے لا سکتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ محض ایک پٹاخا بن کر رہ جاتا ہے . . . . . .

اور اب تو یہ جنسی پٹاخا بہت ہی سیل ہو گیا ہے"

اس کے خلاف ممتاز شیریں کے متعلق بھی عسکری نے یہاں تک صحیح لکھا کہ

"اپنے افسانوں میں انہوں نے آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے کبھی سنسنی خیزی یا جنسی اور سیاسی اشتعال انگیزی کی کوشش نہیں کی"

ممتاز شیریں نے یہ اچھا ہی کیا کیونکہ خود ان کے اعتراف کی روشنی میں ان کی اپنی زندگی کے علاوہ انسانی زندگی کے دوسرے تمام موضوع

محض کتابی یا اکتسابی ہیں وہ مزدور کی زندگی اور مزدور عورت اور بچے کی ترجمانی تو کجا اس کے ماحول کا صحیح تصور بھی نہیں رکھتیں کسان کی زندگی کے گہرے مشاہدے کا انہیں موقع کبھی نہ ملا ہوگا زندگی میں شاید ہی یہ موقع انہیں ملا ہو کہ وہ دونوں دیہات میں گھومی ہوں صرف اس لئے کہ اس زندگی کی تمام جزئیات ان کے ذہن کی سطح پر منقش ہو جائیں۔ اسی لئے آج کے دو یانیں افسانوں میں تصنع جھلکتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انہی پر منحصر نہیں بلکہ عصمت، اور ہاجرہ مسرور جیسی سکّہ بند اشتراکی افسانہ نگار بھی جب ایسے "عوامی" افسانے لکھتی ہیں تو ان کا موضوع ان کے تجربہ مشاہدے اور زندگی کی حدود سے باہر ہونے کے باعث ایک بھونڈا پروپیگنڈا لٹریچر نظر آنے لگتا ہے جس میں کبھی کبھی حقیقت و واقعیت کا تصور تک موجود نہیں ہوتا۔ اب تک صرف صدیقہ بیگم ہی ایک افسانہ نگار خاتون ہیں جنہوں نے زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں سے بیزاری اور اس سے ایک نئی امید لے کر خود کو اشتراکی تحریک میں عملاً جھونک دیا ہے اور وہ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

لیکن جنسی بازی گری اور سیاسی اشتعال انگیزی کے دائرہ سے صاف باہر نکل آنے کے باوجود ممتاز شیریں کے ساتھ حسن عسکری نے اور دوسروں نے شاید یہ غلطی کی ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں افسانہ نگاری جاری رکھنے کی تلقین کی ہے۔ یہ حوصلہ افزائی اس لئے صحیح نہیں کہ یہ ابھرتی ہوئی خاتون نقاد اپنے مطالعہ کے زیادہ وسیع ہو جانے اور زبان پر رفتہ رفتہ قدرت حاصل کرنے کے بعد ایک اچھی تنقید نگار بن سکتی ہے لیکن اس کی افسانہ نگاری میں جو وقت ضائع ہو رہا ہے وہ فن تنقید کے ساتھ ایک زیادتی ہے۔ کیونکہ افسانہ نویسی میں اس کا جو وقت ضائع ہوگا وہ فن تنقید نگاری کے ساتھ ایک زیادتی ہوگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ حسن عسکری نے صرف چند افسانے لکھے تھے لیکن اسے ایک بہت بلند مرتبہ افسانہ نگار کا درجہ حاصل ہو گیا تھا عسکری فنی تبحر کے ساتھ زبان اور اسلوب پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے اسی لئے جب اس نے تنقید کے حق میں افسانہ نویسی کو ترک کیا تو اچھے اچھے نقاد چلا اٹھے تھے کہ ایک اچھا افسانہ نگار ہاتھ سے گیا کیونکہ اچھا نقاد بننا آسان کام نہیں لیکن عسکری نے یہ خطرہ صحیح نہ ثابت ہونے دیا۔ اور مسلسل مطالعے اور ادبی تنقید پر سالہا سال ملکی اور غیر ملکی ادب پڑھ کر اپنے وجود کو منوا لیا "ساقی" میں عسکری کی "جھلکیاں" جن سے کسی کو اختلاف ہو یا اتفاق، تنقیدی ادب میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

ممتاز شیریں پر عسکری کی مثال صادق نہیں آسکتی ایک ادبی ضرب المثل بن چکی ہے کہ بگڑا ہوا افسانہ نگار اچھا تنقید نگار بن سکتا ہے لیکن بگڑا ہوا تنقید نگار صرف سیاسی لیڈری کر سکتا ہے یا اخبار نویس بن سکتا ہے۔ ممتاز شیریں کو زبان و بیان کی کمزوری، طرز و اسلوب کی مشکل صرف و نحو کی دقت، اردو الفاظ کا نقص وغیرہ اور سب سے بڑھ کر زندگی کا محدود مطالعہ کبھی اچھا فنکار افسانہ نویس نہ بننے دے گا۔ لیکن ان کا تنقیدی فن ضروری اصلاحوں کے بعد زیادہ عروج پر پہونچ سکتا ہے تنقید نگاری اور افسانہ نویسی دونوں اصناف ادب میں ان کی کوششیں اگر جاری رہیں تو ان کی تخلیقی قوت منقسم ہو جائے گی وہ دونوں اصناف ادب میں دوسرے درجے کی تخلیقات پیش کرتی رہیں گی اور اردو ادب ایک اچھے نقاد سے محروم ہو جائے گا۔

●

یارانِ نکتہ داں

نسیم جمالی

علامہ اقبال کی ایک غزل

علامہ اقبال کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل دو شعر جگن ناتھ صاحب آزاد کے مضمون میں اپریل ۵۰ء کے "مخزن" میں شائع ہو چکے ہیں۔

شبِ فرقت تصور تمہارا اعجاز تھا کیا تھا
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

جفا جو کہہ دیا میں نے مگر تم نے برا مانا
خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

اس غزل کے دیگر اشعار جو میرے پاس محفوظ ہیں حسبِ ذیل ہیں۔

نزاکت کے پھولوں کی صورت کسی کی بھولی بھولی ہے
زباں میٹھی ہے لب ہنستے ہیں پیاری پیاری بولی ہے

وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں خیر ہو یارب
پتہ میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہولی ہے

مہ و خورشید انجم دوڑتے ہیں ساتھ ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوقِ بے پروا کی ڈولی ہے

دیارِ عشق میں واماندگیِ رفتار ہے اے دل
جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے

سمجھ سکتا نہیں کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں
گرہ تھی زندگی میری اجل نے آ کے کھولی ہے

جگت الشر ہے تو ہر آنا کو پیت ہے تیری
صنم خانہ کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے

خاور قریشی دہلوی

شیخ عبدالقادر اور علامہ اقبال کی تصاویر

اپریل کا مخزن دیکھا۔ شیخ عبدالقادر علیہ الرحمۃ کے متعلق اور علامہ اقبال کے کلام پر جو مضامین و منظومات اس میں درج ہیں نہایت پر از معلومات ہیں اور افادی پہلو رکھتے ہیں۔ علامہ مرحوم و شیخ علیہ الرحمۃ کی تصاویر ایک ہی صفحہ پر دیکھ کر ذہن میں وہ تمام باتیں ابھر آئیں جو ان دونوں بزرگوں کی ذات سے مختص ہیں اور اب شیخ صاحب کے بعد آپ ہی "مخزن" کی روایات اور امتیاز برقرار رکھنے کے اہل ہیں اور سب کو آپ کی ذات سے بڑی امیدیں ہیں۔

سید باقر علیم

ہمارے رسالوں کی غزلیں

حضرت! میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ایک ہی قسم کی غزلیں اب تو ایک ناقابلِ برداشت بار کی سی صورت اختیار کر رہی ہیں وہی موضوع وہی مضمون اور بحر۔ ردیف و قافیہ کے تھوڑے سے ہیر پھیر کے ساتھ۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں کہ ہر اشاعت میں شعری ادب کی تعداد ہی ہو۔ ایک اچھا شعر ہی کافی ہو سکتا ہے مگر اچھا شعر شرط ہے۔ ہمارے رسالوں میں شعری ادب کی افراط سے معیار گر گیا ہے۔ رسالوں میں غزلوں اور قافیہ کی پابند نظموں سے میں تو یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت ہماری شعری دنیا میں [illegible]

دور دورہ ہے بہت کم نظمیں قافیہ و ردیف کی قیود سے آزاد نظر آتی ہیں۔ اور یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے شعرا میں سے اکثر نے شاعری اپنے اوپر طاری رکھی ہے۔ فرمائشی شاعری عروج پر ہے۔

آپ نے صحیح تلفظ والا سلسلہ کیوں بند کر دیا۔

ظفر اقبال حشر

فلسفہ ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے

مرزا محبوب بیگ کا مقالہ "فلسفہ ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے" تعمیری ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اشاعت زبان اردو کے متعلق آپ جو سعی جمیل فرما رہے ہیں وہ بے حد قابلِ قدر و ستائش ہے۔

محمد یعقوب صاحب

مئی کا مخزن

بہت دنوں سے مخزن کا مطالعہ کر رہا ہوں ہمیشہ ارادہ کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں اپنے تاثرات آپ کو لکھ بھیجوں مگر اس ارادہ کو تساہل کی وجہ سے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ لیکن اس ماہ میں اپنے آپ کو کچھ لکھنے سے روک نہ سکا۔ سر عبدالقادر کے بعد آپ مخزن ادارت کے سچے جانشین ہیں۔ اور جس عمدگی سے رسالہ ترتیب دے رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے "مخزن" سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ مئی کے مخزن میں جاوید صدیقی کا مضمون "بے ترتیبی" پڑھ کر مجھے فخر حاصل ہو رہا ہے کہ ہماری زبان میں بھی ایسے اہل قلم پیدا ہو گئے جو اسے دیگر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل بنا رہے ہیں اچھا لکھنا واقعی مشکل ہے۔ جاوید صدیقی کا اولین نقش ہی شاہکار معلوم ہو رہا ہے مغربی انداز سے انہوں نے "بے ترتیبی" کے موضوع میں جان ڈال دی ہے کہ میں تعریف کرنے سے قاصر ہوں۔ "گورے گورے پاؤں اور بیلا ئیں" میں ارشد صاحب نے سادگی میں پرکاری کی ہے فیاض محمود صاحب کا افسانہ اس رسالہ میں کیا کروں وہ میرے ہیں "ٹھیک ہے اور آپ کے سابقہ "مخزن" میں شائع شدہ افسانوں سے موضوع کے لحاظ سے ہٹ کر ہے اور شاید اسی وجہ سے ان سب سے اچھا ہے شمس الدین صاحب صدیقی کا ڈراما . . . ٹوٹی کماں کمند قسمت کی ستم ظریفی کا پُر اثر مرقع ہے شمس صاحب مغربی کھیلوں کو اس طرح اپناتے ہیں کہ بالکل اجنبیت معلوم نہیں ہوتی۔ مجید امجد کی غزل مسلسل "دن گزرتے گئے" حصۂ نظم میں اچھی ہے۔ آپ نے "املا و تلفظ کی غلطیاں" والا مستقل عنوان کیوں اڑا دیا ہے؟ اور کوئی تنقیدی مضمون بھی نہیں ہے جس کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

مس نکہت رعنا بٹ

صنفِ نازک کا گلہ

معاف فرمائیے گا پاکستان کی صنفِ نازک کو آپ سے تھوڑا سا گلہ ہے۔ بات یہ ہے کہ جب سے "مخزن" کی اشاعت شروع ہوئی ہے اس میں خواتین کے مضامین، مقالات اور غزلیات وغیرہ کے لئے بہت ہی کم صفحات وقف کئے ہیں۔ اس موقع پر اگر آپ یہ اعتراض فرمائیں کہ پاکستان میں ایسی خواتین ہیں ہی کتنی جو اپنے معیاری رسالے کیلئے کچھ لکھ سکیں تو ایک حد تک بجا ہوگا۔ لیکن آخر بالکل ہی تو قحط نہیں ہے۔ اور پھر اگر کچھ خواتین کی تھوڑی سی رہبری کی جائے تو یقیناً وہ بھی اچھے اچھے شعراء اور باکمال ادباء کی صف میں کھڑی ہو سکتی ہیں پاکستان میں ابھی تک ہماری معاشرت اس قسم کی ہے کہ اس گھناؤنی اور مسموم فضا میں کسی باذوق خاتون کا پیدا ہونا ناممکن نہ ہو تو کم از کم مشکل ضرور ہے اور پھر بدقسمتی سے کوئی ایسا ذہن پیدا ہو بھی جاتا ہے (کیونکہ ذوقِ سلیم اور طبع رسا تو خداداد ہے) تو اس کی پرورش اور نمو کے اسباب کسی طرح بھی مہیا نہیں ہو سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن آہستہ آہستہ تنگ آ کر مردہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر طرف ناامیدی اور پریشانی کا سامنا کر کے بیدلی اور یاس کے نیچے دب جاتا ہے بیکار آتا ہے بیکار چلا جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ قوم نے ابھی تک ایسے دماغوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی سے ضعف بھی ضد کی طرح گر بار آور ہو سکتا ہے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ خواتین کی چیزوں کو بھی قبول کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی جائے اگر کہیں خامی نظر آئے تو اس کی اصلاح کر دینی چاہئے نہ یہ کہ اسے بالکل ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک کر ان کے دلوں کو توڑا جائے۔

مخزن المخازن

ماہ نو

شیخ عبدالقادر

حامد علی خاں

یہ مضمون عسکری صاحب کی فرمائش پر ماہ نو کے لئے لکھا گیا تھا اور اس کی اشاعت اپریل میں شامل ہوا تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ اسے "مخزن" میں بھی شائع کر دیا جائے اس لئے ایک حصہ حذف کرنے کے بعد یہ نذر قارئین ہے۔ (مدیر)

شیخ عبدالقادر اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اس صدی کی ... میں ان کا مشہور رسالہ "مخزن" بجائے خود ایک دبستان بن گیا تھا ... لئے یہ کہنا بجا ہے کہ عبدالقادر کی ذات میں ہماری گزشتہ نصف ... ی کی ادبی روایات جمع ہو گئی تھیں۔ ان کے عقیدت مندوں میں سے ... نے ان کو "ماضی و حال کو ملانے والی ایک اہم کڑی" کی حیثیت سے ... یا ہے اور کسی نے انہیں قدیم تہذیب و شرافت کا پیکر گردانا ہے کوئی اردو ... ن سے ان کی گہری محبت کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ "ہم اردو کو ترقی دے ... یہ ثابت کر دیں گے کہ اردو کے محسن ہمارے عبدالقادر اب بھی زندہ ... "۔ تو کوئی ان کو اس حیثیت سے بھی دیکھتا ہے کہ انہوں نے علامہ ... نبال کو شعر گوئی ترک کر دینے کے ارادے سے روک کر گویا بالواسطہ وہ ... اعری پیدا کی جس نے قوم کو پاکستان کی جدوجہد کے لئے تیار کیا۔ یہ سب ... درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے قوم ... جو نقصان پہنچا ہے ابھی ہمیں اس کا پورا اندازہ نہیں ہوا۔

. . . .

. . . .

شیخ صاحب ایک کامیاب اور بھرپور حاصل زندگی گزارنے کے بعد ۹ فروری ۱۹۵۰ء کی صبح کو رحلت فرما گئے۔ دنیوی ترقی کے جو بلند مدارج شیخ عبدالقادر کو حاصل ہوئے ادیب ان سے عموماً محروم رہتے ہیں اور اگر کوئی ادیب اس قسم کی ترقی کی شاہراہ پر پہنچ بھی جائے تو ادب سے اس کی دلبستگی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بے حد قابلِ قدر بات ہے کہ شیخ صاحب اپنی زندگی کے ہر دور میں ادب و شعر کے شیدا رہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ انہیں اردو زبان سے بے حد محبت تھی۔ یہ محبت اس لحاظ سے اور بھی گہری معلوم ہوتی ہے کہ شیخ صاحب کی جوانی کے زمانے میں جو لوگ انگریزی زبان سے اچھی واقفیت رکھتے تھے وہ اردو کی طرف متوجہ ہونا کسرِ شان سمجھتے تھے لیکن شیخ صاحب نے ایک موقر انگریزی اخبار کے مدیرِ اوّل کی حیثیت کو بھی اپنے لئے "مخزن" کے اجرا کی راہ میں حائل نہ پایا۔ "مخزن" کا اجرا ان کی اردو کی محبت کا ایک کرشمہ تھا۔ خود شیخ صاحب کا بیان ہے:-

> "مخزن" کے اجرا کا خیال مجھے اردو کی حمایت کے ایک تاریخی جلسے میں بیٹھے ہوئے آیا جو مدت ہوئی لکھنؤ میں ہوا تھا۔ ان دنوں اردو کی مخالفت جو صوبجاتِ متحدہ میں پنڈت مدن موہن مالوی نے شروع کی تھی۔ اس کا فائدہ اٹھا کر ایک برطانوی لفٹنٹ گورنر سر انٹنی میکڈانل نے پہلے ایک مخصوص کارروائی

اردو کے جسم پر لگائی اور ہندی کو اس کی جگہ دینی چاہی
مسلمانوں میں اس پر بہت اضطراب پیدا ہوا اور اردو کے
بچانے کے لئے لکھنؤ میں ایک اہم جلسہ طلب کیا گیا جس
کی صدارت نواب محسن الملک مرحوم نے کی میں اور شیخ
اور مرزا اعجاز حسین مرحوم پنجاب سے جا کر اس جلسے میں
شریک ہوئے۔۔۔۔ مگر ہمیں جاتے ہی معلوم ہوا کہ اودھ
کی حکومت ہم تینوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی کر
رہی ہے کیونکہ انل صاحب کا مزاج ان دنوں سخت برہم
تھا اور وہ مسلمانوں کے بہت مخالف ہو گئے تھے انہیں
تعجب تھا کہ پنجاب کے تین آدمی لکھنؤ کے جلسے میں شرکت
کے لئے کیوں آئے میں نے ایک مختصر سی تقریر میں جس کا
مجھے اس جلسے میں موقع ملا لاٹ صاحب کے استعجاب کا
جواب دیا کہ اردو کا مسئلہ صرف صوبجاتِ متحدہ سے متعلق
نہیں ہے بلکہ سارے ملک کے ان حصوں سے متعلق ہے
جہاں اردو بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہے اور ہم مجروح اردو
کی پکار سن کر آئے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہر جگہ اردو کے
لئے ایک دعوتِ جنگ ہے۔ مجھے اس جلسے میں یہ دیکھ کر
تعجب ہوا کہ لکھنؤ جیسے شہر میں جس میں اردو ہندوؤں اور مسلمانو
کے گھروں میں بولی جاتی ہے اور جہاں اردو کے کئی مشہور شاعر
اور نثر نگار ہندوؤں میں بھی موجود ہیں، وہاں صرف ایک دو
ہندو شریکِ جلسہ تھے ان میں ایک بنارس کا بوڑھا وکیل
تھا۔ اس نے اتنی ہمت کی کہ وہ جلسے میں شریک بھی ہوا
اور بعض تجاویز کی بحث میں بھی حصہ لیا) یہ تو ظاہر تھا کہ اس
کی وجہ یہ تھی جو ہندی کے حامیوں اور حکومت کے کارکنوں
نے مل کر ان ہندوؤں پر ڈالا ہوگا جو دوسری صورت میں
کم از کم جلسہ دیکھنے کو تو آتے۔ لیکن میں نے یہ بھی محسوس
کیا کہ ان کی کم توجہی میں کچھ قصور مسلمانوں کا بھی ہے بہت
سے مسلمان شعرا نے اپنے اشعار میں تعلّی کا اظہار کرتے ہوئے
ایسے شعر لکھے ہیں جن سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ زبان کے
اصلی مالک یا اجارہ دار وہی ہیں اور دوسرے لوگ اگر کچھ
بولتے یا لکھتے بھی ہیں تو ان سے مستعار لیتے ہیں اس سے
کئی اردو لکھنے والے ہندو اردو سے علیحدگی اختیار کرنے
لگے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ ایک ایسا رسالہ جاری کیا
جائے جو مذہبی یا سیاسی بحثوں سے جو اکثر جھگڑے کا سبب
بنتی ہیں الگ رہ کر صرف ادبی خدمات تک اپنی مساعی
کو محدود رکھے اور ہندو مضمون نگاروں کو شرکتِ کار کے
لئے صلائے عام دے اور اس طرح اپنے ناظرین میں بھی
ہندو مسلمان دونوں کو شامل کرنے کی کوشش کرے۔"

غالباً اردو کی محبت ہی نے شیخ صاحب کو جو فطرۃً صلح کل
کے مسلک کے پیرو تھے اور زیادہ اس مسلک کا پابند بنا دیا تھا۔ شاید اسی محبت
نے عمر بھر انہیں عملی سیاسیات سے کنارہ کش رکھا۔ ۱۹۰۷ء میں جب وہ
بیرسٹر ہو کر ولایت سے تشریف لائے تو انہوں نے "مخزن" میں کچھ اس قسم
کے الفاظ لکھے تھے کہ سیاسیات کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں لیکن اگر میں نے
ضرورت سمجھی تو اس کے لئے کوئی الگ رسالہ جاری کروں گا۔ "مخزن" کو
میں سیاسیات سے الگ رکھ کر سب کا رسالہ بنانا چاہتا ہوں۔

اس تحریر کے تقریباً اکتالیس سال بعد جب فروری ۱۹۴۸ء میں "مخزن" کے
دورِ سوم کے آغاز کا خیال پیدا ہوا تو اگرچہ حالات میں بہت تغیر آ چکا تھا۔
یعنی ہندوؤں نے من حیث القوم اردو کو ترک کر کے ہندی کو اپنی قومی زبان
بنا لیا تھا مگر شیخ صاحب نے "مخزن" کے پہلے پرچے کے لئے راقم الحروف کو
مضمون لکھواتے ہوئے پھر اردو کی محبت سے مجبور ہو کر اپنے اسی قدیم خیال کا

اعادہ یوں کیا:-

"اب ایک مدت سے مخزن" بند تھا جب دو رسوم کے نفاذ
کا خیال متفکرہ مدد احباب کو آیا۔

میری علاحدہ کوشش کامیاب ہو اور اردو کی ترقی
اور استحکام کو اس سے مدد پہنچے۔ جو حضرات اس کی عنانِ ادارت
سنبھالیں گے اگر وہ یہ کوشش کریں گے کہ مخزن کی روح
ان کے قبضے میں آجائے تو ان کی کامیابی انشاء اللہ یقینی
ہوگی اور مخزن کی روح تھی دوستی اور محبت کے ذریعہ
لوگوں کو اردو کی رغبت دلانا اور ان میں اردو کا شوق
پیدا کرنا۔"

اب یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ شیخ صاحب ادب کو سیاست سے علیحدہ
رکھنے کے خیال پر خود اول سے آخر تک عامل رہے۔ ہندوستان سے علیحدگی
کے بعد بھی وہ اسی روش کو اردو کی ترقی کے لئے مفید خیال کرتے تھے۔

اردو کی خدمت انہیں اس قدر عزیز تھی کہ جب وہ بیرسٹر ہو کر ولایت
سے آئے تو غالباً انہوں نے اسی وجہ سے دلی کو اپنے کاروبار وکالت کیلئے
انتخاب کیا کہ وہ "مخزن" کو ہندوستان کے ایک مرکزی شہر میں لے جاکر
اردو کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اس خیال کا اظہار
بھی کیا تھا۔ اگر قومی زبان و ادب کی بے اندازہ محبت دل میں ہوتی تو ظاہر
ہے کہ ایک نیا بیرسٹر اس مشغلے کو اپنی کاروباری ترقی کے راستے میں حائل
سمجھ کر چھوڑ دیتا۔

یہ اسی محبت کا کرشمہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کا نام غیر فانی ہو گیا۔
تاریخ عبدالقادر بیرسٹر کو یاد نہیں رکھے گی، عبدالقادر چیف جج اور
عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل بھی یاد سے محو ہو جائے گا لیکن عبدالقادر مدیر مخزن
کا نام اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ درخشندہ رہے گا، وہ عبدالقادر
جس کا رسالہ ہندو، مسلمان، نئے پرانے ادیبوں کا سنگم بنا رہا۔ "مخزن"
کی کوئی پرانی جلد اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو اس کے مضمون نگاروں اور شاعروں
میں اس قسم کے نام نظر آئیں گے۔

مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈاکٹر اقبال، تلوک چند محروم، پنڈت برج موہن
دتاتریہ کیفی، حضرت نیرنگ، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، حسرت
موہانی، نادر کاکوروی، نذیر حسین ناشاد، آزاد عظیم آبادی، بسمل امام، جوش سیا
شاد عظیم آبادی، مولوی عزیز مرزا، احمد حسن شوکت، حامد علی خاں، دبیر رسا
عبدالرحمن سیاح، دیا نرائن نگم، آغا شاعر، قزلباش، ارشد گورگانی، محمود شیرانی
سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، اختر الخیری، حفیظ جونپوری، امجد حیدرآبادی، ملا
دہلوی، وحشت کلکتوی، ناصر نذیر فراق، سجاد حیدر یلدرم، سرور جہان
آبادی، خوشی محمد ناظر، سید علی بلگرامی، طالب بنارسی، بیخود دہلوی
مولانا ذکاء اللہ، محسن کاکوروی، وحید الدین سلیم، مہدی حسن افادی الاقتصادی
سائل دہلوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید، عزیز لکھنوی، شوق قدوائی
مولوی محی الدین ابوالکلام آزاد دہلوی وغیرہم۔

مولوی محی الدین صاحب ابوالکلام آزاد دہلوی کے نام سے مجھے
ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا جو اب ایک لطیفے کی حیثیت رکھتا ہے:
لطیفہ مجھے شیخ صاحب نے خود نومبر ۱۹۴۸ء میں سنایا تھا۔ مخزن کے
اجراء کے بعد شیخ عبدالقادر صاحب (غالباً ۱۹۰۱ء ہی میں) کلکتے گئے
تھے۔ وہاں اردو کی حمایت میں کوئی جلسہ ہو رہا تھا جب شیخ صاحب نے جلسے
میں تقریر کی، سامعین میں مولانا ابوالکلام آزاد ان کے والد اور ان کے
بھائی غلام یٰسین آہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ
ان دونوں نے تو میرے حال پر کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن مولانا ابوالکلام
جو اس وقت بالکل نوعمر تھے، تقریر کے بعد میرے پاس آئے اور ادھر ادھر
کی باتوں کے بعد انہوں نے کہا آپ نے "مخزن" جاری کیا ہے میں بھی اس کے لئے
مضمون بھیجوں گا۔ یہ مضمون بعد میں انہوں نے بھیجا جو ابوالکلام کے اس مضمون
کا عنوان تھا NEWS اور اس میں کچھ اس قسم کی باتیں لکھی تھیں کہ

نارتھ، ایسٹ، ویسٹ، ساؤتھ کا مخفف ہے۔ یہ مضمون "مخزن" میں شائع کر دیا گیا۔ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے "مخزن" کے ابتدائی دور میں میر غلام بھیک نیرنگ[1] کو کہا تھا کہ آپ "مخزن" کے ہر پرچے پر تنقید لکھ کر مجھے بھیج دیا کیجئے۔ جب میر نیرنگ نے "مخزن" میں ابوالکلام کا یہ مضمون دیکھا تو بہت بگڑے اور لکھا "یہ تم نے کیا شائع کر دیا؟ "مخزن" بچوں کی مضمون نویسی کی مشق کے لئے جاری نہیں کیا گیا"۔

اس کے بعد شیخ صاحب نے خود بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا کہ جن دنوں شملہ میں لارڈ ویول مسلم لیگ اور کانگریس کے زعماء سے گفتگو کر رہے تھے مولانا ابوالکلام آزاد شملہ آئے۔ میں بھی ان دنوں وہیں تھا۔ اتفاق سے میرے پاس "مخزن" کا وہ پرانا پرچہ بھی موجود تھا۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گیا تو وہ پرچہ ساتھ لیتا گیا اور میں نے مولانا کو ان کے بچپن کا وہ مضمون دکھا کر میر نیرنگ کی تنقید کا ذکر کرتے ہوئے ان سے کہا اب مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اسی وقت آپ کی ادبی منزلت کو پہچان لیا تھا۔ اس پر ابوالکلام آزاد بہت محظوظ ہوئے۔

"مخزن" کے ابتدائی دور کے ذکر میں شیخ صاحب نے ایک لطیفہ اپنے کسی بے تکلف دوست کا بیان کیا۔ اتفاق سے ان دوست کے ہاں "مخزن" نہیں پہنچا تھا۔ اس پر انہوں نے شیخ صاحب کے نام ایک خط بھیجا جس پر صرف یہ الفاظ لکھے گئے تھے:

یا شیخ عبد القادر "مخزن" للہ!

شیخ صاحب خود لطیفہ گو اور لطیفہ سنج تھے۔ ایک واقعہ اس وقت یاد آیا۔ "مخزن" کے دوبارہ اجراء پر پہلا مضمون لکھوانے کے چند دن بعد شیخ صاحب ایک طویل علالت میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے کچھ واقعات مختصراً بیان کر کے مجھ سے کہا تھا کہ "ان کی یادداشت رکھ لیجئے"۔ میرا خیال تھا کہ شاید بعد میں شیخ صاحب ان یادداشتوں سے کام لے کر کچھ مضامین خود لکھوائیں گے لیکن اس کے بعد ان کی علالت اور ضعف نے وہ طول کھینچا کہ پھر مجھے ان سے مضمون کا تقاضا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگست میں مجھے خیال آیا کہ ستمبر کے "مخزن" کے لئے ایک صفحہ قائد اعظم کی یاد میں شیخ صاحب سے لکھوایا جائے چنانچہ میں نے ان کے نام ایک خط اس غرض سے لکھ بھیجا کہ اگر آپ ایک صفحہ عنایت فرما سکیں تو میں لکھنے کے لئے حاضر ہوں۔ شیخ صاحب قبلہ نے دوسرے ہی دن مجھے بلا لیا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ حضرت قائد اعظم کے متعلق ایک صفحے کے بجائے کوئی فوری تفصیلی مضمون لکھوانا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ مضمون اس وقت صرف اپنے صفحہ اول کے لئے درکار تھا اس لئے میں کچھ مخمصے میں پڑ گیا اور پھر میں نے کسی نہ کسی طرح اپنا مافی الضمیر ان پر ظاہر کر دیا۔ اس پر شیخ صاحب نے فرمایا کہ کبھی پہلے صفحے کے مضمون کو لوگ پچھلے صفحوں میں بھی تو لے جایا کرتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، وہ تو درست ہے مگر "مخزن" یہ نہیں کر سکتا۔ اس پر شیخ صاحب کو پھر ایک پرانا لطیفہ یاد آیا۔ بڑی متانت سے بولے:۔

"رڈیارڈ کپلنگ جن کا ایک ایک لفظ انگلستان میں سونے سے تلتا تھا، کسی زمانے میں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور کے ادارتی عملے میں کام کرتے تھے انہیں دنوں ایک سیدھے سادے بڈھے منشی فضل دین بھی پریس میں فورمین تھے منشی فضل دین کے ہاتھ میں ہر وقت ایک فٹ رول رہتا تھا، اور وہ آئے دن فٹ رول ہاتھ میں لئے ہوئے مسٹر رڈیارڈ کپلنگ کے کمرے میں داخل ہوتے اور فٹ رول پر کہیں اپنا انگوٹھا رکھ کر اور رول کو اوپر اٹھا کر مسٹر رڈیارڈ کپلنگ کو دکھاتے ہوئے انگریزی میں کہتے Sahib: your article so long یعنی مطلب ہوتا کہ اخبار میں جگہ کم ہے اور تمہارا مضمون دو یا تین انچ لمبا ہے اسے مختصر کر دو۔ اس پر بیچارے رڈیارڈ کپلنگ اٹھتے اور قہر درویش بجان درویش، اپنے مضمون کی کانٹ چھانٹ کرتے۔"

میں اس لطیفے سے شیخ صاحب کا مطلب سمجھ گیا لیکن با دلِ ناخواستہ اپنا فیصلہ بدل نہ سکنے پر مجبور تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی فٹ رول تو تھا نہیں میں نے ہنستے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ کھول کر اوپر کو اٹھایا اور بایاں ہاتھ

[1] نام میں بھول گیا ہوں۔ غالباً یہی نام تھا۔ (راقم)

کلاس پر لکھ کر جا رہا ہے۔ Sahib, anyway your article shall not exceed this much long

اس پر شیخ صاحب مسکراتے ہوئے بولے "اچھا صاحب لکھے دیں کوشش کرتا ہوں کہ مضمون ایک ہی صفحے میں سما جائے۔"

یہ مضمون ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء کے مخزن میں "دو ملک" کے عنوان سے چھپا ہے جب شیخ صاحب نے مجھے قائد اعظم اور مہاتما گاندھی کے متعلق یہ فقرہ لکھوایا

"دونوں قوموں کے ان دو رہنماؤں کے طریق کار میں بہت فرق تھا۔ مگر قائد اعظم نے ہمارے سالک نے نہ لباس بدلا نہ لمبے لمبے روزے رکھے نہ روزہ رکھتے رکھتے اپنا خاتمہ کر دینے کی دھمکی دی۔ مسکراتے ہوئے حکام سے اور دوسری قوموں کے رہنماؤں سے باتیں کرتے رہے ان کو کھری کھری سناتے رہے ان سے کڑوی اور کڑوی باتیں سنتے رہے۔ مگر جو کچھ کیا سیدھی چال سے کیا اور اس میں کسی ہیر پھیر کو دخل نہیں دیا۔"

میں نے لکھتے ہوئے سر اٹھا کر شیخ صاحب سے کہا "اب تو بعض غیر ملکی مسلمان اکابر نے یہ بھی کہا ہے کہ قائد اعظم کا اصل پیغام روحانی اور اخلاقی ہے"

اس پر شیخ صاحب نے کہا "یہ بالکل درست ہے لیکن ابھی آگے چل کر لوگ اچھی طرح یہ بات سمجھیں گے۔"

اپنے ایک تقریباً ہم عمر، ہم پیشہ اور ہم عصر بزرگ کی سچی عظمت کا یہ فراخ دلانہ اعتراف خود شیخ صاحب کی بلند نظری کا ثبوت ہے

بعض اخبارات میں یہ شائع ہوا ہے کہ شیخ صاحب نے خود بہت کم لکھا ہے اور وہ صرف دوسرے ادیبوں ہی کو لکھنے کی تحریک کرتے رہے۔ یہ قول پوری طرح درست نہیں مخزن کی پرانی جلدوں میں مختلف موضوعات پر شیخ صاحب کے بے شمار مضمون پھیلے پڑے ہیں جن سے ان کی وسعتِ معلومات اور گوناگوں دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا سفرنامہ ترکی جو "مقامِ خلافت" کے نام سے چھپا تھا، ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ شیخ صاحب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں ترکی گئے تھے وہاں ان کا قیام سات ہفتوں کے قریب رہا اس قلیل مدت میں انہوں نے ترکی زندگی کے مختلف شعبوں کا جس خوبی سے مطالعہ کر لیا اس سے ان کی دقتِ نظر اور ذہانت کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

مخزن میں اپنی یورپی ممالک کی سیاحت کا حال بھی شیخ صاحب بہت خوبی سے لکھتے رہے۔ اردو شعر و ادب کے متعلق انگریزی میں ان کی تین مستقل تصانیف کے نام یہ ہیں:-

۱- دی نیو اسکول آف اردو لٹریچر (۲) اردو لینگویج اینڈ لٹریچر

۳- فیمس اردو پوئٹس اینڈ رائٹرز

کاروباری اور سرکاری مصروفیتوں سے جو وقت بچتا تھا شیخ صاحب عمر بھر اسے علمی و ادبی مشاغل ہی میں صرف کرتے رہے۔ جنوری [illegible] میں جب پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی جماعت کھلی اور یونیورسٹی کی درخواست پر شیخ صاحب نے ضعفِ پیری کے باوجود اردو کی اعزازی پروفیسر شپ قبول کر لی تو یہ بھی اردو کے عشق ہی کا کرشمہ تھا کہ وہ اس عمر میں بھی باقاعدہ لیکچر تیار کر کے طلبہ کو اس وقت تک مستفید کرتے رہے جب تک مرض کے ایک جان لیوا حملے نے انہیں بالکل مجبور و عاجز ہی نہیں کر دیا۔

شیخ صاحب گزشتہ نصف صدی کے آغاز سے لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کی روح رواں بنے رہے۔ اسی لئے لاہور کی فضائیں ان کے بغیر اداس معلوم ہوتی ہیں۔ اس عہد کے نوجوانوں نے انہیں عموماً ادبی مجلسوں کے صدر کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جس محفل میں شیخ عبدالقادر موجود ہوتے تھے۔ اس کا صدر خواہ کوئی ہو، اہلِ مجلس شیخ صاحب ہی کو صدر سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ صاحب کی شرکت سے ادبی مجالس کا وقار بہت بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ان کو بعض دوسرے اکابر کی طرح صدارت کی خواہش ان مجالس میں نہیں لاتی تھی اس کا ذمہ دار ان کا وہی پرانا زبان و ادب کا عشق تھا جس کی وجہ سے اس عہد کے نوجوانوں کی طرح اب سے نصف صدی پہلے کے بڈھوں نے بھی نوجوان عبدالقادر کو اسی ذوق و شوق سے اپنی ادبی محفلوں میں شامل ہوتے دیکھا تھا۔

اس بات کے ثبوت میں مرزا ارشد گورگانی کا ایک لطیفہ بھی

مدیر

کو میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ شیخ صاحب نے مرزا ارشد گورگانی کے متعلق ایک یادگار مضمون لکھا تھا وہی اس لطیفہ کا ماخذ ہے غالباً ۱۹۰۱ء کا ذکر ہے کہ مرزا ارشد گورگانی نے لاہور کی چند مجالس میں نوجوان عبدالقادر کو دیکھا۔ مخزن جاری ہو چکا تھا۔ اور مرزا صاحب مخزن سے اچھی طرح واقف بھی تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نوجوان ہی عبدالقادر مدیر "مخزن" ہے اسی زمانے میں ایک دن مرزا صاحب کو راہ چلتے اتفاقاً شیخ صاحب مل گئے۔ شیخ صاحب نے مؤدبانہ سلام کیا تو مرزا صاحب نے کہا چلو میاں میرے ساتھ چلو۔ ذرا راستہ بتاؤ میں لاہور سے واقف نہیں ہوں شیخ صاحب ساتھ ہو لئے اور جب مرزا صاحب مقام مقصود پر پہنچے اور وہاں مرزا صاحب کے ساتھ شیخ صاحب کی بھی بہت آؤ بھگت ہوئی تو مرزا صاحب کچھ حیران ہوئے۔ تعارف کے بعد جب اصل حقیقت کھلی تو مرزا صاحب نے شیخ صاحب سے بہت معذرت کی اور کہا۔ "میں سخت نادم ہوں" شیخ صاحب نے کہا "مرزا صاحب آپ بزرگ ہیں۔ آپ کچھ خیال نہ فرمائیے"۔ لیکن مرزا صاحب برابر کہے گئے "لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے میری کتاب شہنشاہ نامہ پر اتنا اچھا ریویو لکھا اور میں نے یہ قدر کی کہ آپ کو معمولی طالب علم سمجھ کر اپنے ساتھ گھسیٹے لایا۔ حقیقت میں میرا ارادہ تھا کہ آپ کے ہاں حاضر ہو کر اس ریویو کے لئے شکریہ ادا کروں"۔ پھر کہا "مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ہی مخزن کے ایڈیٹر ہیں۔ میں تو آپ کو ہر شام اور ہر مجلس میں دیکھ کر یہ خیال کرتا تھا کہ آپ لاہور کے بیکار نوجوانوں میں سے ہیں جو ہر جگہ دل بہلانے کو پہنچ جاتے ہیں اور اسی لئے کبھی پروا نہیں کی تھی کہ کسی سے آپ کے متعلق پوچھوں۔"

یہ چند سطور اردو کی شمع کے اس پروانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جو بالآخر خود شمعِ انجمن بن گیا اور جس کے بغیر لاہور کی ادبی محفلیں اب تیرہ و تار نظر آتی ہیں۔ سچ کہا گیا ہے ؎

اسے ڈھونڈا کرینگی اب نگاہیں
وہ تھا قلب و دماغِ شہرِ لاہور

تبرکاتِ مخزن

(منقول از مخزن بابت ماہ مارچ ۱۹۰۲ء)

اردو ٹائپ

(شیخ عبدالقادر)

ہمارا خیال ہے اردو کو کبھی نہ کبھی یہ مرحلہ طے کرنا پڑے گا کہ اردو اخبار اور رسالے ٹائپ کے حروف سے شائع کیے جائیں اور جس قدر جلد وہ اس ضروری مسئلہ کو حل کریں گے اسی قدر اردو اخبارات اور رسائل کو ترقی ہوگی۔ ساری مہذب دنیا ایک طرف ہے اور ہم اردو والے ایک طرف۔ ٹائپ کے حروف نے نئی دنیا بھر میں اپنا سکہ بٹھا لیا ہے اور ہم ہیں کہ ہمارے علوم و فنون ابھی لیتھو کے سنگ گراں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اخبارات اور رسالے ترقی کے میدان میں بڑھی ہوئی اور بڑھنے والی قوموں کے اخبار و رسائل کے مقابلہ کا کچھ بھی دعوے کر سکیں تو ان وسائل کا اختیار کرنا بھی لازم ہے جو ان کی ترقی کا باعث ہیں۔

ہم سنتے ہیں کہ یورپ کے ہر وقت رسالے اپنی مقررہ تاریخوں پر کمال باقاعدگی کے ساتھ چھپتے رہتے ہیں۔ اور اخبارات نہ صرف ہفتہ وار اور روزانہ اپنے اوقاتِ معینہ پر نکلتے ہیں بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ صبح کے اخبار صبح کو اور شام کے اخبار شام کو حیرت انگیز عجلت کے ساتھ گھڑی گھڑی کی خبریں لئے ہوئے شائقین کی میزوں پر موجود ہوتے ہیں۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ادھر کسی مشہور مقرر یا مدبر نے کوئی معرکے کی تقریر پارلیمنٹ میں کی اور ادھر ایک گھنٹہ بھر کے اندر اخبارات نے اسے شہر بھر میں پھیلا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ نتیجہ کئی مختلف ذرائع کے مجموعی استعمال سے مترتب ہوتا ہے۔ شارٹ ہینڈ والا (مختصر نویس) تقریر کو اسی وقت قلمبند کر لیتا ہے اور تار برقی اسے مطبع تک پہنچا دیتا ہے مطبع میں آہنی حروف کے جوڑنے والے (کمپازیٹر) منٹوں میں حروف جوڑ لیتے ہیں اور مشینیں فوراً اسی دیر میں ہزارہا کاغذ چھاپ کر رکھ دیتی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے

نہ جوڑنے کی ترکیب کے بغیر اور ساری ترکیبیں چنداں کارآمد نہیں ہیں ہم گو اس منزل سے ابھی بہت دور ہیں اور ہمارے حالات و روایات بھی سر دست اس امر کی متقاضی نہیں کہ ہم اس معیار ترقی کی تقلید کر سکیں لیکن اس منزل مقصود کو پیش نظر رکھنا بہرحال بے حد ترقی کے لئے لازم ہے۔

انگلستان میں کتابیں اخبار رسالے سب چیزیں ٹائپ سے ہی چھپتی ہیں بے شبہ علمی کتابوں کی اشاعت میں بھی ٹائپ نے بے حد مدد دی لیکن ہم اگر ابتدا میں کتابوں کے لئے چھپائی کے مروجہ طریق یعنی لیتھوگراف سے ہی کام لیتے رہیں اور صرف اخباروں اور رسالوں کے لئے ٹائپ کا استعمال شروع کریں تو ہمارے ملک کے حالات کے لحاظ سے موزوں ہوگا۔ اردو میں آج تک ٹائپ کے غیر مروج ہونے کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو کا نستعلیق خط ملک میں مرغوب ہے اور حقیقت میں ہے بھی خوبصورت نستعلیق ٹائپ مکمل طور پر اب تک تیار نہیں ہوا اور جب تک تیار نہ ہو لوگ ٹائپ کی طرف راغب نہ ہوں گے دوسری وجہ ٹائپ کے مروج نہ ہونے کی یہ ہے کہ ہمارا ملک بہت خوشحال یا امیر ملک نہیں اور ٹائپ کے کارخانے لیتھو کے کارخانوں سے بہت زیادہ سرمایہ چاہتے ہیں اور ٹائپ کی چھپائی پر لیتھو کی چھپائی سے زیادہ لاگت آتی ہے۔ اس لئے یہ تجویز دونوں صورتوں کے لحاظ سے چھپائی اور نسبتاً آسانی سے عمل درآمد کے قابل ہے کہ شروع شروع میں ٹائپ کی چھپائی کا تجربہ ایسے اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ کیا جائے جو تازگی اور پابندی اوقات کی خاطر نستعلیق خط کی خوشنمائی سے درگذر کریں اور ٹائپ کی چھپائی کے مصارف کی زیادتی کو بخوشی برداشت کریں۔

انگریزی عملداری کے آغاز میں کلکتہ میں بعض کتابیں ٹائپ کے حروف میں چھپیں مگر بدقسمتی سے وہ حروف نہ صرف خوشنمائی کے لحاظ سے ناقص تھے بلکہ ان کے پڑھنے میں بھی ذرا الجھن ہوتی تھی۔ اس لئے مقبول نہ ہوئے۔ سرکاری گزٹ کا اردو ترجمہ پنجاب اور صوبجات متحدہ میں مدت دراز سے ٹائپ کے حروف میں چھپتا ہے۔ اور سرکاری عہدہ دار اسے دیکھتے ہیں مگر اس کے ذریعہ بھی ٹائپ کا رواج عام نہیں ہو سکا۔ کیونکہ وہ بھی بہت آسانی سے پڑھا نہیں جاتا تھا اور نستعلیق خط کی عادی آنکھیں ٹائپ کے حروف کو قبول نہیں کرتی تھیں۔ سر سید احمد خاں مرحوم کی نگاہ دوربین نے آج سے مدتوں پہلے دیکھ لیا تھا کہ اردو کا کام ٹائپ کے حروف استعمال کئے بغیر نہیں چلیگا اور اپنی مسلمہ عاقبت اندیشی سے آج سے نصف صدی پیشتر ٹائپ کو رواج دینا چاہا تھا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق ٹائپ کے حروف میں چھپتا تھا اور علیگڑھ گزٹ کے حروف بھی اسی طرح کے تھے۔ مگر یہ کوشش زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ ایک تو اس لئے کہ وہ ان دنوں میں بہت ہی ابتدائی حالت میں تھی اور دوسرے اس وجہ سے کہ طرز وہی سرکاری گزٹ والے حروف تھے جن سے اردو خواں اصحاب اتنی مدت میں بھی مانوس نہیں ہو سکے۔

اردو میں ٹائپ پورا مقبول تو جب ہی ہوگا کہ نستعلیق ٹائپ عام طور پر تیار ہو۔ ہندوستان میں ایک جگہ نستعلیق حروف ڈھالنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں کسی قدر ناکامی رہی۔ حلقے جوڑ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے اور جوڑ بدنما رہتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے سنا کہ ایک جرمنی کارخانے میں نستعلیق حرف تیار ہوئے ہیں۔ مجھے شوق پیدا ہوا میں نے ان کو خط لکھا کہ مجھے نمونہ بھیجئے اور نرخ بتلائیے لیکن وہاں سے جواب آیا کہ جو حروف تیار ہوئے تھے سب فروخت ہو گئے اور نئے تیار ہونے پر بھیجے جائیں گے۔ جس کی نوبت آج تک نہیں آئی۔ ترکی میں نستعلیق حروف تیار ہوئے ہیں مگر جلی قلم کے عنوانوں کے لئے۔ ایسے نہیں کہ کوئی کتاب یا رسالہ پورا ان سے تیار ہو جائے۔ مختصر یہ کہ نستعلیق ٹائپ عام استعمال کے قابل ابھی کہیں میسر نہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ مستقبل قریب میں ہو جائے تو تعجب نہیں کیونکہ بڑے اور جلی حروف تیار ہو جانے سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ تھوڑی سی اور کوشش سے مکمل ہو سکتا ہے۔ لیکن اب وقت نہیں کہ ٹائپ کی تکمیل کے انتظار میں بیٹھے رہیں وہ مکمل ہوتا رہے گا۔ سر دست ضرورت یہ ہے کہ جیسا ٹائپ میسر ہو اسی سے آغاز کر دیا جائے۔ موجودہ نمونوں میں آسانی سے پڑھا جانے والا اور نسبتاً قابل قبول وہ ٹائپ ہے جس سے اکثر مصری اخبار عربی زبان کے چھپتے ہیں۔ وہ اردو میں خاصا کام دے سکتا ہے اور ہم جہاں تک اندازہ لگا سکتے ہیں موزوں و مقبول ہو جائیگا۔ کلکتہ کے انگریزی ہمعصر کامریڈ کے ایڈیٹر صاحب نے حال میں یہ اعلان کیا ہے کہ ان کا ارادہ ہے کہ دہلی میں کامریڈ کا دفتر منتقل کیا جائے اور وہاں دارالسلطنت میں قائم ہو کر [illegible] کی یادگار میں ایک روزانہ اخبار وہاں سے اردو زبان میں شائع کیا جائے جو مصری ٹائپ کے حروف سے چھپے۔ ہم اس تجویز کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے کامریڈ صاحب کی یہ عمدہ تجویز کامیاب ثابت ہوگی۔

حامد علی خاں

نیا ادب

(تبصرہ)

یہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول (لکھنوی ؟) کی کتاب ہے جو انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے شائع کی ہے۔ یہ دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو پنڈت صاحب نے گزشتہ تین چار سال میں وقتاً فوقتاً نئے ادب اور نئے ادیبوں کے متعلق لکھے اور جن میں سے بعض ہجرت سے قبل انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے "اردو" میں شائع ہوتے رہے۔ پنڈت صاحب نے نئے ادب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) افسانہ ناول اور ڈراما (۲) نئی شاعری (۳) تنقید۔ ان موضوعات میں سے پنڈت صاحب نے صرف افسانے اور شاعری پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔

پنڈت صاحب صرف کمیونسٹ ادیبوں کو "ترقی پسند" نہیں سمجھتے ان کے خیال میں ہر وہ نوجوان ترقی پسند ہے جو نئے رنگ کی شاعری یا افسانہ نگاری کرتا ہے۔ کول صاحب نے ابتدا میں اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ ترقی پسندوں کے کارناموں کو غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے جانچیں گے لیکن ان کے مضامین کو دیکھنے کے بعد کم از کم ترقی پسندوں میں سے اکثر لوگ یہی کہیں گے کہ ان کا یہ نیک خیال محض خیال ہی رہا ہے۔ مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ترقی پسندوں کو (بالعموم بے جا طور پر) سخت تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ پریم چند اور جوش کو ترقی پسند تو اپنے حلقے میں شامل کرتے ہیں اور شاید ان دونوں حضرات نے خود بھی کبھی نہ کبھی ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ لیکن چونکہ کول صاحب کے دل میں ان دونوں کی عزت ہے اس لئے وہ انہیں "ترقی پسند" نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ بلاوجہ ہوگا اگر شہیدوں میں یا سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں شامل ہوتے ہیں۔ راقم کا یہ مطلب نہیں کہ پنڈت کول صاحب کے مضامین بالکل غیر متوازن ہیں اور ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا یقیناً یہ کتاب ان لوگوں کے لئے مفید ہے جنہوں نے اب تک کسی وجہ سے نئے ادب کی طرف توجہ نہیں کی لیکن اب اسے سمجھنے کے آرزومند ہیں۔ اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ جن لوگوں کے افسانوں وغیرہ پر تنقید کی گئی ہے ان کی تحریروں کے بہت سے اقتباسات بھی اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب مفید اور زیادہ دلچسپ بن گئی ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں توازن کی کچھ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے مثلاً پریم چند کے لئے (جنہیں کول صاحب "ترقی پسند" نہیں مانتے) اس کتاب میں جس کا موضوع "ترقی پسند" ہیں ساٹھ صفحوں سے زائد وقف کئے گئے ہیں لیکن بہت سے ایسے ترقی پسندوں کو جنہیں کول صاحب بھی ترقی پسند مانتے ہیں صرف چند سطروں میں ٹال دیا گیا ہے۔

پنڈت صاحب نے "ترقی پسندوں" کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کچھ لوگ تو مارکس کے سودائی ہیں اور کچھ لوگ فرائڈ کے خبط میں مبتلا ہیں ان کے خیال کے مطابق آخر الذکر گروہ میں زیادہ تر پنجابی ادیب ہیں۔

اگرچہ ان دونوں گروہوں کے بہت سے افراد پنڈت صاحب کے زیر عتاب ہیں اور وہ ان کے ادب کی عریانی فحاشی اور کھوکھلے پن سے نالاں نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک بات جو کتاب میں بہت نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ پنجابی ادبا کی "فرائڈ زدگی" کے علاوہ ان کی "پنجابیت" بھی بالخصوص کول صاحب کے عتاب کا نشانہ ہے۔ بلکہ اس کتاب کو پڑھ کر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ پنجابی ہونا شاید بجائے خود ایک شرمناک بدقسمتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں پریم چند اور جوش کو نئے ادب والوں میں شامل کرنا کچھ زبردستی سی ہے بہر حال توجہ کے قابل یہ بات ہے کہ یہ

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمتہ نے پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا

جلد ۲

پیشرو ماہنامہ ملت اسلامیہ

ماہنامہ (دور نو)

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ اگست ۱۹۵۰ء

•

مخزن المخازن، ۶۳

(دیگر رسائل و جرائد کے اقتباسات)

چندہ سالانہ [illegible] ششماہی تین روپے فی پرچہ آٹھ آنے۔ ادارہ مطبوعات نوائے وقت۔ لمیٹڈ لاہور

مخزن

میرزا عبدالقادر بیدل کی مثنوی طورِ معرفت

(عبدالغنی)

شاعر کی زبان شعر کہتے وقت تخلیقی تجربے کا صرف وہ حصہ بیان کرتی ہے جو صوتی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ تخلیقی تجربے کے وقت جذبات احساسات اور خیالات میں جو تموج پیدا ہوتا ہے اس کی وسعتیں ناپیدا کنار ہوتی ہیں۔ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے سے اس تموج کے بارے میں محض اشارے ہی کر سکتا ہے اور اگر پڑھنے والا ان اشاروں کی مدد سے اپنے آپ پر بھی تخلیقی ہیجان طاری کر لے جو خود شاعر پر طاری ہوا تھا تو اس کا قلبِ ماہیت ہو جاتا ہے لیکن اس تجربے کے دوران میں وہ اپنے آپ کو بالکل ایک نئی مخلوق سمجھتا ہے اور اپنے ضمیر کے تار و پود کو یکسر مبدل پاتا ہے۔

اس مثنوی طورِ معرفت کو کہتے وقت میرزا بیدل پر ایک عجیب و غریب تخلیقی ہیجان طاری ہوا تھا۔ اس بات کا اندازہ آپ اس امر سے کر سکتے ہیں کہ کم و بیش بارہ سو اشعار کی یہ مثنوی صرف دو دن میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ واردات اور کیفیات میں جو طوفان بپا ہوا اس کے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ مثنوی کے خاتمے تک ہر تازہ شعر جذبات اور خیالات میں ایک نئے عروج کا اعلان کرتا ہے اور جوشِ بیان ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پھر بھی بیدل یہ شکایت کرتے ہیں کہ واردات کی فراوانی حدودِ شعر میں نہیں سما سکتی تو ایک حقیقی فنکار کی طرح تڑپ اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

زنگ گشت حقیقت ترنم ‏ ‏ ‏ بصد منقاری بالد بیانم

ادا سے شوخی ہشتے رنگ آفریں است   کہ ابر دستے طرب او سمر این است

کیا آپ اس حسنِ خیال کی داد دے سکتے ہیں وہ لبِ جام پر لعلِ نوخط کے ہلکے سے عکس کو قوسِ قزح کہتا کتنا لطیف خیال ہے وہ نگاہ کی اور نفس کی جنبش سے ایک نازک تار کی طرح اس کا معدوم ہو جانا یقینی ہے لیکن بیدل اپنی رنگین خیالی سے اسے حیاتِ دوام عطا کر دیتا ہے اور جامِ لالہ نے جنتِ نگاہ کا سامان مہیا کرتا ہے ۔۔۔۔ یہاں آپ اس بات کو نہ بھولئے کہ یہی نے چیدہ چیدہ اشعار جستہ جستہ مقامات سے لئے ہیں۔ اور اگرچہ گلدستہ اپنی جگہ بہت حسین ہوتا ہے لیکن کھلے ہوئے پھولوں کی جو بہار گلستاں ہی میں ملتی ہے وہ گلدستے میں کہاں؟ اس بہار کو دیکھنے کے لئے خراماں خراماں سیرِ گلستاں ہی کے ارادے سے نکلنا چاہئے۔

اس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ بیدل حسن صرف رنگ تک محدود نہیں ؎

برقِ گفتگوئے آتشیں خود   داغِ حسرتے می سوزی از دود
گذشت آں برق اے غافل تو تحوید   چراغانِ دگر ہم می تواں دید
بچشمت ہر کجا خشت و سفالیست   زیارت گاہِ عشقے و جمالیست

صحیح ذوقِ جمال خشت و سفال کو بھی مرقعِ حسن سمجھتا ہے۔ بیدل نے پتھروں پر نگاہ ڈالی تو ان میں سے اسے شراروں کے عجیب پرنیاد جھلکتے دکھائی دیئے کہتے ہیں ؎

بلوا انتظار ماست دل تنگ   پرنیادِ شرر در شیشۂ سنگ
شویم آتش زنِ شوقِ خرامش   برآریم از طلسمِ انتظارش
شررہ در سنگ پر قیمت غنودست   چراغانِ تصور تیز سوز است

بیدل کے نزدیک پتھر کے ہر ٹکڑے میں ایک ہنگامہ مستور ہے جس کا آنچل ایک طرف سرکا کر اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے ہر پتھر کی ایک تصویر خود نظر آتی ہے اور یہ احساسِ جمال کا کمال ہے۔

لیکن بیدل کی حسن آفرینی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ حسن ہی کیا جو زندہ و بیدار احساسات سے عاری ہو۔ بیدل کا تخیل حسنِ کامل کی تلاش میں پیکرِ آب و گل کو زندگی کی رعنائیوں سے معمور دیکھتا ہے ؎

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جانیست   نہاں در ہر کفِ خاکے جہانیست

فلسفۂ جدید سنگ و خشت کو بھی توانائی کا مظہر سمجھتا ہے۔ بیدل ایک بلند پایہ فلسفی بھی تھا لیکن وہ اس نظریئے تک اپنی حسن آفرینی کی بدولت پہنچا۔ اسے پتھروں میں بھی شدید احساس کی فراوانی نظر آتی۔ اسی احساس کے باعث پتھر بھی اسے درد کی ٹیسوں سے مضطرب دکھائی دیتے ہیں ؎

بغفلت گاہ ایں در کاسنجہ سرور (؟) کہ دارد درد اگر سنگ است بیدرد
نالِ نالہ در آب و گل کیست؟   شرر پروردۂ داغِ دل کیست؟
بجوشِ چشمہ چندیں چشمِ نمناک   ناحضائے کہ افتادہ است بخاک؟

دل خون کہ نقش دل بستہ است؟ کہ صد زخم باید دل نشستہ است؟
داغ کیست مست گریۂ ابر؟ کہ دارد زیر تیغ سینہ امان جستہ؟

ان شاعرانہ توجیہات کا سحر ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارا دل شاعر کی رائے سے متفق ہو جاتا ہے۔

شاعر کا سینہ تجلی زار حسن ہوتا ہے۔ حسن فطرت کی خامیاں وہ اپنے سینے کے آب و رنگ سے دور کرتا ہے۔ اس کا تخیل فطرت کی ناہمواریوں کو ہموار کرتا ہے، جسے عاری نہیں رہنے دیتا۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سینے کا آب و رنگ بھی مظاہر فطرت کو وہ حسن مثالی عطا نہیں کر سکتا جس کی تلاش ہوتی ہے۔ حسن گریز پا ہے۔ جب شاعر دیکھتا ہے کہ مشہودات سے حسن ہمیشہ وراء الوراء رہتا ہے تو وہ اپنے تخیل سے کتابِ فطرت کے اوراق متناہی میں بکھیر دیتا ہے اور اس طرح جمال و جلال کے پیکر مثالی کو مہیا کر جاتا ہے۔ کو ہیر اشتے میں مناظر جب بیدل کے ذوقِ جمال کی تسکین نہ کر سکے تو اس نے ایک خیالی جنت آباد کرنے کی سعی کی ۔

چہ گلزار آیت صنع الٰہی حضورِ عالم عرفاں نگاہی
تجلی گاہ برقِ طورِ اعجاز فروغ آبادِ شمع جلوتِ ناز
بہارش بسکہ تخم رنگ می کاشت ہوا آئینۂ صبح شفق داشت
فضائیش بسکہ گرداز جوش گل تنگ فتادے سایۂ گل بر سر رنگ

اگر طوفانِ رنگ و نور دیکھنے کی آرزو ہو تو اس طویل بند کا مطالعہ کیجیے۔ جس طرح تاج محل مغل آرٹ کا انتہائے کمال ہے۔ بیدل کا آرٹ بھی اس گلزار کے بیان میں اپنے عروج کے انتہائی نقطے پر پہنچ گیا ہے۔

ایک گلبدن اور شیریں ادا اگر چادر سفید بھی زیب تن کیے تو چادر کی سفیدی بھی رنگینیوں کا محشر بپا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ایک حسین خیال جب سادہ اشعار میں بیان ہوتا ہے تو اشعار کی سادگی بھی آئینہ دارِ رنگینی و زیبائی بن جاتی ہے۔ مثنوی طورِ معرفت کو دیکھیے۔ سادہ سی رواں بحر ہے انداز بیان نہ مرصع ہے نہ اس میں شوکت و تجمل کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن لطیف و جمیل خیالات نے تمام اشعار کو ایسی رنگینی اور رعنائی عطا کر دی ہے کہ کیا کہنا۔ تشبیہات کو دیکھیے ایک سے ایک اچھوتی اور ایک سے ایک زیادہ رنگین۔ طاؤس کو محو پرواز دیکھ کر بیدل بیان میں عجب حسن پیدا کر دیتے ہیں ؎

ز طاؤسانِ رعنا گاہِ پرواز بہشتے بر ہوا ہمد آشیاں ساز

تراکیب اور تشبیہات میں جدت، ندرت، اور دلفریبی جو بیدل کے ہاں ملتی ہے، بے مثل ہے اور پر لطف یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان کے لئے بیدل کو فکر عمیق کی ضرورت نہیں پڑی۔ کہیں آورد کا نام و نشان نہیں اور یہ اپنی تخلیق کے ساتھ خلوص کے عمق اور روحانی وابستگی کا سبب پتا دیتی ہے۔

بیدل جب شفق کی رنگینیاں بیان کرتا ہے تو اس کی جاں ستانی کا ذکر کرتا ہے اور تخیل کی لطافت اپنی معراج پر پہنچ جاتی ہے جب کہتا ہے کہ ہوا نے دو عالم کا آب و رنگ اور شعلہ و دود حل کر کے گردوں پر چھپا دیا ہے۔ طبیعت اس بیان سے پھر بھی سیر نہیں ہوتی۔ اپنے عجز کا اظہار ان نادر الفاظ میں کرتا ہے کہ ناطقہ انگشت بدنداں ہو جاتا ہے ؎

بیاں در وصفِ او ناقص کند است عجب دامن مزن آتش بلند است

[illegible] مصرعے پر فصاحت ختم ہو جاتی ہے ــــــ لیکن بیدل فصاحت اور بلاغت کا وہ سرچشمہ ہے کہ جس کی لطافت [illegible] کا جوش ہر حال کبھی ختم نہیں ہوتا جیسے "دامن حزن آتش بلند است" کی مرزونیت پر طبیعت جھوم رہی ہوتی ہے کہ وہ اختصار کے بعد فوراً بیان [illegible] جاتی ہے ؎

گدا می بیدل ایں جا پرفشاں شد　　　کہ خونش رفتہ رفتہ آسماں شد

میری طاقت نہیں کہ "خونش رفتہ رفتہ آسماں شد" کا حسن ناظرین پر ظاہر کرسکوں !! ــــــ اسی طرح پوری کی پوری مثنوی حسنِ بیان کا شاہکار ہے اور لگا یہ جاتا ہے کہ صرف مطالعہ سے رہی ہے۔

لگے ہاتھ آپ جدتِ خیال اور حسنِ بیان کا ایک اور نمونہ بھی دیکھ لیجئے۔ یہ کہنا مطلوب ہے کہ بہار دنیا میں آسانی سے اپنی محفل رنگیں آراستہ نہیں کرتی، صریرِ خامہ یوں نوائے سروش بن کر ہمارے کانوں تک پہنچتی ہے ؎

پس از عمرے قضا می بندد ایں نقش　　　بصد خونِ جگری خندد ایں نقش

ہوا ایں جا نفس دزدد چہ مقدار　　　کہ بوسے گرددازطبعش نمودار

بصد خاک آب بیتابی فرد شد　　　کہ گردد خون وبارنگے بجوشد

چمن عمرے فسردن نقش بندد　　　کہ یک لب در نقابِ گل بخندد

یقیناً بیدل کے اندازِ بیان کے سلسلے میں میری طرف سے ایک بہت بڑی خامی رہ جائے گی اگر میں یہ نہ کہوں کہ وہ خیالی اور غیر محسوس چیزوں کو بھی نظر پرور محسوس اشیاء کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور پھر خوبی یہ ہے کہ موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء کی طرح نہ ابہام ہے اور نہ طلسم تخیل۔ محمد بابا احیاء الگزار کے ذکر میں مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے ؎

دمے کز وصفِ رنگش پرفشاں بود　　　نفس طاؤسِ فردوسِ بیاں بود

حدیثِ سبزہ اش زیبِ بیاں شد　　　سخن تا گل کند ترقی حیاں شد

ز جوشِ تابش اگر گیرد سخن تاب　　　چکد از جبہۂ حسنِ بیاں آب

نفس کو طاؤسِ فردوسِ بیاں کہنا، سخن کا قرتی سبز پوش بن جانا، اور حسنِ بیاں کی جبیں سے آبدار قطروں کا نمودار ہونا میرے دعوے کی تائید کے لئے کافی ہیں ــــــ یہ مبالغہ ہی سہی لیکن آپ انصاف نہ کریں گے اگر آپ کہیں گے کہ مبالغہ حسنِ بیاں کی جان نہیں۔ شاعر مبالغہ کی اہمیت سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کی جائز حد کیا ہے۔

شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے کے شعراء تازہ گوئی کے لئے مشہور رہے۔ تازہ گوئی میں بیدل کو جو ملکہ حاصل تھا۔ اس کا اندازہ طبعِ سلیم مطالعہ سے کرسکتی ہے لیکن بیدل اپنی معنی آفرینی کو اپنا امتیازی وصف سمجھتے ہیں۔ ایک ہی بات سے نئے نئے معانی پیدا کرتے ہیں اور معنی آفرینی کا وہ جوش ہے کہ ایک جابک دست مصور کی طرح موقلم کی خفاسی جنبش سے ایک حسین منظر دکھا کر اور پھر ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے [illegible] تشبیہات سے کام لے کر وہ لائے معانی بکھیرنے لگ جاتے ہیں اور آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان معانی کی بہار کو دیکھے

عبدالغنی

[illegible] نظارہ سے دل و نگاہ کو سیرابی کرتے ہے۔ جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ بیدل اسی لئے جہاں ان اشیا کو ایک عالم [illegible]
سکتا ہے گویا ایک طرف جلوہ ہائے طرب وحدتِ نظارہ سمٹتے ہیں اور دوسری طرف تکلیم کا مطلب کلام موجود ہے۔ مجھے بیدل کے ہاں حسن آفرینی اور
نظارہ یوں ہم آہنگی کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک شئے دوسری کے اندر تحلیل ہو کر رہ گئی ہے اور ایک کو دوسری سے جدا کرنا محال ہے۔ [illegible]
لا بیدل کو بھی ہر دم احساس ہے اور اس مثنوی میں بھی اگر ایک جگہ کہتے ہیں ع

بہر سو جلوۂ نظارہ تیز است

تو دوسری جگہ فرماتے ہیں ع

ز تمیزِ بینش معانی جنسِ بیرنگ

بیدل کے جوشِ معانی کا رنگ دیکھئے۔ نمی کی بہتات کا ذکر کرتے ہیں ؎

چو برگِ گل در و دیوار نم خیز — ز سیرابی زمیں یک جام لبریز
لبِ بام از رطوبت ابرِ معراج — حصیرِ صحن طوفان بافِ امواج
بہ نقش گر نماید خامہ اقبال — نگردد خشک تحریرش بصد سال
ز سیرابیش گر حرفے نوشتی — رواں بود چو سطرش مانند کشتی
وضوئے گر کند زاہد ازیں آب — عصا فوارہ گردد سبحہ گرداب
دریں وادی کہ طوفاں اوج دارد — نہ تنہا جادہ صد کلمِ موج دارد
کہ ایں جا تا نشانِ پا حبابیست — برنگِ چشمِ عاشق ہیچ آبیست

زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اگر کوئی شخص اس وحدت کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی ایک کو لے کر صرف اسی میں محو ہو جاتا ہے اور ادھر ادھر نگاہ نہیں دوڑاتا تو یہ اس کی تنگیٔ ظرف کی دلیل ہے۔ ہمہ گیر نگاہ اس وحدت کو غیر منقسم صورت میں دیکھتی ہے اور اس کے ایک ایک جزو پر توجہ صرف کرتے ہوئے باقی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتی۔ جہاں یہ ہمہ گیری نظر نہیں آتی وہاں در اصل تفکر کی کمی ہوتی ہے۔ خیالات محدود ہوتے ہیں۔ اسرارِ کائنات کی طرف نگاہ کبھی متوجہ نہیں ہوتی۔ یاد رہے کہ فنکاروں اور ادنیٰ درجے کے شعراء کا حال ہے۔ [illegible] کے خیال کے مطابق ایک عظیم المرتبت شاعر ایک عظیم الشان مفکر بھی ہوتا ہے۔ اس کی پختگیٔ فکر اس کی تخلیق اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے اور ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ اس کا فن حیات کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتا ہے۔ وہ فن بحیثیتِ فن کا قائل نہیں [illegible] وہ ذہنی عیاشی سے تعبیر کرتا ہے۔ بیدل ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے جہاں حسن کے جلوؤں کا دلدادہ ہے، بیان میں دلکشی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسالیبِ بیان میں جدت اور دلفریبی پیدا کرتا ہے، لفظی اور معنوی رعایتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے، وہاں کہیں نہ کہیں اسرارِ کائنات بھی کھولتا چلا جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ دقیق سے دقیق فلسفیانہ خیالات بیان کرتے وقت بھی شاعرانہ [illegible] نہیں جانے دیتا۔

انسان جب دنیا میں نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے کثیر التعداد مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سے ایک مختلف اور متضاد۔ کہیں آفتاب کی ضیا فشانی ہے تو کہیں راتوں کی ہمہ گیر تاریکی۔ ادھر باغ و راغ ہیں تو ادھر بے آب و گیاہ صحرا۔ ایک طرف پہاڑوں کے بلند ہوتے ہوئے سلسلے ہیں تو دوسری طرف ہموار و طویل میدان۔ اس اختلاف اور تجدد میں اسے کسی جگہ وحدت نظر نہیں آتی۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔ اس وقت بیدل اس کی یوں رہنمائی کرتا ہے ـــ

دوئی حرف است و تمثال جو میم — کہ در صد مطلب نایاب مرقیم
بدین تمثال یا شخصے است موجود — کہ صد تمثال پیدا کرد و نمود
لباسِ جلوہ بیرون از قیاس است — دو عالم شوخیِ رنگِ لباس است
تجدد کسوتِ شانِ وجود است — ہمین است آنچہ سلطانِ نمود است

یہ وحدتِ وجود نہیں جیسا کہ صد تمثال پیدا کرد و نمود سے واضح ہے یہ وحدتِ شہود ہے۔ تمام مظاہر حروف کی مانند ہیں جن سے ایک معنی خیز عبارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک بے مثل وجود کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔ اسی مقدس وجود کی شانِ زیبائی ہے جو ہر چیز سے ہویدا ہے ـــ

ہمان برقے کہ از جوششِ لطافت — بگل رنگ است و در آئینہ حیرت
برنگِ قطرہ از ابر آشکار است — بطبعِ سنگ نامِ او شرار است

اس طرح بیدل کثرت میں وحدت پیدا کر دیتے ہیں۔

انسان اس دورِ حیرت سے نکلتا ہے تو ایک اور دام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ گلہائے رنگا رنگ اس کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ملبوسِ غنچہ و سنبل اسے اپنا والہ و شیدا بنا لینا چاہتے ہیں۔ شبِ ماہ کی ضیا گستری اپنے جلووں سے اسے مدہوش کر دیتی ہے۔ اس کی نگاہ حسن کے ہر منظر کی طرف اٹھتی ہے۔ وہ اگر نگاہ نہیں اٹھاتا تو اپنے وجود کی طرف۔ اس طرح وہ اپنے حسنِ عالم فریب سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے۔ بیدل انسان کو اس کی اپنی رعنائیوں کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں ـــ

قضا روزیکہ در بنیادِ امکان — ز شورِ لالہ و گل ریخت طوفان
مرا ہم رنگ و بوئے دلبری داد — برعنایانِ گلشن ہمسری داد
زبہرِ بزمم ہزار آئینہ در پیش — ولے من بے خبر از جلوۂ خویش

اس بے خبری کی بنا پر اپنی ذات کے ہزارہا جلوے اس کی آنکھوں سے مستور رہے۔ انسان خوبانِ چمن کا نظارہ کرتا رہا اور انہی کے عشق میں گم رہا۔ بیدل انسان کی شکایت کرتا ہے کہ اس کی نگاہ اسے دوسروں کا جلوۂ حسن تو دکھاتی رہی، مگر اسے اپنے جمالِ جہاں آرا سے خبردار نہ کر سکی۔

اس لئے ـــ بجرمِ امتیازِ غیر داغم — دگر نہ من ہم از خوبانِ باغم

وہ اسے یہ زریں الفاظ میں کہتا ہے کہ تم ایک رازِ سربستہ ہو اپنے آپ کو پہچانو ـــ

معمائی معمائی معما — اگر خواہی کشودن چشم بکشا

عبدالغنی

خودشناسی کے لئے آنکھ کھولنا لازم ہے چشمِ بصیرت سے اگر دیکھا جائے تو معمولی سی بات سے ہزاروں [illegible]

بہر سازے کہ چشمِ شوق شد باز — برنگِ نغمہ شو خواہی آں عطر

تامل ہر کجا آئینہ گردید — بطبعِ قطرہ گوہر می تواں دید

تامل ازنے سحر آفریں است — جہانے کش نہایت نیست این است

نگہ را تا بہ یک جلوہ پسند — قدح کم نیست لیکے غیاز خند

قناعت پسندی اور طبیعت کی افسردگی ہزاروں حقائق کو مستور رکھتی ہے اور کائنات کی رونق ختم کر دیتی ہے

گر از چشمِ تو پوشیدہ بے نگاہی — نشیند انجمن ہا در سیاہی

دمے کآئینہ پنہاں گشت و رنگ — ستم بر جلوہ رفت اے بے نیرنگ

اس لئے بیدلؔ انسان کو سمجھاتے ہیں کہ نگاہِ پرشوق کے ساتھ دلِ بیتاب بھی طلب کرنا چاہئے

شوی تا محرم خود دل طلب کن — بہ لیلیٰ تا رسی محمل طلب کن

لیلیٰ کے لئے محمل چاہئے اور وہ محمل دل ہے۔ حسنِ لیلیٰ تو ہزاروں نیرنگیوں کا آئینہ دار ہے لیکن عشق کا مقام بھی کمتر نہیں

اگر حسن ایں قدر نیرنگ دارد — جنونِ عاشقاں ہم رنگ دارد

جنونِ عشق کی رنگینیاں خاص جاذبیت اور خاص افادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے بے خبر نہ رہنا چاہئے۔

خودشناسی بہت بڑی دولت ہے لیکن خودگدازی کے بغیر اس میں ایک بہت بڑا خلا رہ جاتا ہے۔ خودگدازی سے دل میں غمگسار ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ورنہ دل پتھر کی طرح سخت رہتا ہے اور کائنات بھی سنگین نظر آتی ہے

دلِ سنگیں گداز و شیشہ بار — وگرنہ دہر کہسار است کہسار

بیدلؔ کہتے ہیں انسان کے دل میں سنگدلی پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب افراطِ زر ہے

اگر منعم بہ تمکیں گشت مغرور — بجرمِ ہوش معذور است معذور

کہ زر دار است و زر از سنگ خیزد — ز سنگ آخر گرانی رنگ ریزد

لیکن بیدلؔ زر کو برا نہیں کہتے۔ اگر یہی زر ایک عالم کی نفع رسانی کے لئے صرف ہو تو اس کی ماہیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ اس وقت مومیائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو اگرچہ پتھر سے نکلتی ہے لیکن زخموں کے لئے مرہم بن جاتی ہے۔ اس وقت صاحبِ زر بھی متواضع بن کر محراب کی طرح مسجودِ عالم ہو جاتا ہے۔ بیدلؔ کو تو صرف زر پرستی سے مخالفت ہے

اگر طبعِ تو سیم و زر پرست است — پرستی رو کہ دنیا سخت پست است

زر پرستی انسان کو پست فطرت بنا دیتی ہے اس لئے بیدلؔ حرص و ہوا اور طمع کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ انسان خود ہی اتنی گراں قیمت ہے کہ دنیا بھر کا مال و زر اس کے مقابلے میں پاسنگ بھی نہیں۔

اگست ۱۹۵۸ء

[illegible] صفات مثلاً کسرِ نفس کے علاوہ بیدل ہم سے کہتے ہیں کہ گوشہ نشینی چھوڑ کر حرکت اور جد و جہد کو اپنا شعار بنا [illegible] ملی کوششوں میں [illegible] معلوم ہے جد و جہد کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

مدآں معرض کہ باشد چہرۂ کار   گر از کوہ کارے نیست دشوار

بہر کارے کہ جہدش راہبر بود   عرق از چہرہ تا ریزی گہر بود

یہ تمام مطالب مختلف مناظرِ قدرت بیان کرتے ہوئے ضمناً آگئے ہیں۔ الفاظ اور تشبیہات وہی ہیں جن کا تعلق کوہ بیراٹ کے ماحول سے تھا۔ زر پرستی کا ذکر چاندی کی کان سے چھڑ گیا جو کوہ بیراٹ میں موجود تھی۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے عہد کے عیش پرست سنگدل امراء کو تنبیہ ہو جائے جو اپنی بداعمالیوں کے نتائجِ بد سے بالکل غافل ہو چکے تھے۔ اسی طرح جب حباب کا ذکر کرتے ہیں تو بہت سے مسائلِ تصوف بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ حباب ایک صوفی کی طرح سرتاپا حیرت ہوتا ہے۔ شرم و حیا کی بدولت ضبطِ نگاہ کا پابند ہے۔ اگر اس کی نگاہ کسی طرف اٹھتی ہے تو صرف اپنی حقیقت کے مشاہدے کے لئے۔ صفائے سینہ جو حباب میں موجود ہے اور کہاں۔ اس کائنات کی تمام دلکشیوں اور دلچسپیوں کے درمیان رہتے ہوئے ان سے بے نیاز ہو کر وہ بڑی سبک روی سے اپنا وقت گزارتا ہے۔ اور ان تمام خوبیوں سے بالاتر وہ اپنے اندر نفسِ سوزاں رکھتا ہے جو ایک صوفی کا امتیازی وصف ہے۔ یہ اندازِ بیان رمزیت کی معراج ہے اور مشرقی شعراء اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

الغرض اور بھی بہت سے مطالب ہیں جنہیں میں خوفِ طوالت سے بیان نہیں کر سکتا لیکن دیکھئے کیسے حیات بخش اور حیات افروز خیالات ہیں۔ فکر و نظر کو کیسی بلندی عطا کی گئی ہے۔ تعلیمات تمام کی تمام مثبت ہیں۔ خار و خس ہٹا کر ہمارے سامنے ایک ایسا دلفریب اور روح پرور راستہ کھول دیا گیا ہے کہ طبیعت اس کو اختیار کرنے پر خود بخود مائل ہو جاتی ہے۔ خیالات میں اقبال سے مماثلت ہے۔ اسی فطری مناسبت کی بناء پر علامہ مرحوم بیدل کے بڑے مداح تھے۔ اور نوجوانوں کو بیدل کے مطالعے کی دعوت دیتے تھے۔

لیکن افسوس ہے کہ اپنے زمانے میں بیدل کی حقیقت سے لوگ نہایت ہی قلیل تعداد میں باخبر ہو سکے۔ حالانکہ ان کی تمام نظم و نثر کا صرف ایک ہی منتہائے مقصود تھا ــــ انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کر کے اسے دو عالم کی سروری کے قابل بنانا ــــ لیکن انسانی طبائع بری طرح بگڑ چکی تھیں۔ انہوں نے جب اپنے عہد کے انسانوں کے حالِ زار پر اپنے آپ کو تنہا گریہ کناں پایا تو اسی مثنوی میں بصد تاسف کہا ؎

کہ می نالی و کس محرم نوا نیست   بحرفت ہیچ گوشے آشنا نیست

ان کے اپنے عہد میں سرخوش نے ان کی نظم کو دیکھا تو زیادہ سے زیادہ ہم طرح بننے کی کوشش کی اور شیخ علی حزیں نے جب ان کی نثر کو پڑھا تو کہا "فہمم نمی آید مگر مراجعتِ ایراں دست دہد برائے ریشخندِ بزمِ احباب رہ آوردے بہتر ازیں نیست" لیکن بیدل کے بعد ایک صدی گزرنے پر جب غالب نے اسی نثر کا قدردان نگاہوں سے مطالعہ کیا تو اس سے استفادہ کر کے ایک جدید طرزِ نگارش کا موجد بنا۔ اور جب ایک صدی مزید گزر گئی تو اقبال نے بیدل کے کلام سے ایسے اسرار سیکھے کہ جمشید کا ہم نشین بن گیا۔ اسی طرح ہر صدی کے خاتمہ پر جب کبھی کوئی مجتہدِ فن اور بلند فطرت حکیم پیدا ہوگا تو وہ بیدل سے فیضیاب ہو کر اپنے عہد آفریں کارنامے سرانجام دے گا۔

عبدالغنی

اگست ۱۹۵۷ء

خلیفہ عبدالحکیم

کوزہ گرِ دہر

جو دہر ہے جام جم بناتا
ہر روز نئے صنم بناتا

خود اپنے ہی جام پھوڑتا ہے
ہر کہنہ صنم کو توڑتا ہے

نجم و مہ و آفتاب ساغر
ٹوٹے صفتِ حباب ساغر

میخانے میں جام نو بنو ہیں
دنیا میں نظام نو بنو ہیں

ہستی کی سرشت میں ہے تغییر
ہر روز نئی ہے اس کی تعمیر

گُل پچھلی بہار کے کہاں ہیں
سب پہلے حسین بے نشاں ہیں

ہر لمحہ نئی ہے اس کی تحریر
دیتا ہے مٹا بنا کے تصویر

ہر رنگ پہ پھیرتا ہے پانی
اوّل سے بھلا ہے نقشِ ثانی

ہستی کو جمود سے ہے نفرت
آئین و قیود سے ہے نفرت

قائم رہا دیر تک جو اک رنگ
وہ رنگ بدل کے بن گیا زنگ

آئین ہے زندگی کا تجدید
یعنی ہے دلوں کی موت تقلید

مت روک حیات کی روانی
سڑتا ہے ضرور بند پانی

دریا کبھی دام میں نہ آیا
فرق اس کے خرام میں نہ آیا

یہ دہر کی سنّتِ کہن ہے
اصلاح ہمیشہ بت شکن ہے

اگست ۱۹۵۰ء

"غرۂ شوال اے نورِ نگاہِ روزہ دارا"

مہِ صیام ہے میرے لئے مہِ شوال
مئے نشاط سے خالی ہے میرا جامِ سفال

وہی ہے تیرگی تام ہر سحر ہر شام
کہ میرا بخت ہے کافر کا نامۂ اعمال

غضب ہے خاطرِ ناشاد و رنگ تنگِ الم
ستم ہے جانِ حزیں اور گونہ گونہ ملال

اسی طرح سے بسر کر رہا ہوں لیل و نہار
اسی روش سے گزرتے ہیں ہفتہ و مہ و سال

وہ دل کہ عیش و نشاط و طرب کا خوگر تھا
غمِ زمانہ سے ہے آج خستہ و پامال

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا معمّا ہے
کہ مے حرام ہے لیکن غمِ زمانہ حلال

وہ شور بخت ہوں اڑ جائے مے سے رنگِ طرب
میسّر آئے اگر مے مجھے بفرضِ محال

مٹا دیا ہے زمانے کی چیرہ دستی نے
زمانہ حضرتِ اکبر کا وہ جمال و جلال

از سید فیاض محمود

"تیرے بنا..."

(افسانہ)

وہ چل دی۔ سر جھکائے، خاموش، چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتی وہ چل دی۔

نسیم صبح چلی ہلکی ہلکی پھوار پڑی۔ آسمان کی سبک نیلاہٹوں نے کروٹ لی، زمین نے دم سادھ لیا۔ کائنات سوگئی [illegible] اپنی خوشبو بنا بھول گئے۔

موتیا رنگ کے ریشمی لباس میں اپنے نازک جسم کو لہراتے، نادانستہ طور پر اپنے گوشوں کو شباب کے بوجھ سے جھکاتے، وہ گلاب کی انتظار میں مستی سے ناآشنا، محبت کے دکھ سے ناواقف، فراق کی آگ سے نامانوس، عشق کی حقیقت سے بے پرواہ، گھاس کو روندتی، باغ کی رنگینیوں سے بیزار، حسن کے نزدیک وہ اس کی لگن سے پریشان، اس کے تقاضوں سے مضطرب، اس کی لجاجت سے عاجز، اس کی تڑپ سے گھبرا کر اسے چھوڑ گئی۔ وہ وہاں سے چل دی اور احسن اپنے سب عقلی دلائل بھول گیا۔ وہ عقل کا پجاری، وہ خدا یا تیت کا دشمن، وہ تہذیب یا ج معاشی زندگی کو عقلی میزان میں تولنے کا عادی، وہ بحث مباحثوں کا رسیا، وہ علمی مبارزتوں کا عاشق، وہ مباہلوں کا سودائی، وہ استدلال کا وہ کرید اور تحقیق کا شائق، بچوں میں بیٹھا، یہ نہ سمجھ سکا کہ رضیہ اسے چھوڑ کر کیوں چل دی۔

آج صبح وہ اس سے کہہ رہا تھا "معمولی سی بات ہے۔ معمولی! بالکل صاف۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میں تمہیں عرصے سے چاہتا ہوں۔ تم نے کہا ہے تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔ تم کسی اور کو پسند نہیں کرتیں جب کسی وقت تمہارا دل اور باتوں سے اکتا جاتا ہے تو تم مجھی کو یاد کرتی ہو۔ اکثر تمہاری بہنیں، تم کہتی ہو، تم سے مذاق کرتی ہیں —— میرا نام لے لے کر تمہیں چھیڑتی ہیں۔ ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تم کو بھی مجھ سے پیار ہے۔ تم بھی مجھ کو چاہتی ہو۔ اسی کو محبت کہتے ہیں کیوں؟ محبت کسی اور چیز کو کہتے ہیں؟"

"شاید"

"شاید کیوں، محبت کی تعریف اور کیا ہو سکتی ہے۔ شاعروں پر نہ جاؤ۔ تمام جذباتی قسم کے آدمی ہوتے ہیں ان کا اعتبار نہیں۔ عقل سے کام لو۔ بتاؤ محبت اور کسے کہتے ہیں۔"

"معلوم نہیں"

"یہ کج بحثی ہے، مسکراتی کیوں ہو؟ میں تم سے فقط یہ پوچھتا ہوں —— کیا کسی کو پسند کرنا —— کہو، تم مجھے پسند کرتی ہو نا"

"ہوں ہوں ہوں!"

"پھر کیا ہے۔ مجھے پسند کرتی ہو۔ مجھے یاد کرتی ہو۔ کسی اور کا خیال بھی تمہیں نہیں اور پھر بھی یہ نہیں [illegible] محبت۔

نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کہیں لڑکا باغ کی ایک روش سے فلم کا یہ گیت گاتا ہوا گزر گیا: "تیرے بنا لاگے نا ہیں مورا جیا" رضیہ اس کی طرف منہ اٹھا کر اس کی آواز میں گم ہو گئی۔ احسن بولتا گیا۔ وہ دلیل سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ رضیہ کو اس سے محبت ہے۔ رضیہ نے چونک کر اس سے پوچھا "کیا کہہ رہے تھے"

"تو کیا تم سُن نہیں رہی تھیں؟"

"نہیں تو! تم نے سنا وہ لڑکا کیا گا تا جا رہا تھا؟"

"کیا گا رہا تھا؟"

"چلو جانے دو۔ اچھا بتاؤ تم کیا کہہ رہے تھے۔ اب چلیں نا۔ دیر ہو گئی ہے امی کیا کہیں گی؟"

"مگر تم نے میری باتوں کا جواب تو دیا نہیں؟"

"کن باتوں کا؟"

"کن باتوں کا! میں کیا کہہ رہا تھا تم سے؟ کیا تم نے ایک بات بھی نہیں سنی؟"

"سنی کیوں نہیں" وہ گھاس پر بے پرواہی سے پیٹ کے بل لیٹ گئی۔ اس کی پتلی سی کمر زمین سے لگ گئی اور اس کے جسم کی گولائیاں اُبھر آئیں۔ احسن باتیں کرتا رہا۔ رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ اپنے منطقی ترکش کے تمام تیر اس پر چلاتا رہا . . . .

"محبت ایک جذبہ ہے۔ اور جذبوں کی طرح اس میں جنسی عنصر ضرور غالب ہے مگر بیشتر حصہ اس میں طبیعتوں کی ہم آہنگی ہے، دماغوں کا ملاپ روحوں کا اتصال، یہ کوئی سفلی جذبہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ہی محبت کرتی ہو۔ میں تمہیں پانچ سال سے جانتا ہوں۔ میں تمہارے ہر جگہ پھرا ہوں۔ سینما دیکھے ہیں۔ پکنکیں کی ہیں۔ دریاؤں پر کشتیاں چلائی ہیں، تم میرے ساتھ رہنا پسند کرتی ہو۔ کسی اور سے تمہیں دلچسپی نہیں پھر بھی یہ کہتی ہو کہ تمہیں معلوم نہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا . . . . ."

ایک شوقین مزاج نوجوان سائیکل چلاتا اپنی دھن میں گنگناتا ان لفظوں کو دہراتا پاس سے گزر گیا: "سنا دو محبت کے نغمے سنا دو۔ میرے دل کی دنیا کو رنگین بنا دو" رضیہ نے آنکھیں بند کر لیں وہ کسی خیال میں کھو گئی۔ محبت اس کے نزدیک ایک عجیب سی چیز تھی! میٹھی، پرسوز، پردرد ایثار و ایمان، ایقان سے بھری ہوئی۔ زندگی میں سب سے عزیز، سب سے قیمتی، سب سے نرالی چیز! محبت شوق اور ایثار، لگن اور جستجو سراغ پانے، کھو جانے اور مل جانے، سبھی چیزوں سے ترکیب پائے ہوئے ایک رنگین نغمے کا نام تھا۔ احسن بہت اچھا آدمی تھا۔ پڑھا لکھا ذہین، ذکی، قابل اعتماد، مہذب، شائستہ، خوش اخلاق، باتوں میں تیز مگر برتاؤ میں شرمیلا، ناجائز اور جائز باتوں میں تمیز کرنے اور رکھنے والا ہم نشیں اور ہمدم، مگر ہمراز نہیں! وہ جذبات سے خائف، شاعری سے لرزاں، عقل کا پرستار، ہر چیز کو قاعدے اور کلیے پر پرکھنے والا، حقیقت شعار، معتبر، ہر طرح سے پسندیدہ، ابا کو پسند، اماں کو پسند، بھائیوں کو پسند، بہنوں کو پسند، بے عیب، بہت ہی بے عیب! پاکیزہ ذہن کا مالک، بہت ہی پاکیزہ خیالات کا مالک! حسن سے بے پروا، عشق سے بیگانہ، وجد سے ناواقف . . . .

وہ پیٹ کے بل لیٹی گھاس کے لمبے لمبے ریشوں کو کھینچ کھینچ کر توڑتی رہی! اس نے دو تین دن ہوئے ایک فلم دیکھی تھی "بڑی بہن" اس میں ثریا نے ایک گیت گایا تھا۔

کسی لکھنے والے نے بربادی میری قسمت میں

یر کے دماغ میں معلوم نہیں یہ شعر کیوں گونجنے لگا ؟ بربادی میری قسمت میں ! بربادی میری قسمت میں . . . . . بربادی میری قسمت میں !
شق کیا چیز ہے ؟" وہ سوچنے لگی "کیا عشق یہی ہے جو احسن کو مجھ سے ہے۔ مروت، محبت، قربانی ! محفوظا در غلطی اندیشے سے دور !
لمانی سے پاک ! الجھن سے خالی ! پھر میرے دل میں یہ موہوم سی خلش کیوں ہے۔ کیوں مجھے درد بھرے گیت اچھے لگتے ہیں۔ زندگی اس
وار دیگر رکا نام تو نہیں ہو سکتا جو عقل کے کٹہروں کے درمیان قرینے سے کھچی ہوئی ہو۔ میں کیوں تلاطم کی تلاش میں رہتی ہوں اور کس قسم کے
لم کے تلاش میں ؟ احسن کی محبت میں قدر ضرور کرتی ہوں، میرے لئے یہ اطمینان کا سایہ ہے ! مگر میں اس سے کیسے کہہ دوں مجھے تم سے محبت ہے
بت اس کو نہیں کہہ سکتے ! احسن ملنے آجائے تو خوشی ہو اور نہ آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے لئے میرا جسم کانپتا نہیں۔ میرا دل اسے مانگتا
ہیں۔ اس کی باتیں پسند ہیں۔ اس کی موجودگی میں سکون ملتا ہے لطف آتا ہے۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے فلم دیکھنے جائیں تو اس کے ساتھ ہمیشہ
یہ فلم دیکھنے میں زیادہ مزہ ملتا ہے۔ مگر میں ان باتوں کو محبت کیسے کہہ دوں ؟ اس کے دماغ میں ایک شعر کوندگیا اس نے پلٹ کر احسن سے پوچھا
میں اس شعر کا دوسرا مصرع یاد ہے ؎

عشق نہیں جنوں سہی اس کے اثر کو کیا کروں ؟

س بات کہہ رہا تھا۔ وہ رک گیا ؟ اس نے پوچھا کیا کہا ؟ رضیہ ہنس دی ! احسن استعجاب کی شکل بنا ہوا رضیہ کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھتا
ہا۔ اس نے پھر دہرایا "کیا پوچھ رہی تھیں تم ؟" رضیہ اور بھی ہنسی اس کے گالوں میں سرخی کی جھلک نے وہ کیفیت پیدا کر دی کہ احسن اس کے
رے کی تابانی کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھول گیا کہ وہ کیا پوچھ رہی تھی۔ اسے بعد میں الجھن ہوتی تھی کہ یہ لمحات کیوں
طاری ہو جایا کرتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ باتیں کرتے ہوئے، کسی نکتے کو واضح کرتے کرتے رضیہ کی لمبی لمبی خمدار کالی پلکوں کو دیکھنے لگ
نا اور بھول جاتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر جلد ہی ذہنی طور پر اپنے آپ کو مجبور کر کے وہ سلسلۂ کلام کو جاری کر دیتا۔ علیحدگی میں اس جذباتی صدمے
خلل کیا اور اپنے آپ کو لعن طعن کرتا۔ کئی دفعہ خیال آتا کہ یہ عجیب بات ہے ! باتیں کرتے وقت ایک غیر متعلق چیز کی طرف توجہ کیوں ہو
اتی ہے ؟ مانا لیا رضیہ خوبصورت ہے مگر یہ کہ اس کے نقشوں کو دیکھتا ہوں یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے !

رضیہ احسن کے گھورنے سے جھینپ گئی۔ کئی دفعہ وہ احسن کے اس طرح یک لخت رک کر دیکھنے سے گھبرا جاتی اس کا سانس رکتا ہوا
علوم ہوتا سبدن پر ایک ہلکی سی کپکپی طاری ہو جاتی اور اس کی آنکھیں جھک جاتیں ! مگر جب احسن فوراً ہی اپنے آپ کو قابو میں کر لیتا تو اسے ایک
خفیف سا صدمہ بھی ہوتا۔ سوچتی آخر دیکھنے میں کیا حرج ہے اور دیکھنا بھی کیا ہے، شباب پر اس کی نظر نہیں جمتی جسم کے خطوط اس کے لئے بے معنی
یں کپڑوں پر اس کی نظر کبھی نہیں رکتی، بالوں سے وہ نہیں الجھتا۔ فقط دیکھتا ہے تو آنکھوں کو ناک کو اور منہ کو ! بے چارہ ! احسن نے پھر باتیں شروع
ردیں "سقراط کے نزدیک محبت کا مفہوم یہ تھا . . . . . .

و رضیہ سر جھکا کر مسکرا دی۔ اسے غالب کا شعر یاد آیا، وہ شاعروں کے دیوان بہت پڑھا کرتی تھی آخر ایم۔ اے اردو کر چکی تھی یوں بھی اس کا
مطالعہ خاصا وسیع تھا وہ کہا کرتی۔ شعر پڑھنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ غالب کا مصرع یونہی دماغ میں لہرا گیا ؎

"ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟"

مسکرائی کہ کیا حالِ دل اسی کو کہتے ہیں۔ پھر اسے یک لخت غصہ آگیا! اور بولی "افلاطون کیا کہتا ہے؟ ارسطو کا فلسفہ بھی بیان کرو۔ کہتے ہیں بوعلی سینا نے محبت کا ایک نیا اصول قائم کیا تھا جو اقلیدس کے اصولوں پر پورا اترتا تھا۔ تمہیں یہ نہیں معلوم پچھلے نانوے یا سو سال تک اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ عشق وزن زیادہ ہوتا ہے یا محبت کا۔ سائنس دانوں نے اس پر ادبی تحقیق کی ہے۔ کہتے ہیں وہ عشق کو دماغ کا خلل ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ دماغ کا اپریشن کرنے پر اس کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر محبت کا کیمیائی تجزیہ ہو چکا ہے۔ تحقیق جاری ہے امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے سب اجزائے ترکیبی دریافت ہو جائیں گے۔ پھر یہ چیز لیبارٹری میں تیار کر لی جائے گی اور سفوف یا گولیوں یا انجکشن کی شکل میں تمام دواخانوں میں مل سکے گی۔ یہ بھی کوشش ہو رہی ہے کہ اس کا توڑ بھی حاصل کر لیا جائے اس پر علیحدہ غور ہو رہا ہے۔ عقل انسانی کے یہ کرشمے دیکھ کر دنیا سکتے کے عالم میں پڑ گئی ہے . . . . .

یہ کہہ کر رضیہ چل دی

احسن اس کی طرف دیکھتا رہا! اسے وہ موتیا رنگ کے ریشمی ملبوس میں لپٹی ایک پھولوں سے لدے ہوئے بوٹے کی طرح ہوا میں جھومتی ہوئی نظر آئی۔ باغ میں سناٹا چھا گیا وہ چلتی گئی۔ اس کے قدموں کی چاپ احسن کے دل کی دھڑکن میں اسے سنائی دینے لگی وہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں رضیہ کی لچکتی ہوئی کمر پر گڑ گئیں۔ حیرانی کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ عورت کا جسم بھی کیسا دلآویز ہوتا ہے۔ اس کی کمر کا خم اس کے کولہوں کا ابھار اس کی چال کو کس قدر دلکش بنا دیتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ہیجان سا اٹھا! اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دماغ میں کوئی چیز بھک سے اڑ گئی ہے۔ خیالات جو ہمیشہ قابو میں رہتے تھے، بے عناں ہونے ہونے لگے۔ اس کی آنکھیں باغ میں فقط رضیہ کی پشت پر گڑی ہوئی تھیں باغ، درخت، بوٹے، پھول کیاریاں دھندلی پڑ گئیں۔ جب رضیہ اس کی نظر سے اوجھل ہوتی دکھائی دی تو وہ گھبرا کر اٹھا۔ وہ رضیہ کو گھر سے سیر کے لئے لایا تھا۔ اب وہ اکیلی کیسے چلی جائے گی؟ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے لپکا۔ معلوم نہیں کیوں؟ مگر وہ مصرع جس کے بارے میں رضیہ نے کوئی سوال کیا تھا اس کے ذہن میں ٹکرانے لگا۔

عشق نہیں جنوں سہی اس کے اثر کو کیا کروں

زور زور کی ٹکریں! عشق نہیں جنوں سہی! لاشعوری طور پر اس نے سوچا اس کے کیا معنی ہیں عشق نہیں جنوں سہی؟ جنوں سہی؟ مگر اسے اب یہ خیال نہ آیا کہ اسے بکواس کہا جا سکتا ہے؟ وہ ہمیشہ ایسے شعروں کو لغو کہہ کر رد کر دیا کرتا تھا اب یہ لفظ ایک بڑی سی گھنٹی کی آواز کی مانند اس کے دماغ میں گونجنے لگے! عشق نہیں جنوں سہی، جنوں سہی! اسے محسوس ہونے لگا، موہوم طور پر سہی، مگر محسوس ہونے لگا کہ اس میں کچھ معنی موجود ہیں۔ عشق نہیں جنوں سہی میں بھی کچھ معنی ہیں . . . .

٥

جہانِ قیصر و جم میں . . . .

"ہے کس طرف، مرے بیٹے! تمہاری عمر دراز!
ہمارے دیس کے فرماں روا کی درگہِ ناز؟"

شعاعِ اوّلِ خورشید کی نگاہِ خموش
فضائے صبح کی دھندلاہٹوں میں ڈوب گئی
مجھے وہ لمحۂ ظلمت نشاں نہیں بھولا
جب ایک پل کے لئے دو جہاں کی تاریکی
مرے ضمیر کی گہرائیوں سے اچھلی، اور
ابد کے راستوں اور منزلوں پہ پھیل گئی

"معاف رکھنا، بڑی بی، مجھے کہاں معلوم"
"کوئی بھی میرا جہاں میں نہیں؟"
"ترے مقسوم!"

جہانِ قیصر و جم کی شگفتہ راہوں پر،

ضعیف قدموں کے چلتے نشان بکھرتے گئے،
غبارِ راہ کی پیشانیوں سے مٹتے ہوئے،
مرے شعور کے الواح پر ابھرتے گئے!
ہزار لٹتے ہوئے خرمنوں کے نظارے
نظر کے سامنے آتے گئے گذرتے گئے،

"یہاں کہیں بھی مداوائے اضطراب نہیں،
کہاں ہو لوٹ بھی آؤ... !"

. . . .

کوئی جواب نہیں!

کسی کے ہانپتے ارماں جنھیں جگہ نہ ملی،
نظامِ زر کے چمکتے ہوئے قرینوں میں،
اب ایک دوزخِ احساس بن کے کھولتے ہیں
مرے تڑپتے ارادوں کے آبگینوں میں!

پڑا رہے گا یونہی کب تک اے خسِ پامال
بلند محلوں کے رفعت نورد زینوں میں،
عطا ہوا ہے تجھے بھی یہ حق مشیّت سے
خراج مانگ، بہاروں کی بادشاہت سے

•

حلقۂ اربابِ ذوق

ڈاکٹر محمد باقر
(ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی)

(یادداشت)

۱۹۳۹ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں بھاٹی دروازے کے باہر زیلدار روڈ پر رہتا تھا اور اسلامیہ کالج میں فارسی کا معلم تھا۔ میرے مکان کے سامنے کھلے میدان میں ایک بوڑھی عورت نے بھینسیں اور مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اور ان کی غلاظت سے جو مکھیاں از خود پلتی تھیں، میں نے ان سے بچنے کے لئے اپنے مکان کی کھڑکیوں کے سامنے چقیں لگا دی تھیں۔ ان چقوں کے پیچھے بیٹھا ہوا میں سیاہ بادلوں کو دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ بارش پُرلطف چیز ہے لیکن اس مکان میں بارش کا کیا لطف جس کے بعد ساری گلی گوبر سے بھر جائے گی اور میں پتلون کے پائنچے اوپر اٹھا کر کودتا پھاندتا مکان میں آیا جایا کروں گا۔ اتنے میں کسی نے میرے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

"کون ؟"

"یہ .... بھا .... بھاجی ..." شیر محمد صاحب اختر اپنی شخصیت واضح کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے آواز دی "تشریف لائیے" اور ہم دونوں بچپن کے دوست بیک وقت بیٹھک میں پہنچ گئے۔ عرب ہوٹل سے لے کر لنڈن کے پکاڈلی تک کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں ابھی تازہ تازہ انگلستان سے واپس آیا تھا۔ اختر صاحب کا اصرار تھا کہ ولایتی نمونے کی کوئی مجلس لاہور میں قائم کی جائے۔ میں نے تجویز کی کہ پھر کوئی لٹریری سرکل بنا لیجیے جس میں ہنگامہ خیزی کی بجائے چند صاحبِ ذوق جمع ہو کر نوجوان لوگوں کی کاوشوں کی داد دیا کریں اور بے لاگ تنقید کیا کریں تاکہ صحت مند ادب کی ترقی ہو سکے۔

اختر کہنے لگے "تو پھر کوئی نام تجویز کیجیے۔"

میں نے کہا "کل سوچ کر بتاؤں گا۔"

دوسرے دن اختر صاحب پھر آ دھمکے۔ ان کے ساتھ میرے ایک دو شاگرد بھی تھے۔ ایک کا نام غالباً شمیم تھا جو بعد میں فوج میں کپتان ہو گئے۔ دوسرے صاحب سید اقبال تھے۔ جو سید نور احمد صاحب ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز کے صاحبزادے ہیں۔ یہ دونوں ایف اے اور بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ اور اسلامیہ کالج کے ہیلی ہوسٹل میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ہیلی ہوسٹل کے مہتمم اقبال صاحب بھی تھے جنہیں کسی نامعلوم وجہ سے ہم ڈاکٹر اقبال کہنے لگے تھے۔ شاید کوئی اور صاحب بھی ان کے ساتھ ہوں۔ دس سال کے عرصے کے بعد یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر صورت یہ سب لوگ متقاضی تھے کہ لٹریری سرکل کا نام رکھا جائے اور آئندہ اتوار کو ہیلی ہوسٹل میں اس کی پہلی مجلس منعقد کی جائے۔ لٹریری سرکل کا لغوی ترجمہ "ادبی حلقہ" ہوتا ہے۔ حلقے کا لفظ (جس کا پنجابی تلفظ کا معنی پاگل کے ہے) احباب کو کچھ پسند آتا

تھا کہ نظم تحریر سیل کا نیا اور عمل پسند ظہور نام رکھنے کی طرح ہم سب نے بار بار "حلقہ" کا لفظ دہرایا اور بالآخر یہ ہمارے حلق سے نیچے اتر گیا۔ میری تجویز پہ "حلقۂ اربابِ ذوق" کا نام طے پایا۔ اور آئندہ اتوار کو اس کی پہلی مجلس پہلی ہوسٹل میں ڈاکٹر اقبال کے کمرے میں منعقد ہونی قرار پائی۔ اسی نشست میں حلقۂ اربابِ ذوق کے طریقِ کار کے متعلق چند موٹے موٹے اصول طے پائے۔

۱۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا کوئی مستقل صدر نہ ہوگا

۲۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا عہدہ دار صرف ایک مستقل سیکرٹری ہوگا۔

۳۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا رکن بننے کے لئے کوئی چندہ یا فیس نہیں لی جائے گی۔

۴۔ ہر سال کے لئے ایک سکرٹری چنا جائیگا۔

۵۔ حلقے کی رکنیت محدود رکھی جائے گی۔ اور حلقہ کے ارکان کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہیں حلقے کا رکن بنائیں۔ لیکن حلقے کے اجلاس ہر ایک مرد اور عورت کے لئے کھلے ہوں گے جس کو اجلاس میں شامل ہونے کے لئے دعوت دی جائے۔

۶۔ حلقہ کا جلسہ ہر ہفتے ایک رکن کے مکان پر ہوگا جس کے ذمے سب کو چائے پلانا بھی ہوگا۔

۷۔ حلقے کی ہر نشست میں کچھ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں گی۔ جن کو سننے کے بعد ان پر بے لاگ تنقید کی جائے گی اور مضمون نگار یا شاعر کا فرض ہوگا کہ وہ ناراض ہونے کی بجائے خوشدلی سے ناقدین یا معترضین کی تنقید و اعتراض کو سنے اور ان کا جواب دے۔

۸۔ حلقہ کی کارروائی کو حتی الوسع مشتہر نہ کیا جائے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ قواعد و ضوابط کہیں لکھے نہیں گئے تھے۔ لیکن ہم سب نے ان کی پابندی اپنے لئے لازم سمجھ لی تھی۔ ڈاکٹر اقبال اور ان دونوں بہت دوست نواز تھے۔ پہلی نشست پہلی ہوسٹل میں ان کے کمرے میں ہوئی۔ حلقے کے سات آٹھ بنیادی رکن جمع ہوئے جو بیشتر کالج کے طالب علم تھے۔ دو تین مضامین پڑھے گئے۔ ایک دو غزلیں اور نظمیں سنائی گئیں۔ طالب علموں نے سہمے سہمے انداز سے چائے پی اور شرماتے لجاتے مضامین سنائے۔ صدارت غالباً میرے سپرد تھی۔ مضامین اور شعر سننے کے بعد تنقید شروع ہوئی بے لاگ تنقید کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس قدر بیباک تنقید کی گئی کہ شاعر اور مضمون نگار دونوں حیران تھے کہ کس گناہ کی پاداش میں وہ حلقے میں آن پھنسے ہیں۔ بہر حال جلسہ بخیر و عافیت ختم ہوا۔ شاعروں اور مضمون نگاروں کے دل پر جو گزری سو گزری لیکن چائے کا سب کو لطف آگیا۔

ڈاکٹر اقبال کی طبعِ فیاض نے احباب کو سیج کی قندِ مکرر کے اصرار پر مجبور کر دیا۔ اور آئندہ صحبت میں پھر ان کے کمرے میں چائے اور پیسٹری کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر کی تواضع کی گئی۔ اور سہمے ہوئے شاعروں اور مضمون نگاروں کا پھر وہی حشر ہوا۔ ان مجلسوں کی روح رواں شیر محمد اختر تھے نہایت باقاعدگی سے اپنے پاکیزہ خط میں پروگرام کو سائیکلوسٹائل کر کے احباب تک پہنچا دیتے۔ یاد نہیں پڑتا کہ ذوق و دہن کی تواضع کس کس کی کب تک ہوتی رہی بہر صورت ڈاکٹر اقبال بھانپ گئے کہ اگر یہ لطف تلے اور حلقۂ ارباب کے "ذوقی تقاضے" رہے تو چند دن میں دیوالیہ پٹ جائیگا۔ چنانچہ ایک نشست کا انتظام انہوں نے اپنے کمرے کی بجائے اسلامیہ کالج کے فزکس تھیٹر میں کر دیا۔ اب کمرہ تو چائے

پایا نہیں سکتا تھا۔ شکایت کس سے کی جاتی پیہم تو فہرا جانے کے بغیر مضمون سنے اور سنائے گئے اور پھر چائے کا سلسلہ باقاعدگی سے
جاری نہ رہ سکا۔ چائے کی عدم موجودگی اس کا سبب تھی یا کوئی اور بات۔ مگر یہ لوگ تنقید اب سننے اور سنانے والوں کے درمیان کبھی کبھی
تلخی کا باعث بھی بننے لگی۔ تاہم کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ چند نشستوں کے بعد ہنگامی مصلحتوں کے پیش نظر اختر صاحب کی تجویز پر حلقہ
ان کے بھائی عزیز نیازی صاحب کا دفتر قرار پایا جو ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے واقع تھا۔ حلقے کی بہت سی نشستیں یہاں باقاعدگی سے
ہوتی رہیں۔ اس عرصے میں ہم ایک سال سے زیادہ کا فاصلہ طے کر آئے تھے لیکن شیر محمد اختر کی مساعی سے ایک نشست کا بھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔
میں نے بھی ایک دو نشستوں میں مضمون پڑھے کبھی کبھار صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اس وقت تک قیوم نظر، میراجی، یوسف ظفر،
عبدالمجید بھٹی، جمیل ناخدا، وقار انبالوی، مس بٹ (بعد میں بیگم وقار) تابش صدیقی اور کئی دیگر حضرات باقاعدگی سے حلقے کی نشستوں میں شامل
ہونے لگے تھے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد حلقے کی مجلسیں ایبٹ روڈ سے وائی ایم سی۔ اے میں منتقل ہو گئیں۔ اور یہیں اس کے سالانہ جلسوں
میں سر عبدالقادر اور میاں بشیر احمد نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس عرصے میں اختر صاحب کے بعد کئی اور صاحب حلقے کے
سکرٹری منتخب ہو چکے تھے۔ میرا حلقے سے عملی طور پر تعلق منقطع ہو چکا تھا سوائے اس کے کہ مجھے کبھی کبھی حاضری کے لئے بلا لیا جاتا۔ سنہ [illegible]
میں میراجی بڑے پر جوش انداز میں حلقے میں شمولیت کرتے رہے۔ اس وقت وہ شاید سکرٹری بھی منتخب ہو گئے تھے۔ مضمون یا نظم سننے کے بعد
وہ ایک مخصوص جلالی انداز میں پھنکارتے ہوئے سب سے پہلے تنقید شروع کرتے اور حاضرین کو مرعوب کرتے ہوئے مضمون نگار یا شاعر
کو اس طرح لتاڑتے کہ گفتگو میں اچھی خاصی گرمی اور بحث میں تلخی پیدا ہو جاتی۔ وہ خود جب اپنی ناقابل فہم طویل نظمیں سناتے تو نظم ختم کرنے کے بعد
اس وحشت آمیز انداز سے حاضرین کی طرف دیکھتے جیسے سب سے زیادہ وہ خود اپنی نظم سے متاثر ہوئے ہیں۔ حلقے میں اسی قسم کی ایک نظم پڑھی گئی تو
میں نے اپنا تاثر مثال سے واضح کرتے ہوئے ایک واقعہ احباب کی خدمت میں عرض کیا۔ چند سال ہوئے ایک غیر ملکی مصور روڈش نے لٹریری لیگ
کے زیرِ اہتمام شاہدین بلڈنگ میں اسی لیگ کے دفتر میں اپنی تصویروں کی نمائش کا انتظام کیا۔ روڈش صاحب سے صاحب سلامت تھی۔
دعوت نامہ ملنے پر میں بھی نمائش دیکھنے گیا۔ نگارخانے کے دروازہ سے داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک بیش قیمت چوکھٹے میں ایک تصویر
آویزاں تھی جس کو دیکھنے کی باری سب سے آخر میں آئی تھی۔ کیونکہ مصور کی ہدایت تھی کہ تصویریں بائیں سے دائیں جانب گھوم پھر کر دیکھی جائیں۔
اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جب آخر میں میں اس تصویر کے سامنے پہنچا تو دو چار فن کار اور دو چار خواتین اس تصویر کی بہت تعریف کر
رہی تھیں۔ یہ لوگ وہاں سے ہٹے تو میں نے بھی قریب ہو کر تصویر کو خوب غور سے دیکھا۔ اتنے میں روڈش میرے قریب آ گئے اور علیک سلیک
کے بعد پوچھنے لگے:۔

"کیسی تصویریں پسند آئیں؟"

"میں مصور ہوں نہ نقاد۔" میں نے دبی زبان سے کہا "جی"

"اور یہ تصویر کیسی ہے؟" روڈش نے سامنے لگے ہوئے چوکھٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو یہاں کوئی تصویر نظر نہیں آتی" میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

معدالیق نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "یہ سچ ہے کہ یہ کوئی تصویر نہیں لیکن آپ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے یہی بات کہہ دی ہے"

میں نے پھر پوچھا "تو آپ نے اسے یہاں اس قدر بیش قیمت چوکھٹے میں کیوں لٹکا رکھا ہے؟"

معدالیق نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تاثری (IMPRESSIONISTS) مصوروں کا مذاق اڑایا ہے۔ کینوس کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے چند خوبصورت رنگ برش سے اس پر پھیلا دیئے ہیں۔ لیکن خوبصورت رنگوں کے امتزاج کے سوا اس تصویر میں اور کوئی چیز نہیں"

"لیکن ابھی تو کچھ لوگ اس تصویر کی بہت تعریف کر رہے تھے"

"یوں بھی ہوتا ہے" دوروش یہ الفاظ کہہ کر ایک اور مہمان کا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھ گئے۔

یہ واقعہ سننے کے بعد حلقے کے کچھ لوگ بہت برہم ہوئے لیکن میں نے اپنی قدامت پسندی اور قصور فہم کا عذر پیش کر دیا جو کسی حد تک قبول کر لیا گیا اور بات ٹل گئی۔

آج یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی حلقہ ارباب ذوق کے بانیوں اور حلقہ قائم کرنے والوں کی مساعی کو بھولتے جا رہے ہیں۔ "بیان" شائع کرنے کا چسکا بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ابھی اگلے دن ایک مشہور شاعر کا انتقال ہوا تو ملک کے معزز اخبار نویسوں اور ان ادبا نے بھی جو گزشتہ دس سال میں بمشکل ایک آدھ مرتبہ حلقے کی نشستوں میں شامل ہوئے ہیں، حلقے کے قیام و استحکام کا سہرا شاہانہ از راہ ترحم شاعر مرحوم کے سر باندھ دیا۔

★

غزلیات

اثر صہبائی

(ذکر و فکر (زیرِ تدوین) کا ایک ورق)

حسن مصروفِ گلفشانی ہے
عشق مسرورِ کامرانی ہے

بادۂ آرزو سے رگ رگ میں
ایک طوفانِ زندگانی ہے

عشق دنیائے کیف و رقص و سرود
حسن فردوسِ شادمانی ہے

کس قدر دلکشا ہے تیری یاد!
صبح بھی، شام بھی سہانی ہے

جذبہ پر جو زندگی نثار ہوئی
غیر فانی ہے جاودانی ہے

میری ہر سانس، ہر نظر میری
نغمہ و نور کی کہانی ہے

عشق کے میکدے میں صہبائی
بادہ داں رقص و نغمہ خوانی ہے

جیمی سرشار

(انچارج تیاجیون "فیروزپور چھاؤنی")

جو چاہتے تھے تم وہی کرنا پڑا مجھے
آخر بلندیوں سے اترنا پڑا مجھے

سوچا جو کچھ دماغ نے مجھ سے نہ ہو سکا
جو دل نے کہہ دیا وہی کرنا پڑا مجھے

ایک ایک بات سے جو بڑی ندامت ہوئی کہیں!
ایک ایک بات کہہ کے مکرنا پڑا مجھے

راحت سے بیٹھ کر بھی مجھے راحت نہیں ملی
صدہا مصیبتوں سے گزرنا پڑا مجھے

مغرورِ حسن آپ تھے، مجبورِ عشق میں!
کرنا پڑا جو آپ کو بھرنا پڑا مجھے

خوش ہوں وفا کی شان تو دنیا میں ہو گئی
سرشار اگرچہ جاں سے گزرنا پڑا مجھے

صدق جائسی

نظر میں الفت کی جس پہ محبت کا گماں گزرے
مگر پلٹے تو فردِ ناز سے زینت بجاں گزرے

ہم ایسی بے اثر تقریر سے اے ہم زباں گزرے
انہیں ایسا ایک حرفِ شوق پر سو سو گماں گزرے

دلِ نقاش کہتا ہی ہو انسان کا دل تھا
دیکھیں سامنے سے صورتِ برقِ تپاں گزرے

پسِ فردِ النصیب وعدۂ فردا کو کیا روؤں
نہ جانے وعدۂ امروز کتنے رائیگاں گزرے

ضرورت چادرِ گل کی نہ حاجت شمعِ تربت کی
وہی اچھے رہے جو لوگ بے نام و نشاں گزرے

زبانِ شمع افسانے پہ افسانہ سناتی ہے
نہ جانے عرصۂ ہستی پہ کیا کیا آسماں گزرے

نہ سنا اے بلبل کہ گل نازک طبیعت ہیں
بیانِ عشق حسرت ناک ہے شاید گراں گزرے

ہزاروں کارواں بے نقش آتے ہیں حیرت گاہِ ہستی میں
کسے معلوم کس کس راہ سے عمرِ رواں گزرے

زہے پیچِ زلفِ سنبل کو نہ توڑا شاخ سے گل کو
مسافر کی طرح گلشن سے ہم اے باغباں گزرے

گل نقشِ قدم ہے آئینہ ہے داستاں کا
کسے دیکھا کسے پوچھا، کہاں ٹھہرے کہاں گزرے

بہارِ سیرِ گل اے صدق کچھ اس ناز سے نکلے
صدا دی [illegible] آنکھیں ادھر سے میہماں گزرے

تابش دہلوی

آشیاں ہے گر جل جائے ورنہ دام و زنداں ہے
شاخِ گل بہر صورت فتنۂ بہاراں ہے

جلوہ گر ہے تو لیکن کچھ نظر نہیں آتا
یا حجاب حائل ہیں یا نظر پریشاں ہے

کچھ دنوں میں شاید حسن چشمِ شوق بھی ہو جائے
آج ہر ادائے حسن یک نگاہ ساماں ہے

الجھنیں جنوں لیکن الجھنوں میں راحت سی
زندگی ہے یا کوئی گیسوئے پریشاں ہے

ہر جنوں کے موسم میں ہے خرد کا ایک انداز
پہلے بھی گریباں تھا، آج بھی گریباں ہے

دل کی نامرادی میں زندگی سی پاتا ہوں
کوئی نارسا نالہ، غالباً رگِ جاں ہے

بحر کی کشاکش میں غرق ہو چکی کشتی
اب کسے خبر ساحل کی، اب بھی موجِ طوفاں ہے

ہر حجاب جلوہ ہے سعیِ شوق سے تابش
اپنی ہر نظر یعنی، خود نظر پہ عریاں ہے

از پنڈت بال مکند صاحب عرش ملسیانی

دفتر کی تیاری

یوں تو دفتری زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ آدمی کا خون خشک نہ ہوتا ہو۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تشویش دامنگیر رہتی ہے۔ ملاقاتیوں کا رونا۔ بے سمجھ افسروں کی شکایت۔ اپنی قابلیت کی ناقدری کا ذکر۔ الغرض ہزاروں باتیں دفتر کے متعلق اور دفتری زندگی کے متعلق ناحق کی جاتی ہیں لیکن ان سب سے زیادہ صبر آزما وہ لمحات ہیں جو گھر پر دفتر کی تیاری میں گزرتے ہیں۔

صبح اٹھتے ہی دفتر کا خوفناک تصور ذہن پر چھا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ رات کو بھی یہ تصور پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اکثر اصحاب کو خواب میں دفتر دفتر کی رٹ لگاتے سنا ہے۔ سوتے میں بڑبڑاتے ہیں تو کسی فائل پر بحث کرتے، چپراسی کو جھڑکیاں دیتے، یا کسی ساتھی سے جھگڑتے نظر آتے ہیں گویا دفتر کا تصور اس قدر ذہن پر سوار رہتا ہے کہ خواب میں بھی اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ صبح کی سیر کو جاتے بھی ہیں تو صبح کے مناظر ہری ہری گھاس پھولوں کی مہک باغ اور باغ کی روشیں سب پر دفتر کا سائن بورڈ نظر آتا ہے۔ آزادی سے [illegible] نہیں اٹھایا جاتا کسی نے کوئی دلچسپ موضوع چھیڑا تو بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور فرمایا "اجی صاحب چھوڑیئے، دفتر بھی جانا ہے۔ ابھی کتنے کام باقی ہیں۔ حجامت بنانا ہے، نہانا ہے، کھانا کھانا ہے، بچے اور بیوی کی دوا بھی حکیم جی سے لانی ہے۔ اس پر یہ حال ہے کہ [illegible] صاحب پانچ منٹ کی بھی مہلت نہیں دیتے۔ ایک منٹ کی دیر ہوئی تو جواب طلبی اور زیادہ ہو جائے تو پھر پیشی۔ کیا کریں۔ کل کے چھوکرے افسر ہو گئے اور ہم سے دس سال جونیئر گریڈ کے آدمی ہیڈ کلرک بن گئے۔" چنانچہ اس قسم کی گفتگو میں تو بے حساب وقت ضائع کئے جاتے ہیں لیکن دوسرے کی بات سننے کا وقت نہیں ہوتا۔

گھر پہنچتے ہیں تو عجیب حالت ہوتی ہے۔ ایک طرف حجامت بن رہی ہے۔ دوسری طرف بچے کو پڑھا رہے ہیں۔ بیوی سے کھانا جلد پکانے کے بار بار تقاضے ان سب پر مستزاد۔ اچھی بھلی کام کرتی ہو تو اسے بدحواس بنا دیتے ہیں۔ کوئی سبق نہیں آتا ہے تو بچے پر خفگی، کپڑوں کی ڈھونڈھیا، دکاندار، کنٹرول، گزشتہ جنگ، ہٹلر اور نہ جانے کون کون اس وقت عتاب کا شکار ہوتا ہے۔ بے توجہی کے عالم میں استرے کا زخم کھا بیٹھے خون بند نہیں ہوتا پھٹکری کی تلاش میں گھر کے گھر کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ دفتر کی تیاری ایک اچھا خاصا ہیجان کی تمام [illegible] ہے۔ اتنے میں بچے پر بھی نزلہ گرتا ہے۔ تعلیم کے اصول اور بچے کی نفسیات سے تو واقف نہیں ہوتے۔ اسے جو سمجھاتے ہیں اس کی سمجھ میں نہیں آتا بچے کی سوجھ بوجھ کے مطابق بات سمجھانا نہیں جانتے۔ آخر وہ چار تھپڑوں سے اپنی کم سمجھی کا علاج کر لیتے ہیں اور بچے کو [illegible] بنا دیتے ہیں۔ سارا گھر سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔

آج مجھے جلد دفتر جانا تھا۔ ایک نہایت ضروری کیس تیار کرنا تھا۔ سو بار یہ بات سمجھا چکا تھا [illegible]

دفتر کی تیار

وہاں اسباب کے سب بند ہیں۔ ایک میری ذات نہ ہو تو گورنمنٹ کے سب کام رک جائیں۔ اب کیسے پہنچوں گا۔" بیوی کے سامنے یہ تقریر
جھاڑ کر غسل خانے کا رخ کرتے ہیں۔ بدحواس تو ہو ہی چکے ہیں کبھی تولیا باہر چھوڑ گئے کبھی کپڑے۔ صابن موجود ہے تو تیل نہیں اور تیل ہے تو صابن
نہیں۔ کپڑے بدلنے کا خیال تھا۔ پھر باہر آئے اور ساون کے گرجتے ہوئے بادل کی طرح برسے۔ بے چاری رسوئی چھوڑ کر کپڑے نکالنے لگیں
تو بہر قمیص اور پاجامے کر رہ فرمائش جاتے ہیں۔ یہ نہیں وہ نہیں۔ آخر خود ہی ٹرنک کے سب کپڑے نکال کر باہر پھینک دیئے اور جیسے تیسے الم غلم
کر غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ نہا کر باہر نکلے تو پھر وہی غیظ و غضب کا عالم۔ قمیص کے ایک دو بٹن نہیں ہیں۔ "بٹن جلد لگاؤ۔" کوئی کام بھی
یہاں طریقے سے نہیں ہوتا۔ کبھی دفتر کی ملازمت کرنی پڑتی تو دوسرے دن ڈسمس ہو جاتیں۔ یہ ہمارا ہی حوصلہ ہے کہ نباہ کر رہے ہیں ورنہ ان
نالائقیوں پر بیوی کیا آدمی نوکر کو بھی نہیں رکھ سکتا۔" ہندوستانی معاشرت میں پلی ہوئی ہندوستانی بیوی کے تصور میں خاوند کا درجہ دیکھتا ہے
دیوتاؤں کا، قوتوں کو کون دیکھ سکتا ہے۔ بے چاری چپکی چپکی سن لیتی ہیں اور دعا کرتی ہیں کہ آج کا دن خیر سے گزر جائے۔ دفتر جائیں تو سب چیزوں کو
پھر ان کی جگہ ترتیب سے رکھ دیں گی۔ انہیں یہ نہ ہو جانے کی کہ وہ کیسی جو انہیں تیار کرتا ہے اسے ان کے سوا کوئی اور تیار بھی نہیں کر سکتا کیونکہ
گورنمنٹ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ان کی دلچسپی کے لئے خود کوشش کرے گورنمنٹ پی لیتی ہیں اور کوئی میٹھی بات کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن یہاں تو
دفتر کا بھوت سر پر سوار ہے اور "پیش از مرگ واویلا" کے مصداق میاں کسی کی سنتے ہی نہیں اس لئے سمجھتے ہیں بیوی خاوند میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ بچے سہمے
ہوئے روز کے جھگڑے کا سین دیکھ کر باہر بھاگ جاتے ہیں اور ماں اور باپ کی بدحواسی پر بے اعتنائی کی ضرب لگاتے ہیں۔ کپڑے پہنتے ہیں تو جیسے چلاتے
جوتوں میں آئے تک ہیں۔ پاجامہ گلے میں ڈالتے اور قمیص میں ٹانگیں نکالتے اکثر دیکھے گئے ہیں۔ الٹا پاجامہ پہنے کبھی گھر سے نکل گئے ہیں
اور وہیں سے پلٹ کر آئے ہیں۔ ادھر الٹا پاجامہ پہنے کبھی دفتر بھی پہنچ گئے ہیں۔ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو گھڑی سامنے رکھ لیتے ہیں۔ منٹ
منٹ کا حساب ہوتا ہے۔ لیکن مزاج کو کیا کریں۔ وہ تو اتنا بگڑ چکا ہے کہ کوئی سبزی لذیذ نہیں۔ آٹے میں مٹی ہے روٹی چبائی نہیں جاتی کسی
سبزی کا نمک کم کسی میں زیادہ۔ بھابڑا کسی میں نہیں۔ وہی ہے تو نہیں چاہئے اور نہیں ہے تو بار بار مانگتے ہیں۔ دو چار لقمے کھانے کے بعد
تھالی کو زمین پر پٹک دیتے ہیں۔ بیوی کے فرائض کھانا تیار کرنے میں بیوی کی نااہلیت، زمانے کی بے راہ روی، عورت کی حقوق طلبی، ہندو
کوڈبل اور نہ جانے کن کن موضوعات پر ایک لمبی چوڑی تقریر گرجتے برستے فرما دیتے ہیں۔ خدا بھلا کرے ان بیوی صاحبہ کا کہ روز کا معمول
سمجھ کر خاموش رہتی ہیں۔ میاں کا قصور نہیں سمجھتیں۔ دفتر میں کام کی زیادتی اور میاں کے ساتھیوں کی نالائقی پر ان تمام باتوں کی ذمہ داری عائد
کرتی ہیں۔ خدا خدا کر کے گھر سے نکلنے کا وقت آتا ہے۔ سائیکل کو ہاتھ لگایا تو پہیوں میں ہوا نہیں۔ پمپ کبھی گھر میں رکھا نہیں جلدی سے سائیکل
کی دکان پر گئے۔ ہوا ڈلوائی اور چلے دفتر کی طرف بڑی تمکنت کے ساتھ۔ جیب ٹٹولی تو شناخت کا کارڈ نہیں۔ آدھا راستہ طے کر کے پھر پلٹے۔
کبھی کبھی دفتر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ چابیاں گھر پر رہ گئی ہیں۔ چپراسی کو دوڑایا تو چابیاں منگوائیں۔ کوئی ضروری کاغذ گھر پر رہ جائے تو خود
بھی گھر پہنچتا ہے۔ یہ تو روز کا معمول ہے اور اس معمول میں زندگی جسے دلچسپ اور پرسکون بنانے کے لئے دفتر کی ملازمت اختیار کی ہے کیسے
کٹتی ہے لطف اور بے اطمینانی میں کٹ جاتی ہے۔ غیر معمولی باتوں کا ذکر کیا جائے تو یہ داستان اور بھی طولانی ہو جائے۔ بسا اوقات عین وقت
پر کوئی [illegible] ادھر ہوش اڑ رہے ہیں۔ ساڑھے نو، پونے دس اور دس اور اس کے بعد جو منٹ بھی گزرتا ہے دل پر ایک تیر سا

دو غزلیں

حضرت نظر حیدرآبادی

کب تک بتاؤ، کوئی در در کی خاک چھانے
اے وقت رحم فرما، انصاف اے زمانے!

اس خوابِ منفعل کا انجام کون جانے
سویا ہوں روتے روتے جاگا تھا مسکرانے!

راہوں کے پیچ و خم میں گم ہو گئی جوانی
آواز دے رہے ہیں گزرے ہوئے زمانے!

جب ہم قفس سے چھوٹے وہ رنگِ گلستاں تھا
بکھرے ہوئے پڑے تھے رستوں میں آشیانے!!

فکر و نظر ہیں حیراں، احساسِ جاں بلب ہے
اے زندگی مبارک یہ موت کے بہانے!

اب میکدے میں ساقی وہ بات ہی نہیں ہے
بے کیف سی ہے صہبا، ساغر ہیں گو پرانے!

ہم مٹ چکے پر اب تک محسوس ہو رہے ہیں
اے انقلاب! تیرے نادیدہ تازیانے!!

کتنی مسرتوں کو لوٹا شقاوتوں نے
کیسی حقیقتوں کے بنتے گئے فسانے!

شاید نظر کسی کی چشمِ کرم بھر آئی
چھیڑنے لگے فضا میں غم آشنا ترانے!

حضرت حیرت

یہی ہے زندگی کی بس کہانی
مسرت عارضی، غم جاودانی

کیا کرتے ہیں غم کی ترجمانی
ہمارا کام ہی ہے نوحہ خوانی

وفاداروں سے ایسی بدگمانی
مگر یہ بھی ہے ان کی مہربانی

اگر ہوتا کسی عنوان ممکن
تو کرتے چارۂ دردِ نہانی

ہمیں یہ شغلِ گریہ ہی بہت ہے
مبارک دوستوں کو شادمانی

ہوائیں ہی کچھ ایسی چل رہی ہیں
بجھی جاتی ہے شمعِ زندگانی

مقدر کیا ہمارے ہی لٹے ہیں
بلائیں جس قدر ہیں ناگہانی

سمجھتی ہے جنہیں معصوم دنیا
وہی فتنوں کے ہیں بانی مبانی

خدا نے جن کو بخشی ہے محبت
وہی کرتے ہیں دل پہ حکمرانی

یہاں اس کا تصور بھی ہے مشکل
وہاں اک کھیل ہے ایذا رسانی

کریں فکرِ سخن کیا اور حیرت
یہیں تک تھی طبیعت میں روانی

نظر و حیرت

پیڈ آمد ریٹ
بماز۔ تھکرحید

غمِ روزگار

(ایک لطیف تمثیل)

کردار

دو سپاہی — ایک روسی خاندان کی ماں
کچھ سیّاح — چند انگریز سیّاح
کچھ فوٹوگرافر — ایک اجنبی
کچھ شرابی — ایک پادری
مکتی فوج کے چند افراد — ایک ہوٹل کا مالک
بچے (جو زیادہ تر روسی ہیں) — نامہ نگارِ خصوصی
اطالوی قوال — ایک خچر
ایک خاتون — اشتہاری بورڈ اٹھانے والا
ایک روسی خاندان کا باپ — بیرا

مقام :- پہاڑ کے نزدیک ایک ویران جگہ

ایک بلند عمودی چٹان پر ایک شخص نہایت خطرناک حالت میں بیٹھا ہے۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ وہ وہاں کیسے پہنچا پر اتنا ضرور ہے کہ وہ وہاں موجود ہے۔ ایک چھوٹی سیڑھی، چند رسّے اور بانس اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اسے بچانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی کافی دیر سے اس عجیب و غریب صورت حال میں گرفتار رہے گا کیونکہ اتنے بڑے ہجوم کے جمع ہونے کے لئے وقت درکار ہے۔ پھیری والے شربت پانی کی رٹ لگا رہے ہیں، پاس ہی ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اس کا بیرا سرتاپا پسینے میں شرابور، سب لوگوں کی فرمائشوں کی تکمیل کی کوشش میں مصروف ہے لیکن ہر ایک کا حکم بجا لانا اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ چند اور بھی پھیری والے ہیں جو فلمی تصویریں، گیت، رسالے اور البم لئے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ایک سیب کی گٹھلیاں فروخت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جو در حقیقت سیب کی نہیں کسی پیش آنے والے حادثے کی افواہیں سن کر آنے والے سیاحوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ان میں انگریز، روسی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، سبھی یورپی قوموں کے لوگ شامل ہیں۔ ہر ایک کے لباس اور طرز وضع و قطع سے اس کا مخصوص قومی شعار جھلک رہا ہے۔ تقریباً ہر ایک چھتری، دوربین اور کیمرے سے لیس ہے۔ وہ بہانت بہانت

کی زبانیں ہولی سب ہیں لیکن قارئین کی سہولت کے لئے ہم ان کی باتوں کو ایک ہی زبان میں منتقل کئے دیتے ہیں۔

چٹان کے نیچے جہاں اجنبی کے گرنے کا اندیشہ ہے۔ دو سپاہی کھڑے ہیں، وہ بچوں کو پرے رکھنے اور ہجوم کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔

(عام شور و غل اور چیخ پکار نے ایک ہنگامے کی کیفیت پیدا کر دی ہے)

پہلا سپاہی۔ ارے بدمعاش! اگر وہ تیری کھوپڑی پر گر پڑا تو تیرے ماں باپ کیا کہیں گے؟

لڑکا۔ کیا وہ یہیں گرے گا؟

پہلا سپاہی۔ بالکل یہیں!

لڑکا۔ آگے پیچھے نہیں؟

دوسرا سپاہی۔ لونڈا درست کہتا ہے، ممکن ہے کہ وہ ذرا آگے گر پڑے اور دستی توڑ ڈالے۔ اس طرح کسی تماشائی کو کچھ نقصان پہنچ جائے۔ اس کا وزن دو من سے کیا کم ہوگا۔

پہلا سپاہی۔ اری لونڈیا تو کہاں چلی جا رہی ہے؟ بہن یہ تمہاری بچی ہے؟ اسے ذرا پرے ہٹا لو، نوجوان ایک آدھ ہی منٹ میں گرا چاہتا ہے۔

خاتون۔ ایک منٹ میں! اری میرے اللہ! منی کے ابا اُدھر نہیں دیکھ سکیں گے؟

چھوٹی بچی۔ امی، وہ تو ہوٹل میں ہیں۔

خاتون۔ (جھنجلا کر) ہاں، ہاں! بس انہیں تو ہر وقت ہوٹل کا جنون ہے۔ نیلی جا تو انہیں بلا لا، کہنا کہ وہ ایک منٹ تک گرنے ہی والا ہے۔ جا میری بٹیا، ذرا جلدی سے جانا۔

آوازیں۔ (ہوٹل سے) بیرا! بوائے! بیرا!..... ابھی تک بیئر نہیں لائے!..... کیا!..... ہوں!..... کیسی بیہودگی ہے!..... ایک منٹ جناب..... جلدی..... بوائے! بیرا!..... بیرا!.....

پہلا سپاہی۔ ارے لونڈے تو پھر آگیا۔

لڑکا۔ جی میں تو وہ پتھر پرے کرنا چاہتا تھا۔

پہلا سپاہی۔ کیوں؟

لڑکا۔ جی، تاکہ جب گرے تو اسے چوٹ نہ لگے۔

دوسرا سپاہی۔ بھئی لونڈے کا خیال درست ہے، ہمیں پتھر ہٹا کر کچھ اور جگہ صاف کر دینی چاہئے، یہاں کسی کے پاس ریت یا لکڑی کا برادہ نہیں ہوگا؟

(دو انگریز سیاح پہنچتے ہیں۔ وہ اپنی دوربینوں سے اجنبی کو دیکھتے ہیں)

پہلا انگریز۔ نوجوان معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا انگریز۔ کیا عمر ہوگی؟

پہلا انگریز۔ اٹھائیس سال!

دوسرا انگریز۔ نہیں بھئی، چونکہ ڈر رہا ہے اس لئے عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

پہلا انگریز۔ رہی شرط؟

دوسرا انگریز۔ اچھا سو کی لکھ لو۔

پہلا انگریز۔ (لکھتا ہے ایک سپاہی سے) کیوں بھئی کچھ معلوم ہے کہ وہ کیسے وہاں پہنچ گیا؟ اسے نیچے کیوں نہیں اتارا جاتا؟

سپاہی۔ جناب کوشش تو بہت کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ کیا کیا جائے کوئی اتنی لمبی سیڑھی ہی نہیں۔

شاہد حمید

پہلا انگریز۔ یہ کتنی دیر سے ویلی ہے؟

سپاہی۔ کوئی دو دن سے۔

دوسرا انگریز۔ اچھا پھر آج رات تو وہ نیچے آ ہی رہے گا۔

پہلا انگریز۔ آج رات؟ دو گھنٹوں کے اندر اندر، رہی شرط؟

دوسرا انگریز۔ کون؟ (اجنبی سے) ہوں، کیسے ہو؟ ... کیا کہا؟ مجھے سنائی نہیں دیتا۔

اجنبی۔ (آہستہ سے) بری حالت ہے ناگفتہ بہ!

خاتون۔ دیکھیو، ننھی کے ابا ابھی تک نہیں آئے۔

موٹی لڑکی (دوڑ کر آتی ہے) کہتے ہیں ابھی آیا، وہ کسی آدمی کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں۔

خاتون۔ اوئی میرے اللہ! ان سے کہو نیلی جلد آئیں ... میں کہتی ہوں، کیوں جمعدار جی، وہ بہت دیر میں گرے گا؟ ... نہیں نیلی، تم جاؤ، میں تمہارے ابا کے لئے جگہ روک کے رکھوں گی۔

(ایک مخصوص وضع قطع اور خونخوار صورت والی لمبی دبلی پتلی عورت اپنی جگہ کے بارے میں کسی سیاح سے جھگڑ رہی ہے۔ سیاح بیچارہ سادہ سا آدمی ہے۔ وہ کچھ گھبرا گیا ہے، عورت کا پارہ اور بھی چڑھ جاتا ہے)

سیاح۔ محترم خاتون، جگہ تو میری ہے، میں دو گھنٹوں سے یہاں کھڑا ہوں۔

خونخوار عورت۔ جانے میری جوتی تم کب سے یہاں کھڑے ہو۔ یہاں میں کھڑا ہونا چاہتی ہوں، سمجھے؟ میں یہاں سے اچھی طرح دیکھ سکوں گی۔ آیا خیال شریف میں؟

سیاح (آہستہ سے) لیکن میں بھی تو یہاں سے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

خونخوار عورت۔ کیا کہا، تم یہاں سے ... منہ اور مسور کی دال، بھلا تم کیا جانو یہ باتیں۔

سیاح۔ اس میں جاننے کی بات ہی کون سی ہے ... آدمی نیچے گرنے والا ہے اور بس۔

خونخوار عورت۔ آدمی نیچے گرنے والا ... تمہیں باتیں بنانی خوب آتی ہیں، کبھی آدمی کو نیچے گرتے دیکھا بھی ہے؟ میں تو تین دفعہ دیکھ چکی ہوں۔ ایک ... تھا، دو بازیگر اور تین ہوا باز۔

سیاح۔ یہ تو چھ ہوئے۔

خونخوار عورت۔ چھ! اتو یہ میری تو بہ! تم تو بڑے حساب والے ہو! کبھی اپنی آنکھوں سے پڑیا گھر میں شیر کو کسی عورت کو چیر پھاڑتے ہوئے دیکھا ہے؟ ؟ ؟ جی؟ نہیں نا؟ میں نے دیکھا ہے! اب بتاؤ کیسی رہی؟ مجھی مجھی!

(سیاح اپنے کندھے سکیڑتا ہے گویا اس کی بہت توہین ہو گئی ہو اور دبلی پتلی عورت اس جگہ پر خوب پھیل کر بیٹھ جاتی ہے جو اس نے زبردستی حاصل کر لیا ہے۔ وہ اپنے بیگ سے مختلف قسم کے رومال، پیپرمنٹ کی ٹکیاں اور ایک شیشی نکالتی ہے اور اپنے آس پاس رکھ لیتی ہے۔ پھر دستانے اتار کر اپنی دوربین کے شیشے صاف کرنے لگتی ہے اور پھر تماشائیوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتی ہے۔ اب وہ اس خاتون کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کا شوہر ہوٹل میں ہے)

خونخوار عورت (بلا التفات سے) ڈارلنگ، تم تھک جاؤ گی، بیٹھ کیوں نہیں جاتیں؟

خاتون۔ جی! انہیں نہیں، شکریہ، میری ٹانگیں ... مضبوط ہیں۔

خونخوار عورت۔ ... [illegible]

[illegible] نہیں آتی کہ کسی شریف بہو بیٹی کے لئے جگہ چھوڑ
... اچھا، تمہارے پاس پیپرمنٹ کی ٹکیاں ہیں؟

خاتون۔ نہیں، کیا ضروری ہیں؟

خوش خوراک عورت۔ لیمو ویٹک ابھی پچھلے سے شاید تم بے ہوش ہو
جاؤ، کیوں جی، تمہارے پاس خوشبودار نمک بھی نہیں؟ نہیں نا؟
... کم کی کشتی بے پروا ہوا جب وہ گر پڑا تو ہم تمہیں کیسے ہوش
میں لائیں گے؟ میرے خیال میں تمہارے پاس کوئی عطر بھی تو
نہیں، واہ بہن! اگر تمہارا یہی حال ہے تو پھر تم ... تمہارے
ساتھ بھی کوئی نہیں۔

خاتون۔ (خائف ہو کر) ابھی اپنے شوہر کو بلاتی ہوں، وہ ہوٹل میں
ہیں۔

خوش خوراک عورت۔ تمہارا خاوند بھی ایک ہی ذاتِ شریف ہے!

ایک سپاہی۔ یہ کس کا جیکٹ ہے؟ کس نے پھینکا یہاں؟

لڑکا۔ جی میں نے تاکہ جب وہ گرے تو اسے چوٹ نہ آئے۔

سپاہی۔ اٹھاؤ اسے۔

(چند سیاح کیمرے پکڑے بہترین جگہ کے متعلق جھگڑ
رہے ہیں)

پہلا سیاح۔ یہاں میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔

دوسرا سیاح۔ ہو جاتے، کون روکتا تھا۔ لیکن اب تو میں کھڑا ہوں۔

پہلا سیاح۔ تم تو اب آئے ہو اور میں یہاں دو دن سے
کھڑا ہوں۔

دوسرا سیاح۔ پھر یہاں سے گئے کیوں؟ اپنا سایہ بھی تو نہ چھوڑ
کر گئے۔

پہلا سیاح۔ کیوں جی! آپ کا خیال ہے کہ میں بھوکا پیاسا مر
جاتا۔

پھیری والا۔ (ہاتھ میں کنگھی پکڑے ہلکی آواز سے) لے لو
سیپ کی، اصلی سیپ کی۔

ایک سیاح۔ واقعی؟

پھیری والا۔ جی، بالکل اصلی سیپ کی ہے۔

سیاح۔ دور بھی ہو — شیطان کہیں کا۔

ایک سیاح۔ محترمہ! دیکھئے میرے کیمرے پر تو نہ بیٹھئے۔

خاتون۔ میں بہت تھک گئی ہوں — ہوں، مڑا بستر کو
ہے! میرے بیٹھنے سے کیا بگڑ گیا۔

سیاح۔ (مایوس ہو کر) محترمہ!

خاتون۔ میں تو سمجھی تھی یہ کوئی پتھر دھرا ہے! مجھے کوئی چیز چبھی
آئی اور میں دل ہی دل میں حیران تھی کہ یہ سچ مچ پتھر ہے بھی یا
نا! آخر نکلا کیا! تمہارا کیمرا!

سیاح۔ (دنگ آکر) محترم خاتون، خدا کے لئے!

خاتون۔ لیکن یہ اتنا بڑا کیوں ہے؟ کیمرے تو چھوٹے چھوٹے
ہوتے ہیں اور یہ اتنا بڑا! تو یہ میری سمجھ خیال ہی نہ آیا کہ
کیمرہ بھی ہو سکتا ہے، اچھا میری تصویر اتارو گے؟ دیکھو
ان پہاڑوں کے پس منظر میں کتنی اچھی تصویر آئے گی۔

سیاح۔ پر اتاروں کیسے؟ کیمرے پر تو آپ بیٹھ گئی تھیں، صرف نادیدہ
ہیں۔

خاتون۔ (دہشت سے کود کر) کیا مطلب؟ مجھے بتایا کیوں نہ
کیا اس میں میری تصویر اترتی رہی؟

آوازیں۔ (ہوٹل سے) بیرا ... بیرا ... بیئر ... کیوں نہیں
بیئر ... بوائے ... جناب ... جی کیا کروں؟
... صرف ایک منٹ جناب ... ایک منٹ۔
بیرا ... بیرا! ... بیئر ...

[illegible] حاصل کر دیا آسمان صاف ہے۔ قدرت کی ہر شے حسین دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن آہ! اس بیچارے کی قسمت میں کہیں گر کر ہی مرنا لکھا ہے۔ مشتا، دیکھتے نہیں، یہ خیال ہی کتنا دردناک ہے!

طالب علم۔ (بے حسی سے) جی سمجھتا ہوں۔

سیاح۔ (دری مشتا، تجھے بھی کچھ پتا چلا؟ کیسا نکھرا نکھرا آسمان ہے لوگ کھانے پینے میں مصروف ہیں، ہر شے کتنی سہانی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی قسمت! بیچارے کو دیر سویر گرنا ہی ہوگا! کتنا زبردست سانحہ ہے! مسٹر کچھ یاد ہے کہ ہیملٹ کون تھا؟

دوسرا لڑکی۔ ہیملٹ؟ وہی الیسینور میں، ڈنمارک والا شہزادہ؟

طالب علم۔ مجھے معلوم ہے۔ ہیلسنگفورس میں۔ ابا، آپ مجھے پریشان کیوں کر رہے ہیں؟

مشتا۔ (بے حسی سے) بے چارے رات بھر بیروں کے جو خواب دیکھتے رہے۔

مشتا۔ سینڈوچ کھانے کو جی چاہتا ہے۔

پھیری والا۔ اصلی سیپ کی!

سیاح۔ (آہستہ سے) چوری کا مال ہوگا؟

پھیری والا۔ جی؟

سیاح۔ (آہستہ سے) چوری کا مال نہیں تو اصلی کیسے ہو سکتا ہے؟

خونخوار عورت۔ (نرمی سے) یہ سب آپ کے بچے ہیں؟

سیاح۔ جی ہاں، ایک باپ کی ذمہ داریاں! لیکن محترمہ، دیکھتی ہیں نا آپ کتنے شریر ہیں یہ! . . . . . اُف! کتنی دردناک ٹریجڈی ہے

. . . . مشتا ذرا پھر سنبھل؟

خونخوار عورت۔ بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے، بچوں کا اصلی علاج مولا بخش ہی کر سکتا ہے۔ آپ ایسے دردناک کیوں تصور کرتے ہیں؟ بلندیوں پر پرواز کرنے والا ایک نہ ایک دن نیچے پستیوں میں آ کر رہتا ہے۔ لیکن یہاں ——— ذرا دیکھئے نا ——— یہ چٹان کوئی سو یا زیادہ سے زیادہ دو سو فٹ بلند ہوگی، میں تو ایک آدمی کو بادلوں سے گرتے دیکھ چکی ہوں۔

سیاح۔ کیا فرمایا آپ نے؟ مشتا، بچو، سنو، آدمی بادلوں سے گرا!

خونخوار عورت۔ ہاں، ہاں۔ ایک ہوا باز تھا، بیچارہ ایک آہنی چھت پر آن کر گرا۔ بس گرتے ہی ہڈی پسلی غائب ہو گئی۔

سیاح۔ اف، کتنا دردناک نظارہ ہوگا!

خونخوار عورت۔ سچ پوچھئے تو ٹریجڈی یہ تھی! اس سانحے سے میں اس قدر متاثر ہوئی کہ دو گھنٹوں تک بیہوش رہی۔ بڑی مشکلوں کے بعد ڈاکٹر خوشبوئیں سنگھا سنگھا کر مجھے ہوش میں لائے، نہیں تو میں ختم ہی ہو چکی تھی۔ سو وہ دن اور آج کا دن میں ہر وقت اپنے پاس لخلخہ رکھتی ہوں۔

(اطالوی قوالوں کی ایک پارٹی نمودار ہوتی ہے۔ جیوت گانے والے کا قد پست، جسم گٹھیلا، داڑھی چھدری، اور بڑی بڑی پُرنم آنکھیں، پھیکی اور بے رونق ہیں۔ اس کی آواز میں بہت لوچ اور مٹھاس ہے۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی گٹار ڈرپو بوڑھے چوہے کی سی آواز نکال رہا ہے۔ زیر لب الاپ کر رہا ہے۔ چکارا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دبلی پتلی عورت وائلن پر جھکی ہوئی اپنی گول مول آنکھیں مٹکا رہی ہے۔ وہ پرے جا کر گانے لگتے ہیں۔ گا تا . . . . . ری . . .
. . . دھا، نا، پا . . . . تا، نا، ری ری . . . . گا تا . . .
. . . ری، ——— . . . .)

مشتا۔ (دکھے پن سے) ابا، دیکھئے نا، وہ اپنا ہاتھ ہلا رہا ہے۔

شاہد حمید

(... ہجوم کا شور و غل بلند ہوتا ہے۔ ذرا دیر کو افرا تفری سی پھیل جاتی ہے)

سیاح۔ نہیں، ابھی جلدی کرنی چاہئے حضرات، اسے ہر قیمت پر نکالنا چاہئے۔ اچھا کون چلتا ہے میرے ساتھ؟

تماشائی۔ (یک آواز) ہم سب۔

(سب لوگ تیزی سے بازو ہلاتے چلے جاتے ہیں۔ ہوٹل سے تیز، تند و ترش آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ بیئر کی بوتلوں کی کھڑکھڑاہٹ اور جرمن موسیقی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ بیرے کی ہمت جواب دے چکی ہے۔ وہ بھاگ کر باہر آجاتا ہے۔ عالمِ مایوسی میں آسمان کو تکتا ہے اور ایک میلا رومال سے اپنے ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہے۔ اندر سے لوگوں کی مسلسل آوازیں آ رہی ہیں۔ بیرا! ... بیئر ... بیرا .....)

اجنبی۔ (ذرا بلند آواز سے) بیرا، سوڈے کی ایک بوتل مجھے بھی دینا۔

(بیرا ادھر دیکھتا ہے اور اجنبی کو دیکھ کر پرے چلا جاتا ہے۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں: "بیرا، بیئر، بیرا" کی بے قرار مسلسل آوازیں پہنچ رہی ہیں)

بیرا۔ ایک منٹ جناب، صرف ایک منٹ۔

(ہوٹل سے دو شرابی نکلتے ہیں)

خاتون۔ میرا خاوند! ..... یہاں آ جائیے۔

خونخوار عورت۔ ہرجائی! وحشی کہیں کا!

شرابی ۱۔ (اپنے ہاتھ ملا کر) آہا، او پر میرے یار! ——— ہوں، مزے میں تو ہو، نہیں؟

اجنبی۔ (رقت سے اونچی آواز سے) میری جان نکل رہی ہے، تمہیں خیال ہی نہیں ہے۔

شرابی ۱۔ چھوڑئیے صاحب، اپنے مینڈک نے کہیں ...

اجنبی۔ نہیں کچھ نہیں۔

شرابی ۲۔ کیا مطلب تمہارا؟ شراب اور اس کے لئے؟ جان نکلتی ہے غریب کی اور پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ..... سنو یار، ہم اب تک تمہارا ہی جامِ صحت پیتے رہے ہیں۔ دیکھو برا نہ ماننا۔

شرابی ۱۔ کمال کرتے ہو یار! اس میں برا ماننے کی بات ہی کون سی ہے؟ اس کے دانے نیلے ہیں! اچھا سنو تو، خدا کی قسم تمہاری حالت دیکھ کر افسوس بہت آتا ہے، لیکن برا نہ ماننا، مجبوری ہے! ... اچھا ہم پھر تھوڑی دیر کے لئے ہوٹل میں جاتے ہیں۔

شرابی ۲۔ ارے یار، بھیڑ بھاڑ کی بھی انتہا ہو گئی، اتنا ہجوم!

شرابی ۱۔ چھوڑ و یار، اگر کم بخت کہیں گر پڑا، تو ہوٹل بس بند سمجھو۔

(چند اور سیاح آتے ہیں۔ ان کے آگے یورپ کے ایک بلند پایہ روزنامے کا نامہ نگارِ خصوصی، جو شکل و صورت سے ایک شائستہ اور با سلیقہ نوجوان معلوم ہوتا ہے، چلا آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے لوگ بہت خوش خوش نظر آتے ہیں۔ اسے دیکھنے کے اشتیاق میں ہوٹل سے بھی لوگ باہر نکل آتے ہیں اور تو اور بیرا بھی اسے دیکھ کر زیرِ لب مسکراتا ہے)

آوازیں۔ دیکھنا، نامہ نگارِ اعلیٰ!

خاتون۔ ہائے اللہ، میرا شوہر ابھی نہیں آیا۔

سیاح۔ پیٹر، مشا، سشا، کیتی، ماسیا، ارے دیکھو یہی نامہ نگارِ اعلیٰ ہے۔ سمجھے؟ ——— نامہ نگارِ اعلیٰ ..... اس کا لکھا پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔

کیتی۔ مشا، تو پھر نہیں دیکھتی۔

آتا ہے۔ خلا کی رات تھا... نہیں اوپر چڑھ رہا تھا... پاگل تھا، سنکی...

نامہ نگار۔ حضرات، ذرا سکون سے کام لیجئے..... آخر وہ آسمان سے تو گر نہیں پڑا، تاہم... (تیزی سے لکھتا ہے) بدقسمت نوجوان... بچپن ہی میں مالیخولیا کے موذی مرض کے دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے... پورے چاند کی درخشاں روشنی... چھٹکی چاندنی... ہوٹل کا بدحواس بیرا... نظر نہیں آتا...

میتاح ۱۔ (علیحدگی میں میتاح نمبر ۲ سے) چاند تو ابھی پہلے رخ میں ہے۔

میتاح ۲۔ تمہارے خیال میں عوام علم ہیئت پڑھے ہوئے ہیں۔

میتاح۔ (خوشی کے عالم میں) مشا، ذرا غور سے دیکھو، یہ ہے زندہ اجسام پر چاند کے اثرات کی ایک نمایاں مثال — کتنا بڑا المیہ ہے! چھٹکی ہوئی چاندنی میں سیر کرتے کرتے ایسے مقام پر جا چڑھنا، جہاں سے نہ اتر سکو نہ بچائے جا سکو۔

نامہ نگار۔ (بلند آواز سے) کیا محسوس کر رہے ہو؟ مجھے سنائی نہیں دیتا، ذرا اونچی آواز سے ہاں....

ہجوم۔ (دلچسپی سے) سنو! اس کمبخت کو سنو۔ کتنا دردناک حال ہے!

نامہ نگار۔ (دیکھتا ہے اور پھر بلند آواز سے دہراتا ہے) اس کے عضو عضو پر موت کا خوف طاری ہے... روئیں روئیں سے خطرے کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں... رگوں کا خون منجمد ہوا جا رہا ہے.... مطلقاً ناامیدی... اپنے آسودہ حال گھرانے کے متعلق خیالی نقشے بنا رہا ہے، اس کی بیوی پیسٹری بنانے میں مشغول ہے۔ اس کے پانچوں بچے معصومانہ انداز سے باتیں کر رہے ہیں.... بچوں کی دادی آرام کرسی پر بنہایت آرام سے پائپ سلگا رہی ہے.... ان کا دادا... جبکہ دادی.... ہجوم کی ہمدردی سے متاثر ہو کر... اس نے اپنی آخری آرزو کا اظہار کیا... اس کے آخری الفاظ ہمارے اخبار میں شائع کر دئیے جائیں....

خونخوار عورت۔ جھوٹا۔

مشا۔ دیکھو، وہ لگا گرنے۔

میتاح۔ (غصے سے) چپ۔ یہاں اتنا بڑا المیہ ہونے والا ہے اور تو....... ارے تو اپنی آنکھیں کیوں میچتی ہے؟

نامہ نگار۔ (بلند آواز سے) دوست صرف ایک منٹ اور رہا۔ میرا آخری سوال یہ ہے، اب جب کہ تم دوسری دنیا کے دروازے پر دستک دے رہے ہو، اپنے ساتھیوں کو کوئی آخری پیغام دینا چاہتے ہو؟

اجنبی۔ (مرجھائی ہوئی آواز سے) میری طرف سے کہہ دو، جہنم میں جائیں۔

نامہ نگار۔ کیا؟ اوہ ٹھیک...... (لکھتا ہے) گہری اور لازوال محبت...... الوداعی الفاظ۔ آخری دم تک حبشیوں کو آزادی دینے کا زبردست مخالف....... اس کی آخری امید... کالے کبھی....

ایک پادری (سانس پھولا ہوا، ہجوم جلدی سے راستہ بنا دیتا ہے) کہاں؟ اُف! وہ! آہ بدبخت نوجوان! حضرات! میرے جیسا لباس پہنے کوئی اور تو یہاں نہیں آیا؟ نہیں؟...... شکریہ، تو اولیت کا شرف مجھے ہی حاصل ہوا۔

نامہ نگار۔ (دیکھتے ہوئے) رقت انگیز نظارہ...... پادری کی آمد.... کامل سکوت.... بہت سے لوگوں

شاہد حمید

(کلیسا کا سپاہی ملٹر زور سے طبلہ بجاتے اور بلند آواز سے پکارتے ہوئے) بھائیو اور بہنو......

پادری۔ (اس سے بھی بلند آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہے) بھائیو، وہ تائب ہو چکا ہے۔ حضرات، آپ سب گواہ ہیں، وہ خداوند یسوع مسیح کے حضور میں ندامت کا اظہار کر چکا ہے۔

سپاہی ۱۔ (جو ایک عورت ہے، وہ پتھر پر کھڑی ہے اور ورد کر رہی ہے) اس گنہگار کی طرح میں بھی ظلمت کی وادیوں میں بھٹکتی رہی۔ بادۂ رنگین کے خم پر خم لنڈھاتی رہی تا آنکہ مجھ پر نور کی کرن......

ایک آواز۔ اب بھی تو نشے میں دھت ہے۔

پادری۔ جمعدار صاحب۔ آپ نے اسے یسوع مسیح کے حضور میں سر بسجود ہوتے اور توبہ کرتے نہیں دیکھا؟

(کلیسائی فوج سپاہی ۱ خوب زور زور سے طبلہ بجاتا ہے، دوسرا ڈھولک بجانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اتنا ہی شور و غل، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی...... ہوٹل کے اندر لوگ الگ الگ گانے میں مصروف ہیں۔ بیرے کو مختلف زبانوں میں آوازیں دی جا رہی ہیں۔ فوٹو گرافر اپنے حال میں مست ہیں۔ ایک انگریز سیاح عورت خچر پر سوار وارد ہوتی ہے، خچر کی ڈھینچوں ڈھینچوں بھی عالم شور و غل میں گم ہو جاتی ہے۔۔۔ آخرکار کچھ سکون ہوتا ہے اور کلیسائی فوج نہایت شان سے چلی جاتی ہے، پادری بھی بڑبڑاتا ہوا ان کے پیچھے چلا جاتا ہے)

انگریز سیاح ۱۔ (ایک دوسرے سے) لعنت ہو یارا اب آداب تو اس ہجوم کو چھو تک نہیں گئے۔

انگریز سیاح ۲۔ آؤ پھر چلے چلیں۔

انگریز سیاح ۱۔ صرف آدھ منٹ اور ٹھیر جاؤ، میں پھر کہتا ہوں۔ ذرا عجلت سے کام لو۔

انگریز سیاح ۲۔ سر ولیم، کیا کر رہے ہیں آپ؟

انگریز سیاح ۱۔ دیکھتے نہیں لوگ کس بات کے منتظر ہیں اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی خواہش پوری کر دی جائے —— اس ہجوم کے روبرو اپنے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

انگریز سیاح ۲۔ سر ولیم!

سیاح۔ (مسرت سے) بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے وہ، بالکل ٹھیک۔ سشا، پیٹر، سنو، وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے کتنا بڑا المیہ ہے۔

انگریز سیاح ۱۔ (اپنے ساتھی کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے) جلدی سے نیچے آ جاؤ، سنتے ہو؟ اگر تم میں اتنی جرأت نہیں تو کیا پھر تمہاری مدد کے لئے گولی آئے؟ کہو، ہاں یا نہیں؟

آوازیں۔ خاکی وردی والا...... شیطان...... پاگل!

سپاہی۔ (انگریز سیاح کو بازو سے پکڑ کر) آپ کو ایسا کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں، میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔

ایک سیاح۔ وحشیوں کی قوم!

(اجنبی کچھ چلاتا ہے، ہجوم میں وہی افراتفری اور گھبراہٹ)

آوازیں۔ سنو، سنو!

اجنبی۔ (بلند آواز سے) اس شیطان کو دفع کر دو...... دوزخی! مجھے گولی مارنا چاہتا ہے...... مالک سے کہہ دو میں اب تنگ آ گیا ہوں۔

آوازیں —— ہیں! کیسا مالک؟ غریب پاگل تو نہیں ہو گیا؟

سیاح۔ سشا، سشا۔ یہ دیکھو جنون کا دورہ۔ پیٹر، ذرا ہیملٹ کا تصور کرو۔

اجنبی۔ (جھنجلا کر) اس سے کہہ دو میری کمر ٹوٹ کر دوہری ہوئی جاتی ہے۔

شاہد حمید

ستشا - (بیدلی سے) ابا، وہ اپنی ٹانگیں ہلا رہا ہے۔

کیتی - کیوں ابا، اسے تشنج نہیں کہتے؟

سیاح - (افسردگی سے) معلوم نہیں، مگر میرا خیال ہے بہت بڑا المیہ ہے!

ستشا - (مغرور انداز سے) کیتی تو بیوقوف ہے البس تو دور سے جا سکتی ہے، یا پھر چشمہ لگا جانتی ہے، بیچاری اتنا بھی نہیں جانتی کہ یہ جانکنی کا درد ہے: ابا! میں تو تھک کر چور چور ہو گیا ہوں۔

سیاح - بچو، ذرا خیال کرو، یہاں گرنے سے ایک آدمی کی ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی۔ کیا سوچ رہا ہے وہ؟ آہ بے چارے کی کمر؟

(شور و غل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چند غضبناک سیاح ایک مبہوت و پریشان آدمی کو کھینچے لئے چلے آ رہے ہیں۔ وہ سفید واسکٹ پہنے ہوئے ہے اور ادھر ادھر جھک کر بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر پکڑا جاتا ہے)

آوازیں - مکار! فریبی! جعلساز! بے شرم! پولیس! پولیس! اسے سبق ملنا چاہیئے!

دوسری آوازیں - کیا ہوا، کیا ہوا؟ ہیں؟ فریب! خوب اچھا پکڑ رکھا ہے!

محصور آدمی - جناب والا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ یہ مذاق تھا، سو فیصدی مذاق سیاح بہت اکتائے ہوئے تھے اور میرا مقصد صرف انہیں تفریح بہم پہنچانے کا تھا۔

اجنبی - (اونچی آواز سے) مالک!

محصور آدمی - ایک منٹ بھئی، صرف ایک منٹ!

اجنبی - آپ چاہتے ہیں میں تا قیامت یہیں بندھا رہوں؟ آپ کا وعدہ تین بجے تک کا تھا، اب کیا وقت ہوگا؟

لمبا سیاح - (غیظ و غضب سے نیم پاگل ہو کر) حضرات سنا آپ نے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بدمعاش نے ــــ میرا مطلب ہے اس سفید واسکٹ والے ــــ ایک دوسرے بدمعاش کو اس چٹان کے اوپر باندھ رکھا ہے۔

آوازیں - ہیں! وہ بندھا ہوا ہے؟

لمبا سیاح - یقیناً اور وہ قیامت تک نیچے نہیں گرے گا۔ ہم یونہی بیقرار ہو رہے تھے کہ دیکھئے کب گرتا ہے اور وہ کبھی گرے گا ہی نہیں۔

اجنبی - واہ سبحان اللہ! چند ٹکیوں کی خاطر اپنی جان کو عذاب میں ڈال رکھا ہے، مالک، اب انتہا ہو گئی، وہ شیطان کا بچہ دو گھنٹوں سے مجھے گولی مارنے پر تلا ہوا ہے ... ہمارا معاہدہ یہاں تک نہ تھا۔

ستشا - ابا سے کہا بھی تھا کہ بیدکار جھوٹا ہے، مگر وہ لوگوں کی باتوں میں بہت جلد آ جاتے ہیں۔ یونہی ہمیں یہاں گھسیٹ لائے۔

محصور آدمی - لوگ بہت پژمردہ ہو رہے تھے ... محض ان کی دلچسپی کی خاطر یہ سوانگ رچایا گیا تھا۔

خونخوار عورت - کیا بکواس ہے، خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ گرتا کیوں نہیں؟ نہیں گرے گا تو پھر کون ہوتا ہے وہ؟

سیاح - میری سمجھ بھی کچھ کام نہیں کرتی، اسے گرنا تھا۔

پیٹر - ابا، آپ کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا۔ وہ بندھا ہوا ہے۔

ستشا - پیٹر، تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات مان جائیں گے یہ خام خیالی ہے۔ بیدکار پر تو وہ فوراً ہی ایمان لے آتے ہیں، لیکن اپنی اولاد پہ، توبہ کیجئے، وہ ہماری کہاں سنتے ہیں۔

شاہد حمید

پیٹر۔ ہمارے ابّاجان تو ــــ

سیّاح۔ چپ!

خونخوار عورت۔ کیا مصیبت ہے! اسے گرنا تھا!

لمبا سیاح۔ لیکن ذرا سوچو! کتنی بڑی جعلسازی! جناب آپ کو اپنے رویّے کی وضاحت کرنی پڑے گی۔

محصور آدمی۔ عوام کو تفریح درکار تھی ...... حضرات مجھے معاف فرمایا جائے .... لیکن دلچسپی کا مہیا کرنا .... چند گھنٹوں کے لئے دل لگی کا سامان بہم پہنچانا .... بے غرض جذبات اکسانا ...... ایک ہیجان برپا کرنا ....

ایک انگریز۔ کیا وہ ہوٹل تمہارا ہے؟

محصور آدمی۔ جی۔

انگریز۔ اور وہ برابر والا کیفے بھی؟

ہوٹل کا مالک۔ (محصور آدمی) جی .. عوام ...

نامہ نگار خصوصی۔ (لکھتا ہے) ریاکار، بدمعاش ... ہوٹل کا مالک .... بے فروشی سے آمدنی بڑھانے کی خاطر انسانیت کے لطیف جذبات و احساسات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ..... عوام کا غم و غصہ .....

اجنبی۔ (تلخی سے) مالک، مجھے اتارو گے یا نہیں؟

مالک۔ شکایت کس بات کی؟ ہر رات تمہیں اتارتے نہیں رہے؟

اجنبی۔ حد ہو گئی، تو پھر آج رات مجھے اوپر ہی مارنے کا ارادہ ہے۔

لمبا سیّاح۔ اے بدمعاش جانتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ اپنے ذلیل مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر تو نے ہماری انسانیت کا مذاق اڑایا ہے۔ پڑوسی کی مدد کرنے کے جذبہ کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ہمیں دہشت زدہ کیا۔ اور ہمیں ہمدردی پر مجبور کیا۔ رنج و الم کے جذبات سے ہمارے دلوں کو مسموم کر دیا ہے

ــــ ان سب باتوں کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ سُن، بدمعاش کمینے! ذلیل کُتّے! ... اور وہ تیرا بدمعاش ساتھی، پر بندھا ہوا ہے اور جس کے گرنے کی توقع سے کر ہم یہاں تھے، اب اگر گرنا چاہے بھی تو نہیں گر سکتا۔

خونخوار عورت۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے نیچے گرنا تھا۔

سیّاح۔ پولیس! پولیس!

(پادری دوبارہ آتا ہے، اس کا سانس پھولا ہوا ہے)

پادری۔ ہیں! ابھی تک زندہ ہے؟ تعجب ہے! یہ ملک والے بھی کیسے نیم حکیم ہیں!

آوازیں۔ سنتے نہیں۔ وہ جانے نہیں دے گا۔

پادری۔ کیا، کیا نہیں جانے دے گا یہ؟ ہوں! موت کی ہم سب زیست کے بندھنوں میں گرفتار رہتے ہیں کوئی بات نہیں، وہ اوپر بندھا ہوا ہو یا نہیں، میں نے یسوع مسیح کے حضور میں اس کی توبہ تو کرا ہی دی ہے نیم حکیم ......

سیّاح۔ پولیس، پولیس! آپ لوگوں کو سرکاری رپورٹ ہو گی۔

خونخوار عورت۔ (گستاخانہ مالک سے) یوں تو میں بھی فریب نہیں دینے دوں گی۔ میں ایک ہوا باز کی ہڈی ایک ہوتے دیکھ چکی ہوں۔ میں نے ایک شیر کو ایک عورت کو چیرتے پھاڑتے ہوئے دیکھا ہے ......

ایک فوٹو گرافر۔ اس بدمعاش کی تصویریں لے لے کر اپنی تین فلموں کو خراب کیا ہے، جناب والا، اس کو کے بھی آپ ہی ذمہ دار ہوں گے۔

سیّاح۔ سرکاری رپورٹ! سرکاری رپورٹ! زندگی وحشیانہ

مشا، پیٹر، سشا، اسیا، ذرا پولیس کو بلانا!

ئے (مایوس ہوکر) اگر وہ نہیں گرنا چاہتا تو میں اسے کیسے گرا دوں، جو میرے بس میں تھا، وہ میں کر چکا ہوں حضرات حضرات! ـــ

ا عورت - چھوڑو اس گی میں بھی نہیں تجھے -

ئے - معاف کیجئے حضرات اگر وہ اب کی بار نہیں گرنا چاہتا تو اگلی مرتبہ ضرور گر پڑے گا، وعدہ رہا، انشاء اللہ!

ی - اگلی بار کے متعلق کیا کہا ؟

ش - یار چپ بھی رہو!

ی - ہیں ٹکلیوں کی خاطر!

ی - واقعی کتنے افسوس کی بات ہے! ایک منٹ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر خداوند یسوع مسیح کے حضور میں اس کی توبہ کرائی تھی .... سنتے تھے نا آپ کیسے مجھے میرے سر پر گرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا؟ اور ابھی تک منہ چڑا رہا ہے، چور کمین کا! بے ایمان اخوفی! پڑوسی کے گدھے کو للچائی نظروں سے دیکھنے والا ....

گرافر ۱ - حضرات، گدھا!

گرافر ۲ - کہاں ہے گدھا؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا۔

دگرافر ۱ (آہستہ سے) یار کچھ ایسا ہی سنا تھا اور ....

دگرافر ۲ - تم بھی نرے گدھے ہو، تمہاری وجہ سے میری آنکھیں بھی خراب ہو گئیں۔

نا - (افسردگی سے) وہ دیکھئے، ابا، سپاہی -

(شور و غل اور افراتفری کا عالم، ایک طرف سپاہی کو ہجوم نے نرغے میں لے رکھا ہے اور دوسری طرف ہوٹل کے مالک کو، دونوں طرف سے "تمہاری مرضی" "تمہاری مرضی" کی آوازیں آ رہی ہیں)

سیاح - جمعدار صاحب، یہ بدمعاش ادھر ہے، یہ چھپا ....

پادری - اجی جمعدار صاحب، یہی ہے چور، خونی! بدمعاش! پڑوسی کے گدھے کو للچائی نظروں سے دیکھنے والا ....

سپاہی - حضرات، ذرا صبر سے کام لیجئے، ہم ابھی اسے بتا دیں گے کہ اس نے کیا کیا ہے - اسے اپنے کئے پر شرمندہ ہونا پڑیگا۔

مالک - اگر وہ نہیں چاہتا تو میں اسے کیسے گرا دوں؟

سپاہی - ہیلو، نوجوان! تم اوپر ہو نا؟ اچھا بتاؤ، بھلا گر سکتے ہو یا نہیں؟

اجنبی - (ترشروئی سے) میں گرنا نہیں چاہتا۔

آوازیں - اوّہ، مان گیا - بدمعاش ہے نا!

لمبا سیاح - جمعدار صاحب، لکھئے نا! ..... منافع کی خاطر ..... پڑوسی کی محبت کا ناجائز فائدہ ... پاکیزہ جبلت ...

سیاح - سنو بچو، وہ رپورٹ مرتب کر رہے ہیں - کتنا شاندار اظہار ہے!

لمبا سیاح - ایک پاکیزہ جبلت جو ....

سپاہی - (اپنی زبان ایک گال میں دیئے، فرض شناسی سے لکھتے ہوئے) "ہمسائے سے محبت ..... ایک پاکیزہ جبلت جو ......

مشا - (افسردگی سے) ابا، دیکھئے - اشتہاری بورڈوں والے آ رہے ہیں -

(چند لوگ طبلے اور ڈھول اٹھائے ہوئے آتے ہیں، ان کے آگے آگے ایک شخص اشتہاری بورڈ اٹھائے چلا آ رہا ہے، بورڈ پر بہت لمبے لمبے بالوں والے ایک آدمی کی تصویر بنی ہوئی ہے اور اس کے نیچے لکھا ہوا ہے "کسی زمانے میں میں بالکل گنجا تھا")

شاہد حمید

جنبی - بڑی دیر لگادی تم نے! اب وہ سرکاری رپورٹ تیار
کر رہے ہیں، خیر کوئی بات نہیں، اب بھی بہت سے کام ہو۔
اشتہاری بورڈ اٹھانے والا - (شہر جاتا ہے اور بلند آواز سے
تقریر کرنے لگتا ہے) بہنو اور بھائیو! میں پیدائشی گنجا تھا۔
بہت عرصے تک میرے سر پر بال نہ آگے اور جو چند بال تھے
بھی، انہیں بالوں کے بجائے بٹیر کی اون کہنا شاید زیادہ مناسب
ہوگا۔ شادی کے وقت میری سفید اور ہموار چاند چمک رہی
تھی اور بیوی . . . . .
میاح - کتنا بڑا المیہ۔ شادی اور ایسا سر! لاحول ولا! . . . .
بچو، سمجھے ہو؟ اس کا تصور ہی کتنا اذیت ناک ہے!
(سب تماشائی نہایت سکون کے ساتھ سنتے ہیں یہاں
تک کہ سپاہی بھی قلم ہاتھ میں پکڑے اسی طرف متوجہ
ہو جاتا ہے)
اشتہاری بورڈ اٹھانے والا - (نہایت جوش اور ولولہ
کے ساتھ) اور آخر وہ وقت آن پہنچا جب میری:
ایک ایک بال کے لئے ترسنے لگی۔ نیم حکیموں کے
کہ وہ تمام نسخے اور دوائیں . . . . .
میاح - پیٹر، اپنی نوٹ بک نکالو۔
خونخوار عورت - لیکن وہ گرے گا کب؟
مالک - (تشکر آمیز لہجے میں) اگلی مرتبہ مادام، اگلی مرتبہ
اب کی بار میں اسے اتنا مضبوط نہیں باندھوں گا۔
. . . . سمجھ گئیں آپ؟

(پردہ)

شاہد جم

مغنی

ساونی

المجید بھٹی

(ایک نئے گیت کے چند بول)

رے من میں اُمنگ
رے جی میں ترنگ رہے ساون کا رنگ
یوں ہی جگ مسکرائے

لہراؤں میں
انبوا کی ڈالی پہ کُوکے کوئلیا
کوآو ــــــ کُو
جانے مجھ کو بُلائے پیا جھُولا جھُلائے
اور گاؤں میں
گاؤں میں

برا گورا ہے انگ
برے نینوں میں رنگ جیوں آشا کے سنگ
پیا گھٹ میں سمائے

اٹھلاؤں میں
انبوا کی ڈالی پہ کُوکے کوئلیا
کُوآو ــــــ کُو
جانے مجھ کو سمجھائے پیا جھُولا جھلائے
اور گاؤں میں
گاؤں میں

میں جو دیکھوں دھنک
چھنا چھن چھن چھنک چھنا چھن چھن چھنک
میرا من گنگنائے

جھوم جاؤں میں
انبوا کی ڈالی پہ کوکے کوئلیا

کُوآو ــــــ کُو
جانے مجھ کو بلائے پیا جھولا جھلائے
اور گاؤں میں
گاؤں میں

کبھی بالم کے سنگ
جو بجے جل ترنگ بڑھے جیون امنگ
سارا جگ مسکرائے

مسکراؤں میں
انبوا کی ڈالی پہ کُوکے کوئلیا
کُوآو ــــــ کُو
جانے مجھ کو بُلائے پیا جھولا جھلائے
اور گاؤں میں
گاؤں میں

کبھی سکھیاں جو آئیں
رنگ رلیاں منائیں گائیں جھولیں جھلائیں
من میں وہ موج آئے

بہی جاؤں میں
انبوا کی ڈالی پہ کوکے کوئلیا
کُوآو ــــــ کُو
جانے مجھ کو سمجھائے پیا جھولا جھلائے
اور گاؤں میں
گاؤں میں

عبدالمجید بھٹی

شیروانی

وہ گویا سب سے اگلا، بچھاؤ نرم، اوڑھو گرم، گٹھڑی میں گرم اُٹھے دو کرم، بالکل یہی حال شیروانی کا ہے۔ اچھی خاصی مُلّا کی لنگی ہوتی ہے، بچھانے اوڑھنے غرض ہر کام میں الیبیے۔ اس سے بہتر لباس ہماری دانست میں تو دنیا بھر میں کوئی نہیں، اس کے لئے نہ تو قد و قامت کی قید نہ چہرے مہرے کی تخصیص نہ ذات پات کا جھگڑا، مسلمان، ہندو، برہمن، دھیڑ، چمار، اندھا، کانا، لنگڑا، لولا، ہر شخص شیروانی پہن سکتا ہے۔ اس کے لئے کپڑے کی تخصیص بھی نہیں سوٹ کے لئے بعض خاص خاص قسم کے کپڑوں کی شرط ہے مثلاً ٹوئیڈ، سلک، چیک، فلینل کے سوا دوسرے کپڑوں کے سوٹ بنائے ہی نہیں جاتے مگر شیروانی، ہمرو، مشجر، کمخواب، مخمل، زربفت، پوت، اطلس جامہ وار، چھینٹ، لٹھے، ململ، چکن، ڈوریئے جا نک کی بن سکتی بلکہ بنتی ہے۔ دولھوں کے لئے شادی کے روز پہننے کی شیروانی عام طور پر ہمرو، مشجر کمخواب، کیموا، زربفت، پوت اور اطلس کی حسب مقدرت بنائی جاتی ہے۔ صاحبانِ ذوق ٹوئیڈ، سلک، پا مرج، ایس او کی شیروانیاں موسم کے لحاظ سے سلواتے ہیں اور بعض من چلے ڈوریئے، ململ بلکہ ڈبے کی جالی تک کی شیروانیاں سلوا لیتے ہیں۔ مئی کے اواخر اور جون کے اوائل میں گرمی ایک دم سے بڑھ جاتی ہے تو بعض لوگوں کے دماغوں پر بھی خاصا اثر ہو جاتا ہے، چنانچہ بعض محرور المزاج اشخاص اس موسمی تغیر سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی وضع قطع دیکھ کر آپ پہچان سکتے ہیں کہ گرمی نے ان کے دماغوں پر کس قدر اثر کیا ہے، قرمزی یا سبز ریشمی قمیص پر ڈوریئے یا ڈبے کی جالی یا چکن کی شیروانی، سرخ یا اور کسی شوخ رنگ کا ازار بند کولہوں پر لٹکا ہوا چست اریب کا چوڑی دار پاجامہ یا پھر تیس انچ چوڑے پائنچوں کا پتلون نما پاجامہ، پاؤں میں زر نگار قصوری جوتی یا مہین سینڈل اس پیکر کا یہ حال کہ ع

کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ!

لطف یہ کہ ٹوپی بھی کسی شوخ رنگ کی، سر پر ترکی یا رامپوری ٹوپی ترچھی جمی ہوتی۔ شیروانیوں کی بہار عید کے دن دیکھنے کی ہوتی ہے بقر عید میں وہ رعنائی لباس نہیں رہتی، مگر عید میں خوب دل کھول کر داد شوخی و شنگی دی جاتی ہے، بھانت بھانت کی شیروانیاں، طرح طرح کے رنگ قسم قسم کا کپڑا نظر آتا ہے۔ بعض لوگ شیروانی اپنی پسند کی پہنتے ہیں بعض دوسروں کی پسند کی یعنی بیوی کی پسند یا دوستوں کی مگر بعض ایسے بھی ہیں جو دکاندار کا پسند کا کپڑا خرید لیتے ہیں، میرے ایک دوست ہمیشہ تنہا جا کر شیروانی کا کپڑا خریدتے ہیں، چار چھ قسم کے کپڑے دیکھ کر دکان دار ہی سے پوچھتے ہیں کہ بھائی! شیروانی کون سے کپڑے کی اچھی ہو گی اور وہ جس کپڑے کی سفارش کرے آپ لے لیتے ہیں، چنانچہ بعض ستم ظریف ان کے اس بھولے پن سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور بعض مزے لیتے ہیں، شہر کے دکان دار عموماً خراب کپڑا ان کے گلے باندھ دیتے ہیں مگر ایک دفعہ تو ٹھنڈی رام جی نے کمال کر دیا کہ ان کو مخمل دے دیا اور انہوں نے شیروانی سلوالی اور مدت تک پہنتے بھی رہے، مخمل بھی سرخ اور شوخ۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہیں کپڑے کی قسم رنگ اور قیمت سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔ چاہتے ہیں کہ شیروانی سل جائے مگر مصیبت

تمکین کاظمی

یہ ہے کہ جب شیروانی سلوانے کی ضرورت ہوگی دو چار دوستوں کو گھیر لیں گے کہ بھئی ہمیں شیروانی کا کپڑا دلا دو، اور احباب جو کپڑا پسند کریں یہ خرید لیں گے، ایک اسی قسم کے دوست نے ایک بار ریشمی چھینٹ کی جس کے پردے اور تکیے وغیرہ بنائے جاتے ہیں شیروانی سلوالی اور اسے مزے سے پہنتے رہے، ایک بزرگ عام طور پر بیوی کی پسند کا کپڑا پہنتے ہیں ایک دفعہ ان کی محترمہ نے ان سے جارجٹ لانے کو کہا فیروزہ رنگ کا جارجٹ جو انہیں دنوں بازار میں آیا تھا، محترمہ کے لئے خرید لیا پھر جو اپنی شیروانی کا خیال آیا تو اسی رنگ کا جارجٹ خرید لیا اور شیروانی سلوا ڈالی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ساڑی کا جارجٹ بوٹی دار تھا اور شیروانی کا سادہ مگر تھے دونوں ہم رنگ!

شیروانی کی سلوائی میں بھی بڑی بڑی کرامتیں ہوتی ہیں۔ شیروانی کے موجد سر سالار جنگ مختار الملک تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے شیروانی دکن میں رائج کی اور اس کو درباری لباس قرار دیا اور اسی خاندان کی آخری یادگار یوسف علی خاں سالار جنگ مرحوم نے بھی شیروانی میں بڑی کاٹ چھانٹ کی۔ سالار جنگ کے تخیل اور جان برٹن کی تراشش نے شیروانی کو بہت اونچا کر دیا۔ فوجی گلا، جیبوں پر پردہ، تین ٹک کا ڈھائی تین انچ اونچا گلا۔ یہ سب سالار جنگ مرحوم اور جان برٹن مغفور کی کرامتیں تھیں۔

اگر شیروانی کے "ارتقائی مدارج" پر کبھی تحقیقات یعنی ریسرچ ہو تو سب سے پہلے جان برٹن اور اس کے ہاں شیروانی سلوانے والوں کا نام لینا پڑے گا کیونکہ انہیں لوگوں نے بقول کسے شیروانی کی کایا پلٹ دی۔ پہلے انگرکھے ایک ٹک کے ترچھے گلے کی شیروانی پہنی جاتی تھی جس کو پانچ گھنڈیاں (بٹن) لگائی جاتی تھیں اور ہاتھوں یعنی کفوں پر دو دو گھنڈیاں! جان برٹن نے سینے پر چھ اور ہاتھ پر تین اور اس کے بعد سینے پر سات اور آستینوں پر چار چار گھنڈیاں لگا دیں۔ گلے پر تین تین ٹک لگا دیئے اور نہایت اونچا اور کھڑا گلا بنا ڈالا۔ تراش بھی بہت بدل دی اور شیروانی کیا سے کیا ہو گئی، اب تین ٹک کے بجائے ایک لمبا ٹک۔ بالکل فوجی عام ہو گیا، چھاتے اور کندھوں پر پیڈنگ دی جانے لگی۔

اگر شیروانی کے اقسام الگ الگ کئے جائیں تو بیسیوں قسمیں ملیں گی قدامت پسند حضرات اب بھی ایک ٹک کے آڑے گلے کی شیروانی ڈھیلی ڈھالی، شوخ رنگ کے موٹے کپڑے کی پہنتے ہیں امراء اور عہدہ دار جان برٹن وغیرہ کے ہاں سلواتے ہیں اور ان شیروانیوں میں یکسانی بھی ہوتی ہے، متوسط اور درمیانے طبقے کے لوگ اپنی شیروانیاں متوسط درزیوں سے سلواتے ہیں مگر ان میں یکسانی کم ہوتی ہے اور بعض دفعہ تو شیروانی بہت بے ڈھب ہو جاتی ہے، بعض کوتاہ گردن اونچے فوجی گلے کی شیروانی سلواتے ہیں اور طویل القامت آدمی اپنی شیروانی ٹخنوں کے قریب قریب تک لمبی رکھواتے ہیں، بے گوشتے۔ دبلے پتلے لوگ ڈھیلی ڈھالی شیروانی سلواتے اور فربہ قسم کے نہایت ہی چست اور فٹ پہنتے ہیں جس کے ہر ایک سلوٹ میں دو دو سیر گوشت پھنس جاتا ہے۔

نوجوان طبقے نے شیروانی کو گھٹنوں سے اوپر چڑھا لیا ہے۔ تنگ آستین، لمبا گلا، شیروانی کی لمبائی رانوں تک یعنی گھٹنوں سے اوپر، سینے اور کمر پر بے انتہا چست، چھاتے اور مونڈھوں پر پیڈنگ، چالیس انچ چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، کرسٹی یا رامپوری لال لال شوخ رنگ کی ٹوپی، پلاسٹک کا سینڈل یا چپل، بال بڑھے ہوئے، چہرہ صاف، "سبزہ پامال یعنی ریزیڈ" ناک کے بال بڑھے ہوئے، لمبے لمبے ناخن ان پر کیوٹیکس لگا ہوا، سفید سفید براق دانت، بھینی بھینی خوشبو کا سینٹ رومال میں چھڑکا ہوا اور رومال بائیں ہاتھ کی آستین میں، طبیعہ وشستہ نہاں

تمکین کاظمی

اگست ۱۹۵۰ء

شاید اسی تصور میں غالب نے کہا تھا ع

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں سگرٹ کھلا!　　　لے رومال

مگر شارحین غالب نے دشنہ کو دست سے اور سگریٹ کو خنجر سے بدل دیا۔ خیر مطلب تو صاف ہی ہے کیونکہ مطلب ہے ناز و غمزہ بہر حال

سر پر ٹوپی، پر گندم گوں چہرے، لمبی لمبی قلمیں کنپٹی پر کے بال خصوصیت سے جمے ہوئے، جب کبک رفتاری سے مصروف خرام ہوتے ہیں تو

یہ کہنے کو جی چاہتا ہے سے

گلے کٹیں گے نہ یوں تیر بدل بدل کے چلو　　　چلے گی تیغ سر راہ ذرا سنبھل کے چلو

اور استاد جلیل کے اس مصرع کا سماں بندھ جاتا ہے ع

جب تم چلو زمین پہ چلے آسماں چلے!

بعض وضعدار ایسے بھی ہیں جو تیس چالیس سال سے ایک ہی قسم کے کپڑے کی شیروانی بلا لحاظ موسم پہنتے ہیں، بعض حضرات گرمی سردی ہر موسم میں ٹوئیڈ

کی استر دار شیروانی پہنتے ہیں اور بعض بزرگ ہر موسم میں سفید الپس۔ اوکی شیروانی!

ٹوئیڈ کی شیروانیاں دوسری عالمگیر جنگ سے دو ایک سال پہلے تک زیادہ پہنی جاتی تھیں مگر جب جاپان نے کرم کیا اور ڈھائی روپے

گز ٹوئیڈ ملنے لگا تو شرفا نے ٹوئیڈ پہننا چھوڑ دیا اور بہشتی خاکروب چپراسی خلاصی ٹوئیڈ پہننے لگے۔ جنگ کے زمانے میں ٹوئیڈ پھر گراں ہو گیا

اور اب فی راستا ہو گیا ہے مگر شرفا ٹوئیڈ چھوڑ رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے کھدر پوشی شروع کی ہے اور اس میں کچھ ایجاد بھی فرمایا ہے مثلاً ہمارے

دوست ..... خاں صاحب نے نہ صرف کھدر کی شیروانی شروع کی ہے بلکہ "گند، بہ بزہ یا خشک خوردن اگرچہ گندہ و لیسا بجا و بندہ" کے

اصول پر آپ نے شیروانی کا پردہ الٹ دیا ہے۔ عام طور پر سیدھی طرف کا پردہ نیچے آتا اور اس پر گھنڈیاں ٹانکی جاتی ہیں، الٹے ہاتھ کا پردہ اوپر آتا اور اس

پر کاج بنائے جاتے ہیں۔ مگر خاں صاحب تو بس ہم الٹے بات۔ الٹی یار الٹا واقع ہوئے ہیں خود کو غدار تنخواہ کو تنخا لکھتے ہیں اسی طرح شیروانی کو بھی

الٹا دیا ہے ع　　　تیرے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے!

شیروانی پوشی میں ایک چگونگی تعداد کی بھی ہوتی ہے۔ بعض لوگ ہر مہینے ایک آدھ شیروانی سلواتے ہیں اور بعض ہر سال ایک اور بعض دس پندرہ سال

میں ایک۔ مثلاً نواب قاسم الدین حسین صاحب کے جسم پر عیدین میں اس جامہ دار کی شیروانی نظر آتی ہے جو حضور غفران مقام میر محبوب علیخاں نے ان کے والد

نواب معز یار جنگ کو چہل سالہ جوبلی کے موقع پر سرفراز فرمایا تھا۔ مولوی سید خورشید علی صاحب کے جسم پر دو چار دفعہ سے زیادہ کوئی شیروانی نظر

نہیں آتی، نواب داؤد جنگ کوئی شیروانی سال بھر سے زیادہ استعمال نہیں کرتے یہی حال معین الدولہ اور ولی الدولہ کا بھی تھا۔

شیروانی پہننے کی عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بعض لوگ صرف دفتر وغیرہ جاتے ہوئے شیروانی پہنتے ہیں اور گھر پر یا محلے میں یا مسجد میں بغیر شیروانی

کے تہمد باندھے رہتے ہیں۔ ہمارے دوست مولانا عبدالسلام دیوبندی گھر سے شیروانی لے کر ضرور نکلتے ہیں مگر جس طرح آغا حشر کاشمیری

کبھی کبھی کندھے پر کوٹ ڈال کر کلکتہ میں گھوما کرتے تھے اسی طرح شیروانی کندھے پر ڈالے دفتر تک پہنچ جاتے ہیں اور دفتر پہنچ کر شیروانی پہن

لیتے ہیں۔ بعض لوگ بغیر شیروانی پہنے گھر کے اندر سے دیوان خانہ (ڈیوڑھی) بھی نہیں آتے۔ نواب رفعت یار جنگ بہادر کو کسی نے بغیر شیروانی

تمکین کاظمی

نہ دیکھا ہی نہیں، حمام میں بھی شیروانی پہن کر داخل ہوتے اور حمام کے بعد شیروانی پہنے ہوئے باہر آتے۔ (مرحوم)

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، ملا کی لنگی اور شیروانی دونوں علاقی بہنیں ہیں۔ شیروانی سے ہر کام لیا جاتا ہے، بازار عام میں بعض لوگ پرانی بچھائے نماز پڑھتے نظر آتے ہیں، چائے خانوں میں یار لوگ چائے پی کر شیروانی کے دامن سے منہ صاف کر لیتے ہیں کبھی آپ میر عالم کی منڈی کے رستے سے گزریں تو بعض لوگ شیروانی کے دامن میں سبزی ترکاری لے جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔

مختصر یہ کہ شیروانی جانماز، رومال، دسترخوان، دستی تکیہ ہر چیز بن سکتی ہے بشرطیکہ استعمال کرنے والے کی طبیعت میں جدت ہو یا کوئی شدید ضرورت آ لگے (پلنگ) جائے اور غیر ارادی طور پر ضرورت ایجاد کی ماں اور شیروانی حاجت روائی کا ذریعہ بن جائے ایک دفعہ ایک بزرگ کی میت میں جانے کا اتفاق ہوا برسات کا زمانہ تھی، قبرستان میں سب کو بیٹھنا پڑا ایک مزار کے چبوترے پر ہم نے بھی رومال بچھا کر دھر نا دیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نماز جنازہ کی پکار ہوئی ہم نے اٹھ کر رومال اٹھانا چاہا تو وہ پتھر سے وصل ہو چکا تھا۔ رومال سے ہاتھ دھونا پڑا مگر وضو بھی کرنا تھا اب وضو کرنے کے بعد جو ہم رومال کا خیال آیا تو وہ چبوترے پر چسپاں تھا اور تو کچھ تھا نہیں ہم نے خاموشی کے ساتھ شیروانی ہی کے دامن سے ہاتھ اور منہ خشک کر لیئے شیروانی زندہ باد!

شیروانی کے پرانا ہو جانے یا پھٹ جانے کے بعد یار لوگ اس سے بھی بڑے بڑے کام لیتے ہیں، ایک بزرگ پرانی شیروانی کی آستینوں کی تھیلیاں بنا لیتے ہیں اور دامن اور گھیر کے تکئے سلواتے ہیں اکثر لوگ پھٹی ہوئی شیروانی کے کوٹ یا ویسٹ کوٹ یا بچوں کی شیروانیاں سلوا لیتے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے لکھنؤ میں مجھ غریب کو ایک تھان ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی (کھدر) کا سرفراز فرمایا اور میں نے اس کی شیروانی سلوائی میں ہمیشہ سے چست شیروانی پہنتا ہوں، پہلے ہی دھوپ میں شیروانی تنگ ہو گئی اور ایک روز جو میں نے زبردستی کھینچ تان کر پہننا چاہی تو مونڈھوں پر سے غائب ہو گئی، چونکہ شیروانی بیکار ہو چکی تھی اور اس کھادی کی عزت جو باری میاں مرحوم کی سرفراز کردہ تھی میرے دل میں بہت تھی اس لئے میں نے بھی اس کے دامن اور گھیر کو پھاڑ کر چند گاندھی ٹوپیاں سلوا ڈالیں اور مدت تک پہنتا رہا۔

خیر یہ تو ہیں پرانی باتیں۔ اب حیدرآباد سے تو شیروانی تقریباً رخصت ہو رہی ہے۔ بش شرٹ اور لیش کوٹ کا رواج اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ شیروانی کم ہوتی جا رہی ہے، ہر پانچ آدمیوں میں سے صرف دو آدمی شیروانی پوش نظر آئیں گے اور باقی تین آدمی بش پوش! اس طرح مستقبل قریب میں شاید فی صد ایک آدمی شیروانی پوش رہ جائے گا، پنڈت نہرو نے نہ صرف شیروانی کو اپنا لباس بنا لیا ہے بلکہ بھارت کا درباری لباس بھی قرار دیا ہے اور اسی طرح نواب زادہ لیاقت علی خاں بہادر نے بھی شیروانی کو اپنا لباس بنانے کے علاوہ پاکستان کا درباری لباس قرار دیا ہے[1] مگر باوجود اس کے شیروانی کم ہوتی جا رہی ہے، کاش کوئی من چلا شیروانی پہنو کی مہم شروع کرے اور اس تحریک کے زیادہ سے زیادہ معاون پیدا کر کے شیروانی کو عام کر دے۔

---

[1] زیر اعظم پاکستان سے پہلے حضرت قائد اعظم نے شیروانی کو قومی اور سرکاری لباس قرار دیا تھا اور اس کو خود استعمال کر کے اس کا وقار بڑھا دیا تھا۔ "مخزن"

حقیقت یہ ہے کہ شیروانی میں جو لطافت اور بھاری بھرکم پن ہے کسی اور لباس میں بالکل نہیں۔ سوٹ اس میں شک نہیں ہے چالاکی پیدا کر دیتا ہے مگر شیروانی کا وقار اس میں کہاں؟ پھر سوٹ کے لئے بڑی تیاریوں کی ضرورت ہے شیروانی کے لئے کسی خاص ٹوپی پاجامے کی ضرورت نہیں۔ زناردارانِ دکن ہمیشہ دھوتی باندھ کر شیروانی پہنتے ہیں اور بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چاہے آپ تنگ پہنیں یا پتلون، ناڑھیلا ڈھالا پاجامہ یا ادیب کا چوڑی دار، ہر ایک پر شیروانی کھل جائے گی اسی طرح سر پر چاہے رفیدہ ہو چاہے پیشوائی پگڑ منصب داری دستار ہو چاہے شملہ، گاندھی ٹوپی جناح کیپ، ترکی، ایرانی، مصری کوئی سی ٹوپی ہو شیروانی پر سب چلے گی۔

پاؤں میں چاہے بوٹ ہوں یا شورز، چڑھاؤں ہو یا چپل، کھڑاؤں ہوں یا سلیپر ہر مال چالو! یہ خصوصیت کسی لباس میں آپ پائیں گے، اس لئے بھائیو شیروانی پہنو!

شیروانی زندہ باد!

تمکین کا

○

حضرتِ وقار کی غزل

جولائی میں حضرت وقار انبالوی کی غزل میں ایک ایسا شعر شائع ہو گیا جو قافیہ کے لحاظ سے اس غزل کا شعر نہیں رہ سکتا۔ یہ دلچسپ غلطی جس پر بہت لوگوں کو تعجب ہوا ہوگا حضرتِ وقار اور مدیرِ مخزن کی "متحدہ مساعی" کا نتیجہ تھی قارئین براہِ کرم تصحیح فرمالیں۔ پہلے پہل نوائے وقت کے ایک کاتب صاحب نے ہمیں اس غلطی کی طرف متوجہ کر کے کاتبوں کی آجتک کی تمام غلطیوں کا "کفارہ" ادا کر دیا ہے۔

مخزن کا رعایتی چندہ

اہلِ ذوق کے فائدہ کے لئے "مخزن" کا چندہ سات روپے سالانہ سے گھٹا کر پانچ روپے کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح رعایتی ششماہی چندہ تین روپے ہے ہمیں افسوس ہے کہ جولائی کے مخزن میں کاتب کی غلطی سے پھر چندہ سالانہ سات روپے اور ششماہی چار روپے درج ہو گیا حالانکہ یہ رعایت تا اطلاعِ ثانی بدستور قائم رہے گی اور شائقین اس سے برابر فائدہ اٹھا سکیں گے۔

●

یوسف محمود
(ایم۔ اے)

ناراض

(افسانہ)

ب پانچ سال کے بعد گھر آیا تھا مگر پہنچ ہی دن میں وہ حالت ہوگئی کہ خدا کی پناہ۔ گھر میں ماشاء اللہ والدہ، خالہ، نانی، دادی، کوئی ایک درجن
ہ چچیوں اور بھتیجے بڑی بہنوں کے علاوہ چھوٹے بچوں کی وہ بھرمار تھی کہ مجھے اس مقولے کی صحت کا یقین ہوگیا کہ جب اللہ میاں دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا
نے؟ پچھلے پانچ سالوں میں کیا کیا کیا۔ کہاں کہاں گیا۔ اگر کسی جگہ نہیں گیا تو کیوں نہیں گیا اور اگر گیا تو کیوں۔ غرض کہ اس قسم کے سینکڑوں فلسفیانہ مسئلوں
ہی معضل۔ روشنی ڈالنی پڑی کہ سر چکرا گیا۔ اور پانچ دن کے اس قلیل عرصے میں مجھے بچوں سے تو "ایسی والہانہ" نفرت ہوگئی کہ اپنے آپ سے ڈرنے لگا۔
ضے پیارے پیارے۔ بچے! ہونہار! ماں باپ کے لاڈلے! معصوم آنکھیں! چھوٹے چھوٹے ہونٹ! میرے بس میں ہوتا تو سب کو تھوڑی تھوڑی
ملا دیتا۔ ماموں جان کیا لوگ واقعی چین میں مینڈک کھاتے ہیں؟ ماموں جان! برما کے لوگ سانپ کھا کر مر نہیں جاتے؟ اگر نہیں مرتے تو
نہیں مرتے؟ چچا ماں کے بھائی کو سانپ نے کاٹا تو وہ کیوں مر گیا؟ آپ کی موٹر کار اتنی لمبی کیوں ہے؟ بس گھنٹے میں فقط سو میل کر سکتی
یا جان کہتے تھے ایک ہوائی جہاز ہے جو گھنٹے میں چھ سو میل کرتا ہے (میرے سگریٹ لائٹر کو پانی کے گلاس میں سے نکالتے ہوئے) اس
ے کی کونسی بات ہے اقبال بھئی۔ بچہ ہی تو ہے، اور پھر یہ ابھی دھوپ میں سوکھ جائے گا۔

میں نے والدہ محترمہ سے علیحدگی میں کہا۔ کہ آپ کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ یہ میں ہر سچے مسلمان کی طرح تسلیم کرتا ہوں مگر ابھی میری
لیے ہے جنت کو چندے انتظار کرنے دیجئے۔ اور پھر سبھی علمائے دین کا اس پر اتفاق ہے کہ اب بیٹوں کی قربانی کا حکم نہیں۔ ایک دنبے [illegible]
ہی سے کام نکل جاتا ہے۔ اور اگر آپ نے یہ منت مان ہی رکھی ہے تو بسم اللہ۔ میری رگوں میں بھی خونِ خلیلی ہے ذبح کر ڈالیے۔ کیا مجال ہے
گردن سرک جائے۔ مگر اس طرح تڑپا تڑپا کر مارنا تو کسی مذہب میں روا نہیں۔ اللہ میاں کے غضب سے ڈرنا چاہیے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے

والدہ محترمہ نے بڑے تحمل سے جواب دیا: "لاکھ لعنت ہے ایسی سفید خون اولاد پر، جو اپنے بہن بھائیوں کو دیکھ نہ سکے" اور پھر پیار بھرے
میں فرمایا "خدا ایسی اولاد دشمن کو نہ دے۔ شرم نہیں آتی بے شرم، بے غیرت کو۔ پانچ سال کے بعد گھر آیا ہے اور کسی سے سیدھے منہ بات
نہ کرتا۔ بڑا انگریز کا بچہ بن گیا ہے۔ چند ڈگریاں لے آیا، ہمارا افسر بن گیا ہے۔"

میں نے بڑی عاجزی سے اپنی غلطی کی معافی چاہی۔ والدہ محترمہ کو فارسی مقولے کا ترجمہ سنایا کہ بچوں سے خطائیں ہو ہی جاتی ہیں، معاف
کرنا ہمیشہ سے شیوۂ بزرگی ہے، اور پھر کہا کہ اگر کوئی گلی محلے والی عورت یا بچہ باقی رہ گیا ہو تو شوق سے انہیں بھی آنے کی دعوت دے دیجئے۔ میں
سب کے سوالات کا جواب بھی دوں گا۔ آخر اس تعلیم کا فائدہ ہی کیا جو اپنوں کے کام نہ آسکے۔

والدہ محترمہ بولیں کہ گلی محلے والے جائیں بھاڑ میں۔ میں کیوں لگی انہیں بلانے۔ ہاں تمہاری خالہ عصمت آرہی ہیں۔ اور ساتھ اختر بھی۔

یوسف محمود

اگست سنہ ۱۹۵ء

وہ بھی اب ماشاءاللہ بڑی ہوگئی ہے۔ تمہاری تو بڑی چہیتی ہوا کرتی تھی۔ وہ آئیں تو ذرا باہر آ بیٹھنا۔ ان سے چند باتیں کر لینا۔ کتابیں پڑھنے کو ساری عمر پڑی ہے"

مجھے یوں یاد پڑتا ہے جیسے بس اتنا کچھ ہی کہنے کے بعد، والدہ صاحبہ اٹھ کر باہر چل دیں۔ یا شاید انہوں نے کچھ اور کہا ہو۔ یا کچھ دیر اور بیٹھی رہیں۔ بہرحال جب میرے حواس خمسہ پوری طرح میرے قابو میں آئے تو میں اکیلا بیٹھا تھا، اور ایک کھلی ہوئی کتاب میرے سامنے "اختر" میرے دماغ کو اس نام سے ایک دھکا سا لگا۔ اختری کو اختر کہنا ایسا ہی بے معنی معلوم ہوا جیسے ہم یک لخت تیترہ کو تیتر کہنا شروع کر دیں۔ ایک دلکش لطیف سی کیفیت جس کی یاد سے چھوٹی چھوٹی لہروں پر بادِ نسیم کا رقص یاد آئے۔ یہ تھی اختری۔ میری بھتیجی جس کی موہوم مدھم سی مسکراہٹ سے موتیا کے پھولوں میں خوشبو پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ جس کی موجودگی سے خالہ عصمت کے گھر میں بھی رنگا رنگ لہریں دوڑ جایا کرتیں۔

میں ان دنوں بیس ایک برس کا تھا۔ اختری ہوگی یہی کوئی سولہ برس کی۔ کالج سے آ کر اکثر شام کی سیر کا انتظار رہا کرتا تھا۔ اور پھر قدم خود بخود خالہ عصمت کے گھر کی طرف مڑ جاتے۔ یہ نہیں کہ ان کا گھر کوئی لارنس باغ میں تھا۔ قلعہ گوجر سنگھ والی سڑک پر ایک پرانی وضع کا مکان تھا۔ اور میں تھا کہ روز شام کو جا دھمکتا۔ اختری انٹرنس کا امتحان دے رہی تھی اور میں تھا اس کا بے تنخواہ کا ماسٹر۔

اختری کو غالب کے شعر پڑھاتے پڑھاتے میں اکثر ایسے شعر پڑھ جاتا جو غالب کو کبھی سوجھے تک نہ تھے۔ اس کی بوڑھی دادی سر نمازیں پڑھتی رہتی۔ خالہ عصمت شام کا کھانا پکانے میں مصروف ہوتیں، اور میں غالب کے اشعار پڑھتے ہوئے کہتا "میری جان شعر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی اس وقت تک مہمل اور بے معنی ہے جب تک کسی کے پیارے پیارے گھنگھریالے بال میرے چوڑے چکلے شانوں پر نہ بکھر جائیں۔ آپ جانتی ہیں یہ بال کب بکھرتے ہیں۔ اختری کے سفید گالوں پر سرخی کی لہریں یوں دوڑ جاتیں، جیسے شفق کی کرنیں نیلگوں آسمان کو لہو سے رنگ رہی ہوں"۔ اختری دھیمی آواز سے کہتی "جی میں سمجھ گئی۔ اب خدا کے لئے اگلا شعر پڑھئے"۔

"تم خاک سمجھ گئی ہو۔ اس شعر کے سمجھنے کے لئے ہفتوں بلکہ مہینوں کی ضرورت ہے۔ اور اگر تمہاری یہی حالت رہی تو عمر بھر نہ سمجھ سکو گی"

اختری لجاتی منتیں کرتی "امی سن پائیں گی تو غضب ہو جائے گا"۔

"کیا غضب ہو جائیگا۔ غالب تھا ہی مشکل پسند، اور میں تمہاری امی سے ابھی سب کچھ کہے دیتا ہوں"۔ (زور سے) "خالہ جان"

"خدا کے واسطے۔ رسول کے واسطے کیا کیجئے گا۔ دیکھئے"

(باہر سے) "کیا ہے بیٹا"۔

"بولو تو پھر کل ہمارے ہاں آؤ گی کہ نہیں۔ بولو نا۔۔۔ (زور سے) "خالہ جان، آپ کی بیٹی ——"

"آؤں گی خدا کی قسم آؤں گی"۔

(خالہ عصمت اندر آتے ہوئے) "کیوں بیٹا کیا ہے"؟

"کچھ نہیں خالہ جان۔ یہ اختری بڑی تو جبے جو میں کہتا ہوں سنتی نہیں۔ اس طرح سے امتحان پاس نہیں ہوتے"!

سید احسن مارہروی

مولانا احسن مارہروی کی یاد میں

عرصے کے بعد جناب کی خدمت میں یہ عریضہ روانہ کررہا ہوں اس طرف کافی مشغولیت رہی جس کی وجہ سے مراسلت بند رہی اب ارادہ ہے کہ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً کچھ خدمت کرتا رہوں تاکہ اپنی تسکینِ ذوق بھی ہو۔

والدِ مرحوم و مغفور کے انتقال کی تاریخ ۳۱ اگست ہے آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۴۰ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو آپ نے بزم ہمایوں میں مرحوم کا تذکرہ کیا تھا۔ آپ لوگوں سے جو خصوصی تعلق مرحوم کو تھا اس کی بنا پر ان کی دو غزلیں اور ایک مکتوب روانہ کررہا ہوں۔ جو غزل آپ مناسب خیال کریں اور مکتوب اگست کے مخزن میں شامل فرما لیجئے یہ سال ان کے انتقال کا دسواں سال ہے۔ ارادہ ہے کہ اگست کے آخری ہفتے میں یہاں ایک مختصر ادبی مجلس ان کی یاد میں منعقد کی جائے تیسرے سال بھی ایک کامیاب جلسہ کیا تھا جس کی صدارت مولوی عبدالحق صاحب نے کی تھی۔

مرحوم کا مجموعہ مکاتیب تقریباً مکمل ہے۔ انشاء اللہ جلد شائع ہوگا۔ اگر آپ چند سطور اس مضمون کی شائع کردیں کہ جن صاحب کے پاس حضرتِ مرحوم کا کوئی ادبی خط ہو وہ اس کی نقل آپ کو یا مجھے بھیج دیں تو عنایت ہوگی۔

۵۱۶ جہانگیر روڈ
ڈاکخانہ نیو ٹاؤن کراچی ۵

نیازمند
سید احسن مارہروی ایم۔اے

مولانا مرحوم کا ایک مکتوب

بنام عبداللطیف اعظمی

لطف فرمائے تسلیم خلوص تسنیم۔ گرامی نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ جس مسئلے کے متعلق جناب نے خاکسار کی رائے دریافت کی ہے اس کا جواب حسب ذیل ہے :-

لفظ "نکات" کے باب میں مجھے ان حضرات کی رائے سے اتفاق ہے جو بکسرِ اوّل صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کی صحت و عدمِ صحت کا مدار لغت پر ہے تو غیاث اللغات کی یہ عبارت پڑھی جائے "نکات" بکسرِ اوّل۔ جمع نکتہ۔ و بضم محض غلط ...... نکتے کی ایک جمع "نکت" بھی ہے۔ وہ بضمِ نون ہے۔ جو حضرات نکات کو بضم نون غلط العام فصیح کے تحت میں لانا چاہتے ہیں وہ اگر مسئلے تک پہنچ سکیں تو ان کے نزدیک مَرَض۔ عَرَق۔ وَرَق۔ شَرَف وغیرہ بھی بسکون اوسط ہونا چاہئیں۔ حالانکہ یہ الفاظ بفتحتین ہیں۔ اسی طرح حذف بسکون اوسط ہے مگر آج کل اس قسم کے دوسرے الفاظ تمام ہی ایک ہی قسم کے حضرات کی زبانوں سے غلط استعمال ہوتے ہیں۔ بے شک بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جنہیں خلافِ لغت استعمال کیا گیا ہے۔ تحقیق لغت میں قیاس آرائی بے کار ہے۔ صرف استعمال مستند و معتبر ہے بقول مشہور ـــــ

در سخن کار بہ قیاس مکن — ترش باشد ترش، نہ تلخ تلخ (سخن)

امروز۔ امشب۔ امسال پر قیاس کرکے ام سحر ام شام۔ ام لیل نہیں بول سکتے وہ اہل علم اور ارباب قلم جن کی تحریریں مسلم و معتبر ہیں اور جنہیں مجتہدِ فن کا مرتبہ حاصل ہے اگر ان کے استعمال میں کوئی لفظ خلافِ لغت استعمال ہو گیا اور متفق علیہ مروج ہو گیا وہ فصیح سمجھا جائے گا اور انہیں فصحا کے زمرہ عام میں مانا جائے گا ورنہ بلحاظِ استعمال تخت۔ وقت بسکون اوسط کو تخَت۔ وقَت بفتحتین بولئے۔

منحصر کو منضر اور فصیل کو سفیل بولنے والے جہلا اور بازاری لوگ ہیں اور اسی زمرے میں وہ حرف شناس آجاتے ہیں جنہیں فن سے آگاہی نہیں۔ اور ادبی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو عوام کہا جائے گا نہ عام۔ میرے نزدیک غلط العام فصیح سے وہ اہلِ علم مراد ہیں جو مستند اور معتبر ہیں اور وہ لوگ جو بوجہ ناواقفیت یا عدم توجہی فنِ تحقیق سے نابلد ہیں ان کو عوام میں شامل کرنا چاہئے۔ اور ان کے لئے غلط العام فصیح کہنے کے بجائے یہ فقرہ کہنا چاہئے کہ غلط العوام ہیں۔
امید ہے کہ آپ اس جواب سے مطمئن ہوں گے مزید اطمینان کے لئے حدائق البلاغت۔ بحر الفصاحت اور دوسری تصانیف میں قواعد دیکھئے۔ والسلام خیر ختام۔

مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔
۴۔ ماریس روڈ۔

راقم
سید علی احسن۔ احسن مارہروی

حضرتِ احسن مارہروی کی ایک غزل

دل عشق میں ناچار ہے، معلوم نہیں کیوں
مجبور یہ مختار ہے، معلوم نہیں کیوں

دل خوگرِ آزار ہے، معلوم نہیں کیوں
جب دیکھئے بیمار ہے، معلوم نہیں کیوں

جو کام زمانے میں ہے سب کے لئے آساں
میرے لئے دشوار ہے، معلوم نہیں کیوں

ہم رند تو پھر رند ہیں، زاہد کو ہوا کیا
حوروں کا طلبگار ہے، معلوم نہیں کیوں

شوخی تری تصویر میں تجھ سے بھی سوا ہے
پھر نقش بدیوار ہے، معلوم نہیں کیوں

کوئی دلِ زخمی نہ ملا، بے خلشِ درد
گلزار یہ پُرخار ہے، معلوم نہیں کیوں

کچھ اور بھی کیا حق کے سوا اس نے کہا ہے
منصور سرِ دار ہے، معلوم نہیں کیوں

ہے روز کا معمول مگر خوابِ شبِ غم
مرنے سے بھی دشوار ہے، معلوم نہیں کیوں

دُہرے ہوئے جاتے ہیں نزاکت سے کمر کی
پھر ہاتھ میں تلوار ہے، معلوم نہیں کیوں

سوچے ہوئے وہ دل میں ہے معلوم نہیں کیا
خاموش لبِ یار ہے، معلوم نہیں کیوں

سب غیر مناتے ہیں اسی کی مگر احسن
تو جان سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

احسن مارہروی
اگست ۱۹۵۰ء

یارانِ نکتہ داں

منشی تلوک چند محروم

جولائی کا مخزن ملا۔ یوں تو تمام مضامین نظم و نثر انتخابی ہیں مگر جس چیز سے متاثر ہو کر یہ عریضہ لکھ رہا ہوں وہ جناب خلیل الرحمٰن صاحب کی نظم "انتقام" ہے۔ میں ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں ــــ "حضرت غالب کی اصلاحیں" بہت خوب چیز ہے۔ اس پر آپ کا نوٹ حقیقت کا آئینہ دار ہے اس لئے مزید توصیف محض تکلف بلکہ بے کار ہے۔

جگن ناتھ آزاد

(از دہلی)

جولائی کے "مخزن المخازن" میں شیخ عبدالقادر مرحوم کا مضمون دیکھ کر تعجب ہوا کہ ۱۹۱۲ء ہی میں انہوں نے ٹائپ کی اہمیت کو بھانپ لیا تھا۔ اصل میں اردو کا عشق ان کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا اور جو کچھ ہم آج محسوس کر رہے ہیں وہ انہوں نے چالیس برس پہلے دیکھ لیا تھا۔ اب یہ مسلّم ہے کہ ٹائپ کا استعمال شروع کرنے میں ہم جتنی تاخیر کریں گے اتنا ہی ہماری زبان، ادب اور صحافت نقصان میں رہیں گی لیکن ٹائپ کے انتخاب کا کام آسان نہیں۔ آپ کا اخبار "قندیل" ہمارے یہاں آتا ہے۔ اس کا ٹائپ آنکھوں کو اتنا بھلا معلوم نہیں ہوتا جتنا نمکداں (کراچی) کا ٹائپ۔ طہران کے اخبار "اطلاعاتِ ہفتگی" کا ٹائپ بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اگر حکومت پاکستان مدد پر آمادہ ہو تو آپ لوگوں کو نستعلیق کا ٹائپ رائج کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس میں ایرانی کتابت کا حسن بھی برقرار رہ سکے گا اور زیادہ سائنٹیفک بھی ہوگا ــــ اس پرچے میں یوسف جمال انصاری کی نظم بہت پیاری چیز ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے یہ تمنا ہوئی کہ کاش یہ نظم میں نے کہی ہوتی۔ مگر آخری شعر میں وہ کیفیت نظر نہیں آتی جو ساری نظم میں حاوی ہوتی ہے۔ شعر ہر اعتبار سے بے عیب ہے خامی اس میں کوئی نہیں لیکن خارجی کیفیات کا حامل بن کر رہ گیا ہے۔ باقی اشعار کا حسن داخلی کیفیات کے موزوں ترین اظہار میں پنہاں ہے۔ "حضرت غالب کی اصلاحیں" غالبیات میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ اصلاحیں فنی اصلاحیں ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے نظریاتی طور پر غالب کا مطالعہ کرنے میں بھی امداد ملتی ہے۔ "یارانِ نکتہ داں" میں ایک خط ہے نسیم جمالی صاحب کا۔ انہوں نے اقبال کی وہ ساری غزل لکھی ہے جس کا میں نے اس مضمون میں ذکر کیا تھا۔ اگر ان کے پاس علامہ اقبال کا ایسا اور بھی کلام ہو جو ابھی تک دنیا میں نہ چھپا ہو تو مجھے منگوا دیجئے ــــ ڈاکٹر تاثیر کی غزل خوب ہے۔ اس دور کی غیر مردّف غزلوں میں بالعموم اقبال کا انداز غالب آجاتا ہے (کیونکہ ردیف کے بغیر اردو غزل میں نغمہ پیدا کرنے کی کامیاب ترین کوشش اقبال نے کی ہے) لیکن یہ غزل اس قید سے آزاد ہے۔ اسلوب بھی شاعر کا اپنا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی لیکن یہ مطلع پر کیوں ختم ہوتی ہے؟ ــــ کول صاحب سے آپ کا شکوہ بے جا ہے۔ یہ اسی انجمن ترقی اردو (ہند) کے رکن ہیں جو ہندوستان میں اردو کی قبر کھودنے میں مصروف ہے۔ یقین جانیئے اردو کو اس ملک میں ختم کرنے اور اس کی نعش کو دفنانے کا فخر انجمن ترقی اردو (ہند) کو حاصل ہوگا۔ اردو کے لئے وہ دن انتہائی منحوس دن تھا جب اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جو فرد یا ادارہ ماضی کے تجربات سے سبق حاصل نہیں کرتا اس کا انجام

...تی جا سکتا ہے ـــــ پچھلے دنوں پاکستان پریس ڈیلیگیشن کے ممبر
...آئے تھے۔ میرا کافی وقت ان لوگوں کے ساتھ کانسٹیٹیوشن ہاؤس
...بسر ہوا۔ اکثر دوست بھی اس ڈیلیگیشن میں تھے لیکن اگر فیض، مہر،
...لک، حمید نظامی، فصیح، شورش بھی اس ڈیلیگیشن میں ہوتے تو بات
...اور ہوتی۔ یہاں ہر تقریب میں ہم نے ان کی کمی محسوس کی۔

وحید قریشی

اس خط کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ نسیم مجالی صاحب کی
...ملیہ میں علامہ اقبال کے چار شعر آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں
...مدعا یہ ہے کہ آپ کو ایک بات پر ٹوکا جائے۔ دوسرا فرض پہلے ادا کرتا
...ہوں۔ "یارانِ میکدہ" کا عنوان بدل دیجئے کیونکہ اب آپ خواتین کے خطوط
...بھی اس میں چھاپنے لگے ہیں۔ (وملہا ہو) یارانِ میکدہ کا عنوان میری معلومات
...کے مطابق مخزن میں کبھی درج نہیں ہوا۔ آئندہ بھی اس سے بچنے کی کوشش
...کی جائے گی مطمئن رہیے) علامہ کے چار شعر ۱۹۴۵ میں پسرور ضلع سیالکوٹ
...میں ایک بہت بوڑھے اسکول ماسٹر صاحب سے سنے تھے۔ ان
...میں پہلے تین ایک نظم سے ہیں جو ماسٹر صاحب کو یاد نہ تھی وہ صرف تین
...شعر سنا سکے جو لکھے جاتے ہیں۔ یہ اشعار اس تحریک کے بارے میں ہیں
...جس کے خلاف علامہ ایک زمانے میں (جب یہ شعر کہے گئے) اخباروں میں
...بیان بھی دے چکے تھے۔ چوتھا شعر سیالکوٹ کے شاعر جلوہ سیالکوٹی پر ہے
...جو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے اکثر علامہ کے استہزا کا نشانہ بنتے تھے۔
...شعر یہ ہیں۔

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے پہ رو رہا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

جس نے ہماری... ...اس جلوت کو کہہ رہا ہوں میں

گر اے شبِ سیہ تجھے حسرت ہے شام کی
کچھ قرض مانگ لے مرے روئے سیاہ سے

ان اشعار کی شاعرانہ حیثیت تو اس سے ظاہر ہے کہ علامہ نے اپنی
زندگی میں انہیں شائع نہ کیا۔ بس تبرک سمجھ کر رکھ لیجئے۔

صادق قریشی

جولائی کے مخزن میں آپنے غالب کی اصلاحوں کے متعلق
... قیمتی مضمون شائع کرکے غالب کے پرستاروں کی آنکھیں روشن
... غالب کس قدر ترقی پسند تھا!! املا کی صحت کتنی جدید ہے!
...ے آج بھی کئی لوگوں کو پہونچا، پہنچا لکھتے دیکھا ہے۔ غالب نے آج
... ۰۰ سال قبل بتایا کہ صحیح لفظ پہنچا ہے ـــــ اس پرچے میں بیلا اور
...امی کتاب پر آپنے خوب تبصرہ کیا ہے۔ اصل کتاب ابھی نظر سے نہیں
...گذری مگر اب تو دیکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ عجیب بات ہے کہ پنجاب
...نے اردو کی اتنی خدمت کی ہے کہ باقی تمام ملک کی خدمات سے اس
...کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ تقسیم سے قبل صرف لاہور کے اردو اخبارات ورسائل
اور کتابوں کی اشاعت ہندوستان کے تمام دوسرے شہروں کی اسی مجموعی
اشاعت سے زیادہ رہی ہے۔ مگر افسوس کہ پنجابی ادیب بعض لکھنوی
نقادوں کے ہمیشہ سے زیرِ عتاب چلے آتے ہیں۔ حالات بدل گئے۔
ملک تقسیم ہو گیا۔ دونوں ملکوں کی قومی زبان ایک نہ رہی، مگر یہ عتاب نہ
ٹل سکا ـــــ جون میں آپنے جنابِ جوش ملسیانی کی شرحِ غالب پر تبصرہ
کرتے ہوئے مدنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے" کی صحیح شرح
بیان کی ہے۔ یہ شرح تو غیر نئی نہیں (چند ماہ پہلے ماہ نو میں بھی شائع ہو چکی
ہے) البتہ پنجابی کے گرتہ اشک لے "کو عشق ہے" کی مسخ شدہ صورت
قرار دے کر آپنے ایک تازہ واردات پیدا کی ہے۔

حدیث یہ بات بھی پہلی نئی نہیں ـــــ سید احمد دہلوی کی فرہنگ
آصفیہ میں ... ... عشق ہے" کی تفصیل

شرح کے ساتھ میر اور دوسرے لوگوں کے اشعار بھی شامل ہیں۔ مدت ہوئی اسی کو دیکھ کر میں شعر کے صحیح مفہوم تک پہنچا تھا ورنہ اس سے پہلے میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح گومگو کی حالت میں تھا۔ آپ کا خط وصول ہونے کے بعد میں نے "ماہ نو" کا مضمون دیکھا جعفر علی خاں اثر نے شعر کی شرح تو مختلف کی ہے۔"

پرویز بختیار

"مخزن" کے دورِ جدید کے تقریباً تمام پرچے میری نظر سے گزرے ہیں۔ "مخزن" کے متنوع مضامینِ نظم و نثر اور ترتیب کی حسن کاری کو میں نے ہر بار سراہا ہے۔ "مخزن" "حسن بے لیلیٰ" ادب کا نقیب ہے۔ میرے خیال میں یہی اور صرف یہی ادب ہماری قوم کے عروج کا آئینہ دار ہے۔ "مخزن" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ادب میں یہ کسی گروہ بندی کا قائل نہیں اور اس لحاظ سے آپ کی ذات قابلِ صد مبارک باد ہے کہ ہوا کے مخالف رخ آپ نے اپنی قندیل روشن کر رکھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے دورِ ادارت میں "ہمایوں" میں لکھنے والوں میں سے کئی حضرات ابھی "مخزن" کے صفحات پر جلوہ گر نہیں ہوئے اور یہ نئے افسانہ نگار: اے۔ حمید، رفیق احمد، ست پرکاش سنگر، انور سدید اور اشفاق احمد صرف ادبِ لطیف، ساقی، ہمایوں اور اردو ادب کے لئے ہی مخصوص ہیں۔

شفقت کاظمی

کمالِ شوق کو کہتے ہیں ناتمام نظر
تمامِ شوق تری خواہشِ تمام کے بعد

. . . .

حضرت رخشاں ابدالی کا مضمون "غالب کی اصلاحیں" اور جناب ڈاکٹر تاثیر کی غزل دونوں ستائش سے مستغنی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ کم گو ہیں لیکن جب کبھی کچھ کہتے ہیں بے بدل کہتے ہیں۔

"مخزن المخازن" میں جنابِ شیخ عبدالقادر مرحوم سے متعلق آپ کا مضمون کام کی چیز ہے۔ اگرچہ مختصر ہے لیکن سر شیخ کی زندگی کا ادبی پہلو کافی حد تک اجاگر کیا گیا ہے۔ اگر آپ ان پر ایک مستقل کتاب لکھ ڈالیں تو آپ کی یہ خدمت دنیائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اختر انصاری اکبرآبادی

میں نے "مخزن" کے کئی پرچے دیکھنے کی طرح دیکھے ہیں۔ آپ نے اس رسالے کو نام اور کام دونوں اعتبارات سے "مخزن" بنا دیا ہے۔ اتنے ستھرے علمی ادبی رسائل کی کمی ہے۔ کاش دوسرے جرائد "مخزن" کو مثال و نمونہ بنا کر تقلید کر سکیں۔ جولائی کی اشاعت میں حضرتِ غالب کی اصلاح ایک ایسا مضمون ہے کہ جس سے استفادہ کیا جائے۔ جگن ناتھ آزاد اور خلیل الرحمٰن کی نظمیں اچھی ہیں۔ صفیہ شمیم اور ڈاکٹر تاثیر کی غزل سے محظوظ ہوا۔ فلسفہ کے ارتقا پر جس نقطۂ نظر سے مرزا محبوب بیگ صاحب نے روشنی ڈالی ہے وہ قابلِ داد ہے۔

ملک مسعود احمد

اس انحاد و انتشار کے دور میں جب کہ مختلف ادبی تحریکیں مختلف معاشی اور سیاسی تحریکوں کی آڑ لے کر میدان میں آگئی ہیں، صرف "مخزن" ہی ایک ادبی ماہنامہ ہے جو پاکیزہ اور صالح ادب پیش کرتا ہے۔ اور پھر ہمہ اس میں ترقی پسندی کے آثار بھی بہت زیادہ ہیں۔ براہِ کرم آپ اپنے رسالے کے لئے بعض پرانے مشہور غزل گوؤں اور نظم نگاروں سے ان کا کلام بھی حاصل کیجئے۔ اس کے لئے ابھی "مخزن" میں کافی گنجائش ہے۔ جدید رنگ کی نظمیں اور غزلیں شائع کرتے کرتے آپ نے قدیم رنگ میں لکھنے والے غزل گو اساتذہ کا کلام بہت تھوڑا سا شائع کیا ہے۔ جو نہایت ضروری ہے۔

آغا ضیا جالندھری

موت و عدم کون و مکاں اور ہی کچھ ہے

سن لے کہ مرا نام و نشاں اور ہی کچھ ہے

شعلوں میں وہ انداز کہاں سوزِ نہاں کے

اٹھتا ہے جو دل سے وہ دھواں اور ہی کچھ ہے

. . . .

شاعر ہیں ضیاؔ اور بھی اس دور میں لیکن

یہ رنگِ بیاں رنگِ زباں اور ہی کچھ ہے

دیرِ مخزن! آپ کو قائدِ اعظم کا واسطہ اور اقبال کا واسطہ میرے

ضرور شائع کر دیجئے۔

تمکین کاظمی

مخزن ماہِ جون ملا، حیدر آبادیوں کا غلبہ دیکھ کر مسرت ہوئی پروفیسر

الدین علی اختر، مرزا محبوب بیگ اور صدق جائسی، چار دن ایک

نظر آئے خدا کرے اور اہلِ قلم بھی اسی طرح مخزن میں کھنچ آئیں اور

حیدر آبادی ادیبوں کا مرکز بن جائے

ڈاکٹر تاثیر کی نظم "آزادیٔ وطن" ریڈیو پر سنی تھی اور جی چاہتا تھا کہ دوبارہ

پے شائع فرما دی بڑی اچھی نظم ہے۔ اقبال کے متعلق سید فیاض محمود

ب کا مضمون پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی یہ تو ہر فن مولا نکلے

بگرفت بہ یک دست علم را و قلم را!

ں الدین صاحب کا ڈراما خوب ہے اور پشاور کے کھو تو بڑا

یس مضمون ہے۔

نفیس چغتائی

جون میں پروفیسر محمد شمس الدین صدیقی کا "جل تو جلال تو" اصل

چارلز لی کے (SAMPSON) سے ماخوذ ہے۔ کیا ہم

ے طبعزاد کہہ سکتے ہیں؟ —— حضرتِ اکبر کی غزل خوب ہے

سبحان اللہ۔

ایک آنسو میں کہہ دیا غمِ دل کس قدر ہم نے اختصار کیا

نسیم جعفری

جولائی کا "مخزن" نظر سے گزرا اس کی ترتیب و تدوین بے حد

جاذبِ نظر ہے۔ یہ مخزن کی خوش قسمتی ہے . . . .

رخشاں ابدالی کا مضمون "غالب کی اصلاحیں" ایک نادر چیز

ہے جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا —— مجھے افسوس

ہے کہ آپ نے اپنے مضمون کا "ماہ نو" سے مکمل اقتباس نہیں لیا——

منظومات میں سے ڈاکٹر تاثیر کی غزل مجھے بے حد پسند آئی ان سے عرض

کر دیجئے کہ گاہے گاہے اپنے ارشاداتِ عالیہ سے "مخزن" کو نوازا

کریں شفقت صاحب نے رنگِ حسرت کا کامیاب اتباع کیا ہے۔

محمد حبیب اللہ رشدی (ایم اے)

ہرچند مخزن کی لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے لیکن کاغذ اتنا اچھا

نہیں جو دورِ اوّل کے مخزن میں استعمال ہوتا تھا۔ اُس عمدہ میں

عمدہ کاغذ کے استعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تقریباً پچاس برس

کے بعد بھی مخزن کی قدیم مجلّدات اب تک قابلِ استعمال ہیں

نیوز پرنٹ کاغذ اتنی مدت تک اچھی حالت میں نہیں رہ سکتا۔

افسانوں کے متعلق میری ناچیز رائے یہ ہے کہ جب تک

کسی افسانے میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ ہو مخزن میں شائع نہ

ہو۔ علمی اور ادبی رسالوں میں افسانوں کی موجودگی ایک بہت

عام چیز ہو گئی ہے۔ مخزن میں ان کی عدم موجودگی ہی ایک امتیازی

خصوصیت بن جائے تو برا نہ ہوگا۔

مخزن ہم گھٹیا افسانوں کی اشاعت سے حتی الامکان احتراز

کرتے ہیں۔ اچھا کاغذ آجکل صرف سرکاری رسالوں کو

دستیاب ہوتا ہے۔ مجبوری ہے۔

مخزن المخازن

"نوائے وقت"

قائدِ اعظم زندہ باد!

محترمہ سعیدہ عروج ایم اے۔ بی ٹی (علیگ)

ہر سال ۱۴ اگست کو پاکستان کی سالگرہ کے موقع پر اہلِ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ کو دلی محبت و تشکر سے یاد کرتے ہیں جن کے عدیم النظیر تدبر، حیرت انگیز عزم و عمل اور پہاڑ کی طرح محکم ایمان و یقین نے برِ اعظم کے مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کے لئے یہ آزاد وطن حاصل کیا۔ قائدِ اعظمؒ کی محبت اہلِ پاکستان کے اتحاد یکجہتی، آزادی اور بلند عزائم کی بنیاد ہے قائدِ اعظم زندہ باد! "مخزن"

مسلم کا جہاں سوختۂ برقِ بلا تھا
ہر بندۂ حق بستۂ زنجیرِ جفا تھا

صدیوں کی غلامی سے ہوئی کند بصیرت
ایمان نہ ایقان نہ کردار نہ سیرت

مسلم کے تھے یوں خوار و زبوں ہند میں حالات
پابندِ توہم تھا وہ نخچیرِ روایات

اور اک مسلماں تھا غلامی پہ رضامند
قرآں سے بیزار تھا قرآں کا فرزند

تدبیر و سیاست کی افق پہ ابھر آیا
اک چاند امیدوں کا یہاں پھر نظر آیا

بیباک و جری، مردِ خدا قائدِ اعظم
حق بین و حق اندیش وہ ایقانِ مجسم

وہ ماہرِ دستور، وہ نباضِ سیاست
وہ فاتحِ تدبیر، وہ مسجودِ قیادت

وہ کعبۂ ایماں، وہ مسلماں کا سہارا
وہ راکبِ تدبیر، وہ قرآن کا پارا

عرفان کے قلزم سے وہ نکلا ہوا گوہر
قرآن کی آیات میں ڈوبا ہوا جوہر

اک ہاتھ سے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا
اک ہاتھ پہ گرتے ہوئے انسان کو روکا

اٹھا ہے تو ہاتھوں میں نہ شمشیر نہ نیزہ
پر کوہ بھی تھا راہ میں جیسے کوئی ذرہ

کردار و بصیرت کا وہ اک مظہرِ ذیشان
"دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" اقبال

تاریک شبِ غم میں وہ اک صبحِ مجسم!
"جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم" اقبال

ہے پاک زمیں نیتِ احسن پہ گواہی
"مومن ہے وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی" اقبال

"ساقی"

اردو کا ایک فراموش کردہ ناول نگار

افضل صدیقی

...... قاری سرفراز حسین ایک اچھے ناول نگار بھی تھے عموماً ناول

ب نہ ایک مقصد کو سامنے رکھ کر کسی قصے کی بنیاد رکھتا ہے قاری
صاحب نے بہت سے ناول لکھے۔ ان کے پیش نظر طوائفوں اور طوائف
زدوں کی اصلاح تھی اور اسی مقصد کو مدِنظر رکھ کر سب ناول لکھے گئے
ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ناول کا پلاٹ دوسرے ناول
کے پلاٹ سے بالکل علیحدہ ہے۔ ہر پلاٹ میں ابتدا سے دلچسپی شروع
ہوتی ہے تو آخر تک رہتی ہے۔ ہر ناول اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت
رکھتا ہے اور یہی مصنّف کا کمال ہے۔

ان ناولوں میں ایک ہی نصب العین ملتا ہے کہ کوئی نوجوان ان
کو پڑھے تو حسینانِ بازاری کے ہتھکنڈوں سے چوکنا ہو جائے گھر کی
بیٹھنے والیاں پڑھیں تو وہ اپنے خاوندوں کی بے توجہی کے اسباب سمجھ
جائیں اور اگر کوٹھے والیاں پڑھیں تو اپنے ناپاک اور ذلیل پیشے کا احساس
کریں۔ ان کے سامنے ناولوں کا پلاٹ طوائفوں کی زندگی۔ ان کی چالبازیوں
اور ان کے ہتھکنڈوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ قدم قدم پر اصلاح پیشِ نظر
رکھی گئی ہے۔ اور کبھی بھی اپنی مخصوص چلبلی طرزِ تحریر کو ہاتھ سے نہیں جانے
دیا ہے جس کی شیرینی اور چاشنی صرف پڑھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔
محاورات اور ضرب الامثال ایسے برموقع استعمال کئے ہیں جیسے انگوٹھی
میں ہیرا جڑا ہوا ہو۔ واقعہ نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے اور طرزِ
بیان کو دیکھیں تو ان کا جواب نہیں۔ انہوں نے جس ماحول کے لوگوں
کو زندگی بسر کرتے دیکھا ہے اس کا نقشہ ہو بہو کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ
ذوقِ سلیم سر دھنتا ہے۔

زبان کی چاشنی ملاحظہ ہو۔ دلی مرحوم کا ذکر ہے۔ ہائے وہ دلی اور اس
کی زبان ــــ! خیال آتے ہی کلیجہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ یہ زبان سننے
کو تو کان ترس گئے ہیں۔ قاری صاحب اپنے ناول "بہارِ عیش" میں لکھتے ہیں۔

"دلی ــــ بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہندوستان کا دل۔ درویشی
کی کان۔ قال اللہ وقال الرسول کا مخزن۔ طب اور ویدک
کا گھر کشتی اور ورزش کا گہوارہ۔ حسن و عشق کا اکھاڑا۔ یہ ہے
پار قلعہ ہے اس کی پشت پر جمنا جی جہاں صبح کو ہزاروں عورت
اشنان کر کے ایشور کی بھگتی کرتے ہیں۔ سبحان اللہ،
ایسا شہر اور ایسا منظر ــــ"

دل کے جذبات کی صحیح ترجمانی بھی کچھ قاری صاحب ہی کے قلم نے
کی ہے۔ "بہارِ عیش" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"نزاکت جان کیا خاک کھانا کھاتیں۔ اٹواٹی کھٹواٹی لئے پڑی
تھیں ہاتھ میں نوالہ ہے۔ یا پانی کے گھونٹ پی رہی ہیں۔ یا
بچوں کی نگرانی کر رہی ہیں۔ خیالات کا ایک سمندر ہے کہ
امڈا چلا آتا ہے۔ بار بار دل میں کہتی ہیں کہ ہائے میں نے ایسے
بے وفا شخص کے لئے یہ کچھ کیا۔ اپنی جوانی برباد کی بھرا
بھرا گھر خاک سے لگا دیا۔ اپنے بیگانے سب سے بگاڑ لی۔
اور جس مردود کی محبت میں یہ سب کچھ کیا وہ آناً فاناً صابن میں
سے تار کی طرح نکل گیا۔ . . ."

"ادبی دنیا"

مولانا حسرت موہانی کا تازہ کلام

(بتقلید جامی علیہ الرحمۃ)

پھر کیوں تری طلب میں نہ ہوں جان و دل فدا
جب جانتے ہیں سب کہ یہ نعمت ہے بے بہا

کیا کیا ہیں، کیا بتاؤں، مرے دل کی خواہشیں
وابستہ تیری ذات سے اے جانِ مدعا

عشاق کی نظر میں ترا ظلِ عاطفت
ہے ظلِ آرزو کے لئے سایۂ ہما

تیرا ستم بھی ہم پہ کرم ہے، نہ ہے ستم - تیری جفا بھی ہم کو وفا ہے، نہ ہے جفا

تیرے خرامِ ناز سے گلشن کی ہر روش
ہر دم ہے منتظر کہ قیامت ہو کب بپا
دنیا سے منہ کو موڑ کے اے محوِ ذاتِ حق
ہم عاصیوں کے پاس کبھی خواب میں تو آ
حاشا و زینہار کہ اے جانِ حسن و عشق
حسرت کے دل میں اور بھی کچھ ہو ترے سوا

"نظام المشائخ"

میر باقر علی داستان گو

ملا محمد واحدی

قصے لکھ کر بھی سنائے جاتے تھے اور زبانی بھی۔ زبانی سنانے والوں کی آخری دہلوی یادگار کا نام میر باقر علی تھا۔ میر باقر علی صاحب کے باپ دادا شاہانِ مغلیہ کو زبانی داستانیں سنانے پر مقرر تھے اور اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ گویا داستان گوئی میر باقر علی صاحب کا موروثی حقہ تھا۔ اور داستان گوئی انہیں گھٹی میں پلائی گئی تھی۔

میرا لڑکپن تھا اور میر باقر علی ادھیڑ تھے۔ جب میر صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ مشہور اخبار نویس سید جالب مرحوم کے ہاں دیکھا میں ادھیڑ ہو گیا اور میر صاحب بالکل ضعیف .... اتنے طویل زمانے تک مجھے ان سے اور ان کو مجھ سے ملنے کا اکثر و بیشتر اتفاق ہوتا رہا۔ اور میں نے سینکڑوں داستانیں ان کی زبان سے سنیں۔

میر باقر علی منحنی آدمی تھے۔ دبلے پتلے، دھان پان۔ قد بھی معمولی تھا۔ لیکن داستان بیان کرتے کرتے کبھی کسی بادشاہ کا ذکر آجاتا کہ اس نے یہ کیا اور یہ حکم دیا تو بادشاہ کی کہن اور حکم کو ایسی شان اور ایسے لہجہ میں ادا کرتے کہ گمان ہوتا کہ اس وقت ہمارے سامنے کوئی منحنی دبلا پتلا داستان گو نہیں ہے بلکہ ہم ایک قہار بادشاہ کے دربار میں ہیں۔ اور آ ہے بولتا دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح اگر ظالم ٹھاکو کی نقل کرتے تو میر باقر میں اور ڈاکو میں فرق نہ رہتا تھا۔ پھر اگر کسی شریف معمر عورت کی بولی تو شریف بڑھیوں کی گفتگو کا انداز اختیار کر لیتے۔ دانت ہوتے سلنے بے دانتوں کے بن جاتے۔ اور سرائے کی بھٹیاری کا خاکہ اڑاتے تو محسوس ہوتا کہ ہم سرائے میں بیٹھے ہیں اور ہمارے سامنے بھٹیاری صاحبہ گل افشانی فرما رہی ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندوستان میں کسی دوسری زبان عربی فارسی کے فقرے داستان میں بولنے پر آجاتے تو اہل زبان کی مثل بولتے۔ اور لطف یہ تھا کہ لوگ میر صاحب کے ان کمالات سے مرعوب ہو جاتے اور کبھی محظوظ ہو کر بے اختیار داد دیتے لیکن میر صاحب کے چہرے پر ان تمام تاثرات کا کوئی اثر نہ آتا۔ وہ مشین کی طرح اپنا کام کئے چلے جاتے اور داستان کو چھوڑ کر کسی اور بات کی طرف متوجہ نہ ہوتے البتہ جب داستان کہہ چکتے تو داد کا نہایت مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرتے۔

انسانیت کا جوہر

شفیق صدیقی جونپوری

بہار ایسی بھی ہوتی ہے تو ہم گلشن سے باز آئے
کہ غنچے مسکرائیں اور شبنم اشک برسائے
ضرورت اشتراکی دور کو ہے ایسے رہبر کی
جو سر پر تاج رکھے مشک بھی کاندھے سے لٹکائے
امیری میں بھی ہو جس کے بدن پر ٹاٹ کا کرتا
جو خود مزدور بن کر قسمتِ مزدور چمکائے
اپاہج کی مدد بیمار کی امداد کرتا ہو
جو بیوہ کو تسلی دے یتیموں پر ترس کھائے
امیر فوج و لشکر ہو مگر ہو سادگی ایسی
کہ سر پہ ٹوکرا رکھ کر بھی چلنے سے نہ شرمائے

کبھی بازار سے گزرے تو اک درویش کا نقشہ
علم لے ہاتھ میں تو شہریاری سر کے بل آئے
کبھی گر کھیت پہنچے تو کسانوں کا معاون ہو
جو مسند پہ قدم رکھے زمیں ہیبت سے تھرائے
غریبوں کو چھڑائے پنجۂ سرمایہ داری سے
مگر شعلے بغاوت کے قبائل میں نہ بھڑکائے
چھپا لے اپنے دامن میں جو آئے رحم کا طالب
ملا دے آہنی قلعہ اگر باطل سے ٹکرائے
امیروں اور ناداروں میں نفرت کا نہ بانی ہو
مگر ایسا سبق دے قیصریت ختم ہو جائے
نہ ہو محدود روٹی اور بوٹی تک نظام اس کا
بدن بھی ہو توانا روح بھی سیراب ہو جائے
شکم پہ بھوک سے پتھر بندھے ہوں مستقل فاقے
پکارے در پہ گر سائل تو چادر نذر ہو جائے
چلی آتی ہوں چکی کی صدائیں بابِ عالی سے
مگر بانوئے خانہ قوم کی سلطانہ کہلائے
ضرورت پیش آجائے تو کیا رونا سواری کا
خود اک انسان اک انسان کو کاندھوں پہ لے جائے
ہو جس کی سادگی کے حسن پہ قربان رنگینی
کہ دستر خوان پہ نانِ جویں کی شان بڑھ جائے
شفیق اخلاق میں انسانیت کے اتنے جوہر ہوں
تو امت رحمت اللعالمیں کی قوم کہلائے

جہانگیر ایک شکاری کی حیثیت سے

"نگار"

یوں تو تمام شاہانِ مغلیہ کو شکار کا شوق تھا لیکن جہانگیر خصوصیت کے ساتھ بڑا شائق تھا۔ اس نے اپنی ڈائری تزکِ جہانگیری میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں شکار کیونکر کھیلا جاتا تھا اور اس کے لئے کیا کیا اہتمام ہوتا تھا۔

ایک بار راولپنڈی کے قریب جنگلوں میں اس نے پورا ہفتہ شکار میں بسر کیا جس کی تفصیل خود اس نے اپنے قلم سے لکھی ہے۔

"بابا حسن ابدال نے گھیرا ڈالنے کا انتظام کرایا تو ۲۷ سرخ ہرن اور ۸۰ سفید ہرن گھر گئے۔ خود میں نے تیر و کمان سے ۲۹ ہرن شکار کئے۔ پرویز اور خرم نے بھی متعدد ہرنوں کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد درباریوں اور ملازموں کو شکار کی اجازت دی گئی۔ خان جہان بہترین نشانہ باز ثابت ہوا اور اس کا ایک نشانہ بھی خطا نہیں ہوا۔ اس نے ہر تیر کے ساتھ ایک ہرن گرایا۔"

ایک اور موقع پر ظفر خاں نے شکار کا انتظام کرایا تو اس دن جہانگیر نے ۴۴ ہرن سرخ رنگ کے اور ۳۵ ہرن سیاہ دم والے شکار کئے ان کے علاوہ کئی جنگلی سور بھی مارے۔

شکار میں اکثر مغلیہ خواتین بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ جہانگیر اپنے تزک میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"۲۱ کو قلعہ رہتاس سے تین فرسخ کے اندر ایک اور شکار کا انتظام کیا گیا۔ اس کا اہتمام ہلال خاں کے سپرد تھا۔ میرے ساتھ خواتین بھی تھیں۔ یہ شکار بہت کامیاب رہا۔ ۱۰۰ ہرن کا شکار ہوا۔ ۲۴ کو پھر رہتاس کے مضافات میں انتظام کیا گیا۔ اس شکار میں میری بہنیں اور دوسری خواتین بھی شریک تھیں۔ اس مرتبہ ۱۰۰ ہرن ہاتھ آئے۔"

ایک اور شکار کا ذکر جہانگیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

"۲۷ کو شکاریوں نے چار شیروں کا پتا چلایا۔ ان کے شکار

کے سفر میں گیا تو خواتین بھی ساتھ تھیں۔ جب شیر نظر آئے تو نورجہاں بیگم نے مجھ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں بندوق سے ان کا شکار کر دوں۔ میں نے اجازت دی تو نورجہاں بیگم نے دو فیروں میں دو شیر گرا دئے اس کے بعد چشم زدن میں باقی دو شیر بھی ہلاک کر دیئے اس وقت تک میں نے ایسا شکار کبھی نہ دیکھا تھا کہ ہاتھی کے اوپر ہودے میں بیٹھ کر گولی چلائی جائے اور کوئی نشانہ خطا نہ کرے۔ میں نے اس قدر اندازی سے خوش ہو کر نورجہاں بیگم کو ایک جڑاؤ کنگن ایک لاکھ کی قیمت کا اور ۱۰۰۰ اشرفیاں دیں"

جہانگیر ایک جگہ لکھتا ہے کہ:-

"ایک بار میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شروع سے اس وقت تک جتنے جانور میں نے شکار کئے ہیں ان کی فہرست بنائی جائے چنانچہ میں نے اخبار نویسوں کو حکم دیا اور انہوں نے جو فہرست بنائی اس سے معلوم ہوا کہ بارہ سال کی عمر سے آج (۱۱ سن جلوس) تک ۲۸۵۳۲ سر شکار کئے ہوئے جانوروں کے میرے سامنے پیش کئے گئے۔ ان میں سے ۱۷۱۶۷ خود میرے شکار کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ۸۶ شیر، ریچھ اور چیتا وغیرہ، نیل گائے ۸۸۹، بارہ سنگے ۳۵، ہرن چیتل وغیرہ ۱۶۷۰۔ مینڈھے اور سرخ ہرن ۲۱۲۵۔ بھیڑئیے ۶۴۔ جنگلی بھینسے ۳۰۔ سور ۹۰۔ بز کوہی ۲۲۔ خرگوش ۲۳۔ چڑیاں ۱۳۹۶۴۔ کبوتر ۱۰۳۴۸۔ چیل ۲۔ باز ۳۔ الو ۳۹۔ فاختہ ۲۵۔ بطیں ۹۷۔ کوے ۳۱۷۶۔ گھڑیال ۷۰۔

جہانگیر نے آخیر عمر میں شکار سے توبہ کر لی تھی اس کا واقعہ وہ یوں بیان کرتا ہے کہ:-

"میرے بیٹے شاہجہان کا محبوب بیٹا شجاع جس نے نورجہاں بیگم کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا، بیمار ہوا، بہت علاج ہوا لیکن فائدہ نہ ہوا تو میں نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ سترہ سال قبل میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ جب میری عمر ۵۰ سے متجاوز ہو جائے گی تو میں شکار چھوڑ دوں گا اور میں کسی کی جان نہ لوں گا اور سوچا کہ ممکن ہے اس عہد کے پورا کرنے سے شجاع اچھا ہو جائے، چنانچہ میں نے اس پر عمل کیا اور شجاع اچھا ہو گیا۔

"معارف"

ہندوستان

(سید سلیمان ندوی)

ہندوستان کے باشندوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ساری دنیا سمٹ کر ایک گھر میں جمع ہو گئی ہے اور ساری قومیں مل جل کر آئندہ دنیا کا نقشہ بنا رہی ہیں، ایسی حالت میں ہندوستان کے کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ وہ اپنی دنیا الگ بنائیں اور ہزار ہا سال پیچھے ہٹ کر اپنے ملک کو ویسا ہی بنا دیں جیسا پہلے تھا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ریل اور ہوائی جہاز کے اس دور میں پھر سے بہلی اور رتھ پر سوار ہو کر اپنا سفر شروع کر دیں اور آپ دیکھیں گے کہ یہ تخیل ہندوؤں اور مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں میں تفرقہ پیدا کر دے گا اور اس باقی ملک کو بھی بیسیوں ملکوں میں تقسیم کر دے گا۔

اپنے صوبہ کے ٹنڈن جی کی آواز تھم تھم کر پھر سنائی دیتی ہے۔ اخباروں میں آیا ہے کہ راج رشی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ ہندو کلچر کو اختیار کریں ورنہ پاکستان کی راہ لیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ٹنڈن جی

ے اوّل تو میرا یہ کہنا ہے کہ کیا وہ ملک کے ڈکٹیٹر ہیں یا بادشاہ، جو
...ری قوم کی طرف سے اپنے خیال کا اظہار حکم کے لہجہ میں کر رہے ہیں
...اس صوبہ کی اسمبلی کے ایک اسپیکر اور اس صوبہ کی کانگریس کے صدر
...یں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں، اور اس لئے وہ اس تحکم
کے لہجہ میں باتیں کر کے اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں"

وہ ہندو کلچر جس کے وہ منادی ہیں، کہاں پایا جاتا ہے، کیا ان کی
دا...ی ہندو کلچر ہے کیا ان کا لباس ہندو کلچر ہے، کیا بھارت کی یونیورسٹیوں
...ہندو کلچر ہے، کیا ہمارے بڑے بڑے عہدہ داروں نئے تعلیم یافتوں
اور طالب علموں کے طور و طریق اور لباس و صورت اور زبان و بیان
اور طرز زندگی میں ہندو کلچر ہے، آج ہر جگہ یورپ کا تمدن پھیل رہا ہے
...لی پیروی ترقی کا نام پا رہی ہے، ہمارے نوجوان بھلا کیسے ہیں کہ
یورپ کے اس غلبہ اور استیلاء کو جو ہر میدان میں نظر آ رہا ہے، آج
ہندو کلچر سے نہیں بلکہ اسی کے طور و طریق سے روک سکتے ہیں، اور آب
یہ پرانی باتیں کسی پرانے ڈھنگ کے ملک میں بھی نہیں چل سکتی ہیں، اس
لئے اگر کوئی نئے زمانہ کا دل جلا نوجوان کسی دن خود راج رشی سے یہ کہہ
دے کہ رشی جی آپ پرانا کلچر اختیار کیجئے، ورنہ ہندوستان چھوڑ
کر نیپال کی ترائی میں چلے جائیے، اور وہیں تپسیا کیجئے، تو کیا ہو گا۔

ہندوستان کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے
کہ ملک آنکھیں بند کر کے جواہر لال کے پیچھے چلے، ان کے خیالات
کو دل میں جگہ دے، اور ان کے احکام کی تعمیل اور ان کی نصیحتوں پر
عمل کرے، ورنہ تنگ خیال تحریکیں ملک کو ویران کر دیں گی، صوبوں
کی زبان وار تقسیم، ہزار سال کی مردہ ریاستوں کو دوبارہ جنم دینے کا خیال
سنسکرت کو ملک کی زبان بنانے کی تحریک، یہ سب اسی تنگ خیالی
کی پیداوار ہیں۔

"آفاق"

چودھری محمد حسین مرحوم

محمد شفیع

...... حضرت علامہ اقبال سے چودھری صاحب کے تعلقات مکمل
کی ہم آہنگی پر استوار تھے جہاں تک اسلام اور ملت اسلامیہ کا تعلق
ہے چودھری محمد حسین بھی تصورات، حیات اور ترتیب کے لحاظ سے بہت
بلند پایہ بزرگ تھے۔ ان کی نگاہ اسلام کی تقدیر کے باب میں کم گہری نہ
تھی، وہ اسلام کو بطور ایک فکر، بطور ایک ضابطۂ حیات کے خوب
سمجھتے تھے لیکن وہ ایک بات سے محروم تھے یعنی وہ حضرت علامہ اقبال
کی طرح آرٹسٹ نہ تھے، جو باتیں وہ بچوں کی طرح گن گن کر کے اور اس قسم
کی دوسری حرکات سے کر سکتے تھے انہیں حضرت علامہ اقبال اپنے عظیم الشان
GENIUS کے طفیل شعر و شاعری کی لڑیوں میں ملکوتی موتیوں
کی طرح پرو دیتے تھے۔

مرنے والا مر گیا ہے ——— واللہ تعالیٰ اس کی روح پر اپنی رحمتیں نازل
کرے) آج وہ کسی کی تصدیق یا تکذیب کرنے کے قابل نہیں خدا نہ کرے
کہ میں ان کے متعلق کوئی ایسی بات کہوں جو حقیقت پر مبنی نہ ہو مجھے
اچھی طرح یاد ہے کہ چودھری صاحب نے بارہا مجھ سے فرمایا:۔

"میں نے اپنے خیالات کو بلا دریغ
حضرت علامہ کی نذر کر دیا اور انہوں
نے ان خیالات کو حسب ضرورت قبول
کیا اور پھر اپنے تخیل کی بھٹی میں ڈال
کر جگمگاتے ہوئے شعروں کی شکل میں
دنیا کے سامنے پیش کیا ——— انہوں نے کہا کہ
جہاں تک افکار کا تعلق ہے، میں نے اپنی

شخصیت کو حضرت علامہ میں مکمل طور پر مدغم کر دیا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھنے والے جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کی کارگاہِ فکر کے انجم بیاض میں منتقل ہونے سے پہلے چودھری صاحب کی پرکھ کے لئے ان کے سامنے بالالتزام پیش کئے جاتے تھے۔ اور بارہا چودھری صاحب "گن گن کر" کے ان میں ترمیم کا باعث بنے۔

"اردو ادب"

میراجی کا اکیلا پن

مختار صدیقی

میراجی کو اپنے "اکیلے پن" کا احساس بہت دیر سے تھا لیکن یہ خیال بھی تھا کہ کوئی تنہائی، کوئی دوری ایسی نہیں جو قائم رہ سکے۔ اپنی موت سے تین سال پیشتر یہ خیال پختہ ہوا اور انہوں نے خود لکھا۔

اے پیارے لوگو
تم دور کیوں ہو
کچھ پاس آؤ
آؤ کہ مل لیں
. . . .
اے پیارے لوگو
میں تم سے مل کر بہتر بنوں گا
ایسے اکیلے
یوں روتے روتے
آنسو بہیں گے
اور کچھ نہ ہوگا

لیکن جس طرح وہ چاہتے تھے، ان پیارے لوگوں کو جس طرح قریب آنا چاہئے تھا، کوئی قریب نہ آسکا ـــ یہ دنیا کا قاعدہ ہے، وہ ا(؟) نہ چلنے والے کو اپنے میں سے نہیں سمجھتی خود میراجی کے نفسی(؟) اس منزل پر پہنچ چکے تھے، جہاں سے لوٹ کر آنا، یا وہاں سے پگڈنڈی پر چل نکلنا ناممکن تھا، اس لئے خود آگے بڑھ کر اس اپنا پہل کرنا جس کی تمنا نے انہیں یوں اکیلا کیا تھا، ان کے لئے مگر اس اپنے پن کے ساتھ جسم اور روح کی جو بالیدگی، جو نمو اور تکمیل ہے۔ ان کے مقدر میں نہ ہوسکی، اور ستم یہ ہے کہ اس سے وہ محروم رہا۔ جو اس بالیدگی اور تکمیل کا زیادہ عرفانی تھا، اور ازلی محرومی اور شدید احساس ہی نے جنسی لذتوں، پیراہنوں کے دامنوں کی لہروں اور سیمیں پنڈلیوں کا وجدانی بنا دیا تھا ـــ جب بالیدگی اور روح کی تکمیل و نمو جو سرمستیاں اور سکون لاتی ہے جس کے زبردست جنسیاتی اور فلسفیانہ مطالعے نے ان پر بے واضح کئے تھے لیکن اس کے حصول یا کوشش کے لئے جو اور جذبے درکار ہوتے ہیں۔ وہ شاید ان کے جسم اور دماغ میں نہ تھے، ان حالات میں، ان کی حیاتِ نفسی کا مریض و کجرو ہونا کچھ نہ تھا بلکہ ایک معمولی بات تھی، اور میراجی اسے معمولی بات ہی ثابت کرتے تھے۔ حالانکہ یوں دیکھنے میں ان کی حیاتِ نفسی ہوم ہونے سے کو سوں دور مجبور یہ صحراؤں میں اکیلی بھٹکتی پھرتی تھی۔

"آجکل"

بہادر شاہ ظفر کی غزل پر غالب کی تضمین

مختار الدین احمد آرزو

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھنا کاش کہ یوں تکمیل آدھی رہ گئی۔ کھینچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی

غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا ہے کے چشمِ پرنم اس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دوں گا غم اس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو
کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو
ہم نشیں آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا مجھ پہ کیسی بن گئی اے انتظار
خوابِ بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار
مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار
کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں تصویرِ یار
جاگ اٹھا جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا تو چاہا ہم نے یوں آئے دلنواز
دیکھتے ہی اے ستمگر تیری چشمِ نیم باز
کی نہ تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی (نامکمل مخزن)

اس بتِ مغرور کا کیا ہو کسی پہ التفات
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ گزری ہوں گی راتیں پانچ سات
اس رخِ روشن کے آگے ماہ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشید پہ تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے پہنچائے کاہش بختِ بد ہے گھات میں
ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم گھاٹا ہے ہر اک بات میں
کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
آتے ہی خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی

سب سے یہ گوشہ کنارے ہے گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیا پکارے ہے گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اتارے ہے گلے لگ جا مرے
مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے گلے لگ جا مرے
وصل کی شب اے بتِ بے پیر آدھی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو یارب کب کی بات
کچھ نہیں کہتا کسی سے سن رہا ہوں سب کی بات
کس لئے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ پرسوں شب کی بات
نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو گئی تحریر آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں ہے یہی غضب
پانچ چھ گھنٹے تو ہوتی فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے تو کیا اچھی گذرتی رات سب
پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اس کے گھر
جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں مگر
دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو ظفر
واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

تبرکاتِ ”مخزنِ“ قدیم

منقول از مخزن ماہ جنوری ۱۹۱۱ء

”بلینک ورس کی خواہش اردو میں بیجا ہے“

سید اولاد حسین شادان بلگرامی

اول تو ایک بات جو ایک ملک کے لوگ پسند کرتے ہوں اس

هدیہ

کے پسند کرنے پر دوسرے لوگ کیوں مجبور کئے جائیں۔ ہمارے طبائع ان سے از روئے فطرت مختلف ہیں۔ جن چیزوں کو وہ حسن سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک قبیح ہیں اور اسی طرح بالعکس اس کے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حسن و قبح اشیاء عقلی نہیں۔ سوائے حسن صدق و قبح کذب کے بلکہ انتظامِ عالم اختلاف طبائع ہی سے مربوط ہے اگر اختلافِ طبائع نہ ہوتا تو تمام عالم کے انسان کچھ چیزیں اور پیشے پسند کرتے اور دوسری چیزیں بوجہ ناپسند ہونے کے ترک کر دیتے جس سے وہ صنائع معطل رہتے اور ضروریات عالم میں خلل واقع ہوتا۔ اس اختلاف میں عجیب مصلحت باری ہے۔ اور ارتفاع اختلاف ممکن نہیں۔

جن اصول اور خصوصیاتِ ملکی کے ساتھ یورپ والوں کی نظمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر اصول بوجہ اختلافِ طبائع ہماری طبیعتوں پر سخت گراں ہیں۔ چنانچہ اوزان انگریزی پر کیا منحصر ہے۔ بعض بحور عربیہ بھی ہماری طبیعتوں کو موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ ایسے خواہشاتِ بیجا سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ہم سے کہا جائیگا کہ وزن انگریزی پر اردو میں نظمیں کہی جایا کریں۔ جب خود فطرت نے ہر ملک کے امزجہ و طبائع و آب و ہوا و اشیاء و اشکال وغیرہ مختلف پیدا کئے ہیں۔ پھر ایک کی مرغوب چیزیں دوسروں کے پسند کیونکر ہو سکتی ہیں۔ ایسے امور کا ہم کو پابند کرنا گویا اصولِ نیچر کے خلاف ہم کو چلانا ہے۔

دوسرے یہ کہ زبانِ انگریزی کا قافیہ تنگ ہے۔ چنانچہ انگریزی میں سَن (آفتاب) بفتح اوّل کا قافیہ۔ گون (گیا) بروزن خوان اور فیئر (اچھا) کا قافیہ۔ آر (ہیں) اور پُٹ بضم (رکھنا) کا قافیہ نَٹ بفتح (اخروٹ) اور لارڈ کا قافیہ ورڈ (لفظ) لاتے ہیں۔ ورڈز ورتھ اور لارڈ ٹینیسن اور ایمرسن اور لانگ فیلو کی نظمیں ملاحظہ ہوں۔ بوجہ ضرورتِ قافیہ۔ ان میں سے بعض الفاظ کے تلفظ میں تغیر کیا جاتا ہے مگر نثر اور بول چال میں یہی تلفظ بتایا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے میں بہت سی مثالیں لکھتا مگر بخیالِ انقباضِ طبائع اسعد دانان؛ مثالوں سے احتراز کیا۔ جو لوگ انگریزی پڑھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کے قوافی انگریزی میں کثیر الوقوع ہیں۔ پھر ایک اور امر میں نہ تعداد مصاریع کا انتظام نہ قوافی کا کوئی بند و بست۔ انہیں وجوہ نے انگریزوں کو نظم غیر مقفیٰ کہنے پر مجبور کیا۔ برخلاف ہماری زبان کہ ایک لفظ کے بکثرت قافیے موجود ہیں۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ نظم غیر مقفیٰ کہیں کسی بڑے سے بڑے مضمون واقعہ۔ اور تاریخ ہم بہت آسانی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں۔ اور ایسے طولانی مضامین کے لئے مثنوی اور مسدس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم ایشیائی لوگوں کی طبیعتوں کو بوجہ انس و عادت قدیم جو حظ کہ نظم مقفیٰ سے ہوتا ہے وہ نظم غیر مقفیٰ سے نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو بلینک ورس کی طرف میلان نہیں ہے۔ کچھ نظمیں غیر مقفیٰ جو اردو میں اب تک کہی گئیں، مرغوبِ طبع نہ ہونے سے ان کو مقبولیت نہ حاصل ہوئی اور ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔

غزل عزیز لکھنوی

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے
زبن پڑی ہے ہنستے اور نہ روتے

شبِ فرقت اسی حسرت میں گزری
ہمیں بھی نیند آتی ہم بھی سوتے

بہت جھگڑے ہیں فرقت کی شب تک
نہ دنیا تھی نہ ہم تھے صبح ہوتے

عزیز اب ضبط سے بھی کام لو کچھ
ارے مر جاؤ گے کیا روتے روتے

(منقول از مخزن جنوری ۱۹۱۱ء)

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمۃ
نے پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا

جلد ۴ ○ نمبر ۳

"مخزن"

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ ستمبر ۱۹۵۰ء

☆

قیمت

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

☆

The "MAKHZAN" Lahore • ادارۂ مطبوعاتِ نوائے وقت لمیٹڈ لاہور

مخزن

فلمی موسیقی

(سیّد علی عباس جلالپوری)

دنیا نے موسیقی میں ہندوستانی سنگیت کا مقام بہت بلند ہے۔ اس وقت جب کہ فیثاغورث انسانی آواز کو تین سُروں میں تقسیم کر کے ابتدائی تجربات میں مصروف تھا ہندوستانی اسے سات سُروں میں تقسیم کر چکے تھے۔ قدیم زمانے میں موسیقی کو فنِ عالیہ کا درجہ حاصل تھا اہلِ فن کے علاوہ رشی منی اور راجا مہاراجا بھی اس کے اکتساب کے لئے عمریں وقف کر دیتے تھے۔ ساز سنگیت اور گانے کی طرف یکساں توجہ کی جاتی تھی۔ ہندوستانی سازوں میں وچتر وینا ایک ایسا ساز ہے جہاں تک نغمے کے غنائی دقائق — مینڈوں اور سوتوں — کو ادا کرنے کا تعلق ہے دنیا بھر میں اس کے مقابلے کا کوئی ساز موجود نہیں۔ امیر خسرو نے اسی ساز کو سادہ شکل دے کر ستار ترتیب دیا تھا۔ ساز سنگیت میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ گانے کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی [illegible] نے بحث کر کے اس میں لوچ اور لچک پیدا کرنے کے اصول اور قواعد مقرر کئے گئے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ چند نغمات شکل پکڑ گئے۔ مختلف موسموں اور اوقات کے جمالی محرکات کے پس منظر میں راگ اور راگنیاں مرتب کی گئیں۔ امیر خسرو نے دھرپد میں قول اور قلبانہ کا پیوند لگا کر خیال کی بنیاد رکھی جسے لکھنؤ کے فن کاروں نے موجودہ شکل بخشی۔ خیال کے مختلف مدارج مقرر ہوئے الاپ۔ دلبت۔ درُت اور ان کے ادا کرنے کے [illegible] احترام کیا گیا۔ مغل شہنشاہوں اور راجا مہاراجاؤں کے درباروں میں موسیقی کی بے حد قدردانی کی جاتی تھی۔ ان کی توجہ سے کلاسیکی

سید علی عباس

ستمبر ۱۹۵۰ء

موسیقی نے حیرت انگیز سرعت سے ترقی کی منازل طے کیں لیکن سیاسی ادبار اور تنزل کے ساتھ علوم و فنون کو بھی زوال آگیا اور موسیقی چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں احساسِ قومیت پیدا ہوا اور فن کاروں نے دوسرے فنونِ لطیفہ کے ساتھ موسیقی کے احیاء کی کوشش بھی شروع کی۔ اس مبارک کوشش میں پنڈت ڈسکر و گمبر پیش پیش تھے مگر اس وقت تک کلاسیکی موسیقی عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی۔ اور چند پنڈت صاحبان اور خان صاحبان کا اجارہ بن کے رہ گئی تھی۔ اسی زمانے میں کلکتہ اور بمبئی میں تھیٹریکل کمپنیوں کا ظہور ہوا۔ تھیٹر نے موسیقی کو دوبارہ عوام تک پہنچانے کی مہم شروع کی اور اس سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ استادوں نے کلاسیکی موسیقی کے شاہکاروں کو عام فہم دھنوں کی شکل میں پیش کرنا شروع کیا۔ عوام راگ کے پیچیدہ اتار چڑھاؤ اور سُر اور لے کے باہمی تعلق کو سمجھنے سے قاصر تھے مگر جب دادرے، غزل یا گیت میں کسی راگنی کی الاپ کے ٹکڑوں کو پیش کیا گیا تو عوام کے لئے اس سے لطف اندوز ہونا آسان ہو گیا۔ غزل کی استھائی اور انترے میں راگنیوں کی مخصوص شکل اور چال کو پہچاننا سہل ہو گیا۔ تھیٹر نے جن راگنیوں کو مقبولِ عام بنایا ان میں اساوری، آسا، بھیرویں، بھیروں، بلیو بھیم، پہاڑی، کھماج، جوگ، تلنگ، بہاگ، سندھڑا، دیس، کاموہ، بھوپالی، ایمن، اور شام کلیان قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں استاد جھنڈے خاں نے بالخصوص بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی قائم کی ہوئی دھنوں نے عوام سے لے کر اصحابِ بصیرت تک سب سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آغا حشر کے لکھے ہوئے ناٹکوں نے عوام کو ادبی و ذوقی لذائذ سے اور استاد جھنڈے خاں نے موسیقی کے لطیف دقائق سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد پہلے خاموش اور پھر ناطق فلموں کا دور شروع ہوا۔ فلمی صنعت کور ذوق بیوپاریوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ سیٹھ صاحبان کو نہ علم و ادب سے دلچسپی تھی نہ موسیقی سے واسطہ۔ آہستہ آہستہ مکالمے اور گانے فنی معیار سے گرتے گئے۔ تک بندوں نے شاعروں کو نکال باہر کیا اور عطائی گلے بازوں نے موسیقی کو سنبھال لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کا ذوق جس کو سدھارنے کے لئے آغا حشر اور استاد جھنڈے خاں نے اتنی عرق ریزی کی تھی پھر پستی کی جانب مائل ہو گیا۔ اگر کسی صاحبِ ذوق نے سیٹھ صاحبان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تو جواب یہ ملا کہ معلوم نہیں آپ کس دنیا کی باتیں کر رہے ہیں آپ کا کہا مانیں تو کل تک دیوالہ پٹ جائے۔ آج یہ حال ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ کلاسیکی موسیقی کو تانوں کا گورکھ دھندا خیال کرتے ہیں۔ لوگ بھونڈی اور تھرکتی ہوئی دھنوں کے جنہیں مبتذل اور سوقیانہ اشعار کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے شیدائی ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ تقسیمِ ملک سے پہلے پرنسپل سوندھی کی کوششوں سے گورنمنٹ کالج (لاہور) کے ہال میں ایک شبِ موسیقی کی مجلس منعقد ہوئی جس میں کلاسیکی موسیقی کے ایک مشہور گویے کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ کالج کا ہال مہمانوں اور لڑکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ غریب گویا دیر تک بیٹھا اپنے کمال کا مظاہرہ کرتا رہا مگر حاضرین پر موت کا سکوت طاری تھا۔ کسی طرف سے تحسین و آفرین کی آواز نہ آئی۔ گویے کو شاید یہ غلط فہمی ہو رہی تھی کہ سب اس کے گانے کے سحر سے مسحور ہیں۔ مگر لڑکے اکتا گئے تھے۔ الاپ اور ولمبت کو تو انہوں نے برداشت کر لیا مگر ادھر گویے نے درت میں قدم رکھا ادھر چیخوں اور سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے جوں توں کر کے راگنی ختم کی اور خفیف سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کے بعد لڑکوں نے پُر زور مطالبہ کیا کہ ان کے ایک دوست برس کو گانے کا موقع دیا جائے۔ مسٹر برس پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے شانِ بے نیازی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے سٹیج پر آئے اور بلند آواز اور بے ڈھنگے سُروں میں بے تحاشا گانا شروع کیا ؎

ڈنگ تے لاچی نہاون گئے لاچی ماری ٹبی

پھر کیا تھا تحسین و آفرین کا وہ غل مچا کہ کان بہرے ہو گئے۔ سینکڑوں لڑکے جھوم جھوم کر گا رہے تھے ؎ ہائے ہائے لاچی ڈبی [illegible]

کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ جب یہ ہنگامۂ بدتمیزی فرو ہوا تو معلوم ہوا کہ پرنسپل، گویّا، اکثر لڑکیاں اور مہمان تنگ آ گئے تھے۔

کالجوں اور سکولوں کے لڑکے، موٹروں تانگوں کے ڈرائیور، دفتروں کے چپراسی اور خوانچے والے وغیرہ فلمی موسیقی کے سب سے بڑے قدردان ہیں۔ جب کسی فلم میں کوئی چلتی ہوئی دھن نکلتی ہے اور خاص کر جب گانے والی بھی چلتی ہوئی ہوتی ہے تو پھر کیا کہنا بازاروں میں، گلی کوچوں میں، بورڈنگ ہاؤسوں کے کمروں میں، غسل خانوں میں ہر جگہ اسی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک دھن ہی کسی گھٹیا فلم کو "سلور جوبلی" تک لے جاتی ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ فلم سازوں نے عوام سے محض روپیہ بٹورنے کی خاطر ایک قدیم اعلیٰ فن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ عبرت کا مقام یہ ہے کہ روپے کی خاطر اچھے اچھے مغنیوں نے فلم سازوں کے ہاتھ اپنا پیشہ ورانہ ضمیر فروخت کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے دھنوں میں "تحرک" اور "پھڑک" پیدا کرنے کے لئے مغربی موسیقی کا دامن تھاما ہے ــــ کلاسیکی مغربی موسیقی کا نہیں، امریکہ کی عامیانہ رقص کی موسیقی کا۔ ہم لوگ امریکہ کی ثروت و امارت سے اس بری طرح مرعوب ہو گئے ہیں کہ ہم اس کے سطحی آرٹ کو اپنے قدیم اور بلند مرتبہ آرٹ پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ امریکہ بے شک دنیا بھر میں سب سے زیادہ متمول ملک ہے، مگر وجدانی اور ذوقی ترقی کے لحاظ سے بہت پسماندہ بھی ہے۔ اہلِ امریکہ اب تک صرف ایک فن کو "فنِ لطیف" بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور وہ ہے اشتہار بازی ــــ جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے وہ نو مشق اور ناپختہ کار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا اور یورپ کے مقابلے میں ان کا فنی اور ادبی سرمایہ ناقابلِ التفات ہے اور ان کی روایات ناقابلِ ذکر۔ روس، اطالیہ، اور جرمنی مغربی کلاسیکی موسیقی کے مشہور مراکز ہیں۔ جرمنی کا پایہ اس لحاظ سے بہت بلند ہے کہ اسی سرزمین سے باخ، واگنر، ہینڈل، بیتھوون جیسے مشہور مغنی پیدا ہوئے۔ ہمارے مغنی امریکی موسیقی پر اس قدر فریفتہ ہیں کہ انہوں نے اپنی شاندار روایات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ امریکی موسیقی بیشتر جاز، رمبا، ٹانگو وغیرہ ناچوں کی موسیقی ہے۔ اس کی بنیادی "تحرکیں" حبشیوں کے ناچوں سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس کے سازوں (HORNS, TRUMPETS, CORNET) میں کوئی بھی فنی دقائق کے ادا کرنے پر قادر نہیں۔ ان کی سمع خراش چیخ پکار کی مدد سے ناچ کی دھنیں مرتب کی جاتی ہیں۔ جن صاحبِ نظر حضرات نے بڑے بڑے شہروں کے ہوٹلوں میں ناچ کی اس موسیقی کو سنا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کو کلاسیکی موسیقی کی لطافت اور تاثر میسر نہیں۔ شاید اسی موسیقی کے عامیانہ پن سے ہمارے مغنیوں کو احساس ہوا ہوگا کہ اگر اس کے ساز ہندوستانی ارکسٹرا میں داخل کر دیئے گئے تو وہ زیادہ مقبولِ عوام ثابت ہوگا۔ کیونکہ عوام تو ہنگامے اور شور و غل کو پسند کرتے ہیں۔ میلوڈی اور صوت کی لطافتوں سے انہیں کیا واسطہ؟ اس موقع پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ہے۔ امریکہ کا مشہور فلم GONE WITH THE WIND کا پروڈیوسر مشہور مغنی موسیچی کے پاس اس فلم کی پس منظر کی موسیقی لکھوانے کے لئے گیا۔ دورانِ گفتگو میں موسیچی کو معلوم ہوا کہ فلم میں ایک جگہ بھونچال آتا ہے، ایک جگہ آگ لگتی ہے اور کئی دفعہ ہنگامۂ جنگ و جدل برپا ہوتا ہے۔ یہ سن کر موسیچی نے یہ کہہ کر کہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے فلم کو پس منظر کی موسیقی کی کیا ضرورت ہے، اس کے لئے موسیقی لکھنے سے انکار کر دیا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے سب سے پہلے تیمر برن نے ہندوستانی ارکسٹرا میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی۔ تیمر برن خاں صاحب علاؤ الدین خاں کے شاگرد رشید ہیں اور کلاسیکی موسیقی میں بصیرت تامہ رکھتے ہیں۔ مگر اس کو یہ خبط ہو گیا کہ جب تک ہندوستانی ارکسٹرا کو مغربی ارکسٹرا کی وضع اور ترتیب کے مطابق از سرِ نو مرتب نہیں کیا جائے گا، اس میں تناسب اور آہنگ کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکے گی۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہماری موسیقی نغمہ (MELODY) میں اور مغربی موسیقی توافق HARMONY میں فوقیت رکھتی ہے۔ تیمر برن ملکی سنگیت میں توافق کا عنصر داخل کرنا چاہتا تھا مگر

حضرت جوش ملسیانی

غزل

بلائے غم سے کیا ٹلے گی الم سے کب مخلصی ملے گی
غلط ہے امید کا یہ کہنا ابھی ملے گی ابھی ملے گی

نہیں ملے گا تو اک مجھی کو خوشی کا مژدہ نہیں ملے گا
گلوں کو بھی دلکشی ملے گی چمن کو بھی تازگی ملے گی

خدا کی رحمت کو پا رسا اب عذابِ دوزخ سمجھ رہے ہیں
انہیں گماں تک نہ تھا کہ جنت گناہگاروں کو بھی ملے گی

سیاہیِ شامِ غم کا شکوہ نہیں ہے اہلِ طلب میں واجب
یہی اندھیرا بنے گا رہبر اسی سے کچھ روشنی ملے گی

متاعِ حسنِ سخن کے جویا کریں نہ تکلیفِ جستجو کچھ
کہیں یہ دولت گڑی نہ ہوگی جہاں ملے گی پڑی ملے گی

عدم بھی عالم جمود کا ہے نہ کوئی محفل نہ کوئی صحبت
ہمیں تو اب تک یہی یقیں تھا کہ مرگ سے زندگی ملے گی

خلوصِ الفت کی جوش قیمت تمہیں جو اس وقت مل رہی ہے
کہیں بھی پوچھو یہی کہیں گے کہیں بھی جاؤ یہی ملے گی

جوش ملسیانی

ایک تھال، ایک بول

(پنجاب کا دیہاتی پس منظر)

اولناوے اولنا
ہتھ پانی گھچولنا
پانی آیا گندا
نسار پانی چنگا

اُوتھاں چھڈ کے لیندے
نالی چھڈیا گھیرا
ویرا جھیتی جھیتی آ
تیرے گھوڑیاں نوں گھا
وے وچھیریاں نوں گھا

وے رسال پور میرا
وے دیپال پور میرا
وے لاہور تیرا آنے
وے پشاور تیرا آنے
تُوں مناں گی کھانے
لکاں جھوپ جھوپ کھانے

ویرا جھیتی جھیتی آ

تیرے گھوڑیاں نوں گھا
وے وچھیریاں نوں گھا

تھال ہمارے ایسے گیت ہیں جو لڑکیاں اچھلتی ہوئی گیند (کھینوں) کی ٹھپ ٹھپ اور کھنکتی ہوئی چوڑیوں کی آواز کے ساتھ گاتی ہیں۔

ان گیتوں میں موسیقی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ رشتوں ناتوں کا ذکر اذکار بھی ہوتا ہے۔ ماں باپ کا ماں بھی۔ ساس سسر اور نند بھاوج کے تذکرے بھی ہوتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا پیار بھی ناچتا ہے۔

اس تھال میں بہن کے پیار بھرے جذبات بھائی کو بلا رہے ہیں اور اس کے لئے راحت، شادمانی، بامرادی کی ایسی دنیا بسا رہے ہیں جو اس وقت کی مجلسی معراج کی حامل ہے جب یہ تھال تصنیف ہوا۔ کہا گیا ہے:۔

اولناوے اولنا
ہتھ پانی گھچولنا
پانی آیا گندا
نسار پانی چنگا

چوڑا سا کیا چوچوڑے
چوڑا سا کیا چوبچو

عبدالمجید بھٹی

ستمبر ۱۹۵۰ء

(جس میں چوبی نالی کا پانی گرتا ہے)
اس میں بے طرح ہاتھ مارے جاتے ہیں۔ ایسا پانی گدلا ہوتا ہے۔

نسار (چوبی نالی) کا پانی چنگا (پاک صاف) ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے۔ پینے کے لائق پانی وہ ہے جو پاک صاف ہو نسار میں بہتا ہوا آتے اسی پانی چنگا ہے۔ نسار میں بہتا ہوا آرہا ہے یعنی کنواں چل رہا ہے۔ جو کھیتی باڑی میں خوشحالی کی علامت ہے۔ ایسے میں بھائی آئے تو اسے پاک صاف پانی پینے کو ملے گا۔

اُوٹھاں چھڈّے لیڑے نے
ٹاہلی چھڈیا گھیرا
ویرا چھیتی چھیتی آ
تیرے گھوڑیاں نوں گھاہ
تے وچھیریاں نوں گھاہ

اونٹ لید کے قطرے چھوڑ گئے ہیں۔ (یعنی قافلہ جا چکا ہے۔ پڑاؤ خالی ہے۔ اب یہاں صرف اونٹوں کی لید ہے جو صاف کردی جائے گی)

ٹاہلی (شیشم) کا گھیر پھیل چکا ہے (اس کے سائے تیری راہ دیکھ رہے ہیں)

اے میرے بھائی جلد جلد آجاؤ۔ تمہارے گھوڑوں کو گھاس ملے گی۔

گھوڑوں ہی کو نہیں بچھیروں کو بھی گھاس ملے گی (بچھیروں کے لیے علیحدہ چارے کا بندوبست نہیں کیا جاتا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی کھاپی لیتے ہیں)

مطلب یہ ہے۔ تمہاری ہی کھول کر خاطر تواضع کی جائے گی۔

ایک تھا
تمہیں ہر قسم کا آرام پہنچے گا۔ وہ کچھ بھی جیتا ہوگا۔ جو عام جا پہنچانا ضروری نہیں ہوتا۔ اور ایسا کیوں نہیں ہوگا۔

وے رسال پھیرا
وے دیپال پورا میرا
وے لاہور تنبو تانیں
وے پشاور تنبو تانیں
اُتّوں ستاں گی کھانے
لوکاں چوپ چوپ کھانے

رسال پور (فوجی مرکز) میرا ہے
ارے دیپال پور (فوجی مرکز یا صوبہ) میرا ہے۔
(دو ماہیہ انداز میں ہے) تم لاہور میں خیمے کھڑے کرو۔
تم پشاور میں خیمے کھڑے کرو۔ میں ان پر سے کھانا پلاسے (نچھاور) کروں گی جن کو لوگ اُچک اُچک کھائیں گے

ویرا چھیتی چھیتی آ
تیرے گھوڑیاں نوں گھاہ
تے وچھیریاں نوں گھاہ

اے میرے بھائی۔ جلدی جلدی آ۔
تیرے گھوڑوں کو گھاس ملے گی۔
ارے بچھیروں کو بھی گھاس ملے گی۔

بہن اپنے بھائی کو ایسا شہسوار دیکھنا چاہتی ہے۔ جس کے لیے رسال پور کی راہیں کھلی ہوں۔ دیپال پور کی راہیں کھلی ہوں۔
وہ اسے ایسا جوان ہمت، بلند بخت، اولوالعزم، بہادر دیکھنا چاہتی ہے۔ کہ اس کے جھنڈے اونچے ہوں گے لاہور میں بھی نصب

عبدالمجید

فضاؤں میں بھی نصب ہوں۔

ایسے میں وہ کیا کرے گی۔ مٹھائیاں بانٹے گی، شیرینیاں لٹائے گی۔

اس نقطے میں جب ہماری زندگی میں مسرت کا معیاری پہلو فضاؤں میں ایسے جذبات کو بکھیر دیتا ہے جو حصولِ مقصد کے لئے بنیاد بنیں، ایسا حسین اور دلچسپ کارنامہ ہے جس کی داد و تحسین ممکن نہیں۔

بول

کپ کپ کوٹھیا
پکاؤ کر بیٹھے آئے نی
ہورناں لوں ڈھا کے تینوں ڈھان آئے نی

کپ جا کپ جا کو بیٹھے!
ارے کچے مکان آگئے ہیں
اوروں کو ڈھا کر تجھے ڈھانے آئے ہیں۔

برسات میں گیلے ٹیلے وٹوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ یا جذب ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ تو گاؤں کے بچے قریب کے ریتے کی ٹکڑیوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ گیلی ریت میں پیر رکھ کر اسے اوپر سے تھپتھپاتے ہیں اور جلنت لے میں کہتے جاتے ہیں۔

کپ کپ کوٹھیا!
پکاؤ کر بیٹھے آئے نی۔

معلوم ہوتا ہے۔ یہ بول اس وقت کی پیداوار ہے۔ جب کچے مکانوں کی جگہ پکے مکان بننے لگے۔

پرانے لوگ ایسے کچے مکانوں میں رہتے تھے جن کے فرش صحن کے مقابلے میں گہرے ہوتے تھے۔ اس لئے کہ ایسے مکان گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم رہتے تھے۔

رہنے سہنے کے طور طریقے بدلنے لگے۔ کچے مکانوں کی جگہ پکے مکان بننے لگے تہذیب کا ڈھانچا بدلنا شروع ہوا۔ پرانی اقدار کی جگہ نئی اقدار قائم ہونے لگیں تو اپنی روایات، اپنی اقدار اصلیہ کو باقی رکھنے کی جدوجہد ضروری ہو گئی۔

ہر فرد بشر کے ذہن نشین کرانا ضروری ہو گیا کہ جو ادعا ہو رہا ہے وہ اس پر بھی گزرنے والی ہے۔ وہی مکان باقی رہے گا جو مضبوط ہوگا۔ وہی اقدار باقی رہیں گی جن کو باقی رکھنے کے لئے ہم سینہ سپر رہیں گے۔ ڈٹے رہیں گے۔

ہمیں نئی اقدار اور نئے پکے مکانوں کی ضرورت نہیں ہم انہی کچے مکانوں کو اور مضبوط بنائیں گے۔ اتنا مضبوط کہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہیں اور اس حملے کو روک سکیں جو انہیں گرانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

اس بول کے سہارے اشاریت کی مدد سے اپنی تہذیب کی بقا کے لئے ہی کوشش نہیں کی گئی، غیر ملکی استیلا کے خلاف محاذ قائم کیا گیا ہے اور وطن کے سامان بھی کئے گئے ہیں اور بغیر کسی قسم کے خرچ اور مشینری کے ایسے ہمہ گیر پروپیگنڈا کی بنیاد رکھی گئی ہے جو آپ سے آپ بڑھتا اور پھیلتا چلا جائے۔

پروپیگنڈا کرنے والے اپنی ہی موج میں اس محنت کو انجام کرتے چلے جائیں۔ اس کے رنگ سے فضاؤں کو رنگ دیں۔ اسے ہر دل کی دھڑکن بنا دیں۔

جن لوگوں نے ایسے گیت اور ایسے بول اپنی قوم کو دیئے ان کی نگاہ، ان کی بصیرت اور ان کی وطن دوستی اس حد تک مسلم ہے اور اس حد تک نفسیاتی اور سائنٹیفک ہے کہ ہم اگر ان کا اپنا لیں تو ہماری مجلسی اور سیاسی زندگی اس طرح ... سکتی ہے کہ اپنے وطن پر فخر کریں اور اپنے وطن کے احترام پر مجبور ہوں۔

[illegible]

جتی[1]

آنکھوں میں ڈورے کاجل کے
پیارے پیارے ہلکے ہلکے
گھونگھٹ میں نیلے آنچل کے
نظروں سے کیفیّت چھلکے
بھیگی بھیگی پلکوں پہ ہیں
چھائے کیا معصوم دھندلکے
نرگس نے بینائی پائی
آنکھیں تلووں سے مل مل کے
بھیگے بھیگے بالوں میں ہیں
جلوے بھادوں کے بادل کے
گالوں پر بیتاب پسینہ
پھول سے جیسے شبنم ڈھلکے
مکھّن کی لچکیلی باہیں
باہیں ہیں یا شعر غزل کے
یہ جتّی "پروان چڑھی ہے
کھیتوں کی گودی میں پل کے
ہیر کی نگری میں رہتی ہے
دودھ کی نہروں میں بہتی ہے

[1] جاٹنی

جمیل جالبی

تغزل کا مفہوم

اردو کے تنقیدی سرمائے میں بہت سے الفاظ بطور اصطلاحات کے ایسے استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں قاری کا ذہن کم از کم پڑھتے وقت الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس قسم کی اصطلاحات کے استعمال میں کئی باتوں کو دخل ہے ایک تو یہ کہ لکھنے والا خود ان کے مفہوم سے ناواقف ہوتا ہے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طریقے سے ان کو استعمال کر لیتا ہے۔ یا پھر لکھنے والا اپنے ذہنی الجھاؤ کو چھپانے کے لئے ان اصطلاحات کا سہارا ڈھونڈتا ہے مگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی ذہنی کم مائیگی کی پول کھل جائے۔ آج جدید اردو ادب میں یہ بھی ہو رہا ہے کہ انگریزی ادب کی کتابیں پڑھ کر وہاں کی مستعمل اصطلاحات کے الٹے سیدھے ترجمے کر لئے اور لگے انہیں استعمال کرنے۔ اس رجحان کی وجہ سے جدید اردو تنقید روز بروز غیر واضح سی ہوتی چلی جاتی ہے —— لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان تنقیدی اصطلاحات کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ ان میں سے بہت سی اصطلاحات کو سمجھنے کے باوجود تنقید نگار دوسروں کو وضاحت کے ساتھ ان کا مفہوم سمجھانے سے قاصر رہتا ہے۔ اور چونکہ اب تک اردو ادب میں ادھر کچھ توجہ بھی نہیں کی گئی اور ان کے مفہوم و معنی متعین بھی نہیں ہوئے اس لئے استعمال کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے جس طرح کہ تھا۔ غرض اس وقت تنقیدی ادب میں اصطلاحات کے معنی و مفہوم کی تعیین اور توضیح کا مسئلہ بہت اہم ہے لازم ہے کہ ادیبوں کے سوچنے کے زاویے صاف اور واضح ہو جائیں اور ان کے ذہن و فکر کی دھندلی فضا روشن ہو جائے —— انہی توضیح طلب اصطلاحات میں سے ایک تغزل[1] بھی ہے۔ ہم آپ سب یہی کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے ہاں تغزل ہے، فلاں شاعر کے ہاں تغزل نہیں ہے لیکن یہ بات کہتے وقت ہم خود اس کے مفہوم کو نہیں سمجھتے کہ آخر اس سے ہمارا منشا کیا ہوتا ہے۔ آخر یہ تغزل پیدا کب ہوتا ہے۔ کیا اس کا تجزیہ ممکن ہے اور اگر ہے تو کیونکر۔ کیا تغزل صرف غزل ہی میں ہوتا ہے یا دوسرا اصنافِ سخن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ کیا تغزل شاعری کے لئے ضروری ہے وغیرہ۔

چونکہ اس اصطلاح کے معنی و مفہوم متعین کرنے اور سمجھنے کے لئے ایک خاصے وسیع پس منظر کی ضرورت ہوگی اس لئے ہم شروع ہی میں اردو شاعری کو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کئے لیتے ہیں۔ مضمون بندی، معنی آفرینی، حیاتی و جذباتی شاعری۔ مضمون بندی سے میرا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے شعر میں کوئی ایسا انوکھا مضمون باندھے جو عام روش سے ہٹا ہوا ہو۔ اور شاعر نے اس میں بہت دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہو اور اس سے قطع نظر کہ شعر ابتذال کی حدود کو چھو رہا ہو شاعر اسی بات کو پیش نظر رکھے کہ اس نے کس حد تک اس خیال کو شعری جامہ پہنایا جس پر کسی دوسرے کی نظر نہیں پہنچی۔ یا پھر شاعر صرف مشکل ردیف قافیہ کی خاطر بھرتی کا مضمون لائے اور یا صرف رعایتِ لفظی اور ایہام کو شعر کا محرک بنائے۔ یہ چند شعر مضمون بندی کی وضاحت کے لئے ملاحظہ ہوں ؎

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں　　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں　　(غالب)

---

[1] ممکن ہے بعض لوگوں کو "تغزل" کی اصطلاح سے (یا بعض اور اصطلاحوں سے) اختلاف ہو مگر اس کے باعث مضمون سے مستفید ہونے میں کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی۔ "مخزن"

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو (رند)

وہ طفل ترساں جبیں پہ قشقہ جو کھینچ سورج کو ڈبوئے پانی — تو کیوں نہ دل دیکھنے کو ترسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں (شاہ نصیر)

چھلا حضور ہاتھ کا دے دیجئے ہمیں — دل کے جہاز کا اسے لنگر بنائیں گے (تعشق)

تیار رہتی ہیں صف مژگاں کی پلٹنیں — رخسار یار ہے کہ جزیرہ فرنگ کا (آتش)

رہی معنی آفرینی تو اس سے میرا منشا یہ ہے کہ کسی معصوم خیال، تصور، تلمیح وغیرہ سے کوئی ایسی بات پیدا کی جائے جس سے مضمون میں باریکی پیدا ہونے کے ساتھ تازگی اور ندرت کا جمال نکھر آئے اور شعر میں کوئی ایسی چیز پیدا ہو جس سے شعر دل سے قریب ہو کر اس کے دروازوں سے کان لگانے لگے چونکہ اس میں جذبہ بھی موجود ہوتا ہے اس لئے جذبہ اور تخیل، فکر شعر کی اندرونی دنیا میں ایک ہلچل سی مچائے رکھتے ہیں۔ ایسے شعر میں مضمون بھی ہوتا ہے لیکن شعر کے پڑھنے سے یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر صرف مضمون کی خاطر کہا گیا ہے۔ اب اسے یوں سمجھئے کہ مضمون بندی اور معنی آفرینی میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں شاعر کا مقصد صرف دور کی کوڑی لانا ہوتا ہے بمشکل ردیف و قافیہ کا استعمال ہوتا ہے یا پھر لفظی ہیر پھیر لیکن اس کے برخلاف معنی آفرینی میں مضمون موجود ہونے کے باوجود ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ اشعار پڑھئے ؎

وصل سے اڑ گیا ہے رنگ مرا — کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا (میر)

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا (درد)

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے — پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے (انور)

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اک مسیحا نفس کی بات گئی (جگر)

کیا درد ہجر اور یہ کیا لذت وصال — اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے (اصغر)

اب رہ گئی حسیاتی و جذباتی شاعری۔ تو اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے آپ اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ ایک شاعر کی بنیادی و مادی ضروریات وہی ہیں جو ایک عام انسان کی ہیں وہ کھاتا پیتا ہے۔ سوتا جاگتا ہے۔ شادی بیاہ کرتا ہے۔ الجھنوں سے پریشان ہوتا ہے۔ ترقی پہ خوش ہوتا ہے اور عام انسان کی طرح آرزوئیں بھی رکھتا ہے یعنی اس لحاظ سے ایک شاعر و عامی بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہوتے ہیں۔ لیکن ایک چیز جو شاعر کو عامی سے بلند کرتی ہے وہ ہے اس کے احساس کی ذکاوت اور احساس کو لفظوں کی گرفت میں لانے کی قوت۔ شاعر کا دل و دماغ کسی خارجی شے سے مرتعش ہوتا ہے یا ارتعاش ایک احساس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عامی بھی ایک خارجی شے سے متاثر ہوا ہو لیکن اس کے ہاں یہ تاثر بہت ہلکا اور مبہم ہوتا ہے وہ اسے لفظوں کی گرفت میں تو کیا خاک لا سکتا ہے، کچھ لمحوں کے بعد اس کا احساس ہی زائل ہو جاتا ہے۔ شاعر اس احساس کو بیان کرنے کی موثر قدرت رکھتا ہے۔ اب یہاں سے شعر کا طرز تراش شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اب اس احساس کو زبان دی جا چکی ہے۔ اس لئے جب کبھی قاری اس شعر کو پڑھتا ہے تو وہ چونک اٹھتا ہے صرف اس لئے کہ وہ جذبہ جو مبہم اور خوابیدہ سا تھا اب اس شعر کے پڑھنے سے جاگ اٹھتا ہے۔ اب قاری بھی اپنے مبہم احساس اور جذبے کو وضاحت سے سمجھتا اور محسوس کرتا ہے یہ احساس یا جذبہ اوسط درجہ کا شعر طاری کر ہی نہیں سکتا۔ اس جذبے کے لئے مادی اور غیر مادی شاعری کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ یہی وہ شاعری ہے جو فطرت انسانی کی رجاوٹ رکھنے کی وجہ سے انسانی احساسات و ذہن

کو آسودہ کرتی ہے، اور چونکہ ہر انسان احساسات و جذبات کے لحاظ سے کسی دوسرے انسان سے کسی نہ کسی وقت، حالات اور لمحے میں یکساں ہو جاتا ہے اس لئے ایسے اشعار کا اثر دوامی ہوتا ہے۔ ایسی شاعری ایک خاص زمانے میں پیدا ہونے اور اس زمانے کے پرتو کی حامل ہونے کے باوجود زمانے سے متاثر نہیں ہوتی۔ ایسی شاعری خدائی جذبے اور خدائی لمحے کا ایسا بے ساختہ اظہار ہوتی ہے کہ انسان اسے پڑھ کر یہ کہنے لگتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور تغزل بھی اسی منزل میں پہنچ کر جنم لیتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اس نوع کے اشعار کا مطلب بھی آپ بیان کر سکیں، مگر ایسی ہی شاعری سے آپ کے احساسات وضاحت، آپ کے مبہم تصورات بیداری، اور آپ کے جذبات ترتیب و تہذیب پاتے ہیں۔ یہ چند شعر پڑھئے ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ　　طاعت میں وہ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

تو اور آرائش خم کاکل　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

اتنی طویل بحث کے بعد اب ہم تغزل کے مفہوم کے بالکل قریب آ پہنچے لیکن اس کے باوجود تغزل کوئی ایسی بندھی ٹکی چیز تو ہے نہیں کہ جسے ایک لفظ میں سمجھایا جا سکے۔ اس کے لئے چند عناصر کا امتزاج ضروری ہے۔ اب آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب احساس یا تصور کی رچاوٹ رمزیہ انداز میں موسیقی کو اپنے اندر مدغم کر لیتی ہے تب کہیں جا کر تغزل جنم لیتا ہے۔ آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر انہی عناصر پر کیوں زور دیا گیا اور دوسروں کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان عناصر کے ذیل میں اول تو وہ تمام عناصر آ جاتے ہیں جنہیں آپ عموماً جذبہ، تخیل، حسن الفاظ، تاثیر، ترنم، خلوص اور شعری تجربے وغیرہ کا نام دیا کرتے ہیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ جب تک کوئی تصور وجدان کا جزو نہ بن جائے اور جب تک وہ شاعر کی اندرونی ذات اور شخصیت کی گہرائیوں میں داخل ہو کر اسی کا ایک غالب حصہ نہ بن جائے اس وقت تک کیسے ممکن ہے کہ احساس کے بیان میں ایسی وجدانی چمک اور روشنی پیدا ہو جائے کہ جو قاری کے دل و دماغ میں بھی وہی چمک اور روشنی پیدا کر سکے، اس کے احساس کو مانجھ سکے۔ اس کے ذوق کو بلند اور اس کے شعور کو گہرا کر سکے۔ رمزیہ بیان اس لئے ضروری ہے کہ جب تک احساس و تصور کی کچھ پردہ داری نہ ہو گی اور جب تک اظہار میں خوبصورت ابہام نہ ہو گا اس وقت تک احساس یا تصور میں کیسے وسعت پیدا ہو سکے گی اور پھر وہ شعر یا شاعری زمانۂ مستقبل میں کس بل بوتے پر زندہ رہ سکے گی۔ اردو غزل اسی وجہ سے اب تک زندہ ہے اور میر، درد، آتش، غالب اور مومن وغیرہ کے اشعار اسی وجہ سے اب تک ہمارے دلوں کو گرما دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے احساس یا تصور یا تجربے کے اظہار میں رمزیہ انداز اختیار کر کے اس میں گوناگوں وسعتیں پیدا کر دیں۔ میر نے تو کھل کر اس کا اعتراف کیا ہے ؎

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز　　یہ حقیقت ہے شیخ کیا جانے

اور ایک میر ہی پر کیا موقوف ہر بڑے شاعر نے اس پر عمل کیا ہے۔ رمزیہ انداز کی اہمیت کو ایک آدھ مثال سے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ میر بڑے دل و دماغ کا مالک تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ زمانے کے حالات کی طرف سے آنکھیں میچ لیتا۔ میر نے اپنی آنکھوں سے ایک انقلاب دیکھا۔ اور ایک تہذیب کو دم توڑتے دیکھا۔ اس انقلاب کا اثر میر کی شاعری میں عام طور سے ملتا ہے لیکن اس نے صرف واقعات کو شعر کا جامہ نہیں پہنایا بلکہ مخصوص واقعات

کو ذہن میں رکھنے کے باوجود وہی انداز اختیار کیا جو ہر بڑا شاعر کرتا ہے یعنی رمز کا، پردہ داری کا، عمومیت کا۔ میر نے خود دیکھا، شاہ عالم بادشاہ کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیری گئی ہیں مگر اس نے اسے یوں کہا۔۔۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

ایک بڑے شاعر اور چھوٹے شاعر کے انداز کا یہی فرق ہے۔ سودا کا ایک شعر ہے ۔

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک — لخت جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

اس شعر میں مرزا رفیع سودا نے ترکوں کے اس جنگی دستور کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ اپنے کمانڈر کے مرنے کے بعد اس کی لاش کو آگے دھر کر دشمنوں پر حملہ کرتے تھے لیکن شعر کے رمزیہ انداز نے اسے محض رسم کی ترجمانی سے بچا لیا۔ اور اس کے معنی و مفہوم میں ہزار گونہ وسعتیں پیدا کر دیں۔ رمز اس قدر اہم ہے کہ آپ اس کے بغیر شعر کی عظمت کی داستان نہیں کہہ سکتے۔۔۔ اب رہی موسیقی۔ اگر رچے ہوئے احساس کے بیان میں ایسی جھنکار اور روانی ہے جو دل و دماغ کے ملائم تاروں کو مرتعش کر دے تو اور کچھ ہو نہ ہو تاثیر سے شعر خالی نہیں رہتا ہے۔ موسیقی شعر کے اندر جہاں تاثیر کو اضافہ کرتی ہے وہاں شعر کو رواں، جاذب اور مکرر پڑھنے اور سننے کے قابل بنا کر ایک جادو جگانے لگتی ہے۔ اب اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب تینوں اجزا ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں تب کہیں تغزل پیدا ہوتا ہے۔ صرف رمزیہ انداز، صرف احساس یا صرف موسیقی تو کچھ نہیں کر سکتی۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

یہ لگی لگن کوئی لائے کن تو میں مانوں تن تیر سے گھنگرو — گیا سینہ چھن گیا دل بھی چھن جو ہی لوٹے چھن پا تیرے گھنگرو

اس شعر میں موسیقی ہے لیکن کیا آپ اس شعر کو اچھا شعر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہ شعر دیکھئے ۔

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینہ میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے — میر

آجکل جو آپ آفاقی شاعری کا بڑا چرچا سن رہے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ شاعری انسانوں کی مادی ضروریات کی فراہمی کے لئے آواز اور بھوکی دنیا کے تمام انسانوں کے لئے روٹی کپڑے کا انتظام کرنے کی ترغیب دے، یہ کام بھی اپنی جگہ بڑا ضروری اور نیک ہے۔ اگر شاعری یہ کام بھی کر سکتی ہے تو اس سے ضرور یہ کام نکالنا چاہئے لیکن آفاقی شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو مقام، طبقہ، قوم اور ملک سے بلند تر ہو دنیا کے کثیر انسانوں کے احساسات و تجربات کی تشریح کرتی ہو اور انسانی جذبات کی ترتیب و تہذیب کا عظیم کام انجام دیتی ہو۔ اور چونکہ یہ خوبیاں صرف تغزل کے ذریعے سے پیدا کی جا سکتی ہیں اس لئے تغزل ہی آفاقی شاعری کی پیدائش کا ضامن ہے۔ سعدی، حافظ، ہومر، شیکسپیئر تک سب کی شاعری اسی لئے آفاقی ہے کیونکہ اس میں تغزل اپنی انتہا پر ہے۔

تغزل کے ساتھ یہ تصور غلط وابستہ ہو گیا ہے کہ چونکہ یہ لفظ غزل سے مشتق ہے اس لئے یہ صرف غزل کے لئے ہی استعمال ہونا چاہئے۔ تغزل، اس کے باوجود کہ یہ لفظ غزل سے مشتق ہے، اتنا ہمہ گیر اور وسیع ہے کہ کوئی صنف شاعری اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ خواہ وہ نظم ہو یا مرثیہ یا مثنوی۔ میں اس کی مثالیں تو یہاں نہیں دونگا۔ اس لئے کہ مقالے کے طول پکڑ جانے کا خوف مانع ہے لیکن اتنا کہنا کافی ہوگا کہ احساس و تصور کی چاشنی اور رمز و موسیقی مختلف شخصیتوں کے مختلف مزاج کے ساتھ تغزل کی شکل میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے کہیں یہ حافظ کی

تغزل کا مفہوم

مخزن

الوں کی شکل میں، کہیں میر کی بے نیازانہ احساساتی وطنزیہ شاعری میں، کہیں حالی و اقبال اور اکبر کی قومی شاعری میں اور کہیں عراقی اور درد کی غزلوں میں اور کبھی مومن اور میر حسن کی مثنویوں اور انیس کے مرثیوں میں۔ غرض کہ تغزل کے لئے صرف غزل کی قید نہیں۔ آج کے چند شعراء مثلاً فراق، راشد، جذبی اور فیض وغیرہ کی شاعری میں بھی کہیں کہیں تغزل جھلکتا نظر آتا ہے (فراق کے ہاں تو بالخصوص)

تغزل کے مفہوم کو اور وضاحت سے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تغزل اور شعریت میں بھی امتیاز کریں۔ شعریت تغزل کی ابتدائی منزل ہے لیکن تغزل ہے شعریت کا آخری اور انتہائی درجہ۔ شعریت بہ رعایت لفظی، حسن ادا، سادگی، شوخی، طنز، محاورہ اور ضرب المثل سے بھی پیدا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؂

مجھے حال سے یا بھلے حال سے	تمہیں کیا ہماری بسر ہو گئی	داغ
بات اب امتحان پہ آئی	قصہ کوتاہ جان پر آئی	مرزا عسکری
اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں	عارضی میری زندگانی ہے	ناجی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو	کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی	غالب
مجھ کو دھوکا دیا دکھا کے شراب	اے ان کی آنکھوں کا ہو وے خانہ خراب	سوز

غزل کے لئے صرف محاورہ، صرف ضرب المثل یا صرف سادگی و شوخی یا زبان کا چٹخارا کافی نہیں ہوتا۔ شعریت صرف خارجیت سے بھی پیدا ہوتی ہے ؂

بزم اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے	ہاتھ چپکے سے مگر میرا دبا کر چھوڑا	حسرت
جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ میں آپ آئے ہوئے	کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے	
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں	وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو	
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو	وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو	

تغزل کا درجہ چونکہ اس کے بعد کا ہے اس میں نرمی و داخلیت اور ذہنی تکمیل ہوتا ہے ؂

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
عالم حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے	بھولیں اگر تو یاد آئے یاد کریں تو بھول جائے

غرض کہ تغزل شعر کے اندر ایسی وسعتیں پیدا کر دیتا ہے کہ جب اس نوع کے اشعار نئی فضا، نئے ماحول، نئے حالات زندگی میں سامنے آتے ہیں تو ان کے معنی و مفہوم اور تیور بدلتے جاتے ہیں اور شعر (اگر آپ مجھے غیر واضح اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں) زمان و مکاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بیسویں صدی کے کچھ شعرائے کرام شاعری کی بنیاد صرف بجلی گھروں کی تعمیر، سیمنٹ کے پائپ، مزدوروں کی ہڑتال پر رکھتے ہیں اور جنکو وقتی شہرت، عزت اور مال ملنا ضروری ہے اس لئے اکثر شعراء "رمز" کی مخالفت کرتے ہیں اور لامحالہ تغزل کو بھی حرام سمجھتے ہیں لیکن ایسے شعرائے کرام بجلی گھروں اور سیمنٹ کے پائپ تو پیدا کر سکتے ہیں مگر ان کے وجدان میں مل مالکان سے گھل مل سکتے ہیں تو انکی شعری تخلیقات میں بھی یہ مرحلہ تغزل جلوہ گر ہو گئے لیکن — واحول ولا قوۃ میں کیا بات کہہ گیا۔

جمیل جالبی

حضرت امین حزیں

غزل

★

جو حائل ہیں پردے، اُٹھاؤ تو جانیں
نظر صاف ہم کو بھی آؤ تو جانیں

پسِ پردہ ساقی گری کر رہے ہو
جو نظروں سے نظریں ملاؤ تو جانیں

بیاں ہو چکا رقصِ طوبیٰ کا منظر
پلاتے ہوئے جھوم جاؤ تو جانیں

وہ نغمہ، وہ بے ساز و آواز نغمہ!
جو چھیڑو تو جانیں، جو گاؤ تو جانیں

تمہاری قسم ہم تو کھاتے ہیں پیارے
ہماری قسم تم بھی کھاؤ تو جانیں

یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا دل کا سودا؟
"سرِ بزم اِدھر ہاتھ لاؤ" تو جانیں!

جو جانِ سخن ہیں، جو روحِ سخن ہیں
امیں! اُن سے بھی داد پاؤ تو جانیں

حامد علی خاں

کہانی
رانی کیتکی اور کنور اُدے بھان کی
(سنکشیپ اُسی بھاشا میں)

کسی دیس میں کسی راجا کے گھر ایک بیٹا تھا۔ جسے کنور اُدے بھان کر کے پکارتے تھے، اس کے جوبن کی جوت میں سورج کی ایک سوت آ ملی تھی۔ برس بھر کے ـ سولھے میں پاؤں رکھا تھا۔ پر کسی بات کے سوچ کا گھر گھاٹ نہ پایا تھا۔

ایک دن ہریالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر اٹکھیل پنے کے ساتھ چلا جارہا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے آئی تو اس نے سب کو چھوڑ گھوڑا اپھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا تھا؟ جب سورج چھپ گیا اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو بھوکا پیاسا کنور اُدے بھان تھکا آسرا ڈھونڈنے میں کچھ امریاں دھیان چڑھیں۔ ادھر چل نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ چالیس پچاس رنڈیاں ایک سے ایک جوبن میں اگلی، جھولا ڈالے ہوئے پڑی جھول رہی ہیں اور ساون گا رہیاں ہیں جو انھوں نے کنور کو دیکھا ـــ "تو کون ہے تو کون ہے؟" کی چنگھاڑ پڑ گئی۔

ان سبھوں میں سے ایک سے اس کی آنکھ لڑ گئی۔ یہ جھولنے والی، لال جوڑا پہنے ہوئے، جس کو سب رانی کیتکی کہتے تھے، اس کے بھی جی میں اس کی چاہ نے گھر کیا۔ پر کہنے سننے کو اس سے بہت ناہ نوہ کی اور بولی۔

"ایکا ایکی جو تم بیچ میں ٹپک پڑے، یہ نہ جانا یہاں رنڈیاں اپنی جھول رہی ہیں۔ اجی تم جو اس روپ کے ساتھ بے دھڑک چلے آئے ہو ٹھنڈی ٹھنڈی چھانوں چلے جاؤ۔"

کنور نے کہا: "اتنی رکھائیاں نہ کیجئے۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھانوں میں اوس کا بچاؤ کر کے پڑ رہوں گا۔ دھندلکے اٹھ کے جدھر منہ پڑے گا چلا جاؤں گا۔"

یہ سن کر لال جوڑے والی نے کہا: "ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے پڑ رہیں اور کچھ کھانے پینے کو دے دو۔ گھر آئے کو آج تک کسی نے مارا نہیں۔"

رانی کیتکی کی یہ داستان مرزا انشا نے ٹھیٹ ہندی میں لکھی تھی۔ "ٹھیٹ ہندی" سے ان کی مراد وہ زبان تھی جس میں نہ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ ہوں اور نہ سنسکرت کے بھاری بھاری شبد۔ وہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے، اس کا اندازہ اصل کتاب کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ راقم کی رائے میں اس تکلف کی وجہ سے کہیں کہیں زبان کمزور ہو گئی ہے اور مرزا انشا کی اس اپج کو ایک چٹکلے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

ریڈیو پاکستان لاہور سے مختلف حضرات اردو کی مشہور کتابوں کے خلاصے نشر کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ راقم نے خاص کوشش سے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ خلاصے میں اصل زبان سے انحراف نہ ہو۔ (ح)

اتنا آسرا پاکر کنور نے سب سے پرے جو پان سات چھوٹے چھوٹے پودے تھے، ان کی چھانہہ میں اپنا بچھونا کیا پر چاہت کی لگاوٹ جو کہ کوئی آتی تھی؟

ادھر رانی کیتکی نے اپنی سہیلی مدن بان کو جگا کر یوں کہا: "اری تو نے کچھ سنا، میرا جی اس پر آگیا ہے، اور کسی ڈول سے نہیں تھم سکتا سب میرے بھیدوں کو جانتی ہے۔ اب جو ہونی ہو سو ہو، میں اس کے پاس جاتی ہوں۔ تو میرے ساتھ چل، پر کوئی سننے نہ پائے۔ اری یہ میرا میرے آد اس کے بنانے والے نے ملا دیا۔ میں اسی لئے امرئیوں میں آئی تھی۔

کیتکی اپنی گوئیاں کا ہاتھ پکڑے، جب وہاں پہنچی جہاں کنور اُدے بھان پڑے پڑے بڑبڑا رہا تھا، تو مدن بان نے آگے بڑھ کر کہا، تمہیں جان کے رانی آپ آئی ہیں۔ کنور نے اٹھ کر کہا۔ جی کو جی سے ملاپ ہے۔ پھر ہوتے ہوتے دونوں نے اپنے پتے کھولے۔ رانی کیتکی راجا جگت پرکاس اور رانی کام لتا کی بیٹی تھی، اور مہینے پیچھے ایک بار امرئیوں میں جھولنے آئی تھی۔ اُدے بھان نے کہا۔ میرے باپ کا نام راجا سورج بھان اور ماں کا نام رانی لچھمی باس۔ آپس میں گٹھ جوڑا ہو جائے تو کوئی اچرج کی بات نہیں۔ یوں ہی آگے ہوتا آیا ہے۔ دونوں مہاراجوں کو یہ چیت چاہی ہی اچھی لگے گی۔ جب مدن بان کے سمجھانے پر دونوں نے انگوٹھیوں کی ہیرا پھیری کرلی اور لکھوٹی بھی لکھ دی تو مدن بان نے کہا "اب اُٹھ چلو۔ اس سونے دو، اور روئیں تو پڑے رونے دو۔"

پھر پچھلے پہر رانی تو اپنی سہیلیوں کو لے کر جدھر سے آئی تھی اُدھر چلی گئی، اور کنور اپنے گھوڑے کی پیٹھ لگ کر اپنے لوگوں سے مل کر اپنے گھر پہنچا۔ پر اس کا کھانا پینا چھٹ گیا۔ کچھ سوچ کر گھڑی گھڑی پڑھتا، نہ کسی سے بولتا نہ کسی کی سنتا۔ ایک دن ماں باپ نے کنور کو گلے لگایا، منہ پاؤں پر بیٹے کے گر پڑے اور کہا "بھلا وہ ہے کیا جو ہو نہیں سکتا۔ کہو کیا چاہتے ہو، جی تو کھولو۔ جو کہنے میں کچھ گھبراہٹ ہو تو لکھ بھیجو۔ تم کہو کنوئیں میں گر پڑو تو ہم گر پڑیں گے۔"

مہاراج گئے تو کنور نے لکھ بھیجا: "لاج چھوڑ کے، ہاتھ جوڑ کے، منہ پھوڑ کے، گھگیا کے یہ لکھتا ہوں، جگ میں چاہ کے ہاتھوں کسی کو سکھ نہیں۔ کوئی رانی کیتکی مہاراجا جگت پرکاس کی بیٹی ہیں۔ انہوں نے انگوٹھی اپنی مجھے دی اور لکھاوٹ بھی لکھ دی اور میری انگوٹھی انہوں نے لی۔ اب جس میں بیٹے کا جی رہے، وہ کیجئے۔"

ماں باپ نے لکھ بھیجا "تم کو دھومت رانی کیتکی کے ماں باپ تمہاری بات مانتے ہیں تو ہمارے سمدھی سمدھن، نہیں تو ڈھال تلوار کے بل تمہاری دلھن تم سے ملا دیں گے۔"

اب سورج بھان کا باھمن شبھ مہورت دیکھ کے کیتکی کے باپ کے ہاں گیا، مگر اس پر بڑی کڑی پڑی۔ کیتکی کے باپ نے کہا: "یہ ناتا نہیں ہونے کا۔ ان کے باپ دادا ہمارے باپ دادوں کے آگے ہاتھ جوڑ کے بات کرتے تھے۔ کیا ہوا آج راب سے بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے۔"

باھمن نے جل بھن کر کہا: "اگلے بھی ایسی بچار میں تھے اور بھری سبھا میں یہی کہتے تھے جو ہم میں ان میں کچھ گوت کا میل تو نہیں پر کنور کی ہٹ سے کچھ ہماری نہیں چلتی۔ نہیں تو ایسی اوچھی بات کب ہمارے منہ سے نکلتی۔"

یہ سنتے ہی مہاراج نے باھمن کے سر پر پھولوں کی چھڑی سے ماری، اور کہا کہ اگر باھمن کی ہتیا کا دھڑکا نہ ہوتا تو تجھ کو ابھی چکی میں دلوا ڈالتا

بہا: اس کو لے جاؤ اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں موند رکھو۔

جو کامنی پرستی سو کنور اودے بھان کا باپ سنتے ہی لڑنے کی ٹھان، اپنے ٹھاٹھ باندھ، دل بادل جیسے گھر آتے ہیں، چڑھ آیا۔

رانی کیتکی کے باپ جگت پرکاس نے یہ دیکھ کر اپنے گرو مہندر گر کو جو کیلاس پہاڑ پر رہتا تھا، لکھ بھیجا: "کچھ ہماری سہائے کیجئے۔ مہا کٹھن بپتا کے ماروں کو پڑی ہے۔" پھر ساری بات جوں کی توں لکھی۔

جس گھڑی یہ راجا کی چٹھی ایک بگولے کے پہنچتا ہے، جوگی مہندر گر ایک چنگھاڑ مار کر دل بادلوں کو تہلکا دیتا ہے، اور ایک آنکھ کی جھپک میں آن کی آن پہنچتا ہے۔

پہلے تو ایک کالی آندھی آئی، پھر اولے برسے، پھر بڑی آندھی آئی۔ کسی کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ ہاتھی، گھوڑے، اور جتنے لوگ راجا سورج بھان کے تھے کچھ نہ سمجھا گیا، کدھر گئے۔ پھر گرو جی نے اپنے اتیتوں سے کہہ دیا: "اودے بھان، سورج بھان اور لچھمی باس تینوں کو ہرن ہرنی بنا کے کسی بن میں چھوڑ دو اور جو ان کے ساتھی ہیں سب کو توڑ پھوڑ دو۔" جیسا کچھ گرو جی نے کہا، جھٹ پٹ وہی ہوا۔ بپت کا مارا اودے بھان اور اس کے ماں باپ ہرن ہرنی بن، کئی برس بن بن کی ہری ہری گھاس چگتے رہے اور اس بھیڑ بھڑکّے کا تو کچھ ٹھکانہ بڑا نہ ملا جو کدھر گیا۔

پھر مہندر گر نے مہاراجا جگت پرکاس سے کہا: "تو یہ گھمبر اور یہ بھبوت۔ ہم نے تمہیں دیا۔ جو کچھ ایسی بپتا پڑے تو اس گھمبر میں سے ایک رونگٹا پھونک کر آگ دکھا دینا، ہم آن پہنچیں گے۔ اور بھبوت جو کوئی چاہے، جب انجن کرے، وہ سب کو دیکھے، کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔" یہ کہہ کر گرو جی اسی دل سے کیلاس پہاڑ پر جا دھمکے۔

اب رانی کیتکی کی بپتا سنو!

چپکے چپکے کراہتی تھی — جینا اپنا نہ چاہتی تھی
کہتی تھی کبھی اری مدن بان — ہے آٹھ پہر مجھے وہی دھیان
امرتوں میں اُن کا وہ اترنا — اور چپکے سے اٹھ کے ہیر اجانا
اُن کی وہ آتار انگوٹھی لینی — اور اپنی انگوٹھی اُن کو دینی
اب میں نے سنا ہے اے مدن بان — بن بن کے ہرن ہوئے اودے بھان
یہ بات جو جی میں گڑ گئی ہے — اک اوس سی مجھ پہ پڑ گئی ہے
کیونکر انہیں ڈھونڈوں کیا کروں میں — ماں باپ سے کب تلک ڈروں میں

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے اُس کو بھلاوے میں ڈال کر پوچھا: "گرو جی مہندر گر نے جو بھبوت دیا تھا، وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے؟"

ماں نے کہا: "میں واری تو کیوں پوچھتی ہے؟"

رانی نے کہا: "آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں، کوئی نہ مجھے پکڑ سکے۔"

کام لتا نے کہا: "وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے۔ ایسے لٹکے کسی برے دن کے سنبھال لینے کو رکھتے ہیں۔"

یہ سن کر کیتکی روٹھ گئی۔ رانی نے یہ بات مہاراج کو بتائی تو انہوں نے کہا: "مجھے تو پتا جی بھی اس سے پیارا نہیں۔ ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبھوت اس کو دے دو۔"

بھبھوت لے کر رانی کیتکی کئی دن آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے سامنے کھیلتی، سب کو ہنساتی رہی۔ پھر ایک رات مدن بان سے کہنے لگی: "میں اودے بھان کو ڈھونڈنے نکلتی ہوں، تو میرا ساتھ دے۔"

مدن بان نے کہا: "میرا تو کلیجہ تھر تھرانے لگا ہے۔ مانا تم اپنی آنکھوں میں بھبھوت کا انجن کر لو گی اور میرے بھی لگا دو گی تو ہمیں تمہیں کوئی نہ دیکھے گا اور ہم تم سب کو دیکھیں گے۔ پر ہم ایسے کہاں سے جی چلے ہیں جو بن لئے ساتھ، جوبن ساتھ، بن بن بھٹکا کریں، چرچے اور جھاڑ میں جلتے پھریں۔ چاہت جس کے لئے ماں باپ، راج پاٹ، سکھ چین، لاج سب چھوڑ کر ندی کے کچھاروں میں پھرنا پڑے۔ جو وہ اپنے روپ میں ہوتے تو بھی کچھ بہت آسرا ہوتا۔ کنور اودے بھان اور ان کے ماں باپ بن بن کے ہرن ہرنی بنے، نہ جانے کہاں ہوں گے۔ اس بات پر مٹی ڈال دو، نہیں تو پچھتاؤ گی اور اپنا کیا پاؤ گی۔ یہ بات میرے پیٹ میں نہیں پچ سکتی۔ میں مہاراج اور مہارانی کا گھر نہ اجڑنے دوں گی۔"

رانی نے یہ کھائیاں مدن بان کی سن کر ہنس کے ٹال دیا اور کہا: "جس کا جی ہاتھ میں نہ ہو اسے ایسی لاکھوں سوجھتی ہیں۔ پر اری تو بڑی باؤلی چڑیل ہے جو سمجھا کر مجھ سے لڑنے لگی۔"

دس پندرہ دن بعد رانی کیتکی بن کہے مدن بان کے وہ بھبھوت آنکھوں میں لگا کر گھر سے نکل گئی۔ سارا گھر تلملانے لگا اور کچھ کہنے میں نہیں آتا جو ماں باپ پر ہوئی۔ تب مدن بان نے وہ سب باتیں کھولیاں اور مہاراج مہارانی کے کہنے پر وہ بھبھوت لے کر رانی کیتکی کو ڈھونڈنے نکلی۔ مدن بان انجن لگائے ہوئے کیتکی! رانی کیتکی! کہتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ بہت دنوں پیچھے کہیں رانی کیتکی بھی ہرنوں کی ڈاروں میں "اودے بھان! اودے بھان!" چنگھارتی ہوئی مل گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آواز پہچان کر بھبھوت دھو ڈالا اور گلے مل کر اتنا روئیں کہ پہاڑوں میں کوک سی پڑ گئی۔

پھر مدن بان نے کیتکی کے آنسو پونچھ کر کہا: "جو تم کہیں ٹھہرو تو تمہارے اجڑے ہوئے ماں باپ کو میں لے آؤں۔ گسائیں مہندر گر جس کے یہ کرتوت ہیں، وہ ان دونوں اجڑے ہوؤں کی مٹھی میں ہے۔"

بہت دنوں میں رانی کیتکی نے ہاں کہی اور مدن بان کے ہاتھ اپنے ماں باپ کو یہ چٹھی لکھ بھیجی "جو آپ سے کچھ ہو سکے تو اس جوگی سے کچھ ٹھہرا کے آملئے"۔ چٹھی لے مدن بان مہاراج مہارانی کے پاس پہنچی اور سب کچھ کہہ سنایا۔ ان کی جان میں جان آئی۔ کیتکی کی چٹھی پڑھ کر مہاراج نے گھمبیر کا ایک رونگٹا جلایا تو بات کی بات میں مہندر گر آ پہنچے اور سب کچھ سن کر بولے: "جن میں نے ہرن بنایا تھا ان کو پھر جیسے کا تیسا کرنا میرے لئے بڑی بات نہیں۔ اب اٹھو اور اپنے راج پر براجو اور بیاہ کا ٹھاٹھ کرو۔ تم اپنی بیٹی کو سمیٹو، اودے بھان کو میں نے اپنا بیٹا کیا۔"

مہاراج اٹھے اور گدی پر بیٹھ کر کہہ دیا: "سارے کوٹھوں کو گوٹے سے منڈھ دو۔ اور چالیس دن چالیس رات تک جس گھر کا ناچ آٹھ پہر نہ رہے گا اس گھر والوں سے میں روٹھا رہوں گا۔"

پھر گروجی مہاراج اور مہارانی کو لے کے مدن بان کے ساتھ وہاں آ پہنچے جہاں رانی کیتکی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ گروجی نے رانی کو اپنی گود

...نے کے کنور اُدے بھان کا چڑھاوا چڑھا دیا اور کہا "تم ماں باپ کے ساتھ گھر کو سدھارو۔ میں اپنے بیٹے اُدے بھان کو لئے آتا ہوں۔"
اب گسائیں مہندر گر اور اس کے توتے لاکھ اتیتوں نے بن کے بن چھان مارے پر کہیں اُدے بھان اور اس کے ماں باپ کا ٹھکانا نہ لگا۔
...نوں نے راجا اندر کو چٹھی لکھ بھیجی اور وہ سب اندر آسن سمیت آن پہنچے۔ رات کی نکھری ہوئی چاندنی میں راگ سبھا جمی جنگل کے کروڑوں ہرن
...ی بھولے ہوئے، راگ سننے لگے تو راجا اندر نے منتر پڑھ کر کہا "سب ہرنوں پر ایک ایک چھینٹا پانی کا دو۔"

پانی کیا جانے کیا تھا۔ ایک ایک چھینٹا پڑنے سے کنور اُدے بھان اور اس کے ماں باپ ہرنوں کا روپ چھوڑ جیسے کے تیسے ہو گئے
اب مہندر گر اور راجا اندر ان تینوں کو گلے لگاتے ہیں اور پاس اپنے بڑی آؤ بھگت سے بٹھلاتے ہیں اور وہی پانی ایک گھڑے میں ان
بھجواتے ہیں جہاں راجا سورج بھان کے آدمی سب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ پانی کے چھینٹوں سے، جو جو مر مٹے تھے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں
ر جو آدھ موئے ہو کے بھاگ گئے تھے، سب سمٹ آتے ہیں۔ پھر راجا اندر اور مہندر گر سب کو ایک اُڑن کھٹولے میں بٹھا کر بڑی دھوم دھام
ے ان کے اپنے راج میں لے جاتے ہیں اور وہ بھی بڑی دھوم دھام سے بیاہ کا ٹھاٹھ کرتے ہیں اور مہاراج اپنے سارے راج سے یہی کہتے ہیں۔
ج کے دن سے جو جو بھنڈارے کے منہ کھول دو۔ آج کے دن سے بڑا کون سا دن ہوگا۔ ایک تو اس لاڈلے اکلوتے کا بیاہ اور پھر ہم تینوں کا
نوں کے روپ سے نکل کر پھر راج پر بیٹھنا۔ جن جن کی بیٹیاں کنواریاں بالیاں ہوں ان سب کو اتنا کر دو کہ جس جس جاؤ جو جی سے چاہیں اپنی گڑیاں
نوار کے اٹھا دیں اور جب تک جیتی رہیں ہمارے یہاں سے کھایا پیا رندھا کریں۔ سب کوٹھوں کے ماتھوں پر کیسر اور چندن کے ٹیکے لگے
وں اور پھول اتنے بہت سارے کھنڈ جائیں کہ سمجھا جائے ندیاں جیسے سچ مچ پھولوں کی بہتیاں ہیں۔

پھر راجا اندر نے الگ اور مہندر گر نے الگ ٹھاٹھ بیاہ کا کیا۔ جو جو کچھ دونوں مہاراجوں نے کہا ادھر اُدھر اسی روپ سے ٹھیک
ٹھاک ہو گیا۔ اور جو کچھ راجا اندر اور مہندر گر نے کہہ دیا آنکھ کی جھپک کے ساتھ وہی ہونے لگا۔ جس بیاہ کی یہ کچھ سجاوٹ اور رچاوٹ اور اوپر تلے
ن جمگھٹے کے ساتھ ہو، اس کا پھیلاوا کیا کچھ ہوگا۔ یہ دھیان کر لو۔

جب کنور اُدے بھان اس روپ سے بیاہنے چڑھے تو جو باہمن اندھیری کوٹھری میں موندا ہوا تھا، وہ بھی ریت بتانے کو اُڑن کھٹولے
ر ساتھ ہوا۔ راجا اندر اور گسائیں مہندر گر ایراوت ہاتھی پر جھومتے جھامتے، دیکھتے بھالتے، سارا اکھاڑا ساتھ لئے چلے جاتے تھے۔ راجا سورج بھان
دولہا کے گھوڑے کے ساتھ مالا جپتا ہوا پیدل تھا۔

اتنے میں ایک سناٹا ہوا۔ سب گھبرا گئے۔ اس سناٹے میں جوگی کے توتے لاکھ اتیت سب کے سب جوگی بنے ہوئے، موتیوں کی
لڑیوں کی سیلیاں گلے میں ڈالے، گاتیاں اسی ڈھب کی باندھے، مرگ چھالوں اور گھمبروں پر آ ٹپکے۔ سکھپالوں اور رتھوں پر سب اپنیاں مہارانی
لچھمی داس کے ساتھ چلی آتی تھیں۔

سبھی سانگ دیکھے گئے۔ کہیں مہادیو اور پاربتی دکھائی پڑے، کہیں گورکھ جاگے۔ کہیں مچھندر بھاگے، کہیں رام لچھمن سیتا سامنے آئے،
کہیں راون اور لنکا کا بکھیڑا سارے کا سارا دکھائی دینے لگا۔ کہیں کنھیا جی کا جنم ہونا اور باسدیو کا گوکل لے جانا اور ان کا اس روپ سے بڑھ چلنا،
گائیں چرانی اور مرلی بجانی اور گوپیوں سے دھومیں مچانی۔ یہ چاؤ چوچلے دیکھ کر سب کو گدگدیاں سی ہونے لگیں۔

اس دھوم دھام کے ساتھ کنور اُدے بھان سہرا باندھے جب دلہن کے گھر گلستان پہنچا اور جو ریتیں اُن کے گھرانے میں ہوتی چلی آئی تھیں، ہونے لگیاں تو مدن بان رانی کیتکی سے ٹھٹھولی کر کے بولی "اب سکھ سمیٹئے بھر بھر جھولی۔ سر نہوڑائے کیوں بیٹھی ہو آؤ نہ ٹک ہم تم مل کے جھروکوں سے جھانکیں" رانی بولی "اری ایسی ہمیں کیا پڑی ایسی نگھی باتیں ہم سے نہ کر" مدن بان نے یہ بات سن کر دوہا اپنی بولی کا پڑھا۔

ہے کہاوت جی کو بھاوے، یوں ہی پرمنڈیا ہلائے ۔۔۔ لے چلیں گے آپ کو ہم ہیں اسی دھن میں پڑے

بیاہ کے جوڑے میں رانی کیتکی کا بھلا لگنا پڑھنے لکھنے میں نہیں آسکتا، دونوں بہنوں کی کھنجاوٹ اور پتلیوں میں لاج کی سماوٹ، اور نکیلی پلکوں کی رندھاہٹ اور ہنسی کی لگاوٹ اور سہیلیوں کو گالیاں دینا اور چل نکلنا اور ہرنیوں کے روپ سے کرچھالیں مار پڑے اچھلنا کہنے میں نہیں آسکتا اور اُٹھتے رہے کنور اُدے بھان کی چال ڈھال کا اچھوتا پن، اٹھتی ہوئی کونپل کی پھبن، گدرایا ہوا جوبن، جیسے بڑے تڑکے ہرے بھرے پہاڑوں کی گود میں سورج کی کرن۔ جب دولہا اُدے بھان سنگھاسن پر بیٹھا۔ ادھر ادھر راجا اندر اور جوگی مہندر گر جم گئے۔ دولہا کا باپ اپنے بیٹے کے پیچھے مالا لئے کچھ گنگنانے لگا۔ مہارانیاں، دونوں سمدھنیں آپس میں ملیاں جلیاں۔ راگ راگنیاں تھیں۔ سانگ، سنگیت، بھنڈ تال، رہس ہونے لگا۔ اب دلہن آرسی دھام میں بٹھائی گئی۔ جس کی چھت اور کواڑ اور آنگن میں آرسی ہو، اینٹ پتھر لکڑی ایک انگلی کے پورے برابر نہ تھی۔ پھر بلانے پر گھر والوں کے، کنور اُدے بھان کنھیا بنا ہوا، سر پر مکٹ دھرے، سہرا باندھے، چاند سا مکھڑا لئے، اسی آرسی دھام میں آپہنچا جس جس ڈھب سے باہمن اور پنڈت کہتے گئے، اور جو جو مہارا جوں کی ریتیں چلی آتیاں تھیں اسی ڈول سے اُسی روپ سے گٹھ جوڑا ہوا۔

اب اُدے بھان اور رانی کیتکی دونوں ملے ۔۔۔ چاہ کے جو پھول کملائے ہوئے تھے پھر کھلے

دن پھرے جیسے اُنھوں کے ایسے اپنے دن پھریں ۔۔۔ چاہ کے ڈوبے ہوئے اے میرے داتا سب تریں

(انشا)

حامد علی خاں

☆

اختصار اور طولِ بیان کی مثالیں

آرائشِ محفل: "بارے خدا کے فضل سے چند دنوں میں بیگم سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔"

فسانۂ عجائب: "سا ٹھ برس کے سن میں گوہر آب دار، دُرِّ شاہوار، صدفِ بطن، از نے خجستہ اطوار سے پیدا ہوا۔ چھوٹا بڑا اس کی صورت کا شیدا ہوا۔ حُسن اللہ نے یہ عطا کیا کہ نیّرِ اعظم چرخ چہارم پر رعبِ جمال سے تھرایا اور ماہ باوجود غلامی تابِ مشاہدہ نہ لایا۔ اس نقشِ قدرت پر تصویرِ مانی و بہزاد حیراں اور صناعیِ آذر کی ایسے لعبتِ حقیقت کے روبرو پشیماں۔"

از جناب منشی تلوک چند صاحب محروم

تضمینِ دعائے نظامی گنجوی

حضرت نظامی گنجوی کے پانچ دعائیہ شعر (غالباً) اپنی مجلسوں میں پڑھے تھے۔ اور یاد کر لئے تھے۔ ان پر تضمین ہو گئی ہے۔ یہ قدیمانی قسم کی شاعری ہے لیکن پرانے وقتوں کے لوگ ابھی زندہ موجود ہیں۔ اور مخزن کے ناظرین میں بھی ہوں گے۔ اس لئے آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔
محروم

ملے گا کچھ، نہ دنیا سے ملا ہے ۔۔۔ طلب دنیائے دوں کی ناروا ہے
یہی شام و سحر میری دعا ہے ۔۔۔ ترے در پر یہی اک التجا ہے

"خداوندا درِ توفیق بکشائی
بسوئے خود رہِ تحقیق بنمائی"

مجھے یارب حقیقت بیں نظر دے ۔۔۔ صفائے قلب مانندِ سحر دے
توہم کے پڑے ہیں یہ جو پردے ۔۔۔ کرم سے اپنے ان کو چاک کر دے

"دلے دہ کو یقینت را بشاید
زبانے کآفرینت را سراید"

خیالی وسوسوں سے دل ہو خالی ۔۔۔ مٹا دے اس سے ہر نقشِ خیالی
بہ لطفِ خاص ہو اے سب کے والی ۔۔۔ طبیعت مائلِ جذباتِ عالی

"مدہ ناخوب را در خاطرم راہ
بدار از ناپسندم دستِ کوتاہ"

کرم اے خالقِ شمس و قمر ہو ۔۔۔ ترے انوار کی جویا نظر ہو
تجلی سے تری جاں بہرہ ور ہو ۔۔۔ ترا ذکرِ حسیں شام و سحر ہو

محروم

"دِرُونم را بہ نورِ خود بیفروز
زبانم را ثنائے خود درآموز"
سخن سنجی مجھے تونے عطا کی　　نوا پیرا ہوا یہ سازِ خاکی
بلندی کر عطا ذوقِ نوا کی　　مجھے توفیق دے حمد و ثنا کی
"بہ داؤدی دلم را تازہ گرداں
زبورم را بلند آوازہ گرداں"

ایضاً

(بصورتِ مثلث)

بحالِ من، کہ محرومم، بہ بخشائی　　خداوندا درِ توفیق بکشائی
بہ سوئے خود رہِ تحقیق بنمائی
بہ بخش آں علم کو سوئیت گراید　　دِلے دہ کو یقینت را بشاید
زبانے کآفرینت را سراید
درخشاں کن دلم را صورتِ ماہ　　مدہ ناخوب را در خاطرم راہ
بدار از ناپسندم دست کوتاہ
دلِ افسردہ را کن شعلہ اندوز　　درونم را بنورِ خود بیفروز
زبانم را ثنائے خود درآموز
رہینِ لطفِ بے اندازہ گرداں　　بہ داؤدی دلم را تازہ گرداں
زبورم را بلند آوازہ گرداں

از محمد وسیم عباسی (علیگ)

اردو رسم الخط

ہندو پاکستان کی قومی زبان اردو ہے یا ہندی اتھوا ہندوستانی یہ بات خارج از بحث ہے۔ اس پر ضیاء احمد کی نیشنل لینگویج کا ماونڈیا[1] میں اہل الرائے سیر حاصل بحث کر چکے ہیں اور تعصب کی عینک ہٹا کے دیکھا جائے تو فی الحقیقت اردو زبان ہندو و مسلم کا ایک ناقابل تقسیم مقدس ترکہ ہے اور آج حالات یا کل سمجھیں ویدپاٹھری کا خواب دیکھنے والے زمانے کا رخ نہیں پھیر سکتے۔ چونکہ یہ اردو جا پانی پر بھارت کی سماچاری زبان نہیں بولی جاتی۔ ہندی اسٹیشنوں کے فرمائشی پروگرام اس کے گواہ ہیں۔ یہ البلاغی "الملائی" زبان بھی نہیں ہے یہ وہ شیریں زبان ہے جو ہر ایک بے اختیار بلا قصد بول جاتا ہے۔ اہم مسئلہ صرف یہ ہے کہ یہ زبان کس طرح لکھی جائے کہ صحیح تلفظ قائم رکھتے ہوئے ٹائپ اور صاف چھاپے کی سہولتیں مہیا ہو سکیں۔

اس کی تین صورتیں ہیں۔ قرآنی حروف استعمال کئے جائیں یا "رومن لٹرز" یا "دیوناگری اکشر" یہی تین ابجد ہم سے قریب ہیں۔ پہلے برِ اعظم کی اکثریت کے خیال سے دیوناگری کا رسم الخط لیجئے۔ اس کی قباحتیں اظہر من الشمس ہیں۔

اگر اردو ناگری اکشروں میں لکھی گئی تو اپنے دو سرچشموں سے علیحدہ ہو جائیگی یعنی فارسی عربی کے اہم ادبی خوبیوں سے بے نصیب ہو جائیگی۔ ہندو اپنے قدیم ادب اپنے اصل مذہب سے پہلے ہی الگ تھے کیونکہ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں سنسکرت کا تیسرا دور تھا اور اس وقت ویدک زبان کا سمجھنا اتنا زیادہ مشکل ہو چکا تھا کہ ایک وید پڑھ لینے والے ویدی کہلاتے تھے دو وید پڑھ لینے والے دوویدی اسی طرح ترویدی اور چترویدی۔ اب کیا ضرورت ہے کہ مسلم بھی یہ اردو زبان اور اس کا مروجہ رسم الخط چھوڑ کے اپنے ادب اپنے روایات سے بیگانہ ہو جائیں۔[2]

سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ ہندی تلفظ اردو کی ہمہ گیری کے منافی ہے۔ ہندی राम اردو رام کے برابر نہیں بلکہ راَمَ (م مشدد متحرک) کے برابر ہے۔ جیسے انگریزی والوں نے m کے بعد a بڑھا کے RAMA لکھا ہے۔ ت ہے नहे بُہُت کے برابر نہیں بلکہ بُہُتَ کے برابر ہے اسی طرح خ اور ذ ز ض ظ کے قائم مقام ہندی لگے ہوئے [illegible] (دکھا) اور [illegible] (جا) نہیں ہو سکتے۔ نہ [illegible]، [illegible]، [illegible] الف اور ع و اور ہ کی جگہ پوری کر سکتے ہیں۔ اردو کے کسی لفظ کو لے لیجئے۔ مثلاً "باعث" ہے بالکل برابر [illegible] اور [illegible] کے ماتراؤں کے درمیان کی چیز ہے اسی طرح ع کی زیر (عربی سے قطع نظر اردو میں) معروف نہیں ہے یہ [illegible] [illegible] اور [illegible] کے ماتراؤں سے ادا نہیں ہو سکتی اور لغیر ماترا کے ع پہ زبر ہو جائیگا۔ پھر ث کا قائم مقام [illegible] (سا) نہیں ہو سکتا کیونکہ معنوی اعتبار سے ث، س، ص کے لئے [illegible] ناکافی ہے۔ اسی طرح

---

[1] دیوبانی کا ہندی تلفظ (مخزن)

[2] مضمون نگاروں کی ہر رائے لازماً مخزن کی رائے نہیں ہے (مدیر)

[3] یہ بالکل درست ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جو لوگ سنسکرت نما ادب کو زندہ کرنا چاہتے ہیں کیا گناہ کرتے ہیں۔ اردو والوں کی اردو کو اس کوئی نقصان نہیں پہنچنے [illegible]

یکہ (گاڑی)، اکّہ (تنہا)، اِکّا (تنہا) اردو میں ہم تلفظ ہیں ہندی میں لکھتے وقت کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ پہلا لفظ [illegible] (دیا) سے لکھا گیا تو پہنا ہو جائیگا۔ اور دوسرے تیسرے لفظوں میں زیر پیش تائم رکھنے کی کوئی صورت نہیں۔ اردو میں اعراب نہ لگنے کی وجہ سے زبر زیر پیش کے تلفظ میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے یہی وجہ ہے ہندی میں جو شخص جتنا فتھی ہوتا جاتا ہے اردو تلفظ سے اتنا ہی بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر ان صورتوں میں اردو کا رسم الخط ناگری کہاں تک ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ رومن حروف استعمال کئے جائیں جیسا گذشتہ صدی میں انڈونیشیا نے کیا۔ پریس اس میں موجود ہے۔ پریس میں طرح طرح کے چھوٹے بڑے موٹے باریک حروف موجود ہیں۔ اس کا ٹائپ رائٹر ملک کے قریہ قریہ میں پہنچ چکا ہے اور عرصے کی غلامی نے رومن حروف سے ہمیں بڑی حد تک واقف بھی کر دیا ہے۔ یورپ امریکہ کا رسم الخط بھی یہی ہے اور یہ ملک آجکل کے علوم و تمدن کے خداوند بھی ہیں۔ بین الاقوامی یگانگی پیدا کرنے کے لئے بہتر یہی ہے کہ دوسرے کی ڈگر پر چل دیا جائے۔ رومن بائبل کے مقدس حروف اختیار کر لئے جائیں۔ دنیا میں لین دین کے بغیر معاشرتی زندگی کیسے ہو سکتی ہے لیکن خیال یہ آتا ہے کہ ناگری کی قباحتیں یہاں بھی موجود ہیں۔ رومن حروف میں ث ش ح خ ذ ژ ص ض ط ظ ع غ اور ق کے لئے کوئی حروف نہیں ہیں۔ لئے دو چشمی (ھ) سے مخلوط آوازوں کے لئے خاص انتظام کرنا پڑے گا اور رومن رسم الخط طویل بھی ہے پھر جبتک فارسی عربی رومن بھی اختیار نہ کرلیں اردو ان سے بچھڑی رہے گی اور بالفرض قرآن کی حفاظت میں اس کے مصنف مالک کائنات نے عربی رسم الخط بدلنے نہ دیا تو ڈر ہے ہم بھٹکی ہوئی بھیڑی بے گھر بے دوار نہ ہو جائیں۔ ہمیں تو مرکز سے قریب ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ بنجو قتہ ایک مرکز کا سبق ہمیں دیا جاتا ہے پھر شماتت ہمسایہ کا خوف ہی کیا کرنا۔ ہاں بیشک ہماری زبان قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اور اسی میں لکھی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے مروجہ خط میں کاپی نویسی کی طوالت کیسے دور کی جائے۔ مانا کہ سارے پاکستانی ایک ہی رسم الخط نستعلیق میں لکھتے لکھتے کبھی خوشنویس بن جائیں گے اور کاپی نویسی یا مطبع سنگی کے مشکلات کچھ حل ہو جائیں گے لیکن دھات کے حروف کا ٹھپا زیادہ صاف آتا ہے یکساں رہتا ہے اور کاپی نویسی کی مشق سے بے نیاز کرتا ہے۔ یعنی اس طرح وقت بچاتا ہے اور نرم و سخت انگلیوں کے اختلاف کو دور کرتا ہے جبشہ ایران کی چین انڈونیشیا کی اس برعظیم کی اور رومن یا دوسرے حروف لکھنے والی انگلیاں اردو کی یکساں تحریر پر صرف اسی طرح قادر ہو سکتی ہیں۔ ہمارا مقصد صرف ملکی نہیں بلکہ اسلامی بھی ہے یعنی ایک ایسے رسم الخط کی تدوین جو پوری دنیائے اسلام میں مقبول ہو سکے، جو مسلمانوں سے فخر کے ساتھ لیا جائے۔

آج اردو کا مروجہ رسم الخط نستعلیق ہے ہندوستان پر مسلم حکومت اور مغل اعظم کے ایثار و تمدن کی یادگار۔ خط غبار و گلزار، خط طغرا و ماہی وغیرہ صنعت پسندوں کی جدتیں تھیں لیکن اس عہد سے قبل مسلمانوں کی تمام زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں۔ عرب افریقہ ہسپانیہ چین یا ترکستان ہند اور انڈونیشیا میں، پرانے کتبے مخطوطات اور سیاحوں کے بیانات شاہد ہیں کہ مسلمان اور مسلمانوں کے حلیف پہلے عربی رسم الخط ہی استعمال کرتے تھے اور بعد میں کوئی دوسرا یا فارسی رسم الخط استعمال ہوا ہے جس کی ستھری شکل موجودہ نستعلیق ہے۔ ۳۷۵ھ کا مقدسی عرب سیاح سندھ کے متعلق لکھتا ہے کہ یہاں زبان سندھی ہے اور فارسی عربی بھی سمجھی جاتی ہے۔ پانچویں صدی ہجری کا عرب سیاح ابوریحان بیرونی کتاب الہند میں سندھ کی سندھی کا عربی فارسی کا عربی حروف میں لکھا جانا بیان کرتا ہے (معارف محرم ۶۹ھ) نویں صدی ہجری کے مغل دربار سے قبل مسلم لوگ بنگالی۔ دکنی۔ گجراتی

ہیرو کو عربی خط میں لکھتے تھے قریب قریب اسی خط میں جو آج حضرات علیؓ اور امام حسنؓ کے چرمی تبرکاتِ جامع مسجد دہلی میں محفوظ ہے
ماں تک کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا اردو دیوان (۱۰۲۵ھ) بھی اسی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ غرض مغل عنانی اور فصاحت سے پہلے ہمارا
م الخط عربی ہی تھا یعنی خطِ نسخ۔ پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مغل اشیار کی بے قدری سے عبرت نہ پکڑی جائے اور اسی اپنی یکسانیت
اختیار نہ کر لیا جائے۔ خطِ نستعلیق صرف بیاں کی چیز ہے اور پریس اور ٹائپ میں ایک گونہ ناکام رہا ہے۔ کلکتہ، حیدرآباد اور برلن کی
ششوں کو بھی کامیاب نہیں کہہ سکتا۔ مقابل میں مصری چھاپا نسخ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اسی خیال سے پاکستان کا دفتر ممالک اسلامیہ
دورہ کر رہا ہے اور وزارت داخلہ کا جاری (۲۴؍۳؍۴۹ ۱۹۴۹ء مورخہ ۷ راکتوبر ۱۹۴۹ء) دفعہ ۱-۲ بھی خطِ نسخ کو ترجیح دیتا ہے اور چاہتا ہے مرکز وغیرہ
دفتر کی تختیوں میں اردو اور نسخ کو اولیت دی جائے اسی لئے بعض وقت شناس جریدوں (مثلاً ماہ نو) نے افتتاحی مضمون اور کوئی کوئی منظوم
نقرہ خطِ نسخ میں لکھنے کا التزام کر دیا ہے۔ ڈان نے پیروی اب کی ہے۔ دوسرے نشریات بھی اس کی تقلید کریں تو مستحسن ہوگا اور ان کا یہ فعل ایک بڑے
مقصد میں معاون ہوگا۔ اسی طرح ہم بھی سائن بورڈوں اور ڈاک کے پتوں میں نسخ لکھنا شروع کر دیں تو رفتہ رفتہ نسخ کی اجنبیت ہم سے دور ہو جائے گی
آنکھوں میں بیٹھنے لگے گا۔

اب رہا اس کے ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کا مسئلہ۔ فورٹ ولیم کالج کے ٹائپ سے لے کر آج تک کے بہترین ٹائپ تک گیارہ سو سے لے
کر پندرہ سو تک حروف و اجزاء استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے برعکس رومن میں چھوٹے بڑے حروف صرف باون ہیں۔ رومن باون حروف مکمل
خوبصورت تحریر دیتے ہیں اور ہمارے ہزار پندرہ سو اجزاء کے ٹائپ نامکمل ہیں جن میں سے نسخ و نستعلیق کے اصولوں کے مطابق کوئی مکمل تحریر نہیں
دیتا۔ نسخ کے ٹائپ میں مجبوراً ایک کرسی کا التزام کیا گیا ہے۔ نستعلیق میں چار پانچ کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ اور بہ ایں ہمہ پھر بھی ڈھیلے کے ڈھیلے
رہیں گے۔ عبدالغنی صاحب نے اسی لئے ذیل کی تہجی کے لئے سفارش کی ہے۔ ا ب ج د ر س ص ط ع ف ق ک ل م ں و ہ ی ے۔ اس میں حروف
کچھ مختصر کر دیئے گئے ہیں اور یہ مختصر حروف رومن طرز پر الگ الگ ایک قطار میں رکھے جائیں گے۔ جن پر اعراب کا استعمال نہ ہوگا۔ مثلاً لاہور
- ل ا ھ و ر (آموزش مارچ ۱۹۴۹ء)۔ میرے مکرم پروفیسر عبدالغفور صاحب نے چند اور مفید سفارشیں کی ہیں (آموزش اکتوبر ۱۹۴۹ء) وہ بعض
حضرات رومن طرزِ تحریر سے متاثر ہیں۔ مستقیم، منحنی، اور حلقہ دار حروف اور الفاظ کی مختلف کرسیوں کا حل نہیں پیش کرتے۔ ایک ایک مجلس کے
سپرد یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔

ٹائپ رائٹر کے مسئلے میں حیدرآباد، جرمنی کی کوششیں کامیاب نہیں سمجھی جاتیں۔ بعض دفتروں میں صرف رمنگٹن کی مشین پر اکتفا کیا گیا ہے۔
اس میں کل ستانوے کھٹکے ہیں دس عدد کے چار کیرج کے سات نشانات اور بقیہ چھہتر حروف سے متعلق ہیں۔ رمنگٹن ملا رومن میں مجموعی تعداد
چورانوے ہے جس میں باون حروف سے متعلق ہیں یہ رومن ٹائپ مکمل ہے اور اردو ہر حیثیت سے ناقص۔

میرے نزدیک حروف کے اگر حصے کر لئے جائیں تو یہ دقت کچھ حل ہو سکتی ہے نسخ میں تقریباً مکمل طور پر اور نستعلیق میں کسی حد تک۔
"تعلیم پڑیں" مرتبہ اعجاز رقم شمس الدین کے اصول پر یہ نستعلیق پورا نہ اترے لیکن حروف کی کرسیاں کچھ بدل دی جائیں گی تو خوبصورت تحریر
بن جائیگی۔ ممکن ہے میدان اور دائرے وغیرہ گنے ہوئے قطعوں کے برابر نہ رہیں۔ ہٹمین نے زود نویسی کے تحت تین کرسیاں اور بارہ بارہ جوڑ جس

سابقے لاحقے استعمال کئے ہیں لیکن وہ اشکال کسی ٹائپ میں پڑنے نہیں آسکتے۔ ہم بیشتر حروف میں ایک ہی کرسی رکھیں گے۔ بعض بعض میں البتہ زیادہ رکھنا پڑیں گی مثلاً "م" کی مختلف شکلوں کے پیش نظر اس کی ایک کرسی نہیں چل سکتی۔ میرے مجوزہ اجزائے تہجی حسب ذیل ہیں اور امید ہے عملی طور پہ بہتر کام دیں گے۔

ا ب ~ د ر س ــ ط ء • ، / ″ م ں و ہ ھ ٗ ک ے (۲۰)

(۲۴) ٮ ٮ ، ، ر ر ٮ ٮ ، ، ر ، ٮ ، ، ا ، ا ″ ا

ں ر ٮ ٮ ا ع ھ ے ٮ (۸)

١ ٢ ٣ ۴ ۵ ۶ ٧ ٨ ٩ ٠ (۱۰)

ــ ھ ے لا ـــ ر ،،، ص ݣ (۸)

یہ کل باسٹھ جوڑ بند ہوئے ان میں نقطے الگ رکھے ہیں تاکہ نیچے یا اوپر حسب ضرورت لگائے جاسکیں۔ ن کا دائرہ س ص ق ل میں استعمال ہوگا ح کا دائرہ (تیسری سطر میں) ج ح میں کام دے گا۔ شوشے (تیسری سطر) جیسی ضرورت ہو۔ یہی شوشے درمیانی ہائے ہوز کا کام بھی دینگے درمیانی ہ کی موجودہ مقررکردہ شکل چھوڑ دیں گے۔ رقوم وزن اور بگیہ وغیرہ کے لئے آخری سطر کافی ہے۔ ان کے علاوہ رموز اوقاف جو مناسب معلوم ہوں اور مزید کرلئے جائیں۔ بہرحال یہ مختلف ٹکڑے مل کر ساری رقمیں اور الفاظ بنا سکتے ہیں اور مختصر اجزاء اور مختصر کھٹکے ہونے کے باوجود تحریر خوبصورت ہوگی جس میں خطِ مستقیم اور دور کششوں کا پورا التزام ہوگا۔ ان اجزاء کو گراف پیپر پہ رکھ کے سمجھا جاسکتا ہے شکلوں کے لئے سیسے کے ٹکڑے درو امن طور کے بنوائے جاسکتے ہیں۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اوقاف کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے حجاجی اوقاف سے ہٹ کر انگلش سکتے اور وقفے وغیرہ استعمال کئے ہیں (تہذیب الاخلاق جلد دوم) شاید وہ اس لئے انگریزی تقلید میں چلے گئے ہیں کہ مولانا عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے انگریزی پڑھنے کا فتویٰ دیدیا تھا اور انکے خلیفہ سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ کی تحریک سے سر سید متاثر تھے۔ ورنہ قرآنی رموز اوقاف کل چودہ ہیں جبکہ انگریزی اوقاف کی علامتیں پندرہ ہیں۔ اور وہ سب اردو میں مستعمل ہو نہیں سکتیں۔ حجاجی اوقاف بھی سارے استعمال نہیں ہوں گے لیکن پھر بھی جو استعمال ہوں گے وہ ہمیں قرآن شریف کے صحیح پڑھنے میں مدد دیں گے ہمیں عربی سے قریب لائیں گے میں کسی پرچے کا مدیر ہوتا تو اسے نسخ میں حجاجی اوقاف کے ساتھ شائع کرتا۔ منشی غلام محمد متوطن بمبئی کو موقع نہیں ملا ورنہ اپنے مضامین کے ذریعہ نجوم العلامات کو اردو میں پیوست کردیتے اور رموز اوقاف قرآنی سے آج ہم سب واقف ہوتے۔ خیر اب سہی۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے وقت کے تقاضے سے اردو میں وہ کیا تھا ہم آزاد ہو کے اپنے اصل کی طرف لوٹیں اور یہ کریں۔

* * *

محمد وسیم عباسی

غزلیں

بشیر ساجد

یوسفِ دل کا خریدار ملے یا نہ ملے
اک زلیخا سرِ بازار ملے یا نہ ملے

عمر خوابوں کے تعاقب میں گزر جائے گی
جانے وُہ دولتِ بیدار ملے یا نہ ملے

غمِ امروز نے انساں کو کچل ڈالا ہے
عیشِ فردا کا طلبگار ملے یا نہ ملے

زندگی ایک نئے موڑ پہ آئے تو سہی
غم نہیں جادۂ ہموار ملے یا نہ ملے

عام احساس ہے ماحول سے بیزاری کا
پھر بھی اک "بندۂ بیزار" ملے یا نہ ملے

جسمِ جاناں کے خریدار بہت میرے بعد
روحِ جاناں کا پرستار ملے یا نہ ملے

آج پیشانیٔ ساجد سے ٹپکتا ہے لہو
لذّتِ سجدۂ سرکار ملے یا نہ ملے

شاعر لکھنوی

نگاہ اُن کی تجلّی کا رُخ بدل نہ سکی
بہت سنبھل کے اٹھی تھی مگر سنبھل نہ سکی

جہاں جہاں بھی محبت نے کر لیے سجدے
وہاں وہاں پہ تمنّا کی شمع جل نہ سکی

کسی کی نیم نگاہی کا لطف کیا کہنا
یہ پھانس دل میں کھٹکتی رہی نکل نہ سکی

خرد کو ایک تجلّی نے کر دیا گمراہ
جنوں کو گردشِ کونین بھی بدل نہ سکی

جہاں کو تلخیٔ غم کا جواب مل جاتا
تری نگاہ مری زندگی میں ڈھل نہ سکی

شکستِ دل سے خزاں ہو گئے فضا کے چراغ
خزاں بہار کی رعنائیاں بدل نہ سکی

وہ شمع کتنی ہی روشن ہو پھر بھی ہے تاریک
جو رہگذر پہ جلی اور دل میں جل نہ سکی

وہی ہے آج بھی شاعر غمِ حیات کا رنگ
شرابِ تلخیٔ احساس کو بدل نہ سکی

تاؤ کیم ہائی[1]
ترجمہ: صادق قریشی ایم اے

مُرغا

(افسانہ)

بہن، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ واقعی یہ مرغ اپنا کام پورا کر چکا ہے۔ اسے ختم کر دینا چاہئے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میرا شوہر یہ بات کبھی نہیں مانے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور بالکل ناکارہ ہے۔ مگر کیا مجال جو کسی اور مرغ کو اپنی مرغیوں کے نزدیک پھٹکنے دے۔ لڑنے مرنے پر اتر آئے گا مگر جیتے جی کسی اور مرغ کو اپنی جگہ نہیں لینے دے گا۔ یہ مرغ ایک خاص اعلیٰ نسل سے ہے۔ دیکھتیں نہیں آپ، اس کی ٹانگوں کے خار کتنے نکیلے اور ترچھے ہیں، بڑھاپے کے باوجود یہ بہت تیز دوڑ سکتا ہے۔ اس کی ٹانگوں سے ایک خاص شان اور تمکنت ٹپکتی ہے۔ دیکھئے ٹانگوں پر فلس کیسی خوبصورتی سے اوپر تک گئے ہیں۔ جیسے کسی چینی دروازے پر دونوں طرف مقدس عبارت منقش ہو۔ اس کی ماں تو چینی مرغی تھی البتہ باپ کمبوڈی نسل کا اصیل مرغ تھا۔ اس نے اتنی لڑائیوں میں فتح حاصل کی ہے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔

"مگر اس مرغ نے آج سے پانچ سال پہلے میری جو خدمت کی وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ پانچ سال پہلے میرا شوہر میرے والدین کے گھر کے عین سامنے رہا کرتا تھا۔ ہم دونوں ہمسائے تھے مگر ہمارے درمیان معاشری امتیاز کی ایک اتھاہ خلیج حائل تھی۔ اس کی ماں بھی نہ تھی۔ میرا باپ گاؤں کا "لائی ٹرانگ" مکھیا تھا۔ اس کا گھر بانسوں اور کھجور کے پتوں کا بنا ہوا جھونپڑا تھا۔ ہمارا گھر اینٹوں اور ساگوان کی لکڑی کا تھا جس پر بہترین قسم کے نقش و نگار ہوئے تھے۔ سامنے کے رخ چار ساگوانی منقش ستون تھے۔ سفید دیواریں تھیں اور سرخ ٹائلوں کی چھت۔ میرے باپ کے پاس بیس بیل اور دس بھینسیں تھیں۔ اس کے چاول کے کھیت ایک ہزار ایکڑ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہمسائے کے پاس ایک مرلہ زمین بھی نہ تھی۔ وہ ہمارا "تاڈین" (مزارع) تھا۔

"وہ مزارع تھا یا کچھ اور، بہر حال گاؤں کا وجیہ ترین نوجوان تھا۔ تمام ضلع میں اس کے برابر تیزی سے دھان کے پودے کوئی نہیں لگا سکتا تھا اور اکتارا بجانا تو اس پر ختم تھا۔ ہائے وہ سریلے نغمات کا طوفان! فرشتے بھی آسمان پر جھوم اٹھتے ہوں گے۔ شادی کے بعد میں نے اسے اکتارا بجانے سے روک دیا تھا کیونکہ مجھے ایک تو نظر لگ جانے کا ڈر تھا، دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ اکتارا بجانے سے بینائی جاتی رہتی ہے اور جتنا اچھا بجانے والا ہو اتنا ہی اُسے یہ خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔

اس نے کچھ مرغیاں پال رکھی تھیں جن کے درمیان ایک نوعمر مرغا بڑی شان سے پھرا کرتا تھا۔ اس کی سبز اور سنہری کلغی نے اسے گاؤں کے تمام مرغوں میں ممتاز کر دیا تھا۔ اس کا اتنا دبدبہ تھا کہ کوئی اور مرغ اس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔ ہر وقت وہ مرغیوں کے گرد اترایا پھرتا تھا۔ کبھی میں سامنے آتی تو وہ ایک چمکیلی آنکھ سے مجھے دیکھتا اور پھر بدمست مردوں کی طرح پر پھیلا کر مرغیوں سے محبت جتانے لگتا۔

---

[1] TAO KIM HAI ایک نامی مصنف ہیں۔ فرانس کے ادبی حلقوں میں کافی نام پیدا کر چکے ہیں۔ آپ نے ہند چینی کے متعلق دو کتابیں لکھی ہیں۔ حکومت فرانس کی طرف سے آپ امریکہ میں اطلاعات کے مہتمم بھی رہ چکے ہیں۔

صادق قریشی

ایک دن میں اور اس کا مالک بانس کے اس جھونپڑے کے پیچھے کھڑے باتیں کر رہے تھے جہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یکایک طرف سے "ہا ہا ہا" کی آواز آئی۔ ہم نے گھبرا کر اُدھر دیکھا تو مرغا کھڑا تھا۔ مالک نے اس کی طرف زور سے ایک لکڑی پھینکی۔ وہ کسی ایک طرف کو نکل گیا اور کٹ کٹ کٹ کرتا ہوا اپنی مرغیوں سے جا ملا۔ اپنے دڑبے کے پاس جا کر اس نے پھر کسی مسخرے کی طرح ہمارا مڑ کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔

"پھر ایک دن کی اور سنیے۔ ہم نے لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لئے پیال کی ایک ڈھانگ کے پیچھے ملنے کی جگہ مقرر کی تھی۔ جب ہم ایک دوسرے سے اپنا دکھ درد بیان کرنے میں منہمک تھے تو یکایک اوپر سے "اُو، اُو ہر ہر ہر" کی آواز آئی۔ دیکھا تو ڈھانگ پر مرغا کھڑا ہماری زندگی کا سارا بنا بنایا گھروندا پیٹ رہا تھا۔ ہم غصّے میں آ کر اُسے بھگانے لگے تو احتیاط کے حدود سے بھی گزر گئے، اور مرغا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ ہماری اس تنہائی کا راز دار اب اکیلا مرغ ہی نہ تھا بلکہ شام کو ہمارا یہ قصّہ بستی کے اکثر لوگوں کی زبان پر تھا۔ اور جلد ہی یہ میرے والدین کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ میری کئی سکھیاں مجھ سے دور رہنے لگیں۔ وہ سب یہی سمجھتی تھیں کہ میں اپنی نیکی کا بوجھ سر سے پھینک چکی ہوں۔

"مرغ نے ابھی پر بس نہیں کی۔ اس نے ہمارے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر شام کے وقت بھی بانگیں دینا شروع کر دیا۔ جواب میں گاؤں بھر کے مرغ بانگیں دیتے اور دیئے جلنے کے بعد ایک شور سا پیدا ہو جاتا۔

"معزز بہن کیا آپ مانیں گی کہ ہمارے وطن میں مرغوں کا شام کے وقت بانگیں دینا کسی کنواری لڑکی کے حاملہ ہو جانے کی نشانی سمجھا جاتا ہے؟ ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے اور میری ماں تو حد سے بڑھی ہوئی توہم پرست ہے۔ سب کی نظریں میری طرف تھیں۔ میں نے سب کو اپنی بے گناہی کا یقین دلایا مگر مرغوں کی شہادت کے سامنے میرے بیان کی کوئی وقعت نہ تھی۔

"میرے والدین نے جلد جلد تمام رشتہ داروں کو جمع کیا۔ دادا، دادی، نانا، نانی، خالائیں، پھوپھیاں، چچا اور ماموں سب بلائے گئے۔ مجھے انہوں نے میری چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا اور خود سب بڑے کمرے میں ہمارے اسلاف کے بعد کے سامنے بیٹھ کر صلاح مشورہ کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ اب میرا آخری وقت آن پہنچا ہے اور تھوڑی دیر میں وہ میرے پاس زہر کا پیالہ، تیغہ اور سرخ ریشمی رسّی لے کر پہنچ جائیں گے۔ مجھے اپنی موت کا طریقہ خود منتخب کرنا ہو گا اور پھر . . . . پھر وہ میرا سر مونڈ دیں گے اور مجھے خودکشی کرنے کی اجازت دیں گے۔

"مگر ایک خیال سے مجھے کچھ تسلی تھی۔ وہ یہ کہ میرے سوا گھر میں اور کوئی اولاد نہ تھی۔ ماں بوڑھی ہو چکی تھی۔ اسلاف کا نام زندہ رکھنا ہر بات پر مقدم تھا۔ اگر میں ختم ہو جاتی تو خاندان کا نام زندہ رکھنے کے لئے لازم تھا کہ میری ماں کسی اور عورت کو اپنے گھر لا کر بسائے اور اس سے جو اولاد ہو اسے اپنی اولاد سمجھ کر پالے۔ کچھ تسلی اس بات سے بھی تھی کہ میرا باپ مغربی خیالات سے بہت متاثر ہے اور عام رواج کے خلاف مجھے بہت پیار کیا کرتا تھا۔

"مجھے زیادہ دیر تک امید و بیم کی حالت میں نہ رہنا پڑا۔ خاندانی پنچایت نے میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مجھے اس کے سامنے

بیاہ کرنی الفور وہاں سے کہیں دور بھیج دیا جائے۔

"دو ہفتوں کے اندر اندر شادی کی چھوٹی ابتدائی رسوم ادا ہو گئیں۔ اور ہمیں چپکے چپکے ایک دوسرے کا شریک زندگی بنا دیا گیا۔ اس پر نہ کوئی ڈھول ڈھمکا ہوا نہ شور و غل کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ دولہا شادی کے بعد چھ ماہ سے دو سال تک دلہن کے گھر رہتا ہے یہ بھی اڑا دی گئی۔ قرمزی کاغذ پر سنہری حروف میں لکھے ہوئے دعوت نامے کہیں نظر نہ آئے گاؤں کی پنچایت کا سرپنچ بھی نہ بلایا گیا حالانکہ شرعاً کھمو تیو پاس کی موجودگی ضروری ہوتی ہے پیتل کی قاب پر منبسوں کا تعفہ بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ رات بھر چلنے والی ضیافت کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ عروسی جوڑے کو کسی نے بڑھ کر مذاق نہ کیا۔ حجلۂ عروسی میں دعوت متروبات۔ جھولنے والا بستر، اغوا ہونے والا دولہا ــــ یہ سب رسمیں چھوڑ دی گئیں۔ ہم اسلاف کے معبد کے سامنے بٹھا دیئے گئے۔ مجھے طلائی آستینوں کا سرخ کرتا پہنا دیا گیا تھا اور وہ سیاہ رنگ کے چوغے میں ملبوس سیاہ پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ یہ مجبوری کی شادی تھی۔ اس پر کسی نے خوشی کا اظہار نہ کیا اور چند منٹ میں شادی کی رسم ختم ہو گئی۔

"اسی رات ہم ایک بجرے میں سوار کر دیئے گئے چاول، مچھلی اور دوسری چیزوں کا ذخیرہ ساتھ رکھ دیا گیا۔ دو وفادار ملازم ہمارے ساتھ تھے مرغ کو بھی مرغیوں سمیت کشتی میں دھکیل دیا گیا۔

"اب ہمیں آپ کے قریب رہتے ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ ابھی میرے کوئی بچہ نہیں پیدا ہوا۔ میری بوڑھی ماں لکھتی ہے کہ وہ پگوڈا میں جا جا کر ہماری اولاد کے لئے دعائیں مانگتی ہے اور قربانیاں دیتی ہے۔ بوڑھا مرغ جھوٹا ثابت ہو چکا ہے۔ مگر اس کے جھوٹ ہی نے میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری کی۔ ہم دونوں بہت خوش خوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مرغ کو میں اس کے آخری دنوں تک اعلیٰ سفید چاول کھلاتی رہوں گی۔ جتنے یہ کھا سکے کھائے۔"

صادقہ قریشی

"مخزن" کی جلدیں

جلد ۱، جنوری تا جون ۱۹۴۹ء
جلد ۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۴۹ء
جلد ۳، جنوری تا جون ۱۹۵۰ء

خوبصورت اور مضبوط کپڑے کی جلد جس پر سنہری ڈائی سے "مخزن" کا نام لکھا ہے۔ پشتے پر بھی مخزن کا نام اور سنہری بیل ہے جس کے نیچے مہینوں کا نام بھی سنہرا لکھا ہے جلد منگوائیے ورنہ بعد میں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکیں گی۔

رعایتی قیمت فی جلد چار روپے۔ مع محصول ڈاک

"مخزن" کا رعایتی چندہ

اہلِ ذوق کے فائدہ کے لئے "مخزن" کا چندہ سات روپے سالانہ سے گھٹا کر پانچ روپے کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح رعایتی ششماہی چندہ اب چار روپے کے بجائے تین روپے ہے، یہ رعایت تا اطلاعِ ثانی بدستور قائم رہے گی اور شائقین اس سے برابر فائدہ اٹھا سکیں گے۔

حضرت دل شاہجہان پوری
تلمیذ حضرت امیر مینائی

غزل

سوز ہم، دل سوز ہم، جانبازیٔ پروانہ ہم
بن گئے جاتی ہوئی دنیا ترا افسانہ ہم

کہہ گئے ہیں سرگزشتِ عشق بے تابانہ ہم
ختمِ ہر رُوداد ہم، آغازِ ہر افسانہ ہم

کھینچتی موجِ مخالف جب سفینہ لے چلی
دُور تک دیکھا کئے ساحل کو مایوسانہ ہم

اشک رنگیں ہو چلے خونِ تمنّا ہو چکا
آج چھیڑیں گے یہیں سے اک نیا افسانہ ہم

جامِ کوثر روحِ بادۂ جنّتِ میکش کا پھول
اور کیا سمجھیں تجھے اے نرگسِ مستانہ ہم

سرحدِ ادراک تک ہے پائے لرزاں میں خلش
اس کے آگے اے جنوں پھر گردشِ صحرا نہ ہم

ہر قدم پر روندتی چلتی ہے اک دنیا ہمیں
درسِ عبرت ہیں مثالِ سبزۂ بیگانہ ہم

سرگزشتِ نامکمل، واقعاتِ ناتمام
ایک افسانہ ہے دنیا، دوسرا افسانہ ہم

آج یہ کہہ کر ہوئے قرباں اُن پر جاں نثار
بزمِ سوز و ساز میں تم شمع ہو پروانہ ہم

اے نگاہِ منفعل خوددار رہنا چاہیے
ہم سمجھتے ہیں ترا یہ عذرِ معصومانہ ہم

آفریں صد آفریں اے جذبۂ توفیقِ عشق
ایک آہِ سرد میں کُل کہہ گئے افسانہ ہم

وہم کا اک شعبدہ ہے یہ طلسمِ زندگی
جس نظر سے دیکھیے آباد ہم ویرانہ ہم

ہر نظر شرحِ تمنا ہر نفس رُودادِ عشق
سن چکا اک سننے والا کہہ چکے افسانہ ہم

شاملِ روداد ہو کر بجھ گئی شمعِ سحر
سوزِ دل کا جب مکمل کر چکے افسانہ ہم

حضرتِ دلؔ قصۂ دارورسن دُہرا دیا
بے تکلّف کہہ گئے اک لفظ گستاخانہ ہم

ایک ادبی شاہکار

چاند بی بی سلطان

(تبصرہ)

عہدِ حاضر میں جس زور و شور سے کتابوں کی اشاعت عمل میں آرہی ہے اسے دیکھتے ہوئے ایک قاری کے لئے یہ امر بہت دشوار ہو گیا ہے کہ وہ کونسی کتاب پڑھے اور کس کتاب کو نظر انداز کرے کیونکہ کسی بھی شخص کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے کہ وہ سب کتابوں کا مطالعہ کرے نہ اتنا صبر و ضبط کہ ہر کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے۔ یہ تو مسرّت کی بات ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ تلخ بھی ہے کہ ان میں چند ہی ایسے ہیں جن کے لئے کچھ وقت صرف کیا جا سکتا ہے یہ صحیح ہے کہ دنیا کا کوئی ملک یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ اس کا ہر لکھنے والا ہی اچھا ادیب ہے مگر ہمارے پاس لکھنے والوں کی جس قدر کثرت ہے اچھا لکھنے والوں کی اسی قدر کمی ہے۔ جب ایک آدھ اچھا لکھنے والا پیدا ہوتا ہے تو کتابوں کے اس بے پناہ سیلاب میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اس کی صحیح طور پر قدر افزائی نہیں ہو سکتی اور ایک ہونہار ادیب کی دیگر تصانیف سے ادب محروم رہ جاتا ہے۔ ایک اچھے ادیب کی گمنامی اور اس کی خدمات سے استفادہ نہ کر سکنا ہماری بدقسمتی ہے نقاد کا فرض ہے کہ اصلی جواہرات کو پہچانیں اور ان کے لئے مناسب جگہ کا تعین کریں۔ قابل لوگوں کی ہمت افزائی ان کی زندگی میں ہو تو ہم بھی ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور انہیں بھی اپنے کام کا سچا صلہ اسی صورت میں ملتا ہے۔ مردہ پرست ہونے کا داغ ہم اسی وقت دور کر سکتے ہیں جبکہ باکمال حضرات کے کام کا ان کی زندگی ہی میں کھلے دل سے اعتراف کریں۔ اور انہیں ترغیب دیں کہ وہ آئندہ اپنی صلاحیتوں کو زیادہ اجاگر کریں۔

چاند بی بی سلطان کو پڑھنے کے بعد یہی خیال آیا کہ وزیر حسن کو ادب میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ کتاب کا نام دیکھ کر یہ خیال کیا تھا کہ تاریخ کی کوئی پھسپھسی کتاب ہو گی ایسی کتابیں لکھنے کا رواج بہت عام ہے جیسے اکبر اعظم نادر شاہ وغیرہ لیکن کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو سنہ تاریخ وغیرہ کا نام و نشان بھی نہ تھا میں نے تجسس کی خاطر پڑھنی شروع کی تو ایک ہی نشست میں کتاب ختم کر دی اور ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ گھٹیا کتابوں کو پڑھتے پڑھتے ہم ہر کتاب کے متعلق خواہ مخواہ پہلے ہی سے بری رائے قائم کر لیتے ہیں اور اس کے پڑھنے سے کتراتے ہیں۔ بہر حال یہ پڑھنے والے کا قصور ہو یا زیادہ مگر لغو لکھنے والوں کا یہ امر طے شدہ ہے کہ اس ہجوم میں اچھے برے کی تمیز کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

چاند بی بی ــــ تاریخِ دکن کی شہرۂ آفاق ہیروئن ــــ ہماری قوم کی وہ بلند پایہ ہستی ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن ابھی ہماری غلامانہ ذہنیت ختم نہیں ہوئی۔ ابھی تک ہم ژان دارک، شارلیمین اور نپولین کی بہادری کے نغمے گنگناتے ہیں۔ ابھی ہم ٹیپو سلطان، چاند بی بی اور اورنگ زیب کی عظمت کو نہیں جانتے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ادب میں ایسی چیزیں بھی ایسے دلنشیں انداز میں پیش کی جائیں کہ ہماری آنکھیں صرف مغربی ہیروں ہی کی چمک دمک سے خیرہ نہ ہوتی رہیں بلکہ اپنے موتیوں کی آب و تاب کو بھی دیکھ سکیں۔ ادب کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے

مطلب یہ ہے کہ واردات انسانی، ماضی اور حال کے کارنامے، مستقبل کی امید، زندگی کے غم و حسرت کی داستان، انسان کا مرنا جینا، ہنسنا اور رونا اپنے اندر ایک جذب، ایک کشش، ایک اثر، ایک لطف رکھتا ہے ـــــ ادب شہد کی مکھی کی طرح ان پھولوں پر بیٹھ کر رس رد شہد بناکر پیش کرتا ہے۔ وزیر حسن نے بھی اپنا یہی مقصد قرار دیا ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"ان صفحات کو اول اول میں نے اس طرح لکھنا چاہا تھا کہ تاریخی واقعات کو سلسلے سے دہراتا چلا جاؤں مگر ادب چاہتا ہے کہ یہ واقعات زندگی کی سچائیاں بن جائیں۔ اس لئے تاریخی واقعہ اگر اٹل ہے کہ چاند بی بی کی عمر شادی کے وقت سترہ برس کی تھی تو ادب کی خاطر وہ زندگی کی یوں سچائی بھی بنا ـــــ عمر کوئی سترہ برس ہو گی جب توانائی سے جی نہال رہتا ہے پانی پیو تو سر چڑھتا ہے"

یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جس میں چاند بی بی "ایک بیٹی ـــــ کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے وہ حصے اور ہوں گے خدا کرے ں۔ اگر "فارم" کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مروجہ اصناف ادب میں کسی بھی صنف میں اس کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کو سوانح عمری کہہ سکتے ہیں نہ ناول۔ وزیر حسن کو خود اس کا احساس ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا "آخر اس کتاب کا نام کیا ہے"؟ اور انہوں نے جواب دیا "زندگی جس پر تاریخ کی افشاں ہو"۔ درحقیقت وزیر حسن نے ایک نیا فارم تخلیق کیا ہے جس میں ناول کی سی دلچسپی، پلاٹ، مکالمہ اور کردار ہیں اور سوانح نگاری کی سی صداقت سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ "ایجاد بندہ ـ ـ ـ" قسم کی چیز نہیں بلکہ نہایت عمدہ پیش کش ہے۔

اس جلد کو جو بجائے خود مکمل ہے مزید تین حصوں نوید، نسبت اور بیاہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مختصراً پلاٹ یہ ہے۔

یہ دکن والوں کا قصہ ہے جب احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت تھی اور حسین نظام شاہ حکمران۔ چاند بی بی بادشاہ کی بیٹی، شکار سے واپس ہے تو اس کی والدہ خونزہ ہمایوں اسے بلاتی ہے کہ شکار کا حال دریافت کرے۔ گفتگو کے دوران میں چاند بی بی کا چھوٹا بھائی ادھر آنکلتا ہے ارت سے کہتا ہے۔

"شہزادی آپا آپ دلہن بنیں گی"

چاند بی بی اس کی یہ بات سن کر سن سی ہو جاتی ہے مگر ماں کے مسکراتے ہوئے تیور دیکھ کر کچھ سمجھ بھی جاتی ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ اب ماں باپ کا ساتھ چھوٹ جائے گا مختلف بیتی باتیں یاد آتی ہیں۔ کئی دن تک چاند بی بی کو بھائی کے کہے کی ٹوہ رہتی ہے لیکن کچھ سن گن پاتی۔ مختلف اشغال میں دن گزرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی سالگرہ کا دن آجاتا ہے۔ سالگرہ کے دن نگر کی تباہی کے پیش نظر جشن نہیں منایا جاتا۔ میں خونزہ ہمایوں تیر کا نمائش اور چاند بی بی کے تیر و تلوار کے کمالات دیکھنے کے بعد خواتین سے جنگ کی باتیں کرتی ہے اور آخیر آخیر میں یہ بھی کہتی بیٹی جیالی ہو کہ ہر، بلی فقیر کی ہو یا بادشاہ کی ہو، پرائے گھر کی ہوا کرتی ہے آج میکے کل سسرال۔

بت ۔ ملکہ خونزہ ہمایوں کے کہنے میں یہ اشارہ تھا کہ وہ چاند بی بی کی نسبت چپ چپاتے ٹھہرا چکی تھی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ دکن کی پانچ ستیں، نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی، عماد شاہی، برید شاہی، اصل میں بہمنی سلطنت کے ٹکڑے تھے۔ مگر وجیا نگر کا راجا رام راج کا شیاں تھا۔ وہ قطب شاہی اور عادل شاہی کو برادری سے توڑ کر اور لالچ دلا کر نظام شاہی پر تاختیں کر رہا تھا۔ مسلمان بادشاہوں لیں کی پھوٹ سے ہندو راجا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ رومی خاں وزیر نے جب دیکھا کہ غنیم کی متحدہ طاقت سے احمد نگر تباہ ہوا جا رہا ہے تو اس ر

ـــہ ہیئت

نے مسلمان بادشاہوں عادل شاہ اور قطب شاہ سے آپس میں شادی بیاہ کر کے تعلقات استوار کر کے رام راج سے بدلہ لینے کی
اسی کی تدبیر سے چاند بی بی کی نسبت عادل شاہ سے طے پائی اور عادل شاہ کی بہن کی نسبت چاند بی بی کے بھائی سے۔ سہیلیاں
چاند بی بی تک پہنچا دیتی ہیں اور وہ بہت پریشان ہوتی ہے کہ عادل شاہ جیسے دشمن سے شادی ہوتی ہے لیکن ملک کی حالت ۔
اور شادی کے تصور سے جی بھی خوش ہوتا ہے رومی خاں اپنے غضب ناک اور انتقام لینے کے لئے تیار سپہ سالاروں سے اس طرح
کرتا ہے کہ وہ سب بھی صلح اور شادی پر راضی ہو جاتے ہیں۔

بیاہ:۔ چاند بی بی کی شادی سے دلوں کا میل دور ہوتا ہے اور بچھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ تمام ملک کو سجایا جاتا ہے اور مختلف تقریبات
رسمیں ہوتی رہتی ہیں رعایا بھی بڑی خوشی سے حصہ لیتی ہے اور دلہن احمد نگر سے بیجاپور کی طرف سدھارتی ہے۔ اور اسی پر کتاب کا
خاتمہ ہوتا ہے۔

اردو میں شرر کا نام تاریخ کو ادب کی صورت میں پیش کرنے کے سلسلے خاص طور سے لیا جاتا ہے لیکن شرر کی اس خواہش و مقصد
باوجود کہ وہ مسلمانوں میں مذہبی جوش اور قومی احیاء تاریخی ناول کے ذریعے سے بیدار کریں وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے
ناولوں میں بڑے بڑے لافانی مسلمان سلاطین کے کردار لئے لیکن ان کی عظمت کا کوئی نقش ہمارے دل پر نہیں بٹھا سکے۔ بقول ایک نقاد
"زندۂ جاوید شخصیتوں کو مردۂ جاوید بنا کر پیش کرنا مولانا شرر کی خصوصیت ہے"۔ انہوں نے کتابیں بہت لکھی ہیں مگر ایک کردار بھی ایسا
پیش کر سکے جو زندہ ہو جو یاد رہ گیا ہو جس کا اثر مٹائے نہ مٹتا ہو۔ یہی حال محمد علی طبیب کے کرداروں کا ہے۔ تاریخی ناول کا فن صرف
نہیں ہے کہ قصے کی بنیاد کسی تاریخی واقعے پر ہو یا افرادِ قصہ تاریخی شخصیتیں ہوں۔ تاریخی ناول لکھنے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت
ہے سب سے پہلے قوتِ متخیلہ جس سے وہ تاریخ کے لامتناہی سلسلے میں چیزوں اور کرداروں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ سکے۔ شرر کے ہاں یہ
ہوتا ہے کہ تاریخی نام رکھ کر غلط واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری چیز انتخاب اور فیصلہ ہے۔ ان سب کے لئے ناول نگار کو تاریخ پر پورا عبور ہو
تاکہ تاریخی صحت کے ساتھ اس دور کی اسپرٹ سے واقف ہو کیونکہ اپنے موضوع سے اسی وقت ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے جب اس سے
طرح واقفیت ہو۔ ادب کی دنیا میں ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ تاریخ کو کس طرح استعمال کیا جائے یعنی اگر کوئی مصنف تاریخی مواد جمع کرے
اس سے کوئی نئی چیز پیش کرنا چاہئے تو کیس طرح ممکن ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ ماضی کی یاد کس لئے ضروری ہے۔ کیا ماضی سے مستقبل کی تعمیر ہو
ہے؟ مائیکرنٹ سیرل خوب لکھتا ہے:۔

"ایک مادی شے مثلاً بلیرڈ کی گیند بہرحال جو کچھ ہے وہ موجود ہے کسی جگہ، کسی وقت جب گیند پائی جائے گی تو گیند کا سب کچھ
اس میں موجود ہوگا لیکن ایک شے کی نشوونما مثلاً ایک تخم، ایک بیج، ایک جانور یا انسان جب کسی جگہ کسی خاص وقت میں پایا جاتا ہے تو کبھی
اس میں اس کا سب کچھ موجود نہیں ہوتا ماضی کا بہت کچھ اس وقت اس میں موجود نہیں مستقبل میں اس سے بہت کچھ ظاہر ہونے والا ہے
جو بالفعل موجود نہیں نشو و نما کے اجزا و ترکیبی اس کی اصلی حقیقت نہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کے ماضی پر نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ماضی
کس طرح اس کے مستقبل کے لئے ایک خاص قوت اس میں لیے ہوئے ہے۔ نشو و نما اور غیر نشو و نما کے درمیان ایک عظیم الشان فرق غیر نشو و نما میں

اجزائے ترکیبی جس ترکیب اور تناسب سے زیادہ کچھ نہیں لیکن فن کی روح میں ایک اور چیز ہے اور وہ ہے اس کی حقیقت اور فن کا عمرہ

تاریخی مواد سے مستقبل کی تعمیر انسان تخلیقی تخیل کے ذریعہ کرتا ہے۔ چاند بی بی ملک کی عورتوں کے لئے ایک سبق ایک مثال۔ ایک زندہ حقیقت ہے۔ وزیر حسن نے اس کی ہر حال شخصیت کو اپنے سامنے رکھا اور بڑی خوبصورتی سے اس میں رنگ بھرا ہے۔ وزیر حسن بڑی چابکدستی سے تاریخی پس منظر اور عظمتِ رفتہ کی چلتی پھرتی تصویر پیش کرتے تخلیقی تخیل کے ذریعے مستقبل کی تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے چاند بی بی کی زندگی پیش کرنے کے لئے وزیر حسن نے اس کے پورے ماحول کی عکاسی کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے وزیر حسن چاند بی بی کے عہد ہی کے ایک آدمی ہو گئے انہوں نے خود کو اس زمانے میں اس قدر جذب کر لیا ہے کہ زبان سے قطع نظر کہیں گمان ہی نہیں گزرتا کہ مصنف بیسویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک غیور شاہی خاندان، اس کے تعلقات، زندگی، شہر کی بربادی اور اس کا ردِ عمل غرض مواد ملا ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس دور کی روح میں ڈوب کر لکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس قابل ہوئے ہیں کہ چاند بی بی کو جیتا جاگتا اور زندہ جاوید بنا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دیں۔ وزیر حسن اس سلسلے میں شرر سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ چاند بی بی کے ہمزاد بن گئے ہیں سوچتی ہے تو یا اس کے ذہن میں گھس کر اس کے افکار قلمبند کر لیتے ہیں۔ مگر اس کے ذہنی تجزیہ کی تفصیل میں اس قدر ناقابلِ برداشت نہیں ہو جاتے جیسے کچھ دنوں سے اردو افسانوں اور ناولوں میں رواج ہو چلا ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہتی ہے تو یہ اس کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا لیتے ہیں تاکہ اس کے جذبات کو بہتر طور پر محسوس کر سکیں۔ وہ ہنستی ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ قہقہہ لگاتے ہیں۔ بہرحال کہانی سے زیادہ مصنف نے ایسی کامیاب کردار نگاری کی ہے کہ چاند بی بی دیکھتے، سنتے، سوچتے اور محسوس کرتے دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ایک ہیروئن بننے کی فطری صلاحیتیں ہیں مگر وہ ایک وہم ہیروئن نہیں بن گئی ہے۔ اس پر اپنے ماحول کا پورا اثر پڑا ہے۔ گو وہ خود ایک تیز مزاج خاتون ہے جس کے نزدیک چار بارہ سنگھے، پانچ غزال، دو سانبھر بن بلاؤ اور ایک شکار بھاگ دوڑ کر کچھ کھیل ہی لیا: کے مرادف ہے، جو نگر کی بربادی پر جی ہی جی میں پیچ و تاب کھاتی ہے جو کہتی ہے: بل میں بل اپنا لی تھیں جس نے آنکھیں نکال کر دیکھا تو تم خود اس کی آنکھیں کیوں نہ نکال دو، جو جہیز کی دیگر اشیاء کے علاوہ چپکے سے اپنی تلوار بھی ساتھ رکھ لیتی ہے مگر اس نے ایک ایسے باپ کے زیر نگرانی تربیت بھی پائی ہے جو غنیم کی یلغاروں سے تباہ ہو رہا ہے لیکن ہمتِ مردانہ باقی ہے لہٰذا ہار نہیں مانتا اور پھر لڑنے سے پہلے ملنے کے ڈھنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ رخصتی کے وقت غضبناک سلطان کی مصلحت اندیشی اپنی جنگجویانہ فضا میں پلی ہوئی بیٹی سے یوں خطاب کرتی ہے تاکہ چاند بی بی کے کردار میں صلح و آشتی کی نرمی پیدا کر دے۔

"چاند تم نگر بیٹی پہلے ہو، شہزادی بعد میں ہو۔ بات کرو گی تو گرج ہو گی۔ ہنسو گی تو بجلی چمکے گی۔ روؤ گی تو مینہ برسے گا۔ مگر یہ باتیں نگر بیٹیوں کو اس وقت سجتی ہیں کہ برسی گرمی کے درمیان جو کیفیت ہوتی ہے وہی ان کے مزاج میں رہے۔ بیٹی بورق و باراں کا نرا طوفان نہ بن جانا کہ ہمارا خرمنِ امید جل جائے:

آتوں جی کا کہانیوں اور باتوں ہی باتوں میں پتے کی باتیں کہہ جانا چاند بی بی کے لئے ہی کیا ملک کی تمام بیٹیوں کے لئے ایک پیغام ہے۔

"پگلی بھری بیٹی تو سمجھ ایسی ہے جیسے مینا ندی میں کوئی مٹی گھول دے۔ اسے گدلا بنا دے۔ ایسے وقت بھلا کون پیاسا ہو گا جو اس کے دوار جائیگا اور جی ٹھنڈا کرے گا .... او وہ بیٹی بھی کوئی بیٹی ہے جو اپنے ساجن کو ستائے۔ اس سے اپرائے جلدی بگڑنے دیر میں منے، لڑے جھگڑے آٹھوں پہر کلوی کسیلی رہے

ناصاحب وہ بیٹی نہیں ــــ گھر گھرانے، دیس دنیا سب کے لئے ایک بوجھ ہے "

جوشِ مردانہ، ہمت و جرأت ــــ یہ تو چاند بی بی کے کردار کا ایک پہلو ہے۔ اس کے مصنف کی کوشش یہی ہے کہ چاند بی بی کو خلوت میں جلوت میں ہمارے سامنے پیش کرے۔ اس کی نفسیات اس کے خیالات اور ذہنی کشمکش کو آپ پر پوری طرح واضح کرے۔ وہ ابھی زیر تکمیل (IN THE MAKING) ہے۔ آئندہ اسے ایک بہت بڑا کام کرنا ہے ــــ وطن اور قوم کی خاطر میدان جنگ میں آنا اور اکبر اعظم جیسے شہنشاہ کی تدبیروں کو اپنی جوانمردی سے الٹ دینا ــــ پھر اپنی ہی قوم کے غداروں کے ہاتھوں شہید ہونا بھی اس کی قسمت میں لکھا ہے ــــ ایسی شہزادی کا کردار ارتقائی منازل سے گزارنا اور اس میں انسانی جذبات اور کیفیات ٹٹولنا جس سے بشریت کی تکمیل ہوتی ہے وزیر حسن کا کمال ہے۔ زندگی کے معمولی واقعات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرنا ــــ ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تو ہم اس کے مزاج و طبیعت کی جھلک پاتے ہیں:۔

. . . : چاند بی بی اپنے آپ اس طرف کھنچی آتی تھی کہ ناصرہ کی ایک چیخ سنائی دی۔ پھر پانی کا چھپاکا سننے میں آیا۔ ہوا یہ کہ خدیجہ نے ناصرہ کو کپڑ تالاب میں دھکیل دیا۔ سب بھاگے ہوئے ادھر گئے۔ دیکھا کہ ماری ٹھنڈے پانی سے بولائی گھبرائی پھرتی ہے اور جلدی جلدی تیرنے لگی ہے۔ اس پر سب نے قہقہے لگائے۔ اب کیا تھا رکعت تو دور گئی۔ دلشاد نے نعیمہ کو دھکیلا وہ زیب نگاری کو ساتھ لے کودی۔ یونہی ایک نے دوسری کو دھکیل دیا۔ یہاں تک کہ چاند بی بی اکیلی تماشا دیکھتی کھڑی رہ گئی۔ اس وقت اس نے خیال کیا کہ پانی ہو کر الگ جب سہیلیاں کود گئیں تو اپنا الگ رہنا وضع کے خلاف ہوگا۔ اس لئے وہ بھی دھڑام سے تالاب میں آ رہی "

ادب وہ ہے جو تخیل اور جذبے کے اشتراک سے پیدا ہو اور اس کی دوامی قدر و قیمت اسی پیمانے سے ناپی جاتی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ سائنس کی کتاب ہو یا تاریخ کی جب ہم ایک مرتبہ بغور پڑھتے ہیں تو اس کے مطالب و معانی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ بار بار اس کتاب کو اٹھا کر پڑھتے رہیں لیکن ادبی کتاب زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ ادب عالیہ کو ہم بار بار پڑھتے ہیں اور اس پر بار بار غور کرنے پر مجبور ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ادب اجتماعی زندگی کا آئینہ ہے۔ ادب عام انسانوں کے جذبات و تخیلات، تصورات، و مشاہدات کا ترجمان ہے چاند بی بی صرف ایک شہزادی نہیں وہ ایک الھڑ حسینہ بھی ہے۔ اسے بیاہ کی نوید سن کر جو جو خیالات آتے اور اس کے دل میں جو ارمان بیدار ہوتے وہ ایک عام دوشیزہ سے مختلف نہیں۔ سوتے جاگتے چلتے پھرتے، وقت بے وقت، کئی دیگر خیالات پر حاوی وہی خیال۔

"یہ دیکھتے ہی چاند بی بی کو بھی ترکا نزاک لہرائی۔ پھر اک جوش آیا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اچانک ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ درخت سائیں سائیں کرتے ہیں دہرے ہوئے جاتے ہیں چاروں طرف گرد و غبار سا چھا رہا ہے۔ سارا منظر اندھکاری بنا جاتا ہے کہ ایسے میں اسے یہ بھی معلوم ہوا جیسے پھر بہان نواب نے آ کے چیخ لگائی: شہزادی آپا آپ دلہن بنیں گی؟ اس پر وہ کیفیت طاری ہوئی جیسے بچے کے سر پر کوئی آفتابہ بھر پانی انڈیل دے تو گھبرائے اور چونک پڑے اور اسی طرح وہ بھی چونک پڑی اور یہ محسوس ہوا کہ اب تک طبیعت میں جو بچپن سا تھا، وہ چھنا جاتا ہے"

چاند بی بی کے جذبات کا مد و جزر اور اس کی قلبی کیفیات کی تصویر بڑی محنت سے کھینچی گئی ہے۔ شادی کے تصور سے اسے گدگدی ہونے لگتی ہے لیکن مرعل کی بے وفائی خصوصاً عادل شاہ جیسے سابق دشمن ملک سے ڈرتی بھی ہے۔ اسے رومی خاں پر غصہ بھی آتا ہے مگر یہ پرنیا تو

کی زد میں اس سے دل ہی دل میں معافی بھی مانگ لیتی ہے۔ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو دلہن بنا ہوا بھی دیکھتی ہے اور عادل شاہ سے ہمکلام بھی ہوتی ہے۔

ایسے وقت اس شیش محل میں چاند بی بی یہ دیکھتی ہے کہ علی عادل شاہ ابھی ابھی شیر کے شکار سے آیا ہے اور فوجی لباس میں ہے مگر کچھ دن میں آیا ہے جس سے اسے انتظار کی گھڑیاں بتانی پڑیں۔ اسی بات کا چاند بی بی گلہ کرتی ہے۔ علی عادل شاہ مسکراتا جاتا ہے اور خوش مزاجی سے جواب دیتا جاتا ہے۔

چاند بی بی ـــــ سلطان حضور فرما گئے تھے شام تک آجاؤں گا۔

علی عادل ـــــ شام سے پہلے ہی تو آگیا ملکہ بیگم دیکھئے نا! سہ پہر ہے!

چاند بی بی ـــــ مگر دن کون سا ہے؟

علی عادل ـــــ دن اللہ کے بنائے ہوئے سب ایک ہیں

چاند بی بی کے علاوہ حسین نظام شاہ، رومی خاں، آنوں جی، ملکہ خونزہ ہمایوں اور علی عادل شاہ کے کردار بھی اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے قابلِ توجہ ہیں۔

حسین نظام شاہ ایک پرجلال اور باغیرت سلطان ہے۔ جب سے غنیم نے پے در پے دو حملے نظام شاہی پر کئے ہیں، سلطان اپنے آپے میں نہیں۔ جنگ اور انتقام کی تیاری میں رات دن محو ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پیاری بیٹی کی سالگرہ کے دن بھی جبکہ وہ ہر سال جشن کرتا اور لاکھوں روپے کے جواہرات اسے عطا کرتا تھا وہ کچھ نہیں کرتا اور بجائے اس کے فوج سے خطاب کرتا ہے کہ

"ہم آزادی کے چہیتے ہیں، سچائی میں جیتے ہیں، جس کے لئے دہکتی آگ میں کود پڑیں گے، کوندتی بجلی سے لڑیں گے بس تو اب غنیم میں چاہے کوئی عادل شاہ ہو یا قطب شاہ یا رام راج یا یہ سب مل کر ایک جان بن جائیں۔ ہم سب سے لڑیں گے۔ مگر آزاد جئیں گے یا عزت مریں گے کہ اوروں کو جان پیاری ہو تو ہو ہمیں جان سے آن بان پیاری ہے۔"

اس کے علاوہ چاند بی بی کی شادی کے وقت بھی سوائے انتقام کے اسے کسی بات کا دھیان نہیں۔ وہ کسی تقریب میں حصہ نہیں لیتا اور بیوی سے شکوہ کرتا ہے

"چاند کو بھی اور بیٹیوں جیسی دلہن بنایا؟ زرہ خود، کٹار، تلوار کوئی زیور بھی تو نہیں جو اس دلہن کو سجے۔"

بہر حال وہ ایک زخمی سانپ کی مانند چوٹ کھا کر اور بپھرتا ہے۔

رومی خاں وزیر با تدبیر ہے۔ داؤ پیچ کرنا اور غیروں کو اپنا بنانا اسے خوب آتا ہے۔ حسین نظام شاہ جیسے جوشیلے سلطان کے موقع شناس اور مدبر وزیر کی کمی رومی خاں پوری کرتا ہے۔

ملکہ خونزہ ہمایوں ایک عورت، ایک ماں، ایک بیوی ہے۔ اسے بیٹی کی شادی کا بھی ارمان ہے شوہر کی فکر اور پریشانیوں کا بھی احساس

لیکن ان دونوں حیثیتوں کو وہ اپنی حوصلہ مندی سے نبھاتی ہے۔ آنوں جی چاند بی بی کی استانی ہیں اور ایک شفیق دوست بھی ہیں۔ وہ پڑھاتی بھی ہیں لیکن پرلطف قصوں سے دل بھی بہلاتی ہیں۔

علی عادل شاہ ذہین، شوخ مزاج اور علم کا دلدادہ ہے۔ حسن کا پرستار ہونے کے باعث خوابوں میں ایک حسینہ آتی ہے۔ شادی کا ذکر اسے بھاتا ہے لیکن اپنی شوخ مزاجی کی وجہ سے ملا بنجا اور خطیب مشہدی پر فقرے بھی کستا ہے

چاند بی بی کی سہیلیاں بھی کتاب کی رونق بڑھاتی ہیں۔ لیکن ان کی کوئی انفرادی شخصیت نہیں۔ تاہم ان کی وجہ سے کتاب دلچسپ ضرور ہوجاتی ہے اس میں حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ وزیر حسن نے ان سے اپنے اس خوش گوار مقصد کی تکمیل کا کام لیا ہے۔ تاریخ اور فسانہ کا امتزاج اگر خوبصورتی سے کیا جائے تو اس سے زیادہ پر اثر کوئی چیز نہیں۔ تاریخ کی سچائی اور فسانہ کی دلکشی دونوں ایک دوسرے کو پر اثر بناتے ہیں اور پڑھنے والے کے ذہن کو ایک خاص اپیل کرتے ہیں۔

ناول میں وزیر حسن نے طریق بود و باش پر اس طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ قاری کے ذہن کو موجودہ زمانے سے صدیوں سے پیچھے لے جائیں اور اس کے باوجود اس کی دلچسپی تمام و کمال برقرار رکھیں۔

"نوبت کے ٹکورے سنائی دیتے تھے کہ کالے چبوترے پر صاحب آتش خانہ، ادھر رام نے دھوپ گھڑی دیکھی، پھر ہاتھ بلند کیا۔ توپچی نے رنجک کو آگ دی۔ دوپہر کی توپ چل چڑھائیں۔ یہ گرج آس پاس کی پہاڑیوں میں پھیلی اور کچھ اس طرح ایک لمبی گڑگڑاہٹ بن کر لوٹی کہ باغ باغ مورچھند کار لے نظام شاہی بار رخصت ہوئے"

آج کل زبان کو بالکل اہمیت نہیں دی جاتی کوئی خواہ کیسی ہی غلط زبان لکھے۔ خواہ کیسا ہی روکھا پھیکا بیان ہو، خواہ کیسا ہی عام اور مبتذل انداز بیان ہو کوئی اس پر توجہ نہیں کرتا۔ صرف نفس مضمون پر توجہ کی جاتی ہے۔ ناول، شاعری، ڈرامے، افسانے وغیرہ میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ کیا لکھا ہے یہ نہیں کہ کیسے لکھا ہے۔ اسی وجہ سے آج کل کے ادیبوں کا انداز بیان ایک جیسا ہے۔ ہم ایک ادیب کی تحریر پڑھ کر دوسرے ادیب سے اسے مختلف نہیں پاتے۔ حالانکہ زبان سے یہ بے توجہی قابل معافی نہیں۔ ایک ہی واقعہ ہوتا ہے جسے زید بیان کرتا ہے تمام حاضرین قہقہہ لگاتے ہیں۔ وہی واقعہ بکر سناتا ہے کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں آتی۔ مطلب یہ ہے کہ قصہ گوئی بھی ایک فن ہے۔ ادیب کے لئے بھی اس فن پر قدرت ضروری ہے۔ عمدہ تحریر کے لئے لازم ہے کہ اس میں قوت، زور اور اثر آفرینی ہو۔ شوخی، پاکیزگی اور نفاست، برجستگی، رفعت اور تحریر کے سنگار ہیں جن کے بغیر اس کا حسن دوبالا نہیں ہوسکتا۔ انداز بیان و زبان کی طرف سے غفلت کوئی قابل فخر خصوصیت نہیں۔ نہ تو صرف زبان کی چاشنی کوئی بڑی خصوصیت ہے اور نہ صرف واقعہ۔ ان دونوں کے اتحاد سے فن جنم لیتا ہے۔ چاند بی بی سلطان کے مصنف کے حسین پیرایہ بیان کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تعریف کے لئے ویسے ہی انداز بیان کی ضرورت ہے مگر اس سے میرا قلم عاجز ہے اس لئے پڑھنے والے پڑھیں اور لطف اٹھائیں۔ یہاں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے وزیر حسن کے نفیس صوتی حسن بیان کے علاوہ مناظر نگاری پر قدرت کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔

"یاد میں بلد، نظام باغ کی رس رلیاں بھی یاد آگئیں کہ برکھا رت ہے، بادل آرہے ہیں، چھا رہے ہیں،"

برس رہے ہیں۔ بوندیاں حویلیوں کو اتر رہی ہیں۔ جہاں جہاں جاتی ہیں، بہاراں ہوتی جاتی ہیں۔ جہاں مورنیاں
ہیں وہ خود بھی ہے اس کی سہیلیاں بھی ہیں —— سروں پر اودی اودی گھٹائیں، پیروں تلے ہری ہری دوب،
بدن پہ دھانی انگیا، زعفرانی پشوازیں، وہ سکھیاں جھول رہی ہیں، چادر جھلا رہی ہیں۔ خوشی خوشی پینگیں بڑھا رہی
ہیں۔ ملہار گا رہی ہیں:۔

جھولن آئے برکھا کے سمے گگن گرجے پکار پکار
گھٹا اندھیری دامنی چمکے رس کی پڑے پھوار پھوار

وہ میٹھی آوازیں، وہ تو رکے ٹکلے، وہ کبھی کبھی کوئل کا کوکنا، معلوم ہوتا باغ کا پھول پھول بنی ہتی ملہار گا رہی ہے۔
اتنے میں چمک سے چمک ہوئی پھر زور کا کڑکا ہوا۔ زمین دہل گئی۔ اب وہ نئی سہیلی بھاگی کوئی وہیں پر
بیٹھی، کوئی جیسی جہاں تھی، وہیں کھڑی ہے کانوں پر ہاتھ آنکھیں بند، منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی ہے۔"

آنسہ رضیہ جہاں آرا

یہ کتاب دکن اردو اکیڈمی ادارہ شرفیہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے (مخزن)

۱۱ر ستمبر

قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

از:- شیخ عبد القادر علیہ الرحمۃ

بہت سے بڑے آدمیوں کے جنازے ہماری عمر میں اٹھے۔ بہت سی بڑی شخصیتوں کے گزر جانے پر ان کے ماتموں کو ہم نے ہوتے اور ہوتے دیکھا۔ مگر جس شان سے قائد اعظم کا جنازہ اٹھا اور جس دلی اندوہ و غم کا اظہار کروڑوں بندگانِ خدا نے پاکستان کے ہر گوشے میں کیا ہے، اس کی مثال ملنی محال ہے۔ پرانے زمانے میں ملک اطالیہ میں ایک عجیب رسم تھی کہ کسی مرنے والے کے عزیزوں اور دوستوں کے آنسو جمع کئے جاتے تھے میں نے جب اثنائے سیاحت میں پمپیائی کا مشہور اجڑا ہوا شہر دیکھا۔ تو وہاں بعض گھروں کی الماریوں میں چھوٹی چھوٹی شیشیاں نظر آئیں جن میں پانی سا بھرا ہوا تھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ مرنے والے کے ماتم میں اس کے جو دوست شریک ہوتے تھے وہ اپنے آنسو شیشیوں میں ٹپکاتے تھے اور جس کے مرنے پر بہت سی شیشیاں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں ان کی تعداد کی کثرت اس کی ہر دلعزیزی کا معیار ہوتی تھی۔ اگر ہماری قوم میں کوئی ایسا رواج ہوتا اور وہ سب آنسو جو مسلمانوں نے جا بجا اس پُر افسوس واقعہ پر بے اختیار بہائے تھے جمع کئے جا سکتے تو ایک طوفانِ اشک بپا ہو جاتا۔

سراج حیدرآبادی

۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء

(اس یادگار تاریخ کو حیدرآباد کی ۲ صد سالہ حکومت و تہذیب کا چراغ اچانک گل ہوگیا)

اے وطن آج تجھے غیروں کو سونپا ہم نے
چاک ہوتا ہوا دامن ترا چھوڑا ہم نے
اجنبی آج ہوئے ہم سے چمن زار ترے
تیرے گلزار، تری وادیاں، کہسار ترے
جانے غداروں کو کیا غیب سے توفیق ہوئی
جنسِ ناموس لٹادی سرِ بازار تری

مدتوں ہم تری فوجوں کے سپہدار رہے
تیرے سب قافلوں کے قافلہ سالار رہے
محفلیں جتنی جمیں تجھ پہ، جمائیں ہم نے
جتنی شمعیں جلیں محفل میں جلائیں ہم نے
ہم نے تیرے در و دیوار کی معماری کی
کنگروں پر سحر و شام کی گلکاری کی
مسجدیں دیں تجھے اور اُن کو نمازیں بخشیں
تیری آوارہ ہواؤں میں اذانیں بھر دیں
تجھ کو تہذیب دی، عزم دلِ مردانہ دیا
تیرے ہاتھوں میں مئے عشق کا پیمانہ دیا
ظرفِ عالی دیا الفت دی رواداری دی
تیرے ذروں کو بھی تعلیم وفاداری دی
سر کا سودا دیا آنکھوں کا تجھے نور دیا
سب لٹا بیٹھے تو خونِ دلِ مجبور دیا
تیری ناموس تری عظمتِ دیریں کے لئے
خوں بہانے کو دلیرانِ جواں سال دیئے
آہ پھر بھی نہ بچایا گیا گلشن تیرا
ہاتھ کانپے تو چھٹا ہاتھ سے دامن تیرا

اور لوگ آئیں گے اب تیرے گلستانوں میں
اک نئی بزم جمے گی تیرے ایوانوں میں
زندگی تیرے شب و روز بدل ڈالے گی
اپنے قدموں تلے ماضی کو مسل ڈالے گی
اے وطن تجھ کو مگر یاد رہیں گے ہم لوگ
بن کے دل میں ترے فریاد رہیں گے ہم لوگ

لے ایطا کا خیال نہیں رکھا گیا مگر ہماری شاعری کو عروض کی سخت قیود سے کچھ آزادی ملنی چاہئے۔

امین الرحمٰن

"یہ نیلے نیلے پھول"

(افسانہ)

میں اب اس کھڑکی کے قریب بہت کم آتی ہوں حالانکہ یہ اب بھی کھلی رہتی ہے اور اب بھی اس میں سے وہی کھیت اور درخت پرندے اور سرمئی پہاڑ نظر آتے ہیں جنہیں باجی اور میں مل کر دیکھا کرتے تھے۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی اور ہر وقت باجی کے پیچھے پیچھے ایک سائے کی طرح لگی رہتی تھی اور جونہی باجی اس کھڑکی میں آکھڑی ہوتیں میں بھی ساتھ ہی آکھڑی ہوتی۔ باجی کھڑکی میں بہت دیر تک کھڑی باہر تکتی رہتیں اور اس کے ساتھ کپڑے پر پھول کاڑھتی جاتیں نیلے نیلے پھول ......

میں اب اس کھڑکی کے قریب بہت کم آتی ہوں حالانکہ یہ اب بھی کھلی رہتی ہے کھیتوں میں کسان اب بھی کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، درخت اب بھی ویسے کے ویسے کھڑے ہیں، آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتے ہوئے پرندے اب بھی سیاہ نظر آتے ہیں۔ اور سامنے کے پہاڑ اب بھی ایک سرمگیں خاموشی کے طلسم میں گرفتار نظر آتے ہیں اور یہ پگڈنڈی جو کھیتوں میں سے پیچ و خم کھاتے ہوئے گزرتی ہے اب بھی ویسی کی ویسی ہے اور اس پر سے اب بھی کسان، چرواہے اور مسافر گزرتے ہیں، مگر میں اب اس کھڑکی کے قریب بہت کم آتی ہوں شاید اس لئے کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔

"باجی؟"

"کیا ہے؟"

"باجی! یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"باجی یہ تم ہر وقت کیا کاڑھتی رہتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"باجی! یہ نیلے نیلے پھول کبھی ختم بھی ہوں گے؟"

"یہ نیلے نیلے پھول؟"

"ہاں!"

"یہ نیلے نیلے پھول!"

"باجی! یہ تم ہر روز کھڑکی میں کیا دیکھا کرتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ بھی نہیں؟"

"ہاں کچھ بھی نہیں!"

"مگر کھلی ہوئی کھڑکی میں سے تو بہت کچھ نظر آتا ہے!"

"تو پھر؟"

"تو تم کیا کچھ دیکھتی رہتی ہو؟"

"سبھی کچھ!"

"سبھی کچھ؟"

"ہاں سبھی کچھ!"

اور مجھے یاد ہے کہ اس کھلی ہوئی کھڑکی میں کیا کچھ نظر آتا

خاموش گھاٹیاں، پہاڑ، روئی کے گالوں کے مانند سفید بادل، اُڑتے ہوئے پرندے، ممیاتی ہوئی بھیڑوں کے گلے، بنسری بجانے والے چرواہے، پگڈنڈی پر سے گزرنے والے مسافر، فصل کاٹنے والے کسان بہت کچھ۔

"باجی انہیں تم کیوں ہر وقت دیکھا کرتی ہو؟"

"یونہی!"

"یونہی؟"

"ہاں یونہی!"

"باجی! تم کب تک یہ نیلے نیلے پھول کاڑھتی رہو گی؟"

"یہ نیلے نیلے پھول؟"

"ہاں یہ نیلے نیلے پھول؟"

"یہ پھول! یہ نیلے نیلے پھول!"

باجی کو نیلے نیلے پھول کاڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑکی میں کھڑے اپنی سفید سفید سبک انگلیوں سے یہ پھول کاڑھتی رہتیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ کھڑکی میں سے باہر بھی دیکھتی جاتیں آندھی ہو یا بارش، گرمی ہو یا سردی باجی کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔ سردیاں آتیں اور گزر جاتیں، گرمیاں آتیں اور گزر جاتیں خزاں آتی اور چلی جاتی بہار آتی اور چلی جاتی مگر باجی کی زندگی چپ چاپ ایک میدانی ندی کے مانند بہتی چلی جاتی۔

"باجی! معلوم ہے کون سا موسم ہے؟"

"کون سا؟"

"موسم سرما!"

"سرما؟"

"ہاں دیکھو تو سامنے کے پہاڑوں پر برف پڑ چکی!"

"ہاں"

"اور شمال سے سرد ہوا آنے لگی ہے!"

"ہاں"

"باجی! تمہیں کھلی ہوئی کھڑکی میں سے سرد ہوا نہیں لگتی؟"

"نہیں"

"باجی کیا تم تمام سردیاں کھڑکی کو کھلا رکھو گی؟"

"شاید"

"باجی! شمال سے آنے والے سفید بگلے آ چکے ہیں!"

"تو پھر؟"

"باجی وہ نیلگوں پانیوں پر چکر کاٹتے رہتے ہیں!"

"تو پھر؟"

"اور سفید مرغابیاں بھی آ چکی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"پر باجی! تمہارے یہ نیلے نیلے پھول ابھی ختم نہیں ہوئے؟"

"یہ نیلے نیلے پھول؟"

"ہاں"

"یہ نیلے نیلے پھول!"

اور جب خزاں آتی اور بہت سے درخت پھول پتیوں سے محروم ہو جاتے اور بعض درختوں کے پتے بالکل زرد ہو جاتے تو اس وقت بھی باجی کھڑکی میں کھڑے یہی نیلے نیلے پھول کاڑھا کرتیں۔

"باجی معلوم ہے کون سا موسم ہے؟"

امین الرحمٰن

"کون سا؟"

"خزاں آچکی ہے!"

"تو پھر؟"

"درختوں کے پتے جھڑ چکے ہیں"

"تو پھر؟"

"گھاس کی خزاں زدہ پتیاں زرد پڑ چکی ہیں!

"تو پھر؟"

"سب پھول مر چکے ہیں"

"تو پھر؟"

"خاکستری رنگ کی چڑیاں ایک ماتمی گیت گا رہی ہیں!"

"تو پھر؟"

"مگر باجی! تم اب بھی بڑے اپنے نیلے نیلے پھول کاڑھ رہی ہو؟"

"یہ نیلے نیلے پھول؟"

"ہاں!"

"یہ نیلے نیلے پھول!"

اور پھر جب بہار آتی اور جنگلوں، میدانوں اور وادیوں کی سبز و گل ایک اور تسلسل مل جاتی، اور جب فضاؤں میں نیل کنٹھ تلا بازیاں لگاتے اور بہت پیارا سا گیت گاتے، اور جب آسمان کی نیلاہٹیں اور زیادہ نکھر آتیں۔

"تو پھر؟"

"سامنے کا رہگزر پھولوں سے اٹ گیا"

"تو پھر؟"

"پر باجی تمہارے یہ نیلے نیلے پھول ابھی ختم نہیں ہوئے؟"

"یہ نیلے نیلے پھول؟"

"ہاں!"

"یہ نیلے نیلے پھول!"

اور پھر ایک بہار ایسی بھی آئی جب باجی اس کھڑکی میں آکر کھڑی نہ ہوئیں، اور اس کے دونوں پٹ ایک دوسرے کو اپنی ویران نگاہوں سے تکتے رہ گئے۔ لوگ باجی کو اس رہگذر پر سے جو سامنے کھیتوں میں سے ہو کر جاتا ہے لے گئے تھے۔ بے چاری کھڑکی کس قدر تنہا ہو گئی تھی کیونکہ باجی کے بعد میں نے بھی اس کھڑکی میں کھڑا ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اور باجی کے نیلے نیلے پھول؟ وہ اب احتیاط سے امی کے بڑے صندوق میں پڑے ہیں۔ اس صندوق کو کوئی نہیں کھولتا۔ وہ ایک کونے میں پڑا رہتا ہے لیکن میں کبھی کبھی اس کے قریب سے ہو کر گزرتی ہوں۔

"باجی معلوم ہے کون سا موسم ہے؟"

"کون سا؟"

"دیکھو تو بہار آچکی ہے!"

"تو پھر؟"

"چمکیلے پروں والے پرندوں کے گیت فضا میں لہرانے لگے ہیں!"

"تو پھر؟"

"شاخیں پھولوں سے بوجھل ہو گئیں!"

"باجی! بہار جا رہی ہے"

"شفتالو کے پیڑوں میں پھل آگیا"

"گھاس کی مخملیں ہریالی بنسری بجانے والے چرواہوں کے قدموں سے پامال ہو چکی"

"پھولوں کی پتیاں گر رہی ہیں"

"میں تنہا اپنی کھڑکی میں کھڑی بہار کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔

کیا اب کی بہار میں باجی نہ دیکھ سکوں گی؟"

محمد حسن خان کھامگانوی
ایم۔اے (عثمانیہ) از ڈھاکہ

"براری اردو"

برار کے نام سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا آدمی ناواقف ہو۔ برار اور کپاس دو مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ برار کے متعلق یہ مشہور ہے کہ برار سونے کا گھر۔ آب و ہوا، پیداوار، نسل، زرخیزی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ربیع و خریف ہر دو فصلیں عمدہ ہوتی ہیں۔ واقعی یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برار رمینتی کا وطن بھی تھا اور مشہور سنسکرت ڈرامانگار بھوبھوتی کے جنم بھوم ہونے کا شرف بھی اسی سرزمین کو حاصل ہے۔ محمود غزنوی کا جانشین آج بھی یہیں آرام فرما ہے اور اس کا عرس نہایت تزک و احتشام سے ایلچپور میں منایا جاتا ہے۔

برار چار اضلاع پر مشتمل ہے بلڈانہ، اکولہ، امراوتی اور ایوت محل۔ آریاؤں کے قبضۂ ہند کے بعد دراوڑ بندھیاچل پار کر کے ادھر بس گئے تھے چنانچہ عرصے تک صوبہ متوسط میں ان گونڈوں کی حکومت رہی جو دراوڑوں کی اولاد تھے۔ رفتہ رفتہ آریاؤں کی یلغار کے ساتھ دراوڑ جنوب مشرق کی طرف سمٹتے گئے۔ آندھرا خاندان نے چار سو پچاس برس تامل ناڈ اور آندھرا دیس پر حکومت کی ہے غالباً منوں کے حملے کے بعد یہ لوگ جنوب میں تیزی سے منتقل ہوتے گئے۔

پہلا مسلمان بادشاہ علاؤالدین خلجی تھا جس نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ رامچندر کو مجبور کر کے شہر ایلچپور پر قبضہ کر لیا اس وقت سے دہلی مرکز سے اس کے تعلقات شروع ہوئے مگر پھر خاندان بہمنیہ کے زمانے میں مرکز سے منقطع ہو گیا۔ فتح اللہ نے ۱۴۸۴ء میں سب سے پہلے سلطنت بہمنیہ سے علیحدگی اختیار کی اور عماد الملک کے لقب سے تخت نشین ہوا اسی لئے اس کا خاندان عماد شاہی خاندان کہلاتا ہے ۱۵۷۴ء میں برار نظام شاہی خاندان کے زیرنگین آ گیا۔ ۱۵۹۶ء میں مراد بن اکبر اعظم نے احمد نگر پر حملہ کیا چاند بی بی نے برار دے کر صلح کر لی اس وقت سے سلطنت مغلیہ کا جز بنا رہا جب انحطاط سلطنت مغلیہ سے فائدہ اٹھا کر نظام الملک آصف جاہ نے ۱۷۲۴ء میں اعلان خود مختاری کیا تب سے برار آصف جاہی سلطنت کا حصہ رہا حتیٰ کہ ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی وائسرائے نے امدادی صلح کے عوض علاقہ برار سلطنت انگریزی میں شامل کر لیا۔ پھر ۱۹۰۳ء میں یہ دوامی پٹے پر دیدیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں برار پر نظام حیدر آباد کا حق تسلیم کیا گیا (؟) ولی عہد کو پرنس آف برار کا لقب دیا گیا۔ ایجنٹ برار کا عہدہ قائم ہوا اور گورنر صوبہ متوسط کے تقرر میں نظام کا مشورہ بھی شامل کرنا طے پایا نیز ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ نظام کو دینے کا فیصلہ ہوا تھا مگر انتظام و انصرام سب کچھ انگریزی رہا۔

براری اردو کے متعلق سب سے پہلے چند باتیں ذہن نشین کر لینا چاہئے اوّل یہ کہ ہر ملک کی علمی اور ادبی زبان ایک ہوتی ہے مگر بول چال کی زبان مختلف علاقوں میں مختلف ہوتی ہے گو اس کے قواعد صرف و نحو ایک ہی ہوتے ہیں مگر مقامی رنگ اس پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ اس کی علحدہ حیثیت تسلیم کرنی پڑتی ہے مثلاً انگریزی کو لیجئے علمی ادبی زبان کنگز انگلش ہے جو لندن آکسفورڈ کیمبرج کے علاقے کی زبان ہے مگر اسکاٹلینڈ آئرلینڈ ویلز وغیرہ کی زبان مختلف ہے اسے چاہے آپ زبان کے بجائے بولی کہہ لیجئے، فارسی کا بھی یہی حال ہے شیراز و اصفہان کی زبان

ہے دیگر علاقوں کی زبان اس سے مختلف ہے یہی حال اردو کا ہے لکھنؤ اور دہلی کی زبان مستند ہے (مگر تھی) مگر خود دہلی کے گرد و نواح
مختلف ہے اسی طرح لکھنؤ کے قدیم گھرانوں کی زبان مستند ہے بقیہ حضرات پوربی بولتے ہیں براری اردو کا دکنی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ
کے زمینداروں کی سی زبان ہے، مگر براری رنگ کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مسلمانانِ برار کی مادری زبان اردو ہی ہے یہاں
ہے۔ جیسے سندھی مسلمانوں کی زبان سندھی، سرحدی کی پشتو، پنجابی مسلمانوں کی پنجابی اور بنگالی مسلمانوں کی بنگالی بلکہ راجستھان کی اپنی بولی
ہے بہت سے مسلمان بھی وہیں کی ہندی کی شکلیں بولتے ہیں۔ اسی لئے یہاں ذریعۂ تعلیم بھی ازابتدا تا میٹرک اردو ہے۔

لب و لہجہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ بھی مختلف ہے لکھنوی اور دہلوی لہجے کو زنانہ لہجہ سمجھا جاتا ہے وہ لچک اور لطافت (ایک حد تک) یہاں
ہے وہ تیزی و روانی بھی مفقود ہے مگر اتنی کھچاوٹ اور آہستگی کی لٹک بھی نہیں جتنی دکنی میں ہے ان دونوں کا یہاں مذاق اڑایا جاتا ہے۔

۔۔۔ دہلی کا قبول خداداد ہے۔

ہمارے لئے یہ امر ضروری ہے کہ ان مقامی بولیوں میں جو طریقۂ اظہار، امثال، یا الفاظ عمدہ ہوں انہیں اردو میں مستعمل کر دیا جائے اس طرح
کی وسعت اور ہمہ گیری زیادہ ہوگی۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے ہندلسانیت کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر افسوس ان کی ایک
... نگی اور یہ ہندو مسلم ملاپ کی نشانی اب بالکل دوسرے راستے پر پڑ چکی ہے اُدھر ہندی ہے اِدھر اردو۔

ری تلفظ: ۔ ز کا تلفظ ج، ش کا س اور برعکس بھی، ق کا ک (مگر بہت کم) اور خ کا کھ ہوتا ہے، ضمایر میں میرے کو (مجھے) تیرے
(تجھے)، یا میکو تیکو مستعمل ہے "اپن" مرہٹی کا ہے۔ بعض اسما کی جمع الف نون سے بنائی جاتی ہے مثلاً آدمیاں، عورتاں، گدھیاں مگر مثل دکنی
سے بالاں سر سے سراں، کام سے کاماں نہیں بولتے۔ لکڑیاں کا تلفظ لک ڑی یاں نہیں ہوتا بلکہ لک ڑیاں ہوتا ہے بعض وقت اسما
ساتھ افعال وغیرہ کی بھی جمع آتی مگر شاذ مثلاً مچھلیاں سڑیاں ہوئیاں ہیں۔
آ کی آواز کو آ کر دیا ہے مثلاً آدمی کو آدمی، جانور کو جنور، آسمان کو اسمان (مثل دکنی کے ہے) افعال میں جان دے بمعنی جانے دے، کھان دے
... کھانے دے، مرن دے، مرنے دے، کر کے بمعنی اس لئے، ان اور کدھی کبھی، جد بمعنی جب۔ ہو بمعنی ہاں، ا، ایو، اسے لو، دیلو بمعنی دو
لیتے ہیں۔

اب ذیل میں مختلف زبانوں کے الفاظ کی چند مثالیں دی جاتی ہیں اُس شکل میں جس میں بولے جاتے ہیں۔

فارسی: ۔ فارسی الفاظ اپنے غلط تلفظ کی وجہ سے اتنے مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کی اصلیت معلوم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کرج وام
(قرض وام) گھدا = قدح، جانوسہ (جائے نشستہ وہ جگہ جو دولہن والے برات کو ٹھہرنے کے لئے دیتے ہیں) الپ = علف (قسم چارے کی جو
جوسی بنولہ وغیرہ کی ملاکر بنایا جاتا ہے) گمجے = غمزے (تعجب ہے کہ عورتیں ہی استعمال کرتی ہیں) ہجر = فجر، صبو = صبح، بانگاہ = بارگاہ
اسان = احسان، پھرماس = فرمائش (یہ لفظ بھی میں نے عورتوں سے سنا) ما پھ = معاف، ایسپ گول = اسپغول، وکرتہ = وقر (عورتیں
بولتی ہیں) نباب = نواب، سرئی = شرعی، پاجامہ اب صرف مردانہ پاجامے کو کہا جاتا ہے۔ بعض الفاظ نے اپنے معنی بدل دیئے ہیں اور
اضافی معنی ان کے ہو گئے ہیں مثلاً اثر = سایۂ بھوت پریت کا ازار = بمعنی زنانہ پاجامہ۔ مال تجار = دولتمند ملک التجار سے ۔۔۔ بدنظر

محمد حسن

طرزِ گفتار۔

انگریزی: انگریزوں سے میل جول سے کم گمان کی حکومت کی وجہ سے زیادہ تر زبان مخلوط ہوئی ہے۔ صدہا الفاظ ہندی لب و لہجہ میں جاتے ہیں برار کی اردو میں ملاحظہ ہوں۔ اب وہ ہماری زبان کے الفاظ ہیں کیونکہ ہمارے قواعد کے زیر اثر ہیں ان کی شکل بدل گئی ہے ورنہ عوام نے "اردوا" لیا ہے۔

لال ٹین = لینٹرن، سگڑی = سکریٹری، کورٹ COART، جج صریت = مجسٹریٹ، اپھیسر = آفیسر، بیس کلاس = فسٹ کلاس، لیسن = لائسنس، کنٹرول = کنٹرول، پھارم = فارم، بالسٹر = بیرسٹر، پی تک = پبلک، کارٹ = کارڈ، ٹیمن یا ٹھیمن = ... اج نیر = انجنیر، پور بوزن چورہ رود Power، ٹیم = ٹائم، اومی ٹیس، اسٹیشن، جانا سل = ... الفاظ تانیث بھی یوں ہوتی ماسٹر/ماسٹرنی، کمپوڈر/کمپوڈرنی۔

مرہٹی: ہندوؤں کی زبانِ مادری مرہٹی ہے۔ سوائے مارواڑیوں، کلالوں اور بڑواروں کے ... کی ایک قسم ہے ان کے سینکڑوں الفاظ بلا تکلف بولے جاتے ہیں بلکہ ان کو بھی اردو بنا لیا ہے۔ گمت = تماشا، بھاڑا بمعنی کرایہ، کاڑنا = نکالنا، سدا = ہمیشہ، بھلتا بہ معنی کچھ بھی، حرکت نہیں = مضائقہ نہیں، مثلاً وہ پیسہ کال دے دیا کچھ حرکت نہیں۔ سمور = سامنے، موکلا = آزاد یا کھلا ہوا، ایکھادا = ایک آدھ، سوسنا = برداشت کرنا۔ جاسٹی = زیادہ، کھولی = چھوٹا کمرہ، سے جاری = پڑوسی، ہلو = آہستہ، رکاما = مثلاً یہاں کون رکاما ہے تیرے ہاں آنے کو، تراس = سستی، بن گھور = بغیر کسی ڈر یا ہچکچاہٹ کے، نہیں پرتا = کافی نہیں ہوتا۔ بھاڈ = جھگڑا الجھن، ملاکھات لینا = ملاقات کرنا۔ نرالا ہے = مختلف ہے

امثال مرہٹی: پہلے بے بھٹو بعد اٹھوبا یعنی پہلے پیٹ پوجا بعد ازاں رام پوجا، آدلیا جے دیوالا پیسہ جاادو۔ دمڑی کے دیوتا پیسے کا عود وغیرہ دورانِ گفتگو میں بول دیئے جاتے ہیں۔

محاوراتِ بیگمات: ہر ملک میں عورتوں کی زبان مردوں کی بہ نسبت زیادہ رواں سلیس اور با محاورہ ہوتی ہے مرد کی زبان تو مخلوط ہو جاتی مگر عورت کی زبان ٹکسالی ہی رہتی خصوصاً اسلامی ممالک میں جہاں پردہ شرعاً عاید ہوتا ہے۔ برار کی خواتین کے محاورات و الفاظ و کنایات ملاحظہ

پیلک کی گانٹھ اٹھے جھاڑو پھرے۔ آگ لگے اجڑ جائے موئے، کاٹے مٹی میں مل جائے وغیرہ کلماتِ بددعا ہیں۔ حرام پیٹ = پھوہڑ عورت، پیٹ ٹھنڈی، پھس نصیب = بہشت نصیب، بڑا نامہ = قرآن شریف، کچھ ہو گیا، بھوت چمٹ گیا۔ کرنی شگن = شگون، تھوڑے میں بڑا = مفلسی میں آٹا گیلا (یہ بھی کہتی ہیں اور یہ بھی نیستی میں برخورداری)، کچھ بھی نا بمعنی جن، بیل عموماً رات کے وقت سانپ کو کہتی ہیں رسی سے مراد بھی سانپ ہے، پکا پپیا = چالاک آٹھوں گانٹھ کمیت، کال پڑے = نہ دیوے۔ یوں بھی کہتی ہیں کال کے مارے۔ لگانا = چغلی کھانا اور لاؤ لگائی بھی کہتی ہیں، جا اور ماں اُوت ماں کلمات بطور عادیا پرایل پاڑنا = نخرے کرنا، ٹپ ٹوینڈا ...

زنانہ لوریاں اور گیت بھی ایسے ہوتے ہیں جن کا سر نہ پیر اور گائے جاتے ہیں اس طرح کہ معلوم ہو بلیاں مختلف آوازیں نکال رہی ہیں نہایت مضحکہ خیز ہوتے انمل بے جوڑ مثلاً گتا پاؤں کی جوتوں چاہے جہاں چلی جائے، یا پھر امر سے صنم کو جوتوں کا سوگ (شوق) ہے

محمد حسن

اری امثال :- گھر نہ دار چادڑی بٹاڑ (بطور طعنہ جس کا کوئی گھر نہ ہو بجز چادڑی کے) باپ دادے سیتن کے راج میں اُپڑے بلجے پتیاں کے راج میں یہ بات نصیب ہوئی جو باپ دادا کے ملی نہ ہوئی۔ گاڑی کے ساتھ نلے کی بھی جتیر (جاترا) ہوتی ہے۔ یعنی بڑے کے ساتھ چھوٹا (مفت پڑ بھی) ہی مستفید ہوتا ہے۔ جس کا ہاتھ ٹوٹے گا اسی کے گلے میں بندھے گا۔ یعنی اپنے نقصان کا وہی ذمہ دار ہوگا۔ کیڑے (گاؤں) میں چڑی (چیں) آنکھوں میں کیچڑ رہتی ہما سہاگن، کام چور نوالے حاجر (حاضر) ہچوس کا ہلانا اور چھچے کی صحبت (خوب مثل ہے)

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

یسی ہوئی کھدرت (قدرت) پیاج (پیاز) کو لگی ادرک۔ تولے کی ہیری لگا رے کی تیر (عمدہ مثل ہے یعنی جو تیار رہے وہ میری جو ابھی بنی نہیں وتیری)۔ ہر ایک اپنی روٹی پر دال کھینچتا ہے۔ بھالارن (دھاکی) روٹھے گی اپنے بھول سنبھالے گی (عمدہ مثل ہے)۔ مثل مانی روٹھے گی اپنا بھاگ لے گی۔ م کے بڑے ہاتھ ہیں کتھیل (دھاتقلمی) کے کرڑے یعنی نام موٹا اور درشن کھوٹا۔ پیسے کی ہیکو (ہینگ) رتا سا دیکھو۔ تمام تماشے روپے سے ہیں۔ چت بھی میری بٹ بھی میری جو ہر طرف اپنی ہی بات ثابت کرے۔ میں بھی رانی تو بھی رانی کون بھرے گا پانی (یعنی جب ہم دونوں اس بات پر اکڑ گئے ہیں تو پھر کام کون کرے گا۔ اچھی مثل ہے) گھر گھر مٹی کے چولھے۔ یعنی سب کی ایک حالت ہے۔ نہ داں نہ دھواں بی بی مارے جُماں یعنی گھر میں نہ آگ جلتی نہ کھانا پکتا بیوی جوئیں مارتی ہیں بیکار ی میں۔ ماں مرو ماؤنسی (خالہ) جیو۔ خالہ کی محبت ماں سے بڑھ کر ہو تو کہتے ہیں (زنانہ محاورہ)

بعض الفاظ اپنے مفہوم کے خلاف بولے جاتے ہیں مثلاً ناحق کے لئے بیناک یا حق۔ بے گھبل۔ بے فضول خالص کے لئے خالص بطال۔ بے ایمان کو کہتے ہیں۔

بعض اور محاورات :- ہت اس کی۔ افسوس کے وقت بولتے ہیں تری کیا بشاط (بساط) تری کیا اوکات (اوقات)۔ منہ پر بولنا۔ سامنے بولنا۔

مردوں عورتوں کے بعض عجیب و غریب نام پیش کئے جاتے ہیں :- جلیبن بی بی۔ زیتون بی بی۔ چاندبی (چاند بیگم) گلشاں بی صندل بی، مختوم بی، جڑاؤ بی کلسم (کلثوم) ریاست بی، امراؤ بی، اعلیٰ بی، خاتون بی، عمدہ بی، نادان بی۔

مردوں کے نام :- شیخ نکو، ممّو بیگ، سید چھپڑو، دو دھے خاں، شیخ بلبل، گنگا خاں، خان محمد، داغ علی، ان کا تلفظ خاصت اور ڈھیلی ہے۔

سب سے عجیب بات یہ ہے جو بعد میں مجھے حیدرآباد دکن جانے پر معلوم ہوئی۔ گلّی ڈنڈا کھیل جسے برار میں ایٹی ڈانڈو کہتے ہیں اس میں گنتی و کنڑ (ایک رونڈ و مونڈو نالو احید ابار سے ہوتی اور یہ سب تلنگی زبان کے اعداد ایک دو تین چار پانچ چھ سات ہیں۔ صحیح یہ ہیں اوکٹی ۱۔ رندو ۲، نالو ۳، ایدو ۔ ۴، ایدو پانچ وغیرہ۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ یہ الفاظ کیوں کر باقی رہ گئے لطف یہ کہ ہندو مسلمان دونوں اسی طرح بولتے ہیں شاید یہ دراوڑی زمانے کی یادگار رہ گئے۔

اب کنی اور براری کا فرق ملاحظہ ہو مگر افسوس کہ یہ سننے سے تعلق رکھتا ہے ورنہ لب و لہجہ اور تلفظ کا فرق سمجھنا دشوار ہے اسی سلسلہ میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ جو اردو خاندیس، احمدنگر، پونہ کے مسلمان بولتے ہیں وہ براری اردو سے مختلف ہے اس پر مرہٹی بہت چھا گئی ہے۔ دوم برار کے شہری حلقوں کی زبان جیسا کہ اصول ہے مستند اردو ہی ہوتی ہے۔ اور اس مضمون میں دہلی کی زبان سے اختلافی الفاظ و محاورات ہی کو لکھا گیا ہے مشترک کو نہیں۔

محمد حسن ستمبر ۱۹۵۰

ہجرت

جب دو بہاری ملیں گے گفتگو اس طرح ہوتی ہے۔

کالو:۔ سلام آلے کوم۔

شیخ بابا:۔ و آلے کوم سلام کالو بھی میں تمہاری طرح بھی (تمہارے پاس ہی) آنا تھا تمہارے کھسر نے سندلیسہ بھیجا ہے سلام دعا کہ دینا۔

کالو:۔ کھیریت ہے نا حال چال تو ٹھیک ہے۔

شیخ بابا:۔ اللہ کا بھل (فضل) ہے۔ اور کیسے کیا اچھا سلام آلے کوم۔ اب میرے کو گھر جانا ہے۔

دکنی ملاحظہ ہو:۔

کیا ہیں کدھر ہیں بابا صاحب، میرے کو معلوم نہیں تم میرے سسرال سے آئے کتے ناجی۔

ہو بابا میرے کو بولیں کہ دعا سلام کہہ دینا سو تمے بول دے رئیں۔

اَور کیا کی حال ہے۔

خوب اللہ کا بچال ہے۔

محمد حسن کھامگانوی

چاندنی چوک دہلی کا بیان

جنوبی شاعر مرزا سودا (پیدائش ۱۷۱۳ء) کے اردو شعر

شہر دہلی یوں ہے ہندوستان میں — جیسے ہو نرگس چمن بستان میں

بیچ میں بازار کے اک نہر ہے — آب کوثر کی سی جس میں لہر ہے

دونوں کناروں پر شجر ہیں سایہ دار — جن کے اوپر کیجے طوبیٰ کو نثار

مالنیں سب ان درختوں کے تلے — بیٹھی ہیں پھولوں کے ہاروں کو لئے

جابجا بیٹھے ہوئے صراف ہیں — وہ بھی اپنے کام میں اشراف ہیں

پیسے کی دلی نہیں ہرگز کمی — اپنے گھر کنگال بھی واں ہے غنی

چاندنی چوک اس کے ہے میداں میں — خوب ہے اپنی ادا و آن میں

ہو رہے ہیں وقت سہ پہری جس گھڑی — آکے ہوتی ہے وہاں خلقت کھڑی

بیٹھے ہیں ہر جا بساطی با نشاط — کہتے ہیں اپنی بھی ہے کچھ تو بساط

ہے کہیں پکتا کباب اور قیما ل — جس سے دل میں نوش کا ہووے بحال

اودھر (لوڈھ ہوتا) (کذا) آتیاں [illegible] — کہیں جاویں نہ وہ پہچانیاں

سقہ کہتے ہیں کٹوروں کو بجا — ٹھنڈا پانی ہے پیو دریاؤ کا

خوانچہ والے پھریں ہیں سو بسو — اپنی اپنی وضع کی کر گفتگو

شذرات

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

اس مہینے کا سب سے الم انگیز حادثہ مولوی حبیب الرحمن شروانی رئیس اعظم علیگڑھ و بھیکم پور کے پر ملال انتقال کا ہے۔ مرحوم بہت سی خوبیوں کے جامع اور بہت سی صفات حسنہ کے حامل تھے۔ ریاست اور امارت کے ساتھ نہایت سلجھا ہوا ادبی مذاق رکھتے تھے۔ اور خود بھی ایک فاضل اور عالم انسان تھے۔ تحریر شگفتہ اور شائستہ ہوتی تھی۔ متانت اور سنجیدگی اور زندہ دلی کا پیکر تھے۔ دوسرے امرا کی طرح بھانڈوں، میراثیوں اور نوشادی مصاحبین کی ان کے ہاں کھپت نہ تھی اور رقص و سرود کی محفلوں سے قطعاً بیگانہ تھے۔ مشغلے ادبی مجلسیں اور اخلاقی محفلیں ان کی مرغوب اور دل پسند چیزیں تھیں۔ ساری عمر طالب علم بنے رہے اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی علمی دلچسپیوں میں بسر کر دی۔ سیاست کے خارزار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے مگر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش نظر آئے۔ مرحوم اپنے پیچھے ایک نہایت منظم، نہایت نایاب اور قیمتی کتب خانہ چھوڑ گئے ہیں جو بلاشبہ ایک علمی عجائب خانہ ہے خدا کرے ورثا اسے قائم اور سلامت رکھیں۔

مرحوم موضع بھیکم پور ضلع علیگڑھ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد میں مورث اعلیٰ عمر خاں شروانی کا ذکر فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ موصوف سلطان سکندر لودھی کے معتمد امیروں میں سے تھے۔ اکبر اور شاہجہاں کے زمانے میں آپ کے بزرگ دہلی کی سکونت ترک کر کے بھیکم پور چلے آئے تھے۔ آپ کے والد کا نام نواب محمد تقی خاں تھا۔ آپ کی پیدائش کا سال ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء ہے۔ مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولوی عبد الغنی خاں فرخ آبادی سے آپ نے عربی علوم و فنون کی تحصیل کی۔ شیخ حسین محدث بھوپالی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ قرأت اور تجوید کا فن مولانا قاری عبد الرحمن محدث پانی پتی سے حاصل کیا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی کا علم بھی آپ کا وسیع تھا۔ غرض آپ ایک متبحر عالم اور ایک فاضل ادیب تھے۔ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا اور حسرت تخلص کرتے تھے۔ اس فن میں استاد یگانہ منشی امیر احمد مینائی سے آپ کو تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ مدتوں رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر رہے اور نہایت اعلیٰ علمی مضامین اس میں لکھے۔ ندوۃ العلماء کے رکن، علیگڑھ کالج کے ٹرسٹی اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مدتوں آنریری سکرٹری رہے۔ کانفرنس کی سکرٹری شپ کے زمانے میں ایک علمی رسالہ کانفرنس گزٹ آپ کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک حیدرآباد کے محکمہ امور مذہبی کے صدر الصدور رہے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں چند سال جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے۔ حیدرآباد میں نایاب عربی کتب کی اشاعت کے لئے ایک نہایت شاندار مجلس "دائرۃ المعارف" کے نام سے قائم تھی آپ اس کے ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ نظام دکن نے آپ کو ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب دیا تھا جو ہمیشہ آپ کے نام کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ نے اپنا نہایت شاندار اور لاجواب کتب خانہ جو بہترین عربی و فارسی مخطوطات اور مطبوعات پر مشتمل تھا بھیکم پور کے قریب موقع حبیب گنج میں قائم کیا تھا۔ خود آپ کا قیام بھی اسی جگہ رہتا تھا۔

آپ کی تصنیفات میں بہترین کتاب علمائے سلف ہے۔ جس میں علمائے قدیم کے نہایت سبق آموز علمی، مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب صاحب کے نہایت وسیع مطالعے کا حاصل ہے۔ اور بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ آپ کی دوسری قابل قدر تصنیف نابینا علما ہے جس میں آپ نے ان فضلا کے حالات لکھے ہیں جو نور بصارت سے تو محروم تھے مگر دولت علم سے مالا مال تھے۔ سیرۃ الصدیق آپ کی تیسری تالیف ہے۔ اور راقم کے خیال میں حضرت صدیق اعظمؓ کی اردو زبان میں بہترین سوانح عمری ہے۔ ذکر جمیل اور ذکر حبیب دو چھوٹے چھوٹے رسالے حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی آپ کے لکھے ہوئے ہیں جو آپ نے مفت تقسیم فرمائے تھے۔ آپ کی ایک اور کتاب بھی ہے جس کا نام ہے "احکام اسلام کی پابندی کا اثر علمائے کرام کی زندگی پر" یہ مراسل مضمون ہے جو مولوی وحید الدین سلیم مرحوم پانی پتی کے ماہوار رسالہ معارف میں [illegible] میں شائع ہوا تھا۔ مختلف کتابوں پر تبصرے اور مقدمے بھی آپ نے بہت لکھے ہیں۔ کلیات خسرو کا مقدمہ بہترین ہے۔

مرحوم کے انتقال سے دنیا ایک بہت بڑے عالم اور بہت بڑے ادیب سے خالی ہو گئی اور مشکل ہے کہ مستقبل قریب میں اس لیاقت اور حیثیت کا کوئی اور رئیس پیدا ہو۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

حضرت تمکین کاظمی

زہرہ

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

(زہرہ آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ سامنے اسٹول پر شیشے کا پوکھشا رکھا ہوا ہے جس کے بیچوں بیچ میں گلدان ایک خط گلزار میں کاڑھا جا رہا ہے خاکہ سفید سے سے ڈالا گیا ہے آدھے حروف میں سلما لگایا گیا ہے (ماما) دو تین رسالے چند اخبار اور خطوط لا کر زہرہ کو دیتی ہے)

زہرہ۔ (خط پڑھتی جاتی ہے اور چہرہ آہستہ آہستہ غصہ سے سرخ ہوتا جاتا ہے۔ آخر میں کانپنے لگتی ہے) کریم بی! گاڑی منگواؤ میں اماں جان کے پاس جاؤں گی۔

ماما۔ بی بی! ابھی تو تین ہی بجے ہیں، سرکار کے آنے کے بعد جائیے بی کہ آپ چلیں گی نا؟

زہرہ۔ نہیں، سرکار آتے رہیں گے، میں ابھی جاؤں گی، جاؤ جلد گاڑی لاؤ۔

(کریم بی جا کر گاڑی لاتی ہے جوں ہی گاڑی کمپونڈ میں داخل ہوتی ہے عابد دفتر سے واپس آ جاتا ہے اور اپنے کمرے میں جا کر شیروانی اتار کر تولیہ سے گردن صاف کرتا ہوا زہرہ کے پاس پہنچتا ہے)

عابد۔ گاڑی کیوں کھڑی ہے کوئی آئے ہیں کیا؟

زہرہ۔ (منہ پھیر کر) میں نہیں جانتی!

عابد۔ تو گویا سرکار خفا ہیں؟

زہرہ۔ جی نہیں، اور خوش ہوں گی، آپ نے کام ہی تو ایسا کیا ہے!

عابد۔ میں نے کیا کیا؟

زہرہ۔ اللہ اللہ! بیچارہ کچھ جانتا ہی نہیں، کتنا بھولا بھالا۔

عابد۔ ذرا صاف کہو؟

زہرہ۔ صاف کہوں؟ تمہیں کچھ لحاظ بھی ہوتا ہے!

عابد۔ لحاظ کا ہے کا!

زہرہ۔ اللہ ری بے حیائی! اُف ری بے غیرتی! پوچھتے ہیں لحاظ کاہے کا؟ خدایا! تو نے کیسے کیسے بے شرم پیدا کئے۔

عابد۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کبھی کچھ نہیں ہو مگر لحاظ شرم گنا رہی ہو؟

زہرہ۔ بات یہ ہے کہ آج تمہاری چوری پکڑی گئی! تم تو کہتے تھے کہ پہلے جو کچھ ہو چکا ہو چکا شادی کے بعد سے میں نے توبہ کر لی ہے، اب یہ کیا ہے؟

عابد۔ کیا کہا! ذرا صاف صاف کہو؟

زہرہ۔ صاف صاف کہوں؟ ابھی اُڑیں گے آپ! اتنا جلد کیوں سمجھیں گے!

عابد۔ کسی نے تمہیں مذاق سے کچھ باور کرا دیا ہے اور تم خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو!

زہرہ۔ جی ہاں مذاق ہے! آپ کی چہیتی کا خط میں نے پا لیا ہے سب حال معلوم ہو گیا!

عابد۔ میرا خط؟ میرا لکھا ہوا؟

زہرہ۔ جی نہیں! آپ کا لکھا ہوا خط مجھے کیا ملے گا مگر آپ کی

راحتِ جان کا لکھا ہوا خط اتفاقاً مجھے مل گیا ہے۔

عابد۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کس کا خط؟ نام تو بتاؤ؟

زہرہ۔ اچھا تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بہت سی رانڈوں کو گھیر رکھا ہے اب سوچ رہے ہیں کہ ان میں سے کس کا خط مجھے ملا ہو گا؟

عابد۔ دیوانی عورت! ذرا تفصیل تو سنا۔

زہرہ۔ ہوشیار مرد! یہ ہے تیری محبوبہ کا خط جو میرے نام خط لکھتی ہوئی تیرے لئے بھی تسکینِ دل کا نسخہ رکھ دیتی ہے۔

(زہرہ میز پر سے ایک لفافہ اٹھاتی ہے اور عابد مسکرا کر کہتا ہے)

عابد۔ یہ تو غوثیہ کا خط ہے!

زہرہ۔ آخر اپنی محبوبہ کا خط پہچان لیا نا!

عابد۔ دیوانی عورت! غریب غوثیہ کو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں آخر وہ تمہاری ہی عزیزہ قرابت دار ہے نا، بھلا میں اس کی نسبت کوئی برا خیال کر سکتا ہوں۔

زہرہ۔ جی نہیں آپ صرف عاشقی کریں گے! برا خیال کیوں کرنے لگے!

عابد۔ توبہ کرو زہرہ!

زہرہ۔ توبہ ہے توبہ! ایسے نیک شوہر سے!

عابد۔ اچھا وہ خط تو مجھے دکھاؤ!

زہرہ۔ اجی ابھی ابھی دوپہر کی ڈاک سے یہ خط آیا ہے نیک بخت نے مجھے خط لکھا ہے اور ایک چٹھی اپنے پیارے کے نام بھی اسی میں رکھ دی ہے اور کس بھولے پن سے لکھا ہے کہ "بہن! یہ چٹھی دولھا بھائی کو دے دینا۔"

(عابد لفافہ کھول کر اس میں سے چٹھی نکال کر پڑھتا ہے۔ چہرہ زرد پڑ جاتا ہے پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آتے ہیں اور مضطرب ہو جاتا ہے)

زہرہ۔ (ہاتھ بڑھا کر عابد سے چٹھی چھین لیتی اور اسے پڑھتی ہے)

میرے پیارے!

کل تمہارا کوئی خط نہیں آیا، آج کی ڈاک بھی خالی گئی۔ ایسے کیا مصروف ہو کر اپنی غوثیہ تک کو بھلا بیٹھے۔ اگر کل مجھے کوئی خط نہیں ملا تو میں پرسوں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اور ایسی سخت سزا دوں گی کہ گزشتہ سزاؤں کو بھول جاؤ گے فقط

صرف تمہاری غوثیہ

(روتے ہوئے) لو اب بھی کوئی بہانہ تراش لو، پہلے بھی تین خط ایسے آئے ہیں جن میں تمہارے نام کے بند لفافے تھے جو میں نے تمہیں دے دیئے اور خبر تک نہ ہوئی کہ ان میں کیا لکھا تھا مگر آج تو کھلی چٹھی ہی اس نے بھیج دی اُف ری بے حیا عورت!

عابد۔ زہرہ! یقین مانو اس میں غلطی ہو گئی ہے۔ غوثیہ نے شاید اپنے شوہر کو یہ چٹھی لکھی ہے جو غلطی سے تمہارے خط میں ملفوف ہو گئی ....

زہرہ۔ (بات کاٹ کر) ورنہ وہ تمہیں علیحدہ لفافہ بھیجتی تاکہ میں واقف نہ ہو سکوں کیونکہ اب تک ایسا ہی ہوا ہے۔

عابد۔ اب میں کیا کہوں؟ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا! زہرہ! غوثیہ نہایت شریف لڑکی ہے تم خواہ مخواہ اس کی طرف سے بدگمان ہو

(زہرہ سر پیٹ کر رونے لگتی اور ماں کے گھر جانے کو تیار ہوتی ہے عابد سمجھاتا ہے مگر مانتی نہیں اسی حالت میں ماما گھر میں داخل ہوتی ہے)

ماما۔ سرکار! غوثیہ بیگم کے دولھا میاں آئے ہیں۔

عابد۔ ہاں! ہاں!

زہرہ۔ (جھپٹ کر میز پر سے خط اٹھا لیتی اور جلد جلد آنسو پونچھنے لگتی ہے۔ غوثیہ کا شوہر کمرے میں داخل بھی نہیں ہونے پاتا کہ گھبرائی ہوئی پوچھتی ہے) آہا! دولہا بھائی! کب آئے؟

غوثیہ کا شوہر۔ ابھی ابھی سیدھا اسٹیشن سے چلا آ رہا ہوں! (عابد سے مخاطب ہو کر) عابد بھائی! غوثیہ کا کوئی خط آپ کے پاس آیا ہے۔

عابد۔ (پریشان ہو کر زہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور زہرہ کی آنکھیں غصّے سے چمکنے لگتی ہیں اور وہ عابد کو گھورتی ہے) کیوں بھائی! یہ کس لئے پوچھ رہے ہو آج ہی غوثیہ کا خط زہرہ کے پاس آیا ہے!

غوثیہ کا شوہر۔ زہرہ بیگم کے خط سے غرض نہیں آپ کے نام کوئی غوثیہ کا خط؟

عابد۔ ہاں ہاں زہرہ کے مرسوم خط میں میرے لئے بھی شاید ایک چیٹھی تھی!

غوثیہ کا شوہر۔ وہ مجھے دے دیجئے!

عابد۔ کیوں؟

غوثیہ کا شوہر۔ مجھے ضرورت ہے!

عابد۔ ایسی کیا ضرورت ہے؟

(زہرہ کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے ہیں اور وہ غصّے سے عابد کو گھورتی ہے)

غوثیہ کا شوہر۔ (زہرہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) واللہ بڑا پرلطف نظارہ ہے۔ اسی نظارے کی سیر کی خاطر میں اپنا کام خراب کر کے بھاگا ہوا آ رہا ہوں۔

زہرہ۔ دولہا بھائی! تمہیں شرم نہیں آتی، بڑے بے حیا ہو، تمہیں اس چیٹھی کا حال معلوم ہے؟

(عابد کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ رومال سے پسینہ پونچھنے لگتا ہے)

غوثیہ کا شوہر۔ ہاں ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہے یہ چیٹھی "میرے پیارے" سے شروع ہو کر صرف "تمہاری" پر ختم ہوتی ہے۔

زہرہ۔ اُف، حیا، غیرت، شرم، شرافت سب چیزیں دنیا سے اٹھ گئیں۔

(عابد آہستہ آہستہ کمرے سے جانے لگتا ہے مگر غوثیہ کا شوہر اسے روک دیتا ہے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکال کر زہرہ کو دیتا ہے)

زہرہ۔ دولہا بھائی! یہ تو غوثیہ کا خط ہے آپ کے نام۔

غوثیہ کا شوہر۔ یہ تو لفافے ہی سے معلوم ہو رہا ہے، اندر سے خط نکال کر پڑھو!

(زہرہ لفافے میں سے خط نکال کر پڑھتی ہے، آہستہ آہستہ غصّے کے آثار دور ہو جاتے ہیں، پیشانی کی شکنیں مٹ جاتی ہیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے، چہرے پر ایک اطمینان اور بشاشت کی لہر دوڑ جاتی ہے، خط پڑھنے کے بعد واپس کر دیتی ہے)

[عابد حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور غوثیہ کا شوہر مسکراتے ہوئے زہرہ کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اس میں سے چیٹھی نکال کر آواز سے پڑھتا ہے]

"عابد بھائی!

آج جون کی ۱۲ تاریخ ہے مگر آپ نے اب تک اس مہینے کے رسالے نہیں بھیجے۔ مخزن، ماہِ نو، اور نگار جلد روانہ کیجئے، چراغ اور ایوان سے فلمی پرچوں کے

تمکین کاظمی

روانہ کرنے کی زحمت نہ کیجیے، معارف میں کوئی دلچسپ

مضمون ہو تو روانہ کیجیے فقط

خادمہ خورشید

خورشید کا شوہر۔ آج صبح مجھے یہ خط ملا لفافے پر میرا نام اور پتا

اندر عابد بھائی کے نام کا خط، میں نے پہچان لیا تھا کہ عابد

بھائی کو میرے نام کا خط گیا ہوگا، میں دعا کر رہا تھا کہ یہ خط

کسی طرح زہرہ بیگم کے ہاتھ لگے اور دونوں کی کشمکش میرے

سامنے ہو۔ شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔

[زہرہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی جاتی ہے اور

ماما کو چائے لانے کے لئے کہتی ہے۔ عابد اطمینان

سے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ جلاتا ہے اور خورشید کا شوہر

ہنستا ہے]

(پردہ)

تمکین کاظمی

مخزن (اگست) پر "قومی زبان" کا تبصرہ

(اس قسم کے تبصرے مضمون نگاروں کے استفادے کی غرض سے بھی نقل کئے جاتے ہیں)

"پہلا مضمون جناب عبدالغنی صاحب نے مرزا عبدالقادر بیدل کی مثنوی "طور معرفت" کی تعریف و تشریح میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ "طور" نواح دہلی میں اراولی پربت کی ایک پہاڑی ہے جہاں مرزا پر "الہام" کی بارش ہوئی اور انہوں نے یہ معارف کے دریا بہائے۔ وہ خیال آفرینی کے بادشاہ بلند پروازی کے شہباز ہیں مگر کبھی اتنا اونچا اڑتے ہیں کہ اہل زمین کی نگاہ پہنچنے سے رہ جاتی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کستائش ہیں کہیں کہیں شاعرے کی داد کا مزہ آجاتا ہے۔ ایک جگہ غالب کا یہ قطعہ نقل کیا ہے

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

اور مقابلے میں مثنوی کے اس شعر کو ترجیح دی ہے

شگفتن بس کہ لبریز است ایں جا — زمیں تا چرخ گل خیز است ایں جا

شعر تکلف سے خالی نہیں اور استعارہ محض خیالی ہے۔ غالب کی رنگین اور بے تکلف تشبیہ سے اسے بہتر سمجھنا ہمیں اغراق پسندی معلوم ہوا۔

ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدائی تشکیل کی حقیقت لکھی ہے "بشیر مرانی" اور "دفتر کی تیاری" پر ظریفانہ مضمون ہیں ایک مزہ دار تمثیل کا شاہد حمید صاحب نے مزہ دار ترجمہ کیا ہے حسب معمول دو ایک افسانے اور چند اچھی نظمیں اور غزلیں رسالے میں شامل ہیں۔

بہرۂ مراسلات میں انجمن ترقی اردو کی کتاب "نیا ادب" کا ذکر آگیا ہے جگن ناتھ آزاد دہلی سے اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ کرل صاحب شکوہ بیجا ہے یہ اسی انجمن ترقی اردو (ہند) کے رکن ہیں جو ہندوستان میں اردو کی قبر کھودنے میں مصروف ہے۔ . . . "انجمن مذکور کی مصروفیت کا حال تو آزاد صاحب ہی بہتر جان سکتے ہیں۔ لیکن کرل صاحب سے ان کی بدگمانی ہمارے خیال میں بے جا ہے"۔

یارانِ نکتہ داں

(بعض حضرات اپنا نام اور پتا لکھے بغیر خطوط اشاعت کے لئے بھیج رہے ہیں۔ ایسے خطوط شائع نہیں ہو سکتے گو ہم کو ایڈیٹر کو مکتوب نگار کا نام اور پتا معلوم ہونا چاہئے)

محمد شمس الدین صدیقی

مخزن (اگست) میں ایک مکتوب نگار نے میرے ڈرامے "جل تو جلال تو" کو چارلس لی کے M.T. SAMPSON سے ماخوذ قرار دیا ہے حالانکہ سوائے سکہ اچھالنے کے اور کوئی چیز ان دونوں ڈراموں میں مشترک نہیں اور محض اس ایک وجہِ اشتراک کی بنا پر ساری تمثیل کو ماخوذ قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے اقبال کے کلام کو غالب سے ماخوذ قرار دینا کیونکہ اقبال نے بھی عشق، جنوں، موسیٰ، خضر، سکندر وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو غالب استعمال کر چکا ہے

مخزن: شمس الدین صاحب صدیقی نے چارلس لی کے ڈرامے کا خلاصہ اس خط میں لکھ بھیجا تھا جو ہم نے حذف کر دیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ چارلس لی کے ڈرامے کا قصہ، کردار اور محرک و موضوع محمد شمس الدین صاحب صدیقی کی تمثیل سے بہت مختلف ہیں۔ اب اس بارے میں غلط فہمی رفع ہو جانی چاہئے

پروفیسر یوسف جمال انصاری

اگست کا مخزن، بہ اعتبارِ منظومات، بہت پسند آیا۔ علی الخصوص جناب جلال الدین اکبر کی مسلسل غزل۔ ایک شعر تو اس غزل کا ہمیشہ یاد رہے گا ــ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا معمّا ہے
کہ مے حرام ہے لیکن غمِ زمانہ حلال

یہ غزل سادگی و پرکاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ مطلع کے پہلے مصرع میں البتہ ابہام ہے۔ ملاحظہ ہو ــ

مہِ صیام ہے میرے لئے مہِ شوال

جناب صدق جائسی کی غزل قدیم رنگِ سخن کا نہایت ہی حسین نمونہ ہے مگر "دلِ نظارگی، کتنا بھی ہو انسان کا دل ہے" محلِ نظر ہے۔ علاوہ ازیں "سماں کا گزرنا" میں نے نہیں سنا۔ گردش کرنا یا گردش میں ہونا مستعمل ہے۔

جناب آثر صہبائی کا ہر شعر کامیاب ہے۔ جناب سرشار کا یہ شعر بے انتہا پسند آیا ــ سوچا جو کچھ دماغ نے مجھ سے نہ ہو سکا

جو دل نے کہہ دیا وہی کرنا پڑا مجھے

"مخزن المخازن" کے زیرِ عنوان غالب کی تخمیس، اور حسرت اور احسن کی غزلیں تعریف و تنقید سے بے نیاز ہیں۔

محترمہ رابعہ نہاں نے میری توجہ اپریل ۱۹۵۰ء کے "مخزن" میں چھپی ہوئی حضرتِ آثر صہبائی کی غزل کی طرف مبذول کرائی۔ اس کا ایک شعر ہے ــ غرقِ نشاط دل ہے، نظر غرقِ رنگ و نور

ہر سمت مشکبار تجھے پا رہے ہیں ہم

واقعی رنگ و نور کو مشکباری سے کوئی تعلق نہیں۔ کیف بار کہتے تو پھر بھی کوئی بات تھی۔ مجموعی طور پر یہ پوری غزل کمزور ہے۔ جولائی کے "مخزن" میں حضرت تاثیر کی ایک نہایت ہی دلنشیں غزل نکلی تھی، مگر رابعہ نہاں صاحبہ نے ایک شعر پر اعتراض بھی بڑی نوک پلک کے ساتھ کیا ہے ــ

تری نیم کش نگاہیں، ترا زیرِ لب تبسّم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریبِ سادہ

نگاہیں نیم کش کب ہوتی ہیں۔ غالباً آپ نے جو تیرِ نیم کش کہا تھا وہ تیر کی رعایت

سے کہا تھا۔ یہ مکڑا رابعہ نہاں صاحبہ نے اس طرح تبدیل کیا ہے کہ

"تیری نیم باز آنکھیں، ترا زیرِ لب تبسم"

ان کا خیال ہے کہ "ادائے مستی" کی جگہ دوسرے مصرع میں "ادائے رنگیں" کہا جائے تو سادہ اور رنگیں کا تضاد نہایت موزوں ہو جائے۔ الغرض رابعہ نہاں صاحبہ نے رائے قائم کی کہ شاید مدیرِ "مخزن" رابعہ نہاں پر تو معترض ہیں مگر مشاہیر کی غزلیں شائع کرتے وقت رعایت برتی جاتی ہے۔ ورنہ بہتر تو تھا کہ ایسا کلام شائع نہ ہوتا۔ یا اب ان شعرا کی توجہ ان اغلاط کی طرف مبذول کرائی جائے۔

مخزن:۔ رابعہ نہاں صاحبہ کا فکریہ۔ مگر شاید شعرائے متذکرۃ الصدر ان اعتراضات کا یہ جواب دیں کہ رنگ و نور کا مشکباری سے کوئی تعلق اس شعر سے بھی ثابت نہیں کیا گیا بلکہ شعر میں الگ الگ تین ایسی کیفیتوں کا اظہار ہے جو محبوب کے کامیاب تصور سے پیدا ہوتی ہیں یعنی محبوب کے تصور سے اغرقِ نشاط ہوا۔ اس کے جلوے کے تصور سے شاعر کی نظر غرقِ رنگ و نور ہوئی اور اسی تصور کی تکمیل سے شاعر نکہت جاناں سے بھی بہرہ یاب ہوا۔ دوسرے اعتراض کا شاید یہ جواب دیا جائے کہ شعر میں نظر کی تیر سے تشبیہ اتنی عام ہے کہ استعارۃً نظر کو تیر سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح تیر کی صفت "نیم کشی" تیرِ نگاہ کے حصے میں بھی آسکتی ہے۔ رابعہ نہاں صاحبہ نے حضرتِ تاثیر کے کلام پر جو اصلاح دی ہے وہ اپنی جگہ موزوں ہے لیکن سادہ اور رنگین کے "تلازم" کے خیال میں وہ یہ بھول گئی ہیں کہ آنکھیں "مست" ہی کہی جاتی ہیں "رنگیں" نہیں کہی جاتیں۔ لہٰذا "ادائے مستی" کی جگہ محض حسنِ تقابل کے لئے "ادائے رنگیں" کو نہیں دی جاسکتی۔

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

جولائی کے مخزن میں آپ نے "نیا ادب" پر جو منصفانہ ریویو لکھا تھا اس کا بہت بھدا سا جواب "قومی زبان" نے اپنے پچھلے پرچے میں دے کر اس مثل کو سچ کر دکھایا کہ

عذرِ نامعقول ثابت میکند الزام را

آپ نے وہ ضرور پڑھا ہوگا۔ غرضیکہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا صحیح مصداق ہے یا نہیں؟

مخزن۔ شاید "قومی زبان" کو بھی آپ کی طرح اس ریویو کے منصفانہ ہونے میں زیادہ شبہ نہ ہو۔ مگر ہمارے واجب الاحترام معاصر کو کسی وجہ سے کول صاحب کا بہت پاسِ خاطر منظور ہے۔ چنانچہ اس نے کول صاحب کی ملکا رلی ہوئی انشا پردازی کے اقتباسات سے آنکھیں پھیر کر الٹا ہماری عمداً نہ گرائی ہوئی ہی کو جنگجویانہ قرار دے دیا۔ آزاد صاحب کے خط (مطبوعہ مخزن) کے جواب میں اب پھر "قومی زبان" نے لکھا ہے کہ کول جی بہت اچھے آدمی ہیں اور ان کی کتاب کے ان اقتباسات کو اب بھی قابلِ گرفت نہیں سمجھا جو "مخزن" میں شائع کئے گئے تھے۔ حالانکہ ان اقتباسات میں "قومی زبان" کے خیال کے برعکس بعض نئے "ترقی پسند ادیبوں" ہی پر نہیں بلکہ خود پنجاب اور اہلِ پنجاب پر علی العموم ایسے فقرے چست کئے گئے تھے جو اردو کی ترقی کے لئے کم از کم ہمیں سودمند معلوم نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ اردو کا مسئلہ نہ ہوتا تو پنجاب پر کول صاحب کے روا یا ناروا حملے "مخزن" کے دائرۂ توجہ سے بڑی حد تک خارج رہتے۔ جیسا ہمارے معزز معاصر نے لکھا ہے، کول جی ضرور بہت اچھے آدمی ہوں گے۔ مگر یہاں ان کی ذاتی خوبیوں سے قطعِ نظر ان کی وہ فرو گذاشتیں زیرِ بحث ہیں جنہیں ان کی کتاب "نیا ادب" شائع کر کے انجمن ترقیٔ اردو نے خود نمایاں کیا ہے۔ "قومی زبان" نے ان کی جو تعریف کی ہے، اس سے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ کول صاحب ضرور اردو کے شیداؤں میں سے ہوں گے اور ممکن ہے کہ لکھنؤ میں پنجابیوں کی اردو کا خاکہ اڑانے کے بعد سرحدیوں، سندھیوں، بلوچستانیوں اور بنگالیوں کی اردو کو بھی تختۂ مشق بنانا، وہاں اردو کو زندہ رکھنے کا کوئی تیر بہدف "نسخہ" ثابت ہو۔ لیکن انجمن ترقیٔ اردو (پاکستان) کو کراچی میں بیٹھ کر یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ اردو کے لکھنوی بہی خواہ کا انداز بہی خواہی پاکستان کے لئے مفید نہیں۔ ہماری رائے میں کول صاحب کی کتاب کے قابلِ اعتراض حصے اس کتاب کے کم از کم پاکستانی ایڈیشن سے ضرور خارج ہو جانے چاہئیں۔ کاش "قومی زبان" خود بخود یک طرفہ فیصلہ صادر کرنے کے بجائے جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کو اس طرف متوجہ کرتا۔

غلام رسول تنویر

جولائی کے مخزن میں میرا ڈراما "اور شوہر بیمار ہو گیا" چھپا۔ جسے آپ نے اداریہ میں بڑے بامعنی انداز سے "ترقی پسندانہ ڈراما" لکھا تھا — آپ اس ڈرامے کے متعلق ایک ترقی پسند ادیبہ محترمہ ہاجرہ مسرور کی رائے بھی سنیئے:

"دراصل آپ ڈرامے کے عروج اور انجام کو اس تیزی سے

دکھاتے ہیں کہ ابتدا کی ساری لطافت زخمی ہو جاتی ہے"

لیجئے ڈراما غیر ترقی پسندانہ قرار دے دیا گیا — اب یہی ابتدا جو محترمہ ہاجرہ مسرور کیلئے لطافت کی حامل تھی آپ کے لئے شاید کثافت کی آئینہ دار ہو گئی اور آپ نے بڑے بامعنی انداز (اداریہ) میں ترقی پسندی کا نام دے ڈالا اور میں توقع سے کہہ سکتا ہوں کہ وہی عروج و انجام جو محترمہ ہاجرہ کو کھٹکے آپ کے لئے لطافت کا باعث ہونگے (کیونکہ غالباً خالص فنی نقطۂ نگاہ سے طویل ابتدائی مکالمہ جس کی آہستہ روی قابلِ اعتراض تھی اسی عروج و انجام کی تیزی سے ڈرامے میں تبدیل ہوتا ہے)

میں نے تو ڈراما سیدھے سادھے انداز میں پیش کیا تھا مگر آپ ناقدانِ ادب نے اسے ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کی ایک اچھی خاصی پہیلی بنا دیا ہے۔ اور اس پہیلی کو میں تو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک ڈراما بیک وقت ترقی پسندانہ اور غیر ترقی پسندانہ کیسے ہو گیا۔ اسی قسم کے سوال کا جواب دینے سے محترمہ ہاجرہ تو کترا گئی تھیں اور انہوں نے تمام بوجھ محترم ندیم قاسمی پر ڈال دیا تھا اور محترم ندیم بھی اس بات کو ادھر ادھر کی باتوں میں اڑا گئے تھے — شاید آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد فرما سکیں اور یا پھر قارئینِ مخزن ہی اس عقدے کو سلجھائیں۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہرگز نہیں (مخزن) [2] یہ آپ کا حسنِ ظن ہے (مخزن)

مدیر — پہلے علامہ اقبال کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے اور پھر اپنے مضمون کے متعلق ان اشعار کے نیچے مخزن کے مدیر میں وارد متضاد رائیں ملاحظہ فرما کر اپنی گومگو کی حالت پر دوبارہ توجہ کیجئے۔ "زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا۔ اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں" "کوئی کہتا ہے مرا نہیں مجھ کو دل رند مجھے۔ سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیران ہوں میں"

مسعود اشعر (از رام پور ہند)

میں اب تک برابر مخزن کی بدلتی ہوئی حالت یعنی ترقی کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہوں اور بڑی خوشی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ مخزن نے اس زمانے میں بہت ترقی کی ہے اور برابر کر رہا ہے۔ خاص کر جولائی کا شمارہ اپنے اندر بہت سی خصوصیات رکھتا ہے۔ پہلے لکھائی چھپائی اس قدر صاف ستھری اور جاذبِ نظر ہوتی۔ مضامین بھی اچھے ہیں نظموں میں ابھی تک کوئی خاص معیار قائم نہیں کیا گیا تھا لیکن اس مرتبہ بلندی نظر آتی ہے البتہ غزلیں کمزور ہیں۔ افسانوں میں غلام رسول تنویر کا ڈراما اچھا ہے مگر ضرورت ہے کہ افسانوی حصے کو تھوڑا سا اور مضبوط بنایا جائے۔ مگر یہ آپ ترقی پسندی سے اس قدر کیوں گھبراتے ہیں؟ آخر آپ ترقی پسندی کس چیز کو سمجھتے ہیں؟ کیا یہ کوئی قابلِ نفرت شے ہے؟

مدیر — ترقی پسندی ماشاء اللہ بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ کس نے آپ کے کان میں پھونک دیا کہ مخزن تنزل پسند ہے؟

مدیرِ صدق (مولانا عبدالماجد دریا بادی)

مخزن کا معیار خاصا بلند ہے۔ شروع میں اصلاحی مضامین بھی ہوتے تھے لیکن پرچہ خود بھی ترقی پسندی کا شکار ہونے لگا اور یہ رجحان ایک حد تک اب بھی قائم ہے۔ جولائی کے نمبر میں پہلا مقالہ "حضرتِ غالب کی اصلاحیں" ہر اعتبار سے بہت خوب ہے۔ تنہا گرد غالب ہوتی تو بھی جن کے کلام پر یہ اصلاحیں ہیں خود بھی بڑے خوشگو نظر آتے ہیں اور ان دو شعروں پر تو اپنا رنگ انہوں نے بالکل غالب ہی کا دیا ہے۔

حسرت دیدہ بس نکل جائے۔ دل سے دل کی ہوس نکل جائے

جی دیا ہم نے مدعا نہ ملا۔ خون بہا اور خوں بہا نہ ملا

سارا مضمون طلبۂ فن کے کام کا ہے۔ ایک "فی ما آتیں کا نہ سر ہے نہ پیر" شاید خاص متر قی پسندانہ مذاق کا ہے۔ خدا معلوم ایسی گھگھو میاں بیوی کے درمیان نباہ کے کس طرح ہوتی ہے۔ ایک اور تنقیدی مضمون ایک فن کار پر لکھا گیا ہے جو اپنی طوالت کی حد تک ہے۔ ایک ادبیہ افسانہ مصطفیٰ منفلوطی کا ترجمہ ہو کر آیا ہے اور اچھا ہے۔ تبصرہ میں بند کشن پرشاد کول کی کتاب "نیا ادب" پر نظر کی گئی ہے اور کتاب میں جو چوٹیں پنجاب اور اہلِ پنجاب پر ہیں قدرتاً ان پر گرفت کی گئی ہے (صدق دریاباد ۱۱ اگست ۵۰ء)

[1] حضرت غلام رسول تنویر کیلئے ڈرامے کا ذکر ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بکجا (مخزن)

عنوان الخازن

قائدِ اعظمؒ کی یاد میں

(احمد ندیم قاسمی)

تو نے اسلام کا بول بالا کیا
ہر قیامت کو ہنس ہنس کے ٹالا کیا
تو نے ان ظلمتوں میں اُجالا کیا
جن کو صدیوں سے افرنگ ڈھالا کیا
تو نے ان راستوں کو اجاگر کیا جن پہ صدیقؓ و فاروقؓ چلتے رہے
تو نے ان قافلوں کو خراماں کیا جو پڑاؤ پہ پہلو بدلتے رہے
بحرِ ہستی میں اسلام کی لہر تھا قائدِ ہند کیا، قائدِ دہر تھا
آندھیوں سے نکلنا سکھایا ہمیں
آن میں آسماں پر بٹھایا ہمیں
راستہ زندگی کا دکھایا ہمیں
ساری دنیا کا دولھا بنایا ہمیں
تو نے تلوار کو طاق پر رکھ دیا اور قرآن کو رہنما کر دیا
یعنی صدیوں کے اُلجھے ہوئے راز کو چند لفظوں کی حکمت سے وا کر دیا
بحرِ ہستی میں اسلام کی لہر تھا قائدِ ہند کیا، قائدِ دہر تھا
ایک بے داغ آئینہ سیرت تری
سلطنت کا سہارا تھا قوت تری
ساری ملت کی حشمت تھی شوکت تری
پاک فطرت تری، نیک نیت تری
آفتابِ جہاں تاب تیری شعاعیں ابد تک فضاؤں میں لرزاں رہیں
تیرا چہرہ ابد تک فروزاں رہے تیری آنکھیں ابد تک درخشاں رہیں
بحرِ ہستی میں اسلام کی لہر تھا
قائدِ ہند کیا، قائدِ دہر تھا

پنجاب میں قائدِ اعظم کی پہلی تقریر

(امروز)

از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

آج سے چودہ برس پہلے کے واقعات کا تذکرہ شاید بعض لوگوں کو پسند نہ ہو۔ یہ دن ہیں جس برق آسا سرعت سے دنیا کے حالات میں انقلاب آرہے ہیں اور حیرت انگیز رفتار سے ہماری کتابِ زندگی کے ورق الٹے جا رہے ہیں ماضی کی داستان رفتہ رفتہ اپنا لطف کھوتی جا رہی ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　　نہیں ہے ان کی نظر سوئے کوفہ و بغداد

اس کے باوجود تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے کوفہ و بغداد آج بھی لندن اور نیویارک سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتے ہمارے مستقبل کا مورخ جب پاکستان کی تاریخ مرتب کرے گا تو اسے لامحالہ ان تمام گوشوں کے اندر جھانک جھانک کر دیکھنا پڑے گا جہاں سے ہماری تحریکِ آزادی کے سرچشمے پھوٹے اور جہاں سے قائدِ اعظم کی حیات آفریں آواز نے بلند ہو کر سونے والوں کو بیدار اور جاگنے والوں کو آمادۂ عمل کیا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں آج کی صحبت میں قائدِ اعظم کی ایک تقریر قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ جو مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ میں سنگِ میل کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ تقریر اب تک کسی کتاب میں شائع نہیں ہوئی اور نہ اسے قائدِ اعظم کی تقاریر کے مجموعہ میں جگہ دی گئی ہے۔ اس لئے اسے گویا تبرک کی حیثیت حاصل ہے۔

مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ اپریل ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب بمبئی کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا تھا۔ کہ آئندہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرے گی۔ اسی قرارداد کی رو سے قائدِ اعظم کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ۳۵ ارکان پر مشتمل ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے اس کے ماتحت ہر صوبے میں الگ الگ ایک ایک بورڈ قائم کریں۔ پنجاب کو شرف حاصل ہے کہ اس مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا بنیادی اجلاس ۔ مئی ۱۹۳۶ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا اور قائدِ اعظم اس کی صدارت کے لئے بنفسِ نفیس تشریف لائے تھے

اجلاس سے فارغ ہو کر انہوں نے پنجاب کا صوبائی پارلیمنٹری بورڈ مرتب کیا۔ اس کی ترتیب سے پہلے انہوں نے مختلف جماعتوں، اداروں اور رہنماؤں سے گفتگو کی۔ ان جماعتوں میں مجلس احرار، یونینسٹ پارٹی، مجلس اتحاد ملت اور جماعت خاکسار زیادہ نمایاں تھیں۔ چنانچہ جو بورڈ تشکیل پذیر ہوا۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عبدالقادر قصوری، ملک برکت علی، مولانا محمد اسحاق مانسہروی، میاں عبدالعزیز، علامہ اقبال، ملک زمان مہدی ایسے مختلف الخیال اور مختلف المعتقد اصحاب شامل تھے۔ یہ بورڈ اپنے اندرونی اور طبعی اختلافات کی وجہ سے زیادہ مدت یکجہتی سے کام نہ کر سکا۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولوی عبدالقادر قصوری ڈاکٹر عالم کے اصرار پر الگ ہو گئے۔ احراری رہنما بھی کٹ کر دوسری طرف چلے گئے اور انجام کار صرف علامہ اقبال [illegible] نیاز مند رہ گئے۔ جن میں میاں عبدالعزیز، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، ملک زمان مہدی اور غلام رسول خاں وغیرہ شامل تھے۔ ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو میاں فضل حسین کا انتقال ہوا۔ اور چند روز بعد سر سکندر حیات ریزرو بنک کی ملازمت سے مستعفی ہو کر پنجاب آ گئے اور یونینسٹ پارٹی کی قیادت ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ پنجاب کے گورنر ایمرسن تھے۔ انہوں نے اس خیال سے کہ انتخابات میں پارٹی کو ہر قسم کی سہولت حاصل ہو۔ نواب مظفر خاں کو چھٹی جانے پر مجبور کیا اور ان کی جگہ سر سکندر کو پنجاب کا ریونیو ممبر بنا دیا۔

جب یہ انتظامات پختہ ہو گئے تو یونینسٹ پارٹی پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اور انا ولا غیری کا نعرہ بلند کر کے انتخابات کے میدان میں اتری۔ مسلم لیگ کے لئے بلاشبہ حالات سازگار نہیں تھے۔ لیکن قائد اعظم کا استقلال جو آخر وقت تک ہماری حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ امداد و اعانت کے لئے موجود تھا۔ علامہ اقبال نے قائد اعظم کو لکھا کہ وہ خود لاہور آ کر اپنے دست خاص سے پنجاب میں انتخابات کی مہم کا آغاز کریں۔ چنانچہ قائد اعظم ۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو تشریف لائے۔ فیصلہ ہوا کہ ۱۱ اکتوبر کی رات کو ایک جلسۂ عام میں قائد اعظم تقریر فرمائیں اور مسلم لیگ کی طرف سے انتخابات کی مہم کا افتتاح کریں۔ علامہ اقبال اگرچہ مشکل پلنگ سے نیچے قدم رکھتے تھے لیکن انہوں نے ہماری درخواست پر اس تاریخی اجتماع کی کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہونا منظور کر لیا تھا۔ جب قائد اعظم کو اس کی اطلاع دی گئی تو وہ بے حد مسرور ہوئے۔ لیکن ۱۱ اکتوبر کی صبح کو حضرت علامہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس لئے جلسے کی صدارت ملک زمان مہدی خاں مرحوم نے کی۔ موچی دروازے کے باغ میں دس ایک ہزار کا مجمع تھا۔ قائد اعظم یہ رنگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور وہیں انہوں نے مسکرا کر ملک برکت علی سے کہا کہ حالات کی نامساعدت کو مد نظر رکھتے ہوئے حاضرین کی تعداد بڑی حوصلہ افزا ہے۔ اہل لاہور نے اگرچہ احرار کے بڑے دھوم دھامی جلسے دیکھے تھے۔ جن میں پچاس پچاس ہزار کا اجتماع بھی ہو جاتا تھا لیکن متانت سنجیدگی اور خصوصی سیاسی حقائق کی نقاب کشائی کے اعتبار سے یہ جلسہ لاہور کی پبلک زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

قائد اعظم نے انگریزی میں تقریر کی تھی۔ سننے والوں میں اکثر انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن آخر تک پورا مجمع ساکت و صامت بیٹھا ان کے ارشادات کو سنتا رہا۔ ان کے بعد ملک برکت علی نے تقریر کا اردو ترجمہ لوگوں کو سنایا۔ ایک شارٹ ہینڈ لکھنے والے نے قائد اعظم کی انگریزی تقریر قلمبند کر لی تھی۔ جسے بعد ازاں پنجاب صوبائی لیگ کے دفتر نے شائع کر دیا تھا۔ اب آپ یہ تقریر ملاحظہ فرمائیے۔

پنجاب کی حالت۔ گزشتہ چند مہینوں میں مجھے کئی مرتبہ لاہور آنے کا موقع ملا ہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس صوبے کے مسلمان سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پسماندہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا صوبہ افسری صوبہ ہے۔ جس سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے تمام شعبوں پر افسری حکومت کا سکہ رواں ہے۔ آپ کے صوبہ کے رہنما جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں۔ گورنمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے اور ان کے پیش نظر خود پرستی کے علاوہ اور کوئی بلند مطمح نظر نہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے رہنماؤں کا

تحرکِ عمل اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ عوام الناس کی لاعلمی اور جہالت کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور جہاں دوسرے متعدد اور تعلیم یافتہ مسلمانوں سے تعاون کا مسئلہ درپیش ہو وہاں خاموشی سے نئی کترا جائیں۔ حضرات! آپ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ کو چند رجعت پسند رہنماؤں کی ایک ایسی پالیسی کو زیر غور کرنا ہے جس کی پشت پر ضمیر فروش پریس کا پروپیگنڈا، حکومت کی چشم کا گوشہ، التفات اور لاعلم رائے دہندوں کے ووٹ ہیں۔

اخبارات ۔ اخبارات کا ایک حصہ ہمارے لائحہ عمل اور مطمع نظر کو عوام کے سامنے ہمیشہ غلط انداز سے پیش کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ وہ دبی زبان سے یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ کی پالیسی اور اس کے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہم پر دھڑلے سے یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے مقصد کے لئے فرقہ وارانہ پارٹیوں کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اور ان کا اپنا یہ دعویٰ ہے کہ وہ بذات خود بڑے ہی قوم پرست ہیں اور فرقہ پرستی کی لعنت سے کوسوں دور ہیں۔ بلکہ کیا میں ان حضرات سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں اور کیا وہ ایمانداری سے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی اس لئے غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے کہ اس کے ارکان کی فہرست میں دو ہندو ارکان کا نام بھی ہے جو موقع بموقع ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ کیا کوئی شخص ایمانداری سے اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ غیر فرقہ وارانہ جماعت کی موجودگی میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی علیحدہ علیحدہ پارٹیاں موجود ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ غیر مسلم پارٹیاں کیوں یونینسٹ پارٹی ایسی غیر فرقہ وارانہ جماعت میں مدغم نہیں ہوئیں؟ میں یونینسٹ پارٹی کے ارکان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ایمانداری سے ان ہندوؤں اور سکھوں کے نام شائع کریں جن کی امداد انہیں حاصل ہے تاکہ پنجاب کے لوگ ان کی ڈینگ کو باور کر لیں کہ ان کے زمرے میں غیر مسلم ارکان کا مضبوط عنصر شامل ہے۔

یونینسٹ پارٹی کی حقیقت ۔ حضرات! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی شخص اس چیز کا متمنی نہیں کہ ہم ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے ساتھ باہمی تعاون کی لڑی میں پرو سکیں۔

حضرات! میں اس بات کے لئے بھی تیار ہوں کہ انتخابات کی کشمکش سے پہلے ہی ہم ان ہندوؤں اور سکھوں نیز دوسری جماعتوں سے جداگانہ انتخاب کے باوجود تعاون کر سکیں جن کے مفاد ہمارے ساتھ مشترک ہیں لیکن آپ یاد رکھئے کہ جب تک جداگانہ انتخاب کی شق موجود ہے۔ ان پارٹیوں کی تشکیل فرقہ وارانہ لائنوں ہی پر ہو سکتی ہے اور ہمیں ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنی قوم کے سامنے ہی کشکول گدائی پیش کرنا ہوگا۔ ہمارا ہمیں ایسی غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں کی ضرورت نہیں جن کے عناصر رجعت پسند ہندو اور رجعت پسند مسلمان ہوں ہمیں ایسی غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں کی ضرورت ہے جو آزاد خیال ترقی پسند اور محب وطن قومی خادموں پر مشتمل ہوں جو وطن عزیز کے مفاد اور اپنے بھائیوں کی بہبود کے لئے صعوبتوں کی کڑیاں خندہ پیشانی سے جھیل سکیں۔ میرے دل میں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی اپنے بلند بانگ دعاوی کے باوجود کس قماش کی غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے؟ آپ میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس پارٹی کی غیر فرقہ وارانہ تعلیم کو مانتے ہیں اور ملک کی خدمت میں سر دھڑ کی بازی لگانے کیلئے انہوں نے کون سا عملی اقدام کیا ہے؟ ان باتوں کا جواب آپ پنجاب کے مفلس، قلاش اور بدبخت زمینداروں سے پوچھئے جن کی نمائندگی کا ڈھول یونینسٹ پارٹی کے ارکان نے اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے اور جسے وہ وقت بے وقت سارا زور لگا کر پیٹتے رہتے ہیں۔

مسلم لیگ کا پروگرام ۔ آئیے اب میں آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد سے متعارف کراؤں جس کے ماتحت صوبوں میں پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ پارلیمنٹری بورڈ کا مطمح نظر سیدھے سادھے لفظوں میں یہ ہے:-

"نئی اصلاحات کے تحت جس نوع کی پارلیمنٹری حکومت کا افتتاح ہونے والا ہے اس کے مطابق یہ نہایت ضروری ہے کہ ملک میں ایسی

سیاسی پارٹیوں کی تشکیل عمل میں لائی جائے جن کا پروگرام اور جن کی پالیسی بالکل واضح اور معین ہو اور یہ

۱۔ اپنے رائے دہندوں کو اپنے سیاسی آراء و افکار سے مطلع کر سکیں۔

۲۔ یک جہت اور ہم خیال پارٹیوں سے تعاون کر سکیں۔

۳۔ اور نئے آئین سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے علاوہ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل کا محرک ایک یہ جذبہ بھی تھا کہ نئے آئین کے ماتحت صوبائی حکومتوں سے پورے طور پر متمتع ہونے کے لئے مسلمانانِ ہند کو وحدت کی لڑی میں منسلک کیا جائے۔ اس لئے ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ لابدی تھا کہ مسلمانانِ ہند ایک مرکزی جماعت کے دامن سے وابستہ ہو کر اپنی تنظیم کریں۔ چنانچہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ نے مجھے اس امر کا اختیار دے دیا ہے کہ میں صوبائی انتخابات لڑنے کے لئے ایک مرکزی انتخابی بورڈ کی تشکیل عمل میں لاؤں جس کے کم از کم ۳۵ ارکان ہوں اور جو مقامی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک صوبہ میں صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام عمل میں لانے کے مجاز ہوں گے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مجوزہ مرکزی بورڈ کا پہلا اجلاس ۸ جون ۱۹۳۶ء کو آپ کے شہر لاہور میں منعقد ہو گا۔ اس لحاظ سے آپ کا شہر آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا مصداق نہیں۔ بلکہ آپ کی قوم کے بہترین دماغوں نے اس پر دنوں غور و خوض کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمانانِ ہند اپنی سیاسی، مذہبی، تمدنی اور اقتصادی پستیوں کو اوجِ کمال سے آشنا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ باہمی افہام و تفہیم اور کسر و انکسار سے اپنے تمام اختلافات کو مٹا کر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند بن جائیں تاکہ ہر مخالف قوت اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ ان مقاصد عالیہ کے پیش نظر ہم نے مسلمانانِ ہند کی ایک مرکزی جماعت کی بنیاد ڈالی ہے جس کی شاخیں مختلف صوبوں میں مضبوط بنیادوں پر قائم کی جا رہی ہیں۔ مرکزی جماعت کے بنیادی اصولوں کا صوبائی بورڈوں پر پورا پورا تصرف ہو گا۔ اور جو ارکان لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلیوں میں داخل ہوں گے۔ ان کے لئے ان وعدوں کا احترام لازمی ہو گا جو لیگ سے پیمانِ وفا باندھنے سے ان پر عائد ہوں گے۔ اس طرح ہم اسمبلیوں میں ایسے کھرے آدمی بھیجنے کے قابل ہو سکتے ہیں جو ذاتی اغراض سے بالا، رائے دہندگان کے صحیح نمائندے اور مرکزی و صوبائی بورڈوں کے سامنے اپنے تمام اعمال کے لئے جوابدہ ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں بلکہ جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ لیکن آپ یقین رکھیں کہ اگر ہم اس مہم کو سرانجام دینے کے قابل ہو گئے تو نہ صرف یہ کہ پنجاب کے مسلمان ہی اس سے فیضیاب ہوں گے بلکہ مسلمانانِ ہند کو بھی بحیثیت مجموعی زبردست فائدہ پہنچنے کی توقع ہے

یونینسٹ پارٹی کے جنبہ دار اداروں سے۔ اب ذرا آپ اپنے صوبے کی کیفیت سن لیجئے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ کے رہنما مسلمانوں کی اس ہندوستانی قومی تنظیم کی کڑی بننے سے کیوں گریز کرتے ہیں؟ یہ سچی بات اگرچہ کڑوی ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر وہ لیگ کی رکنیت قبول کر لیں تو اس صورت میں انہیں لیگ کی پالیسی اور پروگرام کا زہر بھرا جام جو بدقسمتی سے حکومت کی چشم التفات کی چاشنی سے معرا ہے نوش کرنا ہو گا اس کے علاوہ لیگ کے حلف نامہ پر دستخط کرنے سے ان کی من مانی کارروائیوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کابینہ کی تشکیل کے قصرِ رفیع کا انہدام بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عاشق حسین

ن کی جولانیاں گورنر کے اشارہ چشم و ابرو کے کبھی محتاج نہ ہوں گی۔ اس کے برعکس ہمارے پیش نظر ایسے کابینہ کی تشکیل ہے جس کی قوت کا راز سے عام اور فرائض کو ایمانداری سے ادا کرنے کے جذبے میں پنہاں ہوگا۔

میں نے چند اخباروں میں یہ بیان جو یونینسٹ پارٹی کے بعض ارکان نے دیا تھا پڑھا کہ میں ان لوگوں کو جو لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے نہیں ہو سکتے رجعت پسندوں کاسہ لیسوں اور خوشامدیوں کے ٹولے سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا کہ نواب چھتاری اور سر محمد یوسف جب تک لیگ سے باہر رہے میں نے ان کی رجعت پسندی اور ٹوڈیت سے کبھی تعرض نہ کیا لیکن جونہی انہوں نے لیگ کی غلامی کا جوا گلے سے اتار کر پھینکا میں نے فوراً ان کے گلے میں رجعت پسندی اور کاسہ لیسی کا پھندا ڈال دیا۔ حضرات! میں اس الزام کی صحت سے انکار کرتا ہوں۔ اور اس قسم کے لغو اور لچر بیانات کو درخور اعتنا قرار نہیں دیتا۔ میں رجعت پسندی کا خطاب نہیں دیتا ورنہ ان لوگوں سے کوئی پرخاش رکھتا ہوں جن کی کتاب زندگی کا عنوان رجعت پسندی اور کاسہ لیسی ہے یہی وجہ ہے میں نے نواب چھتاری کا جنہوں نے اپنی مرضی سے بعد میں استعفیٰ دیا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ میں آج پھر سر سکندر حیات خاں کو یہ حلقے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس صورت میں وہ پارٹی کی اجازت کے بغیر صوبائی وزارتوں کے قلمدان سنبھالنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اور انہیں مرکزی بورڈ کے اصولوں کا احترام کرنا ہوگا۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس مجوزہ وزارت کے خوشگوار خوابوں کو درہم برہم کرنا چاہتا ہوں جس کی بنیاد آج ہی سے انتخابات کی کامیابی کی آرزو نے وہ ہندوؤں کی متفقہ آواز سے پہلے رکھ لی گئی ہے۔ میں ہندو اور سکھ حضرات کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو انہیں اپنے ان ارکان سے لاحق ہے جو یونینسٹ پارٹی کے اغراض مشومہ کی قربانگاہ پر اپنے ضمیر اور اپنی قوم کی نمائندگی کو بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ میں اس حقیقت کو پھر ایک بار آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ میرے پیش نظر ایسی اسلامی حکومت کا قیام نہیں جو ہندوؤں اور سکھوں کو کچل دینا چاہتی ہو بلکہ اگر خدا کا فضل شامل حال رہا۔ اور ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے تو ہم پھر از سر نو اس حق و صداقت کی آواز کو بلند کریں گے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل عرب کے دشت میں گونجی تھی۔ اور جس نے عرب و عجم، مسلموں اور غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کو راستی اور پاکیزگی کی کسوٹی پر پرکھا تھا۔ آپ یقین کیجئے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا ایمان ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت جس کی بنیاد ظلم اور ناانصافی پر رکھی گئی ہو ہرگز ہرگز پائدار نہیں ہو سکتی۔ آپ مسلمانوں کی روایات اور ان کے دین قیم کی روشنی میں اس بات پر کامل اعتماد رکھئے کہ وہ برادران وطن کے معاملہ میں انصاف اور حق کی راہ سے انچ بھر بھی ادھر ادھر نہیں بھٹکیں گے۔

"پنجاب کے مسلمانوں سے خطاب پنجاب کے بہادر اور غیور مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں کا دایاں بازو ہیں۔ اور انہوں نے اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کا دکھ درد بٹانے میں ہمیشہ جوش سے حصہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے آج بھی وہ ان اسلامیان ہند کے باہمی اتفاق کی گاڑی میں روڑا بن کر نہ اٹکیں گے جنہوں نے ان کی ہنسی میں مسرت کے پھول برسائے اور غم میں رنج کے آنسو بہانے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔

پنجاب کے غیور لیکن سادہ دل مسلمانو! خدارا آپ اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ ابھی ایسے بہت سے مرحلے باقی ہیں جن کی اہمیت ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے یکساں ہوگی۔ اسلامیان ہند کا بدن ابھی بہت سے ناسوروں سے رس رہا ہے اور ان کے اندمال کے لئے ہر صوبے کے مسلمانوں کو حتی المقدور مرہم کا سامان بہم پہنچانا ہوگا۔ کیا آپ اسلام کی عالمگیر وسعت کو صوبوں کی تنگنائوں میں محدود کر دینا چاہتے ہیں ہمیں بتلائیے کہ آل انڈیا اہمیت کے ان مسائل کو جن کا تعلق مسلمانوں کے تمدن اور مذہب سے ہوگا آپ ایک مرکزی جماعت کی مدد کے بغیر کس طرح نپٹا سکتے ہیں۔ کیا اسلام کا جمہوری نظام آپ کو اس امر

ڈاکٹر عاشق حسین

ستمبر ۱۹۴۵ء

کی طرف صورت ضیں ہے رہا کہ مسلمانان ہند کی ایک مرکزی نمایندہ جماعت ہو جس کی صدا و کروڑ مسلمانان ہند کی متفقہ آواز کہی جا سکے۔

دوسری اہمانے پیش نظر اس قسم کی ملک نمایندہ جماعت کا بلند تصور ہے۔ جو آزاد خیال، ترقی پسند اور اپنا پیشہ افراد پر مشتمل ہو اور جو آزادی وطن کی کوششوں میں ہمسایہ اقوام کا ہاتھ بٹا سکے تاکہ ہندوستان کے ماتھے پر غلامی کا جو سیاہ ٹیکہ لگا ہوا ہے وہ دھل جائے۔

میں ہندوؤں سے بھی یہی کہتا ہوں۔ انہیں بھی اپنی جماعتوں کا جائزہ لینا ہوگا تاکہ ان کی جماعتوں کے خود غرض اور خود ستا رہنماؤں کی وجہ کا ناسور باقی نہ رہے اور وہ سچے دل سے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کر سکیں۔ اس صورت میں کونسلوں اور اسمبلیوں پر بہانے جو نمائندے جائیں گے وہ خلوص قلب اور پوری ایمانداری سے ایک ایسے معاہدے پر پہنچنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جو ہندوستان کی تمام قوموں کو منسلک کرے۔ اور اس طرح اس ملک کی باہمی سرپھٹول اور ہندو مسلم مناقشات کے شاخسانوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

طبلِ بلند بانگ در باطن ہیچ - کیا میں سر سکندر حیات خاں سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر وہ اہل پنجاب کی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لئے اس قدر بے تاب تھے تو آج سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کیا انہوں نے ریڈ روبنگ کی گورنری اور خواجہ کو قائم مقام گورنری قبول کرنے کے لئے قبول لی تھی؟ اس بلند مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے اس سے پہلے کیوں استعفا نہ دیا؟ میں پوچھتا ہوں کہ نواب مظفر خاں کی جگہ سر سکندر حیات کو قلمدان وزارت سنبھالنے کی کیوں ضرورت لاحق ہوئی؟ آہ! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب صرف اس قدر ہے کہ آپ کی یونینسٹ پارٹی کے ارکان جن کو عہدوں کے خوش آئند خوابوں نے اناولاغیری کا مرو باق بنا رکھا ہے وزارت کی پری کو شیشے میں اتارنے کی سعی میں مشغول ہیں۔

اس ضمن میں گورنر پنجاب تک بھی اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں کہ وہ اس امر کو واضح کرنے میں تساہل سے کام نہ لے کہ حکومت جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے کامل طور پر غیر جانبدار ہے اور اسے اس عہد کا پورا پورا پاس ہے۔ جو مرکزی حکومت نے ابھی چند روز ہوئے اسمبلی کے ارکان کو دیا تھا۔

ووٹروں سے اپیل - سب سے آخر میں تمام آپ لوگوں سے پر زور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے ووٹ کی قدر و قیمت پہچانیں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ آپکے ووٹ کی دُہری قیمت ہے۔ پہلے تو آپ کے ووٹ سے صوبائی اسمبلی کے ارکان منتخب ہوں گے پھر آپ کے منتخب کردہ نمایندوں کے ووٹوں سے فیڈرل اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

اس لئے میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ تو لوگوں، برادریوں اور تعلقات کے پست اور غیر اسلامی خیالات سے بلند رہ کر صرف ان لوگوں کو ووٹ دیں جو ایک مخصوص ہیں اور روز روشن کی طرح نمایاں پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا حلف اٹھا چکے ہیں اس کے بعد میں آپ سے درخواست کروں گا۔ کہ اگر آپ مسلمانوں کو باہمی تنظیم کی لڑی میں منسلک دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو مسلم لیگ کے بنیں اور صرف مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدواروں کو ووٹ دیں۔ جو اسمبلی کے اندر اپنے تمام اعمال کے لئے مرکزی جماعت کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ باقی امیدوار بھیڑوں کے اس گلے کی مانند ہوں گے۔ جس کا کوئی نگہبان نہیں اور وہ اپنے اعمال و افعال کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں اور جن کے سامنے طلب منفعت اور ہوس جاہ کے علاوہ اور کوئی اہم مقصد نہیں۔"

اتحاد ایمان تنظیم

معاملہ کے واضح سبب ہے، وہ لکھتے ہیں:

مغل حکمران عدل کو ایک مقدس فرض سمجھتے تھے، ان کے زمانہ میں ادنیٰ آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست بادشاہ کی خدمت میں پہنچ کر انصاف کا طلبگار ہو، گو اس حق کے استعمال کا موقع کم آتا تھا تاہم اس کی وجہ سے بے انصافی کی بڑی روک تھام رہتی تھی، بعض اوقات یہ حق رعایا کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوتا تھا۔

عدل و انصاف میں اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاستوں میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے، لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ پیدا ہونے نہیں پایا اور کسی زمانہ میں بھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمران قوم کا مذہب محکوم امت کا بھی مذہب بنایا جائے، حتیٰ کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہیں رکھی تھی، لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی نیا قانون نہیں بنایا گیا، انگلستان کی ملکہ الیزبتھ کے زمانہ میں ایک ایسا قانون تھا، جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی، مغلوں کے زمانہ میں اس قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔

سینٹ بارتھولومیو کے جیسے قتل عام سے مغلوں کی تاریخ کبھی داغدار نہیں ہوئی، مذہبی جنگ کی خونریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلوں کے عہد میں ایسی مذہبی جنگ کی کوئی مثال نہیں ملتی بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا تھا، لیکن اس نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے عقاید پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا، بابر سے لے کر اورنگ زیب کی تخت نشینی تک مغلوں کی تاریخ تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تلخی سے تقریباً پاک ہے۔

مغلوں میں ولندیزیوں سے زیادہ رواداری تھی، یورپین مؤرخ اورم کا بیان ہے کہ ولندیزیوں نے متعصبانہ مذہبی پالیسی اختیار کی تھی اور جب مرہٹوں نے عیسائی مذہب اختیار کرنے سے انکار کیا تو بہت سے مرہٹہ خاندانوں پر بڑی سختیاں کی گئیں، ان ولندیزیوں سے سیواجی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی وہ ولندیزیوں کو اپنے مذہب کا دشمن سمجھتا تھا، اسی انتقام میں اس نے ہندوستان کے مغربی حصہ کے ولندیزیوں سے چوتھ وصول کی۔

مغلوں کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً جو شاہی اعلانات ہوتے رہے ان سے مغلوں کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے، اکبر کہا کرتا تھا کہ ظلم ہر شخص کے لئے ناجائز ہے، اور بادشاہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور بھی ناروا ہے کہ وہ تو دنیا کا محافظ ہوتا ہے، جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

بہر نگہبانی خلق خدا　　شب نکنم دیدہ بخواب آشنا

از پئے آسودگی جملہ تن　　رنج پسندم بہ تن خویشتن

اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو اس کی معزولی کے بعد ایک رقعہ پر لکھا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور اس کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

مغل اپنے ان اقوال کا ثبوت عمل سے دیتے تھے، ان کا نظام سلطنت نہ صرف مستحکم بلکہ فائدہ مند بھی تھا، حکومت کا استحکام اور اقتدار لوگوں کے حق میں بہت مفید تھا، اسی کی بدولت ایک عرصہ تک ملک میں امن اور اقتصادی خوشحالی رہی۔

مغلوں کا طرز حکومت اگرچہ مطلق العنان تھا لیکن اس زمانہ کے لئے یہی طرز حکومت موزوں تھا، حکومت کے لئے عوام کی نمایندہ جماعت کی ضرورت کبھی نہیں سمجھی جاتی تھی، تمام لوگ اس طرز زندگی سے مطمئن تھے، جس کو وہ اپنی خواہش سے اختیار کر لیتے تھے، حکومت کا انحصار بظاہر فوجی قوت پر تھا لیکن عملاً وہ فیض رساں تھی، رعایا کی تمام پرانی چیزیں باقی رہنے دی گئیں، ان کے رسم و رواج کو قائم رکھا گیا، جس سے ملک کو

ـتی ہوتی رہی، اور قانونیت کو روک کے رکھا گیا، امن و امان بہ زیادہ
ـووہ گیا، مغلوں کے شخصی استبداد میں مستعدی اور ہوشمندی تھی، اس
ـئے وہ کامیاب رہا، از منۂ وسطیٰ میں اصلی خطرہ انارکی یعنی طوائف الملوکی
پھیلنا تھا، کسی کے ہاتھ میں تمام اقتدار کا مرکوز ہو جانا خطرہ نہیں
سمجھا جاتا تھا، مغلوں نے ملک میں تخریبی عناصر کو کبھی بڑھنے نہیں دیا
ـانون کا اقتدارِ اعلیٰ کامیابی کے ساتھ ہر حال میں برقرار رکھا گیا، گو زیادہ تر
ـدشاہ کی خواہش ہی کا نام قانون ہوتا ہے، لیکن لوگوں نے اس زمانہ
ـکے طرزِ حکومت کو آسانی سے تسلیم کر دیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے
ـہ یہ طرز ان کے سیاسی خیالات و رجحانات کے مطابق تھا، اس لئے
یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مغل مطلق العنان ضرور تھے، لیکن اس کے ساتھ بڑے
مدبر اور سیاست دان بھی تھے۔

"اوراقِ نو"

سر عبدالقادرؒ کی ایک مختصر نظم

ذیل کے چند اشعار جنہیں ایک مختصر نظم بھی کہا جا سکتا ہے یہیں
شیخ عبدالقادر کے ایک پرانے مضمون گھر سے نکل کے دیکھو میں ملی ہے
اس ضمن میں ان کے چند فقرے بھی درج کئے جاتے ہیں۔ "ادارہ"

پس اگر حبِّ وطن کا ہندیوں پر یہ اثر ہو کہ وہ اپنا گھر گھستا پن
چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے نئے مقامات میں رزق ڈھونڈنے
کی مشکلات کا سامنا کرنے... نکلیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں۔ کہ وطن سے
نکل کر وطن کو یاد رکھیں۔ اور اپنی فتح اور کامیابی کی گھڑیوں میں بھی اس
کے حق سے غافل نہ ہوں۔ اگر مذہب کے آدمی نکلنے لگیں تو تجارت
زراعت۔ صنعت۔ اشاعتِ مذہب کئی اسباب تحریک کے لئے
موجود ہیں۔ موجودہ حالت کے مصداق مجھے دو چار مصرعے سوجھے ہیں
لکھے دیتا ہوں۔ شاعر ہوتا تو اس طبی تحریر کے بجائے مختصر اور پر زور
نظم لکھ دیتا جسے لوگ گاتے پھرتے۔ اب ان مصرعوں پہ اکتفا کرتا
ہوں۔ اور اپنے سخنور احباب سے عرض کرتا ہوں کہ

اگر شاعری یک اشارت بس است

بخت آزمانے نکلو جنگل بسانے نکلو
کڑیاں اٹھانے نکلو جانیں لڑانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

دولت کمانے نکلو حکمت اڑانے نکلو
مذہب سکھانے نکلو ہر ہر بہانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

تبرکاتِ مخزنِ قدیم

غزلِ شبلی

(منقول از مخزن بابت ماہ نومبر ۱۹۰۹ء)

تا نرگسِ تو ہر بدہ انگیز نبودہ است
ایں مملکتِ حسن بلا خیز نبودہ است

نبود عجب ار گرم در آمیخت باغیار
شوخے کہ بما نیز کم آمیز نبودہ است

واعظ اگرت کار بہ لعل لبش افتاد
زیں گونہ حدیثِ تو دلاویز نبودہ است

دانم کہ بہارِ چمنِ مبحثِ اسال
بر عادتِ پیشینہ جنوں خیز نبودہ است

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل حزیں باخت
ایں حرف ولے مصلحت آمیز نبودہ است

حامد علی خاں

دیوانِ فغاں

(تبصرہ)

انجمنِ ترقیٔ اردو نے پاکستان میں از سرِ نو کام شروع کرنے کے بعد جو کتابیں شائع کی ہیں، ان میں دیوانِ فغاں کی اشاعت ایک بہت اہم کارنامہ ہے۔ اگرچہ فغاں کی کچھ غزلیں مختلف تذکروں میں ملتی تھیں لیکن اکثر ادبی حلقوں میں اب تک اُن کا دیوان نایاب سمجھا جاتا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے دیوانِ فغاں کی ایک نقل اپنے استاد حضرتِ ذوق دہلوی کے پاس دیکھی تھی لیکن آبِ حیات کی تالیف کے وقت غالباً یہ بھی باقی نہ تھی۔ پرانے تذکرہ نگاروں کا تو کیا ذکر، ایک نیا تذکرہ شعرا جو محمد یحییٰ صاحب تنہا نے گزشتہ ہی سال مرآۃ الشعراء کے نام سے شائع کیا تھا، اس میں بھی وہ فغاں کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"بقولِ آزاد فغاں کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسے صاحبِ کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے اور بہت تعریف کرتے تھے" اس کے بعد تنہا صاحب لکھتے ہیں: "جب آپ کا کلام دستیاب نہ ہو تو ہم کو چار و ناچار ایسی ہی آراء پر ایمان لانا ہوگا"

اس کا مطلب یہ ہے کہ خود تنہا صاحب ایسے اربابِ تحقیق بھی گزشتہ سال تک دیوانِ فغاں کے دستیاب ہونے سے مایوس تھے۔ اہلِ ذوق کو جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے جنہوں نے کئی سال قبل بہار کے ایک کتب خانے سے دیوانِ فغاں کا ایک قلمی نسخہ ڈھونڈ نکالا اور پھر پنجاب یونیورسٹی میں اس کے دو اور نسخوں کا کھوج لگانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ان تینوں نسخوں کے مقابلے کے بعد اپنا نسخہ مرتب کیا ہے اور اس پر اپنی طرف سے ۶۵ صفحات کا ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہی نسخہ اب انجمنِ ترقیٔ اردو نے شائع کیا ہے۔

مقدمے میں فغاں کی شاعری پر کوئی گہری ناقدانہ نظر نہیں ڈالی گئی اور اس لحاظ سے یہ کچھ زیادہ اہم بھی نہیں لیکن اس سے فغاں کی زندگی کا ایک مرقع اور اس کی شخصیت کے متعلق بہت سی ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اس کے علاوہ دیوانِ فغاں کی اشاعت کے لئے فاضل مرتب نے جو کد و کاوش کی اس کی دلچسپ تفصیل بھی اس مقدمے میں ملتی ہے۔

مولانا آزاد کا بیان ہے کہ دیوانِ فغاں جو انہوں نے حضرتِ ذوق کے پاس دیکھا، صرف غزلوں پر مشتمل تھا لیکن پیشِ نظر دیوان میں غزل کے علاوہ چند قصیدے، رباعیاں، قطعے، اور ہجویں بھی ملتی ہیں، حضرتِ میر نے نکات الشعراء میں فغاں کے فارسی کلام کا ذکر بھی کیا تھا لیکن اب تک ہم لوگ ان کے فارسی کلام سے ناآشنا تھے۔ موجودہ دیوان میں فغاں کے فارسی کلام کے تئیس صفحے بھی شامل ہیں، اور یہ فارسی کلام بھی معیار کے لحاظ سے خاصا بلند ہے۔ فغاں کے اردو کلام کے کچھ نمونے اربابِ ذوق کی نظر سے اس سے قبل گزر چکے ہیں اور جیسا معلوم ہے چونکہ میر و مرزا کے نسبتاً کم عمر معاصرین میں سے تھے ان کے کلام کا رنگ بھی ان بزرگوں ہی سے ملتا جلتا ہے مثلاً یہ دو اشعار جن کی حضرتِ میر نے

حامد علی خاں

ستمبر ۱۹۵۰ء

ردیف کی تھی خود میر کا کلام معلوم ہوتے ہیں ۔

ساقی زمیں یاں آپ سے کچھ چشم تر آیا | دل دیکھتے ہی ابر کے ناچار بھر آیا
آوارہ پریشان و شکستہ دل و بدنام | سنتے تھے فغاں کو سو وہ آج ہی نظر آیا

ان کے فارسی کلام کا رنگ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پسندِ خاطرم آمد ازیں دنیا و ما فیہا | ادائے خندہ ساغر، صدائے خندۂ مینا
صنم جویاں نہ ہے کوشش، نہ ہے جوش نہ ہے مستی | مسلمانان نہ ہے ایماں، نہ ہے طاعت نہ ہے تقویٰ
چرا از درد می نالی چرا از رنج می رنجی | بہ دردت می رسد یارت فغاں امروز یا فردا

دیوان کے حصۂ اردو کے آخر میں فغاں نے اس کاتب کی ہجو لکھی ہے جس نے ان کے دیوان کی کتابت کی۔ فرماتے ہیں ۔

یہ جو میرا ہے راقمِ دیواں | تحفہ نسخے کا بھولا بھالا ہے
کچھ نہ سیکھا غلط نویسی بن | ہوش جس روز سے سنبھالا ہے
ہائے ہوز سے وہ لکھے ہے حنا | آپ کا رسم خط نرالا ہے
قابلِ طبع زاد ہے ظالم | میں نے دشمن بغل میں پالا ہے
زندگی ہے مری سخن جس کو
سہوِ کاتب نے مار ڈالا ہے

فاضل مقدمہ نگار نے اس ہجو کو دیکھ کر یہ صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فغاں نے اپنے دیوان کی کتابت اپنی زندگی ہی میں کرائی اور مقدمہ نگار کے سامنے کم از کم دو نسخے شاید اسی اولیں نسخے کی ہو بہو نقل ہوں گے۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ امید کچھ بے جا تھی کہ فغاں نے بعد میں کاتب کے اغلاط کی اصلاح کر دی ہو گی لیکن افسوس کہ انہوں نے بڑی بے پروائی یا بے نیازی سے کام لیا اور اصلاحِ اغلاط کے بجائے محض کاتب کی ہجو نگاری پر قناعت کر لی چنانچہ صباح صاحب کو موجودہ مطبوعہ نسخے کی ترتیب کے وقت اغلاط کی صحت کے لئے بڑی محنت کرنی پڑی۔ مگر غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ فاضل مرتب نے دیوان کی ترتیب میں بھی دخل دیا ہے، مثلاً فغاں نے فارسی کلام کو پہلے اور اردو کلام کو بعد میں جگہ دی تھی لیکن صباح صاحب نے اردو کلام کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے" اسے پہلے جگہ دی ہے۔ شاید بہتر یہی ہوتا کہ مصنفِ کتاب کی اصل ترتیب میں اس قسم کا دخل نہ دیا جاتا۔ مطبوعہ نسخے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کتابت کی غلطیوں سے پوری طرح پاک نہیں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اصل قلمی نسخے کس قدر غلط ہوں گے ع

قیاس کن زِ گلستانِ من بہارِ مرا

ایک خاص بات جو کھٹکتی ہے، یہ ہے کہ مطبوعہ دیوان میں کہیں کہیں دو دو باہم غیر متعلق شعروں پر جو شاید کسی نا تکمیل یافتہ غزل کے شعر ہوں "قطعہ" لکھا نظر آتا ہے۔ اسی طرح بعض جگہ ایسے چار مصرعوں پر رباعی کا عنوان درج ہے جنہیں وزن کے لحاظ سے قطعاً رباعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا

جاسکتا ہے۔ ان کو ہم زیادہ سے زیادہ قطعات میں شامل کر سکتے ہیں۔ مزید برآں بعض غزلوں پر (جو بیں غزل مسلسل بھی بشکل ہی ہے) قطعہ کا عنوان ملتا ہے۔ اگر یہ قلمی نسخوں کی غلطی ہے تو تعجب ہے کہ فاضل مرتب نے اس کی اصلاح کیوں نہیں کی بلکہ ایک جگہ صرف اس ایک فارسی شعر پر قطعے کا عنوان جما نظر آتا ہے ؎

بہ مُہر نیست غرض، نامۂ مرا قاصد کہ بر عقیق لبش کندہ اند نام مرا

امید ہے کہ انجمن ترقیٔ اردو یا خود مرتب دیوان اس کی دوسری اشاعت کے موقع پر ان غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے۔ اہل ذوق خود بھی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ان کی نوعیت ایسی نہیں کہ دیوانِ فغاں سے لطف اندوز ہونے میں زیادہ حائل ہوں۔ پتا۔ انجمن ترقیٔ اردو کراچی۔

رسائل

"اوراقِ نو"۔ اس نام سے ہماری ادبی صحافت کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ "اوراقِ نو" ایک ادبی رسالہ ہے جس کے مدیر اردو کے محسن مولوی عبدالقادر علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے ریاض قادر ہیں۔ پہلا پرچہ جو ڈیڑھ سو سے زاید صفحات پر نکلا ہے حضرت شیخ صاحب کی یاد میں ایک خاص نمبر ہے۔ فی الواقع اپنے پاس رکھنے کی چیز ہے۔ سرورق بہت جاذبِ نظر ہے اور رسالہ قابل قدر مضامین کے ساتھ علامہ اقبال اور حضرت شیخ صاحب کی تصویروں سے بھی مزین ہے۔ امید ہے کہ ریاض قادر صاحب اپنے جلیل القدر باپ کے نقشِ قدم پر چل کر زبان و ادب کی مفید خدمات انجام دیں گے۔
پتا۔ دفتر "اوراقِ نو" ٹمپل روڈ لاہور۔

خوش نویس:۔ یہ رسالہ فنِ خوشنویسی کی حفاظت و ترقی کی غرض سے لاہور کے بعض بہترین خوشنویسوں کے اشتراکِ عمل سے ہوا ہے۔ آزادی نمبر میں قدیم و جدید مشہور خوشنویسوں کی خطاطی کے نہایت دلآویز اور خوبصورت نمونے درج ہیں۔ حسنِ طباعت کا خیال رکھا گیا ہے۔ خوشنویسوں کے علاوہ دوسرے اہلِ ذوق حضرات بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ رسالہ اپنے بلند مقاصد میں کامیاب ہو۔
پتا۔ دفتر خوش نویس بازار سعتاں لاہور۔

... نظامی، ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس ... سے چھپوا کر رسالہ "مخزن" ... روڈ لاہور سے شائع کیا [illegible]

شیخ عبدالقادر علیہ الرحمہ
نے پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا

مخزن

جلد ۴۰ — نمبر ۶

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور، دسمبر ۱۹۵۰ء

ادارہ مطبوعات نوائے وقت لمیٹڈ لاہور

The MAKHZAN LAHORE

سالانہ چندہ، پانچ روپے • ششماہی، تین روپے • فی پرچہ، آٹھ آنے

صفحۂ اوّل

کچھ مدت سے بعض "علم پرست" حضرات ہمیں مجبور کر رہے تھے کہ "مخزن" میں افسانوں کی اشاعت بند کر دی جائے اور یہ خالص علمی مضامین کے لئے وقف رہے۔ "علمی مضامین" کی کمی تو شاید وہ اس پرچے میں بھی محسوس کریں گے، لیکن اُن کی خوش قسمتی سے اس مرتبہ افسانہ ضرور غائب ہو گیا ہے۔ "افسانہ پسند" حضرات سے ہم اس سوئے اتفاق کے لئے معافی چاہتے ہیں۔ ایک ڈراما اور "مخزن المخازن" میں "سی سیپون" کا فقرہ شاید کسی حد تک اس کمی کی تلافی کر سکے۔ بہرحال آئندہ پوری تلافی ہو جائے گی۔

شعر کے معاملے میں بھی بعض حضرات "نظم پسند" ہیں اور بعض "غزل پسند"۔ چنانچہ "غزل پسندوں" نے ہماری "نظم پسندی" پر بارہا ہمیں ملامت کی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ غزل ہمیں پسند نہیں، مشکل یہ ہے کہ اچھی غزلیں لکھی ہی کم جاتی ہیں۔ کم از کم زیرِ نظر پرچے کی حد تک "غزل پسند" حضرات کی شکایت بھی رفع کر دی گئی ہے۔ اس پرچے میں "ہند و سندھ" کے بہت سے موجودہ بلند پایہ غزل گو شعراء کا کلام اُن کے ذوقِ تغزل کی تشفی کے لئے موجود ہے اور وہ "نامطبوع" "نظم" کو قریب قریب غائب پائیں گے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ صرف چند غزلوں ہی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ جناب صابر سمٹیاوی کی بروقت امداد سے ایک پورا غزلیہ مشاعرہ اس پرچے کے صفحات میں بند کر دیا گیا ہے۔ قدیم لکھنؤ کے اس مشاعرے کے بعد صرف مُنہ کا مزہ بدلنے کے لئے جدید لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کی نظم درج کی گئی ہے۔

سید علی عباس کی فنی تحقیق اور تنقید قابلِ قدر ہے۔ اُمید ہے کہ مغلوں کی مصوّری پر اُن کا یہ مضمون عام طور سے پسند کیا جائیگا۔ اسی پرچے میں ہم نے اکبر کے عہد کی مصوّری کے متعلق جنابِ کوثر چاندپوری کا ایک مختصر مضمون بھی شامل کیا ہے جسے آپ آخری صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

جنابِ سجاد رضوی نے "بُستانِ حکمت پر ایک نظر" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا ہے اُسے پڑھے بغیر آپ شاید یہ سمجھیں گے کہ "بستانِ حکمت" پر تنقید کی گئی ہے۔ لیکن پڑھنے کے بعد معلوم ہو گا کہ یہ تنقید "بُستانِ حکمت" پر نہیں بلکہ اُردو کے بعض نئے نقادوں پر ہے اور اس میں تنقید کم اور طنز زیادہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اِسے صرف تفریحی مقالہ سمجھ کر پڑھا جائے۔ تاکہ کوئی نوجوان نقاد زیادہ جھنجھلانے لگے

برنارڈ شا کی موت بین الاقوامی ادبی نقصان ہے۔ ہم آنسہ رضیہ جہاں آرا کے ممنون ہیں کہ ان کی توجہ سے ہم اس مرتبہ برنارڈ شا کے متعلق ایک مقالہ شائع کر سکے ہیں، جس میں شا کی شخصیت اور اس کی ادبی حیثیت پر ایک غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالہ شا کو سمجھنے میں ایک حد تک مفید ثابت ہو گا ✦

مدیر

ماہِ نو

منشورات

قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ

مورانِ خاکبازکو تیری نگاہ نے
تختِ سیاد، بختِ سلیماں عطا کیا
(کرم حیدری)

دسمبر کی پچیسویں تاریخ کو بروز یکشنبہ اب سے چوہتّر سال قبل حضرت قائدِ اعظمؒ کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔

حقیقی بڑے آدمیوں کی ایک پہچان یہ ہے کہ جن لوگوں کو اُن کے زیادہ قریب رہنے کا موقع ملتا ہے وہ اُن کے فضائل سے اور بھی زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔ حقیقی بڑے آدمیوں کی ایک اور پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے ایسے مخلص عقیدت مندوں کی ایک جماعت چھوڑ جاتے ہیں جو اُن کے بعد وفاداری کے ساتھ اُن کے پیغام کی تبلیغ میں مصروف رہتی ہے۔

بعض اور اصحاب کی طرح سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے قائدِ اعظمؒ کو بہت قریب سے دیکھا اور یہ قائدِ اعظمؒ کی سچی عظمت کی دلیل ہے کہ سردار صاحب اُن کی بزرگانہ صفات کے بہت بڑے مدّاح ہیں۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اپنے جلیل القدر آقا کا ذکر غیر معمولی محبت و احترام سے کرتے ہیں، اور اُن کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔

ذیل کی دو روایات جو حضرت قائدِ اعظمؒ کے یومِ ولادت کے احترام میں شائع کی جاتی ہیں، ایک عام جلسے میں سردار عبدالرب نشتر کی زبانی سنی گئی تھیں لیکن اب راقم انھیں یہاں اپنے حافظے کی مدد سے دُہرا رہا ہے:

مدیر

نامراد کر دینا چاہا۔ اس کی داستان
غیر مسلم مخالفین نے بعض نام نہاد مسلمان
علاقوں میں اس وقت کوئی مرکزی حکومت

مقابلے کے بعد قائم ہوا، اور جس طرح اس کے قائم ہوتے ہی حریفوں سے اسے ختم و
برت انگیز ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی پاکستان کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے اس کے
ن، زر خرید افراد کی مدد سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک تباہ کن جنگ شروع کر دی۔ پاکستانی
حکومت نہ تھی، قیام پاکستان کے وقت مسلمان فوجیں ملک سے باہر تھیں، ملک کے تمام فوجی سامان اور
روپے پر خود حریفوں کا قبضہ تھا۔ بلکہ آزادی سے قبل تقریباً تمام کا تمام بینکوں کا کاروبار بھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ ازیں پول
ر کی حکومتوں کے دفتروں میں اکثر تجربہ کار کارکن ہندو تھے اور یہ سب اصحاب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق یہاں سے رخصت
ہو چکے تھے۔ اس عظیم انقلاب کی وجہ سے ہر طرف ایک ابتری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر حریفوں نے ہندی علاقوں میں مسلمانوں
کا قتلِ عام اور لوٹ مار شروع کر دی اور لاکھوں خانماں برباد لوگ بہ حالتِ پریشانی و بے سروسامانی پاکستانی علاقوں میں داخل ہونے
لگے۔ ایک نوزائیدہ ملک میں جس کی حکومت بھی ابھی منظم نہ ہوئی ہو، جو معنوی طور پر مفلس ہو، جس کے پاس نہ فوج ہو، نہ جنگی سامان،
نہ ملازموں کو تنخواہیں تک دینے کے لئے روپیہ، اُس کے لئے یہ ایک بہت کڑا امتحان تھا۔ بڑے بڑے ارکانِ حکومت حیران تھے کہ
کہ پاکستان اِن مشکلات سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکے گا اور اس کا کیا حشر ہوگا۔ ایک موقع پر خود قائدِ اعظمؒ اور دو تین اور اصحاب بیٹھے تھے
جن میں ایک سردار نشتر بھی تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ اُس وقت ہم پاکستان کے قائم رہ سکنے کے خیال سے بڑی حد تک مایوس سے ہو چکے
تھے، اور ہم انتہائی پریشانی کی حالت میں سوچ رہے تھے کہ معلوم نہیں ہمارے وطن کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اُس وقت ہمیں
کچھ سوجھ نہیں رہا تھا اور حوصلے پست تھے۔ تھوڑی دیر تک ہماری یہی کیفیت رہی۔ اتنے میں وہ مردِ مومن، وہ رمز آموزِ ایمان و یقین،
وہ پیکرِ عزم و ہمت، جسے لوگ قائدِ اعظمؒ کہتے ہیں اٹھا، اُس کے چہرے سے اُس وقت غیر معمولی عزم مترشح ہو رہا تھا۔ اس نے ہم پر
ایک پُر جلال نگاہ ڈال کر کہا: "Look here! No Surrender! No surrender, until they lift us bodily and throw us into the Arabian Sea."

ترجمہ: ۔ دیکھو، خوب سُن لو! ہتھیار ہرگز نہیں ڈالے جائیں گے! ہتھیار ڈالنے کا اُس وقت تک کوئی سوال ہی پیدا
نہیں ہو سکتا، جب تک کہ آخرکار دشمن عملاً ہمارے جسموں کو اٹھا اٹھا کر بحیرۂ عرب میں نہ پھینک دیں۔

سردار عبدالرب نشتر نے بتایا کہ یہ الفاظ سُن کر معجزانہ طور پر ہم لوگوں کی ہمت پھر بندھ گئی، ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
شاید ہم لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ ہمارے قائد کے اعصاب فولاد کے ہیں یا اس سے بھی زیادہ کسی مضبوط چیز کے۔ پھر ہمارے
دلوں نے ہم سے کہا، جب تک تمہیں اس کوہ وقار رہنما کی قیادت حاصل ہے تمہیں بفضلِ خدا شکست کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔
اس پر ہم اُٹھے اور ایک نئے عزم اور ایک نئی ہمت کے ساتھ تعمیرِ ملک و ملت کے کام میں لگ گئے۔

اسی موقع پر سردار صاحب نے حضرت قائدِ اعظمؒ کا ایک اور سبق آموز قول نقل کیا۔ اور اس کی تمہید کے طور پر بتایا کہ ایک دفعہ
قائدِ اعظمؒ سرحد کے علماء اور پیرانِ کرام کو شرفِ ملاقات بخشنے کے لئے ایک محفل میں تشریف لے گئے۔ مدعیں کہ وقت یہ حضرات تعلقات

کے ساتھ قائد اعظم کی موٹر کار تک آ گئے۔ اس وقت علماء و صلحاء کا یہ گروہ فرطِ ادب و عقیدت سے قائد اعظم کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا جب حضرات قائد اعظم کو کار تک پہنچا کر رخصت ہوئے تو نشتر صاحب سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے چلتی ہوئی کار میں قائد اعظم کو مخاطب کیا :

قائد اعظم! آج میرا دل فرطِ مسرت سے کھلکھلا رہا ہے۔

قائد اعظم :۔ کیوں ؟

نشتر :۔ آج میں نے یہ دیکھا کہ وہ صاحبانِ جبہ و عمامہ جن کے سامنے جاتے ہی ہمارے سر فرطِ عقیدت سے جھک جاتے ہیں، اور ہم لوگوں کو اپنے مقابلے میں دنیادار اور حقیر سمجھتے ہیں، وہ ایک ایسے شخص کے پیچھے پیچھے ادب و احترام سے سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے، جو صاحب جبہ و دستار نہیں بلکہ کلین شیون بھی ہے۔ قائد اعظم، بس اسی بات پر میں خوش بھی ہوں اور حیران بھی!

قائد اعظم :۔ تمھیں معلوم ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

نشتر :۔ قائد اعظم :۔ آپ بتائیے۔

قائد اعظم :۔ سنو، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان لوگوں کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ میں ان کے حقوق کو کبھی کسی قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد قائد اعظم نے اپنے بائیں ہاتھ سے نشتر صاحب کی پیٹھ پر تھپکی دی اور کہا کہ "میرے بچے، اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھاری بھی اسی طرح عزت کریں تو یہ خصوصیت پیدا کرو۔"

ہندوستان کے اردو رسائل

اردو میں خود بخود پھلنے پھولنے اور پھیلنے کی جو خصوصیت ہے وہ لسانی تعصب کے اس بدترین دور میں بھی برقرار ہے۔ ہمارے نزدیک ہندی کی ترقی چاہنا جائز بھی ہے اور ہند کے موجودہ خاص حالات کے لئے ضروری بھی، لیکن اس مقصد کے لئے اردو کا گلا گھونٹنا یا اس سے نفرت کرنا یا اس کی جگہ ہندی کے بجائے بدیشی انگریزی تک کو دے دینا (جیسا عثمانیہ یونیورسٹی میں کیا گیا) تعصب کی بدترین مثالیں ہیں۔ بہرحال ایسے حالات میں اردو کے شیداؤں کی ہمت بے حد قابلِ تعریف ہے کہ وہ تند جھکڑوں کے علی الرغم برابر اپنی شمع جلائے جا رہے ہیں۔ دیگر رسائل کے ساتھ لکھنؤ سے "نگار" اور اعظم گڑھ سے "معارف" اپنی پرانی شان سے جاری ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ اگر دہلی سے شاہد احمد کے ساقی کو یہیں نکالا ملا تو اس کی جگہ پرکاش پنڈت کے مؤقر اردو رسالے "شاہراہ" نے سنبھال لی۔ اسی طرح سابق انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالے "اردو" کو بھارت سے ہجرت اختیار کرنی پڑی تو اب اس کی جگہ نئی انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) کا سہ ماہی اردو رسالہ "اردو ادب" جاری ہو گیا ہے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور ہیں۔ اور سہ ماہی "اردو ادب" ان تمام علمی و ادبی خصوصیتوں کا آئینہ دار ہے جو کبھی اورنگ آباد دہلی کے سہ ماہی "اردو" کا طغرائے امتیاز تھیں۔

بھارت کے یہ دونوں نئے اردو رسالے کم و بیش ترقی پسند ہیں، لیکن "ترقی پسندی" نے انھیں بعض دوسرے رسالوں کی طرح محض ایسا

بازاری یا اشتہاری پرچہ نہیں بنا دیا جو علمی گہرائی، ادبی متانت اور فکری توازن سے محروم ہو۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالے "اردو ادب" کا مقالہ افتتاحیہ اُن بلند حوصلوں کی خبر دیتا ہے جو اس ملک میں اردو کے علمبرداروں کو آمادۂ کار کر رہے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں :-

"اردو زبان سے عشق، اب تک جاگیردارانہ خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ اردو ایک ایسی محبوبہ ہے جس کے ساتھ چند روحانی تصورات وابستہ ہیں جس کی خاطر جان بھی دی جا سکتی ہے لیکن جس کی ایک خاص ادا ہی ہمیں پسند ہے۔ اس بت ہزار شیوہ کو، موجودہ زندگی کی روز افزوں ضروریات کے پس منظر میں دیکھنا ہے، اس کو بدلتے، نکھرتے، بڑھتے، پھیلتے، دوسری زبانوں کا رس جذب کرتے اور انہیں اپنا لہو دیتے بھی دیکھنا ہے۔ اسے فارغ البال طبقوں کی ذہنی عیاشی کے لئے وقف کرنے کے بجائے عام زندگی کے تقاضوں کے دوش بدوش لاتا ہے، اسے نئے صنعتی، جمہوری اور سائنٹیفک مسائل سے آشنا کرتا ہے، اس میں علم کی گہرائی اور عشق کی تازگی سمونی ہے، اس کے لئے پڑھنے والوں کا ایک بڑھتا ہوا حلقہ پیدا کرنا ہے اور اس حلقے کی روحانی اور ذہنی خلش کی چارہ گری کرنی ہے اسے ہندوستان کی بنیادیں اور دنیا کی تازہ ہوائیں عطا کرنی ہیں۔ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن بڑا مقدس کام ہے۔ اور ایسی کام زندہ رہنے والا ہے ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو (؟)

اردو کی تحقیق اب تک ایک محدود دائرے میں گھومتی رہی ہے۔ اس نے شاعروں اور ادیبوں اور ان کے کارناموں کے متعلق منتشر معلومات فراہم کرنے پر اکتفا کی ہے۔ اس نے زندگی کے عام حالات، تاریخی میلانات، سماجی مسائل اور اقتصادی الجھنوں سے دامن بچایا ہے۔ ایک طور پر یہ اب تک خلا میں رہی ہے ہم اسے وزن و وقار عطا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اردو تنقید کو شاعری کی آمریت مقامی گروہ بندی اور صنعتی معیاروں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں نثر کا دوسرا آہنگ بھی ہے۔ ہم تنقید کے ذریعے سے تجربات کی پرکھ اور قدروں کے تعین کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ہم ادبی ذوق کی صحیح قیادت کی کوشش کر رہے ہیں اور اچھا ادبی ذوق خود ایک تہذیبی برکت ہے۔

اردو ادب، ارباب فکر و نظر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خاص طور پر اصلاح زبان، اصلاح رسم الخط، قدیم اردو ادب کے شہپاروں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی ذہنی اور ادبی زندگی، بیسویں صدی کے اہم میلانات ہندوستان کی جدید زبانوں کی موجودہ خصوصیات مغربی اور مشرقی ادبیات کے رجحانات پر مضامین لکھیں۔ ان مضامین میں سے خاص خاص کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا جائیگا۔"

تعلیم یافتہ طبقے کی بدحالی

آزادی سے قبل برعظیم ہند و پاکستان تعلیمی لحاظ سے دنیا کے متمدن ممالک کے مقابلے میں بہت پسماندہ تھا۔ یہ پسماندگی اب بھی برقرار ہے۔ کیونکہ صدیوں کی خرابیاں مہینوں میں رفع نہیں ہو سکتیں۔ جہاں تک پاکستانی علاقے کا تعلق ہے، یہ علاقہ جس طرح ہر لحاظ سے نسبتاً زیادہ پس ماندہ تھا، اسی طرح تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی اس کی حالت زیادہ افسوسناک تھی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب ہمارے ملک میں لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے پر خاص توجہ صرف کی جا رہی ہے لیکن ہمیں ابھی اپنی رفتار کو تیز تر کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

عوام کی تعلیم پر مزید توجہ صرف کرنے کے علاوہ ہمیں اس بات کی بھی خاص ضرورت ہے کہ ہم پڑھے لکھے نوجوانوں کی معیشتی زندگی بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ آزادی سے پہلے بھی دونوں ملکوں میں پڑھے لکھے طبقے کی حالت کچھ زیادہ قابلِ رشک نہ تھی لیکن موجودہ گرانی نے تو ان لوگوں کی حالت بعض صورتوں میں اَن پڑھ مزدوروں سے بھی بدتر بنا دی ہے۔

ایک گزشتہ اشاعت میں ہم نے ریڈیو پاکستان کے مترجموں کی زبان پر کچھ اعتراضات کئے تھے لیکن اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ مترجم کے عہدے کے لئے سوا سو ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ مقرر نہیں۔ ظاہر ہے کہ آجکل بہتر ذہن اس تنخواہ پر دستیاب نہیں ہو سکتے، اور اگر ہماری زبان اچھی نہیں تو اس کا ذمہ دار مترجموں سے زیادہ مترجموں کا "گریڈ" ہے۔

یہی حال کالجوں کے معلمین کا ہے۔ ان کو بھی ڈیڑھ سو روپئے سے زیادہ ابتدائی مشاہرہ نہیں ملتا۔

ملک کے عام ادیبوں کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ ہمارے ملکوں کی حکومتوں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر خوش حال ادیب پاکستان اور ہندوستان کے لئے ایک سہارا ثابت ہو سکتے ہیں تو بدحال ادیب ان کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بھی بن سکتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ ذہنی ترقی کی ایک خاص سطح پر پہنچ جائیں ان کے لئے معیشتی پستی بسا اوقات اتنی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے کہ ان کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہ سکتا اور وہ بیرونی سہارے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

"شاہراہ" (دہلی) اس مسئلے پر قلم اٹھاتے ہوئے اپنے ہاں کے ایک بدحال ادیب کا تذکرہ یوں کرتا ہے:

"ہندوستان میں ادیبوں اور خاص طور پر ترقی پسند ادیبوں کی مالی حالت کیا ہے، اس تلخ حقیقت سے کوئی شخص بھی ناآشنا نہیں ہے انسانیت کے یہ علمبردار اپنا خونِ جگر دے کر ادب، آرٹ، کلچر اور عوام کی خدمت کرتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ نظام عوضانہ کے طور پر انہیں فاقے دیتا ہے۔ اور فاقے اور زیادہ محنت اور کم آرام انھیں دمہ اور دق ایسے مہلک امراض دیتے ہیں۔

اور آج ہمیں دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے، حال ہی میں ہمارا ایک اور نوجوان ساتھی شاعر کمال احمد صدیقی اسی عوضانے کے صدقے میں دق کا شکار ہو کر موت کے غار کی طرف بڑھ رہا ہے۔

کمال احمد صدیقی کسی جاگیردار کا بیٹا نہیں ہے نہ چور بازاری اور نفع خوری کے ذریعے ہی اس نے ہزاروں لاکھوں کی تھیلیاں جمع کر رکھی ہیں۔ وہ انسانیت کا شاعر ہے اور انسانیت کے دشمنوں کے خلاف اپنے قلم کے زور سے لڑتا رہا ہے۔ وہ اپنے اور اپنے لواحقین کے پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لئے شبانہ روز محنت کرتا رہا ہے۔ اس کی صحت اس سر توڑ محنت کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اسے آرام کی سخت ضرورت تھی کیونکہ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور اس کے پھیپھڑے چھلنی ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ آرام کرنے کا مطلب کیا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک ترقی پسند شاعر ہوتے ہوئے اس کی ادبی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ مسلسل کام کرتا رہا اور اندر ہی اندر گھلتا چلا گیا اور آج وہ چارپائی سے لگ کر رہ گیا ہے۔

ہم یہاں اس کے متعلقین کی مجبوریوں کا ذکر نہیں کریں گے جو صرف اسی کے کمزور ہاتھوں کی طرف دیکھتے تھے ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ آج کمال احمد صدیقی کے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہے کہ وہ ڈھب سے اپنا علاج کرا سکے۔ وہ زندگی سے مایوس ہو چکا ہے کیونکہ وہ

جانتا ہے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام میں اس ایسے کیڑوں نوجوان صرف علاج نہ ہونے کی وجہ سے قبل از وقت موت کی نیند سو جاتے ہیں۔"

حکومتِ ہندوستان کو اپنے "کمال احمدوں" کی حالت پر خاص توجہ صرف کرنی چاہیئے۔ حکومتِ پاکستان کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے یہاں کے مال احمدوں" کے حال سے بے پروا نہ رہے۔ جوانی اور بھوک کا ملاپ بڑی خطرناک دیوانگی پیدا کر سکتا ہے۔ غیر ملکی آقا اگر [illegible] دیکھنے والوں مقابلتہً نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے، یا ہمارے پڑھے لکھے طبقوں کا معیارِ زندگی پست رکھتے تھے تو اس کا کچھ خمیازہ وہ بھگت چکے ہیں اور کچھ اٹھا ی اور بھگتیں گے لیکن ہماری ملکی حکومتوں کو اس مجرمانہ غفلت سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ یہ ہماری حکومتوں کے استحکام اور ہماری بادی کے دوام کی اولین شرائط میں سے ہے۔

آسام میں زلزلے کی تباہ کاریاں

پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبریں چھپی تھیں کہ ہندوستان کی ریاست آسام ایک نہایت شدید اور نہایت تباہ کن زلزلے کی گرفت میں آگئی ہے۔ آسامیوں کی اس بربادی سے متاثر ہو کر حکومتِ پاکستان نے حکومتِ ہند کو مصیبت زدہ آسامیوں کی امداد کے لئے کئی ہزار من چاول پیش کیا تھا جسے حکومتِ ہند نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس زلزلے سے تباہ ہونے والوں کی سرگزشت اتنی خوفناک اور لرزہ خیز ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی کے اردو رسالے "آجکل" میں اس تباہی کا کچھ حال "آسام کی پہاڑیاں اور قہرِ الٰہی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"آسام ایک پہاڑی علاقہ ہے جسے سرحد پرگیر پہاڑیاں ہیں۔ درمیانی حصے میں کھاسی اور جینتیا پہاڑیاں اور پورب کی جانب ناقابلِ گزر پہاڑیوں کا وہ سلسلہ ہے جو برما اور بھارت کی سرحد کہلاتا ہے اور جنھیں بھارت کے مختلف مشہور سرحدی قبیلوں کے نام پر پٹکوئی۔ ناگا۔ لوشائی اور چین پہاڑیاں کہا جاتا ہے۔ یہ پہاڑیاں دو ہزار سے دس ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اور ایک دوسرے کے متوازی چلی گئی ہیں۔ ان کے درمیان میں بہت گہری وادیاں ہیں۔

ریاست آسام میں ۱۵۔ اگست کو خوفناک بھونچال کی صورت میں جو قہر نازل ہوا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لرزہ خیز اطلاعات ابھی تک زلزلہ زدہ علاقوں سے موصول ہو رہی ہیں کئی مقامات پر پہاڑیوں کا کل سلسلہ بھونچال سے ناپید ہو گیا اور بہت سی پہاڑیاں بیش قیمت جنگلات سے قطعاً محروم ہو گئی ہیں۔ زمین پھٹ جانے سے زیر کاشت اراضی کے وسیع خطے تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ کئی دیہات میں غلے کے ذخیرے زمین میں غرق ہو گئے۔ ڈبروگڑھ کے قریب ریلوے لائنیں پیچ و خم کھا گئی ہیں اور کئی جگہ ٹوٹ کر زمین سے اکھڑ گئی ہیں زمین پھٹنے سے بہت سی سڑکیں ناقابلِ گزر بن گئی ہیں۔ سعدیہ، شمالی لکھیم پور اور کئی دیگر مقامات پر ہزاروں مکانات مسمار ہو گئے ہیں۔ زلزلے کے فوراً بعد دریائے دیہانگ کا نچلا حصہ بالکل سوکھنا شروع ہو گیا کیونکہ بالائی حصے میں پہاڑوں کے بڑے بڑے تودے گر پڑنے سے دریا کا راستہ بند ہو گیا تھا تین دن بعد دریا کا رکا ہوا پانی سیلاب بن کر بہہ نکلا جس سے ڈبروگڑھ کے قصبے کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ ایسی ہی حالت باقی تمام دریاؤں اور ندیوں کی ہوئی۔ اور ہر طرف زلزلے کی تباہی کے ساتھ ساتھ سیلاب کے پانی نے مزید بربادی اور تباہی پھیلا دی۔ دریائے برہم پترا کا پانی اس قدر گدلا ہو گیا کہ تمام مچھلیاں مر گئیں۔ اندیشہ ہے کہ ایسی وادیوں میں جہاں عام حالات میں بھی انسان کا گذر مشکل سے ہوتا تھا۔ تمام قبائل بالکل نابود ہو گئے ہیں۔"

سید علی عباس جلالپوری

مُغلوں کا فنِ مصوّری

اصولِ فن کے لحاظ سے مغل آرٹ ایرانی مصوری کا خوشہ چیں ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں خراسان اور ماوراء النہر کے تیموری شہزادوں کے درباروں میں ایرانی آرٹ نے پرورش پائی اور دبستانِ ہرات میں معراجِ کمال تک پہنچ گیا۔ سلطان حسین بیقا ایک صاحبِ بصیرت نقاد اور باذوق فرماں روا تھا۔ اس کی شاہانہ توجہ کے زیرِ سایہ دبستانِ ہرات کے گلِ سرسبد بہزاد[1] کے فنی امکانات کو حدِ تکمیل تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ قدرت نے بابر کو بھی اس کے عم زاد سلطان حسین کی طرح حسنِ ذوق کا وافر حصہ بخشا تھا۔ اس نے تزکِ بابری میں بہزاد کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ بابر کی زندگی جنگ و جدل کے ہنگاموں میں گزری اس لئے وہ فن کاروں کی سرپرستی نہ کر سکا۔ ہمایوں کے دربار کے سب مصور ایرانی تھے۔ اور ہندوستان میں رہتے ہوئے ملکی اثرات کو قبول کرنے سے گریز کرتے رہے۔ اس لئے اکبر کو بجا طور پر مغل آرٹ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اکبر نے ہر ممکن طریقے سے فنِ مصوری کو ترقی دینے کی کوشش کی اس نے نہ صرف اپنی شبیہ بنوائی بلکہ امراء اور شہزادوں کو بھی تصویریں بنوانے کی ترغیب دی۔ علاوہ ازیں اس نے ممتاز مصوروں کو سرکاری منصب عطا کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ملکی فن کاروں کی تعلیم و تربیت کے لئے اس نے ایران کے اساتذہ کو اپنے دربار میں بلایا۔ میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی اس کے دربار کے مشہور مصور ہو گزرے ہیں۔ خواجہ عبدالصمد شیرازی بہزاد کا شاگردِ رشید تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ ہمایوں سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ بعد میں اکبر نے اسے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ عہدِ اکبری کا ایک اور قابلِ ذکر مصور فرخ بیگ ہے جو پھولوں کی نقش گری میں یگانۂ روزگار تھا۔ اکثر مصور ہندو تھے۔ ان میں دسونت، بساون، مادھو، مکند، رام داس مشہور ہیں۔ دربارِ اکبری کے مصور نہ صرف مختلف مذاہب کے پیرو تھے بلکہ مختلف فنی رسوم و روایات اور علامتی مظاہر کے حامل بھی تھے۔ اسی زمانے میں ہندی اور ایرانی مصوری میں تاثیر و تاثر کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے بعد میں مغل آرٹ کو جنم دیا۔ یہ عہد مغل آرٹ کا دورِ طفولیت ہے جو روایتی لحاظ سے ایرانی آرٹ کے زیرِ اثر تھا۔ اس میں ایرانی استادوں نے پہلی دفعہ ہندی سنگ تراشی اور نقاشی کے شاہکار دیکھے۔ اور ہندی مصور ایرانی خطاطی اور رنگ آمیزی سے روشناس ہوئے۔ امتدادِ زمانہ سے دونوں فنون آپس میں گھلتے ملتے گئے۔ اس جگہ دسونت کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ دسونت نیچی ذات کا ہندو تھا۔ اس کو بچپن ہی سے تصویر کشی کا بے حد شوق تھا۔ خوش قسمتی سے اُسے عبدالصمد شیرازی جیسا اُستاد مل گیا جس نے اس کے سامنے دبستانِ ہرات کے نکات و رموز

---

[1] کمال الدین بہزاد ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوا۔ پیر سید احمد تبریزی کا شاگردِ رشید تھا۔ ۱۴۶۹ء سے ۱۴۷۶ء تک حسین بیقارا کے دربار میں رہا۔ اس کے بعد صفوی خاندان کے ایرانی بادشاہوں کے دربار میں زندگی بسر کی۔ اس کو شبیہ نگاری میں حیرت انگیز مہارت حاصل تھی۔

ب کشائی کی۔ بالآخر اکبر نے اس کے جوہر کو بھانپ لیا اور اپنے دربار میں جگہ دی۔ اکبر کی فرمائش پر اس نے قدیم ہندی اساطیر و روایات کی
پر بنائیں۔ ان میں اسلوبِ نگارش ایرانی تھا مگر مناظر خالص ملکی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا ہم عصر اور حریف بساون بھی خواجہ عبدالصمد
زی کا شاگرد تھا۔ اس نے بھی دسونت کی طرح ایرانی اصولِ فن کا اکتساب کیا مگر اپنی تصاویر میں گرد و پیش کے اثرات کی ترجمانی کی۔ اس
سویز راجہ اور رمینڈ کی شہزادی " فطرت پرستی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس میں ہندوؤں کی کثرت پرستی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اکبر نے مسلمان
کاروں سے ہندی روایات کی تصویریں بنوائیں۔ اور ہندو مصوروں کو مسلمانوں کے تاریخی موضوع کی نقش گری پر مامور کیا اور اس
ہا مغل آرٹ کی بنیادیں استوار کیں۔

جہانگیر کے عہد میں ایرانی اور ہندی آرٹ کی آمیزش پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ جہانگیر مصوری سے گہری دلچسپی لیتا تھا اور اس فن کے
ق سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے عہد میں مغل آرٹ نے ایرانی محرکاتِ فن کو ترک کر کے ملکی گرد و پیش کے زندہ تقاضوں کی طرف
ع کیا۔ جہانگیر مغربی مصوری سے بھی آشنا تھا۔ اس کے نگار خانہ میں اطالوی مصوروں کے علاوہ ڈیورر اور ہالبین کی تصاویر
و دیکھیں۔ وہ چینی مصوری سے بھی واقف تھا اسے حسین قدرتی مناظر سے گہری وابستگی تھی۔ فطرت پرستی اور مشاہدہ کی دقت اور تازگی
خصائص جو اس کے عہد کے آرٹ کو سابقہ زمانے سے ممتاز کرتے ہیں اس کی ذاتی توجہ کے مرہونِ منت ہیں۔ اس نے ہمیشہ خلوص
ارش پر زور دیا۔ اس کو جانوروں اور پرندوں کی تصاویر کھچوانے کا بھی شوق تھا۔ اس کے مرقع میں عجیب و غریب پرندوں اور رنگ
نگ کے پھولوں کے نقوش کثرت سے ملتے ہیں۔ اور جزو نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس عہد کی تصاویر کے حواشی میں پھولوں،
ملوں، بیلوں اور جانوروں کی بے مثل ننھی ننھی تصاویر ملتی ہیں۔ شکار کی تصاویر میں جنگلوں اور پہاڑوں کے مناظر کو بڑی چابک دستی سے
ش کیا گیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس عہد کے آرٹ کی سب سے نمایاں خصوصیت شبیہ نگاری (miniature
portraiture) ہے اس سے پہلے یک رخی تصاویر کھینچنے کا رواج تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں چہرے کا تین چوتھائی حصہ پیش کیا جانے لگا
س سے مصوروں کو آسانی ہوگئی کہ وہ چہرے کی کرداری خصوصیات کو نفسیاتی صداقت کے ساتھ پیش کر سکیں۔ اس جدت نے مصوروں کے
انی تخییل کی ترجمانی میں بڑی مدد دی۔ یا تو وہ ایرانی آرٹ کی جامد رسوم اور اصولی دقائق میں الجھ کر رہ گئے تھے اور یا ایک ہی جست میں
ن سے آزاد ہو کر انھوں نے اپنے منفرد دبستان کی تشکیل شروع کر دی "جہانگیر دبستان" کے استادوں میں ابوالحسن عرف نادر الزماں خاص
طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ آغا رضا کا بیٹا اور شہنشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ شبیہ نگاری میں اُسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس نے ہندوستانی زندگی کے
مختلف نقوش راجپوت آرٹ کے رنگ میں پیش کیے۔ اس نے ہاتھیوں کی بھی چند خوبصورت تصاویر اپنی یادگار چھوڑیں۔ استاد منصور نقاش
کو جانوروں کی تصاویر بنانے میں غضب کی مہارت حاصل تھی۔ اس کی تصاویر آج بھی بے مثل سمجھی جاتی ہیں۔ محمد مراد سمرقندی نے ہرنوں
اور غزالوں کی نہایت حسین تصاویر بنائیں۔ یہ تصاویر برلین کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ شفیع عباسی ایرانی نژاد مصور تھا اور بالعموم پھولوں
کی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ منوہر جس کے جوہر کو اکبر کی نگاہِ دقیقہ رس نے ڈھونڈ نکالا، درباروں کی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ
فرخ بیگ جس نے اکبر کے عہد میں شہرت حاصل کی تھی جہانگیر کے لئے شکار کے مناظر کی تصویریں کھینچتا رہا۔ بھگوتی، اوڈیشن داس، جن کی تصاویر
علی عباس

"ہمایوں" اور "فقیر شیخ کا مکان" دُنیائے مصوری میں شاہکاروں کا درجہ حاصل کر چکی ہیں اس عہد میں فن کی کرتے رہے۔

شاہجہاں کے عہد میں مصوری نے دوبارہ ایرانی آرٹ کی طرف رجوع کیا۔ تصاویر میں پھر روایت پرستی اور رسمی تقلید کی جھلک دینے لگی اور "جہانگیر دبستان" کی فطرت پرستی اور نفسیاتی صداقت غائب ہو گئی۔ اس کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا کہ جس حد تک اصولی نزاکت اور نفاست ادا کا تعلق ہے اس عہد کے مصور سب پر سبقت لے گئے۔ محمد نادر سمرقندی کی یک رخی تصاویر اس لحاظ سے بے مثل ہیں۔ ان میں شاہجہاں، آصف خاں، خلیل اللہ خاں کی تصاویر ناقدین سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ محمد ہاشم نے مغل دربار کے رؤسا، و عمائد کے چند عجیب و غریب خاکے کھینچے ہیں۔ ان میں سے تیمور، بابر، ہمایوں، اورنگ زیب ا حکیم مسیح الزماں کی تصاویر لندن کے عجائب خانے کی زینت ہیں۔ دارا شکوہ کا ذاتی ملازم راج انوپ اس زمانے کے بہترین مصور میں سے ایک تھا۔ اس نے ایک تصویر میں شاہجہاں کو اپنے امراء کے ساتھ بیٹھے ہوئے دکھایا ہے۔ اس تصویر کے تمام چہرے ا نگارش کے بہترین نمونے ہیں۔ اس سلسلے میں شاہجہاں کے بعد شہزادہ دارا شکوہ کا ذکر آئے گا۔ یہ شہزادہ علم و فضل، غور و فکر، تہذیب نفس اور شائستگی کا زندہ نمونہ تھا۔ اس کو مصوری سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کا ذاتی مرقع اس زمانے کے آرٹ کی بہترین یادگار ہے اس میں اکبر سے لے کر شاہجہاں کے عہد تک کی تصاویر ملتی ہیں جو مغل آرٹ کی تدریجی ترقی اور مختلف عصری رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ مرقع انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں جانوروں کی بعض نادر تصاویر کے علاوہ شبیہ نگاری کے کئی شاہکار موجود ہیں۔ ان میں شہزادہ سلیم کی تصویر نہایت دلآویز ہے جس کے حسین پس منظر نے تصویر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ایک مدت گزری میں نے دارا شکوہ کی ایک نادر تصویر جناب فقیر جلال الدین صاحب مرحوم کے نگار خانے واقع بازار حکیماں لاہور میں دیکھی تھی۔ یہ یادگار نقش مغل آرٹ کے بہترین شاہکاروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ شاہجہاں کے ساتھ مغل آرٹ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستانی آرٹ کے مشہور مبصر پرسی براؤن نے مغل آرٹ سے انصاف نہیں کیا۔ وہ لکھتا ہے:

"ہند ایرانی مصوری (مغل آرٹ) دراصل ایرانی مصوری کی ایک شاخ ہے۔ اس کے قدرتی مناظر اور انسانی اشکال میں اس کی رسمی روایتی نگارش اور شوخ رنگوں کے امتزاج کا کھوج ملتا ہے۔"

مندرجہ بالا سطور میں مختصر طور پر ذکر ہو چکا ہے کہ کس طرح مغل دبستان کے استادوں نے مرورِ زمانہ کے ساتھ ایرانی آرٹ کی تقلید ترک کر کے ایک مستقل بالذات دبستان کی بنیاد رکھی جو اپنی منفرد خصوصیات کے لحاظ سے دُنیائے مصوری میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغل آرٹ میں آخر تک "ہرات دبستان" کی ایک خصوصیت نمایاں طور پر باقی رہی یعنی خطاطی کی نفاست جو آج تک اس کی تصاویر میں ہرات اور اصفہان کے مصوروں اور خوشنویسوں کی یاد دلاتی ہے۔ بعد میں پرسی براؤن کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ ایک جگہ اس نے لکھا:۔

"اگرچہ مغل آرٹ کی نشوونما ایرانی مصوری کے اصولِ فن کی گود میں ہوئی لیکن بعد میں اس نے خالص ہندوستانی رنگ اختیار

کرلیا تھا۔ ہندوستان میں اجنتا اور باغ کی فنی روایات ابھی زندہ تھیں۔ اور راجپوت مصوری میں جزوی حد تک ان کے اثرات باقی تھے۔ ایرانی روایات اور راجپوت مصوری کے تاثرات کے حسین امتزاج سے مغل اسکول کی بنیاد پڑی مغل آرٹ کی فطرت پرستی اسے ایرانی اسکول سے اور خطاطی راجپوت اسکول سے ممتاز کرتی ہے۔

مغل آرٹ کی حقیقت نگاری اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ایرانی آرٹ کے چہرے بے حد دلکش ہیں لیکن مغل آرٹ کی شبیہ میں نفسیاتی گہرائی کی وہ جھلک دکھائی دیتی ہے جس کے باعث اُسے دُنیائے مصوری میں ایک بلند مقام حاصل ہوگیا ہے ہرات بہستان کے خوش نما پس منظر کو مغل آرٹ کے ترجمانوں نے حد درجہ وسعت اور پہنائی بخش دی تھی۔

مغل آرٹ درباری آرٹ ہے جس کو شہزادوں اور رؤسا کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں صرف سلاطین اور امراء مجلسی زندگی کے مناظر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ راجپوت آرٹ کے برعکس اس دبستان میں عوام کی زندگی کے مطالعہ سے اجتناب کیا گیا ہے۔ یہاں امراء کی زندگی کو اس تفصیل سے پیش کیا گیا ہے کہ مصور کی نگاہوں سے ان کے بے تکلف خلوت کدے بھی محفوظ نہیں رہے۔ مغرب کی طرح مشرق میں بھی شبیہ نگاری کے فن کو شاہی درباروں اور رؤسا کے محلوں میں عروج حاصل ہوا مغل سلاطین، شہزادے درباری بیش قیمت جواہرات اور زرنگار لباس پہن کر اپنی تصویریں بنواتے تھے ——— ان کے زربفت اور کمخواب کے لباس جن پر گل دار نقوش بنے ہوئے ہیں، مرصع کمر بند، اور آنکھوں کو چندھیا دینے والے جواہرات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر دیکھنے والے پر اپنی شان و شوکت اور امارت کا سکہ بٹھانے کے شائق تھے بعض تصاویر ایسی بھی ہیں جن میں ہلکے اور سادہ رنگ استعمال کئے گئے ہیں اور جن کے حقیقی مناظر بھی سادہ ہیں ان میں بھی مغل آرٹ کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ ہر ایک نزاکت فن اور نفسیاتی خلوص کا بے نظیر نمونہ ہے۔ شہزادوں کے بیش قیمت لباس اور چمکتے ہوئے جواہرات بھی ان کے کردار اور اخلاق کی مخصوص کیفیات کو نہیں چھپا سکتے۔ خطاطی کی لطافت تشکیل کی شگفتگی اور یک رُخی تصاویر کی دقت نگاری شخصیت کے خفیہ پہلوؤں کو بھی اُجاگر کر دیتی ہے اور صاحب تصویر کا کردار ہماری آنکھوں کے سامنے صاف جھلکنے لگتا ہے۔ ان تصاویر میں شہزادوں اور امراء کی خوبیوں، کمزوریوں، ذہانت اور حماقت، عزور اور فیاضی، خست اور عالی ظرفی غرض کہ تمام عادات اور خصائل کو بے رحمی سے بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ شہزادوں اور رئیسوں کی تصاویر کے دوش بدوش ہمیں فقراء اور درویشوں کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ مثلاً میاں میر اور ملا شاہ بدخشانی کی تصویر۔ ان تصاویر میں ہمیں سنجیدہ چہرے اور نورِ باطن سے چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ان تصاویر کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ شاہ کی تصاویر میں بھی ثروت اور امارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے جس سے بے اختیار ایرانی استادوں کی تصویریں یاد آجاتی ہیں۔ جہاں تک جانوروں کی تصویروں اور فطری مناظر کی نقاشی کا تعلق ہے مغل آرٹ کو ایرانی مصوری پر بدرجۂ اولیٰ فوقیت حاصل ہے۔ ان میں فطرت پرستی کی وہی خصوصیت پائی جاتی ہے جو ہندوستانی آرٹ کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گھوڑے کی تصویروں میں بڑی حد تک ایرانی اصول فن کی تقلید کی گئی ہے لیکن ہندوستانی جانوروں مثلاً ہاتھی اور شیر کی تصاویر میں وطنی روایات کی جھلک

مل جاتی

صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ مغل آرٹ میں قدرتی مناظر ہمیشہ پس منظر کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں دنیائے مصوری میں مستقل مقام حاصل ہے۔ ایرانی آرٹ کی منظر نگاری فطری لچک اور تازگی سے عاری تھی۔ ان کے مناظر چند مخصوص بیلوں، بوٹوں اور پھولوں تک محدود تھے۔ مغل آرٹ کے حقیقی مناظر صحیح معنوں میں قدرتی مناظر ہیں۔ یہاں ہمیں پہاڑ اور درخت، پھول اور پودے قدرتی حالت میں جھلملاتے اور لہلہاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مصوروں کو بین السطور کا بخوبی احساس تھا اور وہ فضا میں زندگی کی دھڑکن کو محسوس کر کے اس کی حرارت کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر سکتے تھے۔ ان کے وسیع آسمانوں میں آوارہ بادل ادھر اُدھر تیر رہے ہیں جن کے رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ شفق کے مناظر میں سنہرے ارغوانی، سرخی اور اودے رنگوں کو استادانہ نفاست سے استعمال کیا گیا ہے۔ ان رنگوں کے لطیف تناسب سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے صاحبِ تصویر کے لباس اور پس منظر میں اُگے ہوئے پھولوں پر بھی ان کے غیر مرئی سائے پڑتے جا رہے ہیں۔ جہاں تک روشنی اور سائے یا دھوپ اور چھاؤں (Chiaroscuro) کے اثرات کا تعلق ہے مغل آرٹ نے اس کو ایک نئے فنی تجربے کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ خصوصیت ایرانی آرٹ میں کلیتہً مفقود ہے۔ مغل آرٹ میں حرم کی زندگی کے خلوتی مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ یہاں ہمیں شہزادیاں اور بیگمات زرنگار چولیوں اور پشوازوں میں ملبوس دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے نیم عریاں گدرائے ہوئے جسموں میں آرزو انگیز خستگی اور عشق پرور لطافت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

سیاسی اور معاشرتی انحطاط کے ساتھ مغلیہ عہد کے فنونِ لطیفہ پر زوال آ گیا۔ موسیقی کے ساتھ مصوری بھی مریضانہ تقشف کا شکار ہو گئی۔ مغل آرٹ کے شاہکار غیر ملکی نگار خانوں کی زینت بن گئے اور اس کی شاندار روایات مٹ مٹا کر رہ گئیں۔ قومی تحریک کے ساتھ بنگال میں ملکی فنون کے احیا کی کوششیں شروع ہوئیں۔ پنجاب میں عبدالرحمٰن چغتائی نے ایرانی خطاطی اور رنگ آمیزی کی یاد تازہ کر دی مگر اس کو مغل آرٹ کے استادوں کی مہارتِ فن حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے اکثر موضوع شاعروں سے حاصل کیے ہیں۔ اور مصوری کے مخصوص فنی تقاضوں کو فراموش کر دیا ہے۔ مگر اس کے متعلق کسی آئندہ فرصت میں بحث ہو گی۔

(سید علی عباس جلالپوری)

اقبال

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

غزل سرائی و نواہائے رفتہ باز آور

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

محبت میں اسی کا نام ہے کچھ کام کر جانا
کسی کے واسطے جینا نہ جی سکنا تو مر جانا

مری آزاد فطرت نے جہاں کو رہگزر جانا
نمود و بودِ ہستی کو رمِ برق و شرر جانا

طریقِ عشق میں آخر اٹھا دی قیدِ منزل کی
وہی رہزن ہوا ثابت جسے بھی راہبر جانا

برنگِ نکہتِ سرخوش پسند آوارگی آئی
تجسس میں ترے ہم نے نہ گھر جانا نہ در جانا

مذاقِ عشق و مستی میں اسی کا نام ہستی ہے
جہانِ رنگ و بو سے ایک لغزش میں گزر جانا

کسی کی بزم سے اٹھنا یہ کہہ کر اب نہ آئیں گے
دلِ ناشاد سے مجبور ہو ہو کر مگر جانا

دل آزاری کی لذت کیلئے دل رکھ بھی لیتے ہیں
ستمگر وعدہ کر لے پھر تری مرضی مکر جانا

کتابِ زندگی ہوگی رقم اک تازہ عنواں سے
اسی کا نام ہے شیرازۂ ہستی بکھر جانا

ادب آموزِ حرماں ہوں کسی منعم سے کیا مطلب
متاعِ درد کو گنجینۂ لعل و گہر جانا

ہمیشہ خفتگانِ خاک پر عبرت ہوئی مجھ کو
مگر انجام اپنا بھی کبھی لے بے خبر جانا؟

خدا کی گر نہیں خلقِ خدا کی اس نے خدمت کی
اثرؔ مذہب کو جس نے ماورائے خیر و شر جانا

اثر لکھنوی

حضرتِ فضاؔ جالندھری

نظر ہے کشتۂ بیدادِ انتظار ہنوز
پکارتا ہے انھیں کوئی بار بار ہنوز

اگرچہ نالۂ پیہم دلیلِ ہستی ہے
مگر نہیں ہمیں اپنا بھی اعتبار ہنوز

ازل سے کیسی پلائی تھی تونے اے ساقی
اٹھا رہا ہوں جو ہیں کلفتِ خمار ہنوز

نہ اب رہا ہے وہ دامن نہ وہ گریباں ہے
مگر جنوں کے نہیں بند کار و بار ہنوز

بہت سے قافلے گزرے ہیں راہِ ہستی میں
میں پا رہا ہوں ہر اک دشت میں غبار ہنوز

نکل کے پردے سے آ صحنِ باغ کی جانب
بہار میں نہیں رعنائیِ بہار ہنوز

نگاہ کر مرے آئینۂ تمنا پر
بنا ہوا ہوں ترا نقشِ یادگار ہنوز

سنانے والے سنا پھر کوئی ترانۂ حق
کہ انتظار میں منصور کے ہے دار ہنوز

یہ ہنس رہے ہیں ابھی ان کو اور ہنسنے دو
نہیں نظر میں گلوں کی، مآلِ کار ہنوز

فضاؔ وہ یاد ہے صحرا نوردیٔ وحشت
چبھے ہوئے ہیں کفِ پا میں چند خار ہنوز

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی

ہر نفس کو شمار کرتا ہوں — یوں ترا انتظار کرتا ہوں

ایک دھوکا ہے میرا ضبطِ جنوں — انتظارِ بہار کرتا ہوں

حُسن پر گو یقیں نہیں مجھ کو — عشق پر اعتبار کرتا ہوں

زندگی کا تو اعتبار نہیں — تم پہ میں اعتبار کرتا ہوں

دل اگر مائلِ سکوں ہو کبھی — خود اُسے بے قرار کرتا ہوں

اک نگاہِ عتاب کی خاطر — التجائیں ہزار کرتا ہوں

دیکھ جائیں وہ اک نظر اے عرش
بس یہی انتظار کرتا ہوں

حضرتِ عرش کا مجموعۂ کلام "ہفت رنگ" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ قیمت تین روپے۔ پتا۔ کتاب محل الفنسٹن روڈ۔ کراچی۔

پروفیسر شمس الدین صدیقی

باپ

(ڈراما)

(پی جیرالڈی سے مستفاد)

لیاقت .. .. .. ایک مشہور انجینیر

سعید .. .. لیاقت کا بیٹا جو ایم اے میں تعلیم پا رہا ہے

نعیم .. .. .. سعید کا ہم جماعت اور دوست

صوفیہ .. .. سعید، نعیم کی ہم جماعت اور نعیم کی محبوبہ

مقام - لیاقت کا مکان

زمانہ - موجودہ

(سعید اپنے مطالعے کے کمرے میں مصروفِ مطالعہ ہے ۔ ریڈیو سیٹ سے دھیمی دھیمی موسیقی کی آواز سنائی دے رہی ہے ۔ سعید بلند آواز سے کتاب پڑھنے لگتا ہے)

سعید :- (پڑھتے ہوئے) "عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ نازک مزاج اور حساس ہوتی ہے ، لیکن وہ جس قدر آسانی سے روٹھ جاتی ہے اسی آسانی سے من بھی جاتی ہے" ــــ بکواس ہے سب خیالی باتیں ہیں ، ہوائیاں ہیں ، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مسخرے نفسیات پر کتاب تو لکھتے ہیں لیکن زندگی کے تجربے اور مشاہدے سے اپنے خیالات کی تصدیق کیوں نہیں کر لیتے ! عورت کی نفسیات انھیں کیا معلوم ! اس پر تو صرف کسی عورت ہی کو لکھنے کا حق ہے بلکہ دو عورتوں کو مل کر لکھنا چاہیئے ۔ ایک نوجوان دوسری معمر ، جب کہیں معقول بات معلوم ہوگی ۔

(کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور سعید سر اٹھا کر دیکھتا ہے ۔ نعیم داخل ہوتا ہے)

نعیم :- اوہو ! ریڈیو بازی ہو رہی ہے اور ساتھ ساتھ مطالعہ بھی ! خوب بھئی ۔ قائل ہوگئے ہم تو ! یعنی ایک ہی وقت میں کان آنکھ ، روح اور ذہن سب کی تشفی ! واللہ کمال کر دیا یار تم نے تو !

سعید :- تشفی کیا خاک ہوگی اور الجھن ہو رہی ہے ۔

نعیم :- تو پھر ریڈیو بند کیوں نہیں کر دیتے ۔

سعید :- الجھن ریڈیو کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس لغو کتاب کی وجہ سے !

نعیم :- آسان ترکیب بتاؤں ؟ پھینک دو اٹھا کر کتاب کو !

شمس الدین

علاج یہی ہے۔ میں تو ہمیشہ یہی کرتا ہوں۔ کیا کتاب ہے؟
نہ وغیرہ تو نہیں؟
:- نہیں یار، ایک بیوقوف نے عورت کی نفسیات پر
ھی ہے اور بکواس کی ہے۔ اوٹ پٹانگ باتوں کے سوا کچھ نہیں
:- اجی ہم سے پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے، کتابوں میں کیا رکھا
پھینکو اسے ردی کی ٹوکری میں!
:- اچھا ریڈیو تو بند کردو، پھر اطمینان سے باتیں ہونگی۔
(ریڈیو کے بند ہونے کا کھٹکا ہوتا ہے۔ اور موسیقی
رک جاتی ہے)
:- اچھا! اچھا یہ بتاؤ آج تم کالج کیوں نہیں آئے؟
:- یونہی۔ جی نہیں چاہتا تھا۔
:- آج تم نہ آکر بڑے نقصان میں رہے۔ پروفیسر قریشی کا
بڑے مزے کا رہا۔ لڑکیاں تو جماعت میں ایسی شرمائی ہیں
کچھ نہ پوچھو۔ وہ منظر تو بس دیکھنے کی چیز تھی! یہ نصیب اللہ اکبر
نے کی جاتی ہے!
ید :- کیوں؟
:- قریشی نے اپنے زمانہ قیام یورپ کے کچھ تجربے اور مشاہدے
سنائے۔ باتیں تو کچھ زیادہ ایسی ویسی نہ تھیں لیکن لڑکیاں پھر
ہاں ہیں۔ ایسی کٹ کٹ گئی ہیں کہ کیا کہوں! ایک تو بیچاری
م کے مارے اٹھ کر ہی چلی گئی!
ید :- کون؟
م :- سوچو کون ہوسکتی ہے؟
عید :- تمہاری صوفیہ؟
عم :- نہیں جی، وہ تو کن انکھیوں سے میری ہی طرف دیکھتی
زیر لب مسکراتی رہی۔ وہ کیوں جاتی!

سعید :- راحت؟
نعیم :- اونہوں! وہ بھی اپنے مذاق کو دیکھتی رہی، وہ کیوں
جاتی!
سعید :- خیر، کوئی ہو، مجھے کیا!
نعیم :- تم بھی یار عجب کوڑھ مغز ہو، کوئی کیوں ہوتی، تمہاری
حمیدہ تھی وہ!
سعید :- حمیدہ! سچ؟؟
نعیم :- اور اگر آج تم آجاتے تو وہ بیچاری کیوں جاتی بھلا!
یار تم نے کیا سنہرا موقع کھو دیا۔ وہ دبی دبی مسکراہٹیں، وہ چوری
چھپی نگاہیں، وہ لال لال شرمیلے گال، افوہ! کیا غضب کا منظر تھا
سعید :- خیر!

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

نعیم :- ہاں ٹھیک ہے، اب تو تم بڈھے ہوگئے، بال سفید
ہوگئے۔ اب بھلا زندگی میں کیا دلچسپی باقی رہ گئی۔
سعید :- نعیم! میرے احساسات کا اس طرح مذاق نہ اڑاؤ۔
نعیم :- پھر کیا کروں؟ دو دن تک اگر حمیدہ نے بات نہ کی،
اور خط کا جواب بھی نہ دیا تو ایسا کونسا سانحہ ہوگیا کہ تم اتنے مایوس
اور بیزار ہو بیٹھے؟ یہ بھی کوئی مردانگی ہے؟ ارے میاں یہ سب ناز
نخرے ہیں سمجھے؟ کیا وہ درحقیقت ناراض ہوسکتی ہے؟
سعید :- کیوں نہیں ہوسکتی؟ میں نے شادی کی بات چند دنوں کے
لئے ٹال دی تھی، یہ اسی کا غصہ ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں ایم۔ اے
کرنے سے پہلے شادی کیونکر کرسکتا ہوں؟
نعیم :- ظاہر ہے، ظاہر ہے۔ کیا وہ نہیں سمجھتی! سب سمجھتی ہے۔
صرف ستا رہی ہے، ورنہ کیا اسے خود ایم۔ اے کرلینے کی خواہش

نہیں ہوگی۔

سعید:۔ ارے بھئی، ان عورتوں کی خواہشوں کا کیا بھروسا!
میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری جماعت کی سب لڑکیاں صرف تفریح
اور وقت گزاری کی خاطر ایم اے کر رہی ہیں۔

نعیم:۔ بجز ایک کے۔ صوفیہ!

سعید:۔ تم تو لوگے ہمیشہ اسی کی بچ۔ کیوں نہ ہو، عاشق صادق
جو ٹھہرے!

نعیم:۔ میں کوئی طرفداری نہیں کر رہا ہوں، دیانت داری کی بات
کہتا ہوں۔

سعید:۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے
ہی، تمھارا دین اور ایمان سب کچھ صوفیہ ہی تو ہے نا!

نعیم:۔ سولہ صد درست! اور تمھارا دین و ایمان!

سعید:۔ وہ جو مجھ سے روٹھی ہوئی ہے۔ عجب مشکل ہے ان
لڑکیوں سے، صورتِ حال کو تو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں
بس جھٹ سے منہ پھلا لیا!

نعیم:۔ تو مناتے کیوں نہیں؟ کیا منانے میں کچھ کم مزا آتا ہے؟
میں تو تبدیلِ ذائقہ کی خاطر ایسی چیزوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔
لیکن تم تو ہو نرے بدھو! عشق کرنے کا ڈھنگ آتا نہیں تو اس
میں ٹانگ ہی کیوں اڑائی؟

سعید:۔ بھئی منانا ونانا تو مجھے آتا نہیں۔ میں نے تمھاری صوفیہ
کے ہاتھ بس وہ خط بھیج دیا تھا جس میں یہ خوب وضاحت کر دی تھی
کہ میں اس وقت شادی کیوں نہیں کرسکتا۔ سیدھی بات ہے میں
اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہوا نہیں ہوں اور ابا جان کو زیر بار کرنا
نہیں چاہتا۔ اب اتنی صاف بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آئے تو
کیا کروں؟

نعیم:۔ کپڑے پھاڑ کر صحرا میں نکل جاؤ یا خودکشی کرلو۔

سعید:۔ خودکشی تو نامناسب ہے کپڑے پھاڑ لینا ہی آس
لیکن صحرا کہاں ہے؟

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر!
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

نعیم:۔ اب کہیں جاکر تمھارا دماغ درست ہوا ہے۔

سعید:۔ کیا خاک درست ہوا ہے؟ خدا جانے وہ میرے
تامل کو کیا کیا معنی پہنا رہی ہے اور کیوں اتنی خفا ہوگئی۔
پڑھ لکھ کر بھی عورت عورت ہی رہتی ہے۔

نعیم:۔ تو کیا مرد بن جائے گی؟

سعید:۔ تم سے تو نعیم ناک میں دم ہے، ہر بات کو مذا
اڑا دیتے ہو۔

نعیم:۔ تم باتیں ہی ایسی فضول کرتے ہو۔

سعید:۔ تمھارے نزدیک تو ہر بات فضول ہی ہے۔

نعیم:۔ ہاں، بجز صوفیہ کے ذکر کے۔

سعید:۔ (چڑکر) تو کیا میں صبح سے شام تک صوفیہ کی تع
ہی کرتا رہوں۔

نعیم:۔ ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے!

سعید:۔ اور حبیب صرف تمھارا ہے، میرا نہیں ہے کو

نعیم:۔ اچھا بھئی جانے دو۔ خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ اک
خوش خبری سناؤں؟

سعید:۔ کہو۔

نعیم:۔ صوفیہ آج حمیدہ کے ہاں گئی ہے، اسی بارے میں
گفتگو کرنے کے لئے۔ ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی؟

سعید:۔ سچ؟ (خوش ہوکر) پہلے کیوں نہیں کہا؟

نعیم :۔ پہلے کہہ دیتا تو تمھارے مزاج کی ان بدلتی ہوئی کیفیتوں کا لطف کیسے اٹھاتا ؟

سعید :۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری ۔

نعیم :۔ بڑے جان دینے والے ہو !

سعید :۔ کیا کالج سے دونوں ساتھ ہی گئی ہیں ؟

نعیم :۔ ہاں ۔

سعید :۔ اور اس کا نتیجہ کب معلوم ہوگا ؟

نعیم :۔ آج ہی صوفیہ آئے گی یہاں ۔ ہمارا آج سینما کا پروگرام ہے یہیں سے اکٹھے چلنے کی تجویز ہوئی تھی ۔

سعید :۔ خوب، خوب ! ظاہر ہے کہ اس پروگرام میں میرے شریک ہونے کا تو سوال ہی نہیں ۔

نعیم :۔ وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن کل تم بھی تو حمیدہ کے ساتھ سینما دیکھو گے ۔ آج ہم کل تمھاری باری ہے ۔

سعید :۔ میں ایسا خوش قسمت کہاں ؟

نعیم :۔ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں ۔

سعید :۔ تم سے کتنا کہا کہ تم بے محل شعر نہ پڑھا کرو ۔

نعیم :۔ لیکن یہ تو مصرع ہے شعر نہیں ہے ۔ اور بھلا بے محل کیوں ہے ؟

سعید :۔ اس کا پہلا مصرع کیا ہے، جانتے ہو ؟

نعیم :۔ ہاں جانتا ہوں لیکن وہ تو پڑھا نہیں میں نے اس وقت !

سعید :۔ خیر جاؤ، معاف کیا مگر آئندہ احتیاط کرنا ۔ اچھا حمیدہ کے بارے میں مجھے اور کچھ بتاؤ ۔ آج اور کیا کیا ہوا ؟

نعیم :۔ شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ !

سعید :۔ آج طبیعت بہت رواں اور شگفتہ معلوم ہوتی ہے ۔ کیوں نہ ہو سینما کا پروگرام ہے نا ! اچھا میاں جاؤ، مٹھائی کرو، تم الگ عیش مناؤ ۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا !

نعیم :۔ ارے عقلمند،

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

سعید :۔ واہ بھئی واہ (طنزیہ انداز میں) کیا باموقع شعر ہے نعیم تم ایم۔ اے کا خیال چھوڑ دو ۔

نعیم :۔ کیوں فیل ہو جاؤں گا ؟

سعید :۔ نہیں بلکہ ایم اے کر کے اپنی یونیورسٹی کا نام بدنام کرو گے اور ہم سب لوگوں کی ناک کٹاؤ گے ۔ ہم پر رحم کرو خدا کے لئے رحم کرو ۔

نعیم :۔ اجی نہیں، اطمینان رکھو، میں ایم۔ اے کے بعد پی ایچ ڈی بھی کرنے والا ہوں ۔

سعید :۔ تاکہ حماقت کی ڈاکٹری بھی حاصل ہو جائے ۔ بھلا کون سے موضوع پر مقالہ لکھو گے ؟

نعیم :۔ موضوع کا کیا ہے کسی بھی موضوع پر لکھ دوں گا، ڈگری تو مل ہی جائے گی ۔ مقالہ تو لکھنا ہے انگریزی میں ۔ اور انگریزی میں اُردو کے متعلق جو باتیں بھی لکھو گے وہ نئی معلوم ہوگی، ہے نا ؟

سعید :۔ ٹھیک ہے لیکن ہم اپنے موضوع سے ہٹ گئے ۔

نعیم :۔ یعنی صوفیہ اور حمیدہ کے ذکر سے ؟

سعید :۔ ہاں تو بتاؤ حمیدہ نے اور کیا کیا اور کیا کہا ! سب کچھ تفصیل سے بتاؤ ۔

نعیم :۔ اس کے لئے تو صوفیہ کا انتظار کرو ۔ ان دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی ہے ۔

سعید :۔ تمھارے خیال میں وہ مان گئی ہوگی ؟

نعیم :۔ اس میں کیا شک ہے۔

سعید :۔ اور کل سینما چلنے کے لئے تیار ہو جائیں گی؟

نعیم :۔ یقیناً۔ میں نے کہا نہیں یہ تو سب عمر زنے ہیں، بشتر عمرزنے۔

سعید :۔ بشتر عمرزنے، نعیم میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اسی وقت ایم۔ اے سے اپنا نام کٹالو۔ مجھ پر رحم کرو۔

نعیم :۔ تو اس کے لئے پہلے صوفیہ کو تیار کرو۔ میں تو صرف اسی کی خاطر کالج جاتا ہوں۔

سعید :۔ اسے کہتے ہیں اونٹ کے گلے میں بلی باندھنا سمجھے؟

(باہر سے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور لیاقت داخل ہوتا ہے)

نعیم :۔ آداب عرض۔

لیاقت :۔ جیتے رہو۔ نعیم کہو اچھے تو ہو؟

نعیم :۔ جی، اللہ کا فضل ہے، آپ بزرگوں کی دعا ہے۔

لیاقت :۔ سعید، خبریں سنیں، وقت ہوگیا کیا؟

نعیم :۔ وقت تو ختم ہوگیا، ہم باتیں کر رہے تھے اس لئے خبریں نہ سن سکے۔

لیاقت :۔ میں اسی غرض سے آیا تھا، خیر اور کہو کیا حالات ہیں؟

سعید :۔ نعیم، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

(سعید چلا جاتا ہے۔ اس کے پیروں کی چاپ ختم ہو جانے کے بعد)

لیاقت :۔ معلوم ہوتا ہے میں تم دونوں کی بات چیت میں مخل ہوا۔

نعیم :۔ جی نہیں، اچھا ہی ہوا، میں خود آپ سے ملنا چاہتا تھا، پھر اس خیال سے رک گیا کہ آپ کام میں مصروف

لیاقت :۔ پھر یہ سعید کیوں چلا گیا؟ میری دخل اندازی اسے گراں معلوم ہوئی ہے، ورنہ اس طرح میرے آتے ہی کا چلا جانا (ہنس کر) کیا مطلب رکھتا ہے؟

نعیم :۔ (ہنس کر) جی وہ آپ نے سنا ہوگا۔ آپ آمد تم برخاست!

لیاقت :۔ (ہنستے ہوئے) خوب، خوب، کیا نکتہ ہے

نعیم :۔ شکریہ۔ یہ سب سعید کی صحبت کا طفیل ہے، ورنہ آنکم کہ من دانم!

لیاقت :۔ نعیم، ایک بات بتاؤ گے؟

نعیم :۔ ضرور، شوق سے پوچھئے۔

لیاقت :۔ سعید چند مہینوں سے کھویا کھویا کیوں رہتا ہے

نعیم :۔ یہ محض آپ کا وہم ہے۔ کوئی خاص بات تو نہیں

لیاقت :۔ ہاں، جوانی میں عشق و محبت کوئی خاص بات نہیں۔ یہ تو ہوتی ہی ہے۔ ہونی ہی چاہیئے۔

نعیم :۔ جی۔

لیاقت :۔ لیکن اس میں اسے تامل کیوں ہے۔ شادی جلد کیوں نہیں کر لیتا؟

نعیم :۔ شادی؟ ایم۔ اے کے بعد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے

لیاقت :۔ کیوں؟ اب کر لینے میں کیا حرج ہے؟ یہ تو میری عین خواہش ہے لیکن وہ مجھ سے بولتا نہیں۔

نعیم :۔ یہ تو حمیدہ کی بھی عین خواہش ہے۔

لیاقت :۔ اچھا تو حمیدہ ہے اس کا نام؟ کیا وہ ساتھ ہی پڑھتی ہے؟

نعیم :۔ جی ہاں۔

لیاقت: طبیعت کی کیسی ہے؟

نعیم:- شریف، حیادار اور تہذیب یافتہ۔ آج ہی کا ذکر ہے کہ ایک پروفیسر صاحب نے نہایت بے تکلفی کے انداز میں اپنے یورپ کے تجربات اور مشاہدات کا ذکر کیا۔ یوں تو سب لڑکیاں شرما گئیں لیکن صرف حمیدہ تھی جو شرم و حیا کی وجہ سے اٹھ کر چلی گئی۔ باقی سب بیٹھی رہیں۔

لیاقت:- بہت خوب! تو پھر نیک کام میں تاخیر کیوں؟ سعید کی والدہ کے انتقال کے بعد پندرہ برس سے گھر سونا سونا ہے۔ سعید شادی کر لے تو شاید اس میں پھر کچھ رونق ہو جائے۔ وہ مجھ سے کہتا کیوں نہیں؟ یہ تامل کس لئے؟

نعیم:- تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کے بعد شادی کرنے کا ارادہ ہے اس کا!

لیاقت:- تو کیا وہ اب شادی کر لے تو مجھ پر کوئی بہت بڑا بار پڑ جائے گا؟ اللہ کے فضل سے میری آمدنی تو اب اتنی ہو گئی ہے کہ وہ چار شادیاں بھی کر لے تو بہ آسانی سنبھال سکتا ہوں۔

نعیم:- پھر بھی وہ آپ کو اس بارے میں زیر بار کرنا پسند نہیں کرتا۔

لیاقت:- یہ جوانی کا جوش ہے۔ جوانی میں ایسے ہی خیالات رہتے ہیں۔ خود داری، خود پرستی، آزادی یہ سب جوانی کے کرشمے ہیں لیکن اتنا پڑھ لکھ کر بھی کیا اسے عقل نہیں آئی؟ عورت کے قدم سے گھر میں نہ صرف رونق بلکہ برکت بھی آجاتی ہے۔ اور میں تو گھر کے سونے پن اور بے رونقی سے تنگ آگیا ہوں۔

نعیم:- کیا آپ نے اپنے یہ خیالات سعید پر بھی کبھی ظاہر کئے ہیں؟

لیاقت:- اشارۃً۔ صاف صاف نہیں۔

نعیم:- اشارۃً! کیوں! ممکن ہے اس نے اشارے سمجھے نہ ہوں۔

لیاقت: ممکن ہے لیکن کیا کروں۔ وہ مجھ سے کچھ اس قدر کھچا کھچا اور دور دور رہتا ہے کہ میں تو اس سے بات چیت کرنے کو بھی ترس جاتا ہوں۔ خدا جانے یہ اجنبیت اور فاصلہ کب ختم ہو!

نعیم:- وہ آپ سے مرعوب ہے اور ڈرتا بھی ہے۔

لیاقت:- ڈرنے کی کیا بات ہے؟ کیا میں کوئی ہوّا ہوں؟ بھوت پریت ہوں! دیو ہوں؟

نعیم:- آپ کے تجربے، قابلیت اور بزرگی نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ آپ سے اس کا ڈرنا آپ کی عظمت کے اعتراف کے طور پر ہے نہ کہ اور کسی وجہ سے۔

لیاقت: تعجب ہے یہ تم الٹی بات کر رہے ہو۔

نعیم:- الٹی بات۔ میں سمجھا نہیں آپ کا مطلب!

لیاقت:- میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ لیاقت میں مجھ سے دو قدم آگے ہے۔ میں انجنیری کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ عام بات کہہ رہا ہوں۔ لیاقت اور ذہانت میں تو میں اس سے ڈرتا ہوں۔

نعیم:- گویا دونوں ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں اور اسی لئے یہ اجنبیت ہے جس کا آپ کو گلہ ہے۔

لیاقت:- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ۲۲ سال سے وہ میرے ساتھ ہے پھر بھی مجھ سے اتنا دور کیوں ہے؟ نہ کبھی مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات کہتا ہے نہ کوئی فرمائش کرتا ہے نہ کوئی بحث کرتا ہے بلکہ اگر میں کبھی کوئی مسئلہ اٹھاؤں بھی تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا ہے اور بات چیت آگے بڑھتی ہی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں

شمس الدین

کہ وہ مجھے باپ سمجھ کر مجھ سے الجھے، مچلے، ضد کرے، الٹی حجت
کرے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

نعیم :۔ تو وہ اب بچہ بھی تو نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہے اس سے
آپ بچپنے کی حرکتوں کی امید کیوں رکھتے ہیں؟

لیاقت :۔ پھر بھی وہ میرے لئے تو بچہ ہی ہے نا، وہ سات
سال کا تھا جب اس کی ماں اس سے چھن گئی۔ اس کے بعد سے
میں ہی اس کا باپ بھی تھا اور ماں بھی لیکن جیسے جیسے وہ
بڑا ہوتا گیا بجائے اس کے کہ مجھ سے قریب تر ہوتا اور دور ہی
ہوتا رہا حتیٰ کہ اب وہ میرے کہنے پر شادی کرنے سے بھی
جھجکتا ہے۔ آخر یہ میری ساری کمائی، یہ مکان، یہ مال اسباب
کس کا ہے؟ کیا یہ سب میں اپنے لئے کر رہا ہوں؟

نعیم :۔ قبلہ! سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک میں آپ کے ان
خیالات اور احساسات سے واقف نہ تھا میں بھی سعید کی تائید
میں تھا لیکن آپ کے سے خیالات والے باپ شاید دنیا بھر
میں گنتی ہی کے ہوں!

لیاقت :۔ تم جب باپ بن جاؤ گے تو معلوم ہوگا کبھی باپ
اس قسم کے ہوتے ہیں۔ سعید کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی چومنے
کو میں ترس گیا ہوں۔ لیکن اس کا موقع ہی نہیں آتا۔

(سعید کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

لیاقت :۔ لو سعید آ رہا ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔

(ایک دروازے سے سعید آتا ہے، دوسرے
سے لیاقت چلا جاتا ہے)

سعید :۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں اب تک؟

نعیم :۔ بڑے مزے کی باتیں۔

سعید :۔ صوفیہ کے بارے میں!

نعیم :۔ نہیں، حمیدہ کے بارے میں۔

سعید :۔ کیا؟ ابا جان کو حمیدہ کا کیا علم؟

نعیم :۔ انھیں سب کچھ معلوم ہے۔

سعید :۔ تم نے کہہ دیا؟

نعیم :۔ نہیں، تم نے۔

سعید :۔ میں نے! میری تو اُن سے کبھی اس بارے میں بات
چیت نہیں ہوئی۔ میں نے تو نہیں کہا۔

نعیم :۔ خیر، تم نہ سہی، تمھارے کھوئے کھوئے پن نے سب
کچھ کہہ دیا۔ ع وہ چھپایا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا۔

سعید :۔ یہ فضول باتیں چھوڑو، تمہیں نے کہہ دیا ہوگا۔

نعیم :۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔

سعید :۔ تم مذاق تو نہیں کر رہے؟

نعیم :۔ لیکن میں پوچھتا ہوں اس میں حرج ہی کیا ہوا! کیا کسی
سے محبت کرنا کوئی جرم ہے؟

سعید :۔ گویا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے سب کچھ کہہ دیا
ہے!

نعیم :۔ میں نے نہیں، تمہی نے خود ہی سب کچھ ظاہر کر دیا ہے

سعید :۔ پھر ابا جان نے کیا کہا؟

نعیم :۔ بہت خفا ہوئے کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کے عشق بازی کے
چکر میں پڑنا میرے لڑکے کو زیب نہیں دیتا

سعید :۔ سچ؟

نعیم :۔ مجھ سے کہا کہ تمھیں سب اونچ نیچ سمجھا دوں گا۔

سعید :۔ میں خود ہی سب باتیں جانتا ہوں۔ اسی لئے تو بھی
شادی کرنا نہیں چاہتا۔

(صوفیہ چپکے سے آتی ہے اور دروازے ہی میں کھڑی ہو کر کہتی ہے)

صوفیہ :- تو وہ کب شادی کے لئے مر رہی ہے ؟

(سعید اور نعیم پلٹ کر دیکھتے ہیں)

سعید و نعیم :- (بیک آواز) اوہ! صوفیہ! تم ؟

نعیم :- کیا تم ہماری باتیں سُن رہی تھیں، کب آئیں ؟

صوفیہ :- ابھی ابھی۔

سعید :- اچھا بیٹھو۔ میں ذرا چائے کے لئے کہہ آؤں ؟

(سعید کے مکان کے اندر جانے کی آہٹ
سنائی دیتی ہے)

نعیم :- سعید کے والد سے ابھی ابھی میری بات چیت ہوئی
وہ تو چاہتے ہیں کہ سعید جلد از جلد شادی کرلے۔

صوفیہ :- واقعی ؟

نعیم :- ہاں، بہو کا انھیں بڑی شدّت سے انتظار ہے۔

صوفیہ :- تو پھر یہ سعید کیوں پیچھے ہٹ رہا ہے ؟

نعیم :- بقول لیاقت صاحب کے جوانی کا جوش ہے، خودداری
خود پرستی اور آزادی کا سودا ہے، اس لئے۔

صوفیہ :- وہ تو ٹھیک ہی ہے، وہ تو خود ہی ابھی اپنے والد کے
زیر پرورش ہے، شادی کس بنا پر کرے ؟

نعیم :- تم نے لیاقت صاحب کو سُنا نہیں۔ میں بھی یونہی سوچتا
تھا لیکن اب میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے اور سعید کی جلد از
شادی کی تائید میں ہوں۔

صوفیہ :- تعجب ہے!

(سعید واپس آتا ہے، اس کے پیروں کی چاپ
پھر سنائی دیتی ہے)

سعید :- چائے وغیرہ کے لئے باورچی کو کہہ آیا ہوں اب اطمینان
سے باتیں ہوں گی۔

نعیم :- بہت اچھا کیا، مجھے تو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

سعید :- "پیاس"! بھئی خوب! بڑا عمدہ لفظ تراشا ہے نعیم
اب تم کو اپنا نام ایم۔ اے سے کٹا لینے کی ضرورت نہیں!

صوفیہ :- اچھا! تو یہ ارادہ تھا کیا ؟

نعیم :- ہاں، سعید کا اصرار تھا کہ میں نام کٹوا لوں کیونکہ میں ایم اے
کروں گا تو یونیورسٹی کا نام بدنام ہوگا۔

سعید :- اور ہم سے لائق لوگوں کی قدر و قیمت بھی گھٹ
جائے گی، لیکن اب تمھیں اس کی ضرورت نہیں شوق سے ایم اے
کرو۔

صوفیہ :- بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی۔

نعیم :- وہ تو مجھے کرنا ہی ہے۔

صوفیہ :- خدا مبارک کرے۔ عمر بھر بس ڈگریاں ہی لیتے رہو

نعیم :- گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔

سعید :- خیر، یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ اب کچھ کام کی باتیں
ہو جائیں۔

صوفیہ :- یعنی ؟

سعید :- حمیدہ سے کیا کیا باتیں ہوئیں ؟

صوفیہ :- بہت مزے مزے کی۔

نعیم :- خیر، وہ تو چھوڑو، بعد میں بھی معلوم ہو سکتی ہیں۔ پہلے تم
یہ تو سنو کہ تمھارے والد سے میری کیا باتیں ہوئیں ؟

سعید :- وہ تو معلوم ہی ہے۔ مجھے پہلے صوفیہ سے اپنے
کام کی بات سُن لینے دو۔

نعیم :- کیا خاک معلوم ہے، تم تو بس بدھو ہو۔

سعید :- کیا مطلب ؟

نعیم :- مطلب یہ کہ تمھارے "پتا جی" تم سے ذرا بھی ناراض نہیں

سعید:۔ اور یہ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا کہ وہ خفا ہیں
نعیم:۔ جھوٹ تھا۔ وہ ناراض ضرور ہیں لیکن اور کسی وجہ سے
سعید:۔ یعنی؟
نعیم:۔ ان کو رنج اس بات کا ہے کہ تم نے اپنے دل کی بات ان سے کیوں نہ کہی؟ انھیں غیر کیوں سمجھا؟
سعید:۔ تو کیا میں ان سے جا کر اپنی عاشقی کی واردات بیان کرتا؟
نعیم:۔ کچھ تو بتا دیتے۔ آخر وہ تمھارے باپ ہیں۔ تمھارے تمام معاملات سے واقف ہونے کا انھیں حق ہے۔
صوفیہ:۔ یہ بھی خوب۔
نعیم:۔ اور وہ تو اس بات سے بہت رنجیدہ ہیں کہ تم ان سے کھنچے کھنچے، دور دور رہتے ہو، بات نہیں کرتے۔
سعید:۔ عجیب بات ہے۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں، اس لئے میں ان کے کام کاج میں حرج پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ اور پھر وہ میرے بزرگ ہیں۔ ان سے دوستوں کی طرح تو باتیں نہیں ہو سکتیں۔
نعیم:۔ تو بچوں کی طرح تو ہو سکتی ہیں۔ انھیں تو شکایت ہے کہ تم نہ کوئی فرمائش کرتے ہو، نہ ضد کرتے ہو، نہ مچلتے ہو، نہ روٹھنے کی دھمکی دیتے ہو۔ نہ کسی بات پر بحث کرتے ہو۔ غرض انھیں بالکل نظر انداز کر کے اُن سے الگ الگ رہتے ہو۔ کیا یہ صحیح ہے؟
سعید:۔ صحیح تو ہے لیکن یہ تو بڑی عجیب باتیں ہیں یعنی میں پھر بچہ بن جاؤں؟
نعیم:۔ تم خواہ کتنے ہی بڑے بن جاؤ ان کے لئے تو بچے ہی ہو
سعید:۔ ٹھیک ہے لیکن میں ضد کس بات کی کروں؟ جو خواہش ہوتی ہے پوری کر لیتا ہوں، وہ خود جیب خرچ کے لئے مجھے اتنی رقم دے دیتے ہیں کہ اُن سے اور کسی چیز کی فرمائش کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔
نعیم:۔ ان سے زیادہ بات چیت کیوں نہیں کرتے؟
سعید:۔ حسب ضرورت تو گفتگو ہوتی ہی ہے۔ بڑوں کی بات کاٹنے کو میں برا سمجھتا ہوں اس لئے کبھی بحث کی نوبت نہیں آتی۔ کیا تمھارا مطلب ہے میں خواہ مخواہ ہی ان سے الجھتا رہوں۔
نعیم:۔ یہ میرا مطلب نہیں ہے انھیں کا منشا ہے۔
صوفیہ:۔ تم سعید کو ستا تو نہیں رہے۔ یہ کیسی الٹی باتیں ہیں۔
سعید:۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔
نعیم:۔ نہیں، میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں تم کبھی ان سے کھل کر تو دیکھو تب معلوم ہو جائے گا۔
سعید:۔ واقعی؟
نعیم:۔ تم ان کے معاملات میں دلچسپی لو تو اُن کے کام میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ ان سے آخر کسی نہ کسی موضوع پر تمھیں گفتگو ضرور کرنی چاہئے۔ اس طرح کٹتے کاٹنا تو ٹھیک نہیں۔
سعید:۔ بہت اچھا، کوشش کروں گا، ویسے اس کی عادت تو نہیں ہے مجھے۔
صوفیہ:۔ بس ہو چکا یا ابھی اس ضمن میں کچھ کہنا باقی ہے۔
نعیم:۔ ابھی ایک بات باقی ہے لیکن وہ بعد میں، اب تم اپنی رپورٹ سناؤ۔
سعید:۔ ہاں، ہاں، میں اس کا زیادہ مشتاق ہوں۔ بولو، کیا ہوا؟
صوفیہ:۔ ہوتا کیا، وہی جس کی توقع تھی۔
نعیم:۔ یعنی حمیدہ مان گئی؟
صوفیہ:۔ اتنی زیادہ کہ اب اس نے سوچ رکھا ہے کہ سعید اب

کہ منت کرے وہ شادی کے لئے اس وقت تک راضی نہیں
ہی جب تک سعید کی اپنی معقول آمدنی نہ ہو جائے۔

حمیدہ: شکر ہے میری بات اس کی سمجھ میں تو آ گئی لیکن یہ اس
نے ضد سے کہا ہے یا سنجیدگی سے؟

صوفیہ: تم کیا چاہتے ہو؟

نعیم: یہ تو دل سے چاہتے ہیں کہ وہ ان پر نثار ہوتی رہے
اور یہ شان دکھاتے رہیں۔ اگر حمیدہ نے سنجیدگی سے یہ عہد کیا ہے
تو پھر میاں سعید کی تو ساری تمناؤں پر اوس پڑ جائے گی۔

صوفیہ: اور کیا وہ ضد یا طعن سے کہتی ہے؟ اس کا تو مطلب
واقعی یہی معلوم ہوتا ہے۔

نعیم: یہ تو بہت برا ہے۔

سعید: کیا برا ہے؟ اچھا ہی ہے۔ اس اثنا میں ایک دوسرے
کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا لیکن صوفیہ مجھے
پوری تفصیل سناؤ۔

صوفیہ: آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے؟

سعید: دونوں سے۔

(ملازم چائے لے کر آتا ہے اور ایک تپائی پر
رکھتا ہے پھر واپس چلا جاتا ہے)

سعید: لو بھئی چائے آ گئی۔

(تینوں ایک ایک پیالی لیتے ہیں اور چسکیوں
کی آواز آنے لگتی ہے)

صوفیہ: چائے تو بہت اچھی ہے، کونسی پتی استعمال
کرتے ہو؟

سعید: اجی پتی میں کیا دھرا ہے یہ تو چائے بنانے والے پر
منحصر ہے۔ خیر، اس پر تو بعد میں تبصرہ ہو سکتا ہے، مجھے پہلے سب
تفصیل تو سناؤ۔

صوفیہ: تفصیل بس یہ ہے کہ میں آج حمیدہ کے ساتھ چلی گئی۔
دوپہر کا کھانا اسی کے ہاں کھایا۔ گپ شپ رہی اور اسی ضمن میں
تمہارا ذکر خیر بھی آ گیا۔ میں نے خط کا جواب مانگا اس نے دے دیا

سعید: تو پھر کہاں ہے وہ جواب؟ لاؤ، دو نا مجھے!

صوفیہ: زبانی جواب تو مل چکا۔ اب کیا تحریری بھی چاہیے۔

سعید: کیوں نہیں، تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام
آئے۔ لاؤ، اب اور نہ ستاؤ، دیدو میرا خط!

صوفیہ: ایسی بھی کیا بے صبری؟ کیا میں کھائے جا رہی ہوں
لیکن بھئی یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم آپ کی خاطر اتنی دوڑ دھوپ کریں
اور آپ جھوٹے منہ سے شکریہ کا ایک لفظ بھی نہ کہیں۔

سعید: معاف کرنا، وہ تو میں بالکل ہی بھول گیا۔ میرا تو رواں
رواں تمہارا شکر گزار ہے۔ خواہ میں زبان سے کہوں یا نہ کہوں

نعیم: تمہارا خط میں سفارش کر کے ابھی دلوا دوں بشرطیکہ تم
ایک وعدہ کرو۔

سعید: وہ کیا؟

نعیم: بلند آواز سے ہمیں بھی پڑھ کر سناؤ گے۔ کہو منظور ہے؟

سعید: منظور۔ اپنوں سے کیا چھپانا ہے۔

نعیم: تو کیا تمہارے والد کا شمار اپنوں میں نہیں؟

سعید: یہ بھلا ایسی بات کا کونسا موقع ہے! نعیم تم کو بات
کرنے کا سلیقہ عمر بھر نہیں آئے گا؟

نعیم: ہاں جب تک تمہاری صحبت حاصل ہے مشکل ہی
معلوم ہوتا ہے۔ خیر صوفیہ ـــــ اب بیچارے کو اور نہ ستاؤ
دے دو اس کا خط۔

صوفیہ: (ملفوف خط دیتے ہوئے) یہ لو۔

سعید :- (جھپٹ کر لیتا ہے اور فوراً لفافہ چاک کر دیتا ہے ۔ اور منہ ہی منہ میں پڑھنے لگتا ہے)

نعیم :- نہیں بھئی، اس کی سند نہیں، زور سے پڑھو۔

سعید :- اچھا لو سنو لکھتی ہے: "مائی ڈیر سعید۔ تمھارا ارادہ نیک ہے، مجھے بھی اس سے اتفاق ہے، میں نے یونہی تمھیں آزمانے کے لئے خفگی کا اظہار کیا تھا۔ امید ہے تم اچھے ہو گئے، آج کالج کیوں نہیں آئے؟ فقط۔ حمیدہ "

نعیم :- یہ تو بڑا مختصر اور غیر شاعرانہ خط ہے ۔

سعید :- میرے لئے یہی بہت کافی ہے ۔

نعیم :- دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر ۔

سعید :- تم نے پھر بے موقع شعر پڑھا ۔

نعیم :- شعر نہیں مصرع !

صوفیہ :- سعید، مبارک ہو یہ دوبارہ میل ۔

سعید :- سچی بات تو یہی ہے کہ تمھاری مدد کے بغیر یہ ممکن نہ تھا مبارکباد تو تم اپنے آپ کو دے لو ۔

نعیم :- اور میں ڈبل مبارکباد دیتا ہوں۔ ایک تو حمیدہ سے میل کی، دوسری شادی کی ۔

سعید :- تم کو تو نعیم ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے بھلا یہ شادی کے ذکر کا کیا موقع ہے؟

نعیم :- یہی تو میرا ترپ کا پتا ہے ۔

سعید :- ترپ کا پتا؟

نعیم :- ہاں، اب سنیما کا وقت تو قریب آ رہا ہے، جانے سے پہلے تمھیں ایک اور خوش خبری بھی سنانی ہے ۔

سعید :- وہ کیا؟

نعیم :- یہی کہ تمھاری شادی ہونے والی ہے؟

سعید :- تم بھنگ تو نہیں پی گئے؟

نعیم :- کیا اس چائے میں تم نے ملا دیا تھا؟

سعید :- کچھ ہوش کی بات کرو، یہ بے سر و پا کیا بک رہے ہو کس کی شادی کیسی شادی؟

نعیم :- تمھاری! اور کس کی؟ اور حمیدہ سے؟

سعید :- کیا ایمبولینس منگواؤں اور تمھیں پاگل خانے بھیج دوں؟

نعیم :- پہلے پوری بات تو سنو۔ تمھارے ابا تمھاری شادی فوراً کر دینا چاہتے ہیں ۔

سعید :- کیوں؟ ابھی تو میری تعلیم ہی مکمل نہیں ہوئی ۔

نعیم :- وہ تو ہوتی رہے گی۔ شادی کر لینے سے ایسا کیا حرج ہو جائے گا؟

سعید :- تم نے پھر بکواس شروع کر دی ۔

نعیم :- اب تم میری ہر بات کو لغو ہی سمجھو تو اس کا کیا علاج ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمھارے والد نے مجھ سے کہا کہ گھر کی ویرانی اور بے رونقی سے وہ تنگ آ گئے ہیں اور جلد از جلد بہو کو دیکھنا چاہتے ہیں ۔

سعید :- تو اس سے کیا!

نعیم :- تمھارے اس خیال کا کہ خود کمانے لگو تب ہی شادی کرو گے انھوں نے بہت برا مانا ہے ۔ کہتے تھے کہ اللہ کے فضل سے اُن کی آمدنی اتنی ہے کہ اگر تم چار شادیاں بھی کر لو تو بآسانی سنبھال سکتے ہیں ۔

سعید :- وہ تو میں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، مجھے ان کا دست نگر تو ہونا ہی پڑے گا ۔

نعیم :- تو پھر وہ کس کے لئے کما رہے ہیں؟ یہ گھر، مال، اسباب

جیزہ کس کے لئے ہے؟ کیا صرف ان کے لئے؟

صوفیہ :- ظاہر ہے کہ یہ سب وہ صرف اپنے لئے تو نہیں کر رہے ہیں۔ سعید ہی تو اُن کا اکلوتا بیٹا ہے۔

نعیم :- او صاحب زادے اتنے بے دماغ نہیں کہ جیب خرچ کے لئے تو ابا جان کے دست نگر رہیں گے لیکن بیوی کے لئے نہیں بھئی واہ یہ بھی اچھی خودداری ہے۔

سعید :- لیکن ابا جان نے کبھی مجھ سے تو ایسی باتیں نہیں کیں؟

نعیم :- تم کو تو اُن سے بات چیت کرنے کی فرصت ہی نہیں، تو وہ کب کہیں تم سے؟

صوفیہ :- میری رائے تو یہ ہے سعید کہ آج تم سب باتیں اُن سے کہہ دو۔ بلکہ حمیدہ کا یہ خط بھی انھیں دکھا دو۔ تمھاری سرد مہری سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بہت دُکھ پہنچا ہے۔

سعید :- میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔

نعیم :- حمیدہ کے بارے میں انھیں سب کچھ بتا دو اور خود ہی کہو کہ تم شادی کرنا چاہتے ہو۔

سعید :- شادی میں تو کرنا نہیں چاہتا لیکن ابا جان کی یہی خوشی ہے تو مجھے اس میں عذر نہیں۔

صوفیہ :- ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے پھر تو کہو کہ "شادی میں کرنا نہیں چاہتا"

نعیم :- ارے جاؤ، میاں جاؤ۔ یہ فریب کسی اور کو دو۔ ہم خوب سمجھتے ہیں۔

صوفیہ :- یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ جی چاہا بھی وہی حکیم بولا بھی وہی۔ بڑی شان سے فرماتے ہیں میں تو نہیں چاہتا۔

نعیم :- دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں۔

سعید :- اب تم دونوں مل کر مجھے بناتے ہی رہو گے یا سینما بھی جاؤ گے وقت تو دیکھو ذرا؟

نعیم :- اچھا، لو چلتے ہیں، ہمیں یہاں سے بھگا کر شوق سے تم ابا جان سے معاملات طے کر لو۔

صوفیہ :- اب تو ہمارا یہاں ایک ایک منٹ ٹھہرنا بھی تمھیں بار ہو رہا ہے نا!

سعید :- نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔

نعیم :- خیر تمھارا مطلب ہم خوب سمجھتے ہیں۔ اچھا بھئی واقعی اب چل دیئے۔ وقت کم ہے، چلو صوفیہ!

صوفیہ :- چلو، سعید چائے کا شکریہ۔ اور اب مٹھائی کب ہو گی؟

نعیم :- کل وصول کریں گے، اب تو چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔

(نعیم اور صوفیہ چلے جاتے ہیں)

سعید :- (اپنے آپ سے) گویا آج مجھے پھر سے بچّہ بن جانا ہے۔ ابا جان کے معاملات میں دلچسپی لینا ہے۔ انھیں اپنا ہمراز بنانا ہے لیکن اس کے لئے تو ریہرسل کی ضرورت ہے ورنہ گڑبڑ گھٹالا ہو جائے گا۔

(لیاقت کے قدموں کی آواز آتی ہے)

ارے تو ابا جان تو پھر ادھر ہی آ رہے ہیں۔ شاید اخبار لینے کے لئے

(لیاقت اندر آ جاتا ہے)

لیاقت :- سعید، تم نے آج کا اخبار پڑھ لیا ہو تو دے دو۔

سعید :- (اخبار دیتے ہوئے) جی ہاں، یہ لیجئے۔

لیاقت :- آج کوئی خاص چیز قابلِ مطالعہ ہے۔

سعید :- ایڈیٹوریل اچھا ہے۔ اور ہاں وہ انجنیروں کی کانفرنس کی رپورٹ بھی ہے۔

لیاقت :- ایڈیٹوریل کس موضوع پر ہے؟

سعید :- یہی ملک کی صنعتی خوش حالی کے بارے میں، انجنیری

اور ڈاکٹری کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ ابا جان مجھے بھی اب
پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کیوں نہ آپ کے نقشِ قدم پر چل کر انجنیئر بن گیا۔

لیاقت :۔ تو وکالت کون سا بُرا پیشہ ہے؟ ایم۔ اے کے بعد تو
تم ایل۔ ایل۔ بی کرنے ہی والے ہو۔

سعید :۔ پھر بھی انجنیئری کی بات اور ہے۔ آجکل آپ کس بلڈنگ
کا خاکا بنا رہے ہیں؟

لیاقت :۔ ایک بینک کی عمارت پر کام کر رہا ہوں۔ کیا نعیم چلا گیا

سعید :۔ جی ہاں۔ کونسے بینک سے کنٹریکٹ ہوا ہے؟

لیاقت :۔ اوریئنٹل سے۔ نعیم بڑا سمجھدار اور ذہین لڑکا معلوم
ہوتا ہے۔

سعید :۔ ابھی اس خاکے پر اور کتنے دن لگیں گے؟

لیاقت :۔ ابھی تو شروع کیا ہے۔ کیا نعیم کچھ لکھتا بھی ہے؟ میرا
مطلب ہے شعر شاعری یا افسانے وغیرہ؟

سعید :۔ جی کبھی کبھی۔ اور کتنے پر کنٹریکٹ ہوا ہے؟

لیاقت :۔ تمہیں اس سے کیا؟ (ذرا غصے کے لہجے میں) اگر
کچھ رقم کی ضرورت ہو تو یہ لو چیک بُک، تمام چیکوں پر میں نے
دستخط کر دیئے ہیں، جتنی رقم چاہیئے اس میں لکھ لو اور نکلوا لو۔

سعید :۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔

لیاقت :۔ پھر اور کیا تھا؟ میں ایک بات کر رہا ہوں تم دوسری۔ میں نعیم کے
بارے میں پوچھ رہا ہوں اور تم کنٹریکٹ کی رٹ لگائے ہوئے ہو۔ اس کا اور کیا مطلب ہے

سعید :۔ میں نے یونہی تجسس کی خاطر پوچھا تھا۔ آپ تو میری ہر بات
کو، ہر حرکت کو الٹے ہی معنی پہنا دیتے ہیں۔

لیاقت :۔ سٹھیا گیا ہوں نا؟

سعید :۔ دیکھئے، پھر آپ نے غلط مطلب سمجھا؟

لیاقت :۔ پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟

سعید :۔ کیا ایک بیٹے کو باپ کے معاملات میں دلچسپی لینے
کا حق نہیں؟

لیاقت :۔ حق کیوں نہیں، لیکن باپ کو اس سے بھی زیادہ
حق ہے۔

سعید :۔ اور ابھی تو میں اب آپ کے پاس یہ چٹھی لے کر
آنے ہی کو تھا۔

لیاقت :۔ ہمیشہ آنے ہی کو رہتے ہو، آتے کبھی نہیں۔

سعید :۔ آپ خود آ گئے اور میں اب آپ کو یہ خط دکھانا ہی
چاہتا تھا۔

لیاقت :۔ کس کا خط ہے؟ (غیر جذباتی اور غیر ہمدردانہ انداز
میں)

سعید :۔ جی وہ بات در اصل یہ ہے کہ ہماری جماعت میں چند
لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں اور . . . (رکتے رکتے بات کرتا ہے)

لیاقت :۔ اور کیا؟

سعید :۔ ان میں سے ایک سے میری دوستی ہے۔ اور . . .

لیاقت :۔ پھر رک گئے، کہتے کیوں نہیں؟

سعید :۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ دوستی ہمیشہ کے لئے قائم
رہے اور . . . .

لیاقت :۔ تو یہ کہو نا کہ شادی کرنا چاہتے ہو، صاف صاف
کیوں نہیں کہتے۔

سعید :۔ جی ہاں، اب آپ نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اس لڑکی
کا نام . . . .

لیاقت :۔ مجھے معلوم ہے۔

سعید :۔ اور یہ خط . . . .

لیاقت :۔ اسی کا ہے۔ یہ بھی میں سمجھ گیا۔ اتنی سی بات کہنے

...ے لئے آتنا ڈر، اتنی جھجک ؟

سعید :۔ آپ بھی پڑھ لیجئے۔

لیاقت :۔ کیا اُس نے اپنا خط کسی اور کو دکھانے کی اجازت دی ہے۔ رہنے دو۔ مجھے سب معلوم ہے۔ کیا کام کرتے ہیں اس لڑکی کے والد ؟

سعید :۔ ڈاکٹر ہیں۔

لیاقت :۔ اب باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ ادھر آؤ۔ اور قریب آؤ۔ ڈرتے کیوں ہو؟ میں کھا تو نہیں جاؤں گا۔ اور نزدیک! آؤ میرے گلے سے لگ جاؤ۔ (پیشانی کو بوسہ دیتا ہے) اب میرے دل کو چین ملا۔

پ ر د ہ گ ر ت ا ہ ے

مخزن کی جلدیں

جلد ۱، جنوری تا جون ۱۹۴۹ء جلد ۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۴۹ء

جلد ۳، جنوری تا جون ۱۹۵۰ء

خوب صورت اور مضبوط کپڑے کی جلد جس پر سُنہری ڈائی سے "مخزن" کا نام لکھا ہے۔ پشتے پر بھی "مخزن" کا نام اور سنہری بیل ہے جس کے نیچے مہینوں کا نام بھی سنہرا لکھا ہے۔ جلد منگوائیے ورنہ بعد میں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکیں گی۔

رعایتی قیمت فی جلد چار روپئے مع محصولڈاک

مخزن کا رعایتی چندہ

اہلِ ذوق کے فائدے کے لئے "مخزن" کا چندہ سات روپئے سالانہ سے گھٹا کر پانچ روپئے کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح رعایتی ششماہی چندہ اب چار روپئے کے بجائے تین روپئے ہے، یہ رعایت تا اطلاع ثانی بدستور قائم رہے گی۔ اور شائقین اس سے برابر فائدہ اٹھا سکیں گے۔

منیجر "مخزن" مال روڈ۔ لاہور

صابر سنبھلوی

قدیم لکھنؤ کا ایک طرحی مشاعرہ

میں اٹھارھویں صدی عیسوی کی مطبوعات پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں متعدد کتب خانوں کے طواف اور متعدد کتابوں کی ورق گردانی کی نوبت آئی۔ دورانِ مطالعہ میں اٹھارھویں صدی کے مشاعروں کی ایک جھلک دکھائی دی۔ دل نہ مانا کہ اکیلا ہی لطف اندوز ہوں۔ یہ پرانے زمانے کے مشاعرے شرابِ کہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشاعرے کی روداد قلم بند کر کے سوچا کہ یہ روداد بھی کسی پرانے زمانے کے رسالے کو بھیجی جائے ع لا شرابِ کہنہ ساقی ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان کے ادبی رسائل پر نگاہ ڈالی تو سوائے مخزن کے اور کوئی ایسا رسالہ نظر نہ آیا جو اس عہدِ کہن کی یادگار ہو۔ لہٰذا یہ مضمون آپ کی نذر ہے

(صابر)

دلّی اور لکھنؤ کے دبستاں سے بے شمار ایسے طلبہ فارغ التحصیل ہوئے جن کے نام لیوا آج تک ہندوستان کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۵۲ء (ریل، ڈاک و تار برقی کے جاری ہونے سے پہلے) کے لکھنؤ اور دلّی کے مشاعروں کا ذکر اب بھی زبان زدِ خاص و عام ہے۔ اس زمانے میں خط و کتابت کے ذریعے اصلاح کا رواج نہ تھا بلکہ شاگرد استاد کے روبرو زانوئے ادب تہ کر کے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ڈاک اور ریل کا سلسلہ جاری ہوا تو بذریعہ خط و کتابت اصلاح لی جانے لگی۔ اسی دوران میں اخبارات و رسائل نے بھی جنم لیا۔ قدامت کا سہرا کس کے سر ہے، یہ تو وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد ریاض الاخبار گورکھپور۔ آگرہ اخبار۔ قیصری اخبار جالندھر۔ کوہِ نور لاہور۔ آزاد لکھنؤ۔ افضل الاخبار دہلی۔ چودھویں صدی راولپنڈی۔ انجمنِ ہند لکھنؤ۔ اخبار اسلام آگرہ۔ کارنامہ لکھنؤ۔ سول اینڈ ملٹری نیوز لدھیانہ۔ شوکتِ اسلام حیدرآباد۔ ملک و ملت حیدرآباد۔ نیرِ اعظم حیدرآباد۔ زمانہ کان پور۔ خیال یار کانپور۔ نسیم آگرہ۔ کائستھ کانفرنس گزٹ کان پور۔ مسلم ہیرلڈ بمبئی۔ اکمل الاخبار دہلی۔ جامِ جمشید مراد آباد۔ مہر نیمروز بجنور۔ وکیل امرتسر۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ پیام یار لکھنؤ۔ دلگداز لکھنؤ۔ خیال لکھنؤ۔ جامِ جم لکھنؤ۔ مرقعِ عالم لکھنؤ۔ ریاضِ سخن لکھنؤ۔ فروغِ سخن لکھنؤ۔ زبان دہلی۔ البیان لکھنؤ۔ دستور میرٹھ۔ گلدستۂ نجم الثاقب الٰہ آباد اردو زبان کی خدمت اور احیا و بقا کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے ہیں۔

اس زمانے کے ماہانہ رسائل میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں اس زمانے کے سربرآوردہ شعراء کے علاوہ مبتدی شعراء کا کلام بھی مجوزہ مصرعۂ طرح کی پابندی سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ مبتدی شعراء بھی آجکل کے اساتذۂ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ان ماہانہ مشاعروں کے وجود سے غائبانہ تعارف کا سلسلہ چل نکلا۔ اور اسی غائبانہ تعارف کے ذریعے سے حضرتِ داغ دہلوی اور حضرتِ امیر مینائی لکھنوی نے

تحسین

۔۔۔ سے کے گوشے گوشے سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ذیل میں اسی زمانے کے ایک صحافتی مشاعرہ "کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے گر قبول
افتد زہے عزّ و شرف!

مصرع طرح: بھلا یہ زہر ہم کب تک پیئے جائیں!

حضرت امیر مینائی لکھنوی، استاد نواب رامپور

بلائیں ہیں وہ گیسو تیرے رُخ کی — بلائیں گیسوؤں کی ہم لئے جائیں
کرم کر سخت جانی اب کرم کر — کہاں تک روز مرنے کو جیئے جائیں
پتا کیا کوئی ان کے گھر کا پوچھے — وہ جب ہر ایک دل میں گھر کئے جائیں
قدم پھسلنے میں واعظ کے آئیں — تو ہاتھوں ہاتھ رندوں میں لئے جائیں
امیرؔ آنچل کا سایہ ڈال دیں وہ — کفن ہلکا سا میّت کو دیئے جائیں

فیاض احمد اصغرؔ جنجانوی

ہمیں بھی ساتھ وہ اپنے لئے جائیں — نہیں تو دل ہمیں واپس دیئے جائیں
رہیں گے بے اثر کب تک یہ اصغرؔ — دلِ پُر غم سے ہم نالے کئے جائیں

احمد خاں صاحب احمدؔ سہاری

مئے گلرنگ غیروں میں اڑے واں — یہاں ہم خونِ دل اپنا پیئے جائیں
ہمارے سامنے غیروں کو دو جام — بھلا یہ زہر ہم کب تک پیئے جائیں
وہ چاہیں جس قدر رنج و الم دیں — ہمیں کیا، جو ملے احمدؔ پیئے جائیں

حافظ جلیل حسن جلیلؔ مانک پوری تلمیذ حضرت امیر مینائیؔ

حسیں ہیں کیسے کیسے نرم و نازک — یہ پھول آنکھوں میں چن کر رکھ لئے جائیں
مزہ ہے برق و باراں کا اسی میں — پیئے بھی جائیں توبہ بھی کئے جائیں
دمِ رخصت لگا کر تیر بولے — نشانی اپنی کچھ تو ہم دیئے جائیں
نہ مانیں ہم نصیحت شیخ جی کی — کہیں وہ، اور ہم اپنی کئے جائیں

محمد ضمیر الدین ضمیرؔ شاگرد عزیزؔ اشرف پوری

نہ گھبراؤ وہ آئیں گے یہ کہہ کر — دلِ مضطر کو دم کب تک دیئے جائیں
غمِ فرقت سے اب دل ٹوٹتا ہے — سہارے پر بھلا کب تک جیئے جائیں

فقیر علی عاقل (جموں) شاگرد یاس لکھنوی،

جو وہ عہد وفا ہم سے کئے جائیں — سہارے پر قیامت تک جئے جائیں
نکلنے کے لئے بیتاب ہیں اشک — کہو پھر ضبط ہم کب تک کئے جائیں
خدا ہم کو دیئے جائے اگر دل — نیا دل روز ہم تم کو دیئے جائیں
عدو کے ساتھ ہو شیریں کلامی — بھلا یہ زہر ہم کب تک پئے جائیں

مولوی غلام عباس عباس اعظم گڑھ

وہ قصرِ دل میں ہے ہر وقت موجود — حرم میں دیر میں کس کے لئے جائیں
پسِ مُردن نہ آئے قبر تک وہ — غضب ہے جان سے جس کے لئے جائیں
جُدائی ہے اگر منظور عباس — جُدا تن سے ہمارا سر کئے جائیں

پریاگ نرائن عاجز زبیدی

وفا یہ ہے نہ عاجز اُف کریں ہم — جفا و ظلم وہ ہم پر کئے جائیں

کو بیر ناتھ علو،

رقیبوں کو عطا ہو شربتِ وصل — بھلا یہ زہر ہم کب تک پئے جائیں
اثر ہوتا ہے کب اس سنگدل پر — بلا سے اس کی ہم آہیں کئے جائیں
بھلا کب مے کشی میں چھوڑتا ہوں — نصیحت حضرتِ واعظ کئے جائیں

پربھو دیال عاشق شاگرد یاس لکھنوی،

ملی ہے شیخ کی رندوں کو تلچھٹ — بھلا یہ زہر ہم کب تک پئے جائیں

عبدالسبحان عاشق، کلاتھ مرچنٹ

سمجھ لیں گے ہم اُن سے حشر کے دن — وہ جا ہیں ظلم جو ہم پر کئے جائیں
ارادہ ہے اگر سیرِ چمن کا — تو عاشق کو بھی ساتھ اپنے لئے جائیں

محمد اسمٰعیل عاصی شاگرد اسرار اجمیری

مجھے داغِ جگر دے کر وہ بولے — نشانی آپ یہ میری لئے جائیں

کنور عطار اللہ خاں عطا

رسائی ان کے در تک ہو رہے گی — مقدر آزمائی ہم کئے جائیں

منشی وریندرا بن عظیم شاگرد بہار،

ہزاروں چاک ہیں دل ہیں جگر میں   رفو ہوں کس طرح کیونکر سے جائیں

میوالال عاجز سب انسپکٹر پولیس جبل پور

نہیں مونس کوئی جز حسرت و یاس   کہ جس کو ساتھ ہم اپنے لئے جائیں

جیکو ارعاطف شاگرد میکش تھانوی،

رقیبوں کو تو وہ بوسے دیئے جائیں   جفا و ظلم عاشق پر کئے جائیں

علی عظیم عظیم

وہ جاتے ہیں تو خیر اتنا کئے جائیں   دل مضطر کو ساتھ اپنے لئے جائیں

بالکرشن فخر لکھنوی تلمیذ حضرت امیر مینائی

جفاؤں پر جفائیں وہ کئے جائیں   دعاؤں پر دعائیں ہم دیئے جائیں

گواہی ہر دہان زخم دے گا   بہت اچھا ہمارے لب سئے جائیں

ہمیں اس زندگی سے موت اچھی   بھلا مر مر کے ہم کب تک جئے جائیں

ملا عبد العلی قنبر احمد آباد

نہ دل توڑیں کسی عاشق کا اپنے   وہ جھوٹے ہی سہی وعدے کئے جائیں

محمد عبد الوحید قیس فتحپوری شاگرد حضرت مضطر خیر آبادی

جو جیتا ہوں تو کہتے ہیں مریں بھی   جو مرتا ہوں تو کہتے ہیں جئے جائیں

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بلا سے قیس وہ پردہ کئے جائیں

شیخ احمد علی صاحب کامل منیجر جام جم لکھنؤ،

قیامت تک نہیں ممکن جئے جائیں   کہاں تک انتظار اس کا کئے جائیں

تجلی اس کی دل میں دیکھ لیں گے   کہاں اب طور پر اس کے لئے جائیں

یہ درد ہجر کامل لا دوا ہے   کہاں تک فکر درماں ہم کئے جائیں

حکیم محمد عابد علی کوثر خیر آبادی شاگرد حضرت امیر مینائی

مجھے آزاد اس غم سے کئے جائیں   اگر جاتے ہیں دل کو بھی لئے جائیں

وفاؤں سے نہ چوکیں گے کبھی ہم   جفائیں ہو سکیں جتنی کئے جائیں

کلیجا منہ کو کوثر آ رہا ہے   کہاں تک ضبط نالوں کو کئے جائیں

مخزن

سید یوسف علی کاہش لکھنوی تلمیذ یاسؔ لکھنوی

خدا کے سامنے انصاف ہوگا ہمارا خونِ ناحق وہ کئے جائیں

شبِ فرقت میں اے بیتابیٔ دل کہاں تک ضبط نالہ ہم کئے جائیں

جنابِ شیخ کو سمجھاؤ کاہش جو آئے ہیں تو تھوڑی سی پیئے جائیں

امجد علی کاوش بجنوری تلمیذ کاہش لکھنوی

ہمارے دل کی قیمت کیا وہ دیں گے انھیں ہم مفت دیتے ہیں لئے جائیں

محمد عبدالکریم کریم بھوج پوری

گھٹا چھائی ہے رند و میکدے پر چلو خالی وہاں پر خم کئے جائیں

محمد جان مفتوںؔ سیتاپوری شاگرد شیفتہ لکھنوی

بھلا لختِ جگر ہم کھائیں کب تک بتاؤ خونِ دل کب تک پیئے جائیں

اڑاتا ہے جنوں اب دھجیاں روز کہاں تک جیب و دامن ہم سیئے جائیں

مظفر خاں صاحب مظفر جودھپور

مرا دل لے کے جاتے ہیں اگر وہ مجھے بھی ساتھ اپنے وہ لئے جائیں

نہ جائیں مے کدے سے آپ خالی جنابِ شیخ تھوڑی سی پیئے جائیں

شیخ حفیظ الدین احمد مزاج دہلوی شاگرد فائز بنارسی

ہمارے دل کی تسکیں کے لئے آپ کوئی وعدہ تو جھوٹا ہی کئے جائیں

ترے وعدوں پر اے رشکِ مسیحا مریضِ غم ترے کب تک جئے جائیں

محمد رسول خاں منت کانپوری

ہم ایسی دل لگی سے باز آئے ہمارا دل ہمیں واپس دیئے جائیں

محمد عبدالرحمٰن مجبیؔ دانا پور

ملے جب جام ہم کو حیز کے بعد بھلا یہ زہر ہم کب تک پیئے جائیں

سید محمد یوسف مضطر

جو مرضی ہو تو اک بوسہ لئے جائیں عوض اس کے جو دل مانگو دیئے جائیں

محمد نثار حسین نثار مالک قومی پریس لکھنؤ

کئی ہیرے کی بن کر دل میں اترے نکلنے والے آنسو کیا پیئے جائیں

لحد پر میری ٹھہریں شوق سے آپ رقیبوں سے مگر کہہ دیجئے جائیں
بلا سے عہد ٹوٹے، توبہ ٹوٹے اب آئے ہیں تو دے ساقی پئے جائیں
وہ بولے ان کی مشکل ہو نہ آساں رہیں یہ نزع میں کیکن جئے جائیں
ہوئی مدت کہ پینا چھوڑ بیٹھے نثارؔ اب بیکدے ہم کس لئے جائیں

محمد عبدالرحمٰن خاں نیرؔ وکیل دہلی شاگرد یاسؔ لکھنوی

پلائیں غیر کو وہ ہاتھ سے مئے بھلا یہ زہر ہم کب تک پئے جائیں
جفا سے باز آئے گا نہ وہ شوخ کہاں تک جان نیرؔ ہم دیئے جائیں

نور محمد صاحب نورؔ صفدر گنج

دکھا کر ہم کو وہ اعدا کو دیں جام بھلا یہ زہر ہم کب تک پئے جائیں
وفا سے ہم نہ باز آئیں گے اے نورؔ جفائیں وہ جو کرتے ہیں کئے جائیں

گلاب چند رسنگھ ناداںؔ بنارس

جہاں تک ہو ستم مجھ پر کئے جائیں تلافی میں مگر بوسہ دیئے جائیں

قاضی محمد واجد صاحب واجدؔ شاگرد حضرت داغؔ دہلوی

کبھی وہ چین دیں ہم کو نہ واجدؔ ہمیشہ چٹکیاں دل میں لئے جائیں

میرزا کرحسین صاحب یاسؔ لکھنوی تلمیذ حضرت جلالؔ لکھنوی

خوشی جس میں عدو کی ہو کئے جائیں ہمیں غم پر وہ غم ہر دم دیئے جائیں
نہ زائل ہوگا سودائے محبت اگر رگ رگ میں بھی نشتر دیئے جائیں
بہت جاتے ہیں میخانے میں واعظ کہیں ایسا نہ ہو یہ دھر لئے جائیں

محمد سفیر اللہ خاں سفیرؔ کوٹ (فتح پور)

نئے ہر روز ہم کو غم دیئے جائیں کہاں تک صبر اے ظالم کئے جائیں
زباں سے اُف سفیرؔ اللہ نہ نکلے وہ جور و ظلم جو چاہے کئے جائیں

مولوی محمد عبدالرحیم کلیمؔ لکھنوی

جنوں میں واہ کیا بخیہ گری ہے گریباں چاک ہو دامن سیئے جائیں
ملا دیں خاک میں سب آرزوئیں وہ اپنے ساتھ دل کو بھی لئے جائیں
خدا جانے اٹھائیں کیا وہ طوفاں نہ ہم آنسو اگر اپنے پئے جائیں

کلیم ان سے کلام اپنا یہی ہے — وہ رکھ لیں بات اگر باتیں کئے جائیں

ستاری جان ساقی طوائف بکسر

ستمگر غیر کو ساغر دیئے جائیں — جلا یہ زہر ہم کب تک پیے جائیں

وہ دل کو دل فریبی سے لئے جائیں — جو ہیں جانباز وہ اُف اُف کئے جائیں

کرے گا داورِ حشر اس کا انصاف — جفائیں ہم پہ بُت ساقی کیے جائیں

بگن جان بگن طوائف پاٹودی

کہاں تک ہجر میں نالے کئے جائیں — کہاں تک خون دل پی کر جیے جائیں

گن ناتھ آزاد
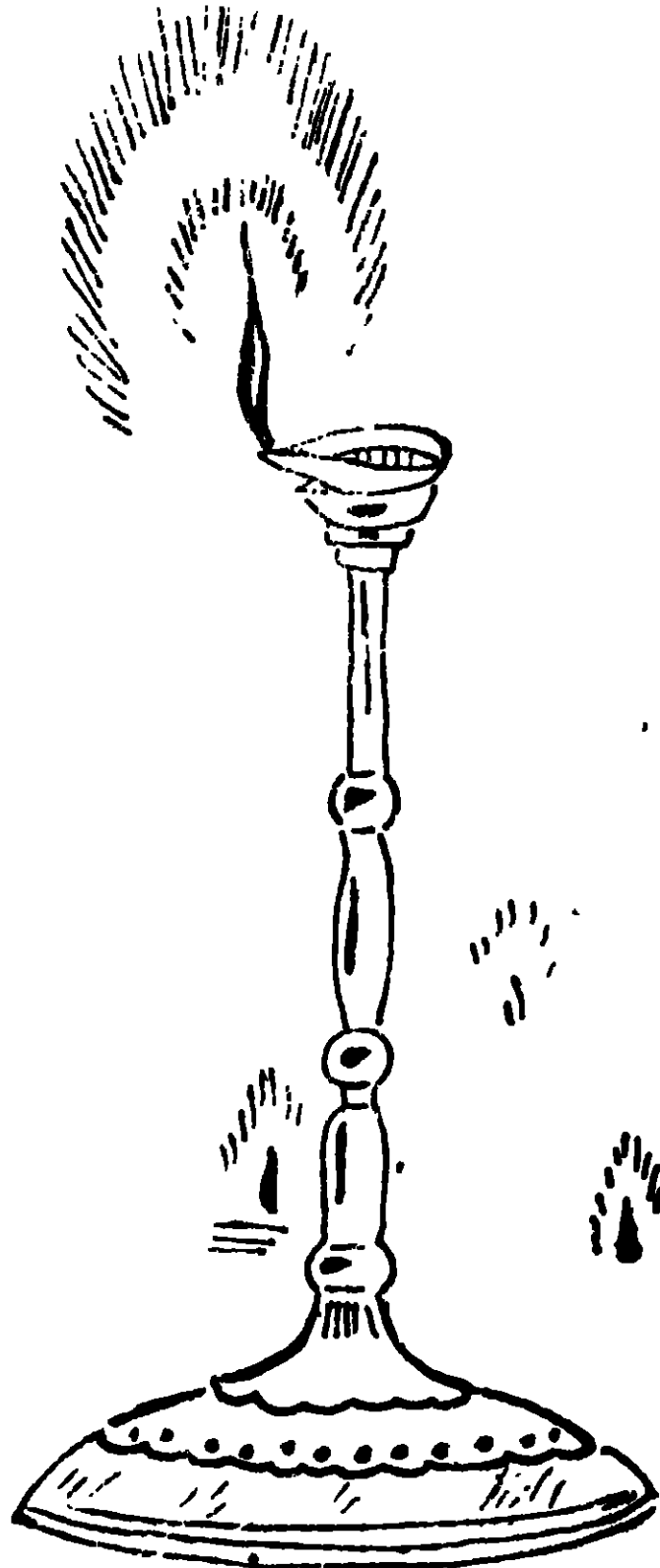
(جدید) لکھنؤ کا ایک مشاعرہ

مرے شعر میں ہے بزم ، مگر کیا کہئے　　جا کے ٹھہرا ہے کہاں ذوقِ نظر کیا کہئے
ت وہ ترشے ہوئے ہونٹوں پہ تبسّم کی لکیر　　ہائے اُن مست نگاہوں کا اثر کیا کہئے
ہ اُمنڈتی ہوئی بدمست گھٹائیں ، توبہ　　اُف وہ پاکیزگیٔ حُسنِ سحر کیا کہئے
رے احساس پہ یہ نور کہاں سے برسا　　بند کمرے میں یہ انوارِ قمر کیا کہئے
ون یہ عشق کے نالوں پہ تڑپ اٹھا ہے　　عشق کا اوج ہے یہ اوج ـــ مگر کیا کہئے
ٔس کے نغمات میں گم بزم ہے، وہ خود ہے کہاں　　نہیں احساس کو اتنی بھی خبر کیا کہئے

برف باری ہیں کہ بستر سے نکلنا تھا محال　　مجھ کو لایا ہے کہاں ذوقِ سفر، کیا کہئے
اب یہ افسانۂ مجروح سُناؤں کس کو　　ہائے یہ سلسلۂ قلب ونظر، کیا کہئے
اب یہ رودادِ جنوں خیز کہاں لے جاؤں　　عالمِ شوق ہے کیوں زیروزبر کیا کہئے

محفلِ شعر کو جب لوٹ رہا تھا کوئی
لُٹ گیا خود وہ سرِ راہگزر کیا کہئے

سجاد رضوی

بُستانِ حکمت پر ایک نظر

اس سے قبل کہ میں "بُستانِ حکمت" کی خوشبو آپ تک پہنچا سکوں مجھے آپ سے کچھ باتیں کہنا ہیں ہو سکتا ہے آپ نے سوچا ہو کہ یہ نظر بھی شاید کسی تاڑنے والے کی نظر ہے جس میں قیامتیں پوشیدہ ہوں یا پھر یہ کہ یہ نظر کسی ایسے نقاد کی ہے جو ادب سے ڈالی گئی ہو دُنیا جہان سے انوکھا ہو جو کسی چھپی ہوئی حقیقت کو بے نقاب کر دے اور دُنیائے ادب میں انقلاب برپا ہو جائے۔ لوگوں کے اپنے نظریے ہی بدل جائیں، تاریکیاں جگمگا اٹھیں۔ یا اس کتاب کے مصنف کی قسمت کا تاریک ستارا آفتاب کو شرمانے لگے اور اس گُم نام شخص کو ادب کا دیوتا سمجھ کر پوجنے لگیں۔

اگر ایسا ہے تو میں آپ سے معافی کا خواست گار ہوں میری نظر تو ایک عام پڑھنے والے کی نظر ہے جو مجھے چھوڑ کر الگ نہ رہ سکی۔ لیکن آپ کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے اور ایسی توقعات حدِ امکانی سے باہر نہیں۔ مگر میں تو آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ہو سکتا ہے بعض علم و فن کے متلاشی تنقید و تبصرہ کے ماہر "بُستانِ حکمت" کو پڑھیں تو اس میں طبیعیات و کیمیا، فلسفہ و اقتصاد کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ یا اُن کے نزدیک فقیر محمد کا قلم سوسائٹی کے گھناؤنے پن کا کچا چٹھا پیش کر رہا ہو۔ یا پھر اس کتاب کا ہر حرف انسانی ذہنوں کا حل چھپائے بیٹھا ہو۔ میں اس امکان سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ "صحت مند نقاد" اس کتاب کو پڑھنے کے بعد غالب و آزاد پر پھبتیاں کسنے لگیں یا پھر اس کتاب کو سرے سے ادب پارہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ اب ملک آزاد ہو گیا ہے اور آزاد ملک میں ہر بڑائی لعنت، رحمت کا اور ہر بُری بلندی پستی کا روپ دی جا سکتی ہے۔

"بُستانِ حکمت" ایک اچھی خاصی کتاب ہے۔ نہ بہت ضخیم نہ بہت مختصر عنوان پوچھیے تو قصہ کہانی اور کہانی کا سر پیر دریافت کیجیے تو میرے خیال میں چُپ رہنا ہی بہتر ہے۔ ممکن ہے "بستانِ حکمت" کی کہانی سُنانے کے لئے ایک اور "بستانِ حکمت" لکھنا پڑے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ بات سے بات نکلتی گئی۔ اور بات بات میں ایک اچھی خاصی کتاب بن کر تیار ہو گئی۔ کیسے ہوئی، ذرا خود مصنف یعنی نواب حسام الدولہ فقیر محمد گویا کی زبانی ہی سُننا بہتر ہو گا:۔

"اب سُنا چاہیئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں۔ اور چند اور احباب بھی باہم بیٹھے تھے۔ اور اس وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعہ کا تھا۔ اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے زبانِ ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ! مصنف اس کا عجیب حکیم بے مثل تھا۔ اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیضِ بحرِ نا متناہی کا

بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ یہ جو کچھ اس نے بیان کیا ملخص ہے کہ بامداد الہام غیبی ہوا و الّا راستے انسان ضعیف البنیان کی کب گنجائش
کو اس قدر جزئیاتِ عالم کی پہنچ سکتی ہے۔ اگر مطالب اس کتاب کے کوئی بچشم خرد دیکھے تو کوئی دقیقہ فوائدِ دینی و دنیوی سے باقی
نہیں چھوڑا ہے اور اگر کوئی غریب و فقیر خواہ رئیس و امیر خصوصاً بادشاہ اس کتاب کے مطالب کو اپنا قبلۂ مقاصد کرے تو یقین
ہے کہ سعادتِ دارین سے سرفرازی پائے۔ اور رونق اس کے ہر امر کی روز بروز ترقی کرتی جائے۔ اس گفتگو میں بعض
اہلِ عقل نے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں ترجمہ اس کا ہو چکا ہے اگر تم اردو میں اسے ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو۔ راقم نے ہر چند
عذر کیا۔ پیش رفت نہ ہوا۔"

تو صاحب یہ ہے قصہ اس کتاب کے معرضِ تصنیف میں آنے کا۔ گویاؔ نے یہ چند سطریں لکھ کر نقاد حضرات پر گویا ظلم ہی کر دیا ورنہ
کیا مجال ہے جو کوئی بے پر کی بے اڑے رہ جاتی۔ طلوعِ آفتاب کے وقت ایک محقق بے خودی کے عالم میں ارشاد فرماتے کہ یہ کتاب تو
دراصل روسی افسانہ نگار چیخوف نے لکھی تھی جس کا ترجمہ نادر شاہ افشار کے عہد میں فیضی نے عبرانی زبان میں کیا۔ اکبر نے جب اس کی
تعریف سنی تو حکم دیا کہ اسے ہندی میں ترجمہ کیا جائے۔ اور وہاں سے نواب گویاؔ نے اسے اردو میں منتقل کر دیا اور پھر شام ہوتے
ہوتے کوئی "قدآور نقاد" محویت میں یہ حکم لگاتے کہ یہ کتاب تو نواب گویاؔ نے اپنی پوتی سے لکھوائی تھی۔ اور ہر عمل جدید لذیذ
کے مصداق دنیائے ادب میں افراتفری کا عالم بپا ہو جاتا۔ نہ کسی کو سر کا ہوش ہوتا نہ پاؤں کی خبر۔ بس ان انکشافات کی داد دینا ہی
مقصدِ زندگی بن جاتا۔ مگر یہ امیدیں تو دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ اور نواب گویاؔ نے سارا قصہ پڑھ سنایا۔

نواب کی روایت کے مطابق بستانِ حکمت کو فارسی سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن عبارت اور مطالب میں ضرورت کے مطابق کہیں
کہیں ردوبدل کی ضرورت سمجھی گئی۔ چنانچہ کہتے ہیں :۔

"لہٰذا بندے نے اپنی دانست میں اسے درست کیا اور بیشتر عبارت و مطالب جا بجا کم و بیش کیے۔"

کہنے کو تو یہ ترجمہ ہے مگر آپ ذرا ملاحظہ فرمائیے گا۔ تو نظرِ اول میں اس کے فارسی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ مگر جب لمبی چوڑی
فارسی ترکیبوں کے بعد "سے"، "کو"، "ہے"، "تھا" جیسے لفظ آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہینگ بیچنے والا کابلی صدا لگا رہا ہو یا مشہدِ
مقدس کے پنجابی زوّار اپنی فارسی دانی کی دلیل پیش کر رہے ہوں۔ ہمارے آجکل کے نقاد جو "قدآور" بھی ہیں اور صحت مند بھی! اُن
کی قدیم کتابوں سے یہ اندازہ کیا کرتے ہیں کہ عہدِ تصنیف میں سوسائٹی کے رنگ ڈھنگ کیسے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کتابوں کی زبان
کو جوان کی نمایاں خصوصیت ہے وہ اُس دور کے عوام و خواص کی زبان سمجھ بیٹھیں اور اس مفروضے سے زبان کے ارتقا کی کڑیاں جوڑنا شروع کر دیں
لیکن کم از کم "بستانِ حکمت" کے بارے میں یہ مفروضہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ "بستانِ حکمت" لکھنؤ کے اس دور کی پیداوار ہے جس کو
ہمارے عظیم نقاد، انحطاط اور زوال پسندی کا دور قرار دیا کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب رجب علی سرورؔ نے کانپور میں جلاوطنی کے
عالم میں "فسانۂ عجائب" تصنیف کی۔ اسی دور میں "کلیلہ و دمنہ" اور "گل بکاولی" لکھی گئیں۔ ممکن ہے سرورؔ کسی حد تک لکھنوی سوسائٹی
کی زبان اور طرزِ معاشرت کا خاکا کھینچ سکے ہوں۔ مگر "بستانِ حکمت"، "گل بکاؤلی" ایسی کتابوں سے یہ اندازہ لگانا میرے خیال میں بیجا

زدری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ میرے اِن خیالات سے فنِ تنقید کے ماہرین متفق نہ ہوں مگر میں تو ایک عام پڑھنے والے کی نظر سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے نہ تو لکھنؤ کی سوسائٹی کی تصویریں ڈھونڈنا ہیں اور نہ لکھنؤ کے انحطاط پسند اندرونی کی ٹوہ لگانا ہے کیونکہ یہ چیز تو ہی قد آور اور دیو ہیکل نقاد ہی تلاش کر سکتا ہے جو اپنے فن میں کامل ہو اور کتاب پڑھے بغیر صرف سرورق دیکھ کر کوئی نظریہ قائم کر سکے جو اس قابل ہو کہ مطبع نامی منشی نولکشور میں بطبع مزین مقبولِ جہاں ہوئی ہے سے لکھنؤ کی بیگمات کی الھڑ بیٹھک کے طور طریقے جان سکے۔ اور سرورق کے نقش و نگار میں سوسائٹی کی تصویریں دیکھ پائے۔ اور پھر اس پر اپنی رائے کا اظہار کر دے۔ آخر وہ نقاد ہی کیا جو کتاب کو بغیر پڑھے آنکھوں سے نہ لگائے۔ یا پھر اُسے ردی کی ٹوکری میں نہ پھینک دے۔

"بستانِ حکمت" کے شروع کے اوراق ظاہر کرتے ہیں کہ "انوارِ سہیلی" ہی سے یہ کتاب ترجمہ کی گئی بذاتِ خود ترجمہ ہے اور بقول گویا یہ کتاب حکیم روشن رائے بید پا برہمن کی کاوش کا نتیجہ ہے جو اس نے سومنات کے راجہ دابشلیم ہندی کے واسطے لکھی یقین آئے تو سُن لیجئے :-

"بیان کیا جاتا ہے کہ کتاب کلیلہ و دمنہ کو حکیم روشن رائے بید پا برہمن ہندو رائے دابشلیم ہندی کے واسطے کہ اس عہد کا وہ فرماں روا بعض مملکت ہندوستان کا تھا۔ اور پایہ تخت اس کا سومنات تھا۔ زبان سنسکرت میں تالیف کی"

حکیم روشن رائے نے کتاب کیا لکھی اپنے بادشاہ کو مصیبت میں پھنسا دیا ممکن ہے اُس نے راجہ سے کسی بات کا انتقام لینا چاہا ہو اور کتاب لکھ کر اُس کے حوالے کر دی ہو۔ کتاب آئی اُسے پسند مگر ساتھ ہی یہ خوف سر پر سوار ہوا کہ کوئی حضرت اسے لے ہی نہ اُڑیں۔ عام اس سے کہ اُن کی نیت بخیر ہی ہو اور وہ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ "تنقید" کے لئے ہی لے جانا چاہتے ہوں۔ اس لئے راجہ کو اس کتاب کی حفاظت کا انتظام کرنا پڑا۔ وہ کیسے سنئے :-

"دابشلیم اس کتاب کو قبلۂ مقاصد اور کعبۂ فوائد سمجھ کر قفل جمیع مشکلات کو کلید مطالعہ سے اس کتاب کی کھولتا تھا اور مانند لعل بدخشاں کے کانِ خزائن سلطانی میں مخفی رکھا کرتا تھا۔ اس لئے کہ بادشاہ کا قدغن تھا کہ اس عروس پردہ نشین پر کسی نامحرم کی نگہ نہ پڑے"

مگر اس قدر حفاظت کے باوجود یہ کتاب نوشیرواں کے ہاتھ لگی۔ وہاں سے اسے عباسیوں کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور نے اُڑایا اور ابوالحسن عبداللہ سے عربی میں ترجمہ کرایا۔ بعد ازاں اس کے مختلف ترجمے ہوئے۔ اور آخرکار نواب گویا کے ہاتھوں یہ ورثہ ہم تک پہنچا۔

یہ تو تھی اس کتاب کی تخلیق کی داستان۔ اب آئیے ذرا اس کے مواد کے متعلق چند باتیں ہو جائیں۔ یہ ایک کٹھن منزل ہے۔ "مادرائی اور قد آور ادب کے طویل القد نقاد" پھر مجھ سے الجھیں گے۔ میری نظر میں یہ کتاب نہ تو ادب و اخلاق کا بے بہا خزانہ ہے اور نہ فلسفہ و نفسیات کا ذخیرہ بے بہا۔ یہ کتاب نہ تو "انسانی ارتقا کی اگلی کڑیاں فراہم کرتی ہے" اور نہ ہماری جنسی الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں نہ تو مدر کمپلیکس (Mother Complex) کے دور کرنے کا نسخہ ملے گا اور نہ ہم "جنسیت" کی تحلیلِ نفسی

سجاد رضوی

بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ یہ جو کچھ اس نے بیان کیا مظنہ ہے کہ بامداد الہام غیبی ہوا اور [illegible]

[illegible] نباتات عالم کی پاک سکتی ہے۔ اگر مطالب اس کتاب کے کوئی [illegible]

نہیں چھوڑا ہے اور اگر کوئی غریب و فقیر خواندہ [illegible]

[illegible]

ڈرامے لکھتا ظاہر ہے کہ اس قسم کی توقعات کرنا ہوش مندی کی دلیل نہ ہوگی۔ اگر میرا یہ خیال [illegible]
حیدری، بہادر علی حسینی، نہال چند، میر امن، سرور، گویا اور ان کے دیگر ساتھیوں سے یہ تقاضا کیوں، کہ وہ [illegible] کی سوسائٹی
کا نقشہ پیش کریں یا سرور کے فسانہ عجائب کے کرداروں میں گہرائی ہو۔ "بستان حکمت" زندگی کی ترجمان ہو۔ آپ اور کچھ بھی
نہ بھی یہ ستم ظریفی ضرور ہے۔ اگر آپ عزیز احمد سے تقاضا کریں کہ وہ بورژوا سوسائٹی کی کمزوریاں بے نقاب کردے تو آپ حق بجانب [illegible]
سرور یا گویا سے آپ یہی بات کہیں گے تو جناب! اوّل تو وہ سمجھیں گے ہی نہیں اور اگر سمجھ بھی گئے تو ہنس دیں گے۔ آج ہمارے نقاد
ادیب سے بازپرس کرتے ہیں کہ اس نے فلاں ناول یا افسانہ پورے شعور سے کیوں نہیں لکھا۔ یا پھر اس کی تخلیقات میں وہ مجلسی، جنسی،
اخلاقی یا سیاسی شعور اجاگر کیوں نہیں ہوا۔ مگر فورٹ ولیم کالج یا لکھنؤ کے نثر نگاروں کے لئے اُن کی تحریروں کا، ان کے مکمل ذہنی شعور کا
آئینہ دار ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ان کے زمانے میں پیدا شدہ ادب کی "توانائی" اور "قدآوری" کی نشانی یہ نہ تھی کہ اُن میں زندگی کا
جوش و خروش اور ہماہمی پائی جائے۔ پھر عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر ادب اپنے دَور کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ مجھے اس کے قبول کرنے
میں بھی تامّل ہے۔ بیسویں صدی کے اُردو ادب پر تو یہ بات کسی حد تک عائد بھی ہوسکتی ہے لیکن اپنے کلاسیکی ادب پاروں کے متعلق
یہ بات کہنا بالکل درست نہیں۔ اور اُن سے اِس بات کی توقع کرنا بھی زیادتی ہے۔ مجھے تو یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں
نے نثر میں کچھ لکھنا گوارا کرلیا۔ ورنہ اس وقت تک تو اُردو کا ادبی سرمایہ وہی شاعری تھی جس کو عام طور پر غیر فطری اور ہم جنسی کے رجحانات کی
آئینہ دار کہا جاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ اُس دور نے تو ادب برائے فن اور ادب برائے زندگی کی صدائیں تک بھی نہ سنی تھیں۔ کسی بھی
زبان کے ابتدائی دَور کے ادیب اور شاعر پورے شعور سے نہیں لکھا کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کیونکہ انھیں لکھنا ہوتا ہے۔ اسے آپ
ادب برائے فن کہہ لیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ابتدائی دَور کے کام کرنے والوں کے سامنے کوئی واضح مثال نہیں ہوتی اور نہ ان کے
سامنے تخلیقِ ادب کا کوئی پیٹرن (نمونہ) ہی موجود ہوتا ہے۔ تنقید تو بہرحال ادب کی تخلیق کے بعد کی پیداوار ہے۔ لہٰذا تنقید کی پیدائش
سے قبل کی ادبی تخلیقات کسی تنقیدی معیار پر کیونکر پوری اتر سکتی ہیں۔ ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ہم ان تخلیقات کا آپس میں مقابلہ کرتے
پھریں۔ اور ایک کو دوسری پر ترجیح دیں جب کوئی معیار نہ ہو تو تقابل کیسا۔ باقی رہی ان تخلیقات کی آفاقیت۔ تو جناب اگر ان میں زندگی

[illegible] سے لگے نہ رہتے۔ حالت یہ ہے کہ آج بھی عام قسم کے قاری جن کے سامنے
[illegible] ممکن ہوتا ان کتابوں کا اسی دلچسپی اور انہماک سے مطالعہ کرتے ہیں جس سے پہلے زمانے کے لوگ ان کو
[illegible] آپ کو کشمیری بازار میں الف لیلہ، قصہ طوطا مینا، بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ، آرائشِ محفل، باغ و بہار
[illegible] اور گل بکاولی نظر آجائیں گی۔ آپ ان کو نہ پڑھیں تو اور بات ہے مگر "لاشعوری طور پر پڑھنے والے
[illegible] ادب کو پڑھا ہی کرتے ہیں تو پھر اس بات پر بحث بیکار ہے کہ ان لوگوں نے "توانا" اور "قد آور" "ادب
[illegible] ان تصانیف کو اس معیار پر پرکھنا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔

[illegible] باتوں کو مدِ نظر رکھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ آپ بُستانِ حکمت سے یہ توقع نہ کریں گے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں
[illegible] سے۔ وہ تو بہرحال اپنے زمانے کی تصنیف ہے۔ اب آئیے ذرا گویا سے اس کے مواد کے متعلق کچھ باتیں سن لیجیے:-

"مطلب اس کتاب کا ایسی پند و نصائح پر ترتیب دیا تھا کہ سیاست۔ رعیت اور بساطِ عدل و رافت اور ترتیب و تقویت
دولت سے دولت اور نظم و نسق آدابِ مملکت اور بہت سے مطالبِ دینی و دنیوی کے بکار آمد ہو"

میرے خیال میں اس سے زیادہ بُستانِ حکمت کے بارے میں کچھ کہنا بھی زیادتی ہے۔ یہ کتاب جس کے لیے لکھی گئی وہ ایک
[illegible] کا حکمراں آمر تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ قبائلی جمہوریت کے طرز کی ایک سلطنت کا سردارِ اعلیٰ تھا۔ ایسے تمام فرمانروا کچھ مشیر رکھا کرتے ہیں
عمل میں یہ کتاب ایک مشیر کی رائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ بادشاہ دربار کر رہا ہے اور ایک مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ اس پر ہر شخص
[illegible] رائے پیش کرتا ہے۔ اب دلائل کی بجائے واقعات ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اور ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ معرضِ بحث میں آتا
ہے۔ کڑیوں سے کڑیاں ملتی جاتی ہیں۔ اور زنجیر مکمل ہو جاتی ہے مختصر لفظوں میں کہانی یوں ہے کہ سومنات کے راجہ دابشلیم کو ایک فقیر
صاحب کرامت کی وجہ سے خزانۂ غیبی ہاتھ آتا ہے۔ اس خزانہ میں ایک تحریر ملتی ہے جو ہوشنگ بن سیامک بن کیومرث بن سام
بن نوح علیہ السلام نے لکھوائی اور راجہ دابشلیم کے نام لکھی گئی۔ اس میں چند وصیتیں تھیں جن میں ایک سفر نہ کرنے کے متعلق تھی
راجہ اپنے دو مشیر بلاتا ہے اور سفر کے بارے میں مشورہ کرتا ہے۔ ان میں ایک سفر کو حضر پر ترجیح دیتا ہے اور دوسرا مخالفت کرتا ہے
اس بحث کے دوران میں سیاستِ ملکی، تہذیبِ نفس، تدبیرِ منزل، راجا اور رعایا کے تعلقات وغیرہ کا ذکر آتا ہے اور حکومت کرنے
کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔

یہاں بعض حضرات یہ سوچ سکتے ہیں کہ ممکن ہے یہ کتاب اس زمانے کے لیے لکھی ہو کہ بادشاہانِ آمر اور مطلق العنان
حکمراں حقوقِ رعایا سے آگاہ ہوں اور ظلم و تعدی سے ہاتھ روک لیں مگر میرے نزدیک یہ محض خیال ہی خیال ہے حقیقت یہ ہے
کہ یہ کتاب صرف اس لئے لکھی گئی کہ بادشاہ اور امرا جن کے پاس وقت گذارنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تھا اس میں سے کہانیاں
سُنتے رہا کریں۔ اور اس طرح ان کی زندگی کے دن کٹ سکیں۔ ورنہ بالکل بیکار بیٹھے رہنا تو عذاب ہو جاتا ہے۔

پرانے قصوں اور کہانیوں میں عام طور پر جنوں اور پریوں کا ذکر ہوتا ہے اور غیر فطری مظاہر کا تذکرہ بھی۔ فسانۂ عجائب، آرائشِ محفل

سجاد رضوی

یا بکاؤلی، داستانِ امیر حمزہ جیسی کتابوں میں اس قسم کی چیزیں اکثر مل جائیں گی۔ مثلاً گل بکاؤلی کی ہیروئن خود جن کی بیٹی ہے۔ فسانۂ عجائب
کے ہیرو کو بھی جنوں اور پریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ داستانِ امیر حمزہ عمرو عیار کے غیر فطری کارناموں سے پُر ہے۔ آرائشِ محفل اور الف لیلہ
بھی غیر فطری اور غیر عقلی عنصر سے پاک نہیں۔ یہ چیز صرف اُردو ہی میں نہیں دُنیا کی ہر زبان کے ادب میں پائی جاتی ہے۔ انگریزی کے ناولوں
اور نظموں میں بھی یہ بات اکثر نظر آجائے گی۔ ریڈکلف اور اسکاٹ کا تو ذکر ہی چھوڑ دیئے۔ کولرج ہی کو لیجئے جس کی فطری غیر فطریت ——
(Natural Supernaturalism) کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غیر فطری چیزیں اس طریقے پر پیش کرتا ہے
کہ ہم کو یقین کئے بغیر نہیں پڑتی۔ اس کے کلام میں بھی کافی غیر فطری مظاہر مل جاتے ہیں۔ اور تو اور شیکسپیئر اور ملٹن بھی اکثر جنوں اور
پریوں کا ذکر چھیڑتے رہے ہیں۔ جہاں تک بُستانِ حکمت کا تعلق ہے اس کی یہ بات واقعی قابلِ قدر ہے کہ اس میں ماورائے عقل
بات ملتی ہی نہیں۔ جن پریاں تقریباً غائب ہی سمجھئے۔ لے دے کے اگر کوئی ایسی چیز ہے تو وہ ہے مختلف جانوروں کا باتیں کرنا۔
اس کتاب میں آپ کو اکثر جانور باتیں کرتے دکھائی دیں گے۔ یہاں مُرغ، لومڑی، کتا، شیر، گیدڑ، بھیڑیا وغیرہ وعظ کرتے ملیں گے۔
حقیقت یہ ہے کہ اصل مصنّف نے ان کرداروں کو تمثیلی طور پر بیان نہیں کیا۔ اور نہ اپنی سوسائٹی کے مختلف افراد کو ان جانوروں کی
شکل میں پیش کیا ہے۔ میں کم از کم گویا یا بندیا سے اس قدر ترقی یافتہ سیاسی شعور کی توقع نہیں کرسکتا۔

اس کے علاوہ اس کتاب پر فحاشی کا الزام بھی عائد نہیں کرسکتے۔ جب کہ اس عہد کی دیگر تصانیف میں یہ عنصر اکثر ملتا ہے۔ بعض
مقامات پر معاشقے اور آشنائی کے واقعات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کئی جگہ عورتوں اور مردوں کی بے وفائی کا رونا بھی رویا گیا ہے۔
مگر یہ تمام چیزیں ضمنی طور پر آئی ہیں۔ اصل مقصد وہی ہے جو میں پہلے عرض کرچکا ہوں۔

اب رہی گویا کی طرزِ تحریر تو وہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دَور کی آئینہ دار ہوگی۔ گویا نہایت اُلجھے ہوئے انداز میں لکھتے ہیں جس کو پڑھنا
دماغ پر بہت بوجھ ڈالتا ہے۔ فارسی عربی ترکیبوں سے مملو، نہایت اُکھڑے ہوئے انداز کے طویل فقرے پڑھنے میں کافی دقّت پیدا
کرتے ہیں۔ کہانی کی ابتدا یوں کی گئی ہے:۔

"جوہریانِ رستہ بازارِ معانی و صیرفیانِ دار العیار سخندانی نے عنوان دفاترِ اخبار کو اس طرح آرائش دی ہے کہ اقصائے
ملکِ چین میں ایک بادشاہ تھا کہ شہرہ اس کی دولت و کامگاری کا اطراف و جوانب میں دائر اور چرچا عظمت و شہریاری کا مانند
نیرِ اعظم کے ظاہر تھا۔ سلاطین نامدار نے حلقہ اس کی اطاعت کا گوشِ جاں میں ڈالا تھا۔ اور بادشاہانِ رفیع المرتبت نے غاشیہ
فرمانبرداری کا دوش پر رکھا تھا۔"

اسی طرح وہ بادشاہ کے دربار، محل، درباریوں، امرا و وزرا، باغ و راغ، صحرا و سبزہ زار کی کیفیت بیان کرتے وقت پورا
پورا صفحہ وقف کر دیتے ہیں اور پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ مثلاً میدان کی مختصر سی تعریف یوں کرتے ہیں:۔

"ناگاہ ایک میدان نظر آیا کہ مانند میدانِ امل وسعتِ فراواں رکھتا تھا۔ اور سبزہ زار اس کا نہایت شادابی اور سرور افزائی
میں نظیرِ جنّت تھا۔ اور زبانِ موجِ نسیمِ مشکبار، اسرارِ رائحۂ گلزار کو چار سوئے جہاں میں فاش کرتی تھی۔ اور ترنّمِ بلبل سے حکایتًا

رنگ و بوئے گل کی کوشش سکنانِ عالمِ بالا میں پہنچی تھی"

گرمی کا عالم یوں بتاتے ہیں :-

"کہ آفتابِ تاباں وسطِ سما پر گرمِ جلوہ تھا۔ اور ہر ذرۂ ریگ نے شدتِ حرارت سے آفتابِ قیامت کا حکم پیدا کیا خفتانِ جوشن پوشاں شعلہ بن گئی۔ اور نعل گھوڑوں کی موم کی طرح نرم ہونے لگی چشمۂ آب سوا چشمۂ آفتاب کے معلوم نہ ہوتا تھا اور طلبِ آب میں غزالاں نگاہ مانند وحشیانِ دشت کوسوں اس سرابِ گرم میں دوڑتے پھرتے تھے مطلق نشان پانی کا نظر نہ آتا تھا"

لیکن کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا جان بوجھ کر اس قسم کی زبان لکھتے تھے جس سے ان کی علمیت اور لغت دانی کا پتا لگ سکے۔ ورنہ کہیں کہیں غیر شعوری طور پر انہوں نے ایسی زبان استعمال کی ہے جو نہایت سلیس ہے۔ دیباچہ نسبتہً آسان اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے جس کا نمونہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اصل کتاب میں اس قسم کی مثالیں اکثر ملتی ہیں مثلاً :-

"کہتے ہیں ایک نابینا ایک بینا کے ساتھ ہم سفر ہوا۔ ایک شب صحرا میں مقام کیا۔ جبکہ تیاری کوچ کی ہوئی نابینا اپنا کوڑا ڈھونڈنے لگا۔ قضارا ایک سانپ پڑا سوتا تھا۔ اندھا سمجھا کہ یہ کوڑا ابریشم کا بنا ہوا مجھے مفت مل گیا۔ بہت خوش ہوا اور سوار ہو کر چلا"

اس ایک مثال سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ وہ آسان اور صاف و سلیس زبان لکھنے پر قادر ہیں مگر وہ ایسا کرنے سے شعوری طور پر گریز کرتے ہیں۔ شوکتِ الفاظ اُن کا خاصۂ تحریر ہے جس پر اُس زمانہ کا لکھنؤ جان دیتا تھا۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس کتاب کا کوئی "افادی پہلو" ہے یا نہیں۔ تو سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ گویا اگلے وقتوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نزدیک یہ چیز ضروری نہ تھی کہ ادب میں "افادیت" موجود ہو۔ یہ کتاب درحقیقت اُن لوگوں کے لئے فائدہ رساں ہے جن کے پاس دولت ہے، وقت ہے لیکن مشغلہ کوئی نہیں۔ ورنہ اِس زمانہ کے لوگ تو اس قسم کی کتابوں کو دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ سات سو صفحے کی کتاب اور وہ بھی بُستانِ حکمت ایسی، پڑھنا آسان کام نہیں، اس کے لئے وقت چاہیئے اور وقت کاٹنا ہی اس کا اوّلیں مقصد ہے۔

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

جلال الدین اکبر

سازِ کہن

(ایک قدیم غیر مطبوعہ غزل)

کہ صیاد تیرے آشیاں سے ہے قفس بہتر
ترے رنگیں قفس سے آشیانِ خار و خس بہتر

گریباں کے رفو کی کوئی صورت اب نہیں باقی
تو پھر اس شوخ کے دامن پہ اے دل دسترس بہتر

اگر آزادیٔ گلشن کی خواہش کا یہ حاصل ہے
مجھے یہ قید اچھی، مجھ کو یہ کنجِ قفس بہتر

اگر صیاد کے گُن ہی سمجھے گانے کی عادت ہے
تو ایسی نغمہ پیرائی سے چُپ اے بوالہوس بہتر

جگا سکتے نہیں سوتے ہوؤں کو گر ترے نالے
تو ان نالوں سے اے اکبر بھرا آوازِ جرس بہتر

یوسف ظفر

ربابِ نو

رہِ طلب میں ترا نقشِ رنگ و بُو نہ ملا
بھٹکنے والے بھٹکتے رہے کہ تُو نہ ملا

ہزار شعلہ سخن تھے ہزار غنچہ دہن
بھرے چمن میں ترا حُسنِ گفتگو نہ ملا

وہ گرد باد ہوں صحرا ہی میرے دامن میں
یہ اور بات کہ دامانِ جستجو نہ ملا

تجھی سے مجھ کو چھپاتے رہے مرے ہمدم
صلاحِ کار کہاں کی، کوئی عدو نہ ملا

تمام عمر کا حاصل جو ایک جرعۂ مے
ملا — تو کیا کہ باندازۂ سبو نہ ملا

کسی کو میری تمنا کا حال کیا معلوم
مری نوا سے ہرا سازِ آرزو نہ ملا

یہ جی میں ٹھانی ہے اب کی، کہ مر رہیں گے ظفر
کسی بہانے اگر وہ بہانہ جُو نہ ملا

انسہ رضیہ جہاں آرا
بی اے (عثمانیہ)

برنارڈ شا پر ایک نظر

برنارڈ شا اپنی سفید ریش اور انوکھی باتوں کی وجہ سے اُن ممالک میں بھی مشہور تھا جن کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے ممالک کے تعلیم یافتہ لوگ بھی برنارڈ شا کے نام سے واقف ہیں جو انگریزی نہیں لکھتے بولتے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ برنارڈ شا نہ ایسی کوئی بات لکھتا ہے نہ کہتا ہے جو مسلّمات میں سے ہو۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ برنارڈ شا کی شہرت اور اس کا فن مسلّمات سے انحراف اور غیر روایاتی نظریۂ اخلاق پر مبنی ہے۔ برنارڈ شا کو صحیح طور پر سمجھنا اسی لئے مشکل ہے کہ جہاں وہ بدعت کرنے والوں کا قائد ہے وہیں paradox (متناقضاتِ ظاہری) کا بھی ماہر ہے۔ چنانچہ وہ حضرت مسیح اور اُن کی تعلیمات پر تو اعتقاد رکھتا ہے۔ لیکن مسیحیت کا قائل نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک ہی چیز "تھوک" ہو تو قانون کہلاتی ہے اور "پرچون" ہو تو جرم بن جاتی ہے۔ وہ علمِ طب کو جادوگری کی ایک شاخ قرار دیتا ہے۔ اور سند یافتہ ڈاکٹر اس کے نزدیک سب سے بڑا عطائی ہے۔ اس نے جرم اور سزا کے مابین فرق کرنے سے انکار نہیں کیا، بلکہ وہ شادی اور "طوائفیت" میں بھی کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسی طرح سرمایہ دار اور چور میں تمیز نہیں کرتا۔ مذہب اور توہم کو ایک ہی چیز قرار دیتا ہے۔ غرض اس کا نقطۂ نظر ہی نرالا ہے۔ "لاقانونیت" کا التزام لئے بغیر وہ اپنے آپ کو ایک انقلابی سمجھتا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کے خیالات سے متاثر ہو کر بعض "غیر روایاتی" قسم کی عورتوں نے جب اس سے مشورہ طلب کیا تو اس نے سب سے زیادہ "روایاتی چیز" یعنی شادی کا مشورہ دیا۔ جسے سُن کر ان عورتوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ برنارڈ شا کو بدعت آمیز اور غیر اخلاقی ڈراموں کی بنا پر کئی دفعہ محکمۂ احتساب کی گرفت میں آنا پڑا۔ حالانکہ اُس سے زیادہ اصلاحِ معاشرت کا خواہش مند بیسویں صدی میں کوئی نہ گزرا ہوگا۔

برنارڈ شا کی دوسری اہم خصوصیت جس نے اس کو مشہور ہونے میں سہولت بہم پہنچادی اس کی خود پسندی اور اپنی برتری کا احساس ہے چنانچہ وہ اپنے آپ کو انگریزی کے سب سے بڑے ڈراما نگار شیکسپیئر سے بھی برتر سمجھتا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ وہ شیکسپیئر کو فقط شاعر مانتا ہے اور اس کی ڈراما نگاری کا منکر ہے۔ شیکسپیئر سے برنارڈ شا کی برہمی کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے بیسویں صدی کے مسائل پر ڈرامے نہیں لکھے (یہ مسائل ظاہر ہے کہ سولھویں صدی میں مفقود تھے) شیکسپیئر کے مقابلے میں شا نے ناروے کے ڈراما نگار ابسن کو بہت بلند رتبہ دے دیا ہے۔ اور شاید ابسن کی فوقیت ثابت کرنے کے لئے ہی اُس نے شیکسپیئر کو گرایا ہے۔ شا کو شیکسپیئر سے یہ شکایت ہے کہ اس نے کرداروں کی پیش کش اور زندگی میں توازن باقی نہیں رکھا۔ شیکسپیئر کی "جذباتیت" اور "رومانیت" بھی شا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی شیکسپیئر

یہ شا اس وجہ سے بھی خفا ہے کہ وہ سوشلسٹ کیوں نہ تھا اور اس کا کوئی "معین نظریۂ حیات" کیوں نہیں۔ شا کے نزدیک شکسپیئر نے بجائے حقیقی اور "توانائی بخش" فکر کے "رومان" اور "جذباتیت" جیسے گھٹیا بدل دیئے ہیں۔ جس شخص کے نزدیک شکسپیئر جیسی عظیم المرتبت ادبی شخصیت کی کوئی حیثیت نہ ہو اُس کی خود پسندی کی کیا انتہا ہوگی؟

برنارڈ شا جس نے اولاً ایک نقاد اور ایک سوشلسٹ کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ بعد میں ڈراما نگار بن گیا۔ حالانکہ ڈراما نگاری سے اسے اس وقت کوئی مناسبت نہ تھی یعنی نہ تو اُسے ڈرامے کا کوئی ذاتی تجربہ حاصل تھا اور نہ وہ ڈرامے کے معینہ اصول و قواعد پورا کرنے پر آمادہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ انیسویں صدی کے آخری دور کے مشہور ترین ڈراما نگار ولیم آرچر نے اسے اپنے ساتھ مل کر ایک ڈراما لکھنے کی دعوت دی اور اس طرح شاہ کو اس فن کی طرف متوجہ کر دیا۔ آرچر ناروے کے ڈراما نگار ابسن سے متاثر تھا۔ ویسے ابسن کے اثر سے اس دور میں کونسا ڈراما نگار آزاد تھا چنانچہ اسی وجہ سے برنارڈ شا نے بھی ابسن کا مطالعہ کیا۔ اور اس کا بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ ابسن "مسائل خیز" ڈراموں کا ماہر تھا۔ شا نے بھی اپنے ڈراموں میں کسی نہ کسی معاشی یا معاشرتی مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ابسن کو اپنا امام بنایا لیکن استاد اُستاد ہی تھا۔ ڈراما نگار کی حیثیت سے شا ابسن کے مقام تک نہیں پہنچ سکا۔ ابسن کے یہاں مسائل ضرور ملتے ہیں لیکن مکالمے بے ساختہ اور فطری ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے شا نے اپنے ڈراموں میں نہ تو پلاٹ ہی کا کوئی خیال رکھا ہے نہ کردار نگاری کا نہ مکالمے کا۔ اس کے ڈرامے، ڈرامے کیا ہیں مباحثے ہیں۔ ایک ہی نکتے پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے مختلف کردار بحثیں کرتے ہیں۔ اور شا کے ڈرامے پڑھتے ہوئے یا انھیں اسٹیج پر دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کسی بزمِ مباحثہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح برنارڈ شا نے انگریزی ڈرامے کو ان تمام خصوصیتوں سے عاری کر دیا ہے جو ڈرامے کے لوازمات میں سے سمجھی جاتی تھیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ تھیٹر ہمارے زمانے کا اتنا ہی اہم ادارہ ہے جتنا ازمنۂ وسطیٰ میں کلیسا تھا۔ تھیٹر اس کے نزدیک مقامِ تفریح نہیں بلکہ ایسا مقام ہے جہاں سے عوام کے اخلاق و عادات کو سنوارا جائے۔ انھیں نئے خیالات دیئے جائیں، انھیں سیاسی اور معاشرتی مسائل پر غور کرنے کی ترغیب دی جائے۔ مختصر لفظوں میں وہ تھیٹر کو پروپیگنڈے کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ تماشائیوں کو لطف اندوزی کی خاطر تھیٹر میں نہ جانا چاہیئے بلکہ سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لئے جانا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ تماشائی جو میرے ڈرامے اسٹیج پر دیکھتے ہیں، گویا اپنے جرائم اور حماقتیں آشکارا دیکھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گنہ گار محسوس کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تصورات رکھنے والے کو شیکسپیئر کے ڈرامے کیا پسند آئیں گے۔ شا نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب ہمیں رومیو اور جولیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں "جذباتیت" کی ضرورت نہیں ہے "عقلیت" کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے ڈراموں میں تمام کردار غیر جذباتی ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر مسئلہ پر ہر وقت بحث کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اس نے صرف ایک ہی ڈراما ذرا رومانی انداز میں لکھا ہے جس کا عنوان ہے "Candida"۔ ویسے اس کے دوسرے ڈراموں میں بھی بعض جذباتی مناظر ضرور ملتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وہ جذباتیت کا دشمن ہے۔ اس نے جذباتیت کی بجائے جبلّتِ انسانی کو اپنے اکثر ڈراموں کا موضوع بنایا ہے۔

شا نے ڈرامے اور تھیٹر کے بارے میں کہا ہے: "میرے ڈراموں کا مقصد تھیٹر کی کھڑکیوں کو نئے خیالات و افکار کی تازہ اور

حیات بخش رو کے لئے کھول دیتا ہے۔ تھیٹر کو "خیالات کی فیکٹری" ضمیر کی بیداری کا مرکز، معاشری اخلاق کی توضیح کا مقام، مایوسی اور بد اخلاقی کے خلاف جائے پناہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہونا چاہیئے "! شا کے نزدیک قدیم اور جدید ڈرامے میں فرق یہی ہے کہ جدید ڈراموں میں مسائل پر بحث ہوتی ہے، جو قدیم ڈراموں میں مفقود ہے۔ اس کے علاوہ وہ حزنیہ اور طربیہ کے مروجہ تصورات کو بھی نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ "میرے ڈرامے اس قسم کی تفریق کے متحمل نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اپنی قسم کے آپ ہیں"۔ شا نے اپنے ڈراموں کو خوش گوار، ناخوش گوار، فلسفیانہ اور اسی قسم کی دوسری صفات سے موسوم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ڈراما سنجیدہ بھی ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی مزاحیہ بھی۔ اس نے اپنے ڈراموں کی ٹکنیک کے بارے میں کہا ہے کہ "میں صرف اتنا کرتا ہوں کہ چند کردار یکجا جمع کر دیتا ہوں جو بولنا اور بحث کرنا شروع کر دیتے ہیں"۔ یہ بات مسائل خیز ڈراموں کے لئے درست ہے لیکن تاریخی و نیم تاریخی ڈراموں کے لئے درست نہیں۔

شا نے فلسفہ، معاشیات اور ادب کے میدانوں میں شوپنہار، نطشے، ابسن، اسٹرنڈ برگ، ٹالسٹائی، سیموئل بٹلر، برگساں وغیرہم سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن پھر بھی وہ ایک تخلیقی مفکر ہے کیونکہ اس نے تصورات "بکے پکائے اور تیار" نہیں لے لیے ہیں۔ اور خیر و شر کے روایتی معیاروں کو جوں کا توں قبول نہیں کر لیا ہے بلکہ زندگی کے معنی خود اپنے دماغ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور دنیا کی تمام چیزوں کو اپنے نقطۂ نظر سے اقدار بھی عطا کئے ہیں۔ اس معنی میں وہ فلسفی ہے اور اپنے آپ کو فلسفی سمجھتا ہے۔ اس نے مابعد الطبیعاتی مسائل کو نہیں چھیڑا ہے کیونکہ وہ ایسے مسائل پر غور کرنے کو تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ اس کا نعرہ مابعد الطبیعات پر مشہور ہے کہ یہ ایک اندھیرے کمرے میں ایک ایسی کالی بلی کی تلاش کے مانند ہے جو وہاں موجود نہیں ہے۔

نطشے پر مضمون لکھتے ہوئے اس نے کہا ہے کہ فلسفی وہ ہے جو زندگی کا غیر مشروط طور پر بغیر کسی تعصب یا جانب داری کے مشاہدہ و مطالعہ کرے۔ وہ کہتا ہے کہ شیکسپیر کے کرداروں میں ایک بھی صحیح معنی میں ہیرو نہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو زندگی اور اشیا کو اپنے طور پر دیکھے اور فیصلہ کرے۔ برخلاف اس کے ابسن کے کردار زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور نتیجے اخذ کرتے ہیں۔

شا نے اپنے ڈراموں میں "رومان" اور "جذباتیت" کو اس لئے بار نہیں دیا ہے کہ وہ دنیا کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا کہ جذبات ہمیشہ غلط جگہ مرکوز ہوتے ہیں۔ ہمارے جذبات بالعموم افلاس اور عدم مساوات کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں اور یہ ایک زہر ہے جو ہماری تہذیب میں سرایت کر چکا ہے، اس لئے جب تک ہماری موجودہ تہذیب قائم رہے گی، صرف مریضانہ اور غلط جذبات ہی ہم میں پیدا ہوتے رہیں گے اور یہ جذبات ہرگز اس لائق نہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

شا ایک سنجیدہ مفکر ہے جس کی فکر کو سماجی مسائل اکساتے ہیں، اور اگرچہ بالطبع وہ قہقہہ بھی لگانا چاہتا ہے مگر اس کا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غریبوں کے افلاس اور افلاس کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوریوں کا مذاق اڑائے، اسی لئے اس نے دولت مندوں کی کاہلی، تن آسانی اور عیش پروری کو نشانۂ طنز و مزاح بنایا ہے اور اس طرح بالواسطہ افلاس کے خلاف جہاد کیا ہے۔

رضیہ جہاں آرا

یہ طریقہ دوسرے مزاح نگاروں مثلاً ارسطوفینز، سروانٹے اور مولیئر نے اختیار نہیں کیا تھا۔

جب ٹالسٹائی نے زندگی کے مسائل کے بارے میں شا کے خیالات کا مطالعہ کرکے یہ فیصلہ دیا کہ شا زندگی کو ایک مذاق سمجھتا ہے "تو شا نے اس کا جواب دیا کہ "زندگی درحقیقت ایک مذاق ہی ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ شا کے طربیوں میں وہ گہرائی اور وہ فراخدلانہ رواداری نہیں ہے جو جذباتی تصورِ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔

شا کو بعض سطح بیں نقادوں نے آسکر وائلڈ کا سا مزاح نویس قرار دیا ہے، کیونکہ آسکر وائلڈ کے طربیوں میں بھی بڑے ہی چبھتے ہوئے فقرے اور پُرلطف متضاد الفاظ میں مستور تصورات زندگی ملتے ہیں۔ گو شا اور وائلڈ میں بظاہر طرزِ ادا کی مشابہت ضرور ہے لیکن معنوی حیثیت سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ وائلڈ نے صرف زندگی کی سطح کو چھوا ہے اس کی گہرائی میں نہیں گیا اس کے کرداروں کی زبان سے جو فقرے ادا ہوتے ہیں وہ بجائے خود دلچسپ سہی لیکن ان کا تعلق ان کرداروں کی سیرت اور عمل سے کچھ نہیں ہوتا اسی لئے اس کے طربیوں کی چمک دمک سطحی ہے۔ یہ بات شا کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ شا کا مقصد پروپیگنڈا ہوتا ہے نہ کہ صرف چبھتی ہوئی پُرلطف باتیں اپنے کرداروں سے کہلوا دینا۔ وہ تو چٹپٹے پن کی مدد سے صرف اپنے خیالات کو زیادہ واضح اور مؤثر کرنا چاہتا ہے۔ وائلڈ کی طرح شا کے ہاں چٹپٹا پن اپنی غایت آپ نہیں ہے۔

جہاں تک فن کارانہ ڈرامانگاری کا تعلق ہے البتہ شا اپنے ہم عصر ڈرامانگار گالزوردی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ شا کے جتنے نقائص ہیں گالزوردی ان سب سے معرّا ہے، نہ تو اس کے ہاں شا کی طرح موعظت ہے نہ لفاظی، نہ پروپیگنڈانہ پلاٹ سے بے توجہی، نہ اسٹیج کی ضروریات سے عدم واقفیت۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ شا کے ڈراموں میں اداکار کو اپنے جوہر دکھلانے کا کوئی موقع ہی نہیں، وہ صرف اپنی تقریر کو اچھی طرح ادا کردے تو کافی ہے، باقی سارا اثر تقریر کے متن کی وجہ سے پیدا ہوجائے گا۔ بخلاف اس کے گالزوردی کے ڈرامے اچھے اداکار کے بغیر اچھی طرح پیش ہی نہیں ہوسکتے۔ بنیادی فرق دونوں کے طریق کا بھی ہے کہ جہاں شا اپنے کردار اور واقعات کے لئے غیر طبعی، عجیب اور غیر روایاتی پہلوؤں کو منتخب کرتا ہے، وہیں گالزوردی بالکل پیش پا افتادہ اور عام باتوں سے اپنے ڈرامے بنا لیتا ہے۔ گالزوردی کے مکالمے بالکل فطری ہوتے ہیں اور شا کے بالکل غیر فطری لیکن گالزوردی برنارڈ شا کے پایہ کا مفکر نہیں ہے۔

برنارڈ شا کو ماہرِ حیاتیات اور فلسفی ہونے کا بھی دعویٰ ہے۔ چنانچہ اس کا فلسفۂ زندگی حیاتیاتی نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقا ناقص اور غیر تشفی بخش ہے۔ بخلاف اس کے وہ برگساں کے تخلیقی ارتقا کو سراہتا ہے۔ برنارڈ شا کے نزدیک انسان کی بنیادی جبلّت عزمِ بہتری (Will to betterment) ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے انسان کو بالارادہ کوشش کرنا ضروری ہے۔ ڈارون کے تصور کی رُو سے ارتقا میں ارادہ کو کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا۔ برنارڈ شا نے اپنے فلسفۂ حیات کی تشریح کے لئے "قوتِ حیات" (Life force) کی اصطلاح تراشی ہے جس کا مقصد تخلیق ہے۔ عورت کو وہ مجسم قوتِ حیات قرار دیتا ہے اور اسی لحاظ سے اس نے یہ الٹا تصور پیش کیا ہے کہ مرد شکار ہے اور عورت شکاری۔ اسی قوتِ حیات کے بارے میں اس نے اور بھی بہت سی باتیں کہی ہیں جو پورے طور پر واضح نہیں۔ مثلاً یہ کہ قوتِ حیات کو اخلاق سے، خیر و شر سے، لذت و منفعت سے کوئی سروکار

(بقیہ جہاں آرا)

ہیں۔ قوتِ حیات کی رو سے جو چیز تخلیق میں مددگار ہے وہ اچھی ہے اور جو غیر تخلیقی ہے وہ بری۔ یہاں شا نطشے کے تصورِ حیات سے کافی متاثر معلوم ہوتا ہے مگر نطشے سے اُسے یہ اختلاف ہے کہ اس نے اپنے فلسفے میں حیاتیات کے ساتھ ساتھ معاشیات کی بھی آمیزش کر دی ہے اور سوشلسٹ بن کر کہتا ہے کہ جب تک ہر ایک کو مساوی آزادی اور فرصت حاصل نہ ہو قوتِ حیات ترقی نہیں کر سکتی۔ ہاں جب سب کو کام مل جائے، سب کو مساوی آمدنی ہو، نہ کوئی چھوٹا ہو نہ بڑا تب ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن سے فوق الانسان افراد کے پیدا ہونے کے امکانات ہوں گے۔

شا کے اقتصادی فلسفے میں اور سب چیزوں کو چھوڑ کر سب سے زیادہ زور آمدنی کی مساوات پر دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے معاشی ڈراموں میں تفصیلات سے احتراز کیا ہے اور صرف ہماری توجہ مسائل کی بنیاد پر مبذول کی ہے۔ غریبوں کی قلیل آمدنی، مزدوروں کی کم کم اُجرتیں، دولت مندوں کا تساہل اور عیش پسندی، قوم کی مجموعی توانائی اور وقت کو ضائع کر دیتی ہے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو شا کے نزدیک قوتِ حیات کے راستے میں مزاحم ہیں۔ اس قوتِ حیات کے عجیب شعور نے شا کے تصورِ شادی کو بھی متاثر کیا ہے۔ شادی پر شا کا اعتراض یہ ہے کہ اُس سے ذاتی ملکیت اور جذباتیت کی بو آتی ہے۔ اور اس طرح عمل کا تخلیقی مقصد پیچھے جا پڑتا ہے۔

شا کے تصورات و عقائد کے بعد اُس کے فن کا جائزہ لینا چاہئے۔ فنی حیثیت سے شا کو صرف ڈرامے کے میدان میں اہمیت حاصل ہے۔ اُس کے مداحوں کے خیال میں انگریزی ادب میں شیکسپیئر کے بعد اگر کوئی ڈرامانگار ہے تو وہ شا ہے لیکن اس کے سب سے بڑے مداح اور سیرت نگار Henderson نے جب اپنی وہ کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا "کیا برنارڈ شا ایک ڈرامانگار ہے" تو اس نے بہت سے دماغوں میں اُٹھنے والے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ڈرامے کی جو روایات اور ہیئت صدیوں سے چلی آ رہی تھی شا نے اُسے یک لخت بدل دیا۔ اور جب اس پر اعتراضات کی بوچھار ہوئی تو اس نے صرف یہ جواب دینا کافی سمجھا کہ لوگ بڑی تعداد میں مجھے ڈرامانگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس لئے مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی مجھے ڈرامانگار سمجھے یا نہ سمجھے۔ میری تشفی کے لئے یہی کافی ہے کہ لوگ میری چیزوں کو ڈراما سمجھ کر دیکھتے ہیں اور بڑی تعداد میں دیکھتے ہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ شا نے پروپیگنڈا کی دھن میں پلاٹ کو عام طور پر نظرانداز کر دیا ہے۔ کرداروں پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے۔ اور بس بحث کو اہم ترین چیز سمجھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بحث میں بڑے ہی شگفتہ اور چبھتے ہوئے فقرے جابجا استعمال کرتا ہے اور اس کے سب کردار یکساں طور پر حاضر جواب اور تیز ہیں۔ گویا ہر کردار میں خود برنارڈ شا جلوہ گر ہے۔ چونکہ اس کے اقوال زندگی، سماج، سیاسیات، مذہب ہر شعبۂ زندگی کے متعلق لفظی بازی گری کے ساتھ ساتھ گہری معنویت اور طنز و ظرافت کی چاشنی لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے ڈراموں کے تماشائی پلاٹ اور کردار نگاری کے نقائص پر توجہ دیئے بغیر اس کے ڈراموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شا کے فن کا بنیادی نکتہ یہی ہے اگر شا کے ڈراموں سے ذہنی اور لفظی بازی گری کے یہ کثیر التعداد نمونے نکال دیئے جائیں تو پھر اس کے اکثر ڈرامے بالکل سپاٹ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ڈرامے میں جذبات کا فقدان ہو، پلاٹ کی تعمیر پر توجہ نہ کی گئی ہو، کرداروں میں یکسانی ہو، مکالمے بالعموم

لمبی لمبی تقریریں بن جائیں تو ڈراما ڈراما نہیں رہے گا۔ مگر اس کے باوجود تم ظریفی یہ ہے کہ برنارڈ شا کو شیکسپیئر کے بعد انگریزی کا سب سے بڑا ڈراما نگار سمجھا جاتا ہے۔

شا کہتا ہے کہ میں ڈرامے محض اس وجہ سے لکھتا ہوں کہ تمام بنی نوعِ انسان کو ہم خیال بنالوں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ڈرامے لکھنے سے میرا مقصد سماج کی اصلاح ہے مگر مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کو محض اپنے ڈراموں کے ذریعے سے پورے طور پر واضح نہیں کرتا اور اپنے مقصد کو سمجھانے کے لئے بہت لمبے لمبے دیباچے لکھتا ہے۔ اس کے دیباچے پڑھے بغیر اس کے ڈرامے کے مقاصد اور محرکات سمجھنا مشکل ہے۔ ڈراما نگار کی حیثیت سے شا کی یہ بڑی ناکامی ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ ڈراموں میں صرف ہنسی مذاق کی دلچسپ گفتگو اور اُلٹ پلٹ بحث میں شا کے مقصد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ڈاکٹرز "Dilemma" اس کا ایک مشہور ڈراما ہے جس کے لکھنے کا مقصد تو یہ بتانا تھا کہ کس طرح ایک خراب سماجی نظام میں ڈاکٹری جیسے شریف پیشے کے لوگ فریبی اور لالچی بن کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن جب اُس نے ڈراما لکھا تو ہوا یہ کہ اُس ڈرامے میں بعض خاص ڈاکٹروں کا مذاق اڑا دیا گیا اور ایک خاص مریض کی ذہانت آمیز بدمعاشی کی تصویر کھینچ گئی۔ یہ بھی احساس پیدا ہوا کہ بڑے بڑے مشہور ڈاکٹر علمی اور عملی دونوں نقطۂ نظر سے محض احمق ہیں، جو ہمیشہ غلطی کرتے ہیں۔ شا کیا ثابت کرنا چاہتا تھا اور ڈرامے میں ہو کیا گیا۔ ایسا ہی حال دوسرے بہت سے ڈراموں کا ہے۔

خیر، اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شا ایک ذہین آدمی، ایک مستقل مزاج سوشلسٹ، ایک تیز فہم ظریف اور ایک پیدائشی ماہر مباحثہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کردیتا ہے۔ اور ایسے مسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیتا ہے جن کے متعلق لوگ بالعموم سوچنا ضروری نہیں سمجھتے۔ "Candida" نام کے ڈرامے میں وہ محبت اور جنسی تعلقات کے مسئلہ پر دعوتِ فکر دیتا ہے۔ "Man and Superman" میں علم النسل اور نسلِ انسانی کے مستقبل پر متوجہ کرتا ہے۔ "Major Barbara" میں افلاس اور تموّل کے مسئلہ پر "Androcles and the Lion" میں مسیحیت پر "Getting Married" میں شادی پر "Heart-break House" میں تہذیبِ حاضرہ پر اور "Saint Joan" میں بہادری اور ولایت کے مسئلہ پر دعوتِ فکر دیتا ہے۔ شا کا اصلی سرمایہ اس کے افکار و تصورات ہیں جنھیں وہ بڑے دلچسپ اور جدت آمیز انداز میں پیش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ واقعات یا کردار سے طربیہ پیدا کرنے کے بجائے افکار و تصورات ہی سے طربیہ پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے بعض نقادوں نے اُسے افکار و خیالات کے ایسے سوداگر کا لقب دیا ہے جو اپنے مال کو بیچنے کے لئے لطف و مزاح کی چاشنی دے دیتا ہے یہ درست سہی تاہم اس کی طبیعت کا اقتضا بھی یہی ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ ظرافت کی آمیزش کرتا ہے۔ مفکر برنارڈ شا ہمیشہ ڈراما نگار برنارڈ شا پر حاوی نظر آتا ہے۔ البتہ "Caesar and Cleopatra" کے ابتدائی مناظر، "Candida" میں Marchbank، "Doctor's Dilemma" میں آرٹسٹ کی موت کا منظر، "Man and Superman" میں قوتِ حیات کے آگے Tanner کا ہتیار ڈال دینا، "Saint Joan" کی فتح

شا، جون آف آرک کے مقدمے کا منظر، یہ سب ڈرامائی نقطۂ نظر سے اعلیٰ درجے کے سحر کن نمونے ہیں۔ اس طرح ڈرامانگار شا اگرچہ کوئی ایسا ناٹک لکھ سکا جو شروع سے آخر تک اعلیٰ ڈرامائی معیار پر پورا اُترے لیکن اس نے ایسے مناظر ضرور پیش کئے ہیں جن کی ڈرامائی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

برنارڈ شا بہ حیثیت مصنف ہی کے دلچسپ نہیں بلکہ بہ حیثیت آدمی کے بھی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے کتنے ہی مزاحیہ قصے مشہور ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی شہرۂ آفاق رقاصہ کی دعوتِ شادی کو اس نے کس عمدگی سے ٹال دیا تھا سب کو معلوم ہے۔ مس ... نے لکھا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ جیسا اعلیٰ دماغ شخص اور مجھ جیسی متناسب الاعضا عورت باہمی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوں اور ایسی اولاد پیدا ہو جو آپ جیسی ذہین اور مجھ جیسی خوبصورت ہو۔ شا نے جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مادام کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں آپ کا سا ذہن اور میرا سا جسم آجائے۔ حاضر جوابی کے میدان میں شا کسی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ ایک دفعہ ایک آزاد خیال خاتون نے ملاقات کے وقت شا کو نیچا دکھانا چاہا۔ شا نے جب رسمی طور پر اس سے کہا کہ "میں آپ سے مل کر خوش ہوا" تو اس خاتون نے فوراً جواب دیا کاش میں یہی الفاظ آپ سے کہہ سکتی۔ اگر شا کے بجائے کوئی اور ہوتا تو اس غیر متوقع جملے سے بوکھلا جاتا لیکن شا نے فوراً جواب دیا کہ مادام کیا آپ میری طرح کسی کا دل رکھنے کے لئے کبھی کبھار بھی جھوٹ نہیں بول سکتیں؟

جب کسی نے برنارڈ شا کے بارے میں برنارڈ شا کی رائے پوچھی تو اس نے جواب دیا تھا! "وہ برنارڈ شا! وہ تو میرے افسانوں سے کامیاب ترین افسانہ ہے لیکن میں اس سے اب ذرا بیزار ہو رہا ہوں۔"

ایک دفعہ برنارڈ شا نے اپنے بارے میں آسکر وائلڈ کی یہ دلچسپ رائے سنائی تھی کہ "اس کا دنیا میں کوئی دشمن نہیں اور اس کا کوئی دوست اسے پسند نہیں کرتا۔" شا کو غالباً وائلڈ کی اس رائے سے اتفاق تھا جبھی تو وہ اس ریمارک کو بھول نہ سکا اور خود دوسروں کو سناتا رہا۔

شا اپنی تحریر میں واوین (Inverted Commas) استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح دوسری تحریری علامات بھی اس بنا پر استعمال نہیں کرتا کہ ان سے صفحے کا دکھاوا خراب ہو جاتا ہے۔ سند میں وہ انجیل کو پیش کرتا ہے کہ اگر انجیل میں یہ سب تحریری علامات موجود ہوتیں تو اس کو وہ اعلیٰ ادبی مقام حاصل نہ ہوتا جو اب حاصل ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ خود اپنی سوانح عمری کیوں نہیں لکھتا تو اس نے پہلے تو یہ کہا کہ تمام خود نوشتہ سوانح عمریاں جھوٹی ہوتی ہیں کوئی آدمی اتنا برا نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے مسائل کے بارے میں سچ سچ باتیں بیان کرکے اپنے متعلقین اور دوستوں کو مصیبت میں مبتلا کردے اور نہ کوئی آدمی اتنا اچھا ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسی صداقت آمیز دستاویز اپنے بارے میں چھوڑ جائے جس کی تردید کرنے والا کوئی نہ ہو۔ خود نوشتہ سوانح عمریوں کے بارے میں اس عام رائے کے بعد اُس نے کہا کہ میں اپنی سوانح عمری خود اس لئے نہیں لکھتا کہ میں سوانح عمری کے نقطۂ نظر سے دلچسپ نہیں ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے اور نہ کوئی غیر معمولی بات مجھے پیش آئی ہے جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ میں نے اپنی کتابوں میں کہہ دیا ہے۔

رضیہ جہاں آرا

ایک دفعہ لندن کے کسی اخبار نے شا سے فرمائش کی کہ وہ اپنے سنگِ مزار کے لئے ایک کتبہ تجویز کر دے۔ شا نے اسے لکھ بھیجا:

یہاں مدفون ہے

برنارڈ شا

کون تھا یہ کم بخت؟

غرض برنارڈ شا عجیب آدمی تھا۔ بیک وقت ناول نگار، نقادِ فن، موسیقی داں، صحافی، ڈرامانگار، فلسفی، ماہرِ حیاتیات، ماہرِ مادیات، سوشلسٹ، الفاظ کا بازی گر، خیالات کا سوداگر ——— ایسے آدمی بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

آخرِ کار

(ضمیر اظہر)

کسی شکیل، نظر گیر، شوخ ٹہنی سے
مثالِ نغمہ، کوئی سیم گوں کلی پھوٹی،
صبا نے گود میں اس سیم گوں کلی کو لیا،
لطیف لوریاں شام و سحر اسے دے کر
جوان پھول کا اک پیکرِ نفیس دیا،
سجا کے پھول کو پھر اوس کے نگینوں سے
"عروسِ حُسن" کا موزوں خطاب پیش کیا

"عروسِ حُسن" نے کچھ دیر تاب دکھلا کر
شمیم اپنی فقط چند روز چھلکا کر
چمن کے حجلۂ صد رنگ سے فرار کیا!
نہاں کسی رہِ ویراں کی خاک میں ہو کر!
یہ رازِ سینۂ گیتی پہ آشکار کیا
کہ حُسن رم ہے ——— فقط رم ہے ——— اور کچھ بھی نہیں!

(حلقۂ اربابِ ذوق، کراچی)
دسمبر ۱۹۵۰ء

غزل

محبت کے خیال آتے ہی رہتے ہیں
بشر پر یہ وبال آتے ہی رہتے ہیں

جوانی پر نکھار آتا ہی رہتا ہے
یہ دن، یہ ماہ و سال آتے ہی رہتے ہیں

اُمنڈتے رہتے ہیں طوفانِ رنگ اکثر
یہ طغیانِ جمال آتے ہی رہتے ہیں

کرم ہے ذوق وجدانِ محبت پر
تری محفل میں حال آتے ہی رہتے ہیں

نگاہوں سے جواب آئے نہ بن آئے
زبانوں پر سوال آتے ہی رہتے ہیں

شکستِ دل کی پروا کون کرتا ہے
کہ ان شیشوں میں بال آتے ہی رہتے ہیں

زوال آتا ہی رہتا ہے زمانے پر
کہیں سے باکمال آتے ہی رہتے ہیں

وقارؔ اس حال میں بھی تیری درگہ پر
بہت سے اہلِ حال آتے ہی رہتے ہیں

اسی قسم کی انوکھی بحر میں حضرت فراقؔ کی ایک غزل پر اکتوبر کے "مخزن المخازن" میں ہم نے اظہارِ خیال کیا تھا حضرت وقارؔ کی اس غزل میں بھی وہی بات ہے مگر انھوں نے ویسی ٹھوکریں نسبتہً بہت کم کھائی ہیں ۔ (مخزن)

یارانِ نکتہ داں

نوابِ جعفر علی خاں آثرؔ لکھنوی

مخزن کے ابتدائی دور میں بھی اس کا مطالعہ کرتا تھا اور اس
خوبیوں کا معترف تھا۔ بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اس کا
یار پست نہیں ہونے دیا۔ بلکہ قائم رکھا ہے۔ جتنے مضامین یا منظومات
سب خوب ہیں۔ آپ کے نوٹ باوصفِ ایجاز ادبیت کی جان ہیں
راختلاف میں اتحاد پیدا کرنے کا ایک شاندار کارنامہ مگر تعجب ہے
آپ نے علی اختر صاحب حیدر آبادی کی گرفت نہیں کی۔ انھوں نے
زبیت کو جو بلا تشدید ہے تربیّت بتشدید نظم کیا ہے ع " اس میں
زبیت جوہر کا نہیں کوئی مقام۔ یہ از روئے لغت ہی غلط نہیں
بلکہ متقدمین نے بھی بلا تشدید نظم کیا ہے۔ سعدی کا مصرع ہے ع

تربیت نا اہل را چوں گردگاں برگنبد است

(از لکھنؤ)

منشی تلوک چند صاحب محروم

منشورات میں "دگر زمین" کے تحت علامہ اقبال مرحوم کا یہ
قول دیکھ کر کہ "مسلمان کو اس سرزمین میں مرنے کے بعد بھی قبر کے لئے
گز زمین ایسی نہیں مل سکتی جس کو اپنی ملکیت سمجھ سکے" مجھے سخت
حیرت ہوئی۔

علامہ مرحوم کے وقت میں مسلمان ہی لاکھوں ایکڑ زمین کے
مالک تھے اور اب بھی ہیں، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر
سکتا۔ پھر اُن کا یہ قول کس طرح مستند ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس سے
کوئی سیاسی بحث مطلوب نہیں۔ ایک شک پیدا ہوا اس کا اظہار
کر دیا۔ والسلام۔ (از دہلی)

مُدیر: بادب گزارش ہے کہ یہاں ملکیت زمین کا وہ
مفہوم نہیں جو آپ نے ظاہر فرمایا۔ اس قسم کی ملکیت کو ملکیت سمجھا جائے
تو بے شک بعض آباد کے ان تمام قبرستانوں پر بھی وہاں کے مسلمانوں
کا پرانا حق ملکیت ہے جہاں اب غیر مسلم حضرات بقول پنڈت سُندر
لال کے بجبر انھیں اپنے مردوں کو دفن کرنے سے روکتے ہیں اور
حکومت بھی ان کی دادرسی نہیں کرتی، یا نہیں کر سکتی۔ آپ نے "نیا ہند"
کا پورا منقولہ اقتباس پڑھا ہی ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو اپنی مملوکہ زمینوں
پر حقِ ملکیت حاصل ہے تو نیک دل اکثریت رہچلدی نے کیوں اُن
سے چھین لیا۔ "نیا ہند" پڑھنے کے بعد علامہ اقبال کے قول کی صحت اور
اُن کی دور اندیشی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس میں ہندوستان ہی
کی تخصیص نہیں، اس قول کی صحت کی گواہ ہر ایسے خطے کی ایسی اقلیت ہوگی جسے
اپنے ہاں کی اکثریت کے ساتھ مساوی حقوق حاصل نہیں، یا حاصل نہیں
ہو سکتے۔

جناب شریف کنجاہی

نومبر کے "مخزن" میں جو افسانہ "عبرت" کے عنوان سے شائع
کیا گیا حقیقتاً ایک فرانسیسی ادیب شیتوبریاں کا لکھا ہوا ہے ہو سکتا
ہے کہ مصطفےٰ لطفی المنفلوطی نے اسی کے افسانے کو عربی میں منتقل کر دیا

ہوگئی ہو جبکہ ناقص بھی ہے اور تاریخی واقعات کے لحاظ سے غلط اور گمراہ کن بھی۔ اس کے جن کرداروں کو سعید اور فلورنڈا کے نام دیئے گئے ہیں انھیں تاریخ ابن سراج اور ادما کے نام سے جانتی ہے۔ اور ان کی نسلیں اسپین اور قرطاجنہ میں آج بھی موجود ہیں۔ ادما مسلمان ہوگئی تھی اور ابن سراج سے اس نے شادی کرلی تھی اور اس وقت اس کا بھائی (جو اسپین کا ایک نامور بہادر تھا) زندہ موجود تھا۔ ان تاریخی غلطیوں کے علاوہ اس افسانے کے اسلوب اور انداز بیان کو بھی اس افسانے سے کوئی نسبت نہیں ہے جو شیتو بریاں نے لکھا اور جو بے نظیر حسن اور رتاثر کا حامل ہے۔ ثبوت کے لئے دیکھئے "ابن سراج" از شیتو بریاں ترجمہ بدر الدین احمد۔ یہ افسانہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (ایڈیٹر ہند کلکتہ) نے بدر الدین احمد مرحوم (برادر نسبتی مولانا ابوالکلام آزاد) کے نام سے غالباً ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا اور میری کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہے۔ (از لاہور)

سیّد باقر علیم

نومبر کے مخزن الخازن کے کیا کہنے۔ اختصار۔ افادیت اور تنوع نے یقیناً "ورلڈ ڈائجسٹ" کے تقابل کی صورت پیدا کردی ہے منشورات کا عنوان بھی خوب ہے۔ شاید آپ اسے مستقل کردیں گے مگر "دوگز زمین" کے سے منشورات مخزن جیسے وقیع ادبی جریدے میں نہیں سجتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ابتر حالت پر دل ہم سب کا دکھتا ہے مگر یہ تو اس آگ کو ہوا دینا ہے۔ پاکستان کے باشندوں کے جذبات کا اشتعال بھارت کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوتا ہے ہم ایسے حادثات کی پبلسٹی کرکے ان دردمندوں کے لئے سودمند ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ تقسیم کے فوراً بعد کچھ مکرم ادبا نے سرحد کے دونوں طرف ان "گمشتاؤں" کو خوب خوب اچھالا ہے مگر ان "ادب پاروں" سے مالی منفعت کے سوا شاید ہی کسی اور بھلائی کی توقع ہوسکتی ہے۔ ادب کا پروپیگنڈا سے ذرا دور ہی رہنا بہتر ہے اور پھر ایسا پروپیگنڈا جس میں سیاست کی بھی ٹانگ ہو۔ ہم لوگ تو ایسے مظاہروں کے سبب ہی ترقی پسندوں سے نالاں ہیں۔

جعفر طاہر کہاں ہیں؟ ایسے پیارے لکھنے والے خدا جانے تھک جلدی کیوں جاتے ہیں اور خواب آمادہ آپ مجبور ہیں تاہم دیکھئے! افسانے کیوں مختصر نہیں لکھے جاتے۔ ۔ ۔ ۔ سید فیاض محمود تو لکھ لیتے ہیں۔ (از پشاور)

مخزن:- آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ اقتباسات پنڈت سُندر لال کے ہندوستانی رسالے "نیا ہند" سے لئے گئے تھے۔ اگر ایک شریف ہندو بزرگ مسلمانوں کے حال پر کڑھتا ہے اور ایک اور ہمدرد ہندو ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے تو اس سے اشتعال بڑھنے کے بجائے کم ہونا چاہیئے۔ پنڈت سُندر لال کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمان مشتعل ہوں۔ "مخزن" نے اقتباسات کے آخر میں جو دو چار سطور لکھی تھیں ان میں بھی بہ وضاحت پاکستانیوں کو اپنی اقلیتوں کے حقوق کے احترام کی تلقین کی گئی تھی۔ یہ محض تلقین ہی نہیں ہمارا جزو ایمان ہے۔

جناب طالب ہاشمی

نومبر کے پرچہ میں ایرانی افسانہ "مجسمہ" کسی صورت میں بھی مخزن کے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اس عامیانہ نفسیاتی افسانے کا معلوم نہیں آپ کو کونسا پہلو پسند آگیا۔ فاضل مترجم نے اسی افسانے میں (صفحہ ۳۲۳) پر ایک جگہ "خوب عصبی خانہ اتارا" کا عجیب و غریب محاورہ استعمال کیا ہے۔ کیا یہ محاورہ فصیح ہے اور ہم اسے بلا تامل استعمال کرسکتے ہیں؟

عبدالمجید صاحب حیرت شملوی کا خط بھی پڑھا۔ پیارے اور میری ن بے حد حسین الفاظ ہیں۔ اور ہرگز ذوقِ سلیم پر گراں نہیں گزرتے رک کو کلارک لکھنا واقعی ایک نئی بات ہے لیکن Clark کا صحیح تلفظ یہی ہے۔

ایک اور چیز مخزن میں مجھے برابر کھٹکتی ہے وہ یہ کہ آپ نے مخزن المخازن "کو بہت زیادہ جگہ دے رکھی ہے مخزن کو عام طور پر علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اوسط طبقے کے خوش ذوق افراد ہی پڑھتے ہیں۔ آپ نے غالباً یہ فرض کرلیا ہے کہ وہ لوگ صرف مخزن کے مطالعے ہی پر قانع رہتے ہوں گے۔ نہیں صاحب جن پرچوں کے اقتباسات آپ درج کرتے ہیں ان میں سے اکثر وہ پہلے ہی خود خرید کر پڑھ لیتے ہیں۔ از راہِ کرم مخزن المخازن کے لئے صرف چار صفحے ہی مخصوص رکھئے۔ اور ان میں ہندوستان کے بلند پایہ ادبی رسائل یا پاکستان کے بلند پایہ لیکن قلیل الاشاعت رسائل کے اقتباسات ہی درج کیجئے۔ یہ آپ کا مخزن اور اس کے قارئین پر ایک احسانِ عظیم ہوگا۔ (از لاہور)

محمد آصف خاں صاحب

آپ مخزن میں دوسرے رسالوں کے چیدہ چیدہ مضمون انتخاب کرکے شائع کرتے ہیں۔ یہ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ایک غریب آدمی دوسرے رسالے خریدنے سے بچ جاتا ہے مگر انتخاب کرتے وقت یہ ضرور دیکھنا چاہیئے کہ یہ مضمون کہیں سرقہ یا ترجمہ تو نہیں کسی کا مضمون اپنے نام سے چھپوا دینا صریحاً ظلم ہے۔ مئی کے مخزن المخازن میں "اقبال اور نیٹشے" کے عنوان کے تحت ایک مضمون رسالہ ہمایوں سے لیا گیا تھا۔ یہ مضمون صفیہ احمد کے نام سے چھپا ہے حقیقت یہ ہے کہ تمام مضمون روحِ اقبال" مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسن خاں سے بلا حوالہ لیا گیا ہے۔ صرف کسی مشکل لفظ کو آسان میں تبدیل کردیا گیا ہے باقی حرف بحرف وہی ہے جو "انسانِ کامل" کے عنوان کے تحت روحِ اقبال" میں ہے۔ (از لاہور)

مدیر "قومی زبان" (کراچی)

مخزن لاہور بابت اکتوبر ۱۹۵۰ء :- پروفیسر سید محمد عبا کا نظریہ یہ ہے کہ دُنیا مجموعی طور پر اخلاقِ حسنہ میں ترقی کر رہی ہے جو دلائل پیش کی گئی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر خیالات کسی انگریزی یا امریکی تحریر سے ماخوذ ہیں۔ ان میں حسب مراد قیاسات و مفروضات کا دخل کچھ زیادہ نظر آتا ہے حتیٰ کہ ایسی سخت بداخلاقی کو بھی جس کی زمانہ گزشتہ میں نظیر نہیں ملتی اخلاقی ترقی کی صلاحیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہمارے خیال میں تعلیم و تعقل میں ضرور ترقی ہو رہی ہے۔ اور اسی سبب امید ہوتی ہے کہ شاید وہ آئندہ اخلاق میں بھی ترقی کرے .... بشیر ساجد صاحب نے اپنے دلچسپ مضمون "تلامیذ الرحمٰن" میں جتایا ہے کہ اگرچہ اصلاح دینے میں استاد بے اعتدالیاں کرتے تھے اور آجکل نئے شعراء نے اس رسم کو بالکل ترک کر دیا ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں الفاظ کا ایسا غلط اور بے جا استعمال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا جیسا آجکل ہو رہا ہے۔

حامد علی خاں صاحب نے ریڈیو پاکستان کی خبروں کی زبان پکڑی اور غلطیوں پر کڑی تنقید لکھی ہے۔ ہمیں زیادہ خوشی اس خیال سے ہوئی کہ دہلی و لکھنو چھوٹنے کے باوجود اہلِ پاکستان ہیا ہی اردو کو چھوڑنے اور بگاڑنے کے روادار نہیں اور کیا عجب ہے کہ اُس گدی کو لاہور سنبھالے جسے لنڈن ڈیٹل نے دہلی سے چھین لیا ہے ....

(اقتباس از قومی زبان)

جنابِ تابش دہلوی،

نومبر کے مخزن میں جنابِ قدوس صہبائی کا مضمون "ایک نئے غزل گو کی ٹریجڈی" نظر سے گزرا۔ اس مضمون کے متعلق میرے تاثرات یہ ہیں :۔

(۱) بہت سے دعوے بے دلیل کئے گئے ہیں۔

(۲) جہاں دعویٰ دلیل رکھتا ہے وہاں "صحافیانہ انداز" رکھتا ہے۔

(۳) مجروح کو ضرورت سے زیادہ عمدہ شاعر ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں میرے پاس خود صاحبِ مضمون کے حوالے موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں :۔ "غالب کا شروع کردہ پروگرام مجروح کا پروگرام تھا۔" "مجروح آرٹ کے بنیادی تصور کو روحانی غنودگی یا تصوف کے خمار سے ملوث نہ کرنا چاہتا تھا۔"

بہتر یہ تھا کہ صاحبِ مضمون پہلے تو مثالوں سے "غالب کے پروگرام" کی واضح صورت میں اُجاگر کرتے، پھر یہ دکھلاتے کہ مجروح نے کس طرح اس پروگرام کو جس کی بنا غالب نے ڈالی تھی آگے بڑھایا؟ اسی طرح آرٹ کے بنیادی تصورات (جو آج تک معین نہ ہو سکے اور اگر ہوئے بھی ہیں تو اختلافی ہیں) بیان کرتے اور تصوف کے نظریات واضح فرماتے، پھر روحانی غنودگی اور خمار کی مثالیں دیتے کہ یہ روحانی غنودگی ہے جس نے آج تک آرٹ پر غلبہ رکھا ہے اور یہ خمارین کیفیت ہے جو تصوف کی پیدا کردہ ہے اور مجروح نے ان دونوں سے کس طرح کنارہ کیا ہے۔ اور دوسرے شعراء سے مجروح کی یہ کنارہ کشی کس طرح اُن کو ممیز و ممتاز کرتی ہے۔

صاحبِ مضمون نے جن دعووں کی دلیلیں پیش کی ہیں وہ اس قدر اخباری انداز رکھتی ہیں کہ مجھے مخزن میں رسالے کی لطافتوں کے ساتھ ساتھ اخبار کا بھی لطف محسوس ہوا۔ (جامعیت پر مبارکباد قبول ہو) وہ چند منتخب اشعار جن میں جذبات و احساسات کا وقار، بہترین اُسلوب کا حُسن، الفاظ کے استعمال کا سلیقہ، موضوع کی ہمہ گیری اور تخیل کی رفعت موجود ہے" درج ذیل ہیں :۔

نگاہِ ساقیٔ نامہرباں یہ کیا جانے
کہ ٹوٹ جاتے ہیں خود دل کے ساتھ پیمانے

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

یہ دُنیا میری رودادِ محبت سے نہ گھبرائے
اسی روداد میں دُنیا کے افسانے بھی آئینگے

الگ بیٹھے تھے لیکن چشمِ ساقی خود اُٹھی ہم پر
اگر ہے تشنگی کامل تو پیمانے بھی آئیں گے۔

پہلے شعر میں نہ موضوع کی ہمہ گیری ہے نہ جذبات و احساسات کا وقار اور نہ تخیل کی رفعت بلکہ ناچیز رائے میں تو شعر مہمل ہے "ساقیٔ نامہرباں" کہنے سے صرف دل توڑنے کا جواز ملتا ہے مگر پیمانے ٹوٹ جانے کی دلیل شعر میں کہاں سے پیدا کی گئی ہے؟ کیونکہ "ساقیٔ نامہرباں" نے پیمانے دیئے ہی نہیں اور یہی دلیل ہے دل ٹوٹنے کی۔ دوسرا شعر مفہوم کے اعتبار سے اچھا نہیں ہے۔ "آرزو کا کھو دینا" محلِ نظر ہے۔ پھر "بہانے" کے سہارے زندگی بسر کرنے کی تمنا محبوب کی تمنا کے مقابلے میں کم از کم سپردگی کے معیار سے کافی گھٹیا بات ہے جو غزل کی اچھی مثالوں میں پیش نہ کرنی چاہیئے تھی ع

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

سے مضمون لینے کی کوشش کی گئی ہے اور بس۔

تیسرے شعر کا مضمون نہایت پامال ہے، اُردو میں ذرا سے

ردّ و بدل کے ساتھ اس مضمون کے شعر ملتے ہیں۔ اس وقت ایک
یاد آتا ہے ؎

طول اس عرضِ غمِ عشق نے کیا کیا کھینچا
حشر آغاز ہی ٹھہرا مرے افسانے کا

چوتھے شعر میں نگاہِ ساقی سے پیمانوں کو افضل قرار دیا گیا ہے
ی نگاہِ ساقی ہم پر باوجود الگ بیٹھنے کے اٹھ چکی ہے۔ اب اگر
اری تشنگی کامل ہے تو پیمانوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لے گی۔
فہوم بھی پست ہے۔ اور اگر یہ مفہوم نہیں ہے تو "بھی" کا صرف
سمجھ میں نہیں آتا۔ یا "بھی" "کو" تو اس کے معنی میں استعمال کیا ہے؟

اشعار کی ان خامیوں کے باوجود صاحبِ مضمون نے جذبات
سلاست، [illegible] ہیئت و اسلوب کے حسن، الفاظ کے استعمال کے سلیقے
ور موضوع کی ہمہ گیری کی دلیل میں یہ اشعار پیش کئے ہیں، جنہیں ہم
تسلیم کرتے ہیں مگر "بندہ پرور" ہیئت کا وہ انوکھا حسن غزلِ مجروح
میں کہاں ہے جس کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ غزل کی ہیئت ابھی
تک کسی نئے حسن کی حامل نہیں۔ کیونکہ اس کی "ہیئت" میں کوئی
تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

مجروح عمدہ ترنم کے مالک ضرور ہیں۔ اور ان کی شاعری
جگر کی شاعری کا چربہ ہے اور کچھ نہیں۔ اُن کے شعر کے وہ اجزائے
ترکیبی آپ نے بتائے ہوتے جو تمام اُردو غزل گو شعراء سے اُن کو
ممتاز کرتے ہیں۔ آپ بھی اس باب میں معذور ہیں، وہ اجزا
ن کی شاعری میں ہیں ہی نہیں جو حسرت، فانی اور فراق سے
ن کو ممتاز کریں۔ ویسے بھی جس ٹریجڈی کا آپ نے اپنے مضمون کے
دوسرے حصے میں ذکر کیا ہے وہی اس کی دلیل ہے کہ اُن کا
بنیادی ذوقِ شعر گوئی پست تھا ورنہ واقعی یہ ٹریجڈی نہ ہوتی۔

(از کراچی)

ملک مسعود احمد

مخزن (اکتوبر) کے حصۂ نثر میں پروفیسر سعید احمد رفیق کا
مضمون "اخلاقی ترقی" ایک دلچسپ مطالعہ ہے لیکن اس کے
بعض پہلوؤں سے کامل اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے بھی
ایک مضمون بعنوان "فلسفہ ارتقائے فرد کے نقطۂ نظر سے" شائع
ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور اخلاقیات سے متعلق اصحابِ
فکر کے ایسے رشحاتِ قلم شائع کرتے رہنا مخزن کے تنوع اور
دلکشی میں اضافے کا موجب بنتا رہے گا اور یقیناً سنجیدہ طبقہ
ایسے مضامین کو زیادہ پسند کرے گا۔

تلفظ و املا کی اصلاح کے بعد ریڈیو پاکستان کی خبروں کی زبان
کے سلسلے میں نہایت مفید مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے جو یقیناً ایک
بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ ریڈیو والوں کو چاہئے کہ زبان و
تلفظ کے بارے میں خاص طور پر احتیاط کریں کیونکہ غلط جملے اور
غلط تلفظ سماعت پر بے حد گراں گزرتے ہیں۔

بشیر ساجد کے دلچسپ مضمون "تلامیذ الرحمٰن" میں
"جنتا" کا غم کھانے والے شاعروں پر نہایت لطیف انداز میں
طنز کی گئی ہے کہ مرورِ زمانہ اور اقدار کے تغیر کے ساتھ اب وہ بیچارے
معاشی دھندوں میں ایسے جکڑے گئے ہیں، کہ رحمانی سلسلۂ تلمذ
سراسر منقطع ہو گیا ہے اور اب تلامیذ الرحمٰن بننا اُن کے بس کا روگ
نہیں رہا۔

کیپٹن صدیقی صاحب کا مترجمہ افسانہ "آشیانۂ بلبل" ہر لحاظ
سے نہایت کامیاب ہے۔ خاتمہ [illegible] ہوا ہے اور
افسانے کی ہیروئن ایلس کی اداکاری برابر توجہ کو اپنی طرف مبذول
کئے رکھتی ہے اور خوبی یہ ہے کہ آخر میں یہ بات بھی نہیں [illegible]

ایگلسن نے اپنے خاوند کو کافی میں زہر گھول کر مارا ہے یا اپنا مقصد صرف [illegible] ہی سے حاصل کر لیا ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خواجہ غلام فریدؒ کی دو کافیوں کی خوب دُرگت بنی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ نفیس چغتائی صاحب پہلے شعر کی طرح اصل کافیوں کو ویسے کا ویسا ہی رہنے دیتے۔ اور بعد میں اُن کا مفہوم ہی اُردو زبان میں سمجھا دیتے یا ان کافیوں کا منظوم ترجمہ اپنی طرف سے کر دیتے لیکن خواجہ صاحب کے کلام بلاغت نظام میں اپنی طرف سے جا و بے جا اُردو الفاظ ٹھونس کر انھوں نے خواہ مخواہ تکلف کیا ہے، جو ہر خوش ذوق کو گراں گزرا ہوگا۔ نفیس صاحب اس سے پہلے "ہمایوں" میں بھی خواجہ صاحب کے کلام کو اس طرح شائع کرتے رہتے ہیں شاید وہ اسے بزعم خود ایک بڑی ادبی خدمت سمجھتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنے سے نہ صرف یہ کہ خواجہ صاحب کا دلکش اور شیریں کلام مسخ ہو کر رو کھا پھیکا رہ جاتا ہے، بلکہ ملتانی زبان جاننے والے اصحاب کا ذوقِ ادب بھی مجروح ہوتا ہے۔

(از ڈیرہ غازیخاں)

جناب محمد حبیب اللہ رشدی

مخزن میں دورِ حاضر کے مشہور شعراء کا کلام التزاماً شائع ہونا چاہئے۔ خصوصاً اُن قدیم اساتذہ کا جنھیں زمانہ بھلا رہا ہے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی، حضرت بیخود دہلوی، جناب آرزو لکھنوی۔ ممکن ہے کہ اِن بزرگوں میں بعض کے افکار میں شعریت کی کمی اور رنگ میں قدامت محسوس ہو۔ مگر ان اساتذہ کی ساری عمر کی مشق و مزاولت نے جو استادانہ کیفیت پیدا کی ہے اس سے ملک اور قوم کو محروم نہ رہنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید رنگ کے اساتذہ مثلاً حضرت جگر مراد آبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، مجاز، فیض، تاثیر وغیرہ کے تازہ افکار کی اشاعت کا بھی اہتمام ہونا بہتر ہوگا۔

(از لاہور)

ڈاکٹر ایم کلیم عباسی

ستمبر کے شمارہ میں جناب محمد وسیم صاحب عباسی (علیگ) کا مضمون "اُردو رسم الخط" نظر سے گزرا۔ میں نے بذاتِ خود تمام نشانات کو یکجا کر کے حروف، الفاظ بنانے کی کوشش کی اور مسرت کا باعث ہے کہ موصوف کے اختراع کردہ تمام نشانات سے حروف، رقوم اور اوزان بالکل صحیح مل گئے۔

میں محمد وسیم صاحب کو پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جنھوں نے اپنی غیر معمولی تحقیق اور چھان بین کے بعد اُردو رسم الخط کے ایک بہت بڑے اور پیچیدہ مسئلہ کا حل تلاش کر لیا۔ جو اُردو زبان کے لئے ایک ناقابلِ فراموش خدمت اور زبردست احسان ہے جس سے نہ صرف اُردو بلکہ عربی، فارسی زبانیں بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ کاش حکومتِ پاکستان اس طرف توجہ مبذول فرمائے۔

(از لکھنؤ)

جناب عبد الغنی صاحب

یہ شیر افضل جعفری کون ہیں؟ کیا خوب لکھتے ہیں! کیا نازک خیالی ہے۔ احساسات اور جذبات کی کیا فراوانی ہے وارفتگی کا کیا عالم ہے۔ طرزِ ادا میں کیسی جدت اور تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

(از جہلم)

مخزن المخازن

ماہِ نو

قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ

(ش، ضحیٰ)

گزشتہ یومِ آزادی کے موقع پر ش، ضحیٰ صاحب کی ایک نظم "۱۵۔ اگست" کے عنوان سے ماہِ نو میں چھپی تھی۔ یہ اس نظم کا آخری حصہ ہے جس میں شاعر نے قائد اعظم محمد علی جناح رح کو یاد کیا ہے۔ اس حصے کو ہم یومِ پیدائشِ قائد اعظم رح (۲۵۔ دسمبر) کے احترام میں ماہِ نو کے شکریہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ ضمناً یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ پاکستان کا یومِ آزادی ۱۵۔ اگست نہیں ۱۴۔ اگست ہے۔ (مخزن)

بنامِ محمد، بنامِ علی ، مجھے اپنے قائد کی یاد آگئی
وہ قائد، وہ اسلام کا رازدار وہ ملت کے میدان کا شہسوار
وہ میرا مجاہد، مرا راہبر کیا جس نے میری شبوں کو سحر
نگاہوں میں جس کی یہ تاثیر تھی غلامی کی زنجیر بھی کٹ گئی
کبھی جس کی تقریر خارا شکن کبھی صرف پھولوں کا رنگیں چمن
شجاعت کا پیکر صداقت کا جام وہ نازک بدن اور نازک خرام
مگر اللہ اللہ اُس کا وقار جدھر چل پڑا جھک گئے کوہسار
ٹھہر سا گیا وہ گھڑی بھی جہاں وہیں رک گئی گردشِ آسماں

مجھے جس نے بخشا ہے یہ تخت و تاج
کہاں ہے وہ میرا جہاندار آج

نہیں وہ نگاہوں سے پنہاں نہیں نظر آج بھی میری ویراں نہیں
وہ قائد جو فردوس میں شاد ہے وطن کی فضاؤں میں آباد ہے
مرے روز و شب کے تبسم میں ہے وہ بحرِ عرب کے تلاطم میں ہے
منور اسی کے منارۂ نور پر اسی کا ہے عکسِ جبیں جلوہ گر
کرن بن کے سورج کی رخشندہ ہے ہمالے ارادوں میں پائندہ ہے
اٹھا اب یہ پاکیزہ پرچم اٹھا یہ قائد کا ارمان ہے اے ساقیا!
چلا چل ذرا مسکراتا ہوا خدائی کے جوہر دکھاتا ہوا
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخیٔ فکر و کردار کا

وہ قائد ترا اب بھی دمساز ہے
یہ ماہِ اگست اس کی آواز ہے

اردو ادب (علی گڑھ)

ادب کی "پابندی" اور "آزادی"

(آل احمد سرور)

وزن، قافیے، ردیف اور مقررہ بحروں پر اس قدر سختی سے توجہ فن کے ایک محدود تصور اور بے جا روایت پرستی کا پتا دیتی ہے۔ فن اور فارم دنیا میں اٹل چیزیں نہیں ہیں۔ ہر فکر اپنے ساتھ ایک فارم لاتا ہے اور ہر فکر اور اس کا فن اپنے دور کی سماجی خصوصیات کا آئینہ ہوتا ہے۔ غزل کے لطیف اشارے، اس کا انتشار، اس میں تعمیری عنصر کی کمی اور جذباتی دھندلکے کی کثرت جاگیردارانہ تمدن میں پھلتی پھولتی رہی۔ یہ مقررہ سانچوں کی سختی سے

پیدا کیا اس لئے ترقی رہی کہ سماج کے مقررہ نظام اور تناسب کی آئینہ دار اور اس کے استحکام کی ضامن رہی۔ غزل گو شاعر انسان دوستی کے جذبات رکھتا ہے مگر ان سے کوئی بڑا کام نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بکھری ہوئی تجلیوں اور لپسی ہوئی بجلیوں کا قائل ہے۔ غزل کے نشتروں سے ایک لطیف خلش پیدا ہوتی ہے اور اس سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ ابھی اور بھی لیا جا سکتا ہے مگر یہ نشتر تلوار نہیں بن سکتے۔ غزل کی زبان بڑی دھلی منجھی ہے مگر اس میں انفرادیت کو پھولنے پھلنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی رمزیت خاصی جامع اور گہری ہے مگر پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں زیادہ عرصہ تک کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے شاعری کا مستقبل زیادہ تر غزل سے نہیں نظم سے وابستہ ہے، اگرچہ لطیف عاشقانہ جذبات کے لئے غزل کا اسلوب اور اس کی زبان ابھی عرصے تک کام آ سکتے ہیں۔ میرؔ کی سادگی سے عوام بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مومنؔ خواص کے لئے بھی خاصے معمے پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے میرؔ کی روایت زندہ رہنے والی ہے اور مومنؔ کی فنا ہونے والی۔

پابند اور آزاد نظم دونوں کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ آزاد نظم کو محض مغرب کی چیز سمجھ کر ٹال دینا تنگ نظری ہے یہ نثر کی زبان میں اور نثر کے آہنگ کے ساتھ شعریت کے امتزاج کا نام ہے۔ آزاد نظم اور پابند نظم میں آہنگ (Cadence) کا فرق ہے۔ یہاں ترنم، قافیے اور اوزان کا پابند نہیں۔ جذبات کے اُتار چڑھاؤ اور الفاظ کے بہاؤ کا پابند ہے۔ فرانسیسی شعراء نے آزاد نظم کو خاص طور پر اس لئے ترقی دی کہ انھوں نے نظم و نثر کے مروّجہ فرق کو مٹانا چاہا۔ آزاد نظم اتنی آزاد نہیں ہے جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کی اپنی پابندیاں ہیں، اس میں صرف پابند شاعری کی قیود سے آزادی ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے اپنی نظموں کے ایک دیباچے میں کہا ہے کہ "آزاد نظم میں ہم ایک لمحے کی طوفانی، عریاں تڑپ کو دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ راؤ نے اپنی کتاب "جیسویں صدی کا انگریزی ادب اور اس کے تصورات" میں لکھا ہے۔ آزاد نظم قدیم شاعری کی سپردگی اور آزادی کی طرف ایک بازگشت ہے جس میں قواعد، اوزان سے بلند ہو کر خیالات اور کیفیات کی مصوّری کی گئی ہے۔" آزاد نظم کو رمزیت اور اشاریت کے پرستاروں نے چونکہ ایک چیستان اور معمّا بنا دیا اور اس کے بعض شعراء نے اپنی مریضانہ انفرادیت اور خام رومانیت کا رنگ بھر دیا، اس لئے اردو میں اس کے امکانات پر توجہ نہیں ہوئی۔ دوسرے اردو ادب ملک کے اُس حصہ کی ملکیت رہا جو دوسروں میں واقع ہونے کے سبب روایات کا زیادہ پابند اور نئے تجربوں سے کم آشنا رہا۔ اس وجہ سے ہمیں اس سلسلے میں ایک عصبیت نظر آتی ہے۔ موجودہ سائنٹیفک دور میں شاعری کا یہ نیا روپ اپنے اندر کئی روشن پہلو رکھتا ہے۔ جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سسّی

سندھ کی ایک رنگین داستان — سسی پنھوں

(عبد الواحد سندھی)

سرزمینِ سندھ اپنے رومانی افسانوں کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔ عمر اور ماروی، لیلا اور چنیسر، جام تماچی اور نوری، مومل اور رانو، سوہنی اور مہینوال، سسی اور پنھوں جیسے افسانوں کو شاہ بھٹائیؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ شاہ نے ان کو اپنے رسالہ "(دیوان)" میں جس انداز اور اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ادب کی دُنیا میں اپنی جگہ ایک بے مثال نمو

شاہ بھٹائی نے ان میں سے ہر ایک افسانے سے ایک
م کا نتیجہ نکالا ہے جس سے ایک عالمی انسان سے لے کر
می تک مستفید ہو سکتا ہے۔ شاہ ان افسانوں کو بیان کرتے
ت تصوف کے باریک مسائل حل کرتا ہے۔ کبھی موقع ہوا تو شا
مائی کے ان افسانوں کو . . . . ایک ایک کرکے
ش کیا جائے گا۔

آج کی صحبت میں "سسی پنھوں" کی رنگین داستان پیش
کی جاتی ہے۔

سندھ کی مشہور تاریخ تحفۃ الکرام میں یہ کہانی درج ہے۔
اس کہانی کا محل وقوع کراچی کا گردونواح ہے۔ کراچی سے تیس
چالیس میل مشرق کی طرف ایک قصبہ ہے جس کا نام "گھارو"
ہے۔ اس قصبہ سے چار میل دور دریائے سندھ کی کسی شاخ
کے کنارے پر ایک شہر آباد تھا جس کا نام بھنبھور تھا۔ بھنبھور کی رونق
تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے کافی تھی۔ ایک طرف تو بلوچستان،
ایران اور افغانستان سے تجارتی قافلے آتے جاتے تھے۔ اور
دوسری طرف سمندر کے ذریعے مختلف ملکوں سے سامانِ تجارت
آتا جاتا تھا۔ اسی شہر میں ایک پنڈت نانیا نامی رہتا تھا۔ اس کی
بیوی کا نام سُندر تھا۔ ان کے ہاں ایک بڑی خوبصورت لڑکی
پیدا ہوئی۔ جوتشیوں نے بتایا کہ اس لڑکی کی شادی کسی مسلمان سے
ہوگی۔ اس بات نے ماں باپ کو تکلیف پہنچائی۔ دونوں نے
یہ سوچا کہ عزت، ناموس اور دھرم کا وقار برقرار رکھنا ضروری ہے
چنانچہ انھوں نے لکڑی کا ایک صندوق تیار کرایا۔ اس میں اس
معصوم بچی کو لٹایا اور اسے ایک مضبوط ڈھکن سے بند کرکے
دریا کے حوالے کر دیا۔ یہ صندوق بہتا بہتا ایک گھاٹ پر پہنچا جہاں
محمد نامی دھوبی (جسے عرفِ عام میں لالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا) کے
نوکر دھوبی کپڑے دھو رہے تھے ان کو صندوق نظر آیا۔ ایک
دھوبی نے آگے بڑھ کر صندوق دریا میں سے نکال لیا اور اسے
اپنے سردار محمد کے سامنے پیش کیا۔ محمد نے جب صندوق کھولا
تو اس کے اندر ایک خوبصورت بچی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتفاق
سے محمد کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ میاں بیوی اولاد کو ترستے تھے۔
قدرت نے چندے آفتاب، چندے ماہتاب ایک لڑکی دی۔
انھوں نے مقامی زبان میں اس کا نام سسی رکھا جس کے معنی
ہیں "چاند!"

سسی ناز و نعمت میں پلی، جوان ہوئی۔ اس کے حسن کی
شہرت دور دور تک پہنچی۔ دور دور کے شہزادے اسیر ہوئے
سسی کے حسن و جمال کے قصے سن کر غائبانہ فریفتہ ہو گئے۔ مکران
کے کسی علاقہ کا حکمراں ایک بلوچ تھا۔ اس کے کئی لڑکے تھے۔
سب سے چھوٹا پنھوں تھا۔ مردانہ حسن و جمال سے آراستہ
تھا۔ اس کے کانوں میں بھی سسی کے حسن کی شہرت کا غلغلہ پہنچا
پنھوں بھی غائبانہ طور پر سسی پر فریفتہ ہو گیا۔ سوداگر کا بھیس بدلا
سوداگری کا سامان لیا۔ مکران سے چلے بھنبھور پہنچے سسی تک
پہنچنے کے جتن کئے۔ سسی کو دیکھا تو اس کے عشق کی آگ اور تیز ہوئی
پنھوں محمد دھوبی کے ہاں نوکر ہو گیا۔ اور کپڑے دھونے کا کام
کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ سسی اور پنھوں کی محبت بڑھنے لگی۔ پہلے صرف
پنھوں کو عشق تھا مگر اب تو سسی بھی پیکانِ محبت کی گھائل ہو گئی
تھی۔ دونوں کا عشق بہت بڑھا جب آخری مرحلہ پر پہنچا تو ایک
سنارن سسی کی رقیب بنی جس نے پنھوں کے کان بھرنے شروع
کئے۔ پنھوں کی محبت کی غیرت نے اس بات کو برداشت نہ کیا
اس نے سسی سے منہ موڑ لیا۔ سسی کو اپنے سچے عاشق کے شبہ کو
رفع کرنے کے لئے آگ کی ایک بڑی بھٹی میں سے گزرنا پڑا۔ اس

زمانہ کی یہ ایک رسم تھی کہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے آگ میں کودنا پڑتا تھا۔ اگر اس میں سے کوئی صحیح وسالم نکل آتا تو اُسے سچا مانا جاتا ورنہ جھوٹا۔ سسی آگ کی بھٹی میں سے صحیح وسالم نکل آئی پنہوں کے تمام شکوک رفع ہو گئے۔ سسی کی طرف سے پنہوں کا دل بالکل صاف ہوگیا۔ اب دونوں طرف سے محبت کی آگ تیز ہوگئی۔ تھوڑے سے دنوں کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ دونوں بھنبھور میں ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔

بھنبھور میں سسی اور پنہوں خوش خوش رہتے تھے مگر مکران میں پنہوں کے ماں باپ اپنے نورِ چشم کی جدائی کی وجہ سے نڈھال تھے۔ مکران کے حاکم کو اطلاع ملی کہ اس کا لڑکا بھنبھور میں ایک دھوبی کے ہاں رہتا ہے اور وہیں شادی بھی کر لی ہے۔ مکران کے حاکم کو بہت غصہ آیا کہ میرا لڑکا ایک دھوبی کے گھر رہتے۔ دھوبی کا پیشہ کرے اور دھوبی کا گھر داماد بنے یہ کہاں کا انصاف ہے؟ مکران کا امیر دن رات کڑھتا رہتا۔

ایک دن اس کے شہزادوں نے کہا: بابا جان! آپ پریشان نہ ہوں ہم پنہوں کو بھنبھور سے لے آئیں گے۔ پنہوں کے بھائی اپنی پوری تیاری کے ساتھ مکران سے چلے بھنبھور پہنچے۔ سیدھے پنہوں کے گھر جا کر اترے۔ سسی نے اپنے دیوروں کی کافی خاطر مدارات کی۔ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرائے۔ مہمانوں نے کھانا کھایا کھانے کے بعد شراب کا دَور چلا۔ تمام لوگ جب سو گئے تو بھائیوں نے پنہوں کو رسیوں سے کس کر باندھا اور اونٹ پر کس دیا اور اسے لیکر مکران کا رستہ لیا۔

سسی کی جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ نہ پنہوں ہے اور نہ پنہوں کے بھائی۔ بھنبھور کے کونے کونے میں تلاش کیا۔ لیکن کہیں ان کا پتا نہ چلا۔ مکران کے راستے پر اُن کے پاؤں کے نشانات ملے۔ سسی ان نشانات کے پیچھے چل پڑی۔ بیچاری عورت ذات گرتی پڑتی پنہوں کے پیچھے دوڑتی بھاگتی جا رہی تھی۔ افسانہ نگار کا کہنا ہے کہ سسی موجودہ مقام ملیر نزد کراچی سے نکل کر منگھو پیر راستے سے ہوتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ وہ بہت بھوکی پیاسی تھکن سے چُور تھی۔ پنہوں پنہوں پکارتی جا رہی تھی۔ اسی حالت میں کوئی چالیس میل چلی ہوگی کہ پیروں نے جواب دے دیا۔ آگے بڑھنے کا یارا نہ رہا۔ بھوک لگی۔ پیاس بھی سخت لگی۔ حلق ودق صحرا۔ انسان نہ حیوان۔ بے ہوش ہو کر پتھریلی زمین پر گر پڑی۔ چلم پر ایڑیاں رگڑنے لگی۔ خدا کی قدرت سے وہیں پانی کا چشمہ دکھا دیا۔ سسی نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ سسی کا چشمہ آج تک موجود ہے اور اس کے کنارے اس کا لگایا ہوا پیڑ بھی ابھی تک پایا جاتا ہے۔ اسی چشمہ سے سیر ہو کر تازہ دم ہو کر آگے چلی۔ سات آٹھ میل چلی ہوگی کہ پھر سے پیاس سے تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ وہاں پاس ہی ایک گڈریا بکریاں چرا رہا تھا۔ اس نے سسی کو دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا دیر تک کھڑا گھورتا رہا۔ اور پھر بولا چلو میرے گھر میں تمہاری مدد کروں گا۔ اور تمہیں اپنی بیوی بناؤں گا۔ سسی بولی واہ بھئی میری تو جان پر بنی ہے تمہیں اپنی ہی سوجھی ہے تمہیں شرم نہیں آتی۔ ایک بے بس لڑکی پر نیت بگاڑتے ہو۔ پھر سسی نے گڈریئے سے کہا جاؤ کچھ کھانا پانی تو لے آؤ پھر دیکھا جائے گا۔ گڈریا بکریوں کا دودھ لینے چلا گیا۔

گڈریا اُدھر دودھ لینے گیا اور اِدھر سسی نے خدا سے گڑگڑا کر نہایت عاجزی سے پناہ مانگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اے خدا مجھے اس ظالم کے پنجے سے نجات دے۔ سسی کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اُدھر ایک چٹان پھٹی اور سسی اس میں گھس گئی۔ بس اس کا آنچل اس کی پاک دامنی کی گواہی دینے اور اس کی

مشاورسے کسی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے باہر نکلا رہ گیا۔

جب گذریا دودھ لے کر آیا تو اس نے نقشہ بدلا پایا اُسے اپنی
افسوس ہوا۔ بہت پچھتایا اور توبہ کی۔ اپنے گناہ کو دھونے کے
اس نے سسی کا مزار بنایا اور وہیں مجاور بن کر بیٹھ گیا۔

ادھر پنہوں جب اپنے باپ کے پاس پہنچا تو اس کی حالت
خراب تھی سسی کی جدائی نے اُسے بالکل نڈھال کر دیا تھا
کو اس کی حالت پر رحم آیا اور اس کے بھائیوں سے کہا کہ
سے سندھ واپس لے جاؤ۔ اور اس کی چاہنے والی کو بھی اس کے
ساتھ لے آؤ۔

اب پنہوں کو اس کے بھائی سندھ واپس لے چلے چلتے
چلتے وہ آکر اس جگہ رُکا جہاں سسی کا مزار بنا ہوا تھا۔ پنہوں کے
سینے میں اس مقام سے ایک طرح کا اُنس پیدا ہو گیا پھر گذریے
نے اور کسی کی داستان جو سنائی تو پنہوں سمجھ گیا کہ سسی کے سوا
کوئی ہو نہیں سکتا۔ پنہوں بھائیوں اور قافلہ والوں سے اجازت
لے کر مزار پر آیا اور مزار کو پکڑ کر زار و قطار رویا اور خدا سے دعا مانگی
"اے اللہ! مجھے میری پیاری سے ملا دے"۔ کہتے ہیں اسی طرح
مزار پھٹی اور پہلے کی طرح پنہوں کو بھی اپنی آغوش میں سمیٹ کر
پھر بند ہو گئی۔

شاہراہ (دہلی)

آزادی کی قسم!

(پروفیسر کنھیا لال کپور)

مغربی اقتدار نے ایشیا کی جن قوموں کی زندگی کا خون صدیوں
تک چوسا ہے اور گوشت نوچا ہے، اور آخر کار انہیں
خشک پنجر کر کے چھوڑ دیا ہے، انہیں طلوعِ آزادی کے بعد
اپنی "شب گزیدہ سحر" سے کسی طرح تسلی نہیں ہوتی۔
صدیوں کی غلامی نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ
صبر سے اپنے قصرِ آزادی کی تعمیر کا انتظار کر سکیں، وہ
مضطرب ہیں۔ اُن کا پیمانۂ صبر چھلکا پڑتا ہے اور وہ معجزے
دیکھنا چاہتے ہیں ــــ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی الٰہ دین
اپنے معجز نما چراغ کی رگڑ سے جنات کو بلائے اور اُن
کے صدیوں کے کھنڈروں پر پلوں میں عشرت محل تعمیر
کر دے۔

ظاہر ہے کہ کم از کم عام انسانی قوت کے بس کی تو یہ بات
نہیں۔ نہ روم ایک دن میں بنا تھا نہ نیویارک نہ ماسکو۔
اس مقصد کے لئے برسوں تک صبر و تحمل سے کام کرنے
کی ضرورت ہے مگر مغربی اقتدار نے جہاں اپنے تمام
سابق غلاموں کی دولت کے مادی ذرائع چھین لئے،
وہیں اُن کے شعور، ودانش پر بھی ڈاکا ڈالا اور انہیں اس
حالت کو پہنچا دیا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں
رہے۔ ان نو آزاد قوموں کا پڑھا لکھا متوسط طبقہ بالخصوص
اب اپنے سابق نیک بد رہنماؤں اور موجودہ اچھے اور برے
وزیروں کی یکساں بُری گت بنا رہا ہے۔ یہ حضرات اب آپے
سے باہر ہو کر چنگھاڑیں مار رہے ہیں کہ آزادی کے بعد علم و
حکمت، مال و دولت اور عیش و عشرت رفتہ طریقۃ العین
ہیں، اور پوری فراوانی کے ساتھ لوٹ کیوں نہیں آئی؟

پروفیسر کنھیا لال کا جو مضمون ہم ترقی پسند معاصر "شاہراہ"
(دہلی) سے شکریہ کے ساتھ ذیل میں نقل کر رہے ہیں اس سے
متوسط طبقہ تو خیر کیا سبق حاصل کرے گا ہمیں امید نہیں
کہ شمع وزارت کے نئے اور آئندہ پروانے بھی اس کو پڑھ کر

پسماندہ ملکوں میں وزارت کے سودے کے نفع ونقصان
کا اندازہ کرسکیں کیونکہ عشق (خواہ وزارت ہی کا کیوں
نہ ہو) ہمیشہ "برتر از اندیشۂ سود وزیاں" رہا ہے ۔

(حامد علی خاں)

میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ ـــــ

باپو کی قربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا لیکن باپو کے بتائے ہوئے
اصولوں پر کبھی عمل نہیں کروں گا۔ میں بات بات میں گاندھی جی کی
دہائی دوں گا لیکن جب مجھے گاندھی جی کی دہائی دی جائے گی تو
میں اس کی بالکل پروا نہیں کروں گا۔ ایک سچے دیش بھگت کی
طرح دیش کا روپیہ اُس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک کہ
دیش کا دیوالہ نہیں پٹ جاتا۔ بوڑھا، اندھا یا بہرہ ہو جانے کے بعد
چاہے مجھے لاٹھی کے سہارے یا سٹریچر پر سوار ہو کر آنا پڑے میں
ریٹائر ہونا پسند نہیں کروں گا۔ اور تب تک گدی سے چمٹا رہوں گا
جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ جب تک دم میں دم
ہے میں کسی نوجوان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دوں گا جب تک
کہ وہ میرا نزدیکی رشتہ دار نہ ہو۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــ

میں بھول کر بھی ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے جنتا
کو فائدہ پہنچنے کی امید یا امکان ہو۔ میں جنتا کو بیوقوف بنانے کی
کوشش کروں گا۔ جو لوگ میری باتوں میں آنے سے انکار کریں گے
انھیں عمر بھر کے لئے جیل خانہ میں بھجوا دوں گا۔ اور قیامت تک
یہ نہیں بتاؤں گا کہ انھوں نے کون سا قصور کیا ہے۔ جتنے اسٹاف
کی مجھے ضرورت ہوگی اس سے چوگنا رکھوں گا لیکن پھر بھی یہ شکایت
کرتا رہوں گا کہ آدمیوں کی کمی کے باعث کوئی کام وقت پر نہیں ہو
رہا۔ جنتا کی ہر شکایت کو بڑے غور سے سنوں گا اور سننے کے بعد
بھول جاؤں گا کہ وہ شکایت کیا تھی۔ کھانے پینے کی تمام مخزن اشیا
پر کنٹرول لگاؤں گا اور اس کے بعد جب وہ چیز بازار سے غائب
ہو جائے گی تو اس کا سبب یہ بتاؤں گا کہ راتوں رات [illegible]
آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جنتا کو وہ چیز پوری مقدار میں
دلائی جا سکتی۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کے لئے ہر شخص سے بہت سے
درخواست کروں گا کہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن کھانا کھایا
کرے۔ اور باقی چھ دن پیٹ پر پٹی باندھ کر سو جایا کرے۔ قلماق کو
کپڑے کا توڑ اس طرح پورا کروں گا کہ کپڑے کے دام معمولی سے
زیادہ بڑھا دوں گا تاکہ کوئی شخص کپڑا خرید ہی نہ سکے۔ بڑے اہل فن
پوسٹر لگوا کر جنتا کو سمجھایا جائے گا کہ فاقہ [illegible] انکار [illegible]
کس قدر ضروری ہے۔

دیش کی دولت بڑھانے کے لئے ہر ایک دوست
امپورٹ لائسنس دلاؤں گا جس سے وہ امریکہ سے
کتابیں اور مہنگا سامان منگوا کر غیر مناسب داموں پر فروخت
اس طرح میرے دوستوں کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو
گا اور ملک بہت جلد مالا مال ہو جائے گا۔ غریبوں کو طرح طرح
سبز باغ دکھا کر خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اگر وہ بغاوت
کریں گے تو [illegible] ثابت کر دوں گا [illegible]
جو غریب اپنا حق مانگتا ہے وہ سیدھا [illegible] جاتا ہے۔ [illegible]
داری ختم کر دوں گا مگر جاگیرداروں کو کسانوں سے اتنا روپیہ
دلواؤں گا جس سے وہ نئی جاگیریں خرید سکیں۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــ

آزادی تحریر و تقریر کو بالکل ختم کر کے چھوڑوں گا۔ چاہے مجھے
پینل کوڈ تبدیل کرنا پڑے یا Ordinances کا سہارا
لینا پڑے۔ اس نیک کام کے لئے نئے آئین میں تین نئی مدیں

۔۔اور ہے کسی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے باہر نکلا رہ گیا۔
م جب گڈریا دودھ لے کر آیا تو اس نے نقشہ بدلا پایا اُسے اپنی
غم افسوس ہوا بہت پچھتایا اور توبہ کی۔ اپنے گناہ کو دھونے کے
تی نے سسی کا مزار بنایا اور وہیں مجاور بن کر بیٹھ گیا۔
ما ادھر پنہوں جب اپنے باپ کے پاس پہنچا تو اس کی حالت
لیکن عزاب بھی سسی کی جدائی نے اُسے بالکل نڈھال کر دیا تھا
کو اس کی حالت پر رحم آیا اور اس کے بھائیوں سے کہا کہ
ں سے سندھ واپس لے جاؤ۔ اور اس کی چاہنے والی کو بھی اس کے
ت لے آؤ۔

س اب پنہوں کو اس کے بھائی سندھ واپس لے چلے چلتے
چلتے وہ آ کر اس جگہ رکا جہاں سسی کا مزار بنا ہوا تھا۔ پنہوں کے
ہیں اس مقام سے ایک طرح کا اُنس پیدا ہو گیا پھر گڈریئے
نے رو رو کر سسی کی داستان جو سنائی تو پنہوں سمجھ گیا کہ سسی کے سوا
کوئی ہو نہیں سکتا۔ پنہوں بھائیوں اور قافلہ والوں سے اجازت
کر مزار پر آیا اور مزار کو پکڑ کر زار و قطار رو دیا اور خدا سے دعا مانگی
اے اللہ! مجھے میری پیاری سے ملا دے۔" کہتے ہیں اسی طرح
ر پھر پھٹی اور پہلے کی طرح پنہوں کو بھی اپنی آغوش میں سمیٹ کر
بند ہو گئی۔

شاہراہ (دہلی)

آزادی کی قسم!

(پروفیسر کنھیالال کپور)

مغربی اقتدار نے ایشیا کی جن قوموں کی زندگی کا خون صدیوں
تک چوسا ہے اور گوشت نوچا ہے، اور آخر کار انہیں
خشک پنجر کر کے چھوڑ دیا ہے، انہیں طلوعِ آزادی کے بعد

اپنی "شب گزیدہ سحر" سے کسی طرح تسلی نہیں ہوتی۔
صدیوں کی غلامی نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ
صبر سے اپنے قصرِ آزادی کی تعمیر کا انتظار کر سکیں، وہ
مضطرب ہیں۔ اُن کا پیمانۂ صبر چھلکا پڑتا ہے اور وہ معجزے
دیکھنا چاہتے ہیں ــــ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی الہ دین
اپنے معجز نما چراغ کی رگڑ سے جنات کو بلائے اور اُن
کے صدیوں کے کھنڈروں پر پلوں میں عشرت محل تعمیر
کر دے۔
ظاہر ہے کہ کم از کم عام انسانی قوت کے بس کی تو یہ بات
نہیں۔ نہ روم ایک دن میں بنا تھا نہ نیو یارک نہ ماسکو۔
اس مقصد کے لئے برسوں تک صبر و تحمل سے کام کرنے
کی ضرورت ہے۔ مگر مغربی اقتدار نے جہاں اپنے تمام
سابق غلاموں کی دولت کے مادی ذرائع چھین لئے،
وہیں اُن کے شعور و دانش پر بھی ڈاکا ڈالا اور انہیں اس
حالت کو پہنچا دیا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں
رہے۔ ان نو آزاد قوموں کا پڑھا لکھا متوسط طبقہ بالخصوص
اب اپنے سابق نیک و بد رہنماؤں اور موجودہ اچھے اور برے
وزیروں کی یکساں بُری گت بنا رہا ہے۔ یہ حضرات اب آپے
سے باہر ہو کر چنگھاڑیں مار رہے ہیں کہ آزادی کے بعد علم و
حکمت، مال و دولت اور عیش و عشرت رفتہ طرفۃ العین
میں، اور پوری فراوانی کے ساتھ لوٹ کیوں نہیں آئی؟
پروفیسر کنھیالال کا جو مضمون ہم ترقی پسند معاصر "شاہراہ"
(دہلی) سے شکریہ کے ساتھ ذیل میں نقل کر رہے ہیں اس سے
متوسط طبقہ تو خیر کیا سبق حاصل کرے گا ہمیں امید نہیں
کہ شعبِ وزارت کے نئے اور آئندہ پروانے بھی اس کو پڑھ کر

پسماندہ ملکوں میں وزارت کے سودے کے نفع ونقصان کا اندازہ کرسکیں کیونکہ عشق (خواہ وزارت ہی کا کیوں نہ ہو) ہمیشہ "برتر از اندیشۂ سود وزیاں" رہا ہے۔

(حامد علی خاں)

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ———

باپو کی قربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا لیکن باپو کے بنائے ہوئے اصولوں پر کبھی عمل نہیں کروں گا۔ میں بات بات میں گاندھی جی کی دہائی دوں گا لیکن جب مجھے گاندھی جی کی دہائی دی جائے گی تو میں اس کی بالکل پروا نہیں کروں گا۔ ایک سچے دیش بھگت کی طرح دیش کا روپیہ اُس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک کہ دیش کا دیوالہ نہیں پٹ جاتا۔ بوڑھا، اندھا یا بہرہ ہو جانے کے بعد چاہے مجھے لاٹھی کے سہارے یا سٹریچر پر سوار ہو کر آنا پڑے میں ریٹائر ہونا پسند نہیں کروں گا۔ اور تب تک گدّی سے چمٹا رہوں گا جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ جب تک دم میں دم ہے میں کسی نوجوان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دوں گا جب تک کہ وہ میرا نزدیکی رشتہ دار نہ ہو۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ———

میں بھول کر بھی ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے جنتا کو فائدہ پہنچنے کی امید یا امکان ہو۔ میں جنتا کو بیوقوف بنانے کی کوشش کروں گا۔ جو لوگ میری باتوں میں آنے سے انکار کریں گے انھیں عمر بھر کے لئے جیل خانہ میں بھجوا دوں گا۔ اور قیامت تک یہ نہیں بتاؤں گا کہ انھوں نے کون سا قصور کیا ہے۔ جتنے اسٹاف کی مجھے ضرورت ہوگی اس سے چوگنا رکھوں گا لیکن پھر بھی یہ شکایت کرتا رہوں گا کہ آدمیوں کی کمی کے باعث کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا۔ جنتا کی ہر شکایت کو بڑے غور سے سنوں گا اور سُننے کے بعد بھول جاؤں گا کہ وہ شکایت کیا تھی۔ کھانے پینے کی تمام اشیا پر کنٹرول لگاؤں گا اور اس کے بعد جب وہ چیز بازار سے ہو جائے گی تو اس کا سبب یہ بتاؤں گا کہ راتوں رات ملک کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جنتا کو وہ چیز پوری مقدار میں دلائی جا سکتی۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کے لئے ہر شخص سے درخواست کروں گا کہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن کھانا کھایا کرے۔ اور باقی چھ دن پیٹ پر پتھر باندھ کر سو جایا کرے۔ کپڑے کا توڑا اس طرح پورا کروں گا کہ کپڑے کے دام حد سے زیادہ بڑھا دوں گا تاکہ کوئی شخص کپڑا خرید ہی نہ سکے۔ بڑے بڑے پوسٹر لگوا کر جنتا کو سمجھاؤں گا کہ فاقہ کرنا اور ننگا رہنا صحت کے لئے کس قدر ضروری ہے۔

دیش کی دولت بڑھانے کے لئے ہر ایک دوست کو امپورٹ لائسنس دلاؤں گا جس سے وہ امریکہ سے کتابیں اور مہنگا سامان منگوا کر غیر مناسب داموں پر فروخت کریں۔ اس طرح میرے دوستوں کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو گا اور ملک بہت جلد مالا مال ہو جائے گا۔ غریبوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اگر وہ بغاوت کریں گے تو انہیں گولیوں سے بھون دوں گا۔ جو غریب اپنا حق مانگتا ہے وہ سیدھا نرک میں جاتا ہے۔ جاگیرداری ختم کر دوں گا مگر جاگیرداروں کو کسانوں سے اتنا روپیہ دلواؤں گا جس سے وہ نئی جاگیریں خرید سکیں۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ———

آزادیٔ تحریر وتقریر کو بالکل ختم کر کے چھوڑوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لئے پینل کوڈ تبدیل کرنا پڑے یا Ordinances کا سہارا لینا پڑے۔ اس نیک کام کے لئے نئے آئین میں تین نئی مدو

مافہ کروں گا۔

(۱) ہر مرد یا عورت کو سمن، وارنٹ اور جرم کے بغیر کسی بھی وقت ...ار کیا جا سکتا ہے۔

(۲) مجرم کو عدالت میں پیش نہیں کیا جائیگا تاکہ وہ اپنا بے ...رہونا ثابت ہی نہ کرسکے۔

(۳) مجرم کو ایک بار رہا کرکے پھر گرفتار کیا جائے گا۔ یہ ...ناری جیل کے دروازے پر عمل میں لائی جائے گی۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ______

اپنی غلطیوں کے لئے میں کبھی خود کو قصور وار نہیں ٹھہراؤں ...زور زور سے چلا کر کہوں گا کہ گاڑیاں اس لئے دیر سے آتی ...یں کیونکہ انجن بوڑھے ہوگئے ہیں۔ کھانا اس لئے نہیں ملتی ...کھیتوں نے زمین سے اُگنا بند کر دیا ہے۔ رشوت بڑھ رہی ہے ...دنکہ لوگوں کو رشوت دینے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ اناج کا توڑا ...ں لئے ہے کہ سارا اناج چوہے کھا گئے ہیں۔ اپنے آپ ...بے قصور ثابت کرنے کے لئے چاہے مجھے کتنا جھوٹ بولنا ...ے میں بولوں گا کیونکہ فتح آخر جھوٹ کی ہوتی ہے۔ اہنسا کے ...سول پر اس حد تک عمل کروں گا کہ بجٹ کا صرف ساٹھ فیصدی ...ہ جنگ کا سامان خریدنے پر صرف کروں گا۔ سچ مجھے جان ...ے بھی زیادہ عزیز ہے مگر سچی بات نہ کبھی خود کہوں گا نہ کسی اور ...ہنے دوں گا۔

شراب نہیں پیوں گا۔ شراب کے بجائے غریبوں کا خون ...کر گزارہ کروں گا۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ______

اگر سورگ لوک میں "باپو" مجھے بُرا بھلا کہیں گے یا میری بے ...پر آنسو بہائیں گے تو میں جان بوجھ کر بہرا اور اندھا بن جاؤں گا۔

آزادی کے دن میں عزم کرتا ہوں کہ ______

میں دیش کو تباہ کرکے دم لوں گا۔ پرماتما مجھے ہمت اور توفیق دے کہ میں اپنے عزم کو پورا کرسکوں۔

آجکل (دہلی)

مصوّری عہدِ اکبری میں

(کوثر چاند پوری)

تصویر کشی کا فن آرٹ کے اعتبار سے کتنا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو اس کے متعلق مذہب کے احکام بالکل جُداگانہ ہیں جن سے اس فن کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں ہوئی چنانچہ علماء نے مصوّری پر بھی اعتراضات کئے ہوں گے۔ اور اس سلسلے میں علمی موشگافیوں کی نوبت بھی آئی ہوگی۔ اکبر کے کانوں میں بھی یہ باتیں ضرور پہنچی ہوں گی۔ اسی لئے وہ اپنی اس رائے کے اظہار پر مجبور ہوا۔ اس نے ایک جلسہ میں کہا۔

مصوّری کی جو مذمت کی جاتی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آتی میرا خیال تو یہ ہے کہ مصوّر سے بڑا خدا شناس کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جب وہ کسی جانور کی تصویر بناتا ہے تو اس کا جوڑ جوڑ نمایاں کر دیتا ہے لیکن اس پیکرِ تصویر میں روح نہیں پھونک سکتا اس لئے اپنے عجز کا اعتراف کرکے خدا کی طاقت کا قائل ہو جاتا ہے اور یہی خدا شناسی ہے۔ اکبر کے اس فطری رجحان نے بھی مصوّری کی ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ اور ہندوستانیوں کے دماغ تصویر کشی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اکثر مصوّر اپنے آرٹ کے نادر نمونے دربار میں پیش کرتے اور بڑے بڑے صلے حاصل کرتے تھے۔ جلد ہی ملک میں ایسے ماہرینِ فن پیدا ہوگئے جن کا آرٹ

اہلِ فرنگ کے آرٹ سے بھی بڑھ گیا۔ بنوا مصوّر تو ایسے تھے جو کمالِ فن کے اعتبار سے بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے۔

اکبر نے دوسرے محکموں اور صیغوں کی طرح خطاطی اور تصویر کشی کا بھی ایک محکمہ قائم کردیا تھا۔ اس میں مصوّروں کے دوش بدوش خوش نویس، جلد ساز، نقاش اور لکیریں کھینچنے والے فن کار بھی ملازم تھے۔

کاتب نظم و نثر کی جو کتابیں لکھتے تھے مصوّر ان میں مناسب مقامات پر تصاویر بنا دیتے تھے۔ اور دوسرے اہلِ فن کتاب پر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے۔ نقاش بیل بوٹے بناتا تھا، مذہب سونے کے ورق چڑھاتا تھا اور صحاف جلد سازی کا کام انجام دیتا تھا۔

اس محکمہ میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ کتابیں خاص طور پر باتصویر تھیں:-

قصّہ امیر حمزہ، چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اقبال نامہ، رزم نامہ، رامائن، نل دمن، کلیلہ دمنہ، عیار دانش۔

تصویر خانہ میں سب سے بڑا اور مشہور مصوّر جو یقیناً اپنے کمالِ فن کے اعتبار سے اس شعبہ کا افسرِ اعلیٰ ہوگا میر سیّد علی تھا۔ یہ تبریز کا رہنے والا تھا اور وہیں اپنے باپ سے مصوّری سیکھی تھی۔ ہندوستان پہنچ کر تصویر خانے میں ملازم ہوگیا تھا۔

خواجہ عبدالصمد شیرازی بھی اس شعبہ کا مشہور مصور تھا اس کو شیریں قلم کا خطاب بھی ملا تھا۔

دسونتہ ہندوستان ہی کا باشندہ تھا، یہ ایک کہار کا بیٹا تھا اور اپنے گھر میں دیواروں پر تصاویر اور نقش و نگار بنانے کی مشق کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے بادشاہ کی نظر پڑگئی اس نے دسونتہ کے فطری جوہر کو بھانپ لیا اور اسے خواجہ عبدالصمد کے سپرد کردیا۔ تھوڑے سے ہی عرصہ میں وہ مصوّری کے آرٹ کا ماہر ہوگیا۔

مادھو بھی اس فن کا زبردست ماہر تھا بلکہ تصویر کشی اور ز میں اُسے عہدِ اکبری کا بہزاد سمجھنا چاہیئے۔

ان مصوّروں کے علاوہ تصویر خانہ میں اور بھی بہت سے مصوّر ملازم تھے۔ جن میں بساون، کیسو لال، مکند، جگن، ہیر، کھیم کرن، تار، سانولہ، ہرنبس، رام، مسکین، فرخ اور قلماق کو بھی اس فن کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور بساون نے تو مصوّری نقاشی اور رنگ آمیزی وغیرہ میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ اہلِ فن اُسے دسونتہ پر ترجیح دینے لگے تھے۔

نگار

امیر و داغ کے غیر مطبوعہ خطوط

امیر کا خط داغ کے نام

۷۔ جولائی ۱۸۹۶ء روز یک شنبہ۔

۔۔۔۔ نواب مرزا خاں صاحب اُس ملک میں رہ کر اور پورا وقت فرصت پاکر آپ کی مشق کو تو بہت ترقی ہوگی۔ مگر اپنے کلام میں عیوب پر نظر کم جاتی ہے۔ اور آپ پر کیا موقوف ہے جو ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں پرکھنے والا نہ ہو، جو کچھ کہے آپ ہی اس کا دیکھنے والا ہو، سننے والے ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ اُن کے سامنے پڑھا جائے واہ وا کریں اس کو یہی وقت پیش آئے گی، بلکہ آفرین ہے آپ کے حسنِ طبیعت کو کہ باوصف تنہائی بہت سے محاسن آپ کے کلام میں رہتے ہیں اور بہت ہی کم معائب ہوتے ہیں۔

ان غزلوں میں البتہ خدا جانے زیادہ کد کی گئی یا اور کوئی سبب ہوا کہ کئی شعر معیوب نظر آئے کئی شعر سہی معلوم ہوئے

بہرکیف طبیعت ایک رنگ پر رہتی نہیں، اس میں آپ کا کیا قصور، میں چونکہ آپ کا خیر خواہ قدیم ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ عیب دیکھوں، اور آپ کو مطلع نہ کروں خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ مجھے دیکھنے اور انتخاب کرنے اور چھپوا دینے کے واسطے بھیجیں۔ اب اس خط کو درخواست عفو گستاخی و بے تکلفی پر ختم کرتا ہوں . . . .　　　امیر احمد عفی عنہٗ

غزل نمبر ا۔ شعر ۲ نقشِ محفل اجنبی ہے، نہ اس کا استعمال فارسی میں نظر سے گزرا نہ اُردو میں۔

اور باعث ہونے کا یہ مقام نہیں ہے دوسرے مصرع کی ترکیب یوں ہونا چاہئے کہ "جینے میں یہ ہے اڑنے میں یہ ہے"

۱۰۔ بھاگا گیا۔ سے کو نہیں چاہتا۔ بلکہ "بھاگتا ہے" ہو تو ردیف ٹھیک ترہے۔

۱۵۔ ایک چیز کی نسبت کہتے ہیں جب وہ دونوں کام دے مثلاً تلوار کی تلوار ہے اور عصا کا عصا ہے۔ شاید آپ کے یہاں اس صورت سے یہ محاورہ ہو تو اس صورت میں مجھے کچھ تامل نہیں ہے، مگر میرے نزدیک دیگر ۳ ای ہے کہ یہی ہمارا رستہ ہے، یہی ہماری منزل ہے اور شوق کی جگہ درد مناسب ہے۔

۱۸۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

۱۹۔ قسم مشکل کشا کی بھرتی ہے، یہ ترکیب یہ کوئی مشکل ہیں مشکل ہے، قسم کو نہیں چاہتی۔

غزل نمبر ۲۔ ا۔ عجب اس میں ذرا بے محل معلوم ہوتا ہے کیا قرینے سے محفل آراستہ ہے یا عجب آراستہ محفل ہونا چاہیئے

۷۔ جس چیز کا دھوکا ہو اس کا بیان دھوکے کے ساتھ ہوتا ہے کہ اصل چیز بیان میں نہیں آتی، دل ایسا کہ مجھے دھوکا ہوا پہلو میں تکیہ ہے۔ اسی پر ختم ہو جاتا ہے، چاہیے یوں بنا لیجیئے۔ نہیں کھلتا کہ پہلو میں مرے تکیہ ہے یا دل ہے۔ یا اور جو صورت آپ کے خیال میں آئے۔

۹۔ آپ کا مقصود غالباً یہ ہے کہ دوست کا قاتل ہے اور دوست کے دشمن کا بسمل ہے۔ مگر پیدا یہ ہوتا ہے کہ اپنے دوست کا قاتل ہے، اپنے دشمن کا بسمل ہے۔

۱۲۔ رشک سے نے مارا کے ساتھ کیوں کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یوں چاہیئے: "مجھے اس رشک نے مارا کہ وہ عاشق قاتل ہے"

۱۹۔ میرے نزدیک شامل کی جگہ شریک چاہیئے۔ شاید میں اس جگہ شامل بولتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو رہنے دیجیئے

غزل نمبر ۳۔ ۳۔ یا تو بھی نہ ہو یا دوسرا نہ ہو (یہ اشارہ طرف ہے میں نہیں سمجھا)

۵۔ اس کا مغز میری سمجھ میں صاف نہ آیا حاصل کیا ہوا؟

۹۔ دوسرے مصرع میں کہ بہت بے محل ہے، چاہیے یوں بنا لیجیئے، چُرانا اپنے دم کا بھی وہاں چوری میں داخل۔

۱۰۔ دُھن بندھنا اس جگہ مناسب نہیں ہے۔

۱۶۔ دوسرے مصرع میں ورنہ غش میں غافل ہے کی جگہ غش ہے سے مطلب حاصل ہے۔ غافل ہے کی ضرورت نہیں قافیہ بیکار ہے فقط

داغ کا خط امیر کے نام

جناب مکرم۔ وعلیکم السلام۔ نیاز نامہ کا جواب اس عنایت و عرق ریزی سے آپ نے لکھا کہ میں پانی پانی ہو گیا۔ ہمارے آپ کے دل میں محبتِ قدیم کا لگاؤ ابھی ہے۔ ارشاد۔ میں نے یہ غزلیں مجبوراً ڈھائی گھنٹے میں کہیں۔ ڈیڑھ میں دو غزلیں۔ اور ایک گھنٹہ میں ایک غزل منشی فرما دیں

۱؎ یہ نوٹ داغ کے قلم کا ہے۔

ہم سرکار گڑی رکھ کر اشعار لکھتے جاتے تھے، خدا جانے یہ کیا امتحان
اور کیوں تھا۔ آپ کے انتخاب سے میں خوش نہ ہوا۔ بسبب مہاجرت
کے مذاق میں مغائرت ہوگئی۔ آپ کے شبہات پر میں نے غور کر کے
جا اور بیجا کا لحاظ رکھ کر ملفوف رقیمۂ نیاز کیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مکرر
ملاحظہ فرما کر جواب جلد لکھئے۔

(راقم آثم فصیح الملک داغ دہلوی)

...... واقعی نقش محفل اجنبی ہے، میں نے اوّل یہی کہا
۔اس کے بعد لفظ حسن بنایا تھا۔ پہلا ہی مصرع لکھا گیا جب
ایک گھنٹے میں اس قدر شعر کہے جائیں تو کیا ہو خصوصاً شعر کے
(ب) شعر سے کیا واسطہ۔ لفظ باعث مجھ کو نہیں کھٹکتا تھا

تمھاری بزم میں ہر بات کا باعث مرا دل ہے
جسے تو رنگِ محفل ہے، اُٹھے تو حسنِ محفل ہے

اس مصرع میں "تو" کا اشباع ہوا ہے ورنہ یونہی یہ مصرع ہو
سکتا تھا میری رائے ناقص میں ترکیب پہلے ہی مصرع کی اچھی ہے

یہ جم کر رنگِ محفل ہے یہ اٹھ کر حسنِ محفل ہے

اپنی رائے سے اطلاع دیجیے ورنہ میں کاٹ دوں گا ہر چند
سرکار میں نقل غزل کی پہنچ گئی ہے۔

بمقامِ امن سایہ سے مرے بھاگا کیا کو سوں
کہ پیچھے پیچھے میں ہوں میرے آگے آگے منزل ہے

بیٹھا وہی دونوں زبانوں پر یعنی یہ حال تھا اور ہے — فریاد
کہ ایسا شعر ناپسند ہو۔

اٹھایا شوق نے اٹھے، بٹھایا ضعف نے بیٹھے
یہی رستہ کا رستہ ہے یہی منزل کی منزل ہے

آپ چاہتے ہیں وہ خاص اس ترکیب میں پیدا ہے بلکہ یہی
خود ہم لوگوں کا اور یہی مدّعا ہے۔ داد بیداد کہ یہ شعر بھی معیوب ہو

قسم مشکل کشا کی یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے

واللہ یہ ترکیب قسم کو ضرور چاہتی ہے۔ داغ گھبرا رہا ہے تسلی
دینے والا قسم کھا کر یقین دلاتا ہے کہ یہ کیا مشکل ہے اب آسان
ہو جائے گی، عین زبان ہے، ہائے افسوس کہ آپ مجھ سے دور
ہو گئے اور کوئی دلّی والا لائق آپ کے پاس نہیں۔

یہ اے صیاد اک پہلو نکل آیا رہائی کا
اسیروں میں ترے جو چھوٹ جائے وہ مرا دل ہے

جی چھوٹ جانا، دل چھوٹ جانا، دونوں میری زبان پر ہیں۔ اب
تو خیال فرمائیے کہ یہ شعر کیسا ہے۔

قرینے سے عجب آراستہ قاتل کی محفل ہے

یہاں عجب کیوں بُرا ہوا۔ قرینہ سے جملہ الگ ہے عجب آراستہ
دوسری صنعت ہے۔ وائے تقدیر کہ یہ شعر ہیں صادوں سے محروم رہے

بڑھا دل اس قدر فرطِ خوشی سے وصل کی شب کو
مجھے دھوکا ہوا پہلو میں یہ تکیہ ہے یا دل ہے

آپ کا لکھنا تو ہر طرح سے بداہتاً اور دوستانہ ہے، مگر میں نے خوب
فکر و غور کی تو اس کا عیب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس دھوکے میں
شک میں رہا کہ یا اب یہ تکیہ ہے پہلو میں یا دل ہے۔ چونکہ پہلے دل
کا ذکر آچکا ہے اس کا اعلان "یا" کے ساتھ ضروری تھا آپ کا مصرع
بھی بہت خوب ہے مگر جب عیب کو نہ سمجھوں تو سرکار میں بھیجی ہوئی
غزل کا مصرع کیوں بدلوں۔ یہ بھی تقدیر کہ اس تازہ مضمون کا بیں داد
طلب تھا۔ اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔

یہ نیرنگِ محبت کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جو اپنے دوست کا
قاتل ہے، وہ دشمن کا بسمل ہے میں نے اس کے معنی یہی رکھے
ہیں کہ معشوق اپنے دوست کا قاتل اور اپنے دشمن کا بسمل ہے
یعنی جس کو وہ دوست اپنا جانتا ہے اور اس پر مائل ہے۔ وہ

الحقیقت اس کا دشمن ہے۔ میرے خیال میں

ستم بھی ہو تو مجھ پر ہو، جفا بھی ہو تو مجھ پر ہو
مجھے اس رشک نے مارا وہ کیوں عالم کا قاتل ہے

منشی امیر احمد صاحب میرے ہوتے جلال پر کیوں عنایت فرماتے ہیں۔ مجھے تو یہ رشک مارے ڈالتا ہے۔ اس رشک نے مارا کیا یہ خلاف محاورہ ہے۔ لفظ "کیوں" میری رائے میں اُچکا ہوا ہے۔

سُنا بھی تو نے اے دل کیا صدا آتی ہے محشر میں
یہی دن امتحاں کا ہے ہمارے کون شامل ہے

اہلِ دہلی کی زبان پر شامل شریک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بُرے وقت میں کون کسی کا شریک ہوتا ہے۔ بُرے وقت میں کون کس کے شامل ہوتا ہے ؎

شہادت میری فریادوں کی اس سے بڑھ کے کیا ہو گی
فرشتے لکھتے ہیں بیٹھی ہوئی آواز سائل ہے

معشوق کی فریادوں کا یقین نہیں آتا، حالانکہ درج نامۂ اعمال ہو رہا ہے، آواز بیٹھنے کی یہ بڑی شہادت ہے، یہاں مراد فریادِ سائلِ وصل سے ہے، نہ بھیک مانگنے والے سے۔ کیا یہ شعر بُرا ہے، بے معنی تصور فرمایا۔ براہِ مہربانی مطلع فرمایئے گا۔ میں اس کو بہت اچھا سمجھے ہوا ہوں۔

یہ کیوں تیغِ ادا سے مضطرب مانند بسمل ہے
الٰہی کیا کلیجے کے بھی اندر دوسرا دل ہے

اس کو یوں کہئے دوسرا دل کیا کلیجے کے اندر بھی ہے، میں نہیں سمجھا کہ اس میں کیا قباحت ہے۔ یہ باتیں تو جب طے ہوں کہ صحبت میسر آئے۔ تحریر سے یہ شبہات مٹ نہیں سکتے۔ میری رائے میں شعر بہت اچھا ہے اور نیا پہلو ہے ؎

ستم دیکھو وہ مشکیں باندھتے ہیں اپنے بسمل کی
کہ اپنا دم چھڑانا بھی وہاں چوری میں داخل ہے

کاف علت کا یہاں بے محل مجھ کو معلوم نہیں ہوتا۔ یعنی زبان کے محاورہ میں ڈھلا ہوا ہے۔ آپ کا مصرع بھی خوب ہے مگر دم کے چھڑانے سے دم چھڑانا فصیح تر معلوم ہوتا ہے۔ انصاف تو کرو کیا شعر کہا ہے ؎

کیا دیوانگی میں قید جب سے چارہ سازِ دل نے
مجھے یہ دھن بندھی ہے میرے پھندے میں سلاسل ہے

لفظ دھن خاص اپنے محل پر بندھا ہے۔ خدا جانے آپ کس سبب سے بے محل سمجھے۔ میں اس کو بے محل نہیں سمجھتا۔

یقیں آتا نہیں اس بدگماں کو مرگِ عاشق کا
کوئی مر جائے تو سکتہ ہے، ورنہ غش ہے غافل ہے

غش میں غلط لکھا گیا۔ تیں کی جگہ ہے تصور کیجیے۔

(فاران)

تبصرہ

عقیدت کے پھول

مرتب: جناب رشیدی۔ ناشر: مکتبۂ ایوانِ ادب پوسٹ بکس ۱۳۰ لاہور۔ تقریباً ڈھائی سو صفحے کی اس مجلد کتاب میں قائداعظمؒ کے متعلق پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے ادبا، شعرا اور مشاہیر کے منظوم و منثور جذباتِ عقیدت جمع کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں قائداعظمؒ کی چند تصویریں بھی شامل ہیں۔ دیباچہ حفیظ فلک پیما نے لکھا ہے اور شروع میں مرتب کتاب نے قائداعظمؒ کے حالات مختصراً لکھے ہیں۔ ان حالات میں اختصار کے باوجود جامعیت ہے اور یہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ ہر پاکستانی کو یہ کتاب دیکھنی چاہیے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

م۔ ح۔ نظامی، ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر نے نوائے وقت پبلیکیشنز لمیٹڈ کے لئے امرت الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر مخزن مال روڈ لاہور سے شائع کیا

(دورِ سوم)

جلد چہارم از جولائی ۱۹۵۰ء تا دسمبر ۱۹۵۰ء

مخزن

مخزن

اکتوبر

۳۹۹
۴۰۶
۴۰۷
۴۱۳
۴۱۵
۴۱۷